

# اسلام اور جدید افکار



محمد حسیب عباسی

مکتبہ کائنات  
جدید

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ  
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مَجْلِسُ التَّحْقِيقِ الْإِسْلَامِيِّ

محدث لائبریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اسلامی کتاب سب سے زیادہ مستحکم

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مَجْلِسُ التَّحْقِيقِ الْإِسْلَامِيِّ کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

### تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے  
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس  
پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 www.KitaboSunnat.com

دانشاؤ العرب

بیت الفکر والعلوم

# اسلام اور جدید افکار

(معاشی، سیاسی اور معاشرتی)

ترتیب، تالیف و تدوین

محمد حبیب عباسی

مکتبہ دانیال

رابطہ: 0333-4276640, 0423-7660736

www.maktabahdanyal.com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

محمد ابوبکر صدیق

نے

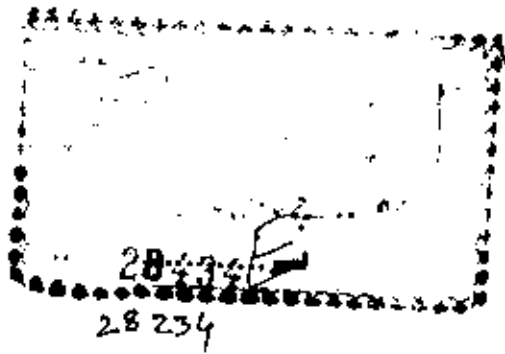
ندیم یونس پرنٹرز لاہور

سے چھوڑ کر مکتبہ دانیال لاہور

سے شائع کی

قیمت ..... 300/-

www.kitabosunnat.com



Best time  
to visit

مکتبہ دانیال

جلال الدین ہسپتال بلڈنگ سرگرم روڈ چوک اردو بازار لاہور

عزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

www.maktabahdaneyal.com



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُوَلَانَا  
مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِهِ وَ صَحْبِهِ وَ  
بَارِكْ وَسَلِّمْ صَلِّ عَلَيْهِ



# فہرست

## اسلام اور جدید معاشی افکار

13	علم معاشیات کا تعارف	★
13	معاشیات کا معنی و مفہوم	★
14	معاشیات کا آغاز و ارتقاء	★
17	معاشیات کی اقسام	★
18	اسلامی معاشیات	★
25	اسلامی معیشت کی بنیادی اقدار	★
25	اللہ کی رزاقیت	★
28	معیشت اور اخلاق کا باہمی تعلق	★
34	معیشت میں تقویٰ کا کردار	★
42	سیاست، معیشت اور معاشرت کا تعلق	★
45	عدل	★
50	عدل کے اصول	★
51	عدل کے اثرات و فوائد اور نتائج و ثمرات	★
52	تعاون / معاونت	★
53	اسلام میں تعاون کی اہمیت	★
58	ایثار / قربانی	★
64	ایثار کے فوائد و ثمرات اور اثرات و نتائج	★
65	احسان	★
71	اخوت / بھائی چارہ	★
76	اخوت کی افادیت و اہمیت	★
83	اسلامی معیشت کے اساسی تصورات	★

83	اسلام میں حلال و حرام کا تصور اور اصول	★
87	حرام اور حلال قرار دینے کی افادیت	★
92	کسب معیشت میں جدوجہد کی اہمیت	★
94	درجات معیشت کا مقصد اور اسلامی فلسفہ	★
97	کفالت عامہ	★
106	اسلام میں معاشی استحصال کی ممنوعیت	★
107	اسلام میں معاشی عدل کے اصول	★
109	معاشی استحصال سے بچنے کے طریقے	★
112	عصر جدید کے معاشی نظریات و افکار کا اسلامی فکر کی روشنی میں جائزہ	★
112	اسلام اور سرمایہ داریت	★
117	اسلام و اشتراکیت میں تقابل	★
120	اسلامی معیشت کا اخلاقی نقطہ نظر	★
120	سرمایہ داری نظام / کپٹل ازم	★
121	اشتراکیت / سوشلزم	★
122	اسلام کا معاشی نظام	★
123	دیگر معاشی نظریات و افکار کا اسلامی نظام سے موازنہ	★
149	اسلام و اشتراکیت میں تقابل	★
153	برصغیر میں معاشی نظریات کی کشمکش کا جائزہ	★
153	سامراجیت	★
153	استعماریات (نوآبادیات)	★
154	اشتراکیت / سوشلزم	★
157	اشتمالیت / کمیونزم	★
158	فاشزم (فیطائیت)	★
158	نازی ازم	★
159	مارکسزم	★
160	سوشلزم	★
162	معاشی نظاموں کا تنقیدی جائزہ	★

162	..... سرمایہ داری نظام / کمپنیل ازم	★
163	..... سرمایہ داری نظام کی خوبیاں	★
164	..... سرمایہ دارانہ نظام کی خامیاں	★
165	..... اشتہائیت / کمیونزم	★
165	..... اشتہائیت کی خوبیاں	★
166	..... اشتہائیت کی خامیاں	★
167	..... مخلوط معاشی نظام	★
168	..... مخلوط معاشی نظام کی خوبیاں	★
168	..... مخلوط معاشی نظام کی خامیاں	★
169	..... اشتراکیت / سوشلزم	★
170	..... اشتراکیت کی خوبیاں	★
171	..... اشتراکیت کی خامیاں	★
172	..... نظریہ افادیت	★
174	..... نظریہ افادیت کی خوبیاں	★
174	..... نظریہ افادیت کی خامیاں	★
176	..... اسلام کا معاشی نظام	★
177	..... اسلامی معاشی نظام کی خصوصیات	★
180	..... علم معیشت کے ارتقاء میں مسلم مفکرین کا کردار	★
180	..... امام ابو یوسفؒ	★
181	..... امام ابو یوسفؒ کے معاشی افکار	★
187	..... امام ابو عبید القاسمؒ	★
188	..... امام ابو عبید القاسمؒ کے معاشی افکار	★
191	..... علامہ ابن حزمؒ	★
192	..... علامہ ابن حزمؒ کے معاشی افکار	★
195	..... حضرت شاہ ولی اللہؒ	★
196	..... شاہ ولی اللہؒ کے معاشی افکار	★
201	..... ابن خلدون	★

202	ابن خلدون کے معاشی افکار	★
212	ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی	★
217	ڈاکٹر یوسف عبداللہ قرضاوی	★
220	اسلامی مملکت میں زکوٰۃ کا کردار	★
220	فرشیت زکوٰۃ	★
223	مصارف زکوٰۃ	★
225	بنیادی مسائل زکوٰۃ	★
229	حرمت سود	★
229	سود کے فوائد	★
230	سود کے نقصانات	★
233	سود کا اسلامی تصور	★
234	مبادلات	★
237	غیر سودی بنکاری	★
240	انشورنس / بیمہ کاری	★
245	انشورنس کے ممنوع ہونے کے اسباب	★
250	اصلاحی اقدامات	★
252	اسلام میں انشورنس کا تبادل	★
254	جدید معاشی مسائل اور ان کا اسلامی حل	★
257	اسلام میں معاشی مسائل کا حل	★
264	بیع و شراء کی جدید صورتیں	★
264	لیزنگ / اجارہ کاری (Leasing)	★
265	کرایہ پر لینا یا دینا	★
269	قسطوں کا کاروبار	★
274	حصص کی خرید و فروخت / بیع سلم	★
278	حقوق مجردہ کی خرید و فروخت / اصنعاع	★
282	قمار کی جدید شکلیں	★



# اسلام اور جدید سیاسی نظریات

299	علم سیاسیات	★
299	علم سیاسیات کی نوعیت	★
301	علم سیاسیات کی وسعت	★
303	علم سیاسیات کے مطالعہ کی اہمیت	★
304	علم سیاسیات کے مطالعہ کی اہمیت / افادیت	★
307	سیاسی نظریات کی مختصر تاریخ	★
310	اسلامی عہد میں سیاست	★
312	اسلامی ریاست کے اہم خصائص اور اساسی تصورات	★
313	اسلامی حکومت کے بنیادی اصول	★
330	ذمیوں کے خصوصی حقوق	★
331	اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق	★
335	دیگر اہم حقوق	★
336	مسلمانوں کا تصور ریاست	★
339	اسلامی ریاست کی خصوصیات	★
346	اسلامی ریاست کے مقاصد	★
352	اسلامی ریاست کی اہمیت	★
354	خلفائے راشدین کے انتخاب کی نوعیت	★
358	خلافت راشدہ کا سیاسی نظام	★
362	خلافت راشدہ کی خصوصیات	★
366	خلافت راشدہ کے عہد میں غیر مسلموں کے حقوق	★
368	اسلامی دستور	★
371	حاکمیت الہیہ	★
373	اسلامی تصور اقتدار اعلیٰ کی خصوصیات	★
376	مغربی اور اسلامی اقتدار اعلیٰ میں فرق	★
380	دین و سیاست کا استخراج	★

383	خلافت و امامت	★
383	خلیفہ کی حیثیت	★
384	خلافت / امامت کی اہمیت	★
384	خلافت / امامت کی خصوصیات	★
385	خلافت / امامت کی ذمہ داریاں	★
387	اسلامی ریاست میں خلیفہ کے اوصاف اور فرائض	★
388	خلیفہ کے اوصاف	★
390	خلیفہ کے فرائض	★
393	شورئی	★
393	شورئی کے عناصر	★
394	رائے دہندگان بحق ووٹر	★
394	ایوان شورئی	★
395	شورئی کی اہمیت	★
399	عصر حاضر میں شورئی کے انتخاب کی عملی صورت	★
401	بنیادی انسانی حقوق	★
405	فلاح عامہ	★
409	عدل	★
411	اسلامی ریاست میں عدلیہ	★
414	اسلامی ریاست اور جہاد	★
414	جہاد کی اقسام	★
415	کفار سے جہاد کا حکم اور اس کی فرضیت	★
419	اہل قتال کے حقوق	★
421	اشیاء قتال ممنوعہ اور غیر ممنوعہ امور	★
422	جنگی قیدیوں کی اقسام	★
424	جدید سیاسی افکار اور اسلام سیاسی فکر کا تقابلی مطالعہ	★

# اسلام اور جدید معاشرتی نظریات و تحریکات

434	..... معاشرہ	★
438	..... معاشرہ کی نوعیت و اقسام	★
442	..... معاشرہ کی ضرورت و اہمیت	★
445	..... معاشرے کے مقاصد	★
447	..... انسان کی معاشرتی فطرت	★
452	..... اسلامی معاشرت کی خصوصیات	★
452	..... اجتماعیت و تکفیل معاشرت اور اسوۂ حسنہ	★
454	..... اسلامی معاشرتی اقدار	★
463	..... نصیحت	★
469	..... اخوت	★
473	..... اسلامی اخوت کے تقاضے	★
477	..... اخوت کے اثرات اور فوائد و ثمرات	★
478	..... باہمی معاملات میں اصلاح بین الناس	★
481	..... برائی کے مقابلے میں حسن اخلاق	★
482	..... اعمال صالحہ کی اقسام	★
483	..... پسندیدہ اخلاقی صفات	★
487	..... غصہ و درگزر	★
492	..... غصہ کے فوائد، نتائج و اثرات اور انسانی زندگی پر اثرات	★
494	..... اعتدال پسندی / میانہ روی	★
496	..... قطع رحمی کے مقابلے میں صلح رحمی	★
498	..... عظمت انسانی اور فرد کا مقام	★
501	..... فرد اور معاشرے کا تعلق	★
504	..... اسلامی معاشرہ کو مستحکم اور غیر مستحکم کرنے والے عوامل کا مطالعہ	★
507	..... معاشرے میں اصلاح احوال کے طریقے	★
512	..... روزائل اخلاق کے اسباب و محرکات	★

519	اہم معاشرتی ادارے	★
519	خاندان	★
522	خاندان میں انتشار کی وجوہات	★
528	مغربی ثقافت اور ہمارا خاندان	★
529	خاندانی بحران یا انتشار	★
531	بحران کی قسمیں	★
536	خاندان کو مستحکم، منظم اور مد سکون بنانے والے عوامل	★
538	مسجد	★
540	مسجد کا معاشرتی مقصد و معاشرتی اہمیت	★
544	مدرسہ	★
548	مدرسے کی خدمات یا فرائض	★
550	تاریخ اسلام کی روشنی میں مدرسوں کا کردار	★
554	مارکیٹ / بازار	★
556	کیونٹی سنٹرز	★
557	عصری ذرائع ابلاغ	★
559	عصری ذرائع ابلاغ کے مقاصد	★
563	غیر اسلامی معاشرہ اور اسلامی معاشرہ کا تقابل	★
572	عورت کا مقام (اسلامی اور مغربی تصورات کا جائزہ)	★
	حقوق نسواں کے حوالے سے جدید افکار کا اسلامی تعلیمات کی	★
575	روشنی میں جائزہ	★
588	جنسی تفریق کا جدید نظریہ اور اسلام	★
590	اسلامی عالمی نظام کے بنیادی اصول	★



اسلام

— اور —

جدید معاشی افکار



# علم معاشیات کا تعارف

تخلیق کائنات کے ساتھ انسان کی بے شمار خواہشات نے بھی جنم لیا۔ جب ایک آرزو پوری ہو جاتی ہے تو دوسری سر اٹھا لیتی ہے اور اسی طرح یہ ایک لامتناہی سلسلہ جاری و ساری ہے۔ اگرچہ قدیم ازمہ میں یہ تمنائیں مختصر اور سادہ ہوتی تھیں مگر امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کی نوعیت اور اہمیت میں بھی جدت آتی گئی اور جوں جوں انسان ترقی کی دہلیز پہ قدم زن ہوتا چلا گیا ان کی خاصیت میں بھی تبدیلی آتی گئی اور اس دور میں تو ان کی حالت بہت ہی عجیب و غریب منزل تک پہنچ چکی ہے۔

تن ڈھانپنے کے لئے پوشاک، بھوک مٹانے کے لئے خوراک، رہائش کے لئے مکان، صلات دور کرنے کے لئے علاج اور ذہنی نشوونما اور قدرت کی شناسائی حاصل کرنے کی خاطر علم کی اشد ضرورت ہوتی ہے اور انہی کو ہم بنیادی احتیاجات (Basic Necessaries) کا نام دیتے ہیں۔ دراصل انسان کی تنگ و دو زیادہ تر ان کی تحصیل کے گرد گھومتی رہتی ہے اور ان کو حاصل کرنے کے لئے منصوبہ بندی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور ایک ایسے علم کی تلاش ہوتی ہے جو ان گتھیوں کو سلجھانے اور انہیں پورا کرنے میں مدد و معاون ثابت ہو اور یہیں سے علم المعیشت (Science of Economy) کی بنیاد پڑتی ہے۔

## معاشیات کا معنی و مفہوم

یاد رہے کہ معاشیات ایک قدیم علم ہے اور اس کی ضرورت ہر دور میں رہی ہے۔ موجودہ صدی میں اس علم کو چار چاند لگ گئے ہیں اور کوئی ملک و قوم اس کے اصولوں اور طریقوں پر عمل کئے بغیر ارتقاء کے زینے پر فائز نہیں ہو سکتے۔ یہی سبب ہے کہ اس کی کارفرمائی سے مختلف قومیں بام عروج پہنچ چکی ہیں اور جن کا دامن اس کی دولت لازوال سے تنہا ہے وہ پست اور غیر ترقی یافتہ ہیں۔

معاشیات (Economics) کو اقتصادیات کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اسکا کس کی اصطلاح (Term) یونانی زبان کے لفظ (Oikonomos) سے اخذ کردہ (Derived) ہے جس کا مفہوم نظم یا نظام خانہ داری (Household Management) یا بندوبست گھریلو یا گھر چلانے کا ضابطہ یا طریق کار ہے۔ پولس (Polls) بھی یونانی لفظ ہے جس کا مطلب ریاست لیا جاتا

ہے چنانچہ کسی ملک کا سیاسی نظام کنٹرول کرنے کے لئے سیاسی یا مدنی معیشت (Political Economy) کے الفاظ استعمال ہوتے تھے۔ پہلے یہ علم سیاسیات (Political Science) کا حصہ تھا۔ یا اس کی ایک شاخ (Branch) تھی۔

## معاشیات کا آغاز و ارتقاء

آج سے کئی صدیاں قبل انسان اپنی زندگی نہایت سادگی سے بسر کرتا تھا، تکلفات بالکل نہیں تھے، خواہشات کم تھیں، ضروریات کا دائرہ بھی تنگ تھا اور وسائل بھی محدود تھے۔ آبادی مختصر تھی، تنگ و دو بھی زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ ترقی تو خواب میں بھی نہیں آتی تھی۔ رہنے سہنے ملتے جلتے کے ڈھب میں دلفریبی و کشش نہیں پائی جاتی تھی۔ البتہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاں حاجات بڑھتی گئیں ان کی جدت و شدت اور نوعیت میں بھی فرق آتا گیا اور انسان میں آگے بڑھنے کی سکت و قوت بھی آتی گئی۔ لہذا اس علم کے بھی نئے ابواب کھلتے گئے۔ جدید علم معاشیات کی بنیاد انگلستان کے معروف پروفیسر ایڈم (آدم) سمٹھ (1723-1790) نے رکھی۔ اس کا تعلق سکاٹ لینڈ سے تھا جو 5 جون 1723ء کو پیدا ہوا۔ اس نے آکسفورڈ اور گلاسکو جامعات (Universities) میں تعلیم حاصل کی اور پھر ایڈن برگ و ایک اور یونیورسٹی میں منطق (Logic) اور فلسفہ (Philosophy) کے مضامین پڑھاتا رہا۔ وہ 1778ء میں کسٹمز مقرر ہوا۔ اسے نئی معاشیات کا بانی (Founder) یا بابائے (Father) معاشیات جدید کہا جاتا ہے۔ اس نے ساری زندگی بغیر شادی کے گزار دی اور اسی علم کے حصول و تدریس میں مصروف رہا۔ اس کی مشہور زمانہ کتاب دو اقوام عالم کی دولت کی نوعیت اور اسباب پر تحقیقی مقالہ.....

"An Enquiry In to the Nature and Causes of Wealth of Nations"

Nations"

9 مارچ 1776ء کو شائع ہوئی تھی جو کئی جلدوں (Volumes) پر مشتمل ہے۔ اس نے ساری دنیا میں دھوم مچا دی۔ کیونکہ اہمیت و افادیت کے اعتبار سے یہ منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ آدم سمٹھ کو کلاسیکی کتب فکر (Classical School of Thought) کا سربراہ مانا جاتا ہے۔ اس کے متعدد (Several) پیروکار (Followers) بنے جنہوں نے اس کی سوچ (Thinking) کو پروان چڑھایا۔

**تعریف (Definition):**

کسی علم کا ادراک کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ یہ بتایا جائے کہ مضمون کیا ہے؟ اس کی تعریف کیا ہے؟ کئی ماہرین تعریف کے حق میں نہیں ہیں۔

دی پریٹو کے مطابق: ”تعریف میں الجھنے سے وقت ضائع کرنا ہے۔“  
 پروفیسر جے ایم کھنر کی رو سے: ”معیشت سیاست بذات خود اس طرح الجھ گئی ہے کہ معاشیات کی تعریف کرنا دشوار ہو گیا ہے۔“  
 بی وٹن نے لکھا ہے: ”تعریفوں کی بھرمار نے معاشیات کا گلا گھونٹ (Strangle) کے رکھ دیا ہے۔“

گنار مرڈل (Gannar Myrdal) اور ڈی جین سن (D. Hutchin Son) کے خیال میں تعریف بیان کرنا فضول یعنی بیکار یا خیر کاروبار یا سرگرمی (Barren Enterprise) ہے۔ ایک اور رائٹر کی رائے یہ ہے:  
 ”معاشیات نہ ختم ہونے والا علم ہے۔“

### تعریفوں کی تقسیم (Division of Definitions):

معیشت دانوں (Economists) نے تعریفوں کو تین حصوں میں بانٹا ہے۔ جنہیں نیچے بیان کیا جاتا ہے:

(الف) کلاسیکی تعریف

(ب) نو کلاسیکی تعریف

(ج) جدید تعریف

اب یکے بعد دیگرے ان تینوں تعریفوں کی تشریح کی جاتی ہے اور ان کے مختلف پہلوؤں پر مفصل بحث کی جائے گی۔

### کلاسیکی تعریف (Classical Definition):

اس کو قدیم تعریف کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا پروفیسر ایلم سمٹھ نے کی تھی اور کئی اور ماہرین اقتصادیات نے اس کی حمایت کی تھی۔ اس لئے اسے کلاسیکی تعریف کہتے ہیں۔ ان میں ڈیوڈ ریکارڈو این ڈیو سینٹر تھامس مالتھس (Thomas Malthus) جے بی سے (J.B. Say) جے ایس مل (J.S. Mill) جیمز مل (James Mill) ڈیو واکر (W. Walker) اور چیپ مین کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

آدم سمٹھ نے اپنی کتاب ”دولت اقوام“ (Wealth of Nations) میں جو کچھ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ معاشیات دولت کا علم ہے۔ یہ کتاب سرمایہ دارانہ نظام (Capitalistic System) کی بابت لکھائی ہے۔ اس کے مطابق:

”معاشیات ایک ایسا علم ہے جس میں ہم یہ مطالعہ کرتے ہیں کہ دولت کس طرح پیدا کی جاتی ہے اسے کیسے صرف کرتے ہیں اس کی تقسیم کیونکر ہوتی ہے؟ اور یہ کہ اس کا تبادلہ کیسے

ہوتا ہے؟“

آدم سمجھ کے دوسرے ساتھیوں کے خیالات اس طرح ہیں۔ سینئر (Senior) کہتا ہے: ”معاشیات کا تعلق دولت کی نوعیت، پیدائش دولت اور تقسیم دولت سے ہے۔“  
ایف اے واکر کے مطابق:

”معاشیات ایک ایسا علم ہے جس کا واسطہ دولت سے ہے۔“

ایک فرانسیسی ماہر معاشیات جے بی سے (Say) کا نقطہ نظر یوں ہے:

”معاشیات ایسا علم ہے جس میں دولت کے سلسلے میں سارے معاملات پر غور و فکر کیا

جاتا ہے۔“

جے ایس ٹل لکھتا ہے:

”معاشیات دولت کی پیدائش اور تقسیم کا علم ہے۔“

### نوکلہا سکی تعریف (Neo- Classical Definition):

اسے نوکلہا سکیل کتب فکر (Neo- Classical School of Thought) کا نام دیتے ہیں۔ اس کی ابتداء انگلینڈ کے معروف پروفیسر الفریڈ مارشل (Alfred Marshall) نے کی تھی۔

ڈاکٹر مارشل (1842-1924) معروف معیشت دان (Economist) تھا۔ اس نے کیمبرج یونیورسٹی 1868ء میں ریاضی کے مضمون میں ڈگری حاصل کی مگر ذاتی کاوش سے معاشیات کا مطالعہ کیا اور اسی مضمون کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس کی مشہور زمانہ تصنیف بنام ”اصول معاشیات“ (Principles of Economics) 1890ء میں منظر عام پر آئی اور دھوم مچادی جس نے علم معاشیات کے ضمن میں غلط فہمیوں کو دور کیا اور اس کی از سر نو تعریف کی جو کلاسیکی تعریف سے بہت مختلف تھی۔

پروفیسر اے مارشل کی تعریف یہ ہے:

”معاشیات میں انسان کے ان افعال کا مطالعہ کیا جاتا ہے جن کا زندگی کے روزمرہ کے معاملات سے واسطہ پڑتا ہے۔ فرد کی انفرادی و اجتماعی کوشش کے اس حصہ کا بھی جائزہ و معائنہ کیا جاتا ہے جس کا اس امر سے گہرا تعلق ہے کہ خوشحالی (Well-being) کے مادی لوازمات (Material Requisites) کس طرح حاصل ہوتے ہیں اور انہیں کیسے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ سو ایک طرف یہ علم دولت ہے اور دوسری جانب جو بہت ہے خود انسان کے پہلو کا مطالعہ ہے۔“

پروفیسر مصوف کی تائید چند دیگر ماہرین نے بھی کی تھی جیسا کہ ای کہین لکھتا ہے:

”معاشیات کا مقصد ان عام اسباب کی تشریح کرنا ہے جن پر انسانی مادی بھلائی کا انحصار ہے۔“

اسے سی بیکو کے خیال میں:

”معاشیات اقتصادی خوشحالی کے مطالعہ کا نام ہے۔“

رابینز کی تعریف (Definition of Robbins):

اس کا تعلق تیسرے طبقہ فکر سے ہے۔ ایل رابینز 1898ء میں پیدا ہوا اور 1984ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ یہ لندن سکول آف اکنامکس میں پروفیسر تھا۔ اس نے ایک کتاب لکھی جو خاصی مشہور ہوئی اس کا نام ”علم معاشیات کی نوعیت و اہمیت پر مقالہ“ تھا۔

کتاب ہذا 1931ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے:

”معاشیات ایک ایسا علم ہے جو انسان کے اس طرز عمل کا مطالعہ کرتا ہے جسے خواہشات (کے لاتعداد) ہونے اور وسائل کے محدود ہونے کی بنا پر اختیار کیا جاتا ہے جبکہ ذرائع متبادل یعنی کئی استعمالات رکھتے ہوں۔“

## معاشیات کی اقسام

علم معاشیات کی چیدہ چیدہ قسموں کا اجمالی ذکر آتا ہے:

1- تشریحی معاشیات یا بیانہ معاشیات (Descriptive Economy)

2- نظریاتی معاشیات (Theoretical Econ. or Econ. Analysis)

3- تطبیقی یا اطلاقی معاشیات (Applied Economics)

1- تشریحی معاشیات یا بیانہ معاشیات:

اس قسم میں کسی مخصوص معاشی موضوع سے متعلق حقائق اور صورت حال کی پوری شرح اور تفصیل ایک جگہ جمع کر لی جاتی ہے مثلاً پاکستان میں صنعت پارچہ بانی سے متعلق سارے مفصل حالات اور ضروری اعداد و شمار خام بھم رسائی تیاری کے مراحل اور پھر مصنوعہ مال کی کھپت و لاگت کے بارے میں مکمل کوائف اکٹھے کر لئے جاتے ہیں۔

2- نظریاتی معاشیات:

دوسری قسم نظریاتی معاشیات میں یہ بتایا جاتا ہے کہ سب کچھ کس طرح اور کس طریقے سے انجام پذیر ہوتا ہے۔ کون سے اصول اور قواعد کارفرما ہوتے ہیں۔ طلب رسد بازار تبادلہ قیمت کے تعین میں کون سے کلیات لاگو ہوتے ہیں اور وہ کون سا اقتصادی ڈھانچہ ہے جس پر یہ



نظام قائم و دائم ہے؟ گویا نظریات و تصورات اور مختلف نظام اس بحث میں آتے ہیں۔

### 3- تطبیقی یا اطلاقی معاشیات:

تیسری قسم میں اولین قسم کے تحت مہیا شدہ معلومات اور مواد پر دوسری قسم کے نظریات و کلیات کی تطبیق کر کے ان کے عمل و اسباب کی تلاش کی جاتی ہے اور پھر اس پر عمل درآمد کیا جاتا ہے۔

## اسلامی معاشیات

اسلام عالم انسانیت کے لئے خدائے بزرگ و برتر کا بھیجا ہوا اور پسند کیا ہوا طریقہ حیات ہے جس کی تکمیل عملی خود صاحب وحی محمد رسول اللہ ﷺ نے کر کے ماڈل قائم کر دیا اور آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ نے اس نمونہ کے بموجب عمل کر کے دکھایا۔ یہ ایک مکمل ضابطہ ہے جس میں انسان کی پوری حیات کے لئے اور ہر مرحلہ کے لئے واضح اصولی ہدایات موجود ہیں۔ اس لئے جہاں اسلام نے اعتقادات اور عبادات کی تعلیم دی ہے وہاں معاملات اور معاشیات سے متعلق بھی واضح احکام دیے ہیں۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں کوئی متعین معاشی نظام موجود نہیں ہے وہ نہ تو معاشیات کے فن کو سمجھتے ہیں اور نہ ہی اسلامی احکامات سے واقف ہیں۔ بقول سید مناظر احسن گیلانی:

”بھلا وہ دین جس کے اصولی نظریات کی بنیادوں کو قرآن مجید جیسی عظیم کتاب نے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہو معاشی احکام و قوانین سے خالی ہو سکتا ہے؟ قرآن مجید کی سب سے پہلی سورہ فاتحہ ہے اور اولین آیت میں خدائے بزرگ و برتر کی صرف ایک صفت کا ذکر ہے اور وہ ہے رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ کیا دنیا کا ماہر معاشیات بتا سکتا ہے کہ معاشیات خدا کی ربوبیت سے پوری طرح استفادہ اور اس کے قانون ربوبیت کی شناخت کے علاوہ کسی اور شے کا نام ہے؟“

افسر حسن صدیقی اس بارے میں یوں لکھتے ہیں:

”اسلامی معاشی نظام کی بنیاد اللہ کے قرآن پاک میں احکامات رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور ان کی طرز زندگی اور صحابہ کرامؓ کے طریقہ کار پر مبنی ہے یعنی جو کچھ اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں فرمایا نبی کریم ﷺ نے جو ارشاد کیا کر کے دکھایا اور صحابہ کرامؓ نے پیروی میں جو طریقہ کار اختیار کیا وہ بس سچ ہے اور ہر لحاظ سے انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنے کے لئے مشعل راہ ہے اور ان سے سرمو فرق نہیں کیا جاسکتا۔

اسلام کے معاشی نظام کو سمجھنے کے لئے مقدمہ کے طور پر یہ بے حد ضروری ہے۔ اس

سے انحراف کی صورت میں ایک مسلم کے ایمان میں خلل آ جاتا ہے اور غیر مسلم چوں و چرا یعنی شبہات کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہتا ہے اور اسلامی معاشی نظام کے سمجھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر خدا خواستہ ایک مسلمان کو کلام کی آیات و احکامات اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات، فرمودات اور سنت میں ہی شک ہے تو پھر یہی دعا کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ روشنی دے اور صراطِ مستقیم پہ چلنے کی ہدایت دے۔“

اسلام جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ایک سلامتی کا دین ہے اور بنیادی طور پر ایمانداری، نیک نیتی، راست بازی، ہمدردی، موافقت، اخوت و شرافت اور دیانت و امانت کا درس دیتا ہے۔ اس کی تلقین ہے کہ اسلام کے ذریعے اصولوں کو اپناتے ہوئے خدائے لم یزل اور رسول کریم ﷺ کے احکامات عالیہ کو مانو، بااخلاق اور نیک سیرت بنو اور اچھے مسلم بن کر دنیا داری بھی نبھاؤ۔ اسلام میں کذب اور دروغ، بغض و عناد، نفرت و حقارت، فریب و لالچ، مکر و چال بازی اور عیاری و حرام خوری کی گنجائش نہیں۔ حدود میں رہتے ہوئے ہمارے تمام اقدارات دین و دنیا میں سرفروشی کا ذریعہ بن جاتے ہیں جبکہ نیت میں خلوص ہو۔ اگر قرآن و سنت و آثارِ صحابہ کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو بہت سے حقائق ابھرتے ہیں جو ہمارے لئے راہ عمل متعین کرتے ہیں جس کی کماحقہ ہمدردی سے انسان ایک جانب دنیا میں بہترین پاکیزہ اور صاف زندگی گزار سکتا ہے اور دوسری طرف عاقبت میں سرفرو ہو سکتا ہے اور اسی پر انسان کی حقیقی فلاح ہے اور افسر حسن صدیقی نے اسلامی معیشت کے چند بنیادی اصول کچھ اس طرح بیان کئے ہیں:

”اسلام نے انسانی زندگی گزارنے کے لئے ایک محفوظ اور معتدل راہ عمل دکھائی ہے۔ یہ انسان کی معاشی جدوجہد میں معروف ایک دنیا دار فرد (Economic Man) تسلیم کرتا ہے اور ربانیت سے منع کرتا ہے، معاشی نقطہ نظر سے اسلامی معاشرہ کا بنیادی اصول (یعنی اسلام میں کوئی ربانیت نہیں) ہے۔“

ارشاد رب تعالیٰ ہے:

”ترک دنیا کو انہوں نے تراش لیا ہے۔ ہم نے اس کو ان پر فرض نہ کیا تھا۔ صرف خدا کی رضا مندی طلب کی تھی انہوں نے اس کی رعایت ملحوظ نہ رکھی۔“ (الحجہ 57 رکوع 4)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے کنارہ کش نہ ہو اور دنیا داری برتو اور اس دنیا میں تمہارا جو حصہ ہے اسے حاصل کرو چنانچہ ارشاد ہے:

”تمہارا دین میں جو حصہ ہے اسے نہ بھول جاؤ کیونکہ اس دنیا میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے وہ انسان ہی کے لئے ہے۔“

یہاں تک کہ (ترجمہ) ”اور تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے، مخر کیا۔“ (پ 25، الجاثیہ 49، رکوع 2)

خدا ہی نے تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے پیدا کیا۔" (پ ۱ البقرہ رکوع 2) اس طرح اسلام چاہتا ہے کہ اس کے پیروکار اسلامی احکامات کے مطابق اس دنیا میں بھرپور معاشی کوشش اور تنگ و دو سے کام لیں تاکہ اسلامی احکامات کے مطابق اس دنیا میں بھرپور معاشی کوشش اور تنگ و دو سے کام لیں تاکہ دیگر اقوام کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکیں اور اپنی عظمت و جلالت کو قائم رکھیں۔

یہاں لفظ "دنیا دار" سے غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہئے۔ مذکورہ لفظ کا استعمال افسر حسن صدیقی نے خالص معاشی نقطہ نظر کی بناء پر کیا ہے۔ یہاں دنیا دار سے مراد وہ شخص ہے یا وہ صارف ہے جو کسب دولت کے حلال ذرائع کو تلاش کرے اور ان سے استفادہ کر کے پھر ان وسائل سے حاصل کردہ ثروت سے متعلق دین اسلام نے جو ذمہ داریاں عائد کی ہیں انہیں پورا کرے۔

اس کے برعکس رہبانیت دنیا کے مسائل سے فرار کا نام ہے۔ رہبانیت یہ ہے کہ بزم خویش اللہ کی خوشنودی کی خاطر کوئی فرد جنگل میں تنہائی کی زندگی گزارے۔ دوسروں کے لئے روزی کمانا تو درکنار خود اپنے لئے بھی روزی حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے۔ خورد و نوش کے لئے کہیں سے کچھ ملا تو بہتر ورنہ درختوں کے پتوں ہی سے گزارہ کرے۔ نکاح اور اس کی ذمہ داریوں سے بھی اجتناب کرے۔ غور سے مشاہدہ کیا جائے تو رہبانیت زندگی کے حقائق کا سامنا کرنے سے بزدلانہ فرار کا نام ہے۔ اسلام نے زندگی کے تمام شعبوں میں توازن و اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے۔ زیست کے شعبوں سے کسی پر بہت زیادہ زور دینا اور بعض سے صرف نظر کرنا جادۂ اعتدال سے جٹ جانے کے مترادف ہے۔ اسی لئے رسول کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ اسلام میں رہبانیت نہیں۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ اسلام میں جس دنیا کی خدمت کی گئی ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کسب حلال کے جائز ذرائع کی جستجو اور ان سے حاصل کردہ مفاد بذات خود مذموم ہے بلکہ ان چیزوں کو اصل مقصد سمجھ بیٹھنے اور اپنی ساری تنگ و دو کو دنیوی زندگی کے لئے ہی محدود کر دینے اور اخروی زندگی کی تیاری سے بالکل غافل ہو جانے کو "دنیا" کہہ دیا جاتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا تو آخرت کی سرخوردگی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بنتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے پانی کشتی کو چلانے کا سبب بنتا ہے۔ اگر کشتی میں پانی اندر داخل ہونا شروع ہو جائے تو یہی پانی کشتی کو مع سواروں کے ڈبو دینے کا سبب بن جاتا ہے۔ اسی طرح اگر دین کی محبت دل میں رچ بس جائے اور انسان آخرت سے غافل ہو جائے تو یہ دنیا انسان کے لئے رحمت کی بجائے زحمت بن جاتی ہے۔ قرآن مقدس میں ہے:

"اے ایمان والو! تمہیں تمہارے مال اور تمہاری اولادیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔ جو شخص بھی ایسا کرے گا تو ایسے ہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں۔"

آنحضور ﷺ کی دعاؤں میں ایک دعا کے بعض جملوں کا ترجمہ یہ ہے:

”اے اللہ! دنیا کو ہمارا سب سے بڑا ہم و فکر نہ بنا اور ہمارے علم کی رسائی صرف دنیا

کے حصول تک ہی محدود نہ ہو اور ہمارے شوق کی انتہا یہ دنیا ہی نہ ہو۔“

انسانی زندگی کا مقصود اللہ نے عبادت بیان کیا ہے مگر انسان کو اس دنیا میں روح و جسم کا رشتہ قائم رکھنے کے لئے دنیوی ذرائع اور اسباب سے استفادہ کئے بغیر چارہ کار نہیں لہذا یہ استفادہ ممنوع نہیں بلکہ اس کا حکم دیا جاتا ہے مگر یہ گوہر حقیقی نہیں تاہم دنیوی لذتوں میں بہت زیادہ اشتہاک (خواہ جائز کیوں نہ ہو) اکثر انسان کو آخرت سے غافل کر دیتا ہے اور اس معاملہ میں حد اعتدال سے نکل جاتا انسان کو حرام کے بھی قریب کر دیتا ہے۔ جس سے انسان خسارے میں رہتا ہے اور اپنا دامن گناہ کی گندگی سے آلودہ کر لیتا ہے۔ چنانچہ احتیاط ضروری ہے۔ اسلام نے لاقعد و انسانی خواہشات (Unlimited Human Wants) کی تکمیل کے لئے اسلامی حدود و قیود میں رہتے ہوئے کھلی اجازت دی ہے۔ اسلامی پابندیاں انسانی معاشی مساعی میں اس طرح اعتدال پیدا کرتی ہیں کہ زندگی کے دوسرے شعبے مجروح نہ ہوں۔ چنانچہ کتاب مقدس میں ارشاد ہے:

”آدمی بڑا اچھا اور بے مبر پیدا کیا گیا ہے۔“ (پ 29، المعارج 70)

مزید یوں فرمایا گیا ہے:

”لوگوں میں عورتوں اور بچوں سونے چاندی کے ڈھیر سدھائے ہوئے گھوڑے اور

موسیٰ اور یحییٰ سے محبت کرنے کی خواہش آراستہ کی گئی۔“ (پ 3، العمران 3)

احادیث میں انسانی فطرت کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ عبد اللہ بن زبیرؓ مکہ معظمہ میں منبر پر کھڑے ہوئے بیان کر رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے تھے: ”اگر بنی آدم کو ایک وادی سونے کی بھری ہوئی دی جائے تو وہ دوسری کی خواہش کرے اور اگر دوسری دی جائے تو تیسری کی خواہش کرے اور انسان کا پیٹ تو قبر کی مٹی کے سوا کسی چیز سے نہیں بھرتا۔“

(بخاری کتاب الرقاق بروایت سعد بن عباسؓ مسلم)

گویا انسان کی آرزوئیں اتنی زیادہ ہیں کہ تمام کی تمام پوری نہیں ہو سکتیں۔ جب ایک کی تکمیل ہوتی ہے تو دوسری کمر بستہ ہو جاتی ہے اور اس طرح نہ ختم ہونے والا چکر چار کی دہائی رہتا ہے۔

غالب نے کیا خوب کہا ہے:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم لگے

بہت لگے میرے ارماں لیکن پھر بھی کم لگے

انسان کی کئی خواہشات ایسی ہوتی ہیں جو اس دنیا میں پوری نہیں ہوتیں اور وہ آخر کار

مسر تون کا روپ دھالتی ہیں۔

لہذا اسلام میں صرف جائز متناؤں کے حصول کی معتدل مساعی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے اور تلقین کی گئی ہے کہ وہ ایک ہی گوشے میں ہاتھ پاؤں باندھ کر نہ بیٹھ جائے بلکہ اس دنیا میں پورے جوش و خروش اور تندگی سے عمل میں مصروف رہے اور اپنی خدا داد صلاحیت و اہلیت کو بروئے کار لاتے ہوئے عملی جدوجہد کا مظاہرہ کرے۔ اللہ اس کی محنت میں برکت ڈالتا ہے۔ مشقت سے گھبراتا اور پہلو تپتی کرنا اسلام کے منافی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

”یعنی ہم نے انسان کو محنت و مشقت میں پیدا کیا۔“ (پ 30، الکبہ 9، ع 1)

اسلام میں ہر صاف اور ستھری چیز کھانے کی اجازت ہے۔ ”اے انسانو! جو چیز زمین میں صاف ستھری ہے اسے کھاؤ۔“ (پ 2، بقرہ 2، ع 2)

”خدا تعالیٰ نے جو حلال و مرغوب رزق تمہیں دیا ہے کھاؤ۔“ (پ 7، المائدہ 5، ع 2)

نیز فرمایا:

”گھوڑوں، نچروں اور گدھوں کو پیدا کیا تاکہ تمہاری سواری کا کام دیں اور زینت بنیں اور وہ بھی پیدا کیا جو تم (عرب) سارے لوگ نہیں جانتے۔“ (پ 14، النحل 6، ع 1)

قرآن مقدس ایسی آیات سے بھی معمور ہے۔ اس نے ضروریات زندگی کو آسائشات (Comforts) کی حد تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ بڑی فیاضی سے زیب و زینت اور آرائش و زیبائش (Luxuries) سے بھی مناسب استفادہ کرنے کی اجازت دی ہے۔ یاد رہے رب العزت نے تمام اشیاء انسان کے استعمال اور افادہ کے لئے پیدا کی ہیں۔ ان بہت سی اشیاء کی تخلیق کا مقصد یہی ہے کہ انسان ان سے جائز حدود تک استفادہ کرے۔ کوئی چیز بھی بے فائدہ پیدا نہیں کی گئی۔ چنانچہ قرآن مقدس میں ارشاد ہوتا ہے:

”اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بیکار پیدا نہیں کی۔“ (العران پ 4)

اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اللہ کی کسی شے کو بیکار اور فضول خیال نہ کرے بلکہ ان سے استفادہ کرنے کی کوشش کرے۔ تاہم حلال و حرام کی تمیز روا رکھے جن سے اللہ نے منع کیا ہے رک جائے اور جن کے استعمال کی اجازت بخشی ہے ان سے فائدہ حاصل کرے۔

مولانا محمد حفظ الرحمن نے تعریف یوں کی ہے:

”لغت کی زبان میں قصد اور اقتصاد (میانہ روی) اور اچھے چلن کا نام ہے۔ مگر عملی اور علمی اصطلاح میں ایسے وسائل کی ”دریافت“ کو کہتے ہیں جو دولت و ثروت کے پیدا کرنے کے مناسب طریقے اس کے خرچ کے صحیح استعمال اور اس کی ہلاکت و بربادی کے حقیقی اسباب بتا سکیں۔ اس لئے علم والا اقتصاد اس علم کا نام ہے جو ان ذرائع سے بحث کرتا اور ان کے صحیح و غلط ہونے پر مطلع کرتا ہو۔ علم والا اقتصاد اس معنی کے اعتبار سے دو حصوں پر منقسم ہے۔ ایک ”انفرادی یا



منزلی“ اور دوسرا ”اجتماعی“۔ ہماری بھی کا نقطہ نظر اجتماعی اقتصاد ہے۔ اس لئے کہ یہی زندگی کی اصل بنیاد ہے اور انفرادی و منزلی اقتصاد کے لئے دلیل راہ ہے۔“  
نور محمد غفاری کہتے ہیں:

”اسلامی معاشیات ان وسائل کے علم کا نام ہے جنہیں انسان استفادہ کے لئے استعمال کرتا ہے جس میں اسے تحران بنایا گیا ہے تاکہ اس طرح شریعت کے مقررہ نیچ کے مطابق فرد اور معاشرہ کی حاجات کی تکمیل ہو۔“  
معروف مسلم سکالرز نے علم معاشیات کو جن ناموں سے موسوم کیا ہے وہ یوں ہیں:

(i) ”گھریلو اور کاروباری تدبیر منزل“

(Management of Household and Business)

(ii) ”سیاست المدن“ (سیاست المدن) (Plitical Economy)

(iii) ”المعاش“ (Economics)

فارابیؒ (م 950) ابن سینا (1037-980) کی کتب میں بھی معاشی موضوعات پر مباحث کے گئے ہیں۔ محمد بن حسن طوسیؒ کی کتاب ”اخلاق ناصری“ میں قین طویل عنوانات پائے جاتے ہیں۔

محمد بن حسن طوسیؒ (م 1274ء) نے معاشیات کی درج ذیل تعریف بیان کی:

”سیاست المدن (Plitical Economy) وہ علم ہے جس میں عوامی بہبود کے قوانین (Laws of Public Welfare) کا مطالعہ کیا جاتا ہے جس کا مقصد اس تعداد کو فروغ دینا ہے جس کے نتیجہ میں حقیقی ترقی کو فروغ حاصل ہو اس کا نفس مضمون معاشرے کے اس ڈھانچہ کا مطالعہ ہے جو انسانوں کے مل جل کر رہنے سے وجود میں آتا ہے اور ان کی سرگرمیوں کے خراج کے طور پر کام کرتا ہے اور ان کے پیشوں میں مہارت سے ہدایت حاصل کرتا ہے۔ پس ہر فرد اپنے پیشے پر توجہ دیتا ہے ایسا وہ اس پیشے کی اچھائی یا برائی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے کرتا ہے کہ اس کا تعلق اس پیشے سے گہرا ہوتا ہے اور وہ اس میں سماجی ضرورت کے تحت مہارت حاصل کرتا ہے۔“

علامہ ابن خلدونؒ نے اپنی کتاب ”مقدمہ تاریخ“ میں المعاش کی تعریف یوں کی ہے:

”معاش رزق ڈھونڈنے اور اسے حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنے کا نام ہے۔“

الحریری کی تعریف:

”معاش سے مراد یہ ہے کہ انسان تجارت، زراعت اور صنعت کے

ذریعہ اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرے۔“

اس تعریف کی خصوصیات یہ ہیں:

- (i) قرآن و سنت پر مبنی ہونا
- (ii) اخلاقی و انسانی اقدار کی وقعت اجاگر کرنا
- (iii) مطلوبہ ہدف کا حصول
- (iv) قدرتی وسائل کی دریافت و موزوں استعمال
- (v) قومی اہلیت کی اہمیت
- (vi) غربت کا قلع قمع
- (vii) صبر و استقلال کا درس
- (viii) معاشیات بطور سماجی علم
- (ix) اعلیٰ مقاصد کا اشارہ
- (x) صبر کی تلقین



# اسلامی معیشت کی بنیادی اقدار

## اللہ کی رزاقیت

اسلام کے نظریہ حیات میں اللہ جبارک و تعالیٰ دنیا کی ہر جائیداد چیز کو رزق مہیا کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں رزق یا معاش کا تعلق صرف اللہ سے ہے اور وہی جائیداد کی معاشی زندگی کا کنٹرل ہے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

”اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کے رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے اور تمہارا رزق اور جس شے کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے آسمان میں (یعنی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہیں) ہے۔“ (الذاریات)

مندرجہ بالا آیات سے واضح ہے کہ رزق (معیشت) اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت ہے جس سے فائدہ حاصل کرنے کا حق ہر شخص کو مہیا ہے۔ اسلامی معیشت میں حق معیشت کو سب کے لئے برابر رکھا گیا ہے مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام کو ایک ہی قسم کا رزق حاصل ہو۔ معیشت میں تفاوت پایا جاتا ہے لیکن اسلامی معیشت اس بات کی دہائی ہے کہ اس فطری تفاوت کے باوجود کوئی فرد بھی معیشت سے محروم نہ رہنے پائے چونکہ ہر جاندار کو رزق اللہ تعالیٰ دیتا ہے لہذا کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے حق معیشت میں دخل انداز ہو سکے۔

قرآن کریم میں ارشاد اللہ عزوجل ہوتا ہے:

ولا تمدن عبیک الی ماعتنا به ازوجنا منهم زھة الحیوة الدنیا لنتھم فیہ و رزق ربک خیر و ابقی۔ (طہ: 131)

رزق فراہم کرنے والی خدائے ذوالجلال والا کرام کی ذات اقدس ہے۔ اس کی قدرت کاملہ سے انسان کو رزق فراہم ہوتا ہے۔ اگر وہ روزی بند کر دے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے میسر نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اسباب معاشی کا خالق و مالک وہی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد گرامی یوں ہے۔

ان اللہ هو الرزاق ذو القوة المتین۔

”بے شک خداوند تعالیٰ ہی رزق دینے والا ہے اور بڑی قوت والا ہے۔“

مزید آں ایک دوسرے مقام پر اس طرح فرمایا گیا ہے:

وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا۔

”یعنی زمین پر چلنے والی کوئی ایسی مخلوق نہیں جس کی روزی کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے

لی ہو۔“

کتاب پاک میں ایک اور جگہ اسے یوں بیان کیا گیا ہے جس کو تم خدائے گرامی کے علاوہ پوجتے ہو وہ تمہاری روزی کے مالک نہیں ہیں۔ تم صرف اللہ تعالیٰ کے ہاں رزق تلاش کرو۔ کیونکہ وہی رزق دینے والا ہے۔

اسی طرح سورۃ الجمعہ میں فرمان رب العالمین ہوا:

واللہ خیر الرازقین۔

”اور رب تعالیٰ سب روزی دینے والوں میں سے بہتری روزی دینے والا ہے۔“

سورۃ انعام میں ہے اپنی اولاد کو روزی کے خوف سے قتل نہ کرو۔ روزی کا ذمہ اللہ تعالیٰ

نے لیا ہے۔

سورۃ النذریات میں اسے اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وفی السماء رزقکم وما توعدون۔

”رزق کا اللہ تعالیٰ نے تم سے وعدہ کیا ہے۔“

اسی طرح سورۃ نمل میں ارشاد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی سب کو زمین و آسمان میں روزی

دیتا ہے اور وہی حقیقی معبود ہے کیونکہ اسی کے فضل رزق نصیب ہوتا ہے۔

رسول مقبول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا:

”جو اللہ تعالیٰ سے نہیں مانگتا رب تعالیٰ اس پر غصہ فرماتے ہیں۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رزق عطا کرنے والی رب کریم کی ذات باریکات ہے۔

ارشاد اللہ عزوجل ہوتا ہے:

”جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کا ہے اور اسی کی عبادت ہے۔“ (النمل 52)

یعنی سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی دینے والا ہے اور اسی سے رزق وافر کی توقع رکھنی چاہئے

کیونکہ کہا گیا ہے:

لا تقنطوا من رحمۃ اللہ

”اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہئے۔ سب کچھ اسی کے قبضہ قدرت میں

ہے۔“

## رزق کے درجوں میں فرق:

خدا کی فلسفہ زندگی میں اگرچہ حق معیشت میں سب یکساں ہیں لیکن حصول معیشت (دولت) میں مساوی نہیں ہیں۔ حصول معیشت میں نئی نوع انسان کے درمیان مختلف درجات کا تفاوت ایک فطری بات ہے۔ معیشت یا پیدائش دولت کا تعلق انسان کی ذہنی اور جسمانی استطاعت پر منحصر ہے لہذا یہ ضروری نہیں کہ سامان معیشت (معیار زندگی) سب کے لئے ایک قسم کا ہو لیکن یہ لازمی ہے کہ سامان معیشت ہو۔ سب کے لئے اسلامی معیشت میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ کسب معاش (Earning) میں درجات کے تفاوت کو اعتدال پر قائم ہونا چاہئے۔ ایسا نہیں کیا جاتا چاہئے کہ معیشت انسانوں کو طبقوں میں بانٹ دے اور ایک طبقہ کی معاشی ترقی دوسرے طبقہ کی افلاس و غربت کا سبب بن جائے یا ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ کے معاشی اغراض و مقاصد کا آلہ کار بنا دیا جائے۔ قرآن کریم میں اس طرح ہے:

”دنیوی زندگی میں ہم نے لوگوں کی معیشت ان کے درمیان تقسیم کر دی ہے اور اس طرح کر دیا ہے کہ بعض کو دوسرے بعض پر درجہ معیشت میں بلندی حاصل ہے۔“

(سورۃ زخرف: 30)

ایک اور مقام پر یوں آیا ہے:

”اللہ جس کے لئے چاہتا ہے رزق میں فراخی دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگی پیدا کرتا ہے۔“ (الرعد 3)

## فراخی اور کفالت:

خالق کائنات نے معاش کے سلسلے میں فراخی دی ہے لیکن ایسے لوگوں کو یہ تنبیہ بھی کی ہے کہ تم اپنی دولت میں سے دوسروں کو بھی کفالت کرتے رہو اور اللہ کی راہ میں بھی خرچ کرتے رہو۔ عقیدہ کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایک امتحان میں ڈال دیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ وہ بندوں کو جن کو دولت عطا کی ہے انہیں آزمائے کہ وہ اللہ کی راہ میں ثابت قدم ہیں یا نہیں۔ جو لوگ احکام الہی سے منحرف ہوں گے ان کے لئے سخت عذاب کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اگر متمول حضرات احکام خداوندی کی پیروی کرتے ہیں اور اپنی دولت میں دوسروں کو بھی جو مستحق ہیں شریک کر لیا کریں تو اجتماعی خوشحالی پیدا ہو سکتی ہے۔ انفرادی خوشحالی کو اس طرح اجتماعی خوشحالی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے اور احکام الہی کے نفاذ کے لئے خلیفہ وقت کو اللہ کا نائب کہا گیا ہے جو اس کے احکام کی پیروی کرتا ہے۔

## معیشت اور اخلاق کا باہمی تعلق

کسی بھی ریاست کے تشخص کو برقرار رکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی بنیاد ہوگی۔ قرآن و سنت کی روشنی میں ہم پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بنیاد فضائل اخلاق ہے۔ جس شیعہ کو قرآن و سنت نے خیر کہا ہے وہ مثبت سیاسی رویہ ہے اور یہ سوچ اسلامی ریاست کو عظمتوں کے آخری قرینے تک لے جاتی ہے جبکہ رذائل اخلاق میں سے چاہے کوئی مرض رذیلہ ہو اسلامی ریاست کی اقدار کو تباہ و برباد کرنے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ”قرآن و سنت کی اخلاقی تعلیمات کا اسلامی ریاست سے گہرا تعلق ہے۔“

ہمارے ماحول میں ہر طرف رذائل اخلاق کے ہر کارے پھر رہے ہیں اور ہم صرف غم آشیاں کر کے مطمئن ہو جائیں یہ کافی نہیں بلکہ جہن بچانے کے لئے میدان عمل میں اترنا ہوگا۔ اس سلسلہ میں فضائل اخلاق ہم نے اپنانے ہیں اور رذائل اخلاق سے اپنے آپ کو باز رکھنا ہے۔ ذیل میں سیاسی پہلو کو مد نظر رکھ کر اسلامی ریاست میں ”سیاسی رویوں“ پر اپنا نقطہ نظر پیش کیا جائے گا:

### باہمی اخوت و محبت کا فروغ:

قرآن و سنت کی روشنی میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ سیاسی رویوں میں جس رویہ کی اصلاح سب سے پہلے ضروری ہے وہ باہمی اخوت و محبت سے متعلق ہے۔ جب تک کسی بھی اسلامی ریاست میں یہ جذبہ عام نہیں ہو جاتا اُس وقت تک معاشرہ میں کسی بھی مثبت تبدیلی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا۔

مسلمانوں میں وہی اخوت و محبت کا جذبہ اور ولولہ جو انصار و مہاجرین میں موجود تھا جب تک پیدا نہیں ہو جاتا اُس وقت تک ملت اسلامیہ جسد واحد کی صورت اختیار نہیں کر پائے گی جس کی ہمیں بہت ضرورت ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کا خیال بالکل اس طرح رکھنا چاہئے جس طرح آئندہ دوسرے اعضاء جسم کا رکھتی ہے۔

جب اس پر عمل ہو گا تو انشاء اللہ مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق اور خلوص و محبت کو فروغ حاصل ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ کی ساری امت جسد واحد نظر آئے گی جس کی تشکیل کے لئے قرآن حکیم نے بھی عقیق اسلوب کے ساتھ تاکید فرمائی ہے:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ (النساء: 1)

”اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تمہیں ایک ہی اصل سے پیدا کیا۔“

دوسری جگہ فرمایا:

انما المؤمنون اخوة فاصلحوا بين اخويكم (المحجرات: 10)  
 ”مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں لہذا اپنے بھائیوں کے درمیان صلح صفائی کروا دیا کرو۔“

باہمی اخوت و محبت کا درس جتنا رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے ملتا ہے اتنا کسی بھی مصلح کے ملحوظات سے نہیں ملتا۔ سیاسی رویوں کو بہتر بنانے کے لئے آپ ﷺ نے باہمی اخوت و محبت کے حسن اخلاق کو معاشرہ میں رائج کرنے پر بہت زور دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنے لئے خیر و برکت کا ہی طالب ہوتا ہے تو لازماً اسے اپنے بھائی کے لئے بھی خیر و برکت کا ہی طالب رہنا چاہئے۔ درج ذیل احادیث مبارکہ پر عمل کرنے سے دھوکا، فریب اور شر و فساد کی ساری راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضا وشك بين اصابعه (متفق علیہ)  
 ”مومن مومن کے لئے عمارت کی مثل ہے جس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کو مضبوط کرتی ہے۔“

جس طرح ہر اینٹ عمارت کا حصہ ہے اسی طرح ہر مسلمان اسلامی معاشرے کا حصہ ہے اور اسلامی معاشرہ افراد کی اصلاح ہی سے صاف ستھرا مضبوط اور توانا ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

مثل المؤمنین في توادهم و تراحمهم و تعاطفهم مثل الجسد اذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى (متفق علیہ)

”مومنوں کی مثال ان کے آپس کی محبت و شفقت، رحم دلی اور مروت، مہربانی اور حسن سلوک میں ایک جسم کی طرح ہے جب اس کا کوئی عضو بیمار ہوتا ہے تو سارا جسم جاگتا ہے اور اس کو بخارا آ جاتا ہے۔“

آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

لا يؤمن احدكم حتى يحب لاجيه ما يحب لنفسه (متفق علیہ)  
 ”تم میں سے کوئی شخص (کامل) مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی بات پسند نہ کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔“

**ظلم کا منفی سیاسی رویہ:**

اسلامی ریاست میں ظلم کا منفی رویہ بہت زیادہ رائج ہوتا جا رہا ہے۔ ایک دوسرے کے حقوق کا خیال نہ رکھنا، ناجائز طور پر کسی کا مال غصب کرنا، لوگوں کی عزتوں کے ورپے رہنا، حق

بات نہ تو خود کہنا اور نہ دوسروں کو کہنے دینا ناجائز پابندیاں طرح طرح کی خرافات یہ سب منافی امور ظلم کے ہی مختلف ہیں حالانکہ کسی بھی شے کا وقار اگر قائم رکھنا ہے تو پھر وہ شے جس مقصد کے لئے بنائی گئی ہے اس کو اس مقصد میں ہی استعمال کرنا چاہئے۔ اگر اس کا محل تبدیل کر دیا تو ایسا ہر عمل ظلم کی تعریف میں آ جائے گا جو کہ بہت زیادہ مذموم فعل ہے۔ سیاسی اقدار کو بھی تہہ بالا کرنے والا ہے اور ظلمتوں کو معاشرہ میں رائج کرنے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ظلم کے ضابطہ کو ریاست میں سے نکالنا اشد ضروری ہے۔

رسول اللہ ﷺ اس مضمون کو درج ذیل حدیث میں بیان کرتے ہیں:

”بجو ظلم سے کیونکہ قیامت کے دن یہ تاریکیاں ہیں اور بجو تم بخیل سے کیونکہ بخیل نے تم سے پہلے لوگوں کو تباہ کیا اس کی وجہ سے انہوں نے خون کئے اور حرام کو حلال کیا۔“ (صحیح مسلم)

**بدعنوانی ملت کیلئے زہر قاتل:**

بدعنوانی کی وجہ سے سیاست میں ”کلمہ طیبہ“ پر مبنی ”معاہدہ عمرانی“ کے بجائے ہوس اقتدار غالب آ جاتا ہے۔ اس مذموم صفت کی وجہ سے ہی قانون کے غلبہ کی جگہ حاکم کا غلبہ سیاسی مقصود بنتا ہے جس کی وجہ سے جو حالات ریاست میں پیدا ہوتے ہیں ان کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

بدعنوانی کی وجہ سے بالادست طبقہ کا ذہن نشاط کاری کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور پھر اخلاق رذیلہ کا میلان پیدا ہوتا ہے جس سے چوری، ڈاکا، اغواء، ظلم، بھوک، لا قانونیت، طبقاتی کشمکش اور علاقائی عصبیت عام ہوتی ہیں اور سب امور یقیناً فرد ملت کے لئے بھی زہر قاتل ثابت ہوتے ہیں۔ سیاسی نظام اپنی احسن بنیادوں کے ساتھ منہ چمپانے میں ہی اپنی عافیت سمجھتا ہے۔ پھر ایسے ماحول میں فہم و فراست والے لوگ بھی مجبوراً احساس غم کی چادر اوڑھ کر سو جاتے ہیں۔ پھر کسی بھی مثبت تبدیلی کا واقع ہوتا بہت زیادہ مشکل ہو جاتا ہے لہذا اسلامی ریاست میں سیاسی رویوں کو مثبت بنانے کے لئے اپنے آپ کو رذائل اخلاق سے دور رکھنا نہایت ضروری عمل ہے اور ان رویوں کے حسن کو دوبالا کرنے کے لئے فضائل اخلاق اپنانا نہایت ضروری ہے۔

**ظلم کے مختلف طریقے:**

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ظلم و زیادتی کی مذکورہ اشکال آخر کیوں معاشرہ میں رائج ہیں؟ ہمارا سیاسی نظام کیوں اتنا مظلم نہیں کہ معاشرتی اقدار کو سہارا دے سکے؟ اس کی وجہ ہمارا رویہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو برتر سمجھتے ہیں اور دوسرے کو کمتر سمجھتے ہیں۔ بات بات پر دوسرے لوگوں کی تحقیر کرنا ہمارا مشغلہ بن چکا ہے۔ شاید ہم یہ سمجھنے لگے ہیں کہ عزتوں کے مالک ہم خود ہیں جس کو چاہے عزت دیں جس کو چاہے رسوا کریں۔ یقیناً یہ رویہ منفی سوچ کی عکاسی کر رہا



ہے۔ جب قرآن و سنت پر ہمارا ایمان بھی ہے تو پھر کیوں ادھر ادھر جھانکتے ہیں، غیروں کا منہ کیوں نکتے ہیں۔ فقط اپنے اللہ عزوجل پر کامل بھروسہ رکھیں۔ عزت دینے والا اور ذلت دینے والا بھی فقط وہی ہے۔ جب یہ سوچ انسان کے اندر پیدا ہو جائے گی تو ظلم و زیادتی کی تمام اشکال اپنے آپ دم توڑ جائیں گی، معاشرہ کا حسن و وبالا ہوگا، سیاسی اللہ ار میں بھی استحکام آئے گا۔ قرآن میں عزت و ذلت دینے کے بارے میں بیان ہوتا ہے:

”اور (اللہ) جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے ساری بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے۔ بیشک تو سب کچھ کر سکتا ہے۔“ (آل عمران: 26)

**اقتدارِ اعلیٰ کا مالک اللہ:**

اسلامی ریاست میں حکمرانوں کے پاس نیابتی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ وہ قوم کے خادم ہوتے ہیں کیونکہ شریعت مطہرہ میں حاکمیت مجازی کی یہی تقریف ہے۔ عوام کے پاس بھی سارے اختیارات نہیں ہوتے۔ یہ جو جمہوریت کا نعرہ لگایا جاتا ہے اس سلسلہ میں یاد رہے کہ ہم مغربی جمہوریت کے طرز حکومت کے قائل نہیں ہیں۔ اس میں یہ ہوتا ہے کہ اکثریت کی بنیاد پر قانون سازی کی جاتی ہے حالانکہ اسلامی ریاست میں قانون سازی کا بالذات اختیار فقط اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات کو ہے۔ اقتدارِ اعلیٰ کا مالک صرف اللہ عزوجل ہے لہذا بندہ نیابتی طور پر حکومت و قانون کے معاملات سرانجام تو دے سکتا ہے مگر اقتدارِ اعلیٰ کا جو تصور ہے وہ فقط اللہ جل و مجدہ الکریم سے متعلق ہے۔

**حاکمیت اللہ تعالیٰ ہی کی ہے:**

”رات لاتا ہے دن کے حصے میں اور دن لاتا ہے رات کے حصے میں اور اس نے کام میں لگائے سورج اور چاند ہر ایک ایک مقرر میعاد تک چلتا ہے۔ یہ اللہ تمہارا رب اسی کی بادشاہی ہے اور اس کے سوا جنہیں تم پوجتے ہو وہ خدما کے چھلکے تک کے مالک نہیں۔“ (فاطر: 13)

**اسلامی مملکت کے فرائض:**

اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات کو برتر ماننے والی اسلامی ریاستیں ہر لحاظ سے اللہ تبارک و تعالیٰ کے حکم کی پابند ہیں۔ اس لئے اسلامی ریاست پر یہ نظریہ کچھ فرائض عائد کرتا ہے جن کو بلا جوں و چرا تسلیم کرنا ضروری ہے اور ان کا نفاذ ناگزیر ہے ورنہ دوسری صورت میں ایسی ریاست کا کوئی مثبت تعلق قرآن و سنت کی تعلیمات سے نہ ہوگا۔ قرآن مجید میں اسلامی مملکت کے جو فرائض بیان ہوئے ہیں ان میں سے چند ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں:

”وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں زمین میں قابو دیں تو نماز پر پار نہیں اور زکوٰۃ دیں اور بھلائی کا حکم کریں اور بُرائی سے روکیں اور اللہ ہی کے لئے سب کاموں کا انجام۔“ (الحج: 41)

درج بالا آیات مقدسہ میں چار فرائض درج ہیں جن کا نفاذ اسلامی مملکت کا قریضہ ہے:

- 1- نماز قائم کرنا
- 2- زکوٰۃ کی ادائیگی کو لازمی بنانا
- 3- نیکی کا حکم دینا
- 4- برائی سے روکنا

### اسلامی مملکت کی تعلیمی پالیسی:

تعلیم ہماری بنیاد ہے اگر بنیاد ہی نہیں تو پھر عمارت کا وجود تخیلاتی تو قائم ہو سکتا ہے مگر اس کا حقیقی دنیا کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو گا لہذا اسلامی مملکت کی تعلیمی پالیسی شریعت مطہرہ کے عین مطابق ہونی چاہئے۔ ہمیں مغربی اقدار سے کیا لینا دینا جب اپنی بنیاد کو چھوڑیں گے تو پستیاں ہمارا مقدر تو ضرور بنیں گی۔

قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”اور مسلمانوں سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سب کے سب نکلیں تو کیوں نہ ہو کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے کہ دین کی سمجھ حاصل کریں اور واپس آ کر اپنی قوم کو ڈر سناکیں اس امید پر کہ وہ بھیجیں۔“ (التوبہ: 122)

### اسلامی مملکت کی معاشی و معاشرتی پالیسی:

ارشاد رب العالمین ہے:

”اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو مغلی کے ڈر سے ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی بے شک ان کا قتل بڑی خطا ہے اور بدکاری کے پاس نہ جاؤ بے شک وہ بے حیائی ہے اور بہت ہی بُری راہ اور کوئی جان جس کی حرمت اللہ نے رکھی ہے ناحق نہ مارو اور جو ناحق مارا جائے تو بے شک ہم نے اس کے وارث کو قابو دیا ہے تو وہ قتل میں حد سے نہ بڑھے ضرور اس کی مدد ہوتی ہے اور جہنم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر اس راہ سے جو سب سے بھلی ہے یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو بچنے اور عہد پورا کر دے بے شک عہد سے سوال ہوتا ہے اور ماپو تو پورا ماپو اور برابر ترازو سے تولو یہ بہتر ہے اور اس کا انجام اچھا۔“

درج بالا آیات میں جو معاشی و معاشرتی اصول و ضوابط بیان ہوئے ہیں ان کو ذیل میں احاطہ تحریر میں لایا جا رہا ہے:

- 1- یہود آبادی کا نعرہ لگا کر چھوٹے خاندان کا ملک میں چار سو پر چار انتہائی مذموم فعل ہے۔ اس سے حکومتیں بازریں بلکہ یہ عمل قرآن مجید کی روشنی میں قتل کے زمرے میں آتا ہے کیونکہ مغلی کے خوف سے زیادہ بچے نہ ہونے دینا قتل کا ہی ایک پڑھا لکھا

ضابطہ ہے۔

- 2- رزق دینے والا مالک حقیقی ہے، صرف اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ اپنی تدابیر پر تکیہ ہرگز نہیں کرنا چاہئے۔
- 3- بدکاری معاشرتی اقدار کو سرے سے ہی ختم کر دیتی ہے لہذا اس کی روک تھام بھی حکومت وقت کے ذمہ ہے بلکہ یہ معاملہ تو اتنا نازک ہے کہ حدود اللہ میں داخل ہے۔
- 4- ناحق قتل کرنا انتہائی مذموم فعل ہے، اس کی روک تھام کے لئے بھی شرعی سزائیں نافذ کرنی چاہئیں۔
- 5- قصاص بھی حکومت وقت کے ذریعے ہی لیا جائے گا۔
- 6- یتیم کا مالک غصب کر کے کھانا صریحاً حرام ہے۔
- 7- وعدوں کو وفا کرنا بھی معاشرتی حسن کو قائم کرنے کے لئے اور معیشت کی اصلاح کرنا انتہائی ضروری عمل ہے۔
- 8- ناپ تول کے معاملہ میں بھی مقررہ شرعی ضابطہ پورا کرنا ضروری ہے۔

### سیاست کا اخلاق سے ربط و تعلق:

سیاست کا اخلاق کے ساتھ بخوبی رشتہ قائم ہے، کوئی ایسا سیاسی رویہ نہیں جو اخلاقیات کے تابع نہ ہو۔ اس آخری نکتہ میں سیاست اور اخلاق کے باہمی تعلق کو فرائض کی ادائیگی کے نقطہ نگاہ سے پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

”پس وہ امیر جو لوگوں پر حکمران ہے اس سے اس کی ذمہ داریوں کے متعلق پوچھا جائے گا۔“ (صحیح بخاری)

برخس اللہ تعالیٰ کے ہاں جواب دہ ہے۔ یہ مسئولیت اخلاقیات ہی تو ہے کہ ایک دن میں نے اللہ عزوجل کے حضور حاضر ہوتا ہے، کچھ تو نیک اعمال کر جاؤں۔ اپنی اسلامی ریاست کی سیاسی اقدار کو کچھ نہ کچھ تو مجھے مضبوط کرنا چاہئے۔ اب ذرا بتائیے کہ سیاست کا اخلاق کے ساتھ تعلق نہیں تو پھر کس سے ہے۔ اس شعبہ میں بھی انسان فرائض کی ادائیگی سے اپنے آپ کو وابستہ کرتا ہے تو اخلاق ہی کی وجہ سے بلکہ فرائض کی ادائیگی اور اخلاقیات ہم معنی و مفہوم الفاظ ہی تو ہیں۔ پس اس خیرائے میں ہماری مذکورہ بحث کو دیکھنا ہو گا تو تمام نکات میں سیاست اور اخلاق کا باہمی ربط بخوبی نظر آئے گا۔ آخر میں فرائض کی ادائیگی کے سلسلہ میں ہی ایک حدیث مبارکہ ملاحظہ فرمائیں:

”قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب اور اس کے زیادہ قریب عادل حکمران ہو گا اور سب سے زیادہ مبغوض اور سب سے زیادہ دور عالم ہو گا۔“

## معیشت میں تقویٰ کا کردار

اسلامی تعلیمات میں تقویٰ کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے معنی کسی نقصان دو شے سے محفوظ رہنا اور بھتاناب برتنا ہے۔ اس کا مفہوم ڈرتے، گھرائی و پاسانی کرنے، حفاظت دلانے اور بچاؤ لئے بھاتے ہیں۔

تقویٰ عربی لغت میں ”وقی“ سے مشتق ہے۔ اس سے مصدر الوقایۃ رقاء کا معنی۔ حفظ النفس مما یوذیه و یضره۔

”کسی چیز کو مضر اور نقصان پہنچانے والی چیزوں سے بچانا۔“

بناء بریں لفظ تقویٰ کا لغوی مفہوم یوں بیان کیا جاتا ہے۔

جعل النفس فی وقایۃ مما یخاف۔

”تقویٰ سے مراد نفس کو ہر اس چیز سے بچانا جس سے اسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔“ اس طرح اصطلاح شریعت میں تقویٰ:

حفظ النفس عما نولم۔

”نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کا نام ہے جو گناہ کا موجب ہو۔“

یتم ذالک ینوک بعض جاحات۔

مگر یہ تو عوام الناس کا تقویٰ ہے اہل اللہ اور خواص کے ہاں اس کا معیار یہ ہے:

”تقویٰ کے لئے بعض مباحات کو بھی ترک کرنا ضروری ہوتا ہے۔“

### اہم نکات:

یہ مندرجہ ذیل ہیں:

#### (1) مرکز:

حضرت کعب احبارؓ رسول اللہ ﷺ کے ایک مخلص صحابی تھے ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ نے ان سے سوال کیا کہ تقویٰ کیا ہے؟ حضرت کعبؓ نے جواباً پوچھا آپ کو بھی خار دار راستے پر چلنے کا اتفاق ہوا؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا ہاں کئی مرتبہ حضرت کعبؓ نے پوچھا تو پھر آپ وہاں سے کیسے گزرتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا میں اپنے کپڑے سمیٹ لیتا ہوں کہ مبادا کانٹے دامن سے الجھ جائیں اور بچ بچ کر احتیاط سے قدم رکھتا ہوں۔ حضرت کعبؓ نے جواب دیا۔ ”بس یہی تقویٰ ہے۔“ یعنی دنیا کے خارزار سے اس طرح گزر جانا کہ گناہ کا کوئی کانٹا دامن گیر نہ ہونے پائے اسی کا نام تقویٰ ہے۔

## تقویٰ کا مقام دل:

اس کا اصل مقام قلب انسانی ہے مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

”تقویٰ قلب کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ تقویٰ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بناء پر ہر کام میں خدا کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے۔“

اسی حقیقت کو حضور ﷺ نے زیادہ واضح طور پر بتاتے سے بیان کیا ہے ایک مرتبہ حضور ﷺ نے صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: التَّوَّابُ هَهُنَا (مسلم) تقویٰ یہاں سے یہ کہتے ہوئے آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے دل کی طرف اشارہ کیا۔ یعنی تقویٰ دل میں ہوتا ہے۔ اگر دل میں خوف خدا نہ ہو تو آدمی دیسے ہی منتہی ہونے کا اظہار کرے تو اسے ریاکاری کہا جائے گا۔ قرآن مجید میں مناسک حج کے ذکر میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنْ يَعْظَمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ (سورۃ الحج)

”اور جو شخص شعائر الہی کی تعظیم کرتا ہے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔ یعنی حقیقی تعظیم دل میں ہوتی ہے اگر دل میں تعظیم نہ ہو اور انسان بظاہر کبھی ہاتھ چومے اور کبھی پاؤں میں گرے تو یہ محض دکھاوا ہوگا۔“

## (2) ظاہر داری تقویٰ نہ ہونا:

حضور ﷺ کے اس ارشاد سے کہ ”التَّوَّابُ هَهُنَا“ سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ تقویٰ کا اصل مقام دل ہے۔ محض ظاہر داری تقویٰ نہیں ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ جب دل میں تقویٰ پیدا ہو جائے اور آدمی اللہ تعالیٰ کے احکامات کی اطاعت کرنے لگے اور اس کی نافرمانی سے ڈرنے لگے تو اس جذبے اور احساس کا عملی زندگی کے ہر شعبے پر نمایاں اثر ظاہر ہونے لگتا ہے۔ پھر وہ کپڑا پہنتا ہے تو اس میں احتیاط کرتا ہے۔ کھانا کھاتا ہے تو اس میں طیب اور غیر طیب کا خیال رکھتا ہے روزی کھاتا ہے تو اس میں حرام و حلال کی تمیز کرتا ہے۔ غرض کہ اس کی ظاہری وضع قطع بھی اس کے باطنی احساس کی آئینہ دار ہو جاتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر ایک شخص لباس کی خاص کانٹ چھانٹ اور بالوں کی مخصوص تراش خراش ہی کو تقویٰ سمجھنے لگے اور دل کی پاکیزگی کی پرواہ نہ کرے تو یہ تقویٰ نہیں ہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے بڑے واضح انداز میں بیان کیا ہے۔

## (3) معیار نیکی:

”نیکی اس بات کا نام نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق کی طرف پھیر لو یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی وہ ہے جو اللہ پر یوم آخرت پر فرشتوں پر اور کتابوں پر اور انبیاء پر ایمان لائے اور اپنا مال خوشی سے اقرباء پر یتیموں پر اور مسکینوں پر مسافروں اور سانکوں پر اور قیدی رہا کرانے پر خرچ کرے اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے اور نیک وہ ہیں جو اپنے وعدے پورے کریں اور سختی اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت صبر کریں یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔“

اس آیت سے معلوم ہوا کہ محض قبلہ رخ ہو جانا یا کعبے کی طرف پیٹھ نہ کرنا ہی نیکی نہیں ہے بلکہ دل کو قبلہ رخ کرنا اصل نیکی ہے دل جب اللہ تعالیٰ کے احکام پر خوشی سے عمل کرنے لگے تو پھر آدمی متقی کہلانے کا حق دار ہو سکتا ہے ورنہ ظاہر ادب آداب اور ظاہری وضع قطع جس کے ساتھ عمل کی سند نہ ہو تقویٰ کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔

## (4) مشکوک شے ترک کرنا:

بعض چیزوں کے متعلق تو ہم حتمی طور پر جانتے ہیں کہ یہ حرام ہیں مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ چند اشیاء کی بابت ہم شبہ میں پڑ جاتے ہیں کہ یہ حلال ہیں یا حرام۔ ایسے موقع پر مشتبہ چیزوں سے بچنا کہ کہیں اللہ کی نافرمانی نہ ہو جائے تقویٰ کہلاتا ہے ایک حدیث میں حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”حلال اور حرام دونوں عیاں ہیں لیکن ان کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں جنہیں اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں جو شخص مشکوک چیزوں سے بچ گیا وہ اپنے دین اور اپنی آبرو کو بچا کر لے لیا اور جو شخص مشکوک اشیاء میں پڑ گیا وہ حرام میں پڑ گیا۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مشتبہ چیزوں میں پڑنا حرام میں پڑنے کے مترادف ہے کیونکہ کسی ایسی چیز کو استعمال کرنا جس کے بارے میں دل مطمئن نہ ہو تقویٰ کے منافی ہے تقویٰ کا تقاضا تو یہ ہے کہ جب تک پورا پورا اطمینان نہ ہو کسی چیز کو استعمال نہ کیا جائے۔

جب کسی چیز میں شبہ پڑ جائے کہ یہ جائز ہے یا ناجائز تو مومن کا دل ہی فتویٰ دے سکتا ہے کہ اسے استعمال کیا جائے یا نہیں۔ کیونکہ کسی چیز کے حلال یا حرام ہونے کا اصل معیار دل کا اطمینان ہے جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ تقویٰ کا اصل مقام دل ہی ہے۔ اس لئے جب شبہ پڑ جائے تو دل سے پوچھنا چاہئے کہ آیا اسے استعمال کروں یا نہ کروں بعض اوقات ہم کسی مفتی کے فتویٰ کا سہارا دے کر مشتبہ چیز استعمال کر لیتے ہیں اور دل کو یہ جھوٹا اطمینان دلاتے ہیں کہ آخرفلاں مفتی کا فتویٰ بھی تو کچھ اہمیت رکھتا ہے حالانکہ اندر سے ہمارا اپنا دل مطمئن نہیں ہوتا ایسے موقعوں کے لئے حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب تک تمہارا دل مطمئن نہ ہو کوئی کام نہ کرو

حضرت دایہ رسول اللہ ﷺ کے ایک مخلص صحابی تھے ایک مرتبہ وہ یہی سوال لے کر حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:

”دایہ تم نیکی اور برائی کی حقیقت پوچھنے آئے ہو؟ انہوں نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ ﷺ۔ حضور ﷺ نے اپنا ہاتھ ان کے سینے پر رکھا اور تین مرتبہ فرمایا۔ استفت قلبک استفت قلبک استفت قلبک اپنے دل سے پوچھ اپنے دل سے پوچھ اپنے دل سے پوچھ۔ پھر آپ نے فرمایا: تقویٰ وہ ہے جس پر تمہارا دل مطمئن ہو جائے اور گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے چاہے لوگوں نے اس کے جواز کا فتویٰ دے دیا ہو۔“

(5) پرہیز کرتا:

مشکوک چیزوں سے اجتناب کی آپ ﷺ نے بڑی تاکید فرمائی ہے لیکن ساتھ ہی آپ ﷺ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ یہ احتیاط کہیں دوسرے کی شکل اختیار نہ کر لے اور آدمی خواہ مخواہ ہر بات میں شبہ کرنے کے مرض میں مبتلا نہ ہو جائے کیونکہ اس سے آدمی کو رہبانیت کی طرف لے جاتی ہے۔ انسان جب غیر یقینی حالت میں پھنستا ہے تو پھر وہ کسی کام کا نہیں رہتا اور جدوجہد ترک کر کے دنیا ہی سے الگ ہو جاتا ہے اور یہ چیز خست نقصان دہ ہے۔

(6) عزت کا مقام تقویٰ ہوتا:

دوسری اقوام کے برخلاف اسلام میں وقار کا معیار تقویٰ ہے۔ دنیا میں عام طور پر دولت اور طاقت کو عزت کا معیار سمجھا جاتا ہے یا بعض اوقات نسب یا خاندانی وجاہت کو فضیلت کا معیار تسلیم کر لیا جاتا ہے مگر اسلام نے ان تمام معیاروں کو رد کر کے تکریم و تعظیم کی کسوٹی تقویٰ کو قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ان اکرمکم عند اللہ التقکم۔ (الحجرات)

”اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تمام سے زیادہ متقی ہو۔“

اس کی تشریح حضور ﷺ نے حجتہ الوداع کے موقع پر بھی فرمادی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی عربی کو بھی پر یا بھیجو عربی پر یا کسی گورے کو کالے پر یا کالے کو گورے پر کوئی برتری نہیں سوائے تقویٰ کے یعنی برتری صرف اس بنا پر ہوگی کہ کون اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہے اور کون کم باقی سب معیار جھوٹے ہیں۔

(7) اللہ کو فقط تقویٰ پہنچتا:

اللہ کی راہ میں ہم صدقہ و خیرات کرتے ہیں قربانی دیتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں الغرض اس کی خوشنودی کے لئے بہت سے کام کرتے ہیں لیکن اللہ کو ان اشیاء میں سے کوئی چیز

نہیں پہنچتی۔ اسے جو کچھ پہنچتا ہے وہ جذبہ ہوتا ہے جو ان تمام اشیاء کے پیچھے کارفرما ہوتا ہے۔  
قرآن میں اس کی بڑی خوبصورت وضاحت بیان کی گئی ہے۔  
سورۃ الحج میں ارشاد باری تعالیٰ ہے اس طرح ہے:

لن ینال اللہ لحو مہا ولاد ماتوہا ولکن ینالہ التقویٰ منکم۔ (آیت 37)  
ترجمہ: ”(تم جو قربانی دیتے ہو) اللہ کو نہ اس کا گوشت پہنچتا ہے نہ خون بلکہ اللہ کو تو صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کو ہماری اشیاء نہیں پہنچتیں بلکہ ان کے پیچھے جو جذبہ کارفرما ہوتا ہے وہ پہنچتا ہے ایک قدسی حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے روز اللہ بندے سے فرمائے گا کہ میں بھوکا تھا تمہارے پاس آیا تو تم نے مجھے کھانا نہ کھلایا میں بیمار پڑا تو تم نے میری پیار پرسی نہ کی وغیرہ وغیرہ بندہ عرض کریں گا کہ اے اللہ تمہیں تو کھانے کی حاجت ہی نہیں ہوتی نہ ہی تم بیمار پڑتے ہو اللہ فرمائیں گا میرا فلاں بندہ جو بھوکا تھا تم نے اسے کھانا نہ کھلایا میرا فلاں بندہ بیمار پڑا تھا تو تم نے اس کی عیادت نہ کی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ کی خوشنودی کے لئے جو فرائض بھی ہم اس دنیا میں سرانجام دیتے ہیں وہ اللہ کو پہنچتے ہیں اور جو کوتاہیاں ہم سے سرزد ہوتی ہیں وہ بھی اس کے علم میں ہوتی ہیں۔

### (8) نیکیوں کی بنیاد:

ساری نیکیوں کی جان تقویٰ میں پنہاں ہے اور انہیں اس کے سبب ہی شرف قبولیت حاصل ہوتا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

”خدائے رحم و کریم متقیوں کے اعمال ہی قبول کرتا ہے۔“

### 9- رزق میں کشادگی:

خداوند بزرگ و برتر متقین کے لئے رزق کے دروازے کھول دیتا ہے۔ ارشاد ہے:

ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجاً دیروزقہ من حیث لا یحسب (سورہ طلاق: 302)  
”جو خدا سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے چھٹکارے کا سامان کر دیتا اور رزق دیتا ہے۔  
جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔“

### 10- امور میں سہولت:

اللہ تعالیٰ خدا ترس انسانوں کے امور میں آسانیاں اور سہولتیں پیدا فرماتا ہے اور اس کے راستے کی دشواریاں اور تکلیفیں دور فرماتا ہے۔ قرآن مجید کا فرمان ہے:



”جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کا کام آسان کر دیتا ہے۔“ (سورہ طلاق: 4)

### 11- بصیرت:

تقویٰ سے انسان میں آگاہی اور بصیرت پیدا ہوتی ہے جس کی بناء پر وہ اچھی اور بُری چیز میں امتیاز کر سکتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

ان تفلوا اللہ يجعل لکم فرقاناً. (سورہ انفال: 29)

”اگر تم تقویٰ اختیار کرو اللہ تعالیٰ تمہیں فرقان یعنی نیک و بد میں امتیاز کرنے والی صفت عطا کرے گا۔“

### 12- ہر دلعزیزی:

تقویٰ اور زہد لوگوں میں ہر دلعزیزی کا باعث بنتا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے بے رغبتی کرو تو لوگ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔

### 13- برکات کا نزول:

اللہ تعالیٰ متقیوں پر برکتوں اور رحمتوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔

سورہ اعراف کی آیت 94 میں ارشاد ہے:

”اور اگر بستی والے ایمان لے آئے اور پرہیزگاری اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکات کے دروازے کھول دیتے۔“

### 14- اللہ تعالیٰ کی معیت:

اللہ تعالیٰ خوف کھانے والے لوگوں کا ساتھ دیتا ہے۔ یہ کیا کم اعزاز ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہونے کا اعلان فرماتے ہیں:

واعلموا ان اللہ مع المتقين. (سورہ بقرہ آیت 194)

### 15- اخروی نعمتیں:

”جان لو اللہ تعالیٰ متقین کے ساتھ ہے۔ آخرت کی نعمتوں کا مستحق بھی متقیوں کو قرار دیا گیا ہے۔“

ارشاد ہے: والعاقبة للمتقين.

ترجمہ: ”عاقبت اہل تقویٰ کے لئے ہے۔“

سورہ حج میں ارشاد ہے:

”بے شک متقی باغوں اور چشموں میں ہوں گے (کہا جائے گا) ان میں امن و سلامتی کے ساتھ داخل ہو۔“

تقویٰ کے نتیجے میں مسومنوں کو ہر قسم کی اخروی نعمتوں سے نوازا جائے گا ان کے گناہ بخش دیئے جائیں گے اور جنت کے وارث قرار دیئے جائیں گے۔

### 16- گناہوں کا نیست و نابود ہو جانا:

اللہ تعالیٰ پر ہیز گاروں کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ سورۃ انفال کی آیت 29 میں ارشاد ہے:

”اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہو گے تو اللہ تمہارے لئے فرقان (حق و باطل میں تمیز کی قوت) پیدا فرمادے گا۔ تمہارے گناہ تم سے دور کر دے گا اور تمہیں بخش دے گا۔“

### 17- عبادات کا مطلوب:

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ.

(سورۃ بقرہ: 21)

”اے انسانو! تم اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم متقی بن جاؤ۔“

اس آیت کریمہ میں عبادت کا لفظ عام ہے اور ساری عبادات خواہ بدنی ہوں یا مالی سب پر حاوی ہے۔ ان عبادات کا مقصود تقویٰ پیدا کرنا فرمایا گیا ہے۔

روزہ کے متعلق ارشاد خداوندی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ

تَتَّقُونَ. (سورۃ بقرہ: 183)

”اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم پر ہیز گار بن جاؤ۔“

چونکہ روزہ سے انسان کے دل میں اللہ کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا ہوتا ہے۔ وہ خواہشات نفسانی کو دباتا ہے۔ اسے دوسروں کے دکھ کا احساس ہوتا ہے اور یہ باتیں تقویٰ ہی ہیں۔

نماز کے متعلق اللہ عزوجل کا فرمان ہے:

ان الصلوة تنهى عن الفحشاء والمنكر. (سورۃ عنکبوت: 45)

”نماز بے حیائی اور برائی کے کاموں سے روکتی ہے۔“

مکرات سے بچنا اور نیکیوں کی طرف راغب ہونا جو نماز کا نتیجہ ہے تقویٰ کہلاتا ہے۔ نماز کے وہ فوائد جو تفسیر سیرت میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ قابل غور ہیں۔

قربانی کی غرض و غایت بھی یہی ہے کہ دلوں میں تقویٰ پیدا ہو۔ سورۃ حج آیت 37 میں ارشاد ہے:

”اللہ تعالیٰ کو قربانی کے جانور کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔“  
سورۃ حج کی آیت نمبر 32 میں ارشاد ہوتا ہے:

”جو خدا کی نشانیں کی تعظیم کرتا ہے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔“  
اس آیت میں شعائر اللہ کی تعظیم کو دلوں کو تقویٰ بتایا گیا ہے۔

## 18- اخلاق کی منشاء:

اخلاق ایمان کے کمال کا سبب ہیں اور عبادات کے ہم پلہ ہیں۔ نیز وہ اللہ کے قرب اور محبت کا ذریعہ ہیں مگر ان اخلاق میں بھی یہ راز مضمر ہے کہ ان سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے اور یہی ان کی فضیلت کا اصل موجب ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

اغفلوا هو اقرب للتقویٰ.

”انصاف کرو انصاف کرنا تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔“

دوسری جگہ فرمایا:

”اگر تم معاف کرو یہ تقویٰ کے زیادہ نزدیک ہے۔“

عدل و انصاف اور عفو و درگزر اعلیٰ اخلاقی صفات ہیں۔ ان کو اختیار کرنے کی تلقین محض اس لئے کی جا رہی ہے کہ انہیں تقویٰ کا قرب حاصل ہو اور خود ان سے تقویٰ وجود میں آتا ہے۔

## 19- پریشانیوں سے نجات:

تقویٰ کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ ایسے افراد دکھ و غم اور حزن و ملال سے خلاص حاصل کرتے ہیں جیسا کہ ارشاد الہیہ اس طرح ہے:

”جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا اور نیک بن گئے تو ان پر نہ کوئی خوف طاری ہوگا اور نہ ہی وہ غمزدہ ہوں گے۔“

القصد۔ تقویٰ سے صارف میں ایسی چند صفات پیدا ہوتی ہیں جن کی بناء پر وہ خلاف شریعت نہ اشیاء تیار کرتا ہے نہ ہی ایسی چیزوں کا استعمال کرتا ہے۔ نیز اسراف و تجذیر سے بچتا ہے۔ سامانِ فحش سے گریز کرتا ہے۔ تبادلہ میں بھی اسلامی اصولوں کی پیروی کی جاتی ہے۔ کسی کو دھوکا یا نقصان نہیں پہنچایا جاتا دولت کی تقسیم میں بھی اچھی عادات کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ عاملین کے معاوضوں میں بھی حق تلفی نہیں کی جاتی۔ کسی کی معذوریٰ مجبوریٰ اور بے بسی سے ناجائز فائدہ

نہیں اٹھایا جاتا سرکاری پالیسیوں میں بھی تقویٰ کا عنصر غالب رہتا ہے جس سے ملک معاشی لحاظ سے آگے کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ معاشرتی بھلائی اور بہتری کے امور سرانجام دیے جاتے ہیں۔ ریاست بھی اپنا قبلہ درست کر لیتی ہے جس سے خزانہ بڑھتا ہے اور فلاحی و رفاہی کام تکمیل کو پہنچتے ہیں۔

## سیاست، معیشت اور معاشرت کا تعلق

سیاست:

اسلامی دنیا نے حقوں اسلامی زندگی کے بڑے جوش اور صداقت انگیز مظاہرے دیکھے ہیں۔ اسلامی دور حکومت میں سیاسی آچار کا اتنا غلبہ رہا ہے کہ صدیوں تک مسلمانوں کا دور بھی ان سے قائمہ اٹھتا رہا۔ اسلامی سیاست نے ایسے علماء پیدا کئے جنہوں نے چار سو سال تک یورپ کے سیاسی ماحول پر اثر ڈالا۔ ہمارے نظام نے سیاسی خیالات اور سیاسی رجحانات پیدا کئے جن کی قوت سے سیاسی کتابیں قلمبند کی گئیں۔ ان کتابوں کے نظریات نے مغرب کو نظریات دیئے جن کی موجودہ آواز ماضی سے ہم آہنگی کا ثبوت دے رہی ہے۔ آج سے صدیوں پہلے علماء سیاست کے متعلق وہ کچھ کہہ چکے ہیں جن کو عصر حاضر کے علماء نے آج اپنی زبان و قلم سے ادا کیا ہے۔

ابن خلدون "سیاست" کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"سیاست اس ذمہ داری کا نام ہے جس کی رو سے عام انسانی گہداشت (کفالت) کا کام پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے جس کے ذریعے خدا کی نپاتی حکومت بندگان خدا میں خدا کے قوانین کو نافذ کرتی ہے اور احکامات کے اجراء کو عمل میں لاتی ہے۔ اس کام میں انسانی بہتری اور مفاد عامہ کا لحاظ رکھتی ہے اور قانون (شرائع) کو فیصلہ کن قوت تسلیم کرتی ہے۔"

اسلامی عہد میں ارم بن ارم کے مکان میں خفیہ اجتماع سے امت کی تنظیم کا نتیجہ خیز کام شروع ہوا تھا جس کی تکمیل اس وقت ہوئی جب مدینہ طیبہ نبوت اور خلافت کا پایہ تخت بن گیا۔ مکہ میں ملت ابراہیمی کی شیرازہ بندی، بین الاقوامی تعلقات کے لئے اصول ہجرت کا اجراء اور اسلامی معاشرہ کے استحکام کے لئے اصول بیعت (اجتماعی حلقہ) کا نفاذ مدینہ میں انصار و مہاجرین کے بھائی چارہ کی تشکیل، بدر کی جنگ، حدیبیہ کی صلح، مکہ کی فتح، فتح کے بعد انسانی مساوات اور امن، آزادی اور اخوت کا اعلان عام، سلاطین عالم کے درباروں میں سفیروں کی روانگی، بیرونی سفیروں کی مدینہ میں ہاریائی، صوبائی تنظیم، حکام کا تقرر، فرامین کا اجراء اور سقیفہ کی

شورائی مجلس میں رائے عامہ سے منصب حکومت کا فیصلہ..... یہ ایسے کارنامے ہیں جن کا تعلق مرتاسر اسلامی سیاست سے تھا۔

### معیشت:

معیشت (رزق) اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت ہے جس سے فائدہ حاصل کرنے کا حق ہر شخص کو مساوی ہے۔ اسلامی معیشت میں حق معیشت کو سب کے لئے برابر رکھا گیا ہے مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام کو ایک ہی قسم کا رزق حاصل ہو۔ معیشت میں تفاوت پایا جاتا ہے لیکن اسلامی معیشت اس بات کی داعی ہے کہ اس فطری تفاوت کے باوجود کوئی فرد بھی معیشت سے محروم نہ رہے۔ ہر جاندار کو رزق اللہ تعالیٰ دیتا ہے لہذا کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے حق معیشت میں دخل انداز ہو سکے۔

قرآن کریم میں ارشاد اللہ عزوجل ہوتا ہے:

وَلَا تَمْلِكُنَّ عُيُنُكَ إِلَىٰ مَا مَعْنَاهُ مِنْ زُكَاةٍ أَوْ يُجَا مِنْهُمْ زُكَاةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لَنُفْتَنَهُمْ فِيهِ وَرِزْقٌ رَبِّكَ خَيْرٌ وَابْقَىٰ. (طہ: 131)

رزق فراہم کرنے والی خدائے ذوالجلال والا کرام کی ذات اقدس ہے۔ اس کی قدرت کاملہ سے انسان کو رزق فراہم ہوتا ہے۔ اگر وہ روزی بند کر دے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے میسر نہیں کر سکتی کیونکہ اسباب معاشی کا خالق و مالک وہی ہے۔

### معاشرت:

معاشرت سے مراد کسی جگہ یا علاقہ کے لوگوں کا طرز زندگی ہے جس میں ان کے خانگی اور شہری تعلقات دونوں شمار ہوتے ہیں۔ پھر چونکہ عملی زندگی ضرور کسی نہ کسی عقیدہ یا نظریہ کا نتیجہ ہوتی ہے اس لئے ہر معاشرہ اپنے اندر چند مخصوص عقائد و نظریات رکھتا ہے۔

اسلام اپنا ایک مضبوط اور پائیدار نظام معاشرت رکھتا ہے جس کے اصول و ضوابط مستحکم و مستقل ہیں جن کا پورا مزاج عدل و انصاف سے مرکب ہے اور جس کے تمام اجزاء باہم مربوط و ہم آہنگ ہیں۔ یہ نظام ایسا جامع اور ہمہ گیر ہے کہ زندگی کے تمام مظاہر اور ہر طرح کی سرگرمیاں اس کے دائرے میں آ جاتی ہیں۔ یہ انسان کے قلب و ضمیر اور اس کے معاملات زندگی دونوں پر محیط ہے اور اپنی ہدایات اور قانون سازی میں دین اور دنیا پر حاوی ہے۔

### درج بالا کا تعلق:

اسلام کے نزدیک سیاسی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی نظام کا آپس میں ویسا ہی تعلق ہے جیسا جز سے نئے کا اور نئے سے شاخوں کا اور شاخوں سے جڑوں کا ہوتا ہے۔ ایک ہی نظام ہے

جو خدا کی توحید اور رسولوں کی رسالت پر ایمان سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی سے اخلاقی نظام بنتا ہے اسی سے عبادات کا نظام بنتا ہے جس کو آپ مذہبی نظام سے تعبیر کرتے ہیں اسی سے معاشرتی نظام نکلتا ہے اسی سے معاشی نظام نکلتا ہے اسی سے سیاسی نظام نکلتا ہے۔

یہ ساری چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ اللہ عزوجل اور اس کے رسول کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں اور قرآن کو اللہ عزوجل کی کتاب مانتے ہیں تو آپ کو لامحالہ وہی اخلاقی اصول اختیار کرنے پڑیں گے جو اسلام نے سکھائے ہیں اور وہی سیاسی اصول اختیار کرنے پڑیں گے جو اسلام نے آپ کو دیئے ہیں۔ اسی کے اصولوں پر آپ کو اپنی معاشرت کی تشکیل کرنی ہوگی اور اسی کے اصولوں پر اپنی معیشت کا سارا کاروبار چلانا ہوگا۔ جس عقیدے کی بناء پر آپ نماز پڑھتے ہیں اسی عقیدے کی بناء پر آپ کو تجارت کرنی پڑے گی جس دین کا ضابطہ آپ کے روزے اور حج کو منعقد کرتا ہے اسی دین کے ضابطے کی پابندی آپ کو اپنی عدالت میں بھی کرنی ہوگی اور اپنی منڈی میں بھی۔

اسلام میں سیاسی نظام، معاشی نظام اور معاشرتی نظام الگ الگ نہیں ہیں بلکہ ایک ہی نظام کے مختلف شعبے اور اجزاء ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ و جڑے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے سے طاقت بھی حاصل کرتے ہیں۔

اگر توحید و رسالت اور آخرت کا عقیدہ موجود نہ ہو اور اس سے پیدا ہونے والے اخلاق موجود نہ ہوں تو اسلام کا معاشی نظام کبھی قائم نہیں ہو سکتا اور قائم کیا بھی جائے تو چل نہیں سکتا۔ اسی طرح اسلام کا سیاسی نظام بھی نہ قائم ہو سکتا ہے نہ چل سکتا ہے اگر اللہ عزوجل اور رسول کریم ﷺ اور آخرت پر عقیدہ اور قرآن پر ایمان نہ ہو کیونکہ اسلام جو سیاسی نظام دیتا ہے اس کی بناء ہی اس عقیدے پر رکھی گئی ہے کہ اللہ عزوجل حاکم اعلیٰ ہے رسول اللہ ﷺ اس کے نمائندہ ہیں قرآن اس کا واجب الاماعت فرمان ہے اور ہم کو آخر کار اپنے اعمال کی جواب دہی کے لئے اللہ عزوجل کے سامنے پیش ہونا ہے۔

پس یہ خیال کرنا ہی سرے سے غلط ہے کہ اسلام میں کوئی سیاسی یا معاشی نظام مذہبی اور اخلاقی نظام سے الگ اور بے تعلق بھی ہو سکتا ہے۔ جو شخص اسلام کو جانتا ہو اور جان کر اسے مانتا ہو وہ کبھی اس بات کا تصور تک نہیں کر سکتا کہ مسلمان ہوتے ہوئے اس کی سیاست اور معیشت یا اس کی زندگی کا کوئی شعبہ اس کے مذہب سے جدا ہو سکتا ہے یا سیاست و معیشت اور عدالت و قانون میں اسلام سے آزاد ہو کر یا اسلام کے سوا کوئی دوسرا نظام اختیار کر کے صرف ”مذہبی“ امور میں اس کی پیروی کرنے کا نام بھی اسلامی زندگی ہے۔

# عدل

## (Justice)

اسے انصاف سے بھی موسوم کرتے ہیں اس کے معنی سیدھا رکھنا برابر کرنا، افراط و تفریط سے اجتناب برتنا، توازن اور تناسب قائم کرنا وغیرہ ہیں۔

حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کے مطابق:

”کسی چیز کو اس کے موقع و محل کے مطابق ڈھالنا عدل ہے جس کی ضد ظلم (Cruelty) ہے یعنی کسی چیز کو ایسی جگہ رکھنا جو اس کے لائق نہ ہو۔“

”آنحضرت ﷺ کے چند ارشادات عالیہ قابل ملاحظہ ہیں:

”خالم حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنا افضل ترین جہاد ہے۔“ (ترمذی شریف)

”مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا ہے کہ رضا اور ناراضگی دونوں میں کلمہ حق کہوں۔“

ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ بارگاہ ایزدی میں دعا مانگا کرتے تھے کہ ”اے اللہ! مجھے فقر و غنا دونوں حالتوں میں اعتدال عطا کر۔“

”روز قیامت جب خدائے ذوالجلال والاکرام کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہو گا اس دن سات اشخاص کو اللہ تعالیٰ اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے گا جن میں ایک امام عادل بھی ہو گا۔“ (بخاری)

ان احادیث سے انصاف کی حقیقت و اہمیت پر روشنی پڑتی ہے اس کی وسعت کافی زیادہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ میں ایک نام عدل بھی ہے۔ اس لئے اللہ وہ اپنے بندوں کو بھی انصاف اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا:

ان الله ياءمر بالعدل والاحسان. (محل: 90)

”بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔“

انصاف صرف انتظام سلطنت کے لئے ہی درکار نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں اس کا اختیار کرنا لازمی ہے اس لئے قرآن پاک میں زندگی کے ہر پہلو میں اسے اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

## عدل کا معنی و مفہوم:

عدل کا لغوی معنی سیدھا رکھنا برابر تقسیم کرنا، توازن قائم کرنا اور اس کا اصطلاحی مفہوم یہ

ہے کہ ہر شخص کو اس کا حق ملے۔ اگر اس حق پر کوئی ہاتھ ڈالے تو جرم کے برابر سزا پائے۔  
**عدل کی معنوی وسعت:**

ہر چیز میں انصاف کی ضرورت ہے۔ قول و فعل میں عدل سچائی اور حق گوئی ہو۔ ہر چیز سچائی کے ترازو میں ٹھیک ٹھیک اترے۔ اس میں ہرگز کمی بیشی نہ ہو۔  
**عدل کی اہمیت قرآن کی روشنی میں:**

ولیکتب بینکم کتاب بالعدل (البقرہ: 282)

”لکھنے والا دستاویز کو عدل و انصاف کے ساتھ لکھے۔“

واذا حکمکم بین الناس ان تحکموا بالعدل (النساء: 58)

”جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا کرو۔“

ولا یجزمکم شأن قوم علی ان لا تعدلوا اعدلوا (المائدہ: 8)

”اور لوگوں کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو انصاف کیا کرو۔“

واذا قلتم فاعدلوا ولو کان ذا قربی (الانعام: 153)

”اور جب کسی کی نسبت کوئی بات کہو تو انصاف سے کہو۔ اگرچہ وہ تمہارا رشتہ دار ہی

کیوں نہ ہو۔“

وتمت کلمۃ ربک صدقا وعدلا (الانعام: 116)

”اور تمہارے رب کی باتیں سچائی اور انصاف میں پوری ہیں۔“

هل یستوی هو ومن یامر بالعدل وهو علی صراط مستقیم (النحل: 76)

”کیا وہ برابر ہے اس شخص کے جو لوگوں کو انصاف کا حکم دیتا ہے اور خود سیدھے راستے

پر چلے۔“

ان الله یامر بالعدل والاحسان وایتای ذی القربی (النحل: 90)

”اللہ تمہیں انصاف کرنے، احسان کرنے اور رشتہ داروں کی مدد کرنے کا حکم دیتا ہے۔“

اور رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

وامرت لا عدل بینکم (الشوریٰ: 15)

”اور مجھے حکم ہوا ہے کہ تم میں انصاف کرو۔“

فان فاءت فاصلحوا بینہما بالعدل والسطوا (الحجرات: 9)

”پس جب (دونوں فریق) رجوع کریں تو ان میں انصاف اور برابری کے ساتھ صلح کرا

دو اور انصاف سے کام لو۔“

واقیموا الشہادۃ للہ (الطلاق: 2)



”اور اللہ کے لئے درست گوئی دو۔“

**عدل و انصاف کی اہمیت حدیث کی روشنی میں:**

آنحضرت ﷺ نے عدل کی فضیلت و اہمیت کے متعلق فرمایا:

ان المقسطین عند الله على منابر من نور الذين يعدلون في حكمهم وأهليهم وما ولوا (صحیح مسلم)

”انصاف کرنے والے اللہ کے نزدیک نور کے منبروں پر ہوں گے وہ جو اپنے فیصلوں اپنے اہل و عیال اور اپنے زیر حکومت لوگوں میں انصاف کرتے ہیں۔“

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”قیامت کے دن عرش عظیم کے سایہ کے علاوہ اور کوئی سایہ نہیں ہوگا اس سایہ میں سات اشخاص ہوں گے جن میں ایک کے بارے میں فرمایا ”امام عادل“ عادل حکمران ہوگا۔“ (صحیح بخاری)

ایک روایت میں ہے:

ان افضل عباد الله منزلة يوم القيامة امام عادل و قبيح (بخاری)

”قیامت کے روز بلحاظ قدر و منزلت تمام بندگان خدا میں بزرگ ترین بندہ منصف، نرم دل امام و حاکم ہوگا۔“

عدل عربی کا لفظ ہے۔ انصاف کا لفظ بھی عدل کا ہم معنی ہے جس کا مطلب ہے کسی چیز کو دو برابر برابر حصوں میں بانٹنا، عدل اور ظلم آپس میں متضاد الفاظ ہیں۔

وضع الشيء في غير اهله

ترجمہ: کسی چیز کو ایسی جگہ رکھنا ہو اس کے لائق نہ ہو اور عدل کے معنی ہیں کسی شے کو ایسی جگہ رکھنا جو واقعی اس کے لائق ہو۔ اعتدال کا لفظ عدل ہی سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں میانہ روی اسے اوسط بھی کہا جاتا ہے جیسے کہ مندرجہ ذیل حدیث میں ہے:

خير الامور اوسطها. ”ہر شے میں اعتدال اور میانہ روی بہتر ہے۔“

عدل و انصاف ایک عام فہم اصطلاح ہے اور اس کا مفہوم سبھی جانتے ہیں عدالت کا لفظ عدل ہی سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں ایسی جگہ جہاں عدل کیا جاتا ہو۔ اسی طرح منصف کا لفظ بھی انصاف کرنے والے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ عدل و انصاف کی خواہش انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے۔ یعنی وہ فطریاً انصاف پسند ہے کیونکہ وہ کائنات کی ہر شے میں توازن اور اعتدال دیکھتا ہے لیکن ماحول کے اثرات کے تحت یا خواہشات نفسانی کے زیر اثر وہ عدل و انصاف سے ہٹ کر ظلم و جور پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اسے مظلوم و جہول کہا گیا ہے۔

اگر ہم غور کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ سارا کارخانہ قدرت عدل و انصاف پر قائم ہے۔ ہر شے ایک مقررہ مقدار میں پیدا ہوتی ہے کائنات کا ہر جز دوسرے کے ساتھ غیر مرئی طریقے سے مربوط ہے اور ان سب میں کمال درجے کا توازن اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ تمام اجرام فلکی ایک دوسرے کی کشش میں جکڑے ہوئے ہیں ان کا درمیانی فاصلہ پر حکمت طریقے سے ناپا ہے اگر اس میں ذرہ برابر فرق آجائے تو یہ کائنات جہاں و برباد ہو جائے مثلاً زمین اور سورج ہی کو لیجئے۔ یہ ایک خاص فاصلے پر قائم ہیں۔ زمین ایک خاص زاویے سے سورج کی طرف جھکی ہوئی ہے اگر سورج ذرا سا اور زمین کے قریب آجائے تو یہاں کی ساری آبادی جل کر بھسم ہو جائے۔ اسی طرح اگر وہ زمین سے تھوڑا سا دور ہو جائے تو یہاں کی ساری مخلوق جم کر ختم ہو جائے۔ یہی حال باقی اجرام فلکی کا ہے قرآن نے بتایا ہے کہ جس روز سورج اور چاند ایک دوسرے سے ٹک جائیں گے اس روز قیامت آجائیں گی۔

قرآن کی سب سے پہلی صورت فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کو یہ دعا سکھائی ہے۔

اهدنا الصراط المستقیم

ترجمہ: ”اے اللہ ہم کو سیدھے راستے پر چلا۔“

یہ صراط مستقیم کیا ہے؟ یہ صراط مستقیم افراط و تفریط سے ہٹ کر وسطی راہ پر چلنے کا نام ہے۔ جسے عرف عام میں راہ اعتدال کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں امت مسلمہ انتہا پسندوں (Extremists) کی جماعت نہیں بلکہ اعتدال پسند لوگوں کی جماعت ہے قرآن میں بھی اسے امت وسطی کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَكُنْ لَّكَ جَمْعُكُمْ أُمَّةً وَسطًا لَّنُكَرَنُو أَشْهَاءَ عَلٰی النَّاسِ وَیَكُونُ الرَّسُولُ

علیکم شہیداً۔ (البقرة: 143)

”اور اس طرح ہم نے تم کو امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ رہے یہ امت وسطی دنیا بھر کے انتہا پسندوں کے لئے نمونے کی امت ہے جو انہیں بتاتی ہے کہ اگر اعتدال کی راہ مطلوب ہے تو اس امت میں شامل ہو جاؤ۔ امت مسلمہ کے علاوہ ہر قوم یا تو افراط میں جتا ہے یا تفریط میں متوازن زندگی کا نمونہ کسی کے پاس نہیں۔“

حضرت علیؓ نے معاشرتی اونچ نیچ کو ختم کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تمام انسان بحیثیت انسان برابر ہیں اور کسی کو کسی دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں ہے جتنے الدواع کے موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ کسی نجی کو عربی پر یا کسی عربی کو نجی پر یا گورے کو کالے پر یا کالے کو گورے پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ برتری اگر ہے تو صرف تقویٰ کی بناء پر ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم سب آدمی آدم کی اولاد ہو اور آدم شی سے پیدا ہوئے تھے آپؐ کے ان ارشادات نے تمام معاشرتی اونچ نیچ ختم کر دی اور معاشرے کے پس ماندہ طبقوں کو بھی اطمینان کا سانس نصیب

ہوا۔ قرآن نے انسانوں کی نسلی اور قبائلی تقسیم کو صرف تعارفی قرار دیتے ہوئے یوں کہا:  
 يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ  
 أَكْرَهَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتَقَىٰ (الحجرات: 13)

”اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور  
 برادریاں بنا دیں تاکہ ایک دوسرے کو پہچانو اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت  
 والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔“

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی قوم کسی قبیلے یا کسی نسل کو کوئی خاص مقام حاصل نہیں  
 ہے۔ سب آپس میں برابر ہیں کسی کو کوئی فوقیت نہیں ہے۔ حقیقی معیار بلند اخلاق اور اعلیٰ صفات  
 میں پہناں ہے دولت و شہرت اور منصب و مراتب کو کوئی (Criterion) قرار نہیں دیا جاسکتا۔  
 معاشرے کے استحکام میں عدل کا کردار۔

عدل خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی اس کا عملی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ انسانی زندگی  
 کے مختلف شعبے ہیں ان میں سے ہر ایک کا عدل کے ساتھ گہرا رابطہ ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا  
 نہیں جس میں عدل کی ضرورت نہ ہو۔ اب ہم ذیل میں عدل کے چند شعبوں کا ذکر کرتے ہیں:  
 1- سلطنت میں عدل:

سلطنت بذات خود ایک وسیع تر شعبہ ہے۔ اس کے دو بڑے حصے انتظامیہ اور عدلیہ  
 ہیں۔ انتظامیہ میں عدل کا تقاضا یہ ہے کہ معتدل قسم کے حکمران مقرر کئے جائیں جو رعایا کو تنگ  
 نہ کریں۔ جو لوگ کسی منصب کے اہل ہوں انہیں بغیر لالچ کے بلا خوف و خطر وہ منصب دے  
 دیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُوَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا

”منصب اور عہدہ بھی تو امانت ہی ہے۔ اگر نا اہل کو منصب سونپے گا تو انصاف کے  
 برعکس ظلم ہو گا۔“

جہاں تک عدالتی شعبوں کا تعلق ہے تو ان کی بنیاد ہی عدل پر قائم ہے۔ عدالتی زندگی  
 میں تو انصاف بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:  
 وَإِذَا حُكِمَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ

2- معاشرت میں عدل:

جہاں انتظامیہ اور عدلیہ اور صاحب اقتدار لوگوں کو عدل کا حکم دیا گیا ہے وہاں عوام کو  
 بھی معاشرتی زندگی میں عدل کی تلقین کی گئی ہے۔ معاشرتی زندگی میں خاندان ایک اہم عنصر

ہے۔ گھریلو زندگی میں عدل کی کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ دوسرا اہم عنصر تقیم ہیں۔ ان دونوں کے متعلق سخت تاکیدی احکام ہیں۔

### 3۔ معاملات میں عدل:

معاملات میں تجارتی و غیر تجارتی دونوں شامل ہیں۔ تجارتی زندگی میں عدل کے معاملہ کی اچھائی نام پ تول میں توازن اور دیا منداری ہے۔

### 4۔ اعتقادات میں عدل:

اسلام ایک فطری دین ہے۔ اس کے احکام میں اعتدال پایا جاتا ہے۔ اعتقادات میں عدل اس طرح ہے کہ نہ تو اللہ کے ساتھ کسی کو اس کی خدائی میں شریک بنایا جائے اور نہ ہی تفریط سے کام لیا جائے کہ اللہ کی ہستی کا ہی انکار کر دیا جائے اور مادہ پرستی کو ہی سب کچھ سمجھ لیا جائے اور دہریت کو قبول کر لیا جائے۔ اسی طرح انبیاء اور فرشتوں کے معقول عقائد میں بھی غلو سے احتراز کیا جائے۔

### 5۔ عبادات میں عدل:

اگرچہ انسانی زندگی کا مقصود اصلی عبادت الہی ہے مگر شریعت نے اس میں بھی اعتدال کو قائم رکھا ہے۔ نماز روزے انفاق فی سبیل اللہ وغیرہ ہر چیز میں اعتدال کا حکم ہے۔ افراط و تفریط سے گریز کا حکم دیا گیا ہے۔

## عدل کے اصول

اسلام نے عدالت کے چند اصول مقرر کر دیے ہیں جو کسی طرح بھی قابل تغیر نہیں ہیں۔ ہم یہاں صرف چند ایک کا ذکر کرتے ہیں:

### 1۔ عدالت بقائے ملت و انسانیت:

درحقیقت عدالت ہی سے انسانیت کی بقا ہے۔ عدل ہی کائنات کی جان ہے۔ اسی کی وجہ سے سارا نظام چل رہا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ قانون عدل کو سوسائٹی میں جاری کیا جائے کیونکہ شریعت کی ترو سے عدل ہی عوام کے لئے زندگی کی ضمانت بن سکتا ہے۔

### 2۔ عدلی نمونہ مساوات:

اسلام نے دنیا کو حقوق اور قانون کی مساوات سے روشناس کیا۔ اسلام میں ہر شخص قانون کی نظر میں برابر ہے۔ ایک چوری کے مقدمے میں آپ ﷺ نے عورت کا ہاتھ کاٹنے میں کوئی رکاوٹ آڑے نہیں آنے دی اور جتہ الوداع کے موقع پر فرمایا: کسی عربی کو عجمی پر اور کسی

بجی کو عرabi پر اور کسی گورے کو کالے پر یا اس کے برعکس کسی کو دوسرے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔

### 3- عدل باعث اجر و ثواب:

امام عادل کی نیک نیتی کو اجر و ثواب کا حامل ٹھہرایا ہے۔ اگر فیصلہ غلط ہی کیوں نہ ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”کوئی فیصلہ کرنے والا جب نیک نیتی سے فیصلہ کرتا ہے تو اگر وہ فیصلہ صحیح ہے تو اسے دو اجر ملتے ہیں اور اگر فیصلہ غلط ہے تو ایک اجر ملتا ہے۔“ (ابوداؤد)

قانون عدل میں کسی زمانے میں جمود کبہہ ہو سکتے ہیں مگر اصول ہر زمانے میں مکمل کام دے سکتے ہیں۔

## عدل کے اثرات و فوائد اور نتائج و ثمرات

اگر معاشرے میں صحیح طریقے سے نظام عدل کا حقیقی نظام قائم ہو جائے تو بے شمار فوائد اور اچھے اثرات برآمد ہوں۔ ذیل میں ہم چند ایک فوائد کا تذکرہ کرتے ہیں:

### 1- رضائے الہی کا حصول:

عادل اور منصف آدمی سے اللہ تعالیٰ بھی راضی ہوتا ہے اور اسے قیامت کے دن عرش کے سایہ میں جگہ ملے گی۔

### 2- ظلم و ستم کا خاتمہ:

جب معاشرے میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہو تو ہر صاحب حق کو اس کا حق ملتا ہے اور کوئی کسی کا حق غصب نہیں کر سکتا تو اس طرح معاشرے سے ظلم و ستم کا از خود خاتمہ ہو جاتا ہے۔

### 3- طبقاتی نفرتوں کا خاتمہ:

جہاں بے انصافی ہوتی ہے وہاں ہی آپس میں نفرتیں اور بدگمانیاں جنم لیتی ہیں اور جہاں عدل و انصاف ہو وہاں سے نفرتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ ظالم کی حق تلفی مظلوم کے لئے نفرت کا باعث بنتی ہے۔

### 4- معاشرتی استحکام:

انصاف کی وجہ سے معاشرہ میں امن و اطمینان ہوتا ہے اور معاشرتی قدروں کو فروغ ملتا ہے اور ظلم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

## 5- نسلی فسادات کا انسداد:

اللہ تعالیٰ نے جو قصاص کا قانون دیا ہے اس پر عمل کریں تو جو نسل در نسل قتل و غارت ہوتی تھی اس کا انسداد ہو جاتا ہے اور انصاف ہو تو لوگ قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیتے، وگرتہ معاشرہ بد امنی، بے چینی اور افراتفری کا شکار ہو جاتا ہے۔

## تعاون / معاونت

## (Co-operation)

انسان اپنی ضروریات اکیلا مہیا نہیں کر سکتا اس کے لئے وہ دوسروں کے تعاون کا محتاج ہے۔ جتنا زیادہ انسانی ضروریات میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اس تناسب سے علوم و فنون میں ترقی ہوتی جاتی ہے جبکہ اس کے ساتھ ہی معاشرتی نظم میں وسعت آتی رہتی ہے جس قدر معاشرتی اکائی منظم اور وسیع ہوگی اسی قدر سہولتیں بھی وافر میسر ہوں گی اس طرح کتبہ سے قبائل، گاؤں اور قصبہ کی صورت میں زندگی منظم ہو جاتی ہے۔ قصبوں اور شہروں کے باہمی اتحاد اور ارتباط سے ریاست تشکیل پاتی ہے جس میں رہنے والے لوگ قوم قرار پاتے ہیں جو اپنی مخصوص خصوصیات کے باعث دوسری اقوام سے ممتاز ہو سکتے ہیں۔

## اسلامی اخوت کا تقاضا:

اسلامی اخوت کا یہ بھی تقاضا ہے کہ کسی مسلمان بھائی کی کوئی بھی جائز ضرورت ہو تو اس کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

تعاونوا علی البر والیقوی۔

”نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو۔“

اسلامی اخوت اور بھائی چارے کی وجہ سے باہمی تعاون اور احساس کی فضاء قائم ہوتی ہے۔ معاشرے کا ہر فرد دوسرے کا احساس کرتا ہے۔

## مدد اور تعاون:

ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا:

انصرا خاکب ظالما او مظلوما.

”اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔“

## معاشرہ اور تعاون:

جب معاشرے میں ایک دوسرے کے لئے ہمدردی، خلوص، وفاداری کے جذبات ہوں گے اور لوگ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے تو معاشرتی ماحول خوشگوار ہوگا۔  
اخوت و محبت کی وجہ سے دل میں ہمدردی کا احساس بھی بیدار ہوتا ہے۔ اگر کسی کو کسی قسم کی تکلیف ہو تو اس کے دوسرے مسلمان بھائی اس کی دلجوئی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ دکھ درد میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

جب اخوت و محبت اور باہمی تعاون کی فضاء ہو تو امراء اپنے غریب بھائیوں کے ساتھ بانی تعاون بھی کریں گے جس سے وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل ہوں گے اور معاشرے سے غربت و افلاس کا خاتمہ ہوگا اور معاشی خوشحالی کا دور دورہ ہوگا۔ جب معیشت ٹھیک ہو جائے گی تو معاشرتی پریشانیاں بھی کم ہو جائیں گی۔

ایک معاشرے کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کے افراد با کرم رہتے ہیں۔ دکھ سکھ میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں مگر جب آپس میں ایک دوسرے کی غیبت اور برائیوں کا ذکر شروع ہو جائے گا تو آپس میں باہمی تعاون ختم ہو جائے گا اور نفرتیں جنم لیں گی۔

## اسلام میں تعاون کی اہمیت

اسلام کی باقی اقدار کی طرح یہ بھی اس کے فلسفہ حیات و کائنات سے متعلق ہے جس کے مطابق یہ کائنات ایک وحدت ہے اور اس کا ہر جز دوسرے اجزاء کے ساتھ مربوط ہے دوسرے الفاظ میں اس کائنات کی ہر شے دوسری چیز سے تعاون کرنے پر مجبور ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ کائنات صفحہ ہستی پر نہیں رہ سکتی۔ تعاون کائنات کی ایک بنیادی قدر ہے۔ انسان بھی اس کائنات کا ایک جز ہے۔ وہ ایک ایسی کائنات کے اندر پیدا نہیں کیا گیا ہے جو اس کی مونس و مددگار نہ ہو۔ انسان کو خدا نے اجنبی فضا میں تخلیق نہیں کیا۔ فطرت انسان کے لئے متضاد پیدا نہیں کی گئی۔ فطرت کے اندر جو قوتیں پیدا کی گئی ہیں انسان کا قرض ہے کہ ان کو سمجھے۔ اس طرح وہ کائنات کو متحرک کر سکتا ہے۔ چنانچہ کائنات کا تمام نظام تعاون پر مبنی ہے۔ اسلام کے تصور انسان کو لیجئے انسان اس کائنات کا حصہ ہے اور کائنات کے دوسرے افراد سے مربوط ہے چونکہ ہر انسان کائنات کا جز ہے اور مربوط ہے اس لئے ہر انسان دوسرے انسان سے گہرا ربط اور تعلق رکھتا ہے۔

انسانوں کے تعلقات کی اپنی نوعیت بھی معاونت پر مبنی ہے۔ ہر انسان دوسرے انسان سے تعاون کرنے پر مجبور ہے۔ انسان کو اللہ نے معاشرتی حیوان کے طور پر پیدا کیا ہے۔ معاشی

انتظار نظر سے کوئی انسان خود تکمیل نہیں ہے فرد کی بہت سی ضروریات دوسرے لوگ پوری کرتے ہیں۔ انسان دوسرے انسانوں پر انحصار کرنے پر مجبور ہے۔ اس طرح جغرافیائی خطوں کو دیکھتے ہر خطے کو یکساں وسائل سے سرفراز نہیں کیا گیا۔ چنانچہ انہی ذرائع کے امتیاز کی بنا پر بین الاقوامی تجارت وجود میں آتی ہے۔ ایک ملک ان اشیاء کی پیدائش میں تخصیص حاصل کرتا ہے جن میں اس کو برتری حاصل ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ہی یہ بات رکھ دی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے تعاون کریں خدا نے تمام انسانوں کو آدم سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے بنایا گیا تھا اس اعتبار سے سب انسان ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور ہر انسان کو دوسرے انسان سے اسی طرح تعاون کرنا چاہئے۔ جس طرح بھائی بھائی سے کرتا ہے۔ سورۃ النساء کی پہلی آیت میں ارشاد ربانی یوں ہے:

”لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت پیدا کئے اور دنیا میں پھیلا دیئے۔“

اس تاظر میں دیکھیں تو اسلام وحدت انسانیت کا قائل ہے ہر انسان دوسرے انسان سے گہرا رشتہ و تعلق رکھتا ہے کیونکہ پوری انسانیت ایک وحدت ہے اور یہ ایک ہی جان سے پیدا کئے گئے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سب انسان ایک وحدت ہیں تو انسانوں میں امتیاز کیوں برتا جاتا ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اختلاف اس لئے ہے کہ تمام کے تمام انسانوں میں وحدت کی قدر متحرک ہو سکے۔ یہ مختلف راہیں اختیار کر کے بھی ایک راہ اختیار کرتے پر مجبور ہوں جو کہ اللہ کی راہ ہے فرض کریں سب انسان ایک جیسے ہوں تو ہر انسان خود تکمیل ہو گا انسانوں کے اختلاف و امتیاز کی وجہ یہ ہے کہ اس کثرت کے اندر وحدت پیدا ہو قرآن حکیم میں یہی حکمت بیان کی گئی ہے۔ سورۃ الحجرات کی 13 آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

”اے لوگو! ہم نے تم کو اس لئے مختلف قوموں اور قبیلوں میں بانٹ رکھا ہے تاکہ تم کو ایک دوسرے کے ساتھ تعارف میں آسانی ہو۔“

شناخت سے فرق پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہم سب کی شکلیں اور صورتیں ایک جیسی ہو جائیں تو ایک دوسرے کو نہ پہچان سکیں تعارف کی بنا پر تعاون وجود میں آتا ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کے تصور انسان کی بنا پر تعاون وجود میں آتا ہے۔

انسانی زیست کا مقصد فلاح کا حصول ہے اور قرآن بتاتا ہے کہ انسان اس وقت تک فلاح حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ دوسرے سے تعاون نہ کرے سورۃ العصر میں ارشاد ہوتا ہے:

”زمانہ گواہ ہے کہ انسان خسارہ میں ہے بجز لمن لوگوں کے جو ایمان لائے عمل صالح کریں ایک دوسرے کو حق کی تلقین کریں اور ایک دوسرے کو ثابت قدمی کی نصیحت کرتے رہیں۔“



ان اہل ایمان افراد کی خصوصی صفت تعاون ہے کیونکہ ایک دوسرے کو دہی حق کی تلقین کریں گے جو ایک دوسرے سے معاونت کریں گے۔ اسلام واضح کرتا ہے کہ تعاون صرف نیکی کے کاموں میں ہونا چاہئے برائی کے کاموں میں نہیں یا ایسے کاموں کے لئے ہونا چاہئے جس میں انسانیت کی فلاح ہو سورۃ مائدہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”بھلائی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور ظلم و زیادتی اور گناہ میں تعاون نہ کرو۔“

تعاون کی جب یہ قدر امت مسلمہ میں پیدا ہوتی ہے تو اسلام کی ایک دوسری مستقل قدر وجود میں آتی ہے۔ اخوت صرف مسلمانوں کا حق ہی نہیں بلکہ جو بھی آغوش اسلام میں آجاتا ہے اخوت کا حق دار بن جاتا ہے۔ فرض کریں تعاون ایک عالمگیر اشتراک (Universal Combination) ہے۔ تمام انسانوں کے درمیان جب واسطہ پیدا ہوتا ہے تو اس کو ہم تعاون کہتے ہیں۔ بلا امتیاز رنگ و نسل قوم و مذہب کے اس سیٹ کے سارے ارکان کے درمیان تعاون ہونا چاہئے اگر اس جٹ سے ان تمام مبرز کو نکال لیں جو مسلمان ہیں تو یہ ایک ضمنی سیٹ (Sub-Set) بن جاتا ہے جس میں فقط مسلمان شامل ہیں ان کے درمیان جو تعلقات پیدا ہوتے ہیں اس کو اخوت کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ ایک محدود سیٹ نہیں ہے بلکہ غیر محدود سیٹ (Infinite Set) ہے جو لوگ ایمان لے آئیں گے وہ اس سیٹ میں شامل ہو جائیں گے تعاون سب انسانوں کے درمیان ہوتا ہے جب کہ اخوت صرف مسلمانوں کا حق ہے۔

سورۃ توبہ کی 71 ویں آیت میں فرمایا گیا ہے:

”مومن مرد اور مومن عورتیں یہ سب ایک دوسرے کے رفیق اور دم ساز ہیں بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں۔“

جب یہ صفت جنم لیتی ہے تو مسلمان ایک دوسرے کے رفیق بن جاتے ہیں۔ بخاریؒ کی حدیث مبارک ہے:

”ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔“

حضور ﷺ نے امت مسلمہ کو ایک جسد واحد سے تشبیہ دی ہے گویا حضور ﷺ نے امت مسلمہ کو ایک معاشی نمونہ (Economic Model) کی صورت دی ہے کیونکہ سارے فرزندان توحید اس میں جڑے ہوئے ہیں۔

ہاں لطف و کرم انس و محبت میں مسلمانوں کا حال جسم کا سا ہے کہ جب ایک عضو کو تکلیف پہنچتی ہے تو بدن کا ہر عضو بے خوابی اور بخار کے ذریعے اس کا شریک غم بن جاتا ہے۔“

ساری امت مسلمہ ایک عضویت (Organism) ہے۔ اگر ایک رکن کو بھی تکلیف ہوتی

ہے تو تمام امت بے قرار و بے چین ہو جاتی ہے۔ ایک اور ماثل حدیث میں ارشاد ہوتا ہے: ”ایک مومن دوسرے مومن کے لئے عمارت کی اینٹوں کی مانند ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو تھامے اور سنبھالے رکھتی ہے۔“

یہاں باہمی انحصاریت کو واضح کیا گیا ہے اگر ایک اینٹ عمارت سے نکال دی جائے تو عمارت کمزور پڑ جاتی ہے اس طرح ایک مومن دوسرے کے لئے عمارت کی اینٹوں کی مانند ہے اگر ایک مومن بھی تعاون نہیں کرتا ہے تو تمام امت مسلمہ کی بنیادیں کمزور ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اس طرح پوری کائنات میں تعاون ہے انسان فلاح کے مقصد کو اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا جب تک تعاون نہ کرے۔

دین نے اسی قدر کو اخوت کا نام دیا ہے۔

اسلام کی اقدار کو نوعیت بنیادی طور پر اخلاقی ہوتی ہے تعاون بھی اخلاقی قدر ہے کیونکہ یہاں چناؤ کا سوال ہے لیکن اس اخلاقی قدر کے مختلف پہلو ہوتے ہیں تعاون کی یہی قدر جب ہمارے معاشی روابط کو منضبط کر رہی ہوتی ہے تو اس وقت یہ معاشی پہلو اختیار کر لیتی ہیں۔ فرض کریں آجر کوئی چیز تیار کر رہا ہے۔ اس شے کی پیداوار سے یہ معاشرے کے ساتھ تعاون کر رہا ہوتا ہے۔ درحقیقت تعاون سے مراد افراد اور اداروں کی وہ مشترکہ جدوجہد ہے جس کی بنا پر وہ معاشی مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے تعاون کو وجوب واجب (Obligation) کا درجہ دیا ہے یہ مسئلہ انسان پر نہیں چھوڑا گیا کہ وہ تعاون کرے یا نہ کرے بلکہ واجب ہے کسی انسان کو شریعت نے اجازت نہیں دیتی کہ وہ انسانوں سے قطع تعلق کر لے اور رہبانیت اختیار کرے۔ فقہاء کے مطابق: پیداواری سرگرمیوں میں تعاون ایک قدر ہے۔ اس طرح اسلام میں لین دین کے امور میں ان امور کو جائز قرار دیا ہے جن میں تعاون کا اصول کار فرما ہے جہاں تعاون کا اصول نہیں برتا جاتا وہ کام ناجائز ہیں وہ سب اقتصادی امور و معاملات ناجائز ہیں جن میں باہمی رضامندی کا دخل نہ ہو کیونکہ تعاون باہمی رضامندی کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔ وہ تمام کام جن میں ایک فرد کا فائدہ دوسرے کے نقصان پر موقوف ہو ناجائز ہیں کیونکہ تعاون بھی اس قسم کے سودوں میں نہیں ہوتا اسی بنا پر اسلام نے جوئے کو حرام قرار دیا ہے۔ اسی طرح شہ لائری، احتکار اور ارتکاز کو حرام دیا ہے یہ سب صورتیں معاشرے میں عدم توازن پیدا کرتی ہیں۔ ذخیرہ اندوزی کرنے والے معاشرے سے تعاون کرنے پر تیار نہیں ہوتے چنانچہ ذخیرہ اندوز کو حضور ﷺ نے جہنم کی خبر دی ہے۔ اسی طرح ارتکاز دولت کو لیں جب ثروت و ذخیرہ کر لی جاتی ہے تو قوی آمدنی کم ہو جاتی ہے۔ ذخیرہ اندوزی کے عمل کی بنا پر پوری قوم کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ تقنین کاری کی بناء پر قوی آمدنی (N.I) گھٹ جاتی ہے کیونکہ شد باز ذاتی فائدہ چاہتے ہیں۔

ہر فرد اس بات کا مکلف ہے کہ معاشرہ نے جو ذمہ داری اس کو سونپی ہے اس کو انتہائی دیا اندازی سے پورا کرے سورۃ توبہ کی 165 ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

”اے نبی ﷺ ان سے کہہ دو تم عمل کرو اللہ اور اس کا رسول ﷺ اور مومنین سب دیکھیں گے کہ تمہارا رویہ کیسا رہتا ہے۔“

یہ قرآن کی عمومی آیت ہے اس کے پہلے کھڑے میں عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اعمال مختلف ہو سکتے ہیں۔ ان کی نوعیت تہذیبی، اخلاقی، سیاسی، سماجی اور معاشی بھی ہو سکتی ہے۔ اس عمل کے لفظ میں تمام سرگرمیاں آجاتی ہیں۔ ہمارا معاشی سرگرمیوں سے تعلق ہے اس لئے ہم معاشی پہلو کو خصوصاً مد نظر رکھیں گے حکم دیا جاتا ہے کہ عمل کے معاشی پہلو کو وجود میں لاؤ۔ یعنی معیشت کے استحکام کے لئے جو سرگرمیاں ضروری ہیں ان کو وجود میں لاؤ۔ اگر فرد تعلیم و تربیت کی اہلیت رکھتا ہے تو فرد کا فرض ہے کہ وہ استاد کے چٹھے کو اپنائے اور معاشرہ کی ترتیب کرے یعنی کسی نہ کسی پیداواری کاوش میں اپنا فرض پورا کرے۔ ساتھ ہی یہ کہا گیا ہے کہ تمہارے اس عمل کی پورا معاشرہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ قدر کرے گا۔ دوسرے الفاظ میں پورا نظام تمہارے عمل کی نگرانی کرے گا دوسری طرف افراد کو یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں ایک دوسرے کی ضروریات کی تکمیل کریں۔

چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا:

”بیوہ اور مسکین کے لئے دوز دھوپ کرنے والا مجاہد فی سبیل اللہ کی مانند ہے اور اس شخص کی طرح ہے جو دن بھر روزے رکھے اور رات بھر نمازیں پڑھے۔“

یہ تو افراد معاشرہ کے درمیان باہمی نوعیت بیان کی گئی ہے فرد پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ معاشرہ اس کو جو سونپے وہ اسے پورا کرے دوسری معاشرے پر بھی ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ فرد کی ذمہ داریوں کو پورا کرے معاشرے کا اعلیٰ ترین ادارہ یعنی ”ریاست“ کا فرض ہے کہ زکوٰۃ وصول کرے اور غریبوں کی ضروریات پوری کرے اگر زکوٰۃ سے غریب کی ضروریات پوری نہ ہوں تو افراد سے رقم وصول کرے اور غریب پر خرچ کرنے تمام فقہانے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ ہستی کے افراد کا فرض ہے کہ غریبوں پر خرچ کرے۔

الغرض صرف تبادلہ پیداوار اور تقسیم میں متعدد عناصر کا باہمی ربط و ضبط ضروری ہے جس سے کئی مسائل کی سطح کنٹی ہوتی ہے نیز افراط و تفریط سے بچا جاسکتا ہے۔

## ایثار/ قربانی

ایثار کے معنی و مفہوم:

ایثار کے لغوی معنی ترجیح دینا ہے یعنی ذاتی ضروریات پر دوسروں کو ترجیح دینا، خود تکلیف اٹھا کر بھی دوسروں کو راحت و آرام پہنچانا۔ اردو میں لفظ قربانی بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ درحقیقت ہمدردی، غنودرگز، صبر و تحمل، سخاوت، شجاعت، عدل، امانت و دیانت سب کے پیچھے ایثار کا وصف ہی کارفرما ہے بلکہ ہوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ یہ وصف تمام اوصاف حمیدہ کی جڑ اور بنیاد ہے۔

ایثار کسی فرد یا گروہ کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور ملک و قوم کے لئے بھی۔

ایثار کی صورتیں:

ایثار کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مال میں، جان میں، جاہ و منصب میں، جذبات اور احساسات میں۔ ہم ان میں سے صرف چند ایک کا ذکر کرتے ہیں۔

1- اپنے مقابلے میں دوسرے کو ترجیح دینا:

اپنی فطری خواہشات کو دوسروں پر قربان کر دینا اسے ”نفسانی ایثار“ بھی کہا جاتا ہے جیسے حضرت ابو طلحہؓ نے خود بھوکا رہ کر مہمان کو اندھیرے میں تمام کھانا کھلا دیا۔ اسی طرح حضرت علیؓ نے خود بھوکے رہ کر سارا کھانا سائل کو دے دیا۔

2- منصب کی قربانی:

منصب اور عہدہ کی قربانی کو ”منصبی ایثار“ کہا جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال انصاری صحابہ خود خلیفہ بننا چاہتے تھے لیکن انہوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کے لئے خلافت جیسا عظیم منصب چھوڑ دیا۔

3- مالی ایثار:

دولت ایک ایسی چیز ہے جو ہر کسی کو پیاری لگتی ہے۔ اس کی خاطر لوگ اپنی عاقبت خراب کر لیتے ہیں تو جب کوئی بندہ اپنا مال و متاع دوسروں پر بٹھا کر دے تو وہ مالی ایثار ہوگا۔ مؤاخات مدینہ کے موقع پر انصار مدینہ نے شاندار مثالیں پیش کیں۔

4- جذباتی ایثار:

انصار مدینہ کے اندر جو ایثار اور قربانی کا جذبہ تھا وہ بے مثال اور لازوال ہے۔ اس کے

اثرات آج بھی مدینہ طیبہ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کی دین کے ساتھ اس قدر جذباتی وابستگی کہ خود ضرور تشدد ہونے کے باوجود دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے کی جگہ و دو کرنا ان کا امتیازی طرہ ہے۔

## 5- جانی ایثار:

انسان کے لئے دوسرے کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینا ممکنات سے ہے مگر دوسرے کی حفاظت کی خاطر اپنی جان کی بازی لگانا یہ انصار مدینہ کا ہی حصہ اور حوصلہ ہے۔ ان لوگوں نے مہاجرین مکہ کو پناہ دے کر اور آنحضرت ﷺ کو اپنے پاس بلا کر گویا پورے عرب کو اپنا جانی دشمن بنا لیا۔ جنگ بدر احد احزاب، حنین، تبوک سب اسی کا تور عمل تھیں۔

## 6- جسمانی ایثار:

دوسروں کو معاشرتی سکھ دینا اور اپنے جسم کو دکھ میں ڈالنا جسمانی ایثار کہلاتا ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے آپ ﷺ کی راحت کی خاطر خود تکلیفیں برداشت کیں۔ بالائی منزل پر تشریف لے گئے تاکہ آپ ﷺ کو صحابہؓ سے میل ملاپ میں وقت نہ ہو۔ ایک مرتبہ بالائی چھت پر پانی گر جانے پر فوراً رضائی کو اوپر بچھا دیا تاکہ وہ پانی جذب کر لے اور پانی کے چھینٹے ٹپک کر نیچے نہ گریں کہ رسول اللہ ﷺ کو تکلیف ہوگی اور پھر کبھی رضائی پر رات کاٹی۔ اسی طرح صحابہؓ کا راتوں کو پہرہ دینا یہ کمال ایثار ہے۔

## ایثار و ہمدردی قرآن کی روشنی میں:

خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھانا خود پیاسا رہ کر دوسروں کی پیاس بجھانا۔ یہ اگرچہ بہت مشکل ہے لیکن جن کی تربیت رسول اکرم ﷺ کی مجلس میں ہوئی ہو جو خود ایثار کا منبع ہو اس کے ساتھیوں کے لئے ایسی قربانیاں ممکنات میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی یوں تعریف کرتا ہے:

وَيُؤْتُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (المحشر: 9)

”اور وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں خود اس کی ضرورت ہو۔“

جس آدمی کو آخرت کی فکر دامن گیر ہوگی تو اس دنیا کو وہ حقیر اور معیوب جانے لگا۔ ایسا انسان بڑھ چڑھ کر سخاوت اور کار خیر میں حصہ لے گا کیونکہ اسے علم ہے کہ آج جو دیں گے کل اس سے کہیں زیادہ بہتر ملے گا۔

وَمَا تَقْدُمُوا لَأَنفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ خَيْرٌ لِجَلْوَةِ عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ وَأَعْظَمُ أَجْرًا

(سورہ مزل: 20)

”اور تم جو اپنے لئے اچھا کام کرتے ہو اللہ کے پاس اس یاں سے بہتر اور اجر میں زیادہ پاؤ گے۔“

ومن يوق شح نفسه فلوالئك هم المفلحون (الحشر: 9)  
”اور جو شخص کی کجی سے بچائے گئے وہ کامیاب ہیں۔“

انما نطعمكم لوجه الله لا نريد منكم جزاء ولا شكورا و يطعمون الطعام على حبه مسكينا ويتيما واسيرا (الذھر)

”ہم تو تمہیں رضائے الہی کی خاطر کھاتے ہیں ہم تم سے کسی قسم کا اجر اور شکریہ نہیں چاہتے اور وہ اللہ کی محبت کی وجہ سے مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔“  
اپنی من بھالی اور پسندیدہ چیز کو راہ خدا میں دے دینا یہ بھی ایثار کی بہترین مثال ہے۔  
ارشاد ہے:

لن تنالوا البر حتى تنفقوا مما تحبون (آل عمران)  
”تم ہرگز نیکی میں کمال حاصل نہیں کر سکتے جب تک اپنی من پسند چیز نہ خرچ نہ کرو۔“  
اس آیت کی بناء پر حضرت ظہرؓ نے اپنا سب سے بہترین باغ اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیا تھا۔

حضرت عائشہؓ پر بہتان لگانے والوں میں حضرت ابوبکرؓ کے بھانجے حضرت مسطحؓ بھی تھے۔ ان کی کفالت حضرت ابوبکرؓ فرما رہے تھے۔ اس واقعہ کے بعد انہیں شدید رنج ہوا اور انہوں نے قسم اٹھائی کہ آئندہ مسطحؓ پر ایک درہم بھی خرچ نہیں کریں گے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:  
ولا تأملوا لاولوا الفضل منكم والسعة ان يؤتوا اولی القربی... (النور: 22)  
”تم میں جو صاحب فضل اور کثادگی واسلے ہیں انہیں اپنے قریبداروں، مسکینوں اور مہاجرین کو فی سبیل اللہ دینے سے قسم نہیں کھانی چاہیے۔“

ومن الناس من يشرى نفسه ابتغاء مرضات الله  
”بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کی رضا کی خاطر اپنی جانیں بیچ ڈالتے ہیں۔“  
ایثار حدیث کی روشنی میں:

رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:  
لا يؤمن احدكم حتى يحب لافيه ما يحب لنفسه (متفق علیہ)  
”کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اپنے (مسلمان) بھائی کے لئے بھی وہی پسند کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔“  
ایک آدمی نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے کہا کہ میں سخت بھوکا ہوں

آپ ﷺ نے ازواج مطہرات کے گھروں میں پیغام بھیجا مگر سوائے پانی کے کوئی چیز نہ تھی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: اس کی مہمان نوازی کون کرے گا تو ایک انصاری نے حامی بھری مگر جب گھر گئے تو سوائے بچوں کے کھانے کے کچھ نہیں تھا۔ بچوں کو بہانے سلا دیا گیا خود چراغ درست کرنے کے بہانے بجھا دیا گیا اور اندھیرے میں مہمان کے ساتھ کھانا کھانے والا انداز اپنانے لگا تا کہ مہمان سمجھے کہ یہ بھی میرے ساتھ کھا رہے ہیں۔ مہمان نے سیر ہو کر کھالیا خود میاں بیوی نے بھوکے رات گزاری۔ جب صبح ہوئی اور وہ صحابی آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

لقد عجب الله من صنعكما بضيفكما الليلة (تشفق علیہ)  
 ”تم آج رات مہمان کے ساتھ جو (حسن) سلوک کیا اللہ تعالیٰ اس سے بہت خوش ہوا ہے۔“

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

طعام الاثنين كافي الثلاثة و طعام الثلاثة كافي الاربعة (تشفق علیہ)  
 ”دو آدمیوں کا تین آدمیوں کو اور تین کا کھانا چار آدمیوں کے لئے کافی ہوتا ہے۔“  
 اور ایک روایت میں ہے:

طعام الواحد يكفي الاثنين و طعام الاثنين يكفي الاربعة و طعام الاربعة يكفي الثمانية (صحیح مسلم)

”ایک آدمی کا کھانا دو کو دو کا چار کو اور چار کا کھانا آٹھ آدمیوں کو کافی ہوتا ہے۔“  
 حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم نبی اکرم ﷺ کے ساتھ شریک سفر تھے ایک آدمی اپنی سواری پر آیا اور دائیں بائیں نظریں گھمانے لگا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:  
 من كان معه فضل ظهر فليعد به على من لا ظهر له ومن كان له فضل من زاد فليعد به على من لا زاد له (مسلم)

”جس شخص کے پاس ضرورت سے زائد کوئی سواری ہو تو وہ زائد سواری اسے دے دے جس کے پاس سواری نہ ہو اور جس کے پاس زادراہ زائد ہو وہ اسے دے دے جس کے پاس زادراہ نہیں ہے۔“

ایک شخص نے نبی پاک ﷺ کے پاس چادر کی بہت تعریف کی اور کہنے لگا کہ یہ مجھے دے دیں! آپ ﷺ نے اسے دے دی۔ (صحیح بخاری)

رسول اکرم ﷺ نے اشعری لوگوں کی یوں تعریف کی کہ ”اشعری قبیلے کے لوگ اپنے (ایثار والے) ہیں کہ جب جہاد میں ان کا زادراہ ختم ہو جاتا ہے یا ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے یا بدینے میں رہتے ہوئے ان کے اہل و عیال کا کھانا کم ہو جاتا ہے تو.....

جمعوا ما كان عندهم في ثوب واحد ثم اقتسموه بينهم في اناء واحد  
بالمسوية فهم من وانا منهم (متفق علیہ)

وہ اسے ایک کپڑے میں جمع کر لیتے ہیں اور پھر اسے ایک برتن کے ذریعے تقسیم کر لیتے  
ہیں وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔“ (متفق علیہ)

ایثار منازل اتفاق میں سب سے بلند مرتبہ ہے۔ اتفاق کے تین درجے یا مراتب ہیں:

### 1- سخاوت:

اس درجے میں جب انسان خرچ کرتا ہے تو اسے یہ خیال نہیں آتا کہ اس سے میرا مال  
کم ہو جائے گا یا پھر اس پر یہ چیز گراں نہیں گزرتی۔

### 2- جود:

اس میں انسان اپنے پاس کم رکھتا ہے اور زیادہ خرچ کرتا ہے یا پھر وہ جتنا اپنے پاس  
رکھتا ہے اتنا ہی خرچ کر دیتا ہے۔

### 3- ایثار:

اس میں انسان خود ضرورت مند ہونے کے باوجود کسی دوسرے کو دیتا ہے۔

(بہجۃ الناظرین ریاض الصالحین)

### عمل صحابہ سے ایثار کی چند مثالیں:

اب ہم ایثار اور بھلائی کے ساتھ محبت کے چند واقعات کا ذکر کرتے ہیں تاکہ عقل و فہم  
والے انسان اس سے رہنمائی حاصل کریں:

1- ”دارالندوہ“ میں قریش کی پارلیمنٹ کا اجلاس ہوا ابو مرہ طلحون نے رسول اکرم ﷺ کے  
قفل کی ایک رائے پیش کی جسے مجلس نے بالاتفاق منظور کر کے اور اس پر عمل درآمد کے  
لئے آپ کے گھر پر اچانک حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اعظم ﷺ کو ہجرت کی اجازت دے دی اور آپ ﷺ نے اس کے  
لئے تیاری شروع کر دی۔ طے یہ ہوا کہ حملہ آوروں کے حملوں کو جنہوں نے مکان سے  
نکلنے وقت آپ پر چھینٹا تھا ناکام بنایا جائے اور آپ ﷺ کے بستر پر ایک نوجوان سو  
جائے تاکہ دشمن سمجھے کہ آپ ﷺ ابھی سوئے ہوئے ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے اپنے  
چچا زاد بھائی حضرت علیؓ کو اس ایثار و قربانی کے قابل پایا۔ آپ ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ  
تم نے رات بستر پر سوتا ہے۔ حضرت علیؓ بلا تردد اس پر آمادہ ہو گئے جبکہ یہ بھی امکان تھا  
کہ بوکھلایا ہوا دشمن چھپٹ پڑے اور ٹکا بوٹی کر دے۔ نو عمری کے باوجود حضرت علیؓ نے



سجادت نفس کی ایک اعلیٰ مثال پیش کی اور ہر مسلمان اس انداز کی قربانی پیش کرنے اور رسول اللہ ﷺ کے لئے اپنی جان کی بازی لگانے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔

2- حضرت حذیفہ عدویؓ بیان کرتے ہیں کہ جنگ یرموک کے موقع پر میں اپنے چچازاد بھائی کی تلاش میں رخصوں کو دیکھ رہا تھا۔ میرے پاس کچھ پانی تھا اور میں کہہ رہا تھا اگر اس میں کچھ رقی باقی ہوئی تو میں اس کو پلا دوں اور اس سے اس کا چہرہ صاف کر دوں گا چنانچہ وہ مجھے مل گیا میں نے اس سے پانی کا پوچھا تو اس نے اثبات میں سرکا اشارہ کیا کہ اچانک دوسری طرف سے ایک اور رخی کے کراہنے کی آواز آئی تو اس نے مجھ سے اس کی طرف جانے کا کہا اس کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ ہشام بن عاصؓ ہیں۔ انہیں پانی پیش کر رہا تھا کہ کسی اور طرف سے کراہنے کی آواز آئی ہشام بن عاصؓ نے اس کی طرف جانے کا اشارہ دیا تو میں ادھر گیا تو وہ فوت ہو چکا تھا۔ پھر ہشام کی طرف پلٹا تو وہ بھی فوت ہو گئے تھے اور آخر میں اپنے چچازاد بھائی کے پاس آیا تو وہ بھی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ ان تینوں شہداء نے ایثار و قربانی کی اعلیٰ مثال پیش کی ہے اور مسلمان کی تو ساری زندگی اس انداز سے گزرتی ہے۔

3- مردی ہے کہ ابوالحسن الانطاکی کے پاس تیس سے اوپر آدمی جمع تھے اور ان کے پاس کھانے کے لئے چند روٹیاں تھیں جو ان کے لئے کافی نہیں تھیں انہیں کلوے کلوے کیا اور چراغ بجھا دیا اور پھر کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔ دسترخوان اٹھایا گیا تو پتہ چلا کہ ساری روٹیاں اسی طرح موجود ہیں اس لئے کہ کسی نے بھی وہ روٹیاں نہیں کھائیں۔ ہر ایک کی یہ تمنا تھی کہ دوسرا کھا لے۔ بھوک میں مبتلا ہر مسلمان واقعی ایثار اور ”حب خیر“ کی یہی مثال پیش کرتا ہے۔

4- مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے ایک مہمان کو ایک انصاری صحابی کھانا کھلانے کے لئے لے گئے اس کے آگے کھانا رکھا بیوی کو کہہ کر کسی بہانے سے چراغ گل کر دیا اور کھانا کھانے کے انداز سے ہاتھ بڑھاتے رہے لیکن کھایا نہیں۔ مہمان سیر ہو گیا۔ صبح ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اس ایثار اور محبت کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو دی اور یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی:

وَيُؤْتُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ غَصَصَةٌ (الحشر: 9)

”اور وہ اپنے آپ پر (دوسروں کو) ترجیح دیتے ہیں چاہے خود محتاج ہوں۔“

(متفق علیہ)

یہ واقعات مسلمان کے جذبہ ایثار اور ”حب خیر“ کی پوری عکاسی کرتے ہیں ہم نے اس لئے ان کا تذکرہ کیا ہے تاکہ عام لوگ نیکی سے محبت اور قربانی کے جذبہ سے معمور ہو کر اعلیٰ

مثالی اور اسلامی زندگی کا نمونہ پیش کریں اس لئے کہ وہ ہر چیز سے پہلے مسلمان ہے۔

## ایثار کے فوائد و ثمرات اور اثرات و نتائج

ایثار قربانی کے بے شمار فوائد اور اثرات ہیں ہم ذیل میں صرف چند ایک کا تذکرہ کرتے ہیں:

### 1- رضائے الہی کا حصول:

چونکہ اللہ رب العزت نے ایثار کی تعریف کی ہے اور اسے کامیاب قرار دیا ہے لہذا اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔

ومن يوق شح نفسه فلوالئكَ هم المفلحون (آخر: 9)

### 2- جرائم کا انسداد:

جرائم کو ختم کرنے کے لئے ان کے محرکات کا خاتمہ ہی اصل طریقہ ہے جب لوگوں میں جذبہ ایثار ہوگا اس قدر ہمدردی اور خیر خواہی کی فضاء ہوگی تو ایسے معاشرے میں کون کسی کو دکھ دینے اور جرائم کا ارتکاب کرنے کا سوچے گا لہذا ایثار جرائم کے خاتمہ اولین نسخہ ہے۔

### 3- خوشحالی:

جب معاشرے میں رہنے والے کمزوروں اور بے کسوں کا خیال رکھا جائے۔ ان کے متعلق خیر خواہی و ہمدردی کا عملی اظہار کیا جائے تو وہاں گداگری اور لوٹ مار کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً اقتصادی خوشحالی پروان چڑھے گی اور لوگوں میں کاروباری رجحان زیادہ ہوگا۔

### 4- مودت و محبت کی فضاء:

جب ایک بندہ دوسرے کے لئے ایثار کا جذبہ رکھے گا تو یقیناً دوسرے کے دل میں بھی اس کے متعلق نفرت و کدورت کی بجائے محبت و مودت کے جذبات بڑھیں گے تو اس طرح جب آپس میں محبت و اُلفت اور اس کی قدر پیدا ہوگی تو معاشرے پر اس کے مثبت اثرات پڑیں گے۔

### 5- خوشگوار معاشرہ کا قیام:

خوشگوار معاشرہ کے قیام کے لئے ایک دوسرے کے لئے عملی نیک خواہشات ہمدردی اور ایثار اپنانا ہوتا ہے جس معاشرے کے افراد میں ایثار کے جذبات ہوں گے وہاں کا معاشرہ خوشگوار ہوگا۔

## 6- ملکی ترقی:

جب کوئی کسی کے متعلق حسد، بغض نہیں رکھے گا بلکہ اپنے اوپر دوسرے کو ترجیح دے گا اور اس کی ترقی کا سوچے گا تو یقیناً ایسا ملک ترقی کرتا ہے۔

## 7- غربت و مفلسی کا خاتمہ:

جس معاشرے میں دوسروں کی غریبی، مسکینی کا خیال رکھنے والے لوگ موجود ہوں گے اور ان میں غریب اور ضرورتمند لوگوں کا احساس ہوگا اور وہ ان کی تکلیفوں کے خاتمہ کے لئے اقدامات اٹھائیں گے تو وہ نہیں سکتا کہ معاشرے سے غربت و افلاس کا خاتمہ نہ ہو۔

## 8- اسلام کے وقار میں اضافہ:

جب مسلمان دوسروں کے دست نگر رہیں گے تو عزت کیا رہے گی۔ اگر وہ غم نہ کر لیں اور اس کے لئے ایثار کو عملاً اپنائیں تو غربت کا خاتمہ ہوگا اور بین الاقوامی طور پر مسلمانوں کی عزت و وقار میں اضافہ ہوگا لہذا اسلام کا نام بلند ہوگا اور اس کا بول بالا ہوگا۔

## احسان

(Benevolence)

## معنی و مفہوم:

احسان کا مادہ (ح-س-ن) حسن ہے جس کے معنی ہیں کوئی اچھا کام کرنا یا احسن طریقہ سے کسی کام کو سرانجام دینا حسن اردو میں خوبصورتی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ غربی میں بھی اس کے معنی خوبصورت طریقے سے کام کرنے کے ہیں عربی میں احسن کے وہی معنی ہیں جو انگریزی میں خوب کیا (Well-Done) کے ہیں۔ اس لفظ کے اردو میں معنی ہوں گے: ”کمال کر دیا“ لہذا احسان کے وسیع تر معنی کسی اچھے اور نیکی کے کام کو بہترین طریقے سے سرانجام دینے کے ہیں۔ نیز خوشگوار، حق سے زائد دینا، مہلت دینا، خطا معاف کرنا، ذمہ داری پوری کرنا، باہمی معاملات فراخ دلی، بردباری و کشادگی طے کرنا بھی احسان ہے۔

جب احسان کا لفظ ایک اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں بہت زیادہ اچھے کام کرنا اور ہر اچھے کام کو بہترین طریقے سے کرنا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے زندگی اور موت کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے تاکہ ہم دیکھیں کہ تم میں سے کون کس قدر اچھے کام کرتا ہے۔ یہی حسن عمل انسان کا اصل سرمایہ ہے اسلام کا جہاں یہ حکم ہے کہ

جس قدر زیادہ نیکی ہو سکے گی جائے اسی طرح ساتھ ہی یہ بھی ہدایت ہے کہ ہر نیکی خوب سے خوب تر طریقہ پر سرانجام دو کہ گویا یہ تمہارا آخری عمل ہے اس فرمان نبوی ﷺ کا مدعا یہ ہے۔ کہ ہمیشہ حسن عمل کا اعلیٰ ترین درجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہو۔ مزید برآں مالی مدد کرنا، معیبت میں کام آنا، ضروریات پوری کرنا، دکھ درد ہائے معذرت قبول کرنا، صلح کرنا اور رنجش دور کرنا بھی اس میں شامل ہے۔

### احسان کی اقسام (Kinds):

انسانی اعمال دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں:

حقوق اللہ سے مراد ایسی عبادات ہیں جن کا تعلق فقط اللہ سے ہے مثلاً ہم نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں یا حج کرتے ہیں یا گویا اللہ کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ حقوق العباد سے مراد یہ ہے کہ بندوں کے جو حقوق ہم پر ہیں ہم انہیں ادا کریں مثلاً ہم پر ہمارے والدین کے حقوق ہیں ہماری اولاد کے حقوق ہیں یا رشتہ داروں اور مسایلوں کے حقوق ہیں ان سب حقوق کو حقوق العباد کہا جاتا ہے۔ اسلام کا حکم ہے کہ ان پر دو حقوق کی ادائیگی میں احسان کو ملحوظ رکھو جب عبادت کی جائے تو بہترین طریقہ سے کی جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

احسن کما احسن اللہ الیک

”جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کئے ہیں اسی طرح تو بھی احسان کر۔“

اس حکم ربانی سے مراد یہ ہے کہ جس طرح اللہ نے تجھے ”محسن تقویم“ یعنی بہترین شکل و صورت پر پیدا فرمایا ہے اور تجھے بے شمار مخلوقات پر فضیلت دی ہے اسی طرح تو بھی اس کے بدلے میں بہترین اعمال سرانجام دے۔ اللہ نے انسان میں اپنی روح پھونکی ہے اسے عقل و شعور سے نوازا ہے اور دنیا میں اسے اپنا خلیفہ اور نائب بنا کر بھیجا ہے یہ اللہ کے احسانات ہیں اگر ان کے جواب میں انسان برے اعمال کرنے لگے تو یہ احسان فراموشی ہوگی حالانکہ نیکی کا بدلہ نیکی ہونا چاہئے۔

جیسا کہ فرمان خداوندی ہے:

هل جزاء الاحسان الا الاحسان

”کیا نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے؟“

یعنی معمولی عقل و شعور رکھنے والا شخص بھی یہ جانتا ہے کہ نیکی کا بدلہ نیکی ہی ہونا چاہئے۔

لہذا ہمیں اللہ کے احسانات کے جواب میں احسان کرنا چاہئے۔

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

## اہم نکات:

یہ مندرجہ ذیل ہیں:

## 1- حسن نیت:

عبادت میں احسان کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ ہم خلوص نیت سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اور کسی دوسری طاقت کو اس میں شریک نہ کریں۔ یعنی عبادت سے ہمارا مقصد صرف اور صرف رضائے الہی کا حصول ہو قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وما امروا الا ليعبدوا الله مخلصين له الدين (سورة البينه 5)

”اور انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین کو اس کے لئے خالص کر کے۔ یہی خلوص نیت احسان کہلاتا ہے۔“

اگر اللہ کی عبادت میں اس کی رضا کے علاوہ کوئی اور جذبہ شریک ہو جائے تو یہ خلوص نیت باقی نہیں رہے گا پھر اسے شریک کہا جائے گا۔ جیسے قرآن نے ظلم عظیم فرار دیا ہے اللہ کا حکم تو یہ ہے کہ ہم نہ صرف اپنی زبان سے اللہ کی وحدانیت کا اقرار کریں بلکہ دل میں بھی یقین رکھیں کہ ہماری نمازیں، ہماری قربانیاں، ہماری زندگی اور ہماری موت سب اللہ کے لئے ہیں جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

## 2- موجودگی کا احساس:

عبادت میں احسان کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ جب ہم عبادت کریں تو اس احساس کے ساتھ کریں گویا کہ ہم اللہ کے روبرو کھڑے ہیں۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تو اس طرح عبادت کرے۔ کا ایک ترازو کہ گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر یہ نہ ہو تو اس طرح عبادت کر کہ گویا وہ تجھے دیکھ رہا ہے یعنی ہماری مرعبات مکمل خشوع و خضوع کے ساتھ سرانجام پائی چاہئے۔ جس طرح ایک غلام اپنے آقا کے سامنے دست بستہ کھڑا ہوتا ہے۔ اسی طرح ہمیں بھی اللہ کے سامنے عاجزانہ انداز سے کھڑا ہونا چاہئے اور ہمہ وقت اس کی موجودگی کا احساس کرتے رہنا چاہئے۔ حضور ﷺ کے الفاظ میں اگر ہمارے لئے یہ احساس مشکل ہو کہ ہم اللہ کو دیکھ رہے ہیں تو کم از کم ہمیں یہ تو ضرور محسوس کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ پردے کے پیچھے چھپ کر ہمیں دیکھ رہا ہے اور ہماری یہ حرکت اس کی نگاہ میں ہے لہذا ہماری پوری توجہ اس کی طرف مبذول دینی چاہئے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

والله بما تعملون خبير

”اللہ تعالیٰ سب اعمال سے باخبر ہے“

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

یعلم ما فی السموت والارض.....

”کے مصداق زمین و آسمان کی ہر چیز کو جانتا ہے۔ وہ دل کی پوشیدہ باتوں سے بھی باخبر ہے جہاں تم دوہوتے ہو وہاں وہ تیسرا ہوتا ہے اور جہاں تو اکیلے ہو وہاں وہ دوسرا ہوتا ہے لہذا اس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ وہ ہر وقت جاگ رہا ہوتا ہے اسے کبھی نیند نہیں آتی نہ ہی اس پر ٹھکن طاری ہوتی ہے لہذا تم جو عمل بھی کرو اس احساس کے ساتھ کرو کہ وہ علیم بذات الصدور (یعنی دل کے بھیدوں سے واقف ذات تمہیں دیکھ رہی ہے)۔“

### 3- نیکی سے پیش آنا:

حقوق العباد کے ضمن میں احسان کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ آپ ہر انسان کی خیر خواہی کریں اور اس کی بھلائی کے آرزو مند ہوں۔ اسلام میں خوش آمدید (Greeting) یعنی باہم ملاقات پر ”السلام علیکم“ کا تبادلو کیا جاتا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ میں آپ کی سلامتی چاہتا ہوں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ سلام کو خوب پھیلاؤ اور ہر ملنے والے کو سلام کرو چاہے تم اسے جانتے ہو یا نہ جانتے ہو۔

احسان کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ جب کوئی شخص آپ سے نیکی کرے تو آپ اس سے بڑھ کر بدلہ اتاریں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

”ان الله یامر بالعدل والاحسان

”اللہ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے۔“

عدل کے معنی برابری کے ہیں اور احسان کے معنی برابری سے زیادہ کے یہاں احسان سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص آپ کو تحفہ دے تو آپ اس سے بڑھ کر تحفہ دیں۔ اگر کوئی شخص آپ کو السلام علیکم کہے تو آپ جواب میں بڑھ کر علیکم السلام ورحمۃ اللہ کہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنہ میں عادل اور محسن دونوں شامل ہیں اللہ کا عدل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص برائی کا ارتکاب کرے تو اللہ اس کے نامہ اعمال میں ایک ہدی لکھ دے لیکن اس کے برخلاف اس کا احسان یہ ہے کہ اگر وہ ایک نیکی کرے تو اللہ اسی کے نامہ اعمال میں دس سے لے کر کئی گنا تک نیکیاں لکھ دے ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا بندہ اگر میری طرف ایک قدم بڑھاتا ہے تو میں اس کی طرف دس قدم بڑھ کر آتا ہوں لیکن اگر وہ مجھ سے ایک قدم دور ہوتا ہے تو میں بھی اس سے ایک قدم دور ہٹ جاتا ہوں۔

### 4- احسان میں اسوۂ رسول ﷺ:

حضور ﷺ کا دستور تھا کہ جب آپ قرض یا ادھار لیتے تو واپسی پر اس سے زیادہ ادا فرماتے ایک دفعہ آپ نے کسی سے ایک اونٹ قرض لیا جب واپس کیا تو اس سے بہتر اونٹ

واپس کیا بعض اوقات ایسا ہوتا کہ آپ کسی شخص سے ایک چیز خریدتے اور قیمت چکا دینے کے بعد وہ چیز اسی کو بطور عطیہ عنایت فرما دیتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے حضرت عمرؓ سے ایک اونٹ خریدا پھر اسی وقت وہ اونٹ حضرت عمرؓ کے بیٹے کو دے دیا۔ حضور ﷺ کی پوری زندگی احسان کا عملی نمونہ تھی۔ آپ نے کبھی کسی شخص کا حق سلب نہیں کیا بلکہ دوسرے لوگوں کو ان کے حق سے زیادہ دیا۔ اگر کسی نے آپ سے ذرا سی نیکی کی تو آپ نے بڑھ چڑھ کر اس کا بدلہ دیا۔ عبداللہ بن ابی سخت منافق تھا اور حضور اس کی مخالفت سے پوری طرح باخبر تھے لیکن اس کے مرنے پر کفن کے لئے اسے اپنا قمیض عطا فرمایا کیونکہ اس نے جنگ بدر کے موقع پر حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس کو اپنا قمیض دیا تھا۔ حضرت عباس کی طرف سے لڑنے آئے تھے اور پھر کفار مکہ کی شکست کے نیچے میں مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہو گئے تھے۔ چونکہ وہ گلے سے تنگے تھے اور کسی کا قمیض انہیں پورا نہیں آتا تھا اس لئے عبداللہ بن ابی کے انہیں پہننے کے لئے اپنا کرتہ دیا تھا۔ حضور ﷺ نے عبداللہ بن ابی کے اس احسان کو یاد رکھا اور اس کی وفات پر کفن کے لئے اپنا قمیض عنایت فرمایا اسی طرح دادا کی وفات کے بعد حضور ﷺ کی پرورش آپ کے چچا ابوطالب نے اپنے ذمہ لے لی۔ اس احسان کا بدلہ آپ ﷺ نے اس طرح اتارا کہ اپنے چچا کے بیٹے علیؓ کی پرورش اپنے ذمہ لے لی۔ غرض کہ حضور ﷺ احسان کی سچی تصوری اور حل جزاء الاحسان الا احسان کا عملی نمونہ تھے۔

### 5۔ نیکی کے بدلے میں نیکی:

اسلام کی تعلیم صرف یہیں تک محدود نہیں کہ نیکی کے بدلے میں نیکی کرو بلکہ اس نے آگے بڑھ کر اسلام اپنے ماننے والوں کو اس بات کی تلقین بھی کرتا ہے کہ وہ برائی کے بدلے میں بھی نیکی کریں قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ادفع بالتي هي احسن السنة

”برائی کو احسن طریقہ سے برے ہٹاؤ۔“

یعنی برائی کرنے والے سے بھی اچھا سلوک کر دیا ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! اگر میں کسی کے پاس جاؤں اور وہ میری مہمانی اور ضیافت نہ کرے تو کیا جب وہ میرے پاس آئے تو میں بھی اس سے ویسا ہی سلوک کروں؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ ”نہیں جب وہ تیرے پاس آئے تو تو اس کی مہمانی کر۔“ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دینا چاہئے۔ ایک شخص اگر کتبوی کرے تو اس کے جواب میں کتبوی نہیں کرنی چاہئے۔ اس سے آپ میں اور اس میں فرق کیا رہ جائے گا مزہ تو یہ ہے کہ وہ برائی کرے اور آپ جواب میں بھلائی کریں۔

ہمارے ساتھ احسان کریں گے تو ہم بھی احسان کریں گے اور اگر وہ ظلم کریں تو ہم بھی ظلم کریں گے۔ نہیں بلکہ ایسا کرو کہ لوگ احسان کریں تو ان کے ساتھ بھی احسان سے پیش آؤ اور اگر وہ برائی کریں تو (تب) بھی ظلم نہ کرو۔“

برائی کے مقابلہ میں نیکی کی تلقین صرف اسلام کی خصوصیت ہے ورنہ عام طور پر انسانی رویہ یہی ہے کہ جو شخص جیسا سلوک کرے اس سے ویسا ہی سلوک کیا جائے۔

### ۱۔ قتل میں احسان:

حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ جب تم کسی کو ہلاک کر دو تو بھلے طریقہ سے قتل کرو اور جب تم ذبح کر دو تو بھلے طریقہ سے ذبح کر دو اپنی چھری تیز کر لو اور اپنے ذبح کو راحت پہنچاؤ۔ (مسلم کتاب الصيد) اس حدیث سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

جب کسی شخص یا موذی جانور کو مارو تو ظالمانہ طریقے سے ہلاک نہ کر دو قبل از اسلام دو زمین بعض لوگ اپنے دشمن کو ایذا دے دے کر ظالمانہ طریقے سے ہلاک کیا کرتے تھے۔ کبھی ایک بازو کاٹتے کبھی دوسرا۔ پھر ایک ایک کر کے دونوں ٹانگیں کاٹتے تھے۔ اس طرح مقتول سسک سسک کر جان دیتا تھا۔ بعض لوگ دشمن کو قید کر کے بھوک اور پیاس سے مار دیتے تھے۔ اسلام نے ان تمام طریقوں سے ممانعت کر دی اس طرح عرب دشمن کی لاش کا مسئلہ کیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر تمام مرووں کی ٹانگیں اور کان کاٹ کر ہار پرو لیتے تھے۔ جنگ احد کے موقع پر ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے سید الشہداء حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر کچا چبا لیا تھا۔ اسلام نے لاش کی بے حرمتی کے یہ تمام طریقے بند کر دیے۔ اسی طرح اسلام نے موذی جانوروں مثلاً سانپ بچھو وغیرہ کو ظالمانہ طریقے سے مارنے سے منع کیا ہے اگر موذی جانوروں کو چوٹ سے مارا جاسکے تو انہیں آگ میں جلانا روا نہیں ہے۔

### ii۔ ذبیحہ:

اسلام نے حلال جانوروں کے ذبح کے بارے میں بھی مفصل ہدایات دی ہیں۔ سب سے پہلی ہدایت تو یہ ہے کہ ذبح کرنے سے پہلے چھری تیز کر لو اور کند چھری سے ذبح کر کے جانور کو عذاب نہ دو۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ چھری تیز کر کے اپنے ذبیحہ کو راحت پہنچاؤ۔ یعنی اگر تیز چھری سے ذبح کرو گے تو جانور کو تکلیف کم ہوگی۔ ذبیحہ کے بارے میں دوسری ہدایت یہ ہے کہ ذبح کرنے سے پہلے جانور کو خوب کھلا پالو بھوک کی حالت میں جانور کو ذبح نہ کرو۔ تیسری ہدایت یہ ہے کہ جانور کو ذبح کرنے کے لئے تھکاتے نہ لے جاؤ۔ چوتھی ہدایت یہ ہے کہ ایک جانور کے سامنے دوسرے جانور کو ذبح نہ کرو بلکہ ہر جانور کو الگ جگہ ذبح کر دو اور آخری



برائی کو قبح کرنے کے لئے لرا کر اس کے گھر سے چھوڑ کر رہا ہے اور وہ بڑی بے بسی سے اس کو دیکھ رہی ہے۔ حضور ﷺ نے اس شخص سے فرمایا کیا تم اسے موت سے پہلے ہی مارنا چاہتے ہو؟ ایک صحابی نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ بکریوں کو ذبح کرتے وقت تجھے ترس آتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر تم ان پر رحم کرو گے تو اللہ بھی تم پر رحم کرے گا۔

## 6۔ معاشیات و احسان میں تعلق:

احسان معاشی سرگرمیوں پر بہت گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ جہاں احسان آجر سے یہ کہتا ہے کہ مزدور کی اجرت سے بڑھ کر اس کو دیا جائے وہاں احسان مزدور سے بھی یہ رائے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی پوری کارکردگی، ایمانداری اور طاقت کو استعمال میں لائے جس سے آجر اور مزدور کے تعلقات بہتر ہو جائیں گے جس سے معاشی سرگرمیاں بہتر طور پر سرانجام پاتی رہیں اور پیداوار میں اضافہ ہوتا رہے۔ صرف میں درمیانی راستہ اپنایا جائے اعزہ و اقارب ہمسایوں اور غریبوں کے ساتھ احسان کیا جائے۔ راہ گیروں، بے کسوں، محتاجوں، یتیموں، مسکینوں، مہمانوں، مقرر و ضوں کی مدد کی جائے تجھے دینا دعوت کرنا بھی فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ اشیاء کے تبادلہ میں بھی احسان کا دامن مضبوطی سے پکڑا جائے۔ دوسروں کے نقصان پر اپنا فائدہ نہ ڈھونڈا جائے۔ سوا طے کرنے میں مروت و محبت کا عنصر شامل ہو تو لئے میں بھی کمی بیشی نہ ہونے پائے۔ خندہ پیشانی و ملنساری سے خرید و فروخت ہو۔ قرض میں سہولت دینا بہت اہم ہے خیرات و صدقات بھی احسان کا لازمی جزو ہیں۔ وصیت وراثت اور شفعہ میں بھی اس کی اہمیت مسلمہ ہے۔ سرکاری واجبات کی ادائیگی میں احسان شامل ہے خراب حالات میں ایک دوسرے کی مدد کرنا بھی احسان کہلاتا ہے۔ کسی طرح بھی سکھ دینا احسان ہے۔

## اخوت / بھائی چارہ

(Brotharhood)

### اخوت کا معنی:

اخوت کا لفظ ارخ سے اخذ کردہ ہے۔ عربی میں ارخ کے معنی بھائی کے ہیں۔ لہذا اخوت کے معنی ہیں برادری بھائی چارہ برادرانہ مواخاۃ اصطلاح میں اخوت سے مراد اسلامی برادری ہے جو الفت و محبت کے برادرانہ رشتوں میں بندھی ہوئی ہے۔ اس برادری میں شامل ہر فرد ایک دوسرے کو سکے بھائی سے بڑھ کر محبوب رکھتا ہے۔ اس طرح اخوت اسلامی دنیا کے مسلمانوں پر

محیط ہے اگر کسی ایک ملک کے مسلمانوں کو تکلیف پہنچتی ہے تو ستاری دنیا کے مسلمان اذیت محسوس کرتے ہیں۔

### اخوت کا مفہوم:

اخوت کا لفظ ”اخ“ سے نکلا ہے۔ اس کے معنی بھائی چارے کے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں اخوت کا لفظ اہل اسلام کے باہمی تعلق اور رشتے کے لئے بولا جاتا ہے یعنی تمام مسلمان آپس میں رشتہ اسلام کی وجہ سے ایک دوسرے کے بھائی ہیں خواہ ان کا تعلق کسی بھی خاندان، برادری، قبیلے یا علاقے سے ہو اور ان کے درمیان کتنا ہی زیادہ فاصلہ کیوں نہ ہو صرف کلمہ گو ہونے کی وجہ سے ہی ایک انسان دوسرے انسان کا بھائی بن جاتا ہے۔ عام طور پر لوگ خاندانی اور نسلی تعلقات کو ہی بھائی چارہ سمجھتے ہیں حالانکہ اسلام کا رشتہ اخوت کہیں زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔

اسلام ہی وہ دین ہے جو اخوت و بھائی چارے کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام سے قبل تمام انسانیت ملک، قوم، رنگ اور نسل کے تعصبات و تفریقات میں بٹی ہوئی تھی۔ ہر قوم دوسری قوم کو اپنا دشمن سمجھتی تھی۔ ہر قبیلہ دوسرے سے دست و گریباں تھا۔ پوری انسانیت باہم برسرِ پیکار تھی اور قبل از اسلام عرب جنگ و جدل میں مصروف تھے اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ آپ ﷺ نے تمام دنیا کو اخوت کا درس دیا اور یہ بات سمجھائی کہ روئے زمین کے تمام انسان ایک ہی اصل کی مختلف شاخیں ہیں۔

### اخوت کی اہمیت قرآن کی روشنی میں:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يا ايها الناس اتقوا ربكم الذى خلقكم من نفس واحدة (النساء: 1)

”اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تمہیں ایک ہی اصل سے پیدا کیا۔“  
دوسری جگہ فرمایا:

وما كان الناس الا امة واحدة فاحفظوا (پولس: 19)

حقیقت میں ہم خوارِ محبت، انس اور پیار ہی وہ بنیاد ہے جس پر دین اسلام نے مسلمانوں میں بھائی چارے کو قائم کیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

انما المؤمنون اخوة فاصلحوا بين اخويكم (الحجرات: 10)

”مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں لہذا اپنے بھائیوں کے درمیان صلح صفا کر دیا کرو۔“

اس رشتہ اخوت میں صرف مومن مرد ہی شامل نہیں ہیں بلکہ مومن عورتیں بھی مواخات

میں اپنے مسلمان بھائیوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

والمؤمنون والمؤمنات بعضهم اولیاء بعض (التوبہ: 71)  
 ”مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔“

اخوت حدیث کی روشنی میں:

رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضا و شك بين اصابعه (متفق علیہ)  
 ”مومن مومن کے لئے عمارت کی مثل ہے جس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کو مضبوط کرتی ہے۔“

جس طرح ہر اینٹ عمارت کا حصہ ہے اسی طرح ہر مسلمان اسلامی معاشرے کا حصہ ہے اور اسلامی معاشرہ افراد کی اصلاح ہی سے صاف ستھرا مضبوط اور توانا ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

مثل المؤمنین فی توادهم و تراحمهم و تعاطفهم مثل الجسد اذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى (متفق علیہ)  
 ”مومنوں کی مثال ان کے آپس کی محبت و شفقت، رحم و دلی اور مردت، مہربانی اور حسن سلوک میں ایک جسم کی طرح ہے جب اس کا کوئی عضو بیمار ہوتا ہے تو سارا جسم جاگتا ہے اور اس کو بخار آ جاتا ہے۔“

غور کیجئے! آنکھ میں چھوٹا سا ذرہ پڑ جائے تو کسی کروٹ چھین نہیں آتا۔ ذرہ نکلے ہی سارا جسم راحت پا جاتا ہے اسی طرح جب مسلمان تکلیف میں ہوں خواہ ان کا تعلق دنیا کے کسی ملک اور زمین کے کسی خطہ سے کیوں نہ ہو دنیا بھر کے مسلمانوں کو ان کے دکھ درد میں شریک ہونا چاہئے اور ان کی ہر ممکن مدد کرنی چاہئے اور جب تک ان کے مصائب اور مشکلات دور نہ ہو جائیں انہیں آرام سے نہیں بیٹھنا چاہئے۔ یہی اس حدیث مبارک کا مطلب اور مفہوم ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

المسلم اخو المسلم لا يظلمه ولا يسلطه من كان في حاجة اخيه كان الله في حاجته (متفق علیہ)  
 ”مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں نہ کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی پر ظلم کرتا ہے اور نہ ہی اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے جو کوئی اپنے مسلمان بھائی کی ضرورت پوری کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ روز جزا (جب نفسا نفسی کا عالم ہوگا) اس کی حاجت پوری فرمائے گا۔“

آپ کا ارشاد مبارک ہے:

”تم میں سے کوئی شخص (کامل) ہونا نہیں چاہتا یہاں تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی بات پسند نہ کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔“

ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنے لئے خیر و برکت کا ہی طالب ہوتا ہے تو لازماً اسے اپنے بھائی کے لئے بھی خیر و برکت کا ہی طالب رہنا چاہئے صرف اسی حدیث مبارک پر عمل کرنے سے دھوکا فریب اور شر و فساد کی ساری راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

”مواخاة“ اللہ کا انعام ہے:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (آل عمران: 103)

”(مسلمانو!) اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے (اسلام سے قبل) تم ایک دوسرے کے دشمن تھے (اسلام قبول کرنے کے بعد) اللہ نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل سے تم بھائی بھائی بن گئے۔“

یعنی جس وقت پورے عرب میں قبائلی نظام رائج تھا، لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم تھا، کوئی حکومت یا عدالت سرے سے موجود ہی نہ تھی کہ جس کی طرف رجوع کیا جاسکتا، اگر کسی قبیلہ کا کوئی آدمی قتل ہو جاتا تو مقتول کا قبیلہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتا جب تک اس کا انتقام نہ لے لیتا۔

قبائلی حیثیت جسے قرآن نے ”حمیۃ جاہلیۃ“ کا نام دیا ہے اس انتہا کو پہنچی ہوئی تھی کہ کوئی فریق یہ سوچنے کی زحمت گوارا ہی نہ کرتا تھا کہ قصور کس کا ہے؟ صرف یہ دیکھا جاتا تھا کہ چونکہ ہمارے قبیلہ کے آدمی کو فلاں قبیلہ کے آدمی نے نقصان پہنچایا ہے اس لئے اس سے انتقام لینا ضروری ہے۔ پھر اس انتقام میں انصاف کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ جہاں کہیں کوئی جنگ چھڑی تو پھر وہ ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ مکہ میں بنو بکر اور بنو تغلب کی لڑائی شروع ہوئی جس میں نصف صدی لگ گئی۔ خاندان کے خاندان تباہ ہو گئے، کشتوں کے پٹے لگ گئے مگر لڑائی ختم ہونے میں نہ آئی۔

پھر صورت حال صرف مکہ اور مدینہ تک ہی محدود نہ تھی بلکہ پورے عرب میں ایک جیسی آگ لگی ہوئی تھی اور قریب تھا کہ پورنی عرب قوم نیست و نابود ہو جائے کہ اس حال میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو دولت اسلام سے سرفراز فرمایا جس سے پرانی رنجشیں اور کدورتیں دور ہو گئیں۔ عداوت کی بجائے مسلمانوں کے دلوں میں الفت و محبت پیدا ہو گئی اور وہ بالکل بھائیوں

بعد بہیم کی آگ کے گڑھے میں گرنے سے بچا لیا۔ اسی نکتہ کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ انفال میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا:

وَالْف بَيْن قُلُوبِهِمْ لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَا أَلْفَتْ بَيْن قُلُوبِهِمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ أَلْفَ بَيْنَهُمْ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (الانفال: 63)

”اس رب کریم نے مسومنوں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیئے آپ اگر روئے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو ان لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے مگر وہ اللہ ہے جس نے ان لوگوں کے دل جوڑے یقیناً اللہ تعالیٰ غالب حکمتوں والا ہے۔“

**اخوت کا عملی نمونہ:**

رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کی زندگیوں میں اخوت کا عملی نمونہ تھیں۔ جب حضور مکہ سے مدینہ تشریف لائے تو انصار اور مہاجرین کے درمیان مؤاخاۃ کو عملی شکل عطا فرمائی۔

جس طرح رسول اللہ ﷺ نے مسجد نبوی کی تعمیر کا اہتمام فرما کر باہمی اجتماع اور میل محبت کے ایک مرکز کو وجود بخشا (کہ مسلمان باہم مل کر نہ صرف رب کریم کے حضور اپنی پیشانیوں کو جھکا کر اس کی رضا اور ہدایت کے طلب گار بنیں بلکہ امیر و غریب، شاہ و گدا، ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں اور ان میں اتحاد و اتفاق اور اُلفت و محبت کی فضاء برقرار رہے۔) اسی طرح آپ ﷺ نے تاریخ انسانی کا ایک اور تائبناک کارنامہ انجام دیا جسے مہاجرین و انصار کے درمیان مؤاخاۃ اور بھائی چارے کے عمل کا نام دیا جاتا ہے۔

پھر رسول کریم ﷺ نے سیدنا انس بن مالک کے مکان میں مہاجرین و انصار کے درمیان بھائی چارہ کرایا۔ کل نوے آدمی تھے آدھے مہاجرین اور آدھے انصار۔ بھائی چارے کی بنیاد یہ تھی کہ یہ ایک دوسرے کے غمخوار ہوں گے اور موت کے بعد نبی قرابت داروں کی بجائے یہی ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔ رات کا یہ حکم جنگ بدر تک باقی رہا۔

اس بھائی چارے کا مقصد یہ تھا کہ جاہلی عصبیتیں تحلیل ہو جائیں حقیقت و غیرت جو کچھ ہو کہ اسلام کے لئے ہو۔ نسل و وطن اور رنگ کے امتیازات مٹ جائیں۔ بلندی اور پستی کا معیار انسانیت و تقویٰ کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے اس بھائی چارے کو محض کھوکھلے الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا تھا بلکہ اسے ایک ایسا نافذ العمل عہد و پیمان قرار دیا تھا جو خون اور مال سے مربوط تھا۔ یہ خالی خولی سلامتی اور مبارک باد نہ تھی کہ زبان پر روانی کے ساتھ جاری رہے مگر نتیجہ کچھ نہ ہو بلکہ اس بھائی چارے کے ساتھ ایثار و غم گساری اور اُلفت و محبت کے جذبات بھی مخلوط تھے اور اسی لئے اس نے اس

نئے معاشرے کو بڑے نادر اور تابناک کارناموں سے پر کر دیا تھا۔  
 نبی اکرم ﷺ کی اس قائم کردہ مواخات کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ انصار نے  
 فراخ دلی اور زندہ دلی کا ثبوت دیا۔ ہر انصاری اپنے مہاجر بھائی کو اپنے ساتھ لے کر گیا اپنے  
 مال باغات اور جائیداد میں سے نصف اس کو دے دیا بلکہ بعض انصاری جن کی دو بیویاں تھیں  
 انہوں نے اپنی ایک بیوی کو طلاق دے کر دوسرے بھائی سے عقد کی پیشکش کی لیکن انہوں نے  
 انصار کی اس پیشکش کو شکرینے کے ساتھ رد کر دیا اور بعض مہاجرین نے اپنے انصاری بھائیوں  
 سے عملاً کسی قسم کا حصہ نہ لیا مگر انصاری بھائیوں نے خلوص و محبت کا مظاہرہ کرنے میں کوئی کسر  
 اٹھا نہیں رکھی۔ یہودیوں اور منافقوں نے کئی ایک مواقع پر اوس اور خزرج کو باہم لڑانے کی  
 کوشش کی اور انصار و مہاجرین کے درمیان دراڑیں پیدا کرنے کی سرگوشش کی۔ ایک مرتبہ تو  
 قریب تھا کہ انصار اور مہاجرین کے درمیان تلوار چل جائے۔ یہودیوں نے کچھ اس طرح کی  
 فضاء پیدا کر دی کہ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے اور یہ ٹھہر گیا کہ حرہ کے میدان  
 میں جا کر دل کھول کر لڑیں اور پیاسی زمین کو اپنے خون سے سیراب کریں۔ رسول کریم ﷺ کو  
 بردقت پتہ چل گیا تو آپ ﷺ نے دونوں گروہوں کو خطا کیا اور ان کے درمیان صحیح صفائی  
 کرائی اور دونوں گروہ اپنی اس حرکت پر نادم ہوئے۔

## اخوت کی افادیت و اہمیت

### (Utility and Importance)

مسلم برادری دنیا کی واحد برادری ہے جس کے افراد ایک دوسرے سے نظریاتی رشتے  
 میں منسلک ہیں اور سب بھائیوں سے بڑھ کر ہم عقیدہ بھائیوں سے پیار کرتے ہیں۔ دنیا میں  
 برادرانہ جذبات عام طور پر نسبی یا خاندانی رشتوں تک محدود ہوتے ہیں۔ ایک ہی خاندان سے  
 تعلق رکھنے والے افراد برادری کہلاتے ہیں جو رنج و غم اور مسرت میں ایک دوسرے کے ساتھی و  
 شریک ہوتے ہیں لیکن اخوت اسلامی کے رشتے میں بندھے ہوئے افراد نسب یا خاندان کو اتنی  
 اہمیت نہیں دیتے جس قدر وہ مذہب کو دیتے ہیں ان کے حقیقی بھائی اگر کافر ہوں تو ان کے  
 مقابلے میں وہ دینی بھائیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے سبب بھائی اگر کفار کی طرف سے لڑنے  
 آئیں تو وہ اسلام کی جانب سے ان کے مقابلے میں بھی صف آراء ہو جاتے ہیں اور خاندان یا  
 برادری کو اسلام کے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں دیتے۔

جب قریش مکہ نے مسلمانوں کا مکہ میں رہنا دبوچ کر دیا تو حضور ﷺ نے انہیں نہینہ کی  
 طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی چنانچہ ایک ایک دو دو کر کے مسلمان مکہ سے ہجرت

کر کے مدینہ چلے آئے بعد میں حضور اکرم ﷺ خود بھی مدینہ شریف لے آئے۔ مہاجرین مکہ سے بالکل بے سروسامان آئے تھے۔ اگرچہ ان میں دولت مند اور خوشحال لوگ بھی تھے لیکن چونکہ وہ کافروں سے چھپ کر نکلے تھے اس لئے کچھ بھی ساتھ نہ لائے انصار مدینہ نے مہاجرین کی بڑی آؤ بھگت کی لیکن یہ عارضی بندوبست تھا اور ایک مستقل انتظام کی ضرورت تھی۔ لہذا حضور ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخاۃ قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ حضرت اس بن مالکؓ کے مکان میں تمام لوگ جمع ہوئے مہاجرین کی کل تعداد اس وقت 45 تھی انصار میں سے دو افراد کو بلا کر فرماتے گئے کہ آج سے یہ اور تم بھائی بھائی ہو۔ انصار نے مہاجرین کو ساتھ لے جا کر گھر کی ایک ایک چیز کا جائزہ لیا اور اپنے اپنے مہاجر بھائی سے کہا آدھا آپ کا آدھا ہمارا ہے۔ سعد بن ریحؓ جو عبدالرحمن بن عوفؓ کے بھائی قرار پائے تھے دو بیویاں مانگتے تھے انہوں نے عبدالرحمنؓ سے کہا میں ایک کو طلاق دیتا ہوں آپ اس سے نکاح کر لیجئے لیکن انہوں نے شکر یہ کے ساتھ انکار کر دیا۔

مواخاۃ کا یہ رشتہ بالکل حقیقی رشتہ بن گیا۔ جب کوئی انصاری فوت ہوتا تو اس کی جائیداد مہاجر بھائی کو مل جاتی اور سکے بہن بھائی محروم رہتے۔ مہاجرین کے لئے مکانات کا یہ انتظام ہوا کہ انصار نے اپنے گھروں کے آس پاس اقتادہ زمینیں اپنے مہاجر بھائیوں کو دے دیں۔ جن کے پاس زمین نہ تھی انہوں نے اپنے مسکونہ مکانات بانٹ کر مہاجرین کو دے دیئے بعد میں جوں جوں مزید مسلمان مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آتے گئے حضور ﷺ انہیں بھی سلسلہ مواخات میں انصار کے بھائی بناتے گئے۔

اگرچہ مواخات کا سلسلہ شروع شروع میں انصار و مہاجرین تک محدود تھا لیکن بعد میں سارے مسلمانوں کو ایک برادری قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا:

انما المؤمنون اخوة

”بیکہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔“

قرآن کے اس ارشاد کا اتنا اثر ہوا کہ مسلمان اپنے غیر مسلم رشتہ داروں کے مقابلے میں مسلمان بھائیوں کو ترجیح دینے لگے۔ حتیٰ کہ میدان جنگ میں اپنے غیر مسلم بھائیوں کے مقابلے میں شمشیر بکف آرا ہو گئے۔ چنانچہ چشم فلک نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ خزوہ بدر کے موقع پر حضرت ابو عبیدہؓ من الجراح نے اپنے سکے باپ کو جو کفار کی طرف سے لڑنے آئے تھے اسامہؓ پر قربان کر دیا۔ اس لڑائی میں لشکر قریش کے سردار عتبہ کے بیٹے ابو جہلؓ مسلمانوں کی طرف سے داد شجاعت دے رہے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بیٹے جو اس وقت تک کافر تھے۔ میدان جنگ میں بڑھے تو حضرت ابوبکرؓ کو مار کھینچ کر مقابلے کو نکلے اسی لڑائی میں حضرت عمرؓ کی تلوار

اپنے ماموں کے خون سے رنگین ہوئی۔ گویا مسلمانوں نے عملاً یہ ثابت کر دیا کہ ان کی نظر میں رشتہ صرف دین کا رشتہ ہے۔ اگر بھائی اسلام قبول کر لیں تو وہ بھائی ہیں اگر اسلام قبول نہ کریں تو وہ دشمن ہیں۔

اخوت اسلامی کا دوسرا مظاہرہ جنگ بدر کے قیدیوں کے فیصلے کے موقع پر پیش آیا تھا۔ حضور ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ اسیران جنگ کے معاملے میں کیا کیا جائے حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا کہ سب اپنے ہی عزیز و اقارب ہیں لہذا قیدیہ لے کر چھوڑ دیئے جائیں لیکن حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ سب کو قتل کر دیا جائے اور ہم میں سے ہر شخص اپنے عزیز کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔ اگرچہ بعد میں حضرت ابو بکرؓ کی رائے پر فیصلہ ہوا کہ سب کو قیدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے لیکن حضرت عمرؓ کا یہ مشورہ ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے عزیز کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے اس بات پر شاہد ہے کہ مسلمان کے نزدیک حقیقی اخوت صرف اسلامی اخوت ہے۔ سکا بھائی اگر کافر ہے تو وہ مسلمان کا بھائی کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ یہ نکات اہمیت پر روشنی ڈالتے ہیں:

### i- آپس میں نرمی:

اخوت اسلامی کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ اس برادری میں شامل افراد آپس میں جتنے رحیم و شفیق ہوتے ہیں۔ اتنے ہی دشمن کے مقابلے میں سخت ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

محمد رسول الله والذين معه اشد على الكفار رحماء بينهم

”محمد ﷺ کے رسول ﷺ ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ کفار کے خلاف سخت ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ کوئی نرم چارہ یا موم کی ٹاک نہیں کہ کافر چدر چاہیں موڑ لیں بلکہ وہ اپنے موقف پر سختی سے ڈٹ جانے والے ہیں اور آپس میں رحیم و شفیق ہونے سے مراد یہ ہے کہ آپس میں بھائیوں کی طرح الفت و محبت سے رہتے ہیں اور ایک دوسرے پر جان نچھاور کرتے ہیں۔“

بقول حضرت علامہ اقبال:

ہو حلقہ یاران تو برہم کی طرح نرم  
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

### ii- خیر خواہی:

اسلامی اخوت کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی برادری کے تمام ارکان آپس میں خیر خواہ ہوں کیونکہ اخوت کا اصل الاصول نیک نیتی یا خلوص ہے۔ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ صحابہ کرام



سے ارشاد فرمایا کہ دین خلوص کا نام ہے۔ صحابہؓ نے پوچھا خلوص کس لئے؟ آپؐ نے فرمایا اللہ کے لئے مسلمانوں کے حکام کے لئے اور مسلمان عوام کے لئے یعنی ہر مسلمان جس طرح اللہ تعالیٰ سے متخلص ہوتا ہے اسی طرح اسے تمام برادران اسلام سے متخلص ہونا چاہئے۔ قرآن میں ارشاد ہے۔

اولیک بعضهم اولیاء بعض۔

”مسلمان ایک دوسرے کے خیر خواہ ہیں۔“

اس خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان کی بھائی چاہئے خواہ وہ سامنے موجود ہو یا غیر حاضر ہو۔ حضور ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا:

”اس خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان کی بھائی چاہئے خواہ وہ سامنے موجود ہو یا غیر حاضر ہو۔“

حضور ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا:

”کوئی بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی کچھ نہ چاہے جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے۔“

iii۔ بھائی پر ظلم نہ کرنا:

اخوت اسلامی کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان بھائی اپنے بھائی کا برادر نہ چاہے حضور ﷺ کی ایک حدیث یہ ہے:

”مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اس کا ساتھ چھوڑتا ہے نہ اس سے جھوٹ بولتا ہے نہ اسے حقیر جانتا ہے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحیح اسلامی اخوت کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ نہ چھوڑے بلکہ آخر دم تک اس کی مدد کرتا رہے۔ اسی طرح صحیح اخوت اسلامی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان سے جھوٹ نہ بولے نہ اسے دھوکہ دے۔

iv۔ مسلمان بھائی کو حقیر نہ سمجھنا:

اخوت اسلامی کو چوتھا تقاضا یہ ہے کہ تمام مسلمان ایک دوسرے کی عزت کریں اور کسی مسلمان بھائی کو اپنے سے کمتر نہ سمجھیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

”آپ کے پاس اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کو حقارت کی نظر سے دیکھنا بہت بڑا گناہ ہے۔ کیونکہ اس سے باہمی محبت ختم ہو جاتی ہے اور دلوں میں گرہیں پڑ جاتی ہیں۔“

”محکم دلائل سے مزین و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

”ہر مسلمان کا خون اس کا مال اور آبرو دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔“

یعنی وہ اپنے مسلمان بھائی کا خون نہیں بہا سکتا نہ اس کی آبرو پر ہٹ لگا سکتا ہے اور نہ ہی ناحق اس کا مال نے سکتا ہے ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے یوں فرمایا:

”کسی مسلمان کے لئے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی طرف ایسی نگاہ سے اشارہ بھی کرے جس سے وہ رنجیدہ ہو۔“

یعنی آنکھ کے اشارے سے بھی بھائی کا تہ جن کرنا (۱۱) کا (۱۰) اٹھانا اخوت اسلامی کے منافی ہے۔

#### v- اعانت کرنا:

اخوت اسلامی کا ایک اور تقاضا یہ ہے کہ ہر مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرے حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

”اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔“

حضور ﷺ کا یہ حکم سن کر صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مظلوم کی مدد کرنے والی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن ظالم کی مدد کرنے والی بات سمجھ میں نہیں آتی آپ نے فرمایا ظالم کی مدد یہ ہے کہ اسے ظلم کرنے سے روک دو یعنی اپنے کسی بھائی کو گناہ سے روکنا خیر خواہی پر مبنی ہے۔ سچی خیر خواہی یہی ہے کہ اگر ہمارا کوئی بھائی گناہ کے گڑھے میں گرنے والا ہو تو ہم آگے بڑھ کر اسے روک لیں اور ہوں گڑھے میں گرنے سے بچالیں۔

حضور ﷺ کا ایک اور ارشاد ہے کہ ”جو شخص اپنے بھائی کی حاجت روائی کرتا ہے۔ اللہ اس کا حاجت روا ہوتا ہے اور جو شخص دنیا میں کسی بھائی کے عیوب پر پردہ ڈالتا ہے اور قیامت کے روز اس کے عیوب پر پردہ ڈال دیتا ہے۔“

#### vi- جائز سفارش:

جب آپ اپنے مسلمان بھائی کی حاجت روائی نہ کر سکیں تو یہ کر سکتے ہیں کہ کسی ایسے آدمی کو سفارش کر دیں جو اس کی ضرورت پوری کر سکتا ہو۔ اسلامی اخوت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ آپ اپنے بھائی کی حاجت روائی کی پوری پوری کوشش کریں۔ ایک روز حضور ﷺ نے فرمایا کہ زبان کے صدقہ سے کوئی صدقہ افضل نہیں۔ صحابہؓ نے پوچھا:

یا رسول اللہ! زبان کا صدقہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: کوئی ایسی سفارش جس سے تم خوریزی روک دو۔ یا ایک دوسرے کو فائدہ پہنچا سکو یا کسی سے ناپسندیدہ چیز دور رکھ سکو۔

## vii- جذبہ قربانی:

مسلم بھائی چارے کا ایک فائدہ اور تقاضا یہ بھی ہے کہ مسلمان اپنے بھائی کے لئے صرف وہی چیز پسند کرے جسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے بلکہ اسے اپنی ذات پر ترجیح بھی دے۔ یہی ایثار و قربانی ہے مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ اپنی ضرورت موخر کر کے بھائی کی ضرورت پہلے پوری کرے خود بھوکا رہے اور دوسروں کا پیٹ بھرے۔ خود کمتر چیز لے لے اور اپنے بھائی کو بہتر چیز دے۔ قرآن میں مومن کی شان میں ارشاد ہوتا ہے:

وہوئرون علیہ انفسہم ولو کان بہم خصاصة (الحشر)  
 ”اور مومن اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود بھی تنگی میں کیوں نہ ہوں۔“

## viii- غیبت اور حسد کی روک تھام:

کسی مسلمان کے لئے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کی پینہ پیچھے اس کی برائی کرے۔ قرآن نے غیبت کو ذمائم اخلاق میں شمار کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ولا یغتب بعضکم بعضا۔

”ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔“ (الحجرات)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تم میں سے کوئی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کریں گا؟ گویا غیبت اپنے بھائی کا مردار کھانے کے برابر ہے۔ اسی طرح باہمی حسد کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ حسد وہ مرض ہے جس سے آدمی کا ایمان تک خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

”حسد سے بچو کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو۔“

## ix- ایک دوسرے کے حقوق:

حضور ﷺ نے اسلامی برادری میں محبت اور الفت کے جذبات پیدا کرنے کے لئے ہدایت فرمائی کہ ہر مسلمان کے اپنے مسلمان بھائی پر مندرجہ ذیل حقوق ہیں:

- (الف) جب وہ ملے تو اسے سلام کرے۔
- (ب) جب وہ دعوت دے تو اسے قبول کرے۔
- (ج) جب اسے چھینک آئے تو یرحکم اللہ کہے یعنی دعا کرے کہ اللہ تم پر رحم کرے۔
- (د) جب وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت کرے۔
- (ر) جب وہ انتقال کرے تو اس کے جنازے میں شرکت کرے۔

مسلمانوں کے باہمی حقوق کا یہ وہ چارٹر ہے جس پر عمل کرنے سے اخوت اسلامی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جائیں گی اور ہلا خرافات مسلمہ سبسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں گی جس سے ٹکرا کر دشمن خود ہی پاش پاش ہو جائے گا۔

### x- دائرہ کار (Scope):

ایک دوسرے سے الفت اخوت کا اثر معاش پر براہ راست ہوتا ہے ایک مسلم معاشرے کے اندر اخوت طاقت و قوت رکھنے والوں کو اس بات پر ابھارتی ہے کہ وہ استطاعت نہ رکھنے والوں کے لئے اقتصادی امداد کا ذریعہ بنیں اور عالم اسلام میں مختلف مسلم ممالک کے درمیان جذبہ اخوت اس بات پر اکسائے گا کہ وہ اپنے اپنے مخصوص وسائل کو باہم متحد کر کے عالم اسلام کی معاشی ترقی اور بہتری کا پند و نیت کریں گے۔ اس وقت اگر عالم اسلام کو بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو اس میں نہ دولت کی کمی ہے نہ ذہانت اور صلاحیت کی نہ شجاعت کی مگر صحیح اسلامی اخوت نہ ہونے کے باعث وہ نتائج برآمد نہیں ہو رہے ہیں جو نکل سکتے ہیں۔ ذرا تصور میں لائیے کہ اگر عربوں کی دولت پاکستان کی ذہانت اور اہلیت ترکوں کی بصالت اسی طرح آپس میں مل جائیں جس طرح نظریہ اخوت اسلام کی روح سے ملنا چاہئے تو پھر نتائج کس قدر خوشگوار ہوں گے۔ خوش قسمتی سے اکثر مسلمان ممالک جغرافیائی لحاظ سے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ اگر ان میں درست اخوت پیدا ہو جائے اور یہ سچے جذبہ ایمانی کے ساتھ سعی کریں تو انشاء اللہ ایک ایسا مضبوط ہلاک بننے کا جسے کسی دوسرے ہلاک کے رحم و کرم کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہوگی اور نہ ہی محتاجی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بشرطیکہ کام خلوص نیت اور صدق دل سے کیا جائے۔ نیز ایمانی، انسانی و قرینی اخوت ابھرے گی نمود و نمائش سے پرہیز ہونی چاہئے۔ کمزور افراد کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش ہونی درکار ہے کوئی بے یار و مددگار نہ رہے۔ معذوری، ناداری، بے کاری اور بیماری کے حالات میں خبر گیری و تکبیری کرنی چاہئے۔

ادائیگی معاوضوں میں انصاف پروردی و ہمدردی کا مظاہر ہونا ضروری ہے اشیاء کے لین دین میں بھی بھائی چارہ کی قضا قائم ہونی چاہئے۔ دقت و مصیبت میں بھی اخوت کا دامن پکڑا جائے۔ حصول رزق حلال کے لئے بھی صحیح رہنمائی و امانت کی جائے۔ سیاسی میدان میں بھی مسلمان اخوت کی لڑی میں پروئے ہوئے ہوں تاکہ قانون کی حکمرانی یقینی بنائی جاسکے۔ تمدنی و تعلیمی اور سائنسی و فنی شعبوں میں بھائی چارہ کا ماحول قائم رکھا جائے۔



# اسلامی معیشت کے اساسی تصورات

## اسلام میں حلال و حرام کا تصور اور اصول

رب غفار نے حلت و حرمت کی واضح حدود مقرر کر دی ہیں اور جو لوگ ان حدود کو پہلاٹ جاتے ہیں تو وہ سخت گنہگار ہوتے ہیں اور ان کے لئے وعید آئی ہے۔ اسی طرح اپنی مرضی سے کسی شے کو حلال نہیں بنایا جاسکتا اور نہ ہی کسی چیز کو حرام کہا جاسکتا ہے۔ سورۃ مائدہ میں تفصیل اسی طرح بیان کی گئی ہے:

”تمہارے لئے جو پائے موٹی حلال ہوئے سوائے ان کے جو تمہیں آگے سنائے جائیں گے۔ یعنی اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری اور اسی جنس کے پالتو اور جنگلی جانور، مثلاً ہرن وغیرہ حلال نہیں۔ حرام ہوا تم پر مردار، جانور، خون، سور کا گوشت، ایسا جانور جس پر اللہ کے سوا کوئی اور نام پکارا جائے۔ جو گلا گھونٹنے سے یا چوٹ سے گر کر یا سینک مارنے سے اور جس کو درندے نے کھایا ہو۔ مگر جیسے تم نے ذبح کیا۔ نیز جو کسی تھان رزق ہوا ازلام یعنی جوئے کے حیلوں سے تقسیم نہ کرو۔“

اسی طرح آگے یوں فرمایا:

”تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لئے کیا حلال ہے؟ تو آپ ﷺ فرمادیں کہ صاف ستھری چیزیں حلال ہیں۔ شکاری کتے کا جانور شکار کیا ہوا بھی حلال ہے اہل کتاب کا کھانا بھی حلال ہے۔ تمہارا کھانا ان کے لئے حلال ہے۔ پاکدامن خواتین حلال ہیں۔ نیز اہل کتاب عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں۔“

سورۃ الانعام میں ہے:

”آپ ﷺ کہیں تم آؤ میں سناؤں جو حرام کیا ہے، تم پر تمہارے رب نے اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ ٹپکی کرو۔ کسی کو ناحق قتل نہ کرو۔ اولاد کو روزی کے ڈر سے نہ مارو۔“

حییم کے مال میں بے جا تصرف کرنا بھی حرام ہے البتہ بہتر و مشروع طریقے سے تصرف کر سکتا ہے۔ حالت احرام میں شکار کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ تحلیل و تحریم کے قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اس میں انسانی رضا و رغبت کو کوئی دخل نہیں ہے۔

اسی سورۃ مائدہ میں ارشاد ہوا:

”اے ایمان والو! امت حرام ٹھہراؤ وہ لذیذ چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے حلال کر دیں اور حد سے نہ بڑھو۔ بے شک رب تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“  
حلال و حرام کی تفصیل بتا کر رزق حلال اور جائز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔  
رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

”حلال و حرام ظاہر ہیں نیز فرمایا: خداوند تعالیٰ یہود کو تباہ کرے ان پر چہ بیاں حرام کی گئی تھیں۔ انہوں نے چربی کو پکھلا کر فروخت کیا۔“ (بخاری و مسلم)

حدیث کی رو سے چیر پھاڑ کرنے والے جانور (دروندے) شیر، بلی، گیدڑ، کتا وغیرہ حرام ہیں۔ اسی طرح وہ پرندے جو پنچہ مار کر شکار کرتے ہیں مثلاً باز، شکر، خیل وغیرہ حرام ہیں۔  
حرام دو قسم کا ہے ایک وہ جو فی نفسہ (اپنی ذات کے) حرام ہے جیسے کتا، بلی وغیرہ۔  
دوسرا حرام وہ ہے جو اپنی ذات کے لحاظ سے حرام نہیں مگر کسی بیرونی عارضہ کی وجہ سے حرام ہے مثلاً چوری رشوت اور سود وغیرہ کا مال حرام ہے۔ یہ مال فی نفسہ حلال تھا مگر چوری رشوت سود کے جرائم کی وجہ سے چور رشوت خور اور سود خوار کے لئے حرام ہیں۔ اسلامی علم معاشیات میں دوسری قسم کے حرام سے بحث زیادہ ہوتی ہے کیونکہ اس حرام کا تعلق ناجائز کسب سے ہے۔  
اسلام اپنے پیروکاروں کو دولت کمانے کا یونہی لائسنس نہیں دے دیتا بلکہ کمائی میں جائز طریقے استعمال کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور ناجائز ذرائع سے نہ صرف منع کرتا ہے بلکہ سزا بھی تجویز کی ہے۔ تاکہ برے کاموں کا قلع قمع ہو سکے۔ ایسے تمام راستے ناجائز ہیں جن میں ایک شخص کا فائدہ دوسرے کے نقصان ہو۔

سورۃ النساء 29-30 میں یوں ارشاد ہوتا ہے:

”اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقوں سے نہ کھایا کرو۔ بجز اس کے کہ لین دین آپس کی رضامندی سے ہو اور تم خود اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو۔ اللہ تمہارے حال پر مہربان ہے اور جو کوئی اپنی حد سے تجاوز کر کے ظلم کے ساتھ ایسا کرے گا اس کو ہم آگ میں جمونک دیں گے۔“

اس آیت میں لین دین کے جواز کی دو شرطیں بتائی گئیں۔ ایک یہ کہ باہمی رضامندی ہو۔ دوسرے یہ کہ ایک کا فائدہ اور دوسرے کا نقصان نہ ہو۔ علاوہ ان میں نہ خود کو ہلاکت میں ڈالو اور نہ ہی دوسرے کو ہلاک کرو۔ سرمایہ داریت اور اشتراکیت میں ان باتوں کو درخود اعتناء نہیں سمجھا جاتا اسی طرح اور بہت سے ناجائز ذرائع ہیں جن سے روکا گیا ہے۔

سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوتا ہے اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور اسے حاکموں تک نہ پہنچاؤ کہ لوگوں کے مال میں سے کوئی حصہ ظلم سے نہ کھا جاؤ۔ یعنی غصب، رشوت

اور فریب سے کسی دوسرے کا مال نہیں کھانا چاہئے۔ رسول کریم ﷺ نے راشی اور سرشی کو جنہی قرار دیا ہے۔

خیانت اور بددیانتی سے بھی منع کیا گیا ہے کیونکہ اس سے بھی ناجائز کمائی ہوتی ہے۔ یتیم کے مال میں بے جا تصرف سے روکا گیا ہے۔

سورۃ مائدہ میں قمار بازی، بت فروشی، فال گری، قسمت بتانا کی کمائی کو حرام ٹھہرایا گیا ہے۔

”اے ایمان والو! شراب، جو، بت اور پانے گندے کام ہیں۔ شیطان کے ان سے بچتے رہو تاکہ نجات پاؤ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تم میں عداوت اور بغض ہو۔ کیونکہ شراب اور جو نماز سے روکتے ہیں۔“ (مائدہ: 90)

اسی طرح سود کی کمائی بھی حرام ہے۔  
”جو لوگ چاہتے ہیں کہ بدکاری کا جرم ہو۔ اے ایمان والو! ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔“ (النور: 19)

اسی سورۃ میں قہر گری اور زنا سے روکا گیا ہے۔ کیونکہ یہ فحاشی ہیں بلکہ زانی مرد اور عورت کے لئے رجم اور سوکڑوں کی سزا مقرر کی گئی۔ نیز چوروں کے لئے قطعید کی سزا رکھی گئی ہے۔ یہ تمام افعال شنیع ہیں اس لئے ان کی کمائی سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: کتے کی قیمت ناپاک ہے۔ زنا کار عورت کی غریبی حرام ہے اور بیٹی کھینچنے والے کی اجرت ناپاک ہے۔ (مسلم)  
کاہن کی اجرت سے بھی منع کیا گیا ہے۔

ہمارے پیارے آقا حضرت محمد ﷺ نے فرمایا: ”جس بدن نے حرام مال سے پردوش پائی وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔“ (بیہقی)

آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”پاک و حلال کمائی فرض ہے فرض کے بعد۔“ (بیہقی)  
نیز آپ ﷺ کا ارشاد ہے: حضرت عائشہ صدیقہؓ روایت کرتی ہیں کہ جو چیز تم کھاتے ہو اس میں سب سے بہتر وہ ہے جو تم اپنے ہاتھوں سے کما کر کھاؤ اور تمہاری اولاد بھی تمہارے کسب میں سے ہے۔ (ترمذی، نسائی، ماجہ، ابوداؤد)

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:  
”ایک زمانہ آئے گا کہ مال میں جو چیز ملے گی وہ اس کی پرواہ نہ کرے گا کہ حلال ہے یا حرام۔“ (بخاری)

حضرت ﷺ نے شراب کے متعلق دس آدمیوں پر لعنت کی ہے:  
(1) مہلوں کو ٹھوڑنے والے پر۔

- (2) بچونے والے پر۔
- (3) بچنے والے پر۔
- (4) اٹھانے والے پر۔
- (5) اس شخص پر جس کے لئے اٹھا کر لائی گئی۔
- (6) پلانے والے پر۔
- (7) پیچنے والے پر۔
- (8) شراب کی قیمت کھانے والے پر۔
- (9) خریدنے والے پر۔
- (10) جس کے لئے خریدی گئی۔ (ترمذی ابن ماجہ)

ایک شخص نے دریافت کیا کہ دوا میں شراب استعمال کر سکتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں کیونکہ یہ خود بیماری ہے۔ اب کوئی ملازم مجلس نہیں جہاں شراب پیش نہ کی جانی ہو اور اسی کے کثرت استعمال سے بے حیائی اور فحاشی بڑھ گئی ہے۔ مغربی دنیا بھی اس کے مضر اثرات سے بیکھلا اٹھی ہے مگر تجارت کے باعث اسے بند نہیں کر سکتے۔ حالانکہ ان کی اپنی جدید تحقیق کے مطابق یہ صحت کے لئے ضرر رساں ہے۔

رسالت مآب ﷺ نے خون کی قیمت سے کتے کی قیمت ہالکی کی قیمت زانی عورت کی خرمی سے سود کھانے والے دینے والے جسم کو گودنے والے گودانے والے اور تصویر کشی کرنے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ (بخاری)

حضرت چاہڑ کے مطابق خداوند تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے شراب کا چپتا مردار کا چپتا اور بتوں کا چپتا حرام قرار دیا ہے۔ (بخاری مسلم)

سرکاری رقوم کا طین ساز و سامان کی خورد و زرخیزی اور ذاکہ زنی کی آمدنی بھی ناجائز ہوتی ہے۔ اسلام میں نہ صرف خبیث طریقوں کی کمائی سے روکا گیا ہے بلکہ طیب اور حلال رستوں سے روزی حاصل کرنے کو ثواب قرار دیا گیا ہے اور مستحسن اقدامات سے اللہ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور اس قسم کے رزق میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ زیادہ حرام کی نسبت کم حلال بہتر اور پسندیدہ ہے اور اسی سے رضائے الہی حاصل ہو سکتی ہے۔ حرام کی کمائی سے انسان کا حرص و لالچ بڑھ جاتا ہے۔ اور اس کے انجام کے اثرات بُرے پڑتے ہیں۔ عاقبت خراب ہوتی ہے۔ بہت سے فسادات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ موجودہ دور میں دنیا معائب کے عمیق گرداب میں مبتلا ہے اور پریشانیوں میں معتد بہ اضافہ ہو گیا ہے۔

سٹ بازی، چور بازاری، سنگٹنگ اور ذخیرہ اندوزی جیسی مہلک برائیاں معاشرے کو گھن کی مانند کھا رہی ہیں اور یہ سب آمدنی کے ناجائز وسائل ہیں ان سے اجتناب ضروری ہے۔ ملک و



ملت کی بھلائی اسی میں ہے کہ یہ ذرائع ممنوع قرار دیے جائیں۔

## حرام اور حلال قرار دینے کی افادیت

ضروری نہیں کہ اسلام نے جو احکام ہمیں عطا فرمائے ہیں ان سب کی حکمتیں بھی ہمیں معلوم ہوں مگر یہ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام کے تمام احکام حکمتوں اور مصلحتوں سے خالی نہیں ہوتے۔ اشیاء کو حلال اور حرام کرنے کی تمام حکمتیں ہم پر عیاں نہیں البتہ ہم خود غور و فکر کر کے بعض مصلحتوں کو پالیتے ہیں اور بعض کو شریعت از خود واضح کر دیتی ہے۔

### 1- معاشی ترقی کی جہت کا تعین:

یاد رہے کہ جدید ماہرین معیشت اس بات پر متفق ہیں کہ ملک کی پیداوار کو صرف بڑھانا ہی معاشی ترقی نہیں بلکہ جائز اور ضروری اشیاء کی پیدائش اور پھر مناسب تقسیم ہی اصل معاشی ترقی ہے اگر یہ بات درست ہے تو پھر ضروری ہوا کہ بعض اشیاء اہم اور ضروری ٹھہرائی جائیں اور بعض کو غیر ضروری یا مضر ٹھہرایا جائے تاکہ پیدائش دولت کا عمل اس طرح متعبط ہو کر حقیقی معاشی ترقی کی منزل حاصل ہو۔ اس شے کو پورا کرتے ہوئے شریعت نے بعض اشیاء کو حرام اور بعض کو حلال قرار دے دیا ہے۔

### 2- اقتصادی ترقی کی رفتار:

کئی اشیاء ملک کی معاشی ترقی میں رکاوٹ کا باعث بن جایا کرتی ہیں۔ ان میں سامان لہو و لعب اور نشہ آور اشیاء شامل ہیں اور چونکہ اسلام معاشی ترقی کی رفتار کو آہستہ نہیں کرنا چاہتا اس لئے اسلام نے شراب اور اس قسم کی اشیاء پر پابندی عائد کر دی ہے۔ تاکہ معاشی ترقی کی رفتار کم نہ ہونے پائے۔

### 3- امن و امان کی برقراری:

معاشی ترقی کے لئے ملک میں امن و امان کا ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ بدن کے لئے غذا اہم ہے۔ اگر امن و امان ملک میں نہ پایا جائے تو پھر معاشی ترقی کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ لہذا شریعت نے ان کاموں کا ممنوع قرار دے دیا ہے۔ جن کی وجہ سے ملک میں امن و امان مفلوج ہو سکتا تھا امن و امان کے پیش نظر اسلام نے شراب جو پھرتی ڈاکہ سنگسار اور ایسی ہی دیگر تمام چیزوں کو ممنوع قرار دے دیا ہے۔

### 4- ارتکاز ثروت کا سد باب:

دولت کا چند ہاتھوں میں مرکز ہونا معیشت کے لئے زہر قاتل کی حیثیت رکھتا ہے جو کہ کسی وقت بھی پوری معیشت کو مضر اثرات کی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔ ارتکاز دولت کے بہت

سے اسباب ہوتے ہیں مگر اجارہ داری، سود اور چور بازاری اس کے بنیادی اسباب ہیں۔ شریعت اسلامیہ نے ان سب اشیاء کو ان کی معضرتوں کی نسبت سے ناجائز و حرام قرار دیا ہے تاکہ ارتکاز دولت پیدا نہ ہونے پائے تقسیم دولت میں مدد ملتی ہے۔

### 5۔ شخصیت کی نشوونما:

اسلام کا یہ مطلوب ہے کہ انسان کی زندگی میں نکھار پیدا ہوتا چلا جائے اس کی شخصیت میں ارتقاء جاری رہے اور یہ مقصد اتنا ہم ہے کہ اسلام کے تمام شعبہ ہائے زندگی اس مقصد کو نہیں بھولتے۔ اسلام نے بعض اشیاء کو حلال اور بعض کو حرام قرار دیکر فرد کے لئے ارتقاء ذات کے مواقع بھی میسر کئے ہیں۔ مثلاً اسلام نے زکوٰۃ کو ادا کرنا ”فرض“ اور ادا نہ کرنا حرام ٹھہرایا ہے اور زکوٰۃ ادا کرنا دراصل انسان میں کل سنجوسی کو ختم کرنے اور سخاوت و فیاضی کی اقدار کو پیدا کرنے کا موجب ہے اور ظاہر ہے کہ کل کا خاتمہ اور سخاوت کی ابتداء انسانی شخصیت کے ارتقاء ہی کا نام ہے۔

### 6۔ ازالہ ضرر:

اسلام نے کئی چیزوں کو حرام قرار دیا ہے تو اس سے بعض اوقات ازالہ ضرر بھی مقصود تھا مثلاً اسلام نے رشوت، فریب کاری اور جھوٹ وغیرہ کو حرام قرار دیا ہے اسی طرح سود اور جوا وغیرہ کو بھی ناجائز ٹھہرایا۔ اگر ہم غور سے ان تمام اشیاء کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان تمام اشیاء میں بعض لوگوں کے لئے تباہی اور ضرر تھا مثلاً رشوت سے اہل لوگوں کو ضرر پہنچتا اور نا اہل افراد بڑے آرام سے ناجائز کام نکلوا لیتے اور لوگوں کی حق تلفی ہوتی لہذا اسلام نے رشوت کو ختم کر کے ضرر کا ازالہ کر دیا ہے۔ اسی طرح باقی بھی ان تمام اشیاء کو حرام قرار دیا ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہے۔

### اثرات و مضمرات (Effects and Implications):

یہ مندرجہ ذیل ہیں:

#### آ۔ اسلامی معاشیات کی مضبوط بنیاد:

بنیادی طور پر خود غرض حریص اور لالچی واقع ہوا ہے اگر اس کی ان فطری خصوصیات کو بے لگام چھوڑ دیا جائے تو عجز کے طور پر اس کا جو رویہ برآمد ہوگا وہ بالکل لادینی سا ہوگا اس رویہ کا مطالعہ سیکولر اکنامکس کی صورت میں وجود میں آئے گا مگر جب تصور حلال حرام سے انسان کو آشنا کر دیا جائے تو اس کے رویہ میں ایک تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ اسی تبدیلی کی وجہ سے اس کا زاویہ فکر تبدیل ہو جاتا ہے اس کی معاشی سرگرمی کا اندازہ بدل جاتا ہے اور اگر پھر اس کے

طرز عمل کا مطالعہ کیا جائے تو نتیجتاً کے طور پر ”اقتصادیات اسلامیہ“ وجود میں آتی ہے۔

## ii- خواہشات میں کمی:

اگرچہ انسانی ضروریات انگنت ہیں اور ایک مسلمان کی خواہشات بھی بے شمار ہوتی ہیں مگر کئی ایک شے کے حرام یا ممنوع ہونے کی وجہ سے ایک مسلمان کی خواہشات ایک غیر مسلم کے مقابلہ میں کم ہو جاتی ہیں جس کا دوسرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان کے ذرائع بڑھ جاتے ہیں کیونکہ حلال و حرام کے تصور کے مل جانے کے بعد ”فرد“ نسبتاً بہتر طریقے سے اپنی خواہشات کو پورا کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک تصور یعنی ”الفلاح“ کا حصول بھی انسان کے پیش نظر ہوتا ہے جو کہ معاشی کارندہ کی خواہشات میں حریہ اعتدال پیدا کرتا ہے۔

## iii- افادہ کا نظریہ:

افادہ کا تصور اسلامی معاشیات میں محدود ہو جاتا ہے کیونکہ اسلامی معاشیات میں ہر وہ شے اپنے اندر افادہ کی قدر نہیں رکھتی جس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام ٹھہرایا ہو اب چونکہ افادہ کا تصور بدل چکا ہے ساتھ ساتھ الفلاح کا تصور بھی موجود ہے اسی لئے اشیاء کی طلب بھی تبدیل ہو جائیں گی اور رسد بھی تبدیل ہو جائیں گی۔

## iv- صرف دولت:

صرف دولت کو اسلامی معاشیات میں وہی اہمیت حاصل ہے جو کہ لادینی معاشیات میں حاصل ہے۔ صرف دولت دراصل معیشت کی جان ہے تصور حلال و حرام کی وجہ سے صرف دولت میں ایک انقلابی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے اب دولت کو محض اس لئے صرف نہیں کیا جاتا کہ طلب کی گئی شے ارزاں ہے یا مستقبل میں اس پیسے سے بہت سا منافع کمایا جاسکتا ہے بلکہ اب تو یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ شریعت نے اس شے کو حلال رکھا ہے یا حرام پھر صرف دولت کے ذمے میں یہ پابندی بھی عائد کر دی جاتی ہے کہ دولت کا اسراف یا ضیاع حرام ہے۔ لہذا اب مجموعی طلب ضرورت سے زیادہ نہیں ہوتی اور اس طرح غلج کو بھی ممنوع قرار دیا گیا ہے جس کی وجہ سے مجموعی طلب ضرورت سے زیادہ کم بھی نہیں ہو پاتی اور نتیجہ افراد زر یا تقریب زر سے معیشت محفوظ رہتی ہے۔ پھر تعیشیات زندگی کو بھی ناجائز قرار دیا گیا ہے اور نتیجہ کے طور پر ضروریات زندگی کی طلب کو بڑھا کر ان کی پیدائش کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

## v- قیمتوں کا تعین:

اشیاء کی قیمتیں عام طور پر طلب اور رسد کی طاقتوں سے طے پاتی ہیں۔ اسلامی معیشت میں بھی قیمت کا تعین کیا جاتا ہے۔ لیکن اسلامی معاشیات کے حوالے سے طلب اور رسد کی

قوتوں کو بھی اتنی زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہوتی جتنی کہ ایک غیر اسلامی معیشت میں ہوتی ہے مثال کے طور پر اسلامی معیشت میں ایک دکاندار کسی شے کی قیمت محض اس لئے نہیں بڑھاتا کہ اس کی رسد وقتی طور پر کم ہو گئی ہے یا اس کی رسد عارضی طور پر بڑھ گئی ہے بلکہ تصور حلال و حرام اور قدر تقویٰ کی وجہ سے دکاندار شے کی قیمت اس وقت تک نہیں بڑھاتا جب تک عاملین پیدائش کی قیمتیں نہ چڑھ جائیں یا مجموعی منڈی میں شے کی نئی قیمت نہ طے پا جائے اس طرح اسلامی معیشت میں کسی شے کی رسد محض اس لئے نہیں گھٹائی جاتی کہ اس طرح سے اس کی قیمت کم ہو جائے بلکہ اشیاء کی رسد قومی ضروریات کے پیش نظر طے کی جائے گی یہاں پر شبہ پیدا نہیں ہوتا چاہئے کہ طلب و رسد پر قیمتیں اثر انداز نہیں ہوں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ طلب کی زیادتی اور رسد کی زیادتی اور اس طرح طلب کی کمی کی ترغیب ہر صورت قیمتوں کے ذریعہ سے ملتی رہے گی۔

### vii- پیدائش دولت:

سربایہ دارانہ نظام میں مزدور کی اجرت اس کی قوت پیداداری کے مطابق طے نہیں کی جاتی بلکہ جس وقت مزدوروں کی رسد بڑھ جائے ان کی اجرت کم کر دی جاتی ہے اور جس وقت مزدوروں کی قلت ہو جائے ان کی اجرت بڑھا دی جاتی ہے اگر مزدور (جب ان کی رسد زیادہ ہو) کم اجرت لینے پر تیار نہ ہوں تو ان کو بے روزگار کر دیا جاتا ہے گویا مزدور کا استحصال کیا جاتا ہے اس کی کمزور قوت ”سودا ہازی“ سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے لیکن اسلام نے مزدور کا استحصال حرام قرار دیا اسی طرح سے عاملین پیدائش کے معاوضے ان کی اہمیت اور عمل پیدائش میں حصہ داری کے مطابق طے پاتے ہیں۔

### vii- معاشی کاوش پر اثر:

بسا اوقات یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ اسلام نے شراب وغیرہ کو حرام قرار دیا ہے اور اس طرح سے مجموعی طلب کو کم کر دیا ہے۔ معاشی سرگرمیوں کے مواقع کم کر دیئے ہیں وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ جن ممالک میں کتے، بلی وغیرہ بھی کھائے جاتے ہیں وہاں تو خرید و فروخت اور کاروبار کے مواقع اسلامی ممالک کی نسبت زیادہ ہوتے ہیں تو اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہم معاشی ترقی کے محض قائل نہیں بلکہ ہم تو مفید معاشی ترقی پر یقین رکھتے ہیں شراب کے کاروبار سے شاید چند آدمیوں کی آمدنیوں میں اضافہ ہو جائے لیکن جن بے شمار لوگوں کا سکون اور چین اس وجہ سے چین جائے اس پر بھی تو غور کر لیا جائے۔ اسی طرح دیگر اشیاء کو اگر اسلام نے منع قرار دیا ہے تو اس سے روحانی طور پر بہت فوائد حاصل ہوتے ہیں اور ان روحانی فوائد کا معیشت پر بھی اثر پڑتا ہے مثلاً خدا کی حرام کردہ اشیاء سے اجتناب کرنے سے انسان کے اندر

تقویٰ کی قدر مضبوط ہوتی ہے اور یہی تقویٰ اسلامی معیشت میں معاشی کارندہ کے رویہ کو حد اعتدال اور عدل پر رکھتا ہے جس سے بے شمار معاشی اور اخلاقی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ تصور ”حلال و حرام“ کی وجہ سے معاشی سرگرمی میں اگر کوئی سستی واقع ہوتی ہے تو کوئی ڈر شے یا نقصان والی بات نہیں ہے کیونکہ شاید تمہیں پتہ نہیں کہ اسلام نے بعض اشیاء کی پیدائش کو فرض کفایہ بعض کو واجب اور بعض کو مستنون قرار دیکر معاشی سرگرمی میں غیر معمولی سرعت بھی پیدا کی ہے۔

### viii۔ اعتدال پسندی:

معیشت میں اگر صرف دولت اور سرمایہ کاری وغیرہ میں توازن قائم رکھا گیا تو افراط زر اور تقریباً زر کے خطرات معیشت میں پیدا نہیں ہوتے۔ کیونکہ صرف وغیرہ کو اسلامی معیشت میں اچھے خطوط پر چلایا جاسکتا ہے۔ افراط زر کا انسداد ”ولا تسرفوا“ اور اسراف نہ کرو کہہ کر اور تقریباً زر کا انسداد ”کلوا واشربوا“ کھاؤ اور پیو کہہ کر کر دیا گیا ہے اسی طرح تجارتی چکروں سے معیشت کو چھٹکارا دلانے میں بھی تصور ”حلال و حرام“ کا اہم کردار ہے۔

### ix۔ برائیوں کی روک تھام:

کئی ملکوں میں کالے دھن کو سفید کرنے کی تدبیریں کی جاتی ہیں۔ درحقیقت یہ بات اس وقت پیدا ہوتی ہے جب معاشرے میں چور بازاری اور سنگٹنگ وغیرہ عام ہو جائے۔ جب معاشرے میں یہ بات عام ہو جاتی ہے تو پھر تقویٰ دولت کا ایک خاصہ حصہ تعمیر کاموں پر صرف ہونے سے رہ جاتا ہے نئی فرمیں قائم نہیں ہو پاتیں لیکن حلال و حرام کی وجہ سے اسلامی معیشت میں ہر قسم کی چور بازاری کا انسداد ممکن ہوتا ہے۔ اس طرح سے معیشت میں معاشرے اور قوم کا سرمایہ ضائع سے بچ جاتا ہے اور قوم ترقی کی راہ پر گامزن ہو جاتی ہے۔ تصور حلال و حرام کے بغیر اس قسم کی معاشرتی برائیوں کا انسداد ناممکن ہے۔

### x۔ تبادلہ اشیاء:

اس کا یہ بھی فائدہ ہے کہ اشیاء مصنوعات کے تبادلے کی بھی حدود مقرر ہو جاتی ہیں۔ ملاوٹ کرنے جھوٹی قسمیں کھاتے اور ناپ تول میں کمی کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ ممنوعہ اشیاء کی خرید و فروخت نہیں ہوتی۔ عہد و بیان کی پابندی ہوتی ہے۔ منڈی کے حالات میں بہتری آتی ہے۔ خریداروں اور فروش کاروں کے مابین تعلقات کی نوعیت میں دیانت و امانت کا عنصر غالب آتا ہے خیانت دھوکہ کا تذکرہ ہوتا ہے۔

20234

20234

## کسب معیشت میں جدوجہد کی اہمیت

جس فرد نے اسلامی تعلیمات کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے اس امر سے بخوبی واقف ہے کہ اسے اپنی آخرت کے لئے ہی جینا اور مرنے ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ گوشہ نشینی اختیار کرے۔ اس پر اسلامی دوسے بہت سی ذمہ داریاں سوئیں گئی ہیں اور ان فرائض کا کما حقہ پورا کرنا ہی صحیح زندگی گزارنا ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کا پورا کرنا نہایت ضروری ہے اور کامل انسان وہی کہلانے کا حقدار ہے جو انہیں پوری طرح سرانجام دیتا ہے۔ اسلام نے مادی ضرورتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ مومن اور مسلم صرف روح کا نام نہیں ہے۔ بلکہ جسم اور روح دونوں کے مجموعے کا نام ہے اور ایک مسلمان کو اس دنیا میں اپنا فرض نبھانے اپنا مشن پورا کرنے اور اپنے پروردگار کی رضا حاصل کرنے کی خاطر کو کچھ کرنا ہے اس کے لئے بدنی اور جسمانی قوتیں بھی درکار ہیں۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ مسلمان عبادت کے ساتھ ساتھ روزی حاصل کرنے کی کوشش بھی جاری رکھے۔ بلکہ حلال کمائی کی جدوجہد بھی عبادت کے ذمے میں داخل ہے۔ یہی وجہ ہے قرآن مجید میں یوں فرمایا گیا:

”جو کچھ زمین میں ہے اس میں سے حلال اور طیب کھاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔“ (البقرہ) اس سے بھی روزی کمائے کی ترغیب ملتی ہے۔ نیز کہا اور کتنے لوگ ہیں جو رزق و فضل کی تلاش میں زمین پر پھرتے ہیں۔ (زلزل) سورۃ الجمعہ میں اس مضمون کو یوں بیان کیا گیا ہے:

”اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کی اذان ہو تو خرید و فروخت روک دو اور اللہ کی یاد کی طرف دوڑو۔ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اگر تمہیں عقل ہو اور جب نماز ختم ہو چکے تو زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو یاد کرو بہت تاکہ تمہارا بھلا ہو۔“ اسی طرح رسائیت کو اسلام میں حرام قرار دیا گیا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

”حلال معیشت کا طلب کرنا افضل ترین عبادت ہے۔“

مزید کہا:

طلب کسب الحلال فریضہ بعد الفریضہ (نکاحی)

”فرض عبادات کے بعد حلال روزی کا کماتا بھی فرض ہے۔“

اپنے ہال بچوں کی پرورش اور پیٹ پالتے کے لئے مساعی کرنا اچھی بات ہے اور پسندیدہ فعل ہے۔ ویسے بھی وقت کو فضول مچوں میں ضائع کرنا زیادتی ہے۔ معاشی جدوجہد سے ہی دنیا ترقی کے ذریعے پر فائز ہو سکتی ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہو

سکا اخلاقی حدود کے اندر رہ کر روزی کمانا ایک اچھا فعل ہے۔

ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ جو قومیں معاشی جدوجہد میں زیادہ سرگرم عمل میں وہی کامیاب ہیں اور جو سستی و کاغذی سے کام لیتی ہیں وہ کاروان نہیں ہو سکتیں۔ بھگت مانگ کر روزی کمانا سخت معیوب ہے۔ اپنا رزق خود اپنا پسینہ بہا کر حاصل کرنا چاہئے۔ دوسروں پر بار نہیں بننا چاہئے بلکہ خود کما کر دوسروں کو کھلاتا بہتر ہے۔ اللہ فرماتا ہے۔ دن ہم نے کمانے کے لئے بنایا ہے۔ اسلام کا مقصد عظیم زیادہ سے زیادہ انسانی فلاح و بہبود ہے۔ اسی لئے زکوٰۃ صدقات اور خیرات وغیرہ کا حکم دیا ہے۔ کہ دولت مندوں کو غرباء کی استعانت کرنی چاہئے۔

آپ ﷺ کا فرمان ہے:

”بہترین کمائی ہاتھ کی ہے۔“

ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

”میں ارتدار اور غربت سے پناہ مانگتا ہوں اس پر ایک شخص نے دریافت کیا کہ کیا دونوں ایک جیسے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہاں۔“

قرآن مقدس میں ہے۔ اگر آپ ناداری سے خوف کھاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنی نعمت سے محفوظ فرمائے گا اگر وہ چاہتا ہے نیک انسان کے لئے اچھی دولت نکلے ہے۔

قرآن کریم میں ہے:

”ہم نے تمہیں زمین سے طاقت دی ہے اور اس میں تمہارے لئے روزی مقرر کر دی ہے۔“ (7-10)

آپ ﷺ نے فرمایا:

”جائز طریقہ سے کمائی ہوئی دولت نیک انسان کے لئے اچھی چیز ہے۔“

دراصل معاشی کوشش کا سب سے بڑا مقصد ملی فلاح و بہبود ہے۔ مگر انسان دنیا میں اس طرح منہمک نہ ہو جائے کہ عاقبت کو فراموش کر دے اسی لئے اللہ کا فرمان ہے:

”اور وہ جو ایمان نہیں رکھتے دنیاوی رنگ میں مشغول ہو جاتے ہیں اور جانوروں کی طرح کھاتے ہیں۔ ان کا لھکانہ آگ (دوزخ ہے)۔“ (11-12)

اسی طرح رسول ﷺ مقبول نے فرمایا:

”دنیا کی خواہش تمام برائیوں کا ذریعہ ہے۔ (نیز یہ ہے کہ) مال اور اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دے۔“

اس لئے ضروری ہے کہ راہ اعتدال اختیار کیا جائے۔ روزی کمانے کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ یاد الہی بھی شامل حال رہے اور یہی صحیح مومن کا طریقہ ہے۔

## درجات معیشت کا مقصد اور اسلامی فلسفہ

دین اسلام معاشی مساوات پر یقین نہیں رکھتا۔ یہ معاشی مساوات کو غیر فطری تصور کرتا ہے۔ معاشرے کے اندر اسلامی نقطہ نظر سے معاشی مساوات کو قائم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بعض افراد قدرت کی طرف سے اچھی صحت لے کر پیدا ہوتے ہیں اور کئی کمزور اگر افراد کی کمائی کا دارومدار اس کی جسمانی صحت پر ہو تو جس فرد کی جسمانی صحت اچھی ہوگی اس کی کمائے والی صلاحیت بھی زیادہ ہوگی کمزور افراد کی قوت پیداواری کم ہوتی ہے چند افراد فطرت کی طرف سے اعلیٰ ذہنی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں بعض کو فنی ذہنی صلاحیتوں سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ دنیا کا کوئی نظام ان صفات پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ جس شخص کی ذہنی صلاحیتیں زیادہ ہوں گی اسی قدر اس کی پیداواری کارکردگی بھی زیادہ ہوگی۔ چنانچہ بدنی طاقت و دماغی اہلیت کے تفاوت کے علاوہ دوسری قسم کے عوامل جو معاشی عدم مساوات کا موجب قرار پاتے ہیں وہ نفسیاتی کہلاتے ہیں۔

جس فرد میں مبروحتل کی خصوصیات پائی جاتی ہیں وہ زیادہ بہتر طریقے سے مسائل حل کر سکتا ہے۔ زیادہ محنت کر کے زیادہ پیداوار حاصل کر سکتا ہے چنانچہ نفسیاتی عوامل میں فرق کی بناء پر کمائے کی اہلیت متفرق ہوگی اور اس طرح معاشی مساوات وجود میں آئے گی۔ تیسری قسم کو جو معاشی عدم مساوات کا باعث بنتی ہے۔ اسے ماحولیاتی عنصر افراد کے ماحول میں جو فرق ہوتا ہے وہ نفسیاتی عوامل سے مل کر شخصیت میں تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ فرد کی جہتوں پر ماحول اثر انداز ہوتا ہے مثال کے طور پر ایک فرد جو امیر گھرانے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے پاس معاشی اثاثہ جات زیادہ ہوں گے تعلیم و تربیت کے مواقع زیادہ ہوں گے۔ چنانچہ اس کی استعداد کمائی زیادہ ہوگی۔ غریب گھرانوں میں پیدا ہونے والے افراد کا معاملہ ان کے برعکس ہوگا اس طرح بعض افراد ایسے ہیں جن کو بڑا سازگار ماحول ملتا ہے۔ کئی افراد قدرت کی جانب سے کتنی ہی اچھی جہتیں لے کر کیوں نہ پیدا ہوں ناسازگار ماحول کی وجہ سے خراب ہو جاتے ہیں۔ ان کی دو اقسام میں ایک فطری (Natural) ہوتے ہیں اور دوسری وہ قسم ہے جو انسان کی خود ساختہ ہوتی ہے ہم صرف پہلی قسم کو لیں گے اگر ایک شخص آسٹریلیا میں پیدا ہوتا ہے تو اس کو عمدہ معاشی ماحول دستیاب ہوتا ہے اس کے برعکس ایک آدمی جو کسی غریب ملک میں جنم لیتا ہے اس کو غیر موافق معاشی ماحول فراہم ہوتا ہے۔ یہ افراد کے اپنے بس کی بات نہیں ہے کیونکہ اس قسم کے معیشت میں یکسانیت پیدا نہیں کی جاسکتی۔ معاشی مساوات کو بھی قائم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مصنوعی اقتصادی برابری قائم کرنے کا ایک نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ معاشی اعتبار سے جو کمزور ہوگا وہ اس دوڑ میں پیچھے رہ جائے گا۔ فرض کریں اے اور بی بالکل یکساں صلاحیتوں کے مالک ہیں مگر



معاشی جدوجہد میں معاشی اعتبار سے کم ملاجیتوں کا مالک پیچھے رہ جائے گا۔ اگر ان کے آگے بڑھنے پر رکاوٹ عائد نہ کریں یعنی معاشی اعتبار سے کمزور کے پہلو بہ پہلو چلنے کا حکم نہ دیا جائے۔ اگر یہ مصنوعی مساوات زبردستی قائم کی جائے تو اس کا اثر زیادہ معاشی ملاجیتوں والے پر ہوگا وہ اس قانون کے خلاف آواز اٹھائے گا۔ چنانچہ ایک دن ایسا آئے گا جب وہ ان قوانین کو توڑ ڈالے گا یا اس کی اہلیت کسی کام کی نہیں رہے گی۔ جس سے اثرات کا رخ بھی بدل جائے گا۔

### مولانا حفظ الرحمن کے مطابق:

معاشیات سے متعلق قرآن عزیز نے جن اساسی اصولوں کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں:

”رزق اور معاش کا حقیقی تعلق صرف ذات الہی سے وابستہ ہے اور وہی ہر فرد کا کفیل ہے اور اگرچہ اس کی مصلحت عام اور حکمت تام کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا کے اس متنوع ماحول میں رزق کے اندر تفاوت درجات پایا جائے۔ لیکن امارت و غربت کے فطری تنوع کے باوجود یہاں ایک فرد بھی محروم المعیشت نہ رہنے پائے۔ کیونکہ اس نے حق معیشت کو سب کے لئے مساوی برابر رکھا ہے اور کسی کو بھی اس حق مساوات میں داخل انداز ہونے کا حق عطا نہیں کیا۔“

نیز یہ کہ:

”اللہ تعالیٰ ہر فرد کی معاشی زندگی کا کفیل ہے اور اس کا وعدہ ہے کہ زمین پر چلنے والے ہر ایک جائدار کی معیشت اس کے ذمہ ہے۔“

اس کے لئے حسب ذیل فصوص قابل مطالعہ ہیں:

”اور زمین پر چلنے والے ہر جائدار کے رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ میں لی ہے اور تمہارا رزق اور جس شے کا تم وعدہ دیئے گئے ہو آسمان میں (یعنی اللہ تعالیٰ کے ذمہ میں) ہے اور افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو نہ مار ڈالا کرو ہم بھی تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور انہیں بھی اور آسمان اور زمین سے تم کو روزی کون پہنچاتا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ بیشک اللہ تعالیٰ ہی روزی دینے والا ہے۔ بڑی مضبوط قوت والا ہے۔“

”اور ہم نے تمہارے لئے زمین میں معیشت کے سامان بنا دیئے اور ان کے لئے جن کو تم روزی نہیں دیتے وہ (خدا) وہ ذات پاک ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا وہ زمین میں ہے۔“ (بقرہ)

ان آیات میں بغیر کسی تخصیص کے ہر فرد بشر کو خطاب ہے اور ان کی روح یہ ہے کہ معیشت و اسباب معیشت خدا نے تعالیٰ کے خزانہ عامرہ کی ایسی عطاء و بخشش ہے کہ جس سے فائدہ اٹھانے کا ہر جائدار کو برابر کا حق ہے۔

اور ان آیات کی اس روح کی زیادہ وضاحت و صراحت حسب ذیل آیات کرتی ہیں:

”وجعل فیہا رواسی من فوقہا وبریک فیہا وقلوبہا اولواتہا فی الربعۃ انام سواء للسانلین۔ (حم جودہ)

”اور رکھے اس زمین میں جو جمل پہاڑ اس کی پیٹھ پر اور برکت رکھی اس کے اندر اور چار دن میں اندازہ سے رکھیں اس میں ان کی خوراکیں جو برابر ہیں (لحفاظ طلب معیشت) سب حاجت مندوں کے لئے۔“

حفظ الرحمن تحریر کرتے ہیں:

”پہلی صل قرآنی تصویص اور ان کی موسیّد احادیث رسول اور ان سے مستحب فقہی احکام یہ واضح کرتے ہیں کہ ”حق معیشت کی مساوات“ کا یہ نظریہ فناء الہی کے خلاف نہیں بلکہ عین فناء الہی کے مطابق ہے اور یہ جدید نظریہ نہیں ہے کہ مارکسزم کی حمایت یا اس سے مرعوبیت کی بناء پر احکام اسلامی کی انوکھی تعبیر کے ذریعہ وجود میں آیا ہو بلکہ اسلام کا وہ بنیادی اور اساسی حکم ہے جو اپنے وجود سے آج تک غیر متبدل اور غیر حزل رہا ہے اور اگر ہم نے اس کو سمجھنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی یا دوسرے انسانوں کے اختراعی معاشی نظاموں سے مرعوب ہو کر ہم ”اسلامی معاشی نظام“ کو یکسر بھلا دیا تو اس میں اپنا قصور ہے نہ کہ اسلامی نظام کے بیان کرنے والے اور اس کی اصل حقیقت سے روشناس کرانے والے کا اور یہ بھی سخت گمراہی ہے کہ ہم یہ یقین کر بیٹھے ہیں کہ غربت و امارت کا یہ غیر فطری تفاوت اور جائزہ امتیاز جو آج ہم کو کائنات پر چھایا ہوا نظر آتا ہے خدا کا بنایا ہوا ہے بلکہ یہ فاسد نظامہائے معاشی کے ثمرات و نتائج ہیں اور خدا کی مرضی یہ ہے کہ اس قسم کے تمام نظامہائے فاسد کو ایک ظلم سوخت ہو جانا چاہئے۔“

مزید رقمطراز ہیں:

”اگرچہ حق معیشت میں سب مساوی ہیں لیکن درجات معیشت میں مساوی نہیں ہیں اور معیشت میں درجات کا تفاوت ایک حد تک فطری ہے یعنی یہ ضروری نہیں کہ سب کے لئے سامان معیشت ایک ہی طرح کا ہو لیکن یہ ضروری ہے کہ ہر سب کے لئے مگر درجات کا یہ تفاوت ایسے اعتدال پر قائم رہے کہ کسی حالت میں بھی وہ لوگوں کے درمیان وجہ ظلم نہ بن سکے یعنی تفاوت درجات تو ہو لیکن نہ ایسا کہ معیشت انسانوں کو دو طبقوں میں اس طرح تقسیم کر دے کہ ایک کی ترقی دوسروں کے فقر و افلاس کا سبب بنے اور دوسرا پہلے کے معاشی اغراض کا آلہ کار بن کر رہ جائے قرآن عزیز نے اس تفاوت درجات کو محروم المعیشت بنانے اور ذاتی اغراض کی خاطر معاشی و شہرہ دہ کرنے کے لئے نہیں ہے اور جو ایسا کرتا ہے وہ خدا کی نعت (عطاء ثروت) کا جاحد (مکرم) ہے و انبختھا اللہ یجحدون کیونکہ یہاں دولت و سرمایہ کا مقصد زیادہ سے زیادہ شمع بازی نہیں ہے بلکہ انفرادی حاجات و ضروریات کے ساتھ ساتھ اجتماعی حاجات و ضروریات

کی تکمیل ہے اور دوسری جانب غیر متحمل سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ متحمل افراد ملت کے حوالہ کو دیکھ کر خدا کے ساتھ کفران اور ناشکر گزاری نہ اختیار کرے اور نہ حسد و بغض کو دل میں جگہ دے بلکہ طمانیت قلب کے ساتھ اپنی مختصر فارغ الہیاتی اور خوشحالی پر شاکر رہے اور یا پھر عملی جدوجہد میں آگے بڑھ کر اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق ان تمام حقوق معیشت سے متبع ہو اور غنا و دولت حاصل کرے جن کو تمام مخلوق خدا کے لئے عام اور مساوی کر دیا گیا اور دوسرے افراد ملت کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں کو اپنے حاصل کردہ مال پر اسی طرح عائد کرے جس طرح قانون اسلامی نے دوسرے ارباب دولت پر عائد کئے گئے ہیں۔“

ان اقتباسات (Extracts) سے عیاں ہوتا ہے کہ حق معیشت میں تو سارے انسانوں کی یکسانیت ہے مگر آمدنی میں برابری ہونا خلاف اصول فطرت ہے کیونکہ سارے افراد ایک جیسی اہلیت (Ability) صلاحیت اور کارکردگی کے مالک نہیں ہوتے اسباب و حالات معیشت میں بمعنی فرق ہوتا ہے اس لئے دولت میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

## کفالت عامہ

(قرآن حدیث، عہد خلافت راشدہ کے تعامل کی روشنی میں)

اس مراد وہ اخراجات ہیں جو حکومت یا عامۃ الناس مقروض لوگوں کے قریبے ادا کرنے کے لیے سہارا اور اپنا بچوں کی سحاشی اعانت کرنے، غریب مریضوں کا علاج کرانے اور بے بس مگر ازدواجی زندگی کے قائلہ لڑکوں کی شادیاں کرانے پر خرچ کئے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

1- انا اولی بالمؤمنین من انفسهم فمن تولی و علیہ دین فعلی فضانہ ومن ترک مالاً فلورثہ۔

”میں مسلمانوں کے لئے ان کی جانوں سے زیادہ قریب ہوں۔ لہذا جو شخص مر جائے اور قرضہ چھوڑ کر جائے تو اس کی ادائیگی میرے ذمہ ہے اور جو کوئی مال چھوڑ کر مرے تو وہ اس کے وارثوں کے لئے ہوگا۔“

2- انا اولی بالمؤمنین من انفسهم فمن مات و ترک مالاً لماله لموالی العصبۃ ومن ترک کللاً او ضیاعاً فارع له۔

”میں مؤمنین کے لئے ان کی جانوں سے بھی زیادہ قریب ہوں۔ لہذا جو شخص ترک میں مال چھوڑے وہ اس کے اقارب کا حق ہے اور جو شخص عاجز و درماندہ قرابت دار اور ناتواں بچوں کو چھوڑے ان کے لئے مجھے بلا لیں۔“

3- اللہ و رسولہ مولیٰ من لا مولیٰ لہ۔

”اللہ کریم اور اس کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس فرد کا والی ہے جس کا کوئی والی نہیں۔“

آپ ﷺ نے اس کا رخیر پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مامور فرمایا تھا چنانچہ جب کوئی تنگدست مسلمان رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ ﷺ اسے بھوکا یا پرہیزگار یا برہنہ پا دیکھتے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیتے اور وہ کہیں سے قرضہ لے کر بھی اس کے کھانے اور کپڑے وغیرہ کا انتظام کرتے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کہیں سے کچھ مال آتا تو اس کے ذریعے سے وہ قرض ادا کر دیا جاتا۔ اگر کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذاتی طور پر بدیہ دیتا تو وہ بھی اس مد میں شامل کر لیا جاتا۔

اس ضمن میں ایک نہایت دلچسپ واقعہ اس لڑکے کا ہے جسے اس کی والدہ محترمہ نے بھیجا کہ وہ جا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے لئے کڑا لائے۔ اس نے آ کر سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس وقت تو کچھ بے نہیں پھر کسی وقت آنا۔ اس لڑکے نے آپ ﷺ کا کرتا مبارک پکڑ کر عرض کیا: اے اللہ کریم کے رسول کریم ﷺ آپ نے تو کرتہ پہن رکھا ہے مجھے نہیں دے رہے۔“

آپ ﷺ نے اپنا کرتہ اتار کر اس لڑکے کو دے دیا۔

اس چھوٹے سے واقعہ سے ہمیں چار معاشی تعلیمات ملتی ہیں:

(i) والدہ کا اپنے بیٹے کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں کرتہ لینے کے لئے بھیجنا اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ آپ ﷺ نے کفالت عامہ کی جو ذمہ دار بحیثیت رئیس دولت اسلامیہ قبول کر رکھی تھی اس کا علم اس محتاج عورت کو بھی تھا۔

(ii) اس لڑکے کا آپ ﷺ کا کرتہ مبارک پکڑ کر کہنا کہ آپ ﷺ نے تو کرتہ پہن رکھا ہے مجھے نہیں دیتے۔ اس امر واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ لڑکا بھی جانتا تھا کہ نگلوں کو کپڑا پہنانا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ..... بحیثیت رئیس دولت اسلامیہ ..... ذمہ داری ہے۔

(iii) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کرتہ مبارک اتار کر اس لڑکے کو دے دینا اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اعتراف تھا کہ ایسے بے کسوں اور بے نواؤں کو کپڑا پہنانا آپ ﷺ کی ذمہ داری ہے لہذا آپ ﷺ نے اپنا کرتہ تک اتار کر اس ننگے برہنہ لڑکے کے سپرد کر دیا۔ صلی اللہ علیہ وآلہ و اصحابہ وسلم!

(iv) قیامت تک آنے والے اسلامی ریاست کے حکمرانوں کو یہ سبق دے دیا کہ یہ کیونکر درست ہے کہ وہ خود تو اپنی ضروریات پوری کر رہے ہوں (مثلاً کپڑے پہن کر رہیں)

اور ان کی رعایا کے محتاج اور بے کس برہنہ تن یا برہنہ پایا پیٹ سے بھوک پھریں۔

### کفالت عامہ اور جدید دنیا:

یورپ کو ناز ہے اس بات پر کہ اس نے کفالت عامہ (Social Security) کا تصور پیش کر کے عاجز و درماندہ اور محتاج انسانوں پر احسان کیا ہے مگر شاید یورپ اور اس کے متاثرین یہ بھول گئے ہیں کہ یورپ نے اس کار خیر کا آغاز انیسویں صدی میں کیا اور اس کا سہرا برطانوی وزیر بیورج (Beveridge) کے سر باندھتے ہیں جس نے 1942ء میں بیورج رپورٹ (Beveridge Report) پیش کر کے محتاجوں کو کچھ دینے کی اپیل کی تھی مگر ہمارے نبی کریم ﷺ نے اس کار خیر کا آغاز اس زمانے میں کیا جب دنیا کفالت عامہ کے تصور سے ہی خالی تھی۔

### کفالت عامہ کا تعارف:

یہ ایک ایسا اٹھلائی تصور ہے جس کی کسی دیگر نظام میں کوئی نظیر (Precedent) نہیں ملتی۔ الخضر اور الکفو دونوں ہی ایسی زبردست تدابیر ہیں کہ جنہیں اختیار کرنے سے دولت کی تقسیم متصفانہ بنانے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ زائد از ضرورت (Byond Need) آمدنی اچھے کاموں پر خرچ کرنے اور اقرباء و غرباء کی مالی اعانت کرنے سے مثبت نتائج نکلتے ہیں۔

علامہ حافظ جلال الدین سیوطی رقم طراز ہیں:

”امام ابن المنذر اور امام ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے کا حکم اس وقت تھا جب زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی تھی۔“

امام طبرانی اور امام بیہقی نے ”عفو“ کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ جو شے اہل و عیال پر صرف ہونے سے رہ جائے اسے اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے۔

امام ابن المنذر نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ عفو کے تین معنی ہیں:

i- گناہ سے درگزر کرنا۔

ii- میانہ روی سے خرچ کرنا۔

iii- لوگوں کے ساتھ احسان برتنا۔

امام عبد بن حمید نے طاووس سے روایت کیا ہے کہ عفو کے معنی ضرورت سے زائد جس کا صرف کرنا آسان ہو البتہ مجاہد کے مطابق اس سے مراد زکوٰۃ ہے۔

تفسیر در مشور میں آیت 219 سورۃ البقرہ کی شان نزول کی بابت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ جب خدائے متعال نے فرزندان توحید کو حکم دیا کہ دین حق کی پیش رفت کے لئے خرچ کریں تو چند اصحاب و انصار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہم نہیں جانتے

کہ اپنے مال میں سے کتنی مقدار صرف کی جائے۔ کیا سارے کا سارا مال خرچ کر لیں یا اس کا کچھ حصہ؟

سید صفدر حسین نجفی نے تفسیر نمونہ ج دوم کے ترجمہ میں تحریر کیا ہے کہ:

”عفو کے لغت میں کئی معانی بیان کئے گئے ہیں:

بخشش و عنایت

اثر زائل کرنا

کسی چیز کو پکڑنے کا ارادہ کرنا

ہر چیز کا وسط اور درمیان

کسی چیز کی اضافی مقدار..... اور

مال کا بہترین حصہ

یہ سب عفو کے مختلف معانی ہیں۔“

مزید برآں یہ کہ:

”تین پہلے معانی ظاہر آیت کے مفہوم سے مناسبت نہیں رکھتے بلکہ آخری تین معانی میں سے یہاں کوئی اس کا مفہوم ہے یعنی خرچ کرنے میں حد اوسط اور اعتدال کا خیال رکھنا یا اپنی ضروریات سے اضافی مقدار خرچ کرنا (یہ دونوں معانی ایک ہی مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں کیونکہ اعتدال کو ملحوظ رکھنے کا معنی یہی ہے کہ اپنی ضرورت سے زیادہ مال خرچ کیا جائے اور اپنی زندگی کو تباہ نہ کیا جائے)۔

اگر آخری معنی مراد لیا جائے تو آیت کا مضمون یہ ہے:

”خرچ کرتے وقت گھٹیا اور بے قدر و قیمت مال کا انتخاب نہ کرو بلکہ راہ خدا میں خرچ کرنے کے لئے اپنے مال کے بہترین حصے کا انتخاب کرو۔“

یہ معنی بھی پہلے دو معانی پر پوری طرح سے منطبق ہوتا ہے کیونکہ خرچ کرتے وقت حد وسط اور اعتدال کو بھی مد نظر رکھا جائے اور اچھے مال کا بھی انتخاب کیا جائے تو ان تمام معانی پر عمل ہو سکتا ہے۔

اسی لئے پادیاں اسلام نے اس لفظ کی تفسیر کرتے ہوئے بعض اوقات لفظ ”وسط“ استعمال کیا ہے جبکہ تفسیر عیاشی اور کتاب کافی میں حضرت امام صادقؑ سے منقول ہے آپ نے فرمایا: ”عفو“ یعنی حد وسط۔

اور کبھی اس کا معنی لفظ ”فضل“ سے کیا گیا ہے جس کا معنی ہے زیادتی، اضافہ۔ جیسا کہ مجمع البیان میں حضرت امام باقر رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے آپ نے فرمایا: العفو، ما فضل عن قوۃ الشۃ

”غلو..... وہ چیز ہے جو سال کے مخرج سے بچ جائے۔“

آیت میں ایک اور احتمال بھی ہے کہ غواہی پہلے معنی میں ہو یعنی مغفرت اور دوسروں کی لغزشوں سے درگزر کرنا۔ اگرچہ جہاں تک ہم نے دیکھا ہے یہ احتمال کسی مفسر نے بیان نہیں کیا۔ اس احتمال کے مطابق آیت کا مفہوم یوں ہوگا:

”کہہ دو کہ بہترین اتفاق اور خرچ کرنا یہ ہے کہ خود درگزر کو خرچ کرو۔“  
شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے لکھا ہے:

”اور سوال کرتے ہیں تجھ سے کیا خرچ کریں کہہ زیادہ حاجت سے۔“  
مولانا شاہ عبدالقادرؒ کے مطابق:

”اور پوچھتے ہیں تجھ سے کیا خرچ کریں تو کہہ جو افزود ہو۔“  
شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ لکھتے ہیں:

”اور آپ ﷺ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہہ دیجئے جو خرچ سے بچ جائے۔“

لوگوں نے پوچھا تھا کہ مال اللہ کے واسطے کس قدر خرچ کریں حکم ہوا جو اپنے اخراجات سے افزود (زائد) ہو کیونکہ جیسا آخرت کی فکر ضروری ہے دنیا کی فکر بھی ضروری ہے مال انشاء تو اپنی ضروریات کے مطابق کیونکہ جو حقوق تم پر لازم ہیں ان کو پورا کرو معلوم نہیں کس کس خرابی دینی اور دنیوی میں پھنسو۔

### کفالت عامہ اور اسلامی ریاست:

اس سے مراد یہ ہے کہ دارالاسلام کے حدود کے اندر بسنے والے ہر انسان کی بنیادی ضروریات زندگی کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے۔ یہ اہتمام اس درجہ تک ہونا چاہئے کہ کوئی فرد ان ضروریات سے محروم نہ رہے۔ ان بنیادی ضروریات میں غذا، لباس، مکان اور علاج لازماً شامل ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلامی ریاست اس بات کی ذمہ دار ہے کہ ہر فرد کو ان ضروریات کی تکمیل کرنے والی اشیاء اور خدمات کی مطلوبہ یہ ضروری مقداریں بہم پہنچاتی رہے بلکہ ان کے کہ وہ خود اپنے مال سے یا اپنی محنت کے ذریعے کسب مال کر کے ان ضروریات کو پورا کر سکتا ہے یا نہیں۔ جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے عام حالات میں عام افراد ان ضروریات کو خود اپنے ہاں پوتے پر پورا کرتے رہیں گے۔ بقدر ضرورت مال نہ حاصل کر سکنے والے افراد کو اپنے خاندان یا عام افراد اجتماع سے اتنی مدد مل سکے گی کہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ صنعتی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو عارضی بے روزگاری مرضی بڑھاپے

یا کسی حادثہ کے سبب معذور ہو جانے کی حالت میں کارخانہ یا متعلقہ صنعت سے اتنا لہذا دی و نظیفہ دلوانے کا اصول بنایا جاسکتا ہے جو ان کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔ سماجی تحفظ (Social Security) کے ان انتظامات کو سامنے رکھتے ہوئے اس اصول کا منشاء یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے کوئی فرد ان انتظامات کے باوجود اس حال میں پایا جائے کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل سے قاصر ہو تو بلاخر اسلامی ریاست اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ فرد ان وسائل حیات سے محروم نہ رہے جو ضروریات زندگی کی تکمیل کے لئے درکار ہیں۔ ریاست کو ایسا نظم قائم کرنا پڑے گا کہ محروم افراد اپنی محدودی کا ثبوت فراہم کر کے 'پاسانی' اور بلا تاخیر اجتماعی خزانے سے بقدر ضرورت مال حاصل کر سکیں اور دارالاسلام کا کوئی باشندہ بھوکا پیاسا، ننگا بے ٹھکانہ اور مرض کی حالت میں بے علاج نہ رہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اصول واضح کر دیا ہے کہ اصحاب امر محروم افراد کی ضروریات کی تکمیل کے ذمہ دار ہیں:

”ہم سے سلیمان بن عبدالرحمن دمشقی نے بروایت یحییٰ بن حمزہ یہ حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ مجھ سے ابن ابی مریم نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ قاسم بن خمیرہ نے انہیں خبر دی ہے کہ ابو مریم ازدی نے ان سے کہا کہ میں معاویہؓ کے پاس گیا۔ انہوں نے کہا ابو فلاں! کیسے تشریف لائے؟ میں نے کہا: آپ کو ایک حدیث سے باخبر کرنے آیا ہوں جسے میں نے سنا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جسے اللہ عزوجل نے مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنایا ہے اور وہ ان کی ضروریات اور فقر سے بے پروا ہو کر بیٹھ رہا، اللہ تعالیٰ بھی اس کی ضروریات اور فقر سے بے نیاز ہو جائے گا۔“

راوی کہتا ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ نے (یہ سن کر) ایک آدمی کو عوام کی ضروریات پر مامور کر دیا۔

”..... عمرو بن حمزہ نے معاویہؓ سے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو امام ضرورت مندوں، فقراء اور مساکین پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے اللہ اس کی ضروریات، فقر اور مسکینی پر آسمان کے دروازے بند کر لیتا ہے۔ (یہ سن کر) معاویہؓ نے ایک آدمی کو عوام کی ضروریات (پوری کرنے) پر مامور کر دیا۔“

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے واضح ہے کہ اگر صاحب امر ضرورت مند افراد کی ضروریات پوری کرنے کا اہتمام نہ کرے گا تو اللہ کی سخت ناراضگی مول لے گا۔ یہ وعید اس بات کے لئے کافی ہے کہ تکمیل ضروریات کو اسلامی ریاست کی ذمہ داری قرار دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب امیر معاویہؓ کو اس فرمان نبوی کے ذریعے ان کی ذمہ داری یاد دلایا گئی تو انہوں نے فوراً اس کو پورا کرنے کا اہتمام کیا۔



مسلم ریاست کی اس ذمہ داری کی اہمیت کا اندازہ ’خلافت‘ کی اس تعریف سے بھی کیا جاسکتا ہے جو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کی ہے جسے سن کر کعب احبار رضی اللہ عنہ نے ان کی تصویب فرمائی ہے:

”سلمان سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: خلیفہ وہ ہے جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرے اور رعایا پر اس طرح شفقت کرے جس طرح آدمی اپنے اہل و عیال پر شفقت کرتا ہے۔ یہ سن کر کعب بن احبار نے کہا: سچ کہا۔“

رعایات کی ضروریات زندگی کی تکمیل کا اہتمام دراصل اس ’خیر خواہی‘ کے اندر شامل ہے جو صاحب امر پر لازم قرار دی گئی ہے۔ جو حکمران رعایا کے ساتھ پوری خیر خواہی نہ برتے اس کا اخروی انجام بُرا ہوگا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق:

ما من عبد یستریعہ اللہ رعیۃ فلم یحطہا بنصیحۃ لم یجدوا النجۃ الجنۃ۔  
 ”جس بندہ کو خدا نے کسی رعایا کا حکمران بنایا اور اس نے اس کے ساتھ پوری خیر خواہی نہ برتی وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا۔“

ما من امیر یلی امر المسلمین ثم لا یجہدہم و ینصح الالم یدخل معہم الجنۃ۔

”جو امیر مسلمانوں کے امور کا نگران ہے اور پھر ان (کی بھلائی) کے لئے محنت نہ کرے اور ان کی خیر خواہی نہ کرے۔ وہ ان کے ساتھ جنت میں نہیں داخل ہوگا۔“  
 ظاہر ہے کہ کسی آدمی کے ساتھ خیر خواہی کا اولین تقاضا یہ ہے کہ جن ضروریات کی عدم تکمیل سے اس کی جان ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو ان کو پورا کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

شریعت نے مسلم ریاست کو اپنے تمام شہریوں کا ولی (سرپرست) قرار دیا ہے۔ سرپرستی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ان افراد کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

اللہ و رسولہ مولیٰ من لا مولیٰ لہ۔

”جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہے۔“

السلطان ولی من لا ولی لہ۔

”جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کی سرپرست حکومت ہے۔“

یہ بات کہ یہ سرپرستی صرف نکاح کے معاملہ تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک عمومی سرپرستی ہے جس میں رعایا کی ضروریات کی تکمیل بدرجہ اولیٰ شامل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خط سے صاف ظاہر ہے جو آپ ﷺ نے ایک نو مسلم قبیلہ کے سردار زرعہ بن ذی یزن کے نام لکھا تھا۔ آپ ﷺ سردار کے توسط سے اس کے قبیلہ حمیر کے لوگوں کو مخاطب کر کے فرماتے

ہیں:

”اہل حیر میں تم کو بھلی روش اختیار کئے رہنے کی تلقین کرتا ہوں۔ نہ خیانت کرنا اور مخالفانہ روش اختیار کرنا۔ اللہ کا رسول ﷺ تمہارے مال دار اور غریب تمام لوگوں کا سرپرست ہے۔ صدقہ کا مال محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یا اس کے گھر والوں کے لئے جائز نہیں ہے بلکہ یہ زکوٰۃ ہے جسے تم (اپنی پاکیزگی کے لئے) غریب مسلمانوں کے لئے نکالتے ہو.....“

اس خط میں اہل حیر کو یہ بتایا گیا ہے کہ ان سے ان کے مال کا جو حصہ بطور زکوٰۃ وصول کیا جائے گا وہ صدر ریاست کے ذاتی مصرف میں نہیں آئے گا بلکہ ضرورت مند مسلمانوں کو دیا جائے گا۔ ان کو اطاعت ترک کر کے سرکشی کی روش اختیار کرنے یا امانت ترک کر کے اداۓ عشر و زکوٰۃ میں خیانت کرنے سے منع کیا گیا ہے اور یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ جو فرد بھی ضرورت یا مصیبت سے پریشان ہو گا خواہ وہ مال دار ہو یا مفلس! اللہ کا رسول ﷺ اس کو سہارا دینے کے لئے موجود ہے۔ ظہار ہے کہ یہاں ”رسول اللہ“ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حیثیت پیش نظر ہے جو اسلامی ریاست کے صدر کے طور پر آپ ﷺ کو حاصل تھی۔ یہ بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک اثر سے بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ آپ نے حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کو ایک خط لکھا تھا جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ”اللہ و رسولہ مولیٰ من لا مولیٰ لہ“ کا حوالہ دے کر ریاست کی ذمہ داری کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔

### فاضل مال کو خرچ کرنے کا حکم:

”میں نے سے ایک اور نکتے کی بھی وضاحت ہو سکتی ہے جو ہمارے سامنے بحث کے دوران اٹھایا گیا اور وہ یہ کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ.

”لوگ آپ ﷺ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ آپ ﷺ کہہ دیجئے جو (ضرورت سے) فاضل ہو۔“ (البقرہ: 2، 219)

نکتہ یہ اٹھایا گیا کہ اس آیت سے تمام لوگوں کو ضرورت سے زائد مال خرچ کرنے کا حکم دیا ہے اگر لوگ از خود اس حکم کی تعمیل نہ کر رہے ہوں اور حکومت اس پر عمل کرانے کے لئے ان کا فاضل مال ان سے لے کر غریبوں میں تقسیم کر دے تو اس میں کیا حرج ہے؟

اس سوال کا جواب اس بات پر متوقف ہے کہ قرآن کریم کا یہ ارشاد (کہ زائد از ضرورت مال خرچ کر دو) کوئی وجوبی حکم (Mandatory Order) ہے یا استجابی حکم ہے؟ اگر یہ وجوبی حکم ہے تو بلاشبہ زائد از ضرورت مال کا خرچ کرنا شرعی واجبات میں شامل ہو گیا۔ اس لئے بزرگ قانون اس کی تعمیل کرانے کا اختیار حکومت کو ہو گا۔ لیکن اگر یہ کوئی استجابی حکم ہے جسے

مالکان کی صوابدید پر چھوڑا گیا ہے تو پھر یہ شرعی واجبات میں داخل نہ ہوگا۔ اس لئے حکومت کو اس پر بزدور قانون مجبور کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔ لہذا پہلے اس بات کی تحقیق کر لینا مناسب ہے کہ یہ حکم کس نوعیت کا ہے؟

ملاحظہ

### قل العفو کا صحیح مفہوم:

اس آیت قرآنی کا سیاق و سباق اور اس کے نزول کا پس منظر واضح طور پر بتا رہا ہے کہ یہ کوئی وجہی حکم نہیں ہے، ترغیبی اور استجابی نوعیت کا حکم ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ حکم از خود نازل نہیں ہوا۔ بلکہ صحابہ کرام کے سوال کے جواب میں نازل ہوا ہے۔ چنانچہ آیت کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔ ”لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟“ یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ کچھ لوگ اپنا مال اپنی مرضی سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ کتنا مال خرچ کرنا اجر و ثواب کا موجب ہے؟ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ جو مال تمہاری ضرورت سے زائد ہو اس کی جو مقدار بھی خرچ کرو گے موجب اجر و ثواب ہوگی اس سوال کے جواب کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ جب قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے فضائل نازل ہوئے تو بعض صحابہ کرام ان فضائل کو حاصل کرنے کے جوش میں اپنا سارے کا سارا مال خرچ کر دیتے تھے اور خود ان کے اور ان کے اہل و عیال کے لئے کچھ نہ بچتا تھا، ان کا یہ جذبہ تو بلاشبہ قابل قدر تھا لیکن اس طرح نقلی صدقہ کرنے کی بنا پر چونکہ خود اپنے نفس اور اپنے بیوی بچوں کا واجب حق پامال ہوتا تھا۔ اس لئے قرآن و سنت نے انہیں اس سے روکا اور یہ بتایا کہ نقلی صدقہ اسی مال سے خرچ کرو جو تمہارے اور تمہارے اہل و عیال کی ضرورت سے زائد ہو۔

ایسا تصور کسی اور معاشی نظام میں نہیں ملتا اور نہ ہی اس کا کوئی جانی ہے۔ اگر افراد اس کی اہمیت جان لیں اور اپنی خالتو دولت کو بانٹ دیں تو بہت سے معاشی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ خاص طور پر دولت کی تقسیم میں موجود ناہمواری ختم ہو سکتی ہے۔ نیز ضرورت مندوں کی کفالت کا انتظام ہوگا اور غربت کا قلع قمع کرنے میں مدد ملے گی۔ مفلوک الحال کی اعانت ہوگی۔

صوفیاء کرام سورہ البقرہ کی آیت 219 کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ضرورت سے زائد شے رکھنا اور جمع کرنا حرام ہے اور کچھ بیچ جائے تو راہ خدا میں تقسیم کر دینا چاہئے ایک بار حضرت بلالؓ نے اگلے دن کے لئے روٹی رکھ دی تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

انفق یا هلال ولا تنخش من ذی العرض الا ذالاً۔

”اے بلال! صرف کرے خداوند تعالیٰ سے قلت کا خوف نہ کر۔“

## اسلام میں معاشی استحصال کی ممنوعیت

انسان شروع ہی سے معاشی عدم تحفظ سے دوچار رہا ہے۔ موجودہ دور میں انسان کا سب سے بڑا مسئلہ معاشی زبوں حالی کا مسئلہ ہے۔ ان بے شمار پکڑڈیوں کے درمیان جن پر آج کا انسان اپنے معاشی تحفظ کی تلاش میں سرگرداں ہے اسلام ایک سواہ السبیل کی حیثیت رکھتا ہے جس کی پیروی انسان کو تمام لغزشوں سے بچا کر سیدھا منزل مقصود تک پہنچا دیتی ہے۔ اسلام نے انسان کے فقر و فاقہ اور معاشی زبوں حالی کے حل کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ نہایت متوازن اور معتدل ہے۔ وہ معاشرہ اور فرد دونوں کی ضروریات کو ملحوظ رکھتا ہے۔ نہ تو معاشرہ کو اتنے اختیارات دیتا ہے کہ فرد کی ذات مسخ ہو کر رہ جائے۔ اس کی ذہنی و جسمانی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ جائیں اس کی آزادی عمل سلب ہو جائے اور اس کو اس کی محنت اور کوشش و جہد کے ثمرات سے محروم کر دیا جائے اور نہ ہی فرد کو اتنی آزادی دیتا ہے جس سے دوسرے افراد کی آزادی مجروح ہوتی ہو۔

### انسانی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا:

ایک طرف وہ ہر فرد کو اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور ان کے ثمرات سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی ترغیب دلاتا ہے۔ اس کے ثمرات محنت و کاوش کو تقدس بخشتا ہے اور کسی کو ان پر دست درازی کی اجازت نہیں دیتا تو دوسری طرف کسی کو حق تلفی اور کسی سے دجل و فریب کا مرتکب ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ ایک طرف وہ انسان کے قلب و ذہن کی تعمیر کرتا ہے اور اس کے اندر اخوت و محبت، ایثار و ہمدردی اور تعاون کے جذبات پیدا کرتا ہے اور لوگوں سے احسان اور حسن سلوک کی ترغیب دلاتا ہے اور دوسری طرف بے کس معذور اور ناتواں لوگوں کی عملی و فیکٹری کے لئے اہل ثروت کی دولت میں ان کا حق متعین کرتا ہے۔ اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ وہ اپنی حدود و مملکت میں معاشی تعمیر و ترقی کے اسباب بطریق احسن بہم پہنچائے صنعت و حرفت اور زراعت و تجارت کو ترقی دے۔ یہ صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ دینی فریضہ ہے۔ معاشی استحکام کے بغیر کوئی ریاست و مملکت مضبوط نہیں ہو سکتی۔

### صنعتی و سائنسی ترقی:

معاشی استحکام صنعتی و سائنسی ترقی کے بغیر ممکن نہیں۔ اسلحہ ساز کارخانے کھولنا، لیبارٹریاں قائم کرنا، جدید ترین انکشافات و ایجادات کی حوصلہ افزائی، جدید ہتھیار مہیا کرنا اور اپنی حدود میں انہیں تیار کرنا، سسٹم ملز قائم کرنا، کپڑے کی صنعت کو ترقی دینا، تعمیری صنعت کو بہم عروج پہنچانا، زراعت کو ترقی دینا وغیرہ۔ اس قسم کی تمام ضروری چیزیں اسلامی ریاست کے فرائض میں

شامل ہیں۔ آج کے دور میں صنعتی ترقی فولاد اور اسٹی توئائی اور بجلی کی طاقت پر منحصر ہیں لہذا ان کا حاصل کرنا اور درجہ کمال کو پہنچانا اشد ضروری ہے۔ قومی پیداوار میں اضافہ اور زرعی میدان میں ترقی کے بغیر ریاست خود کفیل نہیں ہو سکتی۔ اسلامی ریاست کو ناصرف خود کفیل بلکہ بوقت ضرورت دوسروں کی مدد کے قابل ہونا چاہئے۔ حضور ﷺ نے خود فتح مکہ سے پہلے ایک خط کے موقع پر اہل مکہ کی گراں قدر رقم اور اجناس سے مدد فرمائی تھی۔ مادی و معاشی تعمیر و ترقی کے بغیر خود کفالت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ شریعت ہاتھ سے محنت کو احرام کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس کے نزدیک ہاتھ کی ہر وہ کمائی جو جائز طریقے سے حاصل کی جائے جائز اور حلال ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”اِنَّ اَدَمَ لَے اَپنے ہاتھ کی محنت سے بہتر کوئی کھانا نہیں کھایا اور بے شک اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام بھی اپنے ہاتھ سے محنت کر کے روزی حاصل کرتے تھے۔“

اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ وہ اپنے شہریوں کے لئے تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت کی جائز سہولتیں فراہم کرے۔

## اسلام میں معاشی عدل کے اصول

آرٹو میں انصاف کا لفظ عدل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ عدل کے لفظی معنی برابر کرنا کہ ہیں جبکہ اصطلاح میں کسی چیز کو اس کی صحیح جگہ پر رکھنے کا نام عدل ہے۔ کائنات کا نظام عدل کی بنیاد پر چل رہا ہے۔ اگر عدل نہ رہے تو توازن بگڑ جاتا ہے اور جب کسی چیز کا توازن بگڑ جائے تو وہ اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں رہ سکتی۔ اسی لئے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے زندگی کے ہر معاملے میں عدل قائم کرنے میں ہماری رہنمائی کی ہے۔

### انسان اور معاشی تحفظ:

انسان شروع ہی سے معاشی عدم تحفظ سے دوچار رہا ہے۔ موجودہ دور میں انسان کا سب سے بڑا مسئلہ معاشی زبوں حالی کا مسئلہ ہے۔ ان بے شمار پگڈنڈیوں کے درمیان جن پر آج کا انسان اپنے معاشی تحفظ کی تلاش میں سرگرداں ہے اسلام ایک سواہ اسبیل کی حیثیت رکھتا ہے جس کی پیروی انسان کو تمام لغزشوں سے بچا کر سیدھا منزل مقصود تک پہنچا دیتی ہے۔ اسلام نے انسان کے فخر و فاقہ اور معاشی زبوں حالی کے حل کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ نہایت متوازن اور معتدل ہے۔ وہ معاشرہ اور فرد دونوں کی ضروریات کو ملحوظ رکھتا ہے۔ نہ تو معاشرہ کو اتنے اختیارات دیتا ہے کہ فرد کی ذات مسخ ہو کر رہ جائے۔ اس کی دینی و جسمانی صلاحیتیں مفلوج ہو کر

رہ جائیں اس کی آزادی عمل سلب ہو جائے اور اس کو اس کی محنت اور کوشش و جہد کے ثمرات سے محروم کر دیا جائے اور نہ ہی فرد کو اتنی آزادی دیتا ہے جس سے دوسرے افراد کی آزادی بھروح ہوتی ہو۔

### اسلامی مملکت اور معاشی استحکام:

ایک طرف وہ ہر فرد کو اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور ان کے ثمرات سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی ترغیب دلاتا ہے۔ اس کے ثمرات محنت و کاوش کو تقدس بخشتا ہے اور کسی کو ان پر دست درازی کی اجازت نہیں دیتا تو دوسری طرف کسی کو حق تلفی اور کسی سے دھل و فریب کا مرتکب ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ ایک طرف وہ انسان کے قلب و ذہن کی تطہیر کرتا ہے اور اس کے اندر اخوت و محبت کی ایثار و ہمدردی اور تعاون کے جذبات پیدا کرتا ہے اور لوگوں سے احسان اور حسن سلوک کی ترغیب دلاتا ہے اور دوسری طرف بے کس معذور اور ناتواں لوگوں کی عملی و نظری کی لئے اہل ثروت کی دولت میں ان کا حق متعین کرتا ہے۔ اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ وہ اپنی حدود مملکت میں معاشی تعمیر و ترقی کے اسباب بطریق احسن بہم پہنچائے صنعت و حرفت اور زراعت و تجارت کو ترقی دے۔ یہ صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ دینی فریضہ ہے۔ معاشی استحکام کے بغیر کوئی ریاست و مملکت مضبوط نہیں ہو سکتی۔

معاشی استحکام صنعتی و سائنسی ترقی کے بغیر ممکن نہیں۔ اسلحہ ساز کارخانے کھولنا، لیبارٹریاں قائم کرنا، جدید ترین انکشافات و ایجادات کی حوصلہ افزائی، جدید ہتھیار مہیا کرنا اور اپنی حدود میں انہیں تیار کرنا، شیل ملز قائم کرنا، کپڑے کی صنعت کو ترقی دینا، تعمیری صنعت کو بہم عروج پر پہنچانا، زراعت کو ترقی دینا وغیرہ۔ اس قسم کی تمام ضروری چیزیں اسلامی ریاست کے فرائض میں شامل ہیں۔ آج کے دور میں صنعتی ترقی، فولاد اور ایسی توانائی اور بجلی کی طاقت پر منحصر ہیں لہذا ان کا حاصل کرنا اور درجہ کمال کو پہنچانا اشد ضروری ہے۔ قومی پیداوار میں اضافہ اور زرعی میدان میں ترقی کے بغیر ریاست خود کفیل نہیں ہو سکتی۔ اسلامی ریاست کو ناصرف خود کفیل بلکہ بوقت ضرورت دوسروں کی مدد کے قابل ہونا چاہئے۔ حضور ﷺ نے خود فتح مکہ سے پہلے ایک خط کے موقع پر اہل مکہ کی گراں قدر رقم اور اجناس سے مدد فرمائی تھی۔ مادی و معاشی تعمیر و ترقی کے بغیر خود کفالت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ شریعت ہاتھ سے محنت کو احترام کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس کے نزدیک ہاتھ کی ہر وہ کمائی جو جائز طریقے سے حاصل کی جائے جائز اور حلال ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”ابن آدم نے اپنے ہاتھ کی محنت سے بہتر کوئی کھانا نہیں کھایا اور بے شک اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام بھی اپنے ہاتھ سے محنت کر کے روزی

حاصل کرتے تھے۔“

اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ وہ اپنے شہریوں کے لئے تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت کی جائز سہولتیں فراہم کرے۔

## معاشی استحصال سے بچنے کے طریقے

اسلام معاشی استحصال سے بچنے کے لئے معاشرے میں عدل کو فروغ دیتا ہے۔ عدل کی درج ذیل دو اقسام ہیں:

1- انفرادی عدل

2- اجتماعی عدل

### انفرادی عدل:

انفرادی عدل سے مراد یہ ہے کہ انسان کی انفرادی زندگی کے تمام امور میں اعتدال سے کام لیا جائے۔ دینی اور دنیاوی معاملات میں توازن قائم رکھنے کی تعلیم ہمیں اسلام نے دی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ اس سلسلے میں ہمارے لئے کامل نمونہ ہے۔ ایک مرتبہ حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں تین اصحاب حاضر ہوئے۔ ایک نے کہا کہ وہ ساری ساری رات عبادت کیا کرے گا دوسرے نے کہا کہ وہ ہمیشہ روزے رکھے گا تیسرے نے کہا کہ وہ ساری زندگی نکاح نہیں کرے گا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ان کی باتیں سن کر فرمایا کہ میں رات کا کچھ حصہ عبادت کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں روزہ رکھتا بھی ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں میں نے شادیاں بھی کی ہیں جس نے میری سنت کو چھوڑا وہ مجھ سے نہیں۔

### اجتماعی عدل:

اجتماعی عدل کی مختلف صورتیں ہیں مثلاً عدالتی امور میں عدل، معاشرتی امور میں عدل اور معاشی امور میں عدل وغیرہ۔

عدالتی معاملات میں عدل بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ دستاویز لکھنے اور عدالت میں گواہی دینے کے معاملے میں انصاف کا دامن مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھنے کے بارے میں قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

”جب بات کہو تو انصاف کا ساتھ دو خواہ فریق مقدمہ رشتہ داری

کیوں نہ ہو۔“

ایک پاکیزہ اور بلند اخلاق معاشرہ کی تشکیل کے لئے بھی عدل بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اسلام ہمیں ٹاپ تول، حقوق العباد اور روزمرہ کے دیگر معاشرتی امور میں عدل قائم کرنے کا درس

دیتا ہے۔ معاشی امور میں بھی عدل کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ عدالتی اور معاشرتی امور میں کیونکہ اسلام نے ہمیں ایک جامع اور ہمہ گیر معاشی نظام عطا کیا ہے جس میں عدل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ معاشی امور میں عدل کی اہمیت قرآن سے ثابت ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”كَلَّاۤءَ يٰٓوَيْلٰٓيْكِنۡ فُضُولۡ خِرَیۡجِیۡ سَے بچو۔“

معاشی امور میں عدل یعنی میانہ روی اختیار کرنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد پاک ہے:

ترجمہ: ”اللہ کے مقرب بندے وہ ہیں کہ جب خرچ کریں تو نہ فضول خرچی کریں نہ بخل سے کام لیں بلکہ اعتدال کی راہ اختیار کریں۔“

عدل کی یہ مثالیں مغربی اور اشتراکی تصور عدل میں کہیں نہیں ملتیں۔ گو کہنے کی حد تک اشتراکیت نے ایک ایسا معاشی اور سماجی نظام پیش کیا جس کے تحت تمام افراد معاشرہ کو ان کی صلاحیتیں اُجاگر کرنے کے لئے یکساں مواقع فراہم کرنے کی ضمانت دی جاتی ہے۔ اشتراکیت کے حامی ریاست کے قانون کی قوت سے ہی معاشی اور معاشرتی عدل قائم کرتا جاتے ہیں۔ مختصر بات یہ ہے کہ اشتراکی فلسفہ کے متذکرہ فوائد کے باوجود اس میں بعض شدید نقائص کی نشاندہی کی گئی ہے مثلاً اشتراکیت کے اس بنیادی اصول کو ہی تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ جائیداد یا نجی ملکیت تمام معاشی اور سماجی برائیوں کی جڑ ہے۔ صحت مندانہ مقابلہ ایک متوازن معاشی نظام میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اشتراکی نظام میں اسے سرے سے ہی ختم کر دیا جاتا ہے۔ اشتراکی نظام میں فرد کی آزادیاں چھین لی جاتی ہیں۔

تنقیدی جائزہ:

انسان شروع ہی سے معاشی عدم تحفظ اور استحصال سے دوچار رہا ہے۔ موجودہ دور میں انسان کا سب سے بڑا مسئلہ معاشی زبوں حالی کا مسئلہ ہے۔ ان بے شمار پگھڑندیوں کے درمیان جن پر آج کا انسان اپنے معاشی تحفظ کی تلاش میں سرگرداں ہے اسلام ایک سواہ السبیل کی حیثیت رکھتا ہے جس کی پیروی انسان کو تمام لغزشوں سے بچا کر سیدھا منزل مقصود تک پہنچا دیتی ہے۔ اسلام نے انسان کے فخر و فائدہ اور معاشی زبوں حالی کے حل کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ نہایت متوازن اور معتدل ہے۔ وہ معاشرہ اور فرد دونوں کی ضروریات کو ملحوظ رکھتا ہے۔ نہ تو معاشرہ کو اتنے اختیارات دیتا ہے کہ فرد کی ذات مسخ ہو کر رہ جائے۔ اس کی ذاتی و جسمانی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ جائیں اس کی آزادی عمل سلب ہو جائے اور اس کو اس کی محنت اور کوشش و جہد کے ثمرات سے محروم کر دیا جائے اور نہ ہی فرد کو اتنی آزادی دیتا ہے جس سے



دوسرے افراد کی آزادی مجروح ہوتی ہو۔

ایک طرف وہ ہر فرد کو اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو بردے کار لانے اور ان کے ثمرات سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی ترغیب دلاتا ہے۔ اس کے ثمرات محنت و کاوش کو تقدس بخشتا ہے اور کسی کو ان پر دست درازی کی اجازت نہیں دیتا تو دوسری طرف کسی کو حق تلفی اور کسی سے دخل و فریب کا مرتکب ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ ایک طرف وہ انسان کے قلب و ذہن کی تطہیر کرتا ہے اور اس کے اندر اخوت و محبت کی ایثار و ہمدردی اور تعاون کے جذبات پیدا کرتا ہے اور لوگوں سے احسان اور حسن سلوک کی ترغیب دلاتا ہے اور دوسری طرف بے کس معذور اور ناتواں لوگوں کی عملی و نظری کے لئے اہل ثروت کی دولت میں ان کا حق متعین کرتا ہے۔ اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ وہ اپنی حدود مملکت میں معاشی تعمیر و ترقی کے اسباب بطریق احسن بہم پہنچائے صنعت و حرفت اور زراعت و تجارت کو ترقی دے۔ یہ صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ دینی فریضہ ہے۔ معاشی استحکام کے بغیر کوئی ریاست و مملکت مضبوط نہیں ہو سکتی۔

معاشی استحکام صنعتی و سائنسی ترقی کے بغیر ممکن نہیں۔ اسلحہ ساز کارخانے کھولنا، لیبارٹریاں قائم کرنا، جدید ترین انکشافات و ایجادات کی حوصلہ افزائی، جدید ہتھیار مہیا کرنا اور اپنی حدود میں انہیں تیار کرنا، سہیل طر قائم کرنا، کپڑے کی صنعت کو ترقی دینا، تعمیر صنعت کو بہم عروج پر پہنچانا، زراعت کو ترقی دینا وغیرہ۔ اس قسم کی تمام ضروری چیزیں اسلامی ریاست کے فرائض میں شامل ہیں۔ آج کے دور میں صنعتی ترقی فولاد اور اشیائے توانائی اور بجلی کی طاقت پر منحصر ہیں لہذا ان کا حاصل کرنا اور درجہ کمال کو پہنچانا اشد ضروری ہے۔ قومی پیداوار میں اضافہ اور زرعی میدان میں ترقی کے بغیر ریاست خود کفیل نہیں ہو سکتی۔ اسلامی ریاست کو تا صرف خود کفیل بلکہ بوقت ضرورت دوسروں کی مدد کے قابل ہونا چاہئے۔ حضور ﷺ نے خود فتح مکہ سے پہلے ایک قحط کے موقع پر اہل مکہ کی گزراں قدر رقم اور اجناس سے مدد فرمائی تھی۔ مادی و معاشی تعمیر و ترقی کے بغیر خود کفالت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ شریعت ہاتھ سے محنت کو احترام کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس کے نزدیک ہاتھ کی ہر وہ کمائی جو جائز طریقے سے حاصل کی جائے جائز اور حلال ہے۔

رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

”ابن آدم نے اپنے ہاتھ کی محنت سے بہتر کوئی کھانا نہیں کھایا اور بے شک اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام بھی اپنے ہاتھ سے محنت کر کے روزی حاصل کرتے تھے۔“

اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ وہ اپنے شہریوں کے لئے تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت کی جائز سہولتیں فراہم کرے۔

## عصر جدید کے معاشی نظریات و افکار کا اسلامی فکر کی روشنی میں جائزہ

### اسلام اور سرمایہ داریت

اسلام اور نظام سرمایہ داری میں کوئی جزو مشترک نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سرمایہ داری کے خالق آدم سمٹھ بھی سرمایہ داری کے دعویٰ سے مطمئن نہیں تھے اور وہ لکھتے ہیں کہ: ”کم ہی ایسا ہوتا ہے جب کاروباری لوگ کہیں باہم جمع ہو جائیں اور ان کی محفل پبلک کے خلاف کسی سازش پر اور قیمتوں میں اضافے کے لئے کسی قرارداد پر ختم نہ ہو۔ حد یہ ہے کہ تقریبات تک میں مل بیٹھنے کا جو موقع مل جاتا ہے اس کو بھی یہ حضرات اس جرم سے خالی نہیں جانے دیتے۔“ اس سے سرمایہ داری کی حقیقت بالکل سامنے آ جاتی ہے۔

### 1۔ اخلاقیات (Morality):

پروفیسر ڈاکٹر لارڈ کینز ایک بہت بڑے معیشت دان گزرے ہیں۔ انہوں نے اپنے نئے نظریات کی وجہ سے معاشیات کی علمی و ادبی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اپنے معاشی سرمایہ دارانہ نظام کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

”دنیا پر اخلاقی اور فطری قوانین کی ایسی مضبوط حکومت قائم نہیں ہے۔ جس کے زور سے افراد کے ذاتی مفاد اور سوسائٹی کے اجتماعی مفاد میں ضرور آپ ہی آپ موافقت ہوتی رہے۔ معاشیات کے اصولوں سے یہ استنباط کوئی صحیح استنباط نہیں ہے کہ روشن خیال خود غرضی ہمیشہ اجتماعی فلاح و بہبود ہی کے لئے کوشش کیا کرتی ہے اور یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ خود غرض ہمیشہ روشن خیال ہی ہوا کرتی ہے۔ اکثر تو یہ دیکھا جاتا ہے جو لوگ انفرادی طور پر اپنی اغراض کے لئے جدوجہد کرتے ہیں وہ اس قدر نادان یا کمزور ہوتے ہیں وہ خود اپنی اغراض کو بھی پورا نہیں کر سکتے کبھی ان کے ہاتھوں اجتماعی مفاد کی خدمت ضرور اور ہمیشہ انجام پاتی رہے۔“

ان حالات میں صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اسلام اور سرمایہ داری کے درمیان کو بقدر کیساں نہیں ہے اور اسلام اخلاقیات پر زور دیتا ہے۔

### 2۔ محنت:

سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور کی اس کمزوری سے خوب فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ مزدور کو کم

از کم اجرت دے کر مزدور کا اشتغال کیا جاتا ہے لیکن اسلام اس قسم کے اشتغال کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں دیتا۔

### 3- حقوق ملکیت:

اسلام نے بھی فرد کا حق ملکیت مانا ہے مگر اس نے جائیداد میں زکوٰۃ کی شکل میں قیہوں تاداروں اور بیواؤں کا حق بھی بتایا ہے جب کہ سرمایہ داری میں صرف روپیہ اکٹھا کرنے اور اس میں اضافہ کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔

### 4- مراعات:

اسلام نے ہر طبقہ کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے اور زیادہ سے زیادہ مراعات دینے کی پر زور سفارش کی ہے اور ہدایت کی ہے کہ مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی اجرت ادا کر دی جائے لیکن سرمایہ داری میں مزدور کا پسینہ خشک ہی نہیں ہونے دیا جاتا اس لئے اسے اجرت کیسے مل سکتی ہے۔

### 5- پاسداری:

سرمایہ دارانہ نظام میں اسے فقط زندہ رہنے کا حق دیا جاتا ہے جس میں زندہ رہنے کی طاقت ہو غریب اور بھوکے کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ لیکن اسلام کا حکم ہے کہ اگر آپ کا پڑوسی بھوکا ہے تو آپ پر روٹی حرام ہو جاتی ہے اور اگر معاشرے میں ایک فرد بھی بھوکا سوئے گا تو اس کی پورے معاشرے سے پوچھ ہوگی اور اگر ہتھیلی کی خوشبو پڑوسی کے گھر تک چلی جائے تو اس پر پڑوسی کا بھی حق بنتا ہے۔ کیا سرمایہ داری اس کی متحمل ہو سکتی ہے۔

### 6- چند اقدار:

سرمایہ داریت میں افراتفری، بھانگ بھانگ اور نفسا نفسی کے عالم کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا جب کہ اسلام میں اخوت و یگانگت و مساوات اور بھائی چارے کا یہ عالم ہے کہ وقت جان کنی ہے اور پیاسا پانی خود نہیں پیتا بلکہ دوسرے کے لئے بھیج دیتا ہے۔ سرمایہ داری میں کاروبار کے جو طریقے اپنائے جاتے ہیں وہ اجتماعی مفاد کے منافی ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک طرف تو غلبہ اور دیگر ضروری اشیاء سبک کر دی جاتی ہیں ای ان کا ذخیرہ کر کے مصنوعی قلت پیدا کر دی جاتی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ منافع کمایا جاسکے اور دوسری طرف ہزاروں لوگ ان ضروریات سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اسلام اس قسم کے کاروبار کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔

### 7- مقاصد میں اختلاف:

دونوں نظاموں کے بنیادی مقاصد میں فرق پایا جاتا ہے۔ سرمایہ داری نظام کا نصب

الغیر محض فرد کی مادی خوشحالی ہے۔ جب کہ اسلامی نظام معیشت میں فرد کی جدوجہد کا مقصد رضائے الہی کے مطابق مادی احتیاجات کو ایسے انداز میں پورا کرنا ہے جس سے وہ اخروی فلاح سے محروم نہ رہ جائے۔ گویا اسلامی نظام معیشت کا مقصد فرد کی دنیوی اور اخروی فلاح ہے۔

### 8- آزادی اور فرق:

اسلام اور سرمایہ داری دونوں نظام فرد کی معاشی آزادی کو تسلیم کرتے ہیں اور اسے یہ حق دیتے ہیں کہ وہ کسب معاش کے لئے کوئی سا بھی شعبہ یا پیشہ اختیار کر لے لیکن سرمایہ داری نظام میں فرد کے اس حق پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ صارف اپنے مفاد یا تسکین اور اجر اپنے منافع کو زیادہ سے زیادہ کرنے کے لئے کوئی بھی طرز عمل اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن اسلامی نظام معیشت میں صارف یا اجر من مانی نہیں کر سکتا۔ اسے چند اخلاقی اقدار کے دائرہ میں رہ کر ہی اپنے طرز عمل کو کوئی شکل دینی ہوتی ہے۔

ایک صارف حرام اشیاء اور لہو و لعب کے سامان وغیرہ سے لذت و راحت کے حصول کا اہتمام نہیں کر سکتا اور نہ ہی ایک اجر حرام اشیاء کی پیداوار اور حصول منافع کے لئے ناجائز ہتھکنڈے استعمال کر سکتا ہے۔

### 9- مسابقت و معاونت:

سرمایہ دارانہ نظام افراد کے باہمی مقابلہ و مسابقت کو معاشی جدوجہد کے فروغ اور معیشت کی افزائش و ترقی کا بنیادی سبب قرار دیتا ہے۔ اس گروں توڑ مسابقت کے نتیجہ میں اصحاب ثروت دولت سمیٹ لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جب کہ کمزور طبقات بالخصوص محنت کش محروم اور معاشی پریشانیوں کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام باہمی تعاون کی بنیاد پر افراد کی معاشی جدوجہد کو استوار کرتا ہے۔ یہ تعاون باہمی افراد کی فطری صلاحیتوں کو بہتر انداز میں پروان چڑھا کر ان کے معاشی استحکام اور معاشرتی یکجہتی کا باعث بنتا ہے۔

### 10- یقین آخرت:

اسلام میں مقصود آخرت کی زندگی ہے اور دینی زندگی کو آخرت کی بھٹی سمجھا گیا ہے مگر طرز زندگی ایسا دیا گیا ہے جس میں آخرت کی بہتری کی ساتھ دینی زندگی کی بہتری خود بخود حاصل ہو جاتی ہے مگر سرمایہ داریت میں نہیں ہے۔

### 11- روحانیت کی اہمیت:

اسلام میں روح اور مادہ دونوں کے حقوق ادا کئے گئے ہیں اور دونوں کے حقوق میں

توازن رکھا گیا ہے۔ مگر دوسرے نظام میں فقط آپ کی کوئی وقعت نہیں ہے مگر سرمایہ داریت میں آخرت کی کوئی جگہ نہیں اس میں دینی زندگی کی بہتری ہی مقصود ہوتی ہے۔

## 12- ارتکاز دولت کی ممانعت:

اسلام نے زکوٰۃ کے ذریعے قربانی، حج، صدقہ، خیرات وغیرہ کے ذریعے ارتکاز دولت کی مخالفت کی ہے کیونکہ اس طرح ایک طرف تو دولت بے دریغ اور فضولیات پر خرچ ہوتی ہے اور دوسری طرف عام آدمی نان و نفقہ تک کو ترستا رہ جاتا ہے۔ سورۃ التوبہ میں ارشاد خداوندی ہے کہ:

”اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں عذاب الیم کی خبر دے دو۔“

اس کے برعکس سرمایہ داری میں ارتکاز دولت ناگزیر ہے۔ سرمایہ داریت کے نزدیک اگر اللہ کی راہ میں خرچ کیا تو وہ روپیہ ضائع ہو جائے گا مگر اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

”اور تم نیک کامیوں میں جو کچھ خرچ کرو گے وہ تم کو پورا پورا ملے گا اور تم پر ہرگز ظلم نہ ہوگا۔“

سرمایہ داری میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ دولت اکٹھی کر کے سود پر دی جائے تو اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن اسلام کا دعویٰ ہے کہ سود سے دولت گھٹ جاتی ہے۔

سرمایہ دار تنگ دست مقررہ وصول کا مال لے کر اپنا قرضہ وصول کرتا ہے لیکن سورۃ البقرہ میں ارشاد ہے:

”اگر قرض دار تنگ دست ہو تو اس کی حالت درست ہونے تک اسے مہلت دے دو اور اگر مجاف کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہوگا۔ اس کا فائدہ تم سمجھ سکتے ہو اگر کچھ علم رکھتے ہو۔“

سرمایہ دار اگر کچھ روپیہ نیک کامیوں پر خرچ کرتا ہے تو اس کا مقصد اپنی نمائش و نمود کی شہرت اور محسولات میں چھوٹ لگنی ہوتی ہے۔ مگر اسلام میں اس کا ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے اللہ کی خوشنودی و رضا مندی حاصل کرنا جو مخلوق خدا کی خدمت کرنے سے مل سکتی ہے۔

## 13- حرمت سود:

سود سرمایہ دارانہ نظام کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اسے سرمایہ کی فراہمی کا سب سے بڑا وسیلہ گردانا جاتا ہے لیکن اسلام نے سود کو حرام اور ناجائز قرار دیا ہے۔ وہ اسے سرمایہ کاری اور معاشی خوشحالی کی راہ کا سنگین پتھر تصور کرتا ہے۔ اسلامی نظام معیشت میں فراہمی سرمایہ کے دیگر ذرائع

اور بالخصوص شراکت کی بنیاد پر کاروبار کو فروغ دینے کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔

#### 14۔ حلال و حرام میں فرق:

لا دینی نظام انسان کا خود ساختہ ہے۔ اس لئے اس میں جائز و ناجائز کے معیارات بھی انسان کے بنائے ہوئے ہیں اور جن میں وہ اپنی ضرورت کے مطابق تبدیلیاں کرتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام کا معاشی نظام اللہ رب العزت کا وضع کردہ ہے۔ اس میں انسانی اعمال کے جائز و ناجائز اور کسب رزق اور صرف رزق کے حلال و حرام کے قواعد و ضوابط خالق کائنات کے اپنے بنائے ہوئے ہیں اور وہ ابدی و دائمی اور ناقابل تغیر ہیں۔

#### 15۔ متفرق:

ان دونوں نظاموں میں بڑا فرق ان نکات سے بھی عیاں ہے:

i۔ اسلام میں وسائل کا استعمال بھرپور ہوتا ہے جبکہ سرمایہ داریت میں کئی ذرائع بیکار پڑے رہتے ہیں۔

ii۔ بے کاری کو دور کرنے کی کھل سکیم وضع کی جاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ معیشت میں یہ مسئلہ دوسرا بنا رہتا ہے۔

iii۔ اسلام میں تصور حاکمیت کا تعلق ذات کبریا سے ہوتا ہے کیونکہ اقتدار اعلیٰ (Supreme Sovereignty) اس کے پاس ہوتا ہے اور انسان کو فرائض نیابت سوئے جاتے ہیں۔ حکم دینے کا حق اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اس لئے کہ وہی خالق ہے۔

”الا له الخلق والامر“ (اعراف: 54)

اس کائنات میں حاکمیت فقط اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی نہ تو ہو سکتی ہے اور نہ ہی کسی کا حق ہے۔

”کیا تم نہیں جانتے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی (Kingdom) اللہ ہی کی ہے۔“

(البقرہ: 107)

نیز یہ کہ ”اور شہنشاہیت میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔“ (الفرقان: 2)

علاوہ ازیں ”ان الحكم الا لله“ ترجمہ اس طرح ہے:

”فیصلے کا اختیار سوائے خداوند تعالیٰ کے کسی اور کو نہیں ہے۔“

مگر سرمایہ داریت میں حکمرانی کا نظریہ جمہوریت و حکومت کے ساتھ وابستہ ہے جو بے

معنی ہے۔

## اسلام و اشتراکیت میں تقابل

قرآنی نظم معیشت اور لادینی نظام معیشت میں بھی کئی پہلوؤں سے فرق پایا جاتا ہے۔ ذیل میں ان دونوں نظاموں کے اختلافی نکات زیر بحث لائے جاتے ہیں:

### 1۔ مقاصد:

اسلام انسان کی مادی و روحانی اور دینی و دنیوی ہر دو قسم کی فلاح کو اپنا مقصد قرار دیتا ہے اور اسی کے پیش نظر اس نے اپنا معاشی تنظیم دیا ہے جب کہ اشتراکی نظام ایک مادہ پرستانہ نظام ہے جو افراد کی مادی ضروریات کی تسکین کو ہی اپنا نصب العین قرار دیتا ہے۔ اس لحاظ سے اسلامی نظم معیشت کا دائرہ اشتراکی نظام کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ہے۔

### 2۔ ملکیت و ذرائع:

اشتراکی نظام معیشت میں وسائل پیداوار کیلئے ریاست کی ملکیت ہوتے ہیں۔ صنعت، تجارت، زراعت، نقل و حمل الغرض ہر چیز ریاست کی ملکیت ہوتی ہے۔ افراد محض مزدور کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ وہ صرف محدود شخصی دائرہ میں اپنی ضرورت کی اشیاء اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔

اس کے برعکس اسلامی نظام معاشیات میں افراد کو نجی ملکیت کا حق حاصل ہوتا ہے۔ ذاتی اشیاء ضرورت کے ساتھ ساتھ ذرائع پیداوار پر بھی ان کے حق ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ تاہم اسلامی نظام معیشت میں اجتماعی ملکیت کی قطعی طور پر نفی نہیں کی گئی۔ حالات و مصالح کے پیش نظر اسلامی حکومت بعض پیداواری کاروبار اپنی تحویل میں لے سکتی ہے۔

### 3۔ منصوبہ بندی میں فرق:

اشتراکی نظام میں پیداواری ذرائع کو ایک جامع منصوبہ کے تحت زیر استعمال لایا جاتا ہے اور یوں ضروریات اور پیداوار کے درمیان مطابقت پیدا کر کے کا طریق کار اختیار کیا جاتا ہے۔ اسلامی نظام معیشت چونکہ افراد کو نجی ملکیت کا حق دیتا ہے اس لئے وہ انہیں کسی جامع مرکزی منصوبہ کا پابند نہیں کرتا بلکہ آزادانہ طور پر کاروباری فیصلے کرنے کا موقع دیتا ہے۔ تاہم اسلامی ریاست ملکی مفاد کے پیش نظر بعض شعبوں میں منصوبہ بندی کا طریقہ اختیار کر سکتی ہے۔ اسلام میں منصوبہ بندی حکیمانہ عقائد اور ٹھوس ہوتی ہے۔

### 4۔ معاونت:

اسلامی نظام میں تعاون کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے اور یہ نظام سبھی افراد کو یکساں

حقوق اور مراعات دیتا ہے۔ انہیں براہ راست امور ریاست میں شریک کرتا ہے۔ جب کہ اشتراکیت ایک قسم کی آمرانہ حکومت ہوتی ہے اور کسی کو دم مارنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ نیز حکومت مشورے لینے کی پابندی نہیں ہوتی۔

### 5- آزادی (Freedom):

”ہم ہر اس اخلاق کو رد کرتے ہیں جو عالم بالا کے کسی تصور برہمنی ہو یا ایسے خیالات سے ماخوذ ہو جو طبقاتی تصورات سے ماورا ہیں۔ ہمارے نزدیک اخلاق قطعی اور کلی طور پر طبقاتی جنگ کا تابع ہے۔ ہر وہ چیز اخلاقاً بالکل جائز ہے جو پرانے نفع بخش اجتماعی نظام کو مٹانے کے لئے اور محنت پیشہ طبقوں کو متحد کرنے کے لئے ضروری ہو۔ ہمارا اخلاق بس یہ ہے کہ ہم خوب مضبوط اور منظم ہوں اور نفع گر طبقوں کے خلاف پورے شعور کے ساتھ جنگ کریں ہم یہ مانتے ہی نہیں کہ اخلاق کے کچھ ازلی اور ابدی اصول ہیں ہم اس فریب کا پردہ چاک کر کے رہیں گے۔ اشتراکی اخلاق اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ محنت کشوں کی حکومت کو مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کے لئے جنگ کی جائے۔“

تاگزیر ہے کہ اس کام میں ہر چال ’فریب‘ غیر قانونی تدبیر‘ حیلے بہانے اور جھوٹ سے کام لیا جائے مگر اسلام چند حدود و قیود کے اندر لوگوں کو آزادی دیتا ہے اور بلاوجہ سختی نہیں کی جاتی۔

### 6- مذہب (Religion):

اشتراکیت و اشتراکیت میں جیسا کہ لینن نے بذات خود کئی بار یہ کہا کہ مذہب لوگوں کے لئے ایفون کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کے نزدیک اشتراکی نظام کا سب سے بڑا دشمن خدا ہے لہذا ہمیں تمام تر قوت اسے بے دخل کرنے میں صرف کر دینی چاہئے مگر اسلام میں مذہب کو کلیدی حیثیت ملی ہوئی ہے۔ احکامات الہیہ کے مطابق چلنا پڑتا ہے سرتابی ممکن نہیں ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر وی ہیکر لکھتا ہے کہ:

”اشتراکی محض لامذہب اور مادہ پرست ہونے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ لامذہبی اور مادہ پرستی کا مجاہد بھی ہوتا ہے۔“

لینن ایک اور بات بھی کہی ہے:

”مذہب سے جنگ کا قریبی تعلق اس جدوجہد سے ہونا چاہئے جو تہذیب و معاشرت کی جڑوں سے مذہب کے نفوذ اور اثر کو نکال پھینکنے کی خاطر کی جاتی ہے۔“

ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ مذہب مسلمان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔



## 7- ذاتی منافع کا محرک:

اشتراکی نظام میں ایک فرد فقط ریاستی مشینری کے ایک پرزہ کے طور پر کام کرتا ہے۔ کاروباری منافع کا کوئی حصہ اسے حاصل نہیں ہوتا۔ وہ پہلے سے طے شدہ اجرت ہی وصول کرتا ہے۔ اس لئے اس میں کام کرنے کا جذبہ ماند پڑ جاتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں ہر کاروبار آدمی اپنے نفع و نقصان کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی منافع کے حصول کی خاطر بھرپور انداز میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس سے پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے اور معاشی سرگرمیاں جلا جاتی ہیں۔

## 8- سرکاری اختیارات:

اشتراکی و اشتراکی نظام میں ریاست ہمہ مقتدر اور سب سیاسی معاشی اختیارات کی مالک ہوتی ہے اور اپنی قوت کے بل بوتے پر ہر شعبہ زندگی میں دخل اندازی کرتی ہے۔ فرد کلیتہً ریاست کے رحم و کرم پر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسے معاشی امور اور پالیسیوں میں بالکل کوئی عمل دخل حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اسلامی معاشی نظام اپنی داخلی توانائی کے زور پر چلتا ہے۔ شخصی قابلیت و صلاحیت آزادانہ طور پر بروئے عمل آ کر اسے حرکت اور استحکام عطا کرتی ہے۔ سرکاری اختیارات کا دائرہ بڑا محدود ہوتا ہے۔ ریاست معاشی سرگرمیوں کے لئے محض ایک رہنما و نگران اور محافظ و اصلاح کنندہ کا کردار ادا کرتی ہے۔ تاہم قواعد و ضوابط کی پابندی کرنے پڑتی ہے۔

## 9- تقسیم دولت:

اشتراکی نظام میں قومی دولت کے سارے ذرائع حکومت کے قبضہ و تصرف میں آ جاتے ہیں اور عام لوگوں کو فقط ضروریات زندگی کو پورا کرنے کا سامان میسر آتا ہے اور وہ بھی اس قیمت پر کہ انہیں اپنی فطری انسانی آزادی کو سرکاری احکامات اور قوانین کے آگے قربان کرنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی نظام معیشت میں دولت کی تقسیم کا نہایت احسن اور عادلانہ نظام موجود ہے جو ایک طرف دولت کے بے جا ارتکاز کا سدباب کرتا ہے تو دوسری طرف سب افراد معاشرہ کو اس انداز میں ان کی معاشی ضروریات کی تکمیل کی ضمانت دیتا ہے کہ ان کی حریت و فکر و عمل محفوظ رہے اور وہ خوشحال و سکون آراہم وہ زندگی کی مسرتوں و راحتوں سے لبریز ہوتے رہیں اور ترقی کے زینے پر گامزن ہو کر آگے بڑھتے جائیں۔ کوئی طبقہ محروم المعیشت نہ رہے۔ کثیر دار (Have-Lots) اور نادار (Have-Not) کی تفریق ختم ہو جائے۔ متصفانہ تقسیم ذرائع کا پورا پورا اہتمام کیا جاتا ہے جس سے حق تلفی اور نا انصافی نہیں ہوا پاتی۔ زیادتی کرنے والے کو سزا ملتی ہے۔

## 10- افسر شاعی (Bureaucracy):

اشتراکی و اشتراکی دونوں نظاموں میں افسروں کے بے شمار اختیارات ہوتے ہیں کیونکہ ایک مرکزی ادارہ بہت سے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ جمہوری روح غائب ہوتی ہے۔ سرخ فیتہ (Red-Tapism) کا دور دورہ ہوتا ہے۔ سارے فیصلے اوپر سے ٹھونسے جاتے ہیں۔ سرکار کی مخالفت ہو ہی نہیں سکتی مگر اسلامی نظام شورائی صفات کا حامل ہوتا ہے جیسا کہ

وامرہم شورعنا بینہم (الشوری: 38)

”اور مسلمانوں کا کام آپس کے مشورہ سے چلتا ہے۔“

## 11- صارفین سے عدم توجہی:

شوٹلزم اور کمیونزم میں صارفین کی پسند و ناپسند کو درخور اعتناء نہیں سمجھا جاتا کیونکہ جو اشیاء حکومت تیار کرتی ہے صارفوں کو دینی لینی پڑتی ہے۔ چناؤ (Choice) ہوتا ہی نہیں ہے اور حلال و حرام میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ جبکہ نظام اسلام میں تمام حلال اشیاء کے استعمال کی اجازت ہوتی ہے۔

## 12- بنیاد (Base):

اشتراکی و اشتراکی نظاموں کی بنیاد انسانی نظریات الخاد ہیں جن میں صحیح و غلط کی پہچان نہیں ہے اور اس لئے ناپائیدار ہیں جبکہ اسلام کے نظام کی اساس قرآنی تعلیمات اور نبوی تنظیم احکامات و فرمودات (Commandments) پر رکھی گئی ہے جو مشغل و اہل نوعیت کے ہیں جو حادث زمانہ سے متاثر نہیں ہوتے۔

## اسلامی معیشت کا اخلاقی نقطہ نظر

ہر وہ معاشی نظام جو اخلاقیات کے نظام کو برباد کرتا ہے قطعاً قابل قبول نہ ہے مثلاً سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام وغیرہ جبکہ اسلامی معیشت میں بنی نوع انسان کو سادگی، زہد و قناعت، حیاء، رزق حلال وغیرہ جیسے فضائل اخلاق کی تعلیم دی جاتی ہے۔

## سرمایہ داری نظام / کیپٹل ازم

سرمایہ داری نظام دنیا کے بہت سارے ممالک میں رائج ہے۔ یہ نظام اپنی ساخت، نوعیت اور ترکیب کے لحاظ سے منفرد خصوصیات کا حامل تصور کیا جاتا ہے۔ اس نظام کے تحت حکومت کا دائرہ کار محض دفاع، امن عامہ اور بین الاقوامی تعلقات کی

حد تک محدود ہوتا ہے۔ لوگ اپنے معاشی عمل میں عمل طور پر آزاد ہوتے ہیں۔ قانونی حدود کے اندر رہتے ہوئے ذرائع پیداؤں کو بروئے کار لاتے ہیں اور پیداؤں دولت کے عمل کو آزادانہ طور پر جاری رکھتے ہیں البتہ حکومت بعض اوقات معاشی پالیسیوں کے ذریعے پیداواری سرگرمیوں کی ذرائع کے استعمال، صرف دولت اور سرمایہ کاری کا رخ متعین کرتی ہے۔ تمام افراد کو نجی ملکیت اور کاروباری آزادی کے تمام مواقع میسر ہوتے ہیں۔

تعریف:

عمرانی علوم کی لغت (Dictionary of Social Sciences) میں جدید نظام سرمایہ داری کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

”نظام سرمایہ داری کی اصطلاح ایک ایسے معاشی نظام کے لئے استعمال کی جاتی ہے جس میں معاشی زندگی کا زیادہ تر حصہ بالخصوص معاشی مقابلہ کے ذریعے پیداؤں دولت کے لئے کی جانے والی سرمایہ کاری کی ملکیت نجی ہاتھوں میں ہوتی ہے۔“

## اشتراکیت / سوشلزم

اشتراکیت اپنی اصل میں اشتہائیت ہی کا عکس ہے لیکن اشتراکی نظام کے حامی یہ کہتے ہیں کہ ملکی معیشت میں تبدیلی انتظامی نہیں بلکہ ارتقائی طریقے پر ہونی چاہئے۔ زمین اور تمام بنیادی صنعتیں سرکاری تحویل میں ہونی چاہئیں۔ ذرائع پیداواری کا زیادہ تر حصہ ہی حکومت کی تحویل میں ہونا چاہئے تاکہ دولت کی تقسیم منصفانہ بنیادوں پر ہو۔ تاہم اشیائے صرف کی پیداواری شعبے کے ذریعے ہو لوگوں کے معاوضے میں ان کی ذاتی قابلیت اور صلاحیت کا خیال رکھا جائے۔

پس منظر:

اشتہائیت کا بانی کارل مارکس تھا جس نے 1883ء میں وفات پائی۔ بنیادی طور پر وہ ایک صحافی تھا۔ اس نے ایک ایسی سوسائٹی جس میں غریبوں کی ایک بڑی تعداد امراء اور رؤسا کی قلیل اکثریت ہاتھوں پر غلام بنی ہوئی تھی اور کس طرح یہ اقلیت ذرائع پیداواری پر قابض ہو کر لوگوں کا استحصال کرتی ہے کا خود مشاہدہ کیا تھا۔ ان معاشی تاہماریوں کے خلاف اس نے دن رات کی لگاتار محنت لگن اور طویل عرصے پر محیط کوشش کے بعد اشتہائی نظام پر اپنی شہرہ آفاق تصنیف ”سرمایہ“ (The Capital) تخلیق کی جس میں نظام کا اشتہائی ڈھانچہ پیش کیا۔

1883ء میں مارکس نے وفات پائی اس وقت اشتہائیت اور اشتراکیت ایک ہی معنوں میں مستعمل تھے لیکن بعد میں دونوں الفاظ دو علیحدہ علیحدہ نظاموں کی نمائندگی کرنے لگے۔

جدید اشتراکیت جسے جمہوری اشتراکیت (Democratic Socialism) یا آزادانہ اشتراکیت (Liberal Socialism) کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے یا غیر مارکی اشتراکیت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ نظریہ دراصل برطانیہ کی Fabine Socieity کے دانشوروں جارج برنارڈشا، مسٹرٹی ویب اور گراہم وائو نے دیا۔

اشتراکیت کا مقصد تبدیلی بذریعہ انقلاب نہیں بذریعہ ارتقاء تھی۔

### تعریف:

اشتراکیت ایک ایسا نظریہ ہے جس کی رو سے بڑے پیمانہ کی پیدائش کی اشیاء سرمایہ کو نجی تحویل میں رکھنے کی بجائے انہیں مجموعی طور پر پوری قوم کی ملکیت میں دیا جاتا ہے تاکہ مجموعی قومی دولت کی منصفانہ تقسیم عمل میں آئے اور ایسے کرتے ہوئے لوگوں کی شخصی آزادی اور اشیاء صرف کے استعمال کی آزادی برقرار رہے۔

## اسلام کا معاشی نظام

اسلام دین فطرت ہے اس میں نسل آدم کی ہر طرح کی ضروریات کو پورا کرنے کے طریقے بیان کئے گئے ہیں۔

مولانا حفص الرحمن سیوہاروی اپنی کتاب ”اسلام کا اقتصادی نظام“ میں لکھتے ہیں:

”اسلام نے دور حاضر کی طرح یہ نہیں کیا کہ اول اقتصادی نظام کے نام سے ایک عنوان قائم کرتا اور اس کے تحت ایک خاص نظریہ یا چند مخصوص نظریے بیان کرتا اور پھر ان نظریوں کے پیش نظر مختلف ابواب میں اس کے نظام ملکی و عملی پر بحث کر کے کسی مخصوص نام کے ساتھ اس کو موسوم کرتا لیکن اس نے ایسا کیوں نہیں کیا؟..... صرف اس لئے کہ موجودہ دنیا کے جتنے اقتصادی نظام ہیں وہ عموماً انسانوں کے خود ساختہ ہیں اور ایسے فلسفہ پر مبنی ہیں جن میں روحانیت اور مذہب کو یا تو سرے سے نظر انداز کر دیا گیا ہے اور یا اس کی بنیاد روحانیت اور مذہب کی مخالفت پر قائم کر کے اس کو فلسفیانہ رنگ میں ڈھال دیا ہے۔“

لیکن ان تمام نظریات کے برعکس اسلام کا نظام معیشت ایک ہمہ گیر فلسفہ پر قائم ہے جس کا نام اسلام ہے اور یہ صرف انسان کی معاشی بہبود کا ہی خیال نہیں رکھتا بلکہ اس کی حیات کے ہر پہلو خواہ وہ روحانی، مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی ہی کیوں نہ ہو کا خیال رکھتا ہے۔

اس کا مقصد دنیائے ارضی کی بہتری نہیں بلکہ نجات ابدی اور رضائے الہی ہے اس لئے

وہ حیات انسانی کے ہر پہلو کے لئے ایک صالح نظام اجتماعی کا طالب ہے اور ان ہی شعبہ ہائے زندگی کا ایک شعبہ صالح معاشی نظام بھی ہے۔

اس کا نظام معیشت کوئی فلسفیانہ علم و فن نہیں بلکہ ایک مکمل نظام کا حصہ ہے جو دوسرے حصوں سے مکمل طور پر مربوط ہے۔

چنانچہ اسلام نے ”نظام اقتصادی“ سے متعلق چند اصول اور اساسی قوانین بیان کر دیئے ہیں جو ہم آخرت تک ہر عقل سلیم رکھنے والے کے نزدیک یکساں طور پر واجب العمل اور قابل قبول ہوں اور عہد نبوت و خلافت راشدہ نے وہ عظیم المثل عملی پروگرام پیش کیا ہے جس کے معترف و دوست و دشمن یکساں طور پر ہیں۔

تعریف:

اسلام کے معاشی نظام سے مراد ”اخلاقی اور قانونی ضابطے ہیں جن کی بدولت صرف دولت پیدائش دولت متبادلہ دولت اور تقسیم دولت کی سرگرمیوں کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ یہ ضابطے انسان کے خالق عظیم نے بنائے ہیں ان ضابطوں پر کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔“

## دیگر معاشی نظریات و افکار کا اسلامی نظام سے موازنہ

انسان سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ کا پرستار ہو جاتا ہے۔ سرمایہ دار کا دوبار کرنا ہے سٹور کا لین دین ہوتا ہے۔ ملک کی دولت فطرت پر تقسیم ہوتی ہے۔ موجودہ تجارت اور اس کے اثرات کے بارے میں پروفیسر جیمز ہاروے رائس کے الفاظ میں سرمایہ دارانہ نظام کی خرابی نظر آتی ہے وہ کہتا ہے:

”جدید تجارت نے نسل انسانی کے خوش نصیب طبقہ کے لئے ایک قسم کی جنت بنا دی ہے جس پر جنگ کا برا اثر پراس اور جسے بہت سے لوگ اس کے ساتھ حسن بلکہ وقت کی تبدیلی کے ساتھ اس سے زیادہ حسین و جمیل دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ یہ ایک عجیب انسانی کامیابی ہے تجارت قریب قریب ہمارا مذہب بن گئی ہے۔ حکومت اس کا اس طرح تحفظ کرتی ہے جس طرح کلیسا کا کوئی رومی شہنشاہ اور قرون وسطی کے شہزادے سے بچاتے تھے۔“

اس نظام میں دولت مند خوش ہے اور دوسرے سے بے نیاز ہے یوں ہمدردی کا جذبہ بٹ جاتا ہے۔ ہمدردی ملی تو اخلاقی برائیوں نے قبضہ جمایا اور یوں سرمایہ دارانہ نظام اور کیوئزم باطل ہو گیا یہ ان دونوں نظاموں کا تصور ہے کہ دولت مند اقوام پسماندہ اقوام کو ان کی محبت ایمان اور رضامندی حاصل کرنے کے لئے اپنی پیداوار سے بچا ہوا دے کر خوش کر دیتی ہے اور حقیقت میں یہ غلامی ہے انسان اپنی تسکین کے لئے قانون کو ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔ چور بازاری

سنگٹک و ذخیرہ اندوزی و اکثر زنی، رشوت ستانی، عین سازی اور بددیانتی سے دولت کا حصول بن چکا ہے۔

انسان جس طرح مشینی دور میں الجھا ہوا ہے اور ترقی کی راہ پر چل رہا ہے۔ چاند ستاروں پر زندگی کا متلاشی ہے۔ اس کی حیات دنیا میں استوار نہیں وہ غیر مبینی کی حالت سے دوچار ہے۔ اپنے معاشی مسائل کا حل فطری طریقوں سے سوچتا ہے۔ انسانی معیشت کی نہیں سنبھالنا انسانیت کو سہارا نہیں دیتا جو خود اس کی غلط پالیسیوں کے باعث بلک رہی ہے۔ خود کو سنبھالنے کے لئے اسلحہ کا سہارا لیتا ہے۔

لندن کے اخبار ٹائمز نے لکھا تھا۔ اقتصادی خوشحالی کی تدابیر سے اشتراکیت کا مقابلہ کرنا جو مارشل ایڈلمان کا خاص مقصد تھا کبھی بھی کامیاب نہ ہوگا۔ اشتراکیت کے مذہب اور اس کے جاویدیت کا کامیاب مقابلہ کرنے کے لئے جس سے اس وقت ہر ایک جمہوریت پرست گروہ عاجز ہے۔ اس گہری حقیقت پر غور کرنا چاہئے کہ آخر ایک سچا مذہب یہی ہے کہ جو جوئے مذہب کے ساتھ مقابلہ کر کے اسے فنا کر سکتا ہے۔

اے۔ ایل۔ یو۔ ٹاؤنی لکھتا ہے:

"مذہب نے انسانی طمع پر بہت سے قیود عائد کر رکھے تھے۔ سولہویں صدی کی تجارتی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے (مذہب) کے اقتدار کا مقابلہ کیا گیا اور سترہویں صدی کے آخر تک مذہب آئندہ معاشیات پر حکمران نہ رہ سکا تاہم اس کے اقتدار کی دھجیاں باقی رہ گئیں لیکن اٹھارہویں صدی کے پرور مقابلہ میں طلب و رسد کے قانون اور نفع دولت و راحت کے نام پر معاشیات اور مذہب کے درمیان طلاق واقع ہو گئی۔" (داستان و ہجنان)

یعنی مذہب اور اقتصادیات جدا جدا ہو گئے اور حرام و حلال کی تمیز اچھے اور بُرے کی پہچان ختم ہو کر رہ گئی اور عملاً مذہب کو معاشیات سے الگ کر دیا گیا۔

اسی طرح ایک اور تاریخی اعلان جو حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے ان سے کہا تھا: ان نفس فی اموالنا عاشاء یعنی ہم اپنے اموال میں جو پناہیں کریں۔ انہوں نے حضرت شعیب علیہ السلام سے دریافت کیا تھا:

"تمہاری یہ پوچھا پاٹ (صلوات) کیا اس سے بھی روکتی ہیں کہ ہم اپنے مالیات سے متعلق جو چاہیں کریں۔"

گویا ان کے خیال کے مطابق مذہبی عبادات کو انسان کے معاشی کاروبار سے کیا تعلق سروکار ہو سکتا ہے۔ یا وہ یہ سمجھتے ہوں کہ مذہب محض ایک پرسنل (ذاتی) اور شخصی مشغلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اس صورت میں چاہے تو ہو سکتا ہے مگر زندگی کے مجموعی اور عمومی شعبوں میں اس کی دخل اندازیوں کو برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ جیسا کہ آج کل کے مغرب زدہ چند افراد کیلئے

کہتے ہوئے سنے گئے ہیں۔ ان کے سامنے مذہب کوئی اہمیت اور وقعت نہیں رکھتا اور انہی لوگوں نے قوموں کی زندگیوں کو تباہ و برباد کیا ہے۔ جن کے ناقص ذہن مادیت کے بجز کسی پر ایمان نہیں رکھتے۔

ایک ماہر اقتصاد نے سرمایہ داری پر ان الفاظ میں ضرب لگائی ہے:

”سرمایہ داری کے طوفان سے پناہ نے ہر طرف وہ سراپا لگی پیدا کر دی تھی کہ اچھے اچھوں کے قدم اکٹڑ جاتے تھے۔ دولت و افلاس تروت و فلاکت ترقی و تباہی اور آبادی و بربادی کے محیر العقول تضاد نے بے شمار ایسے مسائل پیدا کر دیئے تھے جن کا حل سمجھ میں نہ آتا تھا۔“

یہ ایک اہل حقیقت ہے کہ اشتراکیت معاشی نظام نہیں بلکہ قدرت کا انتقام ہے۔ کیونکہ یہ سب کو ایک ہی لاشی سے ہانکتا ہے اور جب سرمایہ داری کے سهام تم جو اس قدر بڑھ گئے کہ لوگوں کا جینا دو بھر ہو گیا تو ایک انقلاب سے اسے تتر بتر کر دیا گیا۔ دماغی اور جسمانی محنت کی اجرت یکساں ہونی چاہئے۔ (اصول معاشیات) عمال حکومت کی اجرت ایک کاریگر سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے یہ ایک قسم کی غیر فطری تقسیم ہے۔

”اور میری سمجھ میں تو آج تک یہ بھی نہیں آیا ہے کہ قدرتی قوانین کی جس جنگ نے بلاخر سرمایہ داری کے جہنم میں نسل انسانی کو دھکیل دیا تھا اس میں اور یہ جنگ جو اب لڑی جا رہی ہے اور وہ صفائی و کمالاتی تفاوت سے پیدا شدہ مزاحبت و مداح کے اختلاف سے ہو رہی ہے ان دونوں میں نتیجہ کے اعتبار سے کیا فرق ہے؟

سرمایہ داروں کا تو صرف یہی ظلم تھا کہ سب کو نہیں بلکہ اولاد آدم کے صرف ایک حصہ کو غربت کی زندگی گزارنے پر انہوں نے مجبور کر دیا تھا۔ لیکن جنہوں نے یہ دیکھ کر سب چونکہ امیر نہیں بن سکتے اس لئے سب کو غریب بن جانا چاہئے۔ اس اصول کو طے کر کے انہوں نے تو بجائے بعض کے برور شمشیر سب ہی کو غریب بنانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ سرمایہ داری کے نظام میں نادار بن کر جینے کا موقع آدم کے جن بچوں کو حاصل تھا۔ سرمایہ دشمنی کے اس نظام میں تو ان بد نصیبوں کو جینے کے اس حقوق سے بھی محروم کر دینے کی آج دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ یا ہو سکتا ہے کہ کہیں محروم کرنے کا یہ منحوس کاروبار شروع بھی ہو گیا ہو اور میدان جنگ کا جو نقشہ بنایا گیا ہے اس کا تو یہ لازمی نتیجہ ہے مقصد یہ ہے کہ ہر شخص کو صرف اس کی احتیاج کے مطابق ہی دینا چاہئے اور ہر شخص سے بقدر استطاعت کام لینا چاہئے:

”اس شخص نے علاج پائی جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا وہ نماراد ہوا۔ جس نے اسے

دہا دیا۔“

(قرآن) یعنی بنیادی مسلمہ تزکیہ نفس ہے۔ جس کی بے شمار مثالیں انبیاء کرام کی زندگی

میں ملتی ہیں۔ اسلام میں اعمال کی بناء پر جزا اور سزا کا تصور پایا جاتا ہے اور موت کے بعد زندگی کا یقین بھی ہے اس سے انسان میں خوف خدا رائج ہوتا ہے اور وہ خود اپنا محاسبہ کرنے کی عملی سعی کرتا ہے۔“

اسلام سرمایہ کی غلط تقسیم کا حامی نہیں ہے اور نہ ہی وہ مخرب اخلاق حرکات و سکنات کی اجازت دیتا ہے۔

انسان روزی کمانے اور دولت سمیٹنے کی دھن میں سرگردان پھرتا ہے مگر اسے معلوم نہیں کہ روزی رساں تورب تعالیٰ کی ذات گرامی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَلٰكِنْ يَنْزِلُ بِقُدْرٍ مَا يَشَاءُ (پ: 25:27)

”اور لیکن نازل کرتا ہے وہ (اس رزق کو) اس پیمانے پر جس پر چاہتا ہے۔“

قدرت ایک خاص پیمانے کے ذریعے رزق عطا کرتی ہے۔

مزید سورۃ النھر میں یوں فرمایا گیا ہے:

وَاِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَ مَا خَزَاْنُهُ وَمَا نَنْزِلُہُ اِلَّا بِقُدْرٍ

”معلوم کوئی چیز نہیں ہے مگر اس کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور انہیں نازل کرتے رہتے ہیں ہم ان کو مگر ایک مقررہ پیمانے پر۔“

اسی طرح ایک اور مقام پر اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے:

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلٰی اللّٰهِ رِزْقُہَا وَیَعْلَمُ مُسْتَقْرٰہَا وَمُسْتَوْدَعُہَا

”اور انہیں ہے کوئی چلنے والا مگر اس کی روزی کی ذمہ داری خدا پر ہے جانتا ہے اس کی قیام گاہ کو بھی اور جہاں سونپا جائے گا اس کو بھی (جانتا ہے)۔“

اسی طرح ایک اور جگہ بھی فرمایا گیا ہے:

”اور کتنے چلنے پھرنے والے ہیں کہ نہیں لادتے پھرتے میں اپنی روزی کو اللہ ہی روزی پہنچاتا ہے۔ ان کو بھی اور تم کو بھی وہی سننے والا اور وہی جاننے والا ہے۔“

اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کا امتحان بھی لیتا ہے اس لئے کبھی رزق میں کشادگی کر دیتا ہے اور کبھی تنگی کی حالت سے واسطہ پڑتا ہے۔ چنانچہ قرآن مقدس میں بیان کیا گیا ہے کہ:

”اور اپنی دو آنکھیں نہ اٹھاؤ ان کی طرف جنہیں جوڑے جوڑے کی شکل میں ہم نے نعمتیں بخشی ہیں۔ یہ سب پست زندگی کی تازگی ہے تاکہ ہم امتحان لیں۔“

اسی طرح اس مضمون کو ایک اور جگہ پر فرمایا:

وَلَا تَمْدِنْ عَیْنُکَ اِلٰی مَا مَنَعْنَا بِہِ لِزَوَاِجِہِمْ وَلَا تَسْعٰزَنْ عَلَیْہِمْ

”اور اپنی دونوں آنکھوں کو نہ اٹھاؤ ان چیزوں کی طرف جن سے جوڑے جوڑے رنگارنگ کی شکل میں ہم نے لوگوں کو سرفراز کیا اور نہ ہی اس پر غم کھانا۔“



ولا تتمنو ما فضل الله به بعضكم على بعض  
 ”اور نہ آرزو کیا کرو اس چیز کی جس کی وجہ سے خدا نے بعض کو بعض پر برتری عطا کی ہے۔“

رسول مقبول ﷺ نے فرمایا من حصر اسلام لمرع توک ما لایعنیہ  
 ”آدمی کے لئے اسلام کی خوبی کی دلیل یہ ہے کہ ناکامی حاصل اور بے نتیجہ باتوں کو ترک کر دے۔“

بلکہ یہاں تک کہہ دیا گیا ہے:  
 ”دنیا سے تیرے لئے یہ کافی ہے جس سے تیری بھوک کا ازالہ ہو جائے اور جس سے تیری ستر پوشی ہو جائے اور ان ہی کے ساتھ اگر کوئی ایسی چیز بھی تجھے مل گئی جس کے سائے میں نور (کسی کا گھر) تو پھر یہ تو ہے ہی اس کے ساتھ اگر کوئی سواری بھی تجھے مل جائے تو پھر کیا کہنے۔“ (کنز العمال)

سورۃ طہ میں کہا گیا ہے:

وَرِزْقَ رَبِّكَ خَيْرٌ وَابْقَى

”تیرے مالک کی روزی شیرے لئے خیر بھی ہے اور زیادہ باقی رہنے والی بھی ہے۔“

آغصہ رحمۃ اللہ علیہ کی بخاری و مسلم کے حوالے سے جو حدیث ملتی ہے فرمایا:

”تم میں سے جس کی نظر ایسے آدمی پر پڑے جسے مال و دولت میں اس پر برتری عطا کی گئی ہو تو چاہئے کہ دیکھے اس وقت ان لوگوں کو جو مال و دولت کے حساب سے اس سے نیچے ہوں۔“

ایک نہایت ہی اہم امر کی نشاندہی اس طرح کی گئی ہے کہ انسان اپنی ضرورتوں کو خدا کے حضور میں پیش کر سکتا ہے۔ چنانچہ ترمذی کی حدیث میں ہے:

”جس شخص پر فاقہ کی مصیبت نازل ہو اگر اپنی اس حاجت کو لوگوں کے پیش کرے گا تو اس کی حاجت پوری نہ ہوگی۔ مگر وہ جس پر فاقہ کی مصیبت نازل ہوئی اور اپنی اس حاجت کو اس نے خدا کے سامنے پیش کیا تو قریب ہے کہ دیر یا سویر اس کے پاس روزی پہنچ کر رہے گی۔“

مگر صد افسوس ہے کہ آج کے مسلمان نے اسلامی تعلیمات کو فراموشی کی بوکود میں ڈال دیا ہے۔ غیروں کے در پہ جہیں سائی کرتا ہے اور ان کی در پوزہ کا دم بھرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی ضروریات کی تکمیل نہیں ہو پاتی۔ اگر صحیح طور پر احکام محمدی ﷺ اور ارشادات قرآنی پر عمل کیا جائے تو تمام مصائب و مسائل بہتر طور پر حل ہو سکتے ہیں۔ بالفاظ دیگر انسان توکل کو اپنا شعار بنائے اور اللہ پر بھروسہ کرے کیونکہ:

رب المشرق والمغرب لا اله الا هو

”اللہ کے سوا مشرق و مغرب کا اور کوئی پالنے والا نہیں ہے۔“

سورۃ کہف میں یوں ارشاد ہوتا ہے:

ترجمہ: ”اور رو کے رکھو آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو اپنے مالک کو صبح و شام پکارتے ہیں۔ ان لوگوں نے رب کے وجہ (ذات) کو مقصود بنا لیا ہے اور اپنی دونوں آنکھوں کو نہ ہٹاؤ ان سے کیا مقصود بنانا چاہتے ہو۔ پست زندگی کے بناؤ سنگار کو اور ان لوگوں کی اطاعت نہ کرنا جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنا دیا ہے اور وہ پیچھے لگ گیا ہے وہ اپنی ہوا (من مانی) کے اور ہے بات اس کی حد سے گزری ہوئی۔“

اس میں صبر کی تلقینوں کو مٹانے کی ایک تدبیر بتائی گئی ہے۔ جن لوگوں نے اپنی زندگی کا نصب العین یہ قرار سے رکھا ہے۔ کہ اس پست زندگی کی زینب و زینت، آرائشوں اور آسائشوں کے حاصل کرنے میں اپنے آخری سانس بھی پورے کریں گے ان کے بارے میں قرآنی قانون اس طرح بیان کیا گیا ہے:

من كان يريد الحياة الدنيا وزينتها نوف اليهما اعمالهم فيها وهم فيها لايبخلون.

”اور جو اس کتر زندگی کو مقصد بنا لیتا ہے اور اس کی زینت کو پورا کرتے ہیں ان اعمال کو اس میں اور انہیں کمی کی جاتی ہے دیتے میں۔“

اس کا مطلب یہ ہے کہ حیات دنیا اور اس کی آرائش و زیبائش کی تحصیل میں جو لوگ محو سرشار ہو جاتے ہیں اور ساری توانائی کو اسی مقصد کی خاطر صرف کر دیتے ہیں انہیں اپنے عمل کے نتائج سے محروم نہیں رکھا جاتا۔ یاد رہے جائز حد تک آرائش و سیاحت کی اجازت ہے۔ ان لوگوں کے بارے میں بیان کیا گیا ہے:

”بھی وہ لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں نہیں ہے مگر صرف آگ جس میں وہ مجلس کر رہ گئے جو کچھ کیا دھرتا تھا۔ انہوں نے دنیا میں اور بے نتیجہ ہو کر رہ گیا جو کچھ انہوں نے کیا تھا۔“

اس کے بعد رب نے صبر کرنے والوں پر رحمت کا ذکر کیا ہے:

ان الله مع الصابرين.

”یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

اور مزید فرمایا:

واليك عليهم صلوات من ربهم ورحمة واولئك هم المهتدون.

”بھی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے صلوات نازل ہوتے ہیں اور رحمت اور بھی ہیں جنہوں نے راہ (نجات) پائی۔“

انما یوفی الصابرون اجرهم بغير حساب  
 ”اس کے سوا کوئی دوسری بات نہیں کہ صابروں کو ان کا اجر بغير حساب کے دیا جاتا ہے۔“

زیادہ دولت اکٹھی کرنے سے سکون حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو دولت مند ممالک امریکہ، برطانیہ، کینیڈا، روس وغیرہ مطمئن ہوتے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بھی اضطراب اور پریشانی کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ یہ اللہ کی دین ہے ایک جھوٹری والا اس نعمت مترقبہ سے فیض یاب ہو سکتا ہے اور وہ طمانیت و راحت قلبی کی ثروت لازوال سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ سونے کی جھنکار اور زر کی فنکار کی وادی میں کھیلنے سے یہ حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ دولت مند طبقہ اس سے اتلاں نظر آتا ہے۔ یہ دردناک داستان انہی کی زبان سے سنئے۔ شاہ دولت (زاک فیلر) سے متعلق یہ ایڈیٹورس کیا جاتا ہے کہ کسی مجلس میں کامیابی کے عنوان پر بحث ہو رہی تھی اس نے فوراً اٹھ کر تقریر کی:

”کیا ان کی مراد کامیابی سے دولت کماتا ہے کیا اسی کا نام کامیابی ہے۔ میں کہتا ہوں اور مجھے کہنے کا حق ہے کہ سب سے بڑا مفلس وہی ہے جس کے پاس اس کے سوا اور کچھ نہ ہو میں کہتا ہوں اگر مجھے ابتداء میں اس کا اختیار دیا جاتا کہ کس قسم کی زندگی چاہتا ہوں تو میں اپنے لئے یہ اختیار کرتا کہ میرے پاس کچھ نہ ہو یا ہو تو بہت تھوڑا بقدر ضرورت ہو لیکن اس کے ساتھ مجھے بتا دیا جائے کہ میرے جینے کا مقصد کیا ہے؟“ (الہلال مصری)

ان اعتراضات کی گہرائی میں نفسیاتی کیفیات و حالات کے علاوہ اور کون سی اہم شے پوشیدہ ہے۔ اس کے بعد سورہ ہمزہ کے ترجمہ کا یہ ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے:

”وہ جو مال جمع کرتا ہے، اور گنتا ہے اسے خیال کرتا ہے کہ مال اسے خلود اور دیرپائی عطا کرتا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں قطعاً وہ اظلمہ میں جھونک دیا جاتا ہے اور یہ اظلمہ (چور چور کر دیئے) کیا چیز ہے؟ اللہ کی سلائی ہوئی آگ ہے دلوں پر پڑھ جاتی ہے اور اس آتش کے پٹ کو بند کر دیئے جاتے ہیں جو لمبے لمبے ستونوں پر کھڑی ہے۔“

اس سے جمع مال کی سزا ظاہر ہوتی ہے اس لئے زرد و جواہر کے بلا ضرورت خزانے جمع کرنا اور خرچ نہ کرنا درست نہیں ہے۔

قرآن مقدس میں مزید وعید سنائی گئی:

وان جہنم لمحیطۃ بالکافرین

”اور دوزخ کافروں کو قطعاً گھیرے ہوئے ہے۔“

احاط بہم سراوقہا

”اس جہنم کے سراپدوں نے ان کا گھراؤ کر لیا ہے۔“

امریکہ کے مشہور کروڑ پتی کاریگی نے کہا تھا: ”لاکھ پتی (بلینرز) کبھی نہیں سسکرا سکتا۔“  
بغل کی فرقان حمید میں یوں خدمت کی گئی ہے:

”اور وہ لوگ ہرگز ہرگز خیال نہ کریں جو بغل کرتے ہیں ان چیزوں میں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دے رکھی ہیں کہ یہ بات (بغل) ان کے لئے بہتر ہے بلکہ بری ہے یہ ان کے لئے قریب ہے طوق ڈالا جائے ان کو ان چیزوں کا جس کے ساتھ وہ بغل کرتے تھے۔ قیامت کے دن (طوق ڈالا جائے گا۔“

احادیث میں آتا ہے میدان حشر میں ان کا مال ایک ایسے سانپ کی شکل میں ہو گا جس کا سر چکنا ہو گا اور جس کے چہرے پر دو سیاہ نشان ہوں گے اور وہ ان ہی بخیلوں کی گردنوں لپٹ پڑے گا اور ان کے دونوں جھڑوں کو پکڑے گا۔ کہے گا میں حیران ہوں تیرا دفنہ خزانہ ہوں۔

اسی طرح یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ سونے اور چاندی کی تختیاں آگ میں تپائی جائیں گی اور ان ہی لوگوں کے پہلو پیشانیاں اور منھیں ان سے داغی جائیں گی۔ یہ مدت ان لوگوں کو اتنی دراز معلوم ہو گی کہ موجودہ دنیا کے پیمانہ وقت کے حساب سے آنحضرت ﷺ نے پچاس ہزار سال بیان فرمائی ہے۔

ان آیات محکم و احادیث مبارکہ کی روشنی میں کمز مال کی کوئی حقیقت پنہاں نہیں رہتی اور لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ دراصل اسلامی تعلیمات کا مقصد یہ ہے کہ گردش زر جاری رہے۔ اس لئے اپنے مال صدقات و خیرات کی صورت میں صرف کرنے کا حکم قرآن مجید میں ناجاہا دیا گیا ہے اور جو کوئی جائز رستوں پر خرچ نہیں کرتا اس کی سزا بیان کر دی گئی ہے۔ یعنی جو دولت کو قارون کا خزانہ بنا کر رکھ دیتے ہیں۔

ارشاد ربانی ہے:

”تا کہ جب ان پر موت آگئی تو کہا کہ میرے پروردگار آپ نے کیوں نہ مہلت دی کسی قریب زمانے تک تو پھر میں صدقہ کرتا اور سلجھنے والوں میں ہو جاتا۔“  
مولانا عبدالمجید دریا آبادی نے اخبار (جج) میں انگلستان کے ماہر و شاطر جہر و ہائٹ ریٹس کے بارے میں رقمطراز فرمایا تھا:

”ایک دن جب انگلستان میں لوگ سورج گرہن کا میلہ منا رہے تھے دیکھا گیا کہ بند کمرے میں سانس سے خالی ان کی لاش پڑی ہوئی ہے بچے کے بچے ایک ٹھریچہ موت کے دروازے پر قدم رکھتے وقت اپنے آخری مضمون میں اس شخص کے نقطہ نظر سے موجودہ تمدنی زندگی پر تبصرہ کروں گا جو سفر آخرت پر روانہ ہو رہا ہے۔ میں نے بادشاہوں تک کی میزبانی کی ہے۔ بڑے بڑے امراء اور والیان ریاست سے میری بے نظمی کا یارانہ رہا

ہے۔ سیاست کے حلقہ میں بھی رہا ہوں۔ ایک تھیٹر کا مالک بھی رہا ہوں ایک ایک دن میں ساڑھے سات لاکھ پونڈ کی دولت کمائی ہے۔ اخبارات کا حصہ دار رہا ہوں۔ گھوڑا دوڑ کی بازی میں ایک ایک لاکھ پونڈ جیتتا رہا ہوں۔ مائسٹر تک اپنی پیشکش ٹرین پر گیا ہوں۔ اس لئے موجودہ تمدنی زندگی پر رائے دینے کا حق رکھتا ہوں۔ آج میں اپنی زندگی کے آخر دن جب کہ ماضی کے سارے نقشے جلدی جلدی میرے پیش نظر ہو رہے ہیں مجھے دکھائی دے رہے ہیں موجود تمدن بجز حرص و خواہش نفسانی حب جاہ کے اکھاڑے کے اور کچھ نہیں ہے۔ جذبات عالیہ اور قناعت وافرہ اب خواب و خیال میں ہیں اور ان کی جگہ ایک نفرت انگیز ہنگامہ برپا ہے۔ ایک طرف شہوت جاہ شہوت ذر شہوت زن کا زور ہے دوسری طرف یوشویک دنیا تخلیق جدید کے خط میں مبتلا ہے۔ ہر شخص پر دھن سوار ہے کہ محنت کم کرے اور روپیہ زیادہ ملے اور پھر بے اڑانے کو ملیں۔ زر پرستی کی اس شدت کو دیکھ کر روح لرز اٹھتی ہے۔ دل دھڑک رہا ہے۔ میں خدا کے آگے جھکتا ہوں۔ اسی سے لوگ تار ہوں میں قمار بازی کی معصیت میں مبتلا رہا ہوں۔ اس کی سزا مجھے ملنی چاہئے۔“

اس کے بعد آیت قرآنی پر نظر ڈالیں:

ومن اعرض عن ذكرى فان له معيشة ضنكا

”اور جو میری یاد سے کتر یا تو اس کے لئے ضیق اور تنگی سے پر معیشت ہے۔“

محنت و مشقت کے ساتھ یاد الہی بھی جاری رہنی چاہئے کیونکہ اس سے آرام مل سکتا ہے اور برکت بھی ہوتی ہے۔

الا يذکر الله تطمئن القلوب

”یعنی رب جلیل کے ذکر سے ہی سکون خاطر حاصل ہو سکتا ہے۔“

اونچے اونچے بنگلوں سجائے ہوئے گملوں آراستہ ایوانوں اور پر شوکت سوار یوں کے درمیان خدم و حشم کی فوج ظفر موج میں بھی یہ کیفیت طاری ہوتی ہے۔

قرآن کریم میں یاد الہی سے انحراف کی پاداش میں اس دوسری محلی سزا کا ذکر ملتا ہے۔

ومن یعش عن ذكر الرحمن نقيض له شيطانا فهو له قرين

”اور جو خداوند تعالیٰ کی یاد سے آنکھیں چراتا ہے تو پھر ہم ایک شیطان کو اس کے پیچھے لگا دیتے ہیں اور وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔“ (زخرف)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر حال میں صبح و شام چلتے پھرتے سفر میں حضر میں اللہ تعالیٰ کی یاد شامل رہنی چاہئے اور کسی لمحہ بھی اس سے غفلت نہیں برتنی چاہئے اپنا فریضہ ادا کرتے وقت ذکر اللہ کرتے رہتے سے ”ایک پتہ دو کاج“ کے مصداق ثواب دارین بھی حاصل ہوتا رہتا ہے اور اپنا کام بھی مکمل ہو جاتا ہے۔

اگر انسان اپنا مطمح نظر بنالے کہ دنیاوی امور کی انجام دہی کے ساتھ دینی کام کی تکمیل بھی ہوتی رہے تو سونے پر سہاگہ کے مترادف ہوگا۔ یاد رہے مسلمان کا ہر قول و فعل شرعی حدود کے اندر عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔

الحاصل یہ کہ اسلام دنیاوی معاشیات کے ساتھ ساتھ روحانی اور اخلاقی معاشیات پر بھی خوب زور دیتا ہے۔ تاکہ اس زندگی میں کامرانی کے ساتھ توشہ آخرت کا سامان بھی میسر ہو جائے اور یہی مقصود کائنات بھی ہے۔

فسطائیت اور بازاریت اپنے باندوں کی موت کے ساتھ ہی دفن ہو گئے اور ان دونوں نظاموں کا وسیع حرحرچاند ہو سکا۔

اشتراکیت اور اشتمالیت میں ایک ہی خاندان کی اولاد ہونے سے کوئی خاص مناقشت و منافرت نہیں ہے۔ البتہ سرمایہ داریت اور ان کے درمیان سخت کشتی ہو رہی ہے اور ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اشتراکیت دم توڑ چکی ہے سرمایہ دارانہ نظام بھی زوال پذیر ہوگا۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ کون سا نظام انسان کے معاشی مسائل کا حل ڈھونڈنے کی قوت و قدرت رکھتا ہے۔ اسلام کا اقتصادی نظام حقیقتاً 'ابدیت' (Eternity) اور 'کاملیت' (Totality) کے لحاظ سے دیگر سب نظاموں سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ یہ بدلتے ہوئے چیلنجوں کا سامنا کرنے کی پوری صلاحیت و طاقت رکھتا ہے۔ اس کا دوسرے نظاموں سے قطعاً کوئی سمجھوتہ (Compromise) نہیں ہے۔ کیونکہ یہ اپنی انفرادیت (Individuality) پائیداریت اور آفاقیت (Universality) کو قائم رکھے ہوئے ہے۔

یہ حوصلہ مندی و رومندی، رواداری، پائنداری، پاسبرداری و نمکساری اور خیر مکاری کا درس دیتا ہے۔ سادگی، کفایت، شعاری (Economy)، دلداری اور ایثار پذیری کا گہوارہ (Cradle) ہے اس میں برائیوں اور جرائم کو ختم کرنے کے بہتر طریقے پائے جاتے ہیں۔ نیز یہ مسکینوں، یتیموں، یتواؤں، محتاجوں، کمزوروں اور ضرورت مندوں کی کفالت کا پورا انتظام کرتا ہے اس میں ظلم و استبداد اور ناانصافی، ناہمواری کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ یہ جبر کی بجائے مہر نفرت کی بجائے محبت اور نفاق کی بجائے اتفاق کی تلقین کرتا ہے اس میں صرف معاشی پہلو کو سامنے نہیں رکھا جاتا بلکہ اخلاقی، روحانی، سیاسی، تمدنی و سماجی اور تعلیمی و قانونی شعبوں پر بھی توجہ منطف کی جاتی ہے۔ جس کہ سرمایہ دارانہ اور اشتراکاتہ طرز ہائے معیشت ان اوصاف سے عاری ہیں۔

ہرمیانہ داریت میں ظلم و عدوان اور حقارت و منافرت پروان چڑھتے ہیں۔ دولت کے ڈھیر چند ہاتھوں میں مرکوز ہوتے ہیں۔ عزت و شخصیت مجروح ہوتی ہے۔ حلت و حرمت میں کوئی تمیز نہیں کی جاتی۔ اگرچہ اشتراکی نظم معیشت میں دولت کو پھیلانے کا سبق دیا جاتا ہے مگر کوئی

سکیم کامیاب نہیں ٹھہرتی۔ شخصی آزادی سلب کی جاتی ہے۔

حسب ذیل چند عناصر اور نکات اسلام کے معاشی نظام کی ترجیحیت (Preference) پر روشنی ڈالتے ہیں:

## 1- خدائی نظام:

ہر وہ دین یا طریق زیست جو انسان کو فارغ البالی اور رفاہیت کے ساتھ سرور و شادمان زندگی بسر کرنے کی تعلیم نہ دیتا ہو۔ انسان کے ناچنے ذہن کی پیداوار ہے۔ خدا اور اس کے رسولوں کے نزدیک قابل قبول نہیں اور وہ اللہ کا پسندیدہ طریقہ حیات نہیں ہو سکتا۔ اسلامی خدائی نظام ہے۔ مگر اس کے مقابلے میں دوسرے تمام نظام ہائے زندگی چند انسانی دماغوں کی فکری کاوش کا نتیجہ ہیں۔ اگرچہ ان کا مقصد بھی مفاد عامہ ہے مگر وہ صرف زندگی کے چند پہلوؤں کو لیتے ہیں اور باقی کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مگر اسلام ہر جہت کی ترقی کا خواہاں ہے اور یہ چاہتا ہے کہ اس کے ماننے والے نہ صرف اس عارضی زندگی میں کامیاب ہوں بلکہ عقبی میں بھی سرخرو ہوں یہی وجہ ہے کہ وہ ہر مرحلہ پر ہماری رہنمائی کرتا ہے تاکہ انسان بالخصوص مسلمان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آنے پائے اور اسی لئے وہ ارحم الراحمین کس قدر مہربان ہے۔ ارشاد رب العزت ہوتا ہے۔

ولو ان اهل القرى امنوا واتقوا لفنحنا عليهم بركات من السماء والارض  
(الاعراف 9)

”اور یقیناً بستیوں والے اگر مان لیں اور پارسائی اختیار کریں تو ہم ضرور آسمان سے اور زمین سے ان پر برکتوں کو کھول دیں۔“

سبحان اللہ کیا طرز استدلال ہے؟ زمین و آسمان کی برکتیں جو ہمارے معاشی فوائد کی تعبیر ہے انہیں ایمان و تقویٰ کی قوت سے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ ان سے انسانی زندگی کتنی پاک اور شگفتہ ہو جاتی ہے۔ قرآنی اصطلاح میں اس کا نام حیات طیبہ ہے اور وعدہ کیا جاتا ہے۔  
من عمل صالحا من ذکروا انى وهو مومن فلنحیۃ حیوة طیبۃ (النحل)

(14/12)

”جو کوئی مرد یا عورت نیک کام کرے بشرطیکہ ایمان لایا ہو تو ہم ضرور اسے صاف ستھری زندگی کے ساتھ جیتا رکھیں گے۔“

ایک اور مقام پر یوں فرمایا گیا:

انا لنصور سلفنا والذین آمنوا فی الحیوة الدنیا ویوم یقوم الاشهاد (المومن)  
”قطعاً ہم اپنے رسولوں اور ایمانداروں کی مدد کرتے ہیں اس زندگی میں اور اس دن بھی

جب گواہیاں قائم ہوں گی۔“

اللہ صرف پیغمبروں اور اہل ایمان کی نصرت کا وعدہ فرما رہے ہیں۔ کفار اور مشرکین محروم رہیں گے۔ اس امر کی وضاحت اس طرح کر دی گئی:

”یقیناً جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا رب اللہ تعالیٰ ہے پھر اس پر ڈٹ گئے۔ فرشتے ان پر یہ لے کر اترتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ گڑھو ہم تمہارے باور و پشت پناہ ہیں دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی۔“ (حم سجدہ)

گویا خداوند تعالیٰ نے ہر قسم کا ذمہ لے لیا ہے۔ اب اس پر مسلمان ثابت قدم ہو جائیں۔ تو انہیں کامیابی ہی کامیابی ہے۔ دوسرے نظاموں میں اس قسم کی کوئی حتمی بشارت نہیں دی گئی اور دیے بھی دیگر تمام مذاہب اسلام کے نفاذ سے ہی کالعدم قرار پائے۔ اب تا قیامت یہی مذہب ہو گا اور اسی مذہب کو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف مکمل کر دیا بلکہ پسند بھی فرمایا جس کا ذکر سورۃ المائدہ میں ملتا ہے۔ اس مذہب کی صداقت کا غیر مسلم بھی لوہا مانتے ہیں۔ قرآن مقدس نے اعمال صالحہ کی برکت کو یوں بیان فرمایا ہے:

”ان لوگوں نے جو بدیاں بنو رہے ہیں کیا خیال کر لیا ہے کہ انہیں ان لوگوں کی مانند بنا دیں گے جو ایمان لائے نیکیاں کیں ان کی زندگی اور موت برابر ہو جائے گی وہ جو کر رہے ہیں برا فیصلہ ہے۔“ (جاثیہ 25/1)

سورۃ ہود میں یوں خطاب کیا گیا ہے:

”اے میرے لوگو! اپنے مالک سے آمرزش طلب کرو پھر اسی کی طرف پلو وہ آسمان کو تم پر بھیجے گا موسلا دھار بارش کے ساتھ اور وہ قوت میں قوت بڑھائے گا۔“

ان آیات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ اسلام ہی ایک ایسا نظام ہے جو دینی فلاح کے ساتھ دنیاوی بھلائی کا بھی اہتمام کرتا ہے اور اس کے پیروکاروں کو ترقی کے زینے پر فائز کرنے کی پوری طرح رہنمائی دہموائی کرتا ہے۔

## 2- زکوٰۃ کی فرضیت:

اسلام کے مالیاتی نظام میں زکوٰۃ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ دنیا کا اور کوئی معاشی نظام ایسی مثال پیش کرنے اس کے علاوہ مذہبی و اخلاقی اقدار کو صرف غلط کی مانند مٹا دیا جاتا ہے۔ بلکہ اسے سم قاتل سے زیادہ وقعت نہیں دی جاتی ملکیت جائیداد کی نفی ہوتی ہے۔ جس سے کام کرنے کا محرک دب جاتا ہے۔ یعنی دوسرے نظاموں میں جہاں محاسن (Vertues) ہیں وہاں معائب (Evils) بھی موجود ہیں۔

اسلام کا معاشی نظام فطرتی و مثالی ہونے کے علاوہ اعتدالی و جمہوری کہلانے کا حق رکھتا



ہے کیونکہ یہ ہر معاملہ میں درمیانی راستہ تلاش کرتا ہے۔ بنا بریں معاشی دشواریوں کو دور کرنے میں محدود معاون ثابت ہوتا ہے

اگر ہم نئے دور کے تناظر (Perspective) میں جھانکیں تو بہت سی الجھنیں اور دقتیں سر اٹھ رہی ہیں ان سے نجات حاصل کرنے کی خاطر اسلام ہی روشن کا بینار ہے بشرطیکہ فرزندان توحید نیک نیتی و یکسوئی سے تحقیق و تدقیق کا کارہائے نمایاں سرانجام دیں اپنے ملکوں میں اس کا نفاذ یقینی بنا کر دوسروں کے لئے بہتر نمونہ (Model) پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہ بیت المال کی آمدنی کا بہترین اور مستقل ذریعہ ہے۔ موجودہ دور کے گونا گوں محاصل کسی لحاظ سے بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بلکہ یہ ایک قیمتی ماڈل ہے دوسرے ملکوں میں مختلف انواع کی قباحتیں پائی جاتی ہیں۔ مگر یہ تمام نقائص سے پاک و صاف ہے۔ اس کے مصارف کا حتیٰ تعین اللہ نے اپنی مقدس کتاب میں کر دیا ہے۔ ان میں رد و بدل قطعاً ناممکن ہے انہیں مصارف ثنائیہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ ہر صاحب نصاب پر فرض ہے اور جب تک مکمل ادائیگی نہ کی جائے مال طہارت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔ نیز غریبوں کی کفالت کا اس سے معقول بندوبست ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے بھی اسلام کا معاشی نظام دوسرے نظاموں سے برتر و افضل ہے۔

### 3- سود کی بچ کتنی:

اسلامی اور جدید معاشیات میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ اسلام نے ایسے کاروبار کو جس میں سود کا احتمال ہو حرام قرار دیا ہے مگر موجودہ معاشیات میں یہ ایک قسم کی ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کی بنیاد ظلم و ستم پر رکھی گئی ہے اور یہ کسی انسان کی مجبوری کا احساس تک نہیں رکھتا۔ کسی ضرورت مند کو اپنی حاجت پورا کرنے کی خاطر سود کا سہارا لینا پڑتا ہے اور اس کے بغیر قرض کا حصول جوئے شیر لانے سے کتر نہیں ہے۔ اسلام نے نہ صرف اس سے سختی سے روکا ہے بلکہ ایسا مذموم کاروبار کرنے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ یہ معاشرہ کو دیمک کی طرح چاٹ لیتا ہے اور اس کے پھیلے ہوئے جراثیم کو نکالنا بڑے معرکے کا کام ہے۔ اگرچہ سودی ترویج سے وسیع پیمانہ پر پروجیکٹ شروع کئے جاتے ہیں اور حکومتیں بھی اس کے بغیر بمشکل گزارہ کر سکتی ہیں۔ تاہم یہ سوسائٹی کے لئے ناسور ہے اور اس نے تمدنی زندگی کے تانے بانے کو بفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ اسی لئے اسلامی حکومت میں اس کی ممانعت ہوتی ہے سودی نظام نے بہت سے دشوار مسائل کھڑے کر دیئے ہیں اور اسی نے بیشتر ممالک سرگرداں اور تالاں ہیں۔ ایسے نظام سے ہمدردی موافقت اور بھلائی کے جذبات ختم ہو جاتے ہیں۔ بلکہ حرص و آواز فریب اور جعل سازی جیسی حرکات کے لئے میدان ہموار ہوتا ہے۔ دو حاضر میں ان کی کہاں کئی ہے؟ اور اسی لئے معاشرہ دور اعتلاء سے گزر رہا ہے۔ اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ بمکھک کو بغیر سود کے

چلانے کا فوری بندوبست کیا جائے تاکہ متوازن معاشرہ قائم کیا جاسکے۔

#### 4۔ اعلیٰ اخلاق (High Moral):

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو مادہ پرستی کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ لوگوں میں کیریئر بلڈنگ اور تفکیک سیرت کا احساس راسخ کرتا ہے۔ کیونکہ اصل چیز یہی ہے جس سے انسان اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہو سکتا ہے۔ آنحضرت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا آپ ﷺ چلتے پھرتے قرآن تھے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا میں لوگوں کو مکرم اخلاق سکھانے آیا ہوں۔ اچھی صفات اور حیدرہ اوصاف سے ہی ایک انسان توقیر و عزت حاصل کر سکتا ہے۔ رب تعالیٰ کو وہی شخص زیادہ محبوب ہوتا ہے جو زیادہ متقی ہو اور یہ شخص اسی صورت میں ممکن ہے جب اسلامی احکام کی پابندی کی جائے اور خلاف شرع گفتگو اور کاموں سے اجتناب برتنا جائے۔

#### 5۔ عاقبت کا خوف:

قیامت پر یقین رکھنا اور سزا و جزا کو ماننا شرائط ایمان سے ہے جو شخص خداوند تعالیٰ کے وجود کا قائل نہ ہو اس کی ذات اور صفات کو نہ ماننا ہو جیسا کہ کیونٹنوں کے خیالات ہوتے ہیں وہ لوگ تو موت کو بھی ایک قسم کا کھیل گردانتے ہیں۔ بھلا ایسی قوم مسلمانوں کا مقابلہ کر سکتی ہے جو رب تعالیٰ کی الوہیت و وحدانیت کے نہ صرف پرستار ہیں بلکہ اس کی ہستی لافنا کے شیدائی و مربی ہیں اور یہ اسی کی برکت کا ثمرہ تھا کہ ایک باد یہ نشین قوم چند سالوں میں ساری دنیا پر غالب آگئی اور اس کی سطوت و طاقت کے ڈنکے بجنے لگے مسلمان رب تعالیٰ کے علاوہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتا تاہم خوف آخرت اس کے ایمان و ایمان کا جزو لاینفک ہے۔

#### 6۔ مسلمہ قوانین:

اسلام کے قوانین تعزیریہ (Penal Laws) پختہ ہیں۔ عصری تقاضوں اور زمانہ کی ہنگامی تبدیلیوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہ خدائی قواعد و ضوابط ہیں اور انسانی ذہن کی انجھ اور خصائص کو سامنے رکھ کر بنائے گئے ہیں۔ چاہے نئی نوع انسان چاند کو مسخر کرنے کی کوششیں ڈال رہا ہو اور چاہے ہزار سال پیچھے چلا جائے یہ قوانین اٹل ہیں اور ہر انسان اپنی مرضی اور حاجت کے مطابق نہیں ڈھال سکتا۔ جیسا کہ چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت کا ہاتھ کاٹ دیا جائے (المائدہ) شرابی کے لئے 80 کڑوں کی سزا مقرر ہے۔ زانی مرد اور زانیہ عورت کو رجم کر دیا جائے یا غیر شادی شدہ ہونے کی بناء پر سو کوڑے لگائے جائیں۔ یہ اللہ کی مقرر شدہ حدود ہیں کسی بیشی ممکن نہیں اسی طرح دیگر معاشرتی و عدالتی قوانین کے نفاذ سے دنیا موجودہ سینکڑوں جرائم سے محفوظ ہو سکتی ہے اور اسلام سستا اور آسان انصاف مہیا کرتا ہے۔

ڈاکٹر گستاوی بان کی فرانسیسی کتاب "Civiltz Des Arabes" کا اردو ترجمہ "تمدن عرب" میں سید علی بلگرامی (مترجم) فرماتے ہیں:

"یہ سادہ ضوابط شاید اس قدر منصفانہ ہوں جیسے ہمارے (فرانس میں) کے پیچیدہ قواعد کی کارروائی ہے لیکن ان کا بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ ان میں فریقین مقدمہ کا وقت ضائع نہیں ہوتا اور ان پر دیسی چٹائی نہیں جیسی ہماری عدالتوں کی مقدمہ بازی سے آتی ہے۔ اگرچہ فیصلے مختصر ہوتے ہیں لیکن عموماً یہ نہایت منصفانہ ہیں۔ انصاف کا خیال عربوں میں اعلیٰ درجہ کا ہے۔ نہ فقط اس وجہ سے کہ قرآن میں انصاف من جملہ ترین خصائص انسانی کے سمجھا گیا ہے بلکہ اس سبب سے بھی کہ ان کی ابتدائی حالت میں اس عدل کی بے انتہا ضرورت تھی۔

اگر آج کا مسلمان بھی قرآن و سنت پر عمل پیرا ہو جائے تو یہ مقدمہ بازی اور لوٹ کھسوٹ جلد ختم ہو سکتی ہیں زر اور وقت دونوں کی بچت ہو سکتی ہے۔"

7- ہمہ گیر بہبود:

اسلام ایک عمل ضابطہ زیت ہے۔ اس لئے یہ ہمہ گیر ترقی اور بھلائی کو پیش نظر رکھتا ہے۔ دیگر نظاموں پر اس لحاظ سے سبقت لے گیا ہے کہ یہ زندگی کے تمام مسائل اقتصادی، سیاسی، معاشرتی، ثقافتی، تمدنی، تعلیمی اور عالمی تک حل کرنے کی عملی اور ٹھوس تجاویز پیش کرتا ہے۔ پھر ان پر سختی سے عمل درآمد کراتا ہے۔ وہ ایک پلیٹ فارم تیار کرتا ہے جو سب کی ترقی اور عروج کے یکساں مواقع میسر کرنے کی ہمہ جہتی سکیم تیار کرتا ہے۔ یہ چونکہ فطرتی قوانین کا سہارا لیتا ہے۔ اس لئے ارتقاء کے مواقع زیادہ روشن اور واضح ہوتے ہیں۔

اگرچہ اشتراکیت اور سرمایہ داریت معاشی پہلو کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس میں بھی پوری طرح کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔

8- احترام آدمیت:

اسلام میں آدم و مال و جان کی حفاظت کے ساتھ ساتھ عزت نفس اور احترام آدم کا سبق بھی دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

"جس نے ایک جان کو موت سے بچایا گویا اس نے ساری مخلوق کو بچایا اور جس نے ایک جان کو بے قصور قتل کیا گویا اس نے ساری مخلوق کو مار ڈالا۔"

اس سے بڑا احترام آدمیت کا اور کون سا درس ہو سکتا ہے اور کیا وجہ ہے کہ قتل کا بدلہ قتل ہے اگرچہ بعض حالات میں قصاص اور معافی کی بھی اجازت ہے۔ اسی طرح کان کے بدلے کان، ناک کے بدلے ناک اور آنکھ کے بدلے آنکھ کا بدلہ لینے کی اجازت ہے۔ اس میں بھی انسان کی عزت و منزلت کا نتیجہ نکلتا ہے۔

اس کے خلاف اشتہائیت میں انسانوں کو گامبرسولی کی طرح کاٹا جاتا ہے۔ گویا ان کے خیال میں انسان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اسی طرح سرمایہ داری میں بھی ناجائز ذرائع سے دولت جمع کرنے کی دھن میں خون بھی کئے جاتے ہیں۔ لوگوں کی عزت سے ہولی کھیلی جاتی ہے۔ انسانیت کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ دودھ فروشوں کے درمیان رقابت کی آتش آن واحد میں بھڑک اٹھتی ہے جس میں انسانیت کو جلایا جاتا ہے اور اس کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔

## 9- حلال و حرام میں فرق:

اسلام میں جائز و ناجائز کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اس لئے احتیاط ضروری ہے۔ دیگر اقوام میں ان چیزوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ انگریز مشور کا گوشت کھاتے ہیں۔ اس لئے بے حیائی فحاشی اور بے غیرتی کا دور دورہ ہے۔ شرم و حیا ترستی ہے لوگوں میں حیثیت کا مادہ نہ ہونے کے برابر ہے مگر اسلام میں ایسا نہیں ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا حلال و حرام واضح ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ سے اس طرح سوال کیا گیا:

ہایھا النبی لم نعزم ما احل الله لک (التحریم 20/1)

”اے نبی ﷺ آپ ﷺ اس چیز کو کیوں حرام کرتے ہیں جسے اللہ نے آپ ﷺ کے لئے حلال کیا ہے۔“

علامہ ابوبکر بن الصوام کہتے ہیں:

ان لا فضیلة فی امتاع اکلھا (مس 452)

”جن چیزوں کو اللہ حلال فرما چکا ہے ان کے کھانے سے پرہیز کرنے میں کوئی فضیلت حاصل نہیں۔“

## 10- اعتدال پسندی (Moderation):

اسلام نے افراط و تفریط سے ہٹ کر راہ اعتدال کو پسند کیا ہے۔ یعنی فضول خرچی سے روکا گیا ہے اور اس طرح نکل سے بھی منع کیا ہے اور اس کی معاشیات میں بہت زیادہ اہمیت ہے۔ قارون خزانے جمع کرنا اور خرچ نہ کرنا قوم اور ملک پر بہت زیادہ ظلم کے مترادف ہے اور معاشی اصولوں کے بھی منافی ہے۔ کیونکہ اس سے ترقی میں جمود و ٹھہراؤ پیدا ہوتا ہے۔

## 11- جائز و ناجائز میں امتیاز:

دولت کمانے میں نہ صرف جائز ذرائع کی فراہمی سے اجازت دی گئی ہے بلکہ ترغیب بھی ملتی ہے۔ مگر وہاں ناجائز وسائل معیشت سے سختی سے روکا گیا ہے۔ جائز کے ساتھ ملیب کو

پسند کیا گیا ہے۔ نیز ناجائز کے ساتھ غیبت کی پرزور مذمت کی گئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ معاشیات میں اس قسم کی تمیز بالکل ختم ہے اور یہی سبب ہے کہ دنیا بھر میں اقتصادی بحرانوں سے دوچار ہو جاتی ہے۔

ارشاد گرامی ہوتا ہے:

واسع علی اهلک و عیالک حلالا فان ذلک جہاد فی سبیل اللہ ترجمہ: ”اور چاہئے کہ اپنے اہل و عیال کے لئے طلب حلال کی کوشش کرو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد ہے یہاں معاشی جدوجہد میں طلب حلال کو سبیل اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے بڑی اہمیت کی براہین اور کیا ہو سکتی ہیں۔“

## 12۔ بہتر درجہ:

اسلام کا نظام کئی لحاظ سے اعلیٰ درجہ کا حامل ہے جیسا کہ پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں: ”اس کی اصل خصوصیت (Quality) یہ ہے کہ اس کا مرکزی تصور انسان اور اس کی معاشی بھلائی و فلاح ہے وہ معاشی ترقی کو اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ سماجی انصاف اور اخلاقی ترقی کو اولین اہمیت دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس با معاشی نظام سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے اپنے مقصد مزاج اور اصولوں کے اعتبار سے مختلف ہے اور ہر حیثیت میں ان سے اعلیٰ و برتر ہے۔“

## 13۔ اسلامی معیشت کی اساس شناخت اور مزاج:

یہ دوسرے اقتصادی نظاموں سے بالکل جدا اور مختلف ہے۔ سرمایہ دارانہ اور اشتراکانہ نظاموں میں قرض ایک نعمت اور ترقی کے لئے زینہ سمجھا جاتا ہے۔ جو تجارت، صنعت، زراعت اور دیگر شعبوں کے لئے ایک لازمی امر خیال کیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ چاہے کوئی فرد ادب ہو قوم ہو یا ملک ہو ایک دفعہ اس کے خالمانہ پیچہ میں پھنس جائے تو اس سے چمکارا ملنا محال ہو تا ہے۔ مگر اسلام کے پیش کردہ معاشی نقشہ میں یہ ایک ناگزیر برائی اور زحمت ہے اور اسے صرف غیر معمولی حالات میں متعین ضرورت کے تحت لیا جاتا ہے کسی شخص اور حکومت کے لئے قرضوں پر بسر اوقات کرنا مناسب نہیں ہے اس لئے ان سے اجتناب برتنا چاہئے۔

## 14۔ معاشرتی تحفظ:

اسلامی نظام معاش میں سماجی تحفظ کلیدی رول کا حامل ہے اور اس کی گارنٹی دی جاتی ہے اس لئے خاندان مضبوط، مستحکم، جاندار اور محرک ادارہ گنا جاتا ہے جو کوئی غیر معمولی حالات اور مصائب کا شکار بنتا ہے تو سارا خاندان اس کی معاونت اور رفاقت کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا

ہے۔ جب کہ دیگر نظاموں میں ایسا نہیں ہے اگر میلی معاشی دیکھ کر ہی کرنے سے قاصر رہے تو پھر بیت المال کے دروازے اس کی مدد کے لئے کھلے ہوتے ہیں اور حقداروں کی دادی کی جاتی ہے۔

### 15- جداگانہ حکمت عملی:

اسلام عادلانہ حکم پالیسی اختیار کرنے کی ہدایت دیتا ہے تاکہ معاشرے کے ہر فرد کو مناسب و معقول زندگی بسر کرنے کے لئے اتنی آمدنی مل سکے کہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے پر مجبور نہ ہو اور نہ ہی حالات سے تنگ آ کر وہ ناجائز ذرائع سے دولت سمیٹنا شروع کر دے۔ اس کے علاوہ کسی کی حق تلفی بھی نہ ہونے پائے وگرنہ سوسائٹی میں بگاڑ اور فساد کا آغاز ہو جائے گا جو بہت سی برائیوں اور جرائم کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ تاہم اسراف و تبذیر سے ہٹ کر اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلائے کی تلقین کرتا ہے جب کہ دوسرے معاشی نظاموں میں ایسا نہیں ہے یہ اقتصادی اور سماجی تناؤ (Tension) میں کمی کر کے معاشی بالیدگی پر زور چلتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کسی سے زیادتی نہیں ہوتی اس کے آلات کار اور ادارہ کار منظم حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔

### 16- حسین امتزاج:

اس کے نظام اقتصاد کی ایک برتری یوں بھی ثابت ہوتی ہے کہ مسلمان کے ایک ہاتھ میں دین تو دوسرے ہاتھ میں دنیا ہوتی ہے۔ مسلم چاہے اجر یا تاجر ہو یا خریدار یا صارف ہو جب وہ منڈی میں داخل ہوتا ہے تو وہ معاشی ناہمواری کو جنم نہیں لینے دیتا کیونکہ اس کے سامنے فقط مادی فوائد نہیں ہوتے بلکہ وہ روحانی پہلو کو بھی پیش نگاہ رکھتا ہے۔

اس طرح روحانی اور مادی پہلوؤں کو سمو دیا گیا ہے جس سے خرابی پیدا نہیں ہوتی جب کہ دوسرے سارے معاشی نظامات اس خوبی سے عاری ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ ماوریت پر طمانیت انسانیت اور اخلاقیات و روحانیت کو ترجیح دی جاتی ہے۔

### 17- ہمہ گیریت:

اسلام کا ملیت کا عنصر اپنے دامن میں رکھتا ہے اور کوئی دوسرا نظام اس سلسلے میں اس کی ہمسری و برابری کا بالکل دم نہیں بھر سکتا۔

اس میں امانت و دیانت کا تصور اپنی مثال آپ ہے پیداواری ذرائع اسے ودیعت کئے گئے ہیں اور اسی لئے ساری سوسائٹی کا ان پر حق ہوتا ہے یہ مستعد یعنی استعداد کار کا سبق دیتا ہے معاشرتی سیاسی اور معاشی نظام کی تعمیر کو کرتا ہے۔

## 18- ترقی پسندیت:

اسلام ترقی پسند دین ہے یہ مسلمانوں کو آگے بڑھنے کی نہ صرف تلقین کرتا ہے بلکہ یقین کے ساتھ رستہ کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ خلیفہ اے حکیم نے اچھے برائے میں اس پر بحث کی ہے: "اسلام میں اخوت، حریت اور مساوات کے تصورات انتہا درجہ ترقی پذیر اور حقیقی ہیں بشرطیکہ انہیں ٹھیک طرح سمجھا جائے اور عمل میں لایا جائے۔ کیا ہم ایسی مملکت یا نسلیت و علاقیت و قومیت کی پرستش کریں جو وطنیت کو ایک معبود کی حیثیت دیتی ہے؟ کیا ہم اشتہالیوں (Communists) کی معنوی مادیت (Materialism) کو پوچھیں جو زندگی کو پیدائش و تقسیم دولت کی کسوٹی (Criterion) پر پرکھتی ہے۔ ان اقوام میں زندگی مقید منحنی شدہ توڑی مروڑی (Shaken and Broken) ہوئی ہے اور تپ و بالا (Topsy Turvy) ہو گئی ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ زندگی کی غرض و غایت کیا ہے؟ انسان خود اپنے آپ سے دوسروں سے اور اپنے گرد و پیش سے بدسر پیکار اور (بیزار) ہے کیا ہم اس وسیع دارالجانین میں جہاں پر شور و (پر زور) دیوانے (مستانے) بستے ہیں کوئی حیات بخش اکسیر پاسکتے ہیں۔ کیا ہم ایسے حکیموں کے نسخے استعمال کریں جو خود کو تندرست رکھنے کے قابل نہ ہوں۔"

یقیناً ہمیں اپنی منزل خود تلاش کرنی چاہئے۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہئے دوسروں کی تقلید کرنے سے گور مقصود عقلا ہو جائے گا۔ اپنے نظام مصطفیٰ ﷺ کو ہی اپنا اوزھنا بچھونا بنائیں اسی صورت میں کامرانی و شادمانی ہمارے قدم چومے گی۔

## 19- امداد باہمی:

امداد باہمی (انسانی معاشرہ کی وحدت) انسانی سوسائٹی ایک اکائی ہے اور اس کے تمام افراد انسانیت کے وحدانی مرکز پر یکساں حیثیت کے مالک ہیں۔ معاشی زندگی میں ان کا کام اسی طرح امداد باہمی کا محتاج ہے۔ جس طرح ایک انسان کے تمام اعضاء الخلق کلہم عیال اللہ "تمام انسان اللہ کا کنبہ ہے۔" (حدیث)

دنیا میں کوئی انسان دوسرے انسان کے تعاون کے بغیر اپنی مکاش کا سلسلہ جاری نہیں رکھ سکتا۔ روٹی کے ایک لقمہ کے لئے بھی کسان کی چکی کے مالک کی اور ہلوں کے مستری کی ضرورت ہے۔ ایک فرد کے لئے معاشی زندگی بسر کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے انسانی سوسائٹی کا مدار امداد باہمی پر ہے اور اسی لئے اسلامی سوسائٹی کو بنیاد کی دیوار اور ایک ایسے جسم واحد سے تشبیہ دی گئی ہے کہ ایک کی تکلیف سارے معاشرے کی تکلیف ہے۔

ایسی معاونت کی مثالیں دیگر معاشی نظاموں میں نہیں مل سکیں یہ شرف یہ اسلام کو جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں ایک لڑکی میں پروئے جانے کا سبق دیتا ہے۔

## 20- ناداری کا قلع قمع کرنا:

غربت کے انسداد کا مسئلہ بھی اسلام کی معاشی پالیسی میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اسلام کے اقتصادی نظام کے مثبت معاشی مقاصد میں غربت کا انسداد اور تمام انسانوں کو معاشی جدوجہد کے مساوی مواقع فراہم کرنا بھی شامل ہے۔ اسلام کا سب سے اہم مقصد کفر کا خاتمہ ہے اور چونکہ فقر و فاقہ انسان کو اس کی طرف لے جاتے ہیں اس لئے اسلام ان کو اپنا بنیادی ہدف سمجھتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”ابن آدم کا بنیادی حق یہ ہے کہ اس کیلئے ایک گھر ہو جس میں وہ رہ سکے، کپڑا ہو جس سے وہ اپنے جسم کو ڈھانپ سکے اور کھانے کیلئے روٹی اور پینے کیلئے پانی ہو۔“ (ترمذی)۔ اسلام اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ سب کو حصول رزق کے مواقع دے اور بھرتی ہوئے طور پر ایسی پالیسیاں بنائے جن سے غربت و افلاس ختم ہوں اور انسانوں کو ان کی بنیادی ضرورتیں لازماً حاصل ہوں۔

اسلام تنگی کو دور کرنے کا طریقہ حصول رزق کی کوشش اور پیداوار بڑھانے کے ذرائع کی طرف رجوع قرار دیتا ہے اور محض غربت و افلاس معیار زندگی کے گرنے کے خطرے اور قلت وسائل کے واسطے سے انسان کشی اور نسل کشی کی پالیسی کی اجازت نہیں دیتا۔ معاشی مسئلے کا اصل حل معیشت کو فروغ دینا ہے انسان کی قطع و برید نہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَلَا تَقْعَلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ لَرْزُقْهُمْ وَأَيَّاكُمْ إِنَّ فَتْلَهُمْ كَانَ خِطَاً كَبِيراً۔

ترجمہ: ”اور تم اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم ہی ان کو رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی ان کو مار ڈالنا بڑی خطا ہے۔“ (نئی اسرائیل 31)

اسلام آبادی کے حقیقی مسئلے کا حل اضافہ پیداوار کی شکل میں بخور کرنا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

”رسول اللہ ﷺ نے مال داروں کو حکم دیا کہ بکریاں پالیں اور غریبوں کو حکم دیا کہ مرغیاں پالیں تاکہ فراغی حاصل کریں۔“ (ابن ماجہ)

اس طرح اسلام ہر فرد اور پوری قوم کی توجہ کو معاشی وسائل کی ترقی اور پیداوار کی امکانات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے پر مرکوز کرتا ہے۔ وہ ایک طرف معاشرے میں انصاف اور آزادی کو قائم کرتا ہے اور دوسری طرف غربت و افلاس کا خاتمہ کر کے بہتر معاشی زندگی کا قیام ممکن بناتا ہے۔ یہاں بھی اس کا مزاج مغرب کی تمام معاشی تحریکات سے مختلف ہے۔



## 21- سعی کرنا:

گویا ضرورت زندگی خدا کی نعمتیں ہیں جن کی وجہ سے ہم پر اس کا شکر واجب ہے۔ پھر اسلام نے حصول معاش کے لئے محنت اور جدوجہد کی ترغیب دی ہے اور ہر شخص کو پیداوار کی تکثیر پر آمادہ کیا ہے جسے کئی عنوانات کے ماتحت بیان کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً:

i- "سستی کا ہٹاؤ" بے عملی بے روزگاری اور گداگری کو ناجائز ٹھہرایا ہے۔ اس سلسلے میں حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"بیچارہ بیٹھے رہا مومن کا کام نہیں نہ یہ اس کے لئے درست ہے کہ رزق کو تلاش نہ کرے اور صرف زبانی دعا مانگتا رہے دعا کے ساتھ عملاً بھی اس کے لئے جدوجہد کرنا لازم ہے کیونکہ تمہیں معلوم ہے کہ آسمان سے سونا چاندی نہیں برستا۔"

حضور ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ:

ii- "گداگری عزت و ناموس پر کھٹک کا ٹیکہ ہے۔ گداگر سے چہرے پر قیامت کے دن گوشت نہیں ہوگا۔"

مزید برآں:

"قیامت کے دن گداگری کا داغ چہرے پر لے کر آنے سے بہتر ہے کہ کام کرے۔"

ایک اور حدیث میں اس طرح ہے:

"ایک رسی اور کپھاڑی لے کر جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانا اور معاش کا انتظام کرنا اس سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ لوگوں سے سوال کیا جائے سائل کو دینا یا نہ دینا لوگوں کے بطن میں ہے مگر محنت کرنے والا یقینی طور پر روزی حاصل کر لیتا ہے۔"

اس متنی پہلو کے ساتھ ساتھ مثبت طور پر معاشی جدوجہد کی ترغیب یہ کہہ کر دی گئی ہے:

iii- رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "نماز فجر کے بعد رزق کی تلاش کیا کرو غفلت کی نیند مٹ سو۔"

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

"دنیا کی شرافت الماداری اور سخاوت ہے اور آخرت کی شرافت تقویٰ و پرہیزگاری۔"

اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے:

نعم المال الصالح للرجل الصالح

"نیک آدمی کے لئے اچھا مال کیا ہی اچھی چیز ہے۔"

قرآن مقدس میں ہے:

ولا تنس نصیبک من الدنيا (القصص)

”دنیا سے اپنا حصہ فراموش مت کرو۔“

یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر آدمی کا اس دنیا میں حصہ لگا دیا ہے جسے حاصل کرنا اس کے ذمہ لازم ہے اور ظاہر ہے کہ اس کی صورت محنت اور جدوجہد کے سوا اور کچھ نہیں۔ نیز ایک اور حدیث کے مطابق:

كسب الحلال طریضۃ بعد الفریضۃ

”رزق حلال کی تلاش اور کمائی کرنا عبادت الہی کے بعد فرض سمجھا۔“

معاشی جدوجہد کی اسلام کی نگاہ میں جو قدر ہے اس پر ایک حدیث سے روشنی پڑتی ہے کہ حضور ﷺ کے پاس ایک شخص سوال کرنے آیا آپ نے اس کو رزق حلال کی تلاش کی ترغیب دی اور پوچھا تمہارے پاس کچھ ہے بھی؟ اس نے کہا کہ ہاں لکڑی کا پیالہ اور ایک چادر ہے حضور ﷺ نے یہ دو چیزیں فوراً نیلام کر کے بازار سے کلباڑی اور لکڑی منگوائی اور اپنے دست اقدس سے کلباڑی میں دستہ لگا کر اس کے حوالہ کیا۔ پھر اسے جنگل میں جا کر لکڑیاں کاٹنے کا حکم دیا۔ کچھ دن کے بعد وہ شخص آیا تو اس کے چہرے پر رونق تھی اور خوشحال ہو چکا تھا۔ ایک حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا ہے:

”صنعت و حرفت کے ذریعہ سے روزی کمانا انسان پر فرض ہے۔“

ایک اور ارشاد یوں ہے:

”روزی کمانے کی جدوجہد میں متکسر رہنا گناہوں کا کفارہ ہے۔“

اسی طرح کہا گیا ہے کہ:

”جو شخص سوال سے بچے اور اہل و عیال کی روزی حاصل کرنے کے لئے جائز طریقے سے دنیا کمانا ہے اور ہمسائے کی مدد کرتا ہے قیامت کو اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی مانند روشن ہوگا۔“

22- ماہرانہ آراء:

مولانا آزاد کے مطابق ”گویا اس نظام معیشت میں بلاشبہ زیادہ سے زیادہ کمانے والے افراد موجود ہوں گے کیونکہ سعی و کسب کے بغیر کوئی مومن زندہ رہ ہی نہیں سکتا لیکن جو فرد جتنا زیادہ کمائے گا اتنا ہی زیادہ احقاق پر مجبور ہوگا اور اس لئے افراد کی کمائی جتنی بڑھی جائے گی اتنی ہی زیادہ جماعت بحیثیت جماعت کے خوشحال ہوتی جائے گی کامل اور مستعد افراد زیادہ کمائیں گے مگر صرف اپنے ہی لئے نہیں کمائیں گے بلکہ تمام اشخاص قوم کے لئے کمائیں گے۔ یہ صورت پیدائش ہو سکے گی کہ ایک طبقہ کی کمائی دوسرے طبقوں کے لئے معاشی و مفلسی کا پیکار ہو جائے جیسا کہ عام طور پر ہو رہا ہے۔“

مزید لکھتے ہیں کہ ”اسلام نے سوسائٹی کا جو نقشہ بنایا ہے اگر ٹھیک ٹھیک قائم ہو جائے اور صرف چند خانے ہی نہیں بلکہ تمام خانے اپنی اپنی جگہ پر بن جائیں تو ایک ایسا اجتماعی نظام پیدا ہو جائے گا جس میں نہ تو بڑے بڑے کردار ہوں گے اور نہ مفلس و محتاج طبقے ایک طرح کی درمیانی حالت غالب افراد پر طاری ہو جائے گی۔“

اس ساری بحث کا حاصل یہ نکلا کہ ”اسلامی اقتصادیات کا اطلاق ایک ایسے بہتر اور مکمل نظام معیشت پر ہوتا ہے جو اپنے اندر معیشت کے قدیم و جدید نظام ہائے مذہبی و عقلی کے کلی محاسن کو سمونے ہوئے ہے اور ان کے معائب و نقائص سے یکسر خالی بلکہ ان کے مسموم اثرات کے بے نظیر تریاق ہے اور ان تمام کمالات کے علاوہ اس کو برتری حاصل ہے کہ وہ انسانوں کے دماغ کی اختراع نہیں ہے کہ جس کی بنیاد انتقام، بغض یا طبقاتی منافرت جیسی خام کاربوں پر رکھی گئی ہو بلکہ وہ نظام کائنات کے خالق کا بنایا ہوا ہے۔“

ڈاکٹر سر محمد اقبال تحریر کرتے ہیں:

”میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم یا زمامت حائل کے دوسرے ازم (Isms) کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ میرے عقیدہ کے مطابق صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو نئی نوع انسان کے لئے موجب نجات ہے۔“

لادینی نظاموں کی بنیاد بغض و نفاق اور الحاد و فساد اور بگاڑ پر ہے جب کہ اسلامی نظام کی بنیاد اخلاق و اقدار اور اخلاص و احساس اور محبت و معاونت پر قائم کردہ ہے۔

خلیفہ عبدالکیم تحریر کرتے ہیں:

”اسلام بھی ایک طاقتور مملکت کی تعمیر کی ضرورت محسوس کرتا ہے جو قوم کے اساسی حقوق کا تحفظ کرنے، باہر کے حملہ آواروں سے اپنا بچاؤ کرے اور طاقتور کے ظلم و زیادتی سے کمزور کی حفاظت کرے۔ اسلام ایک اجتماعی اور سیاسی مذہب ہے اور اس کے تمام آئین و دستور کا تعلق معاشری عدل اور معاشری اتحاد سے ہے۔ تاہم مملکت یا اس کے قائدین اور حکمرانوں کی غیر مشروط اطاعت واجب نہیں ہے۔ قانون اور نظم و ضبط کی خاطر بالا دستوں کی اطاعت کی تعلیم دی گئی ہے لیکن یہ اطاعت ہمیشہ احکام کے اخلاقی ہونے سے مشروط ہے۔ لا طاعة للمخلوق فی معصية الخالق اسلام کا اساسی اصول ہے۔ صدر حکومت تک کے اعمال و احکام پر ایک ادنیٰ ترین باشندہ ملک ہر عام نکتہ چینی کر سکتا ہے۔“

اسلام کے نزدیک قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ خود آنحضرت ﷺ نے لوگوں سے ارشاد فرمایا کہ اگر آپ ﷺ نے نادانستہ کسی کو کوئی نقصان پہنچایا ہے تو وہ اپنے انتقام کا حق خود آپ ﷺ کے خلاف استعمال کر سکتا ہے۔ فاروق اعظمؓ اور حضرت علیؓ بلا رو رعایت دار و خواہی کے لئے عدالت میں بحیثیت بیٹی اور مدعا علیہ کے بار بار حاضر ہوئے۔

اسلام مشاورت کے ذریعہ سے حکومت کی تعلیم دیتا ہے۔ آنحضرت ﷺ تقریباً ہر روز معاملات حکومت میں اپنے اصحاب سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ قرآن مسلمانوں کے اوصاف حسن میں سے بطور خوبی کے اس وصف کا اظہار کرتا ہے کہ وہ مستبد اور آمر نہیں ہوتے بلکہ اجتماعی اہمیت کے تمام معاملات باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں۔

قرآن میں مسلمانوں کو امت وسطیٰ کا خطاب دیا گیا ہے۔ جو دو انتہاؤں میں ہمیشہ خیر الامور اور وسطیہ پر عمل کرتے ہیں۔ یہ یونانیوں کے نظریہ حیات کے مشابہ ہے جن کا قول تھا کہ ”زیادتی میں کچھ بھی نہیں“ غیر الامور اور وسطیہ کا اصول اوسطا طالیسی اخلاقیات میں محوری نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام کی یہ خصوصیت اس کی تمام تعلیمات اور عمل میں جاری ہے۔ اسلام کی جملہ اخلاقیات عملی اخلاقیات ہیں جس نے رہنما کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ اسلام نئی نوع انسان کا مذہب ہے۔ یہ فرشتوں کے لئے نہیں ہے۔ ہر حکم میں انسان کی اصلی فطرت کو ملح اس کی تمام جہتوں اور خواہشوں کے ملح رکھا گیا ہے۔ وحدانات اور جذبات زندگی کے لئے بطور آلات کے ہیں۔ یہ نظم و ضبط میں لانے کے لئے ہیں۔ فنا کرنے کے لئے نہیں۔ آنحضرت ﷺ کے ایک صحابی نے اپنے رنج و افسوس کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ ”جب میں آپ ﷺ کی صحبت میں رہتا ہوں تو میرا اخلاقی رنگ نہایت بلند و برتر رہتا ہے۔ بلند خیالات و معیارات میری شعوریت میں جاری و ساری رہتے ہیں۔“

لیکن جب میں آپ ﷺ سے دور رہتا ہوں تو میری اخلاقی سطح یکا یک پست ہو جاتی ہے اور میں اپنی حالت پر بہت افسوس کرتا ہوں۔ اس کو سن کر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”تم کو مایوس اور پست ہمت نہ ہونا چاہئے تم انسان ہو فرشتہ نہیں ہو اگر خدا یہ چاہتا کہ دنیا کو ایسی ہستیوں سے آباد کرے جو اخلاقی کھنکش سے آزاد ہوں تو ملائکہ کو یہاں بساتا لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا تمہاری اخلاقی پشیمانی اور یہ بلندی اور پستی کا احساس ایمان کی علامت ہے۔ یہ سن کر آپ ﷺ کے صحابی کو اطمینان حاصل ہوا۔“

انسانی اصلاح و ترقی کے لئے ایک عظیم لائحہ عمل کا خاکہ مختلف اقوام کے عالیہ مفکرین، قائدین اور مصلحین نے کھینچا ہے اور ان منصوبوں میں سے ہر ایک میں چند ایسے اصول ہیں جو اسلامی طہیبات کے اجزاء ہیں لیکن ان سب میں جزدی صداقتوں پر دورغ بیانی کی حد تک مبالغہ آمیزی کی گئی ہے۔ دیگر اجزاء کے اخفا کے ساتھ چند اجزاء پر عقیدہ دانہ تاکید نے انہیں بحیثیت مجموعی زندگی کے ساتھ سلوک میں ناکام و خاسر رکھا ہے۔ حریت پسند عموماً حیات میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو اسلام کی جزوالات تک ہیں۔ ہر ایک کو مساوی مواقع ملنے چاہئیں۔“

پروفیسر خورشید احمد رقم طراز ہیں: ”اس کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مرکزی تصور انسان اور اس کی معاشی و اخلاقی اصلاح ہے۔ وہ معاشی ترقی کو اعلیٰ ترین مدارج (Stages)

تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ سماجی انصاف آزادی اور اخلاقی ترقی کو اولین اہمیت دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا معاشی نظام سرمایہ داری (سرمایہ داریت) اور اشتراکیت دونوں سے اپنے مقصد مزاج اور اصولوں کے اعتبار سے مختلف ہے اور ہر حیثیت سے اعلیٰ اور برتر ہے۔“

## 23- خیرات و صدقات:

آیات قرآنی اور احادیث نبوی ﷺ سے خیرات و صدقات کی وضاحت اور فضیلت پر روشنی پڑتی ہے اگرچہ ادائیگی زکوٰۃ کے بعد مسلمان کا مال پاک ہو جاتا ہے۔ تاہم بار بار خیرات کرنے کی تاکید کی گئی ہے حتیٰ کہ یہاں تک آتا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: وہ پختہ مسلمان نہیں جس کے بمسائے رات کو بھوکے سو جائیں۔ کس قدر غرباء و مساکین کی کفالت اور اعانت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن مقدس میں آتا ہے:

”وہ پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں؟ آپ ﷺ بتا دیں جو تمہاری ضرورت سے پس انداز ہو جائے۔“

یعنی وہ سب کا سب اللہ کی مخلوق کی خبر گیری اور روزی کی خاطر صرف کیا جاسکتا ہے۔ کیا کوئی دوسرا دنیا کا معاشی یا مذہبی نظام ایسی واضح مبین اور روشن حقیقت کا اظہار کر سکتا ہے۔ یقیناً اس کا دامن ایسی اשלہ پیش کرنے سے قاصر رہے گا۔ یہ شرف صرف اسلام ہی کو بخشا گیا ہے۔ کیونکہ رب غفار اس کا خالق و مالک ہے اور وہ اسے دوسرے تمام نظاموں سے ممتاز دیکھنے کا آرزو مند ہے۔

برٹرینڈ رسل جو کسی زمانے میں سوشلزم کا بڑا حامی تھا اس کے ناقدین میں شمار ہونے لگا اور اس نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔

سوشلزم و اصل نفرت، عداوت اور حد پر مبنی ایک منافقانہ نظام ہے۔ مارکس نے انسان کے جذبات کو ابھار کر ایک نہایت جاندار طاقتور پراثر تحریک بنا دیا لیکن یہ تحریک یا مغنی عمل انسانی معاشرے کے لئے کوئی مثبت نتائج برآمد نہ کر سکا۔ مزید کہتا ہے کہ اس نے ان جذبات کو منظم کر کے ایک نظریہ کی شکل دی۔ یہ لازم نہیں کہ یہ محسوسات صرف معاشی قوتوں کے باعث پیدا ہوتے ہوں۔

نیز نقاد مزید کہتے ہیں کہ طبقاتی تقسیم نہایت مبہم اور غیر واضح اصطلاح ہے اور مارکس جو طبقات کی تقسیم کرتا ہے وہ کوئی مستقل اور باندھ قوت نہیں انسانی معاشرے کو مشینوں کے انداز میں بے جان مادوں کی صورت میں تقسیم کرنا کس طرح درست ہے؟ مارکس کے نزدیک دو طبقوں (پرولاریہ بورژوا) کے ساتھ تیسرا طبقہ منظم اور مضبوط حکومت کا بھی پیدا ہو چکا ہے جو کسی کو

حرکت کرنے کی مہلت تک نہیں دیتا۔ اشتراکیت اور اشتعالیت کی ہم اسے مذہب اخلاق و اطوار کے خلاف سمجھ کر مخالفت نہیں کرتے بلکہ خالص اقتصادی معاشرتی اور تاریخی نقطہ نظر سے بھی وہ اصول مدن ہیں جن پر ان کی عمارات کی ساری تعمیر اٹھائی گئی ہے۔ اسی طرح سرمایہ داری کے اصول بھی فطرتی میلانات کی صحیح عکاسی نہیں کرتے اور یہی سبب ہے کہ وہ ناکام ہو چکا ہے۔

”غیر اسلامی تمام نظام ناکمل اور ناقص ہیں یہ انسانی تار سا ذہن کی پیداوار ہے۔ افرنکی عیاری اور قد بازی کا مظہر ہیں غیر فطری واقعات کی جولانگہ ہے مصنوعی خیالات کی تخلیق ہے۔ لہذا یہ ہمارے دکھوں کا مددوا نہیں ہمارے عوارض کا درماں نہیں۔ ہمارے قومی و مسائل کے مطابق مسائل کا حل نہیں بلکہ یہ کسی بہتر مکمل مضبوط اور احسن نظام کے متلاشی ہیں۔ اشتراکیت زندگی کے ہر پہلو کا بنظر غائر مطالعہ نہیں کرتی۔ اگر کسی ازم (ism) سے دلچسپی ہے تو اسلام مزہم کہہ لیں یا اشتراکیت اور اشتعالیت کے وزن پر اسلامیت کا نام رکھ لیں۔

اگر آپ فنی نسل میں پہاڑوں کی ٹیگنی بہار جیسی رنگینی طوفانوں کے سوز و غلام آندھیوں کی بلا خیزی یا دصبا کی شوشی بجلی کے زور آبتاروں کے شور اشجار کی رفعت آفتاب جیسی تہازت ماہتاب جیسی چمک اور ستاروں کی مانند دمک پیدا کرنے کے جتنی ہیں تو اسلامی نظام ہی اپنا نا پڑے گا ورنہ اشتراکیت جیسی خباثت سرمایہ داریت جیسی حماقت اور اشتعالیت جیسی غلبت سے ہی پالا پڑا رہیں گا اور یہ نئی پودوں آسانی سہل انگاری اور عیش کوشی ہی میں پروان چڑھے گی۔ قومی سفینہ ساحل مراد سے ہمکنار نہیں ہو سکے گا اور گوہر مقصود غرق ہو جائے گا۔

اسلام معاشرتی و مذہبی زندگی کی حقیقی لذتوں سے لبریز کرتا ہے۔ اصلی راحتوں اور مسرتوں سے سرفراز کرتا ہے۔ ملکی استحکام و سلامتی کا ضامن اور قومی اتحاد و یک جہتی کا پاسان ہے خوش حالی و شادابی اور طمانیت و رفاہیت کی دولت لازوال سے مالا مال کرتا ہے۔ سیرت و کردار اور اخلاق و اطوار کے ارفع و اعلیٰ مقام پر فائز کرتا ہے۔ تمام دشواریوں مصائب و آلام کا مفید علاج تجویز کرتا ہے۔ المختصر یہ زندگی کے ہر گوشہ پر محیط ہے۔

جو نکتہ وردوں سے کھل نہ سکا اور فلسفیوں سے حل نہ ہوا

وہ راز کملی والہ علیہ السلام نے بتلا دیا چند اشاروں میں

اسلام صاحب جلال اور کاشف احوال بنانا ہے۔ حقیقت پسندانہ افکار آبرو مند دانہ نظریات کا بہتر سبق سکھاتا ہے۔ عرفان و پہچان معرفت کا شیدائی اور تحقیق و جستجو کا اشتیاق اجاگر کرتا ہے۔ وقتی ضروریات اور ملی تقاضوں سے ہم آہنگی کا درس دیتا ہے۔ کیونکہ یہ خدائی نظام ہے نام نہاد جمہوریت اس کی دست بستہ کنیز ہے۔ اس لئے ہمیں شمس فلک سے منہ موڑ کر چراغ فرش پر نظر نہیں رکھنی چاہئے۔ کیونکہ کے آئینل میں پناہ و حوض نے والو! اسلام کے دامن عریض میں عاقبت حاصل کرو سوشلزم کے ظلمت کبدہ میں بھٹکنے والو! اسلامی نظام کے آفتاب جہاں تاب

سے صوفیائی حاصل کرو مرہایہ داری کے سہارے جینے والو! اسلام کے سایہ عاطفت میں نشیمن بناؤ۔ مصنوعی مساوات کے لبادہ میں غریبوں، مسکینوں، یتیموں کا خون چوسنے والو! اسلام کے چشمہ فیض رساں سے آتش کشی بجھاؤ اسی کے طفیل تمہاری دنیا سدھرے گی اور اسی کے وسیلے تمہاری عاقبت سنوڑے گی۔“ (اسلامی معیشت از مہر محمد نواز خان)

## اسلام و اشتراکیت میں تقابل

قرآنی نظم معیشت اور لادینی نظام معیشت میں بھی کئی پہلوؤں سے فرق پایا جاتا ہے۔ ذیل میں ان دونوں نظاموں کے اختلافی نکات زیر بحث لائے جاتے ہیں:

### 1- مطلقہ مقاصد (Objectives):

اسلام انسان کی مادی و روحانی اور دنیوی و اخروی ہر دو قسم کی فلاح کو اپنا مقصد قرار دیتا ہے اور اسی کے پیش نظر اس نے اپنا معاشی تنظیم دیا ہے جب کہ اشتراکی نظام ایک مادہ پرستانہ نظام ہے جو افراد کی مادی ضروریات کی تسکین کو ہی اپنا نصب العین قرار دیتا ہے۔ اس لحاظ سے اسلامی نظم معیشت کا دائرہ اشتراکی نظام کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ہے۔

### 2- ملکیت و ذرائع:

اشتراکی نظام معیشت میں وسائل پیداوار کلینے ریاست کی ملکیت ہوتے ہیں۔ صنعت، تجارت، زراعت، نقل و حمل، القرض ہر چیز ریاست کی ملکیت ہوتی ہے۔ افراد محض مزدور کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ وہ صرف محدود شخصی دائرہ میں اپنی ضرورت کی اشیاء اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔

اس کے برعکس اسلامی نظام معاشیات میں افراد کو نجی ملکیت کا حق حاصل ہوتا ہے۔ ذاتی اشیاء ضرورت کے ساتھ ساتھ ذرائع پیداوار پر بھی ان کے حق ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ تاہم اسلامی نظام معیشت میں اجتماعی ملکیت کی قطعی طور پر نفی نہیں کی گئی۔ حالات و مصالح کے پیش نظر اسلامی حکومت بعض پیداواری کاروبار اپنی تحویل میں لے سکتی ہے۔

### 3- منصوبہ بندی میں فرق:

اشتراکی نظام میں پیداواری ذرائع کو ایک جامع منصوبہ کے تحت زیر استعمال لایا جاتا ہے اور یوں ضروریات اور پیداوار کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کا طریق کار اختیار کیا جاتا ہے۔ اسلامی نظام معیشت چونکہ افراد کو نجی ملکیت کا حق دیتا ہے اس لئے وہ انہیں کسی جامع مرکزی منصوبہ کا پابند نہیں کرتا بلکہ آزادانہ طور پر کاروباری فیصلے کرنے کا موقع دیتا ہے۔ تاہم

اسلامی ریاست ملکی مفاد کے پیش نظر بعض شعبوں میں منصوبہ بندی کا طریقہ اختیار کر سکتی ہے۔ اسلام میں منصوبہ بندی حکیمانہ، مفکمانہ اور ٹھوس ہوتی ہے۔

#### 4- معاشرت:

اسلامی نظام میں تعاون کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے اور یہ نظام سبھی افراد کو یکساں حقوق اور مراعات دیتا ہے۔ انہیں براہ راست امور ریاست میں شریک کرتا ہے۔ جب کہ اشتراکیت ایک قسم کی آمرانہ حکومت ہوتی ہے اور کسی کو دم مارنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ نیز حکومت مشورے لینے کی پابندی نہیں ہوتی۔

#### 5- آزادی (Freedom):

”ہم ہر اس اخلاق کو رد کرتے ہیں جو عالم بالا کے کسی تصور پر مبنی ہو یا ایسے خیالات سے ماخوذ ہو جو طبقاتی تصورات سے ماورا ہیں۔ ہمارے نزدیک اخلاق قطعی اور کلی طور پر طبقاتی جنگ کا تابع ہے۔ ہر وہ چیز اخلاقاً بالکل جائز ہے جو پرانے قلع بخش اجتماعی نظام کو مٹانے کے لئے اور محنت پیشہ طبقوں کو متحد کرنے کے لئے ضروری ہو۔ ہمارا اخلاق بس یہ ہے کہ ہم خوب مضبوط اور منظم ہوں اور نفع گر طبقوں کے خلاف پورے شعور کے ساتھ جنگ کریں ہم یہ مانتے ہی نہیں کہ اخلاق کے کچھ اذلی اور ابدی اصول ہیں ہم اس فریب کا پردہ چاک کر کے رہیں گے۔ اشتراکی اخلاق اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ محنت کشوں کی حکومت کو مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کے لئے جنگ کی جائے۔“

تاگزیر ہے کہ اس کام میں ہر چال فریب غیر قانونی تدبیر چلے بہانے اور جھوٹ سے کام لیا جائے۔ مگر اسلام چند حدود و قیود کے اندر لوگوں کو آزادی دیتا ہے اور بلاوجہ سختی نہیں کی جاتی۔

#### 6- مذہب (Religion):

اشتراکیت و اشتراکیت میں جیسا کہ لینن نے بذات خود کئی بار یہ کہا کہ مذہب لوگوں کے لئے انیوں کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کے نزدیک اشتراکی نظام کا سب سے بڑا دشمن خدا ہے لہذا ہمیں تمام تر قوت اسے بے دخل کرنے میں صرف کر دینی چاہئے مگر اسلام میں مذہب کو کلیدی حیثیت ملی ہوئی ہے۔ احکامات الہیہ کے مطابق چلنا پڑتا ہے سرتابی ممکن نہیں ہے۔

اس ضمن میں پروفیسر وی ہیکر لکھتا ہے کہ:

”اشتراکی محض لامذہب اور مادہ پرست ہونے پر ہی استغنا نہیں کرتے بلکہ وہ لامذہبی اور مادہ پرستی کا مجاہد بھی ہوتا ہے۔“



لیکن ایک بات بھی کہی ہے:

”مذہب سے جنگ کا قریبی تعلق اس جدوجہد سے ہوتا چاہئے جو تہذیب و معاشرت کی جڑوں سے مذہب کے نعوذ اور اثر کو نکال پیچکنے کی خاطر کی جاتی ہے۔“  
ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ مذہب مسلمان کا اوزھنا پھونکا ہے۔

## 7- ذاتی منافع کا محرک:

اشتراکی نظام میں ایک فرد فقط ریاستی مشینری کے ایک پرزہ کے طور پر کام کرتا ہے۔ کاروباری منافع کا کوئی حصہ اسے حاصل نہیں ہوتا۔ وہ پہلے سے طے شدہ اجرت ہی وصول کرتا ہے۔ اس لئے اس میں کام کرنے کا جذبہ مائد پڑ جاتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں ہر کاروبار آدمی اپنے نفع و نقصان کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی منافع کے حصول کی خاطر بھرپور انداز میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس سے پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے اور معاشی سرگرمیاں جلاپاتی ہیں۔

## 8- سرکاری اختیارات:

اشتمالی و اشتراکی نظام میں ریاست ہمہ مقتدر اور سب سیاسی معاشی اختیارات کی مالک ہوتی ہے اور اپنی قوت کے بل بوتے پر ہر شعبہ زندگی میں دخل اندازی کرتی ہے۔ فرد کلیتہً ریاست کے رحم و کرم پر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسے معاشی امور اور پالیسیوں میں بالکل کوئی عمل و دخل حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اسلامی معاشی نظام اپنی داخلی توانائی کے زور پر چلتا ہے۔ شخص قابلیت و صلاحیت آزادانہ طور پر بروئے عمل آ کر اسے حرکت اور استحکام عطا کرتی ہے۔ سرکاری اختیارات کا دائرہ بڑا محدود ہوتا ہے۔ ریاست معاشی سرگرمیوں کے لئے محض ایک رہنما و نگران اور محافظ و اصلاح کنندہ کا کردار ادا کرتی ہے۔ تاہم قواعد و ضوابط کی پابندی کرنے پڑتی ہے۔

## 9- تقسیم دولت:

اشتراکی نظام میں قومی دولت کے سارے ذرائع حکومت کے قبضہ و تصرف میں آ جاتے ہیں اور عام لوگوں کو فقط ضروریات زندگی کو پورا کرنے کا سامان میسر آتا ہے اور وہ بھی اس قیمت پر کہ انہیں اپنی خطری انسانی آزادی کو سرکاری احکامات اور قوانین کے آگے قربان کرنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی نظام معیشت میں دولت کی تقسیم کا نہایت احسن اور عادلانہ نظام موجود ہے جو ایک طرف دولت کے بے جا ارتکاز کا سدباب کرتا ہے تو دوسری طرف سب افراد معاشرہ کو اس انداز میں ان کی معاشی ضروریات کی تکمیل کی ضمانت دیتا ہے کہ ان کی حریت فکر و عمل محفوظ رہے اور وہ خوشحال پر سکون آرام و زندگی کی مسرتوں و راحتوں سے

لبریز ہوتے رہیں اور ترقی کے ذریعے پرگامزن ہو کر آگے بڑھتے جائیں۔ کوئی طبقہ محروم الجمعیت نہ رہے۔ کثیر دار (Have-Lots) اور نادار (Have-Not) کی تفریق ختم ہو جائے۔ مصنفانہ تقسیم ذرائع کا پورا پورا اہتمام کیا جاتا ہے جس سے حق تلفی اور نا انصافی نہیں ہو پاتی۔ زیادتی کرنے والے کو سزا ملتی ہے۔

### 10- افسر شاہی (Bureaucracy):

اشتراکی و اشتہالی دونوں نظاموں میں افسروں کے بے شمار اختیارات ہوتے ہیں کیونکہ ایک مرکزی ادارہ بہت سے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ جمہوری روح غائب ہوتی ہے۔ سرخ فیتہ (Red-Tapism) کا دور دورہ ہوتا ہے۔ سارے فیصلے اوپر سے ٹھونے جاتے ہیں۔ سرکار کی مخالفت ہوتی نہیں سکتی مگر اسلامی نظام شورائی صفات کا حامل ہوتا ہے جیسا کہ

واموہم شورویٰ بہنہم (الشوری: 38)

”اور مسلمانوں کا کام آپس کے مشورہ سے چلے ہے۔“

### 11- صارفین سے عدم توجہی:

سوشلزم اور کمیونزم میں صارفین کی پسند و ناپسند کو درخور اعتناء نہیں سمجھا جاتا کیونکہ جو اشیاء حکومت تیار کرتی ہے صارفوں کو وہی لینی پڑتی ہے۔ چناؤ (Choice) دیا ہی نہیں ہے اور حلال و حرام میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ جبکہ نظام اسلام میں تمام حلال اشیاء کے استعمال کی اجازت ہوتی ہے۔

### 12- بنیاد (Base):

اشتراکی و اشتہالی نظاموں کی بنیاد انسانی نظریات الحاد ہیں جن میں صحیح و غلط کی پہچان نہیں ہے اور اس لئے ناپائیدار ہیں جبکہ اسلام کے نظام کی اساس قرآنی تعلیمات اور نبوی ﷺ احکامات و فرمودات (Commandments) پر رکھی گئی ہے جو مستقل و اٹل نوعیت کے ہیں جو حوادث زمانہ سے متاثر نہیں ہوتے۔



# برصغیر میں معاشی نظریات کی کشمکش کا جائزہ

## سامراجیت

### (Imperialism)

1940ء زمانہ انگریزوں کی حکومت کا تھا جنہوں نے ہمارے ملک متحدہ ہندوستان میں بحیثیت ایک تاجر کے داخلہ حاصل کیا تھا لیکن آہستہ آہستہ اس پر جامہ اند قبضہ کر لیا اور پھر اس ”سوئے کی چڑیا“ کے ایسے پر نوچے کہ ہم ہندوستانوں کو غریب بنا کر خود امیر بن گئے اور ہم لوگوں کو اتنا ذلیل کیا کہ اپنے ریسٹوران کے باہر بورڈ آویزاں کر دیتے تھے:

”Indians Not Allowed“

”ہندوستانی اندر نہیں آسکتے“

اس لفظ سامراجیت کی مختلف تعریفیں کی جاتی ہیں انہی انگریزوں کی آکسفورڈ ڈکشنری میں اس کے معنی جو درج ہیں۔ ان کو درج ذیل کیا جاتا ہے:

”ایک شہنشاہ کی حکومت بالخصوص جب وہ جاہل اور مطلق العنان ہو۔“

اسی طرح ایک اور تھریڈ انٹرنیشنل ڈکشنری میں اس کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

”کسی قوم کا علاقے یا ماتحت علاقے حاصل کرنا اور ان پر تسلط قائم

کرنا یا اس کے لئے رضا مندی ظاہر کرنا۔ بالخصوص ایسی صورت میں جب یہ

علاقے اس ملک کی قدرتی سرحدوں سے باہر ہوں۔ دوسری انسانی نسلوں پر

اپنی حکومت کی توسیع کو بھی سامراجیت کہتے ہیں۔“

## استعماریات (نوآبادیات)

### (Colonialism)

یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد کم و بیش ہر ملک میں صنعتی پیداوار ضرورت سے زیادہ بڑھے گی اور یہ قدرتی بات ہے کہ جب اشیاء ضرورت کی مقدار اتنی بڑھ جائے تو پھر تجارت کے لئے ملک سے باہر نکل کر منڈیوں کو تلاش کرنا پڑتا ہے چنانچہ یورپی اقوام نے دور دراز

علاقوں میں جا کر وہاں کے عوام کو یہ تاثر دینا شروع کیا کہ یورپی لوگ صرف مقامی عوام کی خدمت کے لئے آئے ہیں چنانچہ ان کے لئے رفاہ عامہ کے کام کر کے ان کو متاثر کیا۔ کہیں سرکس بنائیں تو کہیں ادویات سے بیماروں کے ایسے ایسے علاج کیے کہ بادشاہوں نے ان کو خوش ہو کر مراعات دیں جن سے ان کے مراکز حریہ منظم ہو گئے اور پھر ان کو حکومت چلانے کے لئے نئے نئے طریقے اور ڈھنگ سکھائے جس سے متاثر متعلقہ حکام نے ان کی حکومتی اداروں میں لینا شروع کر دیا اور ان لوگوں نے اپنے احکامات جاری کرنا شروع کر دیے جب مقامی لوگوں نے مخالفت انداز اپنایا تو ان پر ظلم و ستم ڈھانے شروع کر دیے اور پھر وہ زمانہ آ گیا کہ ان یورپی عوام نے دنیا کے مختلف کمزور ممالک پر قبضہ کر لیا لہذا اگر ہم یہ چاہیں کہ اس طرز کے نظام کو کیا کہتے ہیں تو ہمیں یہ خیال ذہن میں رکھنا پڑے گا کہ جن علاقوں میں ان یورپی قوموں نے قبضہ کیا۔ ان کو انہوں نے اپنی نو آبادی کہا اور وہاں جس نظام کے تحت مقامی لوگوں کو ظلم و استبداد کے ذریعے ماتحت کیا اسے نو آبادیاتی نظام کہتے ہیں یا دوسرے الفاظ میں ”استعماریت“ کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں کارل مارکس کا خیال ہے:

”یہ سرمایہ کاری کی آواز ہے جو سامراجیت اور استعماریت کی شکل میں غیر ترقی یافتہ اقوام اور علاقوں کا معاشی استحصال کرنے کے لئے قوت استعمال میں لائی جاتی ہے لیکن جب اسی تناظر میں کمپوزم کے طور طریقوں پر نظر دوڑائی جاتی ہے کہ وہ کیوں ایسے ملکوں پر سوشلسٹ نظام کا پرچار کر رہے ہیں تو ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سب اپنے معاشی مفادات کے تعاقب میں اپنے ممالک سے باہر نکل کر ایسے ہی ہنگامہ بازیے استعمال کر کے کمزور قوموں پر اقتدار قائم کرنے کے لئے مختلف شعوری جواز پیش کرتے ہیں اور اپنی اپنی صنعتی پیداوار کی ان علاقوں میں کھپت کا طرز عمل اپناتے رہے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں جنوبی افریقہ یا مشرق بعید میں چلے جائیں تو لاطینی امریکہ میں ان یورپی اقوام نے وہاں جا کر اس طرز پر قدم جمائے کہ دو دو سو تین تین سو سال تک وہاں کی دہائیوں کو لوٹ لوٹ کر اپنے ملکوں کو بھر لیا اور پھر وہاں پر ایسے ظلم و ستم ڈھائے کہ آج کا طالب علم جب انہیں پڑھتا ہے تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں پر تو یہی پنجابی کی ضرب النبال ثابت آتی ہے کہ آئینے آئی تو گھر والی بن بیٹھی یعنی آگ لینے کے لئے آئی تو اس گھر کی بیوی بن کر بیٹھ گئی اور اس بیوی کو گھر سے نکالنے میں بڑی دیر لگی۔ کم از کم ہندوستان سے ان کی دوسری جنگ عظیم کے بعد بڑی مشکل سے نکالا گیا۔ گو 1957ء میں خونی انقلاب برپا کیا گیا لیکن ناکام رہا۔ آخر کار اس سفید قوم نے جاتے جاتے بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کو کشمیر کے تنازعہ پر لڑنا چھوڑ دیا جو اب تک حل طلب ہے۔

## جدید استعماریت:

دوسری جنگ عظیم کے بعد سامراجی مملکتوں نے اپنے ماتحت نوآبادیات کو طوعاً و کرہاً آزادی کی نعمت سے سرفراز کر دیا ہے۔ جن میں ہندوستان، فلپین، جاپان، سائپن (انڈونیشیا) شامل ہیں لیکن اب بھی افریقہ اور ایشیا کے براعظم میں کئی ممالک ایسے ہیں جو اپنی آزادی کے حصول کے لئے تک و دو کر رہے ہیں تاہم بعض نئے علاقوں میں ”نئی استعماریت“ جنم لے رہی ہے ادھر بے شمار ممالک اقوام متحدہ کی رکنیت بڑھا رہے ہیں اور پرانی استعماریت کی صف لیٹی جا رہی ہے اور اب وہ سکڑ کر اپنے جزیروں میں ہی مشکل سے سانس لے رہے ہیں۔ اب روس کو جس طرز پر امریکہ نے توڑ دیا ہے۔ اس کی برتری کو معاشیات کی آگ سے کافی حد تک بھسم کر دیا ہے۔ وہ ممالک جن میں لٹویا، لیتھونیا، استونیا، پولینڈ، ہنگری، چیکوسلوواکیہ، البانیہ، بلغاریہ شامل ہیں۔

روس نے اس حد تک ان کو اپنے ماتحت رکھا ہوا تھا کہ یہ ممالک اس کی نوآبادیاں بن کر رہ گئے تھے۔ دوسری طرف کوریا اور تبت جیسے علاقوں پر چین کا اثر غالب ہے۔ جب چند آزاد ملک اس کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں تو اقوام متحدہ کے اہوانوں سے آواز سنائی دیتی ہے کہ یہ لوگ اتنے پسماندہ ہیں کہ ان کو بیرونی ترقی یافتہ ممالک کی سرپرستی اور رہنمائی چاہئے یعنی وہی جواز جو آج سے تین سو سال پہلے استعماری قوتوں نے اپنے لئے کھڑا کیا تھا۔ انجمن اقوام متحدہ جو کہ اب بڑی طاقتوں کا گہوارہ بننا جا رہا ہے۔ اس کے متعلق انڈونیشیا کے مرحوم صدر ڈاکٹر احمد سوئیکارنوں نے اسی لئے کہا تھا:

”اقوام متحدہ چند بڑی اور مفاد پرست طاقتوں کا مشترکہ اڈا ہے۔ جہاں غریب غیر ترقی یافتہ ترقی پذیر اقوام کو لوٹنے، استحصال کرنے اور ان پر اقتدار قائم کرنے کے لئے باہمی سمجھوتے ہوتے ہیں۔ یہ ادارہ دراصل بڑے ملکوں کے مفادات کی تکمیل کا ذریعہ ہے جہاں پر انصاف کا مطالبہ کرنے والوں کو دھکا دیا جاتا ہے۔ ان کے خلاف سازشیں کی جاتی ہیں اور انہیں دور جدید کی غلامی کے طریقوں پر طاقت کے ذریعے مجبور کیا جاتا ہے۔“

## اشتراکیت / سوشلزم

(Socialism)

بنیادی طور پر نظام اشتراکیت کا نظریہ آج سے اڑھائی ہزار سال پہلے افلاطون نے پیش کیا تھا اگرچہ اس کے پورے پروگرام کے اچھے علم پر کئی طور پر کسی جگہ پر بھی عمل نہیں ہوا لیکن

آخر تاریخ کی درق گردائی کی جائے تو دنیا کے مختلف ملکوں میں فلسفے کی بنیاد جزوی طور پر جہت سی حکمتوں نے اس کے اصولوں کو اپنایا ہے۔ اشتراکیت جسے موجودہ دور میں باقاعدہ ایک ازم کی شکل دینی گئی ہے۔ افلاطونی دور میں قدرے مختلف نوعیت رکھتا تھا۔ جدید مفکرین کے مطابق "افلاطونی نظریہ اشتراکیت" کو موجودہ دور میں "کمپوزم" کے رنگ میں ذرا زیادہ سخت کر کے پیش کیا گیا ہے اگر دیکھا جائے تو افلاطون بنیادی طور پر انفرادیت کی بجائے اجتماعیت کا قائل تھا اور اسی کا نام سوسائٹی یا معاشرہ ہے لیکن وہ اس بات کو بھی پیش کرتا ہے کہ انفرادیت کی اہمیت کو یکسر فراموش بھی نہیں کیا جاسکتا اور اس کی اس بات کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ فرد تنہا نہ تو کوئی اہم کام سرانجام دے سکتا ہے اور نہ ہی اپنے آپ کی کفالت کر سکتا ہے۔ ہر فرد دوسرے افراد کا محتاج ہے۔

کارل مارکس اور فریڈرک انجلز نے جدید اشتراکیت کی بنیاد رکھی اور انٹر کر مارکس نے جو بنیادی کام کیا وہ اشتراکیت کے بکھرے ہوئے خیالات اور نظریات کو اکٹھا کر کے ان کو سائنٹفک طریقے سے پیش کیا اور اسے مندرجہ ذیل تین بنیادوں پر استوار کیا:

- 1- معاشی عنصر کی اہمیت اور انسانی زندگی پر اس کا اثر
  - 2- فرد اور معاشرے کا تعلق اور معاشرے کی فرد پر فوقیت
  - 3- ذاتی ملکیت کا خاتمہ اور دولت کی متعفن اور بہتر تقسیم
- جہاں تک اشتراکیت کی اصطلاح کی تعریف کا تعلق ہے۔ اس کو مختلف طریقوں اور معانی سے بیان کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں اور ہر ایک تعریف کنندہ نے اس کو اپنے نقطہ نظر سے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

### اشتراکیت کی تعریف:

اس اصطلاح کی تعریف جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کئی طریقوں سے کی گئی ہے چنانچہ ایک ماہر سیاسیات نے شاید بہت سی تعریفوں سے تنگ آکر مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا:

"یہ ایک ایسی ٹوپی ہے جس کی اصلی شکل و صورت بگڑ چکی ہے کیونکہ اس کو ہر ایک نے اپنے کی کوشش کی ہے۔"

دیگرے میز سے یوں بیان کرتا ہے:

"اشتراکیت کا تعلق مرگٹ نسل سے ہے جو حالات اور ماحول کے مطابق اپنا رنگ بدل رہا ہے۔"

# اشتمالیت / کمیونزم

## (Communism)

کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز نے افلاطون کے بنیادی نظریہ اشتراکیت کو پیش کیا لیکن وہ اپنے اس نظریہ کو اپنی زندگی میں پورا نہ کر سکا۔ اگرچہ پیرس کمیون سے محنت کشوں کی حکومت قائم ہوئی لیکن وہ زیادہ دن نہ چل سکی۔ لیکن محنت کشوں نے اپنی ان تھک محنت اور ذہانت کے بل بوتے پر روس میں سوشلسٹ انقلاب لانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس انقلاب میں لینن نے جس کارکردگی کا ثبوت دیا۔ اس جیسا ذہین و فطین انسان آج تک پیدا نہیں ہوا۔ لینن نے اس جدوجہد میں جس بات کو بار بار پیش کیا وہ یہ تھا کہ پروتاروی انقلاب کا بنیادی مسئلہ سیاسی اقتدار سنبھالنا اور بورژوازی طبقے کی سیاسی مہینتری کو درہم برہم کرنے کی پروتاروی آمریت قائم کرنا تھا۔ تاہم یہ کام صرف تشدد کے ذریعے سرانجام دیا جاسکتا تھا۔ سوویت یونین میں صرف ایک جماعت کمیونسٹ پارٹی تھی۔ جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور زمینداروں کے خاتمے سے روس میں صرف دو طبقے مزدور اور کسان باقی رہ گئے تھے۔ دراصل 1916ء میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا تو اشتراکیت پسندوں کی جانب سے اس میں کسی قسم کی مدد نہ کرنے کا اعلان کیا گیا۔

زار روس کے مظالم عروج پر تھے اور اس کے بعد مارچ میں انقلاب آگیا۔ زار کا تختہ الٹا دیا گیا۔ 16 جولائی 1918ء کو زار نکولس دوم اس کے لڑکے بیوی اور چار لڑکیوں کو گولی کا نشانہ بنا یا گیا۔ سرمایہ دارانہ نظام ختم کر ڈالا بالٹو کیوں نے اقتدار سلتے ہی جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور صنعتکاروں کو بچائی پر لٹکا دیا۔ صرف پہلے تین برسوں میں سات ہزار سے دس ہزار لوگوں کو مار ڈالا گیا۔

بے شمار کوسا کیمبریا کے سرد ترین علاقے میں بھجوا دیا گیا اور جاتے وقت ان کو کوئی چیز ساتھ نہ لے جانے دی گئی۔ اتحادیوں کو اس طرز کے انسانیت سوز سلوک پر کمیونزم کے خلاف خوب پروپیگنڈے کا موقع ملا۔ المختصر کمیونزم کی عوامی تربیت، قابل اعتماد تجربہ کار اور محنت کش اور جفاکش کارکنوں کے لئے ہے۔ پارٹی میں انقلابی روح کا وجود بے حد ضروری خیال کیا گیا اور وہ کسی بھی ملک میں انقلاب پیدا کرنے کی ہر طرح سے لیس ہو گی کیونکہ لینن کے مطابق: ”انقلاب ایک بہت بڑا فن ہے جو عوام نہیں جانتے۔“

## فاشزم (فسطائیت)

فاشزم یعنی فسطائیت کا آغاز اٹلی کے ملک سے ہوا۔ بنیادی طور پر یہ ایک لاطینی لفظ کا حاصل ہے۔ جس کے اگر معنی کیے جائیں تو یہ ڈنڈوں اور کلہاڑیوں کے ایک گھمنے یا مجبوعے کا نام ہے اور اگر ہم اس کی تعریف کرنا چاہیں تو یہ:

”ایک ایسا نظام حکومت جس میں تمام اختیارات ایک الگ جگہ جمع ہو گئے ہوں جہاں مخالفت اور نکتہ چینی کی کوئی گنجائش نہ ہو جو تمام قومی مثلاً صنعتی و تجارتی معاملات پر کنٹرول رکھتا ہو۔ جارحانہ قومی پرستی اور اشتراکیت کی دشمنی پر مشتمل ہو۔“

فاشزم انفرادیت پسندی کا عین متضاد نظریہ اور فلسفہ ہے۔ انفرادیت میں فرد مقصد ہے اور سماج محض ایک ذریعہ۔ فاشزم اور نازی ازم میں اجتماعیت یعنی قومی ریاست ہی اصلیت ہے۔ افراد سے علیحدہ اس کی اپنی شخصیت اور مفاد ہیں۔ ریاست ہی سب کچھ ہے وہی روحانی، اخلاقی اور سیاسی اقدار کا سرچشمہ ہے۔ ریاست ایک جاندار کل ہے۔ افراد اس کے عضو محض ہیں۔ ریاست کے مفاد سے باہر نہ کسی فرد کے مفادات ہیں اور نہ ہی وہ ریاست کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔ خود غرض آدمی سماج دشمن ہے۔ اس کو راہ راست پر لانے کے لئے ریاست پوری طرح مجاز ہے اور ہا اختیار! وہ فرد کو مجبور کر سکتی ہے۔ فرد کی آزادی اپنے آپ کو ریاست کے ساتھ ہم آہنگ کرنے میں ہے۔

## نازی ازم

### (Nazism)

جونی نازی ازم کے الفاظ سامنے آتے ہیں تو جرمنی کا مشہور و معروف اور زبردست ڈکٹیٹر ہٹلر یاد آجاتا ہے جس نے 1939ء میں دوسری جنگ عظیم کا بنیادی طور پر آغاز کیا تھا۔ دراصل پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر جس طرح اتحادیوں نے جرمنوں سے ہتھیار ہچکوائے تھے۔ اس ذلت اور رسوائی کے علاوہ اتحادیوں نے ان پر اتنا بھاری تادان جنگ ڈال دیا تھا کہ جرمنی قوم بالکل بے بس اور ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

پہلی جنگ عظیم میں ہٹلر فوج میں ایک کارپول کی حیثیت سے ملازم تھا لیکن خدا تعالیٰ نے اس کو رہنمائی (لیڈرشپ) کی صلاحیتوں اور اوصاف سے نواز رکھا تھا۔ وہ اعلیٰ درجے کا تنظیم اور بلا کا مقرر تھا۔ اس کی نیشنل پارٹی نے ہر دشمن سے اپنی ہزیمت اور رسوائی کا بدلہ لینے کا



مہم ارادہ کر کے پارٹی کا نصب العین بنالیا۔ ہٹلر نے بھی اسی پارٹی کی رکنیت حاصل کر لی اور پھر اس نے اپنی شعلہ بیانی کا قائدہ اٹھاتے ہوئے ایسی تقریریں کیں کہ بغاوت کے مقدمے میں اس کو قید میں ڈال دیا گیا۔ اس اسیری کے دوران اس نے ایک معرکہ الآرا کتاب ”میری جدوجہد“ لکھی جو کہ نازی ازم کی بائبل کہلاتی ہے۔ یہیں ہے ہی نازی پارٹی کی ابتدا ہوئی جس کی رہنمائی ہٹلر نے خود شروع کی اور اسی پارٹی کے تحت ہٹلر نے جرمنی کو پھر سے ابھارنے اور جرمن قوم کو منظم کر کے کھڑی ہوئی عزت و ناموس کو واپس لانے کا مہم ارادہ کیا اور یہ شخص اپنی خدا داد قابلیتوں کی وجہ سے آہستہ آہستہ قوم کا اعلیٰ ترین رہنما بن گیا۔

### نازی ازم (Nazism) کی تعریف:

نازی ازم وہ سیاسی تحریک تھی جو جرمنی میں دوسری جنگ عظیم سے پہلے معرض وجود میں آئی۔ اگر ہم نام کا تجزیہ کریں تو یہ دو حصوں میں ایک لفظ ”نا“ اور دوسری (زی) کا مجموعہ ہے۔ جرمنی میں ایک سیاسی پارٹی نیشنل سوشلسٹ پارٹی بھی بنائی گئی تھی ”نا“ کا لفظ تو نیشنل سے لیا گیا۔ جرمن زبان میں سوشلز کے لفظ کو ’اُزی‘ کہتے ہیں تو ’زی‘ کا لفظ اس سے لیا گیا اور اس طرح لفظ Nazi معرض وجود میں آیا۔ یہ سیاسی تحریک آہستہ آہستہ کسی حد تک فوجی انداز اختیار کر گئی۔

### مارکسزم

کارل مارکس کی تعلیم اور فلسفے نے گزشتہ سو سال میں دنیا کی سیاست اور سیاسی فکر پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ مارکس اس زمانے میں پیدا ہوا جب یورپ اور خاص طور پر برطانیہ میں صنعتی انقلاب آگیا تھا اور کارخانے قائم ہو چکے تھے گھریلو دھندے اور دستکار ختم ہو گئی تھی۔ لوگ گاؤں چھوڑ کر کارخانوں اور کانوں میں کام کرنے کے لئے صحیحان شہروں کی طرف دوڑ رہے تھے۔ مزدوروں کو سولہ سے اٹھارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ مزدوروں کی تنخواہیں بہت کم تھیں وہ لوگ گندی بستیوں میں رہتے تھے۔ مرد عورت بچے سبھی کام کرنے پر مجبور تھے پیداوار کے اس نئے طریقے نے مزدوروں کے لئے بڑے سخت حالات پیدا کر دیے تھے۔ انہیں نئے معاشی نظام کی ذہنوں اور زیادتیوں کا سامنا تھا۔

ایسے حالات نے حساس لوگوں کو بڑا متاثر کیا۔ ایک نئے فلسفے اور ایک نئے رویے نے جنم لیا کہ پیداوار کے ذرائع قومی ملکیت ہوں نہ کہ ذاتی ملکیت! اس نظریے کے حامیوں کو سوشلسٹ کہا جاتا ہے۔ ان میں مارکس کی شخصیت نمایاں تھی۔ اس نے بتایا کہ مزدوروں کی خواری اور اذیت کی وجہ ذاتی منافع، مقابلہ اور عدم مداخلت کے اصول ہیں جن پر سرمایہ دارانہ نظام قائم

ہے۔ سائنس اور منطق کی بنیاد پر قائم اس کا سوشلزم سائنسی کہلاتا ہے۔ یہ دوسرے سوشلزموں سے جن کی بنیاد اخلاق، ابہام اور خیال پر تھی ان سے مختلف ہے۔

## سوشلزم

### (Socialism)

سوشلزم کی ایک ایک جامع اور قطعی تعریف کرنا بہت مشکل ہے۔ بقول اشوک مہتا سوشلزم کا فلسفہ جامع اور تغیر پذیر ہے۔ اس کی جھلک مختلف مکاتب فکر میں ملتی ہے۔

Peter Marki کے خیال میں اشتراکیت:

”مختلف سیاسی قوتوں اور مختلف مفکرین کے خیالات کا مجموعہ کا نام ہے۔ کوئی بھی اشتراکی شاید ان تمام خیالات اور نظریات پر بیک وقت یقین نہیں رکھ سکتا جو اشتراکیت میں شامل ہیں اور نہ کسی اشتراکی نے ماضی میں ایسا کیا ہے۔“

سوشلزم کی اصلاح ایک جامع تصور کے اظہار کے لئے کی جاتی ہے۔ جو مارکسزم نے بین الاقوامی سوشلزم، سنڈیکل ازم، اجتماعیت اور جمہوری سوشلزم وغیرہ کو محیط کیے ہوئے ہے۔ ان میں قدر مشترک پیداوار کے ذرائع کو سماجی ملکیت میں رکھنا ہے اور سرمایہ دارانہ معاشی تنظیم کو ختم کرنا ہے۔ مارکسزم پر گزشتہ باب میں بحث کی جا چکی ہے۔

فقیرانہ ازم اصلاحات پر زیادہ زور دیتا ہے اور جمہوریت قائم رکھنا چاہتا ہے۔ گلڈ سوشلزم کا نام قرون وسطی کے گلڈ سسٹم کی مناسبت سے رکھا گیا تھا۔ ہم پیشہ لوگوں کی انجمن کو گلڈ کہتے ہیں چنانچہ گلڈ سوشلزم موجود ٹریڈ یونین کو گلڈ کے طرز پر منظم کر کے ایک سوشلسٹ غیر مرکزی جمہوریت قائم کرنا چاہتا ہے۔ ہر ایک صنعت کی ایک انجمن ہوگی جس میں نفع کے کارکنان شامل ہوں گے۔ یہ انجمن صنعت کا انتظام کرے گی چیزوں کی لاگت اور قیمت فروخت کا تعین دوسری صنعتی انجمنوں کے تعاون سے کرے گی۔ ریاست کے اختیارات سیاسی امور تک محدود ہوں گے۔ انتخاب کی بنیاد علاقے کے بجائے پیشہ پر ہوگی۔ گلڈ سوشلزم جمہوریت اور پرامن تدریجی تبدیلی پر یقین رکھتا ہے۔

کسی سوشلزم:

کسی سوشلزم ایک انقلابی نظریہ ہے۔ یہ ارتقائی سوشلزم کو رد کرتا ہے۔ مارکسزم کے مانند کسی سوشلزم طبقاتی کشمکش اور ریاست کے خاتمے میں یقین رکھتا ہے۔ سوشلزم لانے کے لئے یہ راست کارروائی کی تلقین کرتا ہے چنانچہ ہڑتال، عام ہڑتال، مشینوں کی توڑ پھوڑ اور پیداوار میں

رشتہ داروں کے خاتم کر رہے ہیں۔ اپنے مقصد کے حصول کے لئے تشدد کا استعمال بھی جائز خیال کرتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق پوری صنعت اعلیٰ صنعت اور اعلیٰ حربہ کے ہاتھ میں ہوگی۔ دوسری قومی خدمات کے لئے بھی انجمنیں ہوں گی۔ گویا سماج کے تمام کام مزدوروں کی پوٹیں اور کارکنان کی انجمنیں انجام دیں گی۔

### اجتماعیت (Collectivism)

اجتماعیت یعنی ریاستی سوشلزم ایک ایسا نظریہ ہے جو سرکاری جمہوری طاقت کے لئے ذریعہ ایسے نظام کے قیام کے لئے کوشاں ہوتا ہے جس میں دولت کی پیداوار اور اس کی تقسیم بہتر ہو۔ یہ نظریہ ارتقائی جمہوری سوشلزم (جمہوری طریقوں) سے بتدریج آنے والا سوشلزم کا حامی ہے۔ یہ پارلیمانی اور آئینی طریقوں سے اشتراکی سماج کی تشکیل کرنا چاہتا ہے۔ یہ نظریہ ریاست کے کاموں اور اس کی ذمہ داریوں میں توسیع کا حامی ہے۔

اب تک کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ سوشلزم میں دو بڑے رجحان پائے جاتے ہیں ایک مارکسزم کا راست جو کلیت پسندانہ اور غیر جمہوری سوشلزم کا رجحان۔ اس میں جمہوری سوشلزم زیادہ پسندیدہ نظریہ ہے کیونکہ یہ جمہوری اور قانونی طریقوں کے ذریعے سرمایہ دارانہ سماج کو بدل کر اشتراکی سماج قائم کرنا چاہتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں خوش حالی اور افلاس افراط اور قلت موجود رہتی ہے۔ اور مزدوروں کا استحصال ہوتا ہے جبکہ جمہوری سوشلزم مساوات پر مبنی ایک جمہوری سماج بنانا چاہتا ہے۔ پیداوار کے اہم ذرائع سرکار کی تحویل میں لینا چاہتا ہے اور دولت کی بہتر تقسیم کر کے ایک منصفانہ سماج کی تشکیل چاہتا ہے جس میں افراد آزاد ہوں۔ انتخاب پارلیمان اور آزادی فکر و اظہار کی قدریں قائم ہیں۔

### جمہوری سوشلزم اور کمیونزم :-

دونوں میں اور کوئی بھی قدر مشترک نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کے مخالف ہیں۔ اور اسے رد کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ نظریات اور عمل میں دونوں ہیں۔ کمیونزم انقلابی نظریہ ہے تشدد کو انقلاب کا وسیلہ مانتا ہے طبقاتی کشش کو کمیونزم لانے کے لئے ضروری سمجھتا ہے جبکہ جمہوری سوشلزم ایک ارتقائی فلسفہ ہے جو بتدریج تبدیلی کا حامی ہے۔ تشدد کے بجائے انتخاب اور پارلیمان کے ذریعے سرمایہ داری ختم کر کے سوشلزم لانا چاہتا ہے یہ طبقاتی کشش کو بھی نہیں مانتا۔

جمہوری سوشلزم ریاست کو سماجی طبقات سے اوپر ایسا ادارہ مانتا ہے جو سماج میں مساوات اور انصاف قائم کر سکتا ہے۔ اس لئے ریاست کو ختم کرنے کے بجائے اس کو ایک مثبت ادارہ سمجھتا ہے۔

جمہوری سوشلزم کیونزم کے نظریے اور عمل کے کلیت پسندانہ پہلو کو بھی مسترد کرتا ہے۔ کیونکہ اس سے فرد کی آزادی محروم ہوتی ہے۔ یہ کیونزم کی پروٹار یہ آمریت اور ایک برائتی پسندی نظام کا سخت مخالف ہے۔

ڈیٹیل بیل کے بقول:

”جمہوری سوشلزم اس بات کو تسلیم کرنے کی علامت ہے کہ سماجی و معاشی نصب العین کی حیثیت سے سوشلزم کو جمہوریت کے تصور سے دونوں صورتوں میں الگ نہیں کیا جاسکتا خواہ جمہوریت کو بذات خود ایک مقصد سمجھا جائے یا حصول مقصد کا ایک ذریعہ“

## معاشی نظاموں کا تنقیدی جائزہ

ذیل میں ہم معاشی نظاموں کا تنقیدی جائزہ پیش کر رہے ہیں:

### سرمایہ داری نظام / کیپٹل ازم

سرمایہ داری نظام دنیا کے بہت سارے ممالک میں رائج ہے۔ یہ نظام اپنی ساخت و نوعیت اور ترکیب کے لحاظ سے منفرد خصوصیات کا حامل تصور کیا جاتا ہے۔

اس نظام کے تحت حکومت کا دائرہ کار محض دفاع، امن عامہ اور بین الاقوامی تعلقات کی حد تک محدود ہوتا ہے۔ لوگ اپنے معاشی عمل میں مکمل طور پر آزاد ہوتے ہیں۔ قانونی حدود کے اندر رہتے ہوئے ذرائع پیداوار کو بروئے کار لاتے ہیں اور پیداوار دولت کے قفل کو آزادانہ طور پر جاری رکھتے ہیں البتہ حکومت بعض اوقات معاشی پالیسیوں کے ذریعے پیداواری سرگرمیوں کی عملی ذرائع کے استعمال، صرف دولت اور سرمایہ کاری کا نرخ متعین کرتی ہے۔ تمام افراد کو نجی ملکیت اور کاروباری آزادی کے تمام مواقع میسر ہوتے ہیں۔

### تعریف:

عمرانی علوم کی لغت (Dictionary of Social Sciences) میں جدید نظام سرمایہ داری کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

”نظام سرمایہ داری کی اصطلاح ایک ایسے معاشی نظام کے لئے استعمال کی جاتی ہے جس میں معاشی زندگی کا زیادہ تر حصہ بالخصوص معاشی مقابلہ کے ذریعے پیداوار دولت کے لئے کی جانے والی سرمایہ کاری کی ملکیت نجی ہاتھوں میں ہوتی ہے۔“

## سرمایہ داری نظام کی خوبیاں

سرمایہ داری نظام دنیا کا قدیم ترین معاشی نظام ہے اور مختلف ممالک میں یہ لوگوں کے معاشی مسائل کو حل کرنے میں بہت مؤثر اور مفید ثابت ہوا ہے۔

### 1۔ افرادی قوت کا بھرپور استعمال:

اس نظام میں طلب اور رسد کی خوبیوں کی بدولت تمام افراد کے معاوضوں کا تعین آزادانہ طور پر ہوتا ہے چنانچہ ہر فرد زیادہ معاوضے کے حصول کے لئے اپنی استعداد کار کو بڑھاتا ہے۔ جتنی زیادہ وہ محنت کرتا ہے اتنا ہی معاوضہ وصول کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں فرد اپنی ترقی کے لئے اپنی تمام تر استعداد کار کو عمل میں لاتا ہے۔ اس طرح سے افرادی قوت کا بھرپور استعمال ہوتا ہے۔

### 2۔ آجرانہ صلاحیتوں سے استفادہ:

جس طرح سرمایہ داری نظام میں عام فرد اپنے بہتر معاوضے کے لئے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے اسی طرح آجر بھی زیادہ منافع کی خاطر کاروباری خطرات مول لیتے ہیں۔ وہ اپنے سرمائے کو داؤ پر لگاتے ہیں زیادہ منافع کے حصول کے لئے نقصان ہونے کے اندیشے کا بھی سامنا کرتے ہیں۔ اس طرح ملک میں بڑے بڑے کارخانے قائم ہوتے ہیں اور پوری معاشی ترقی کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

### 3۔ شخصی آزادی:

اس نظام میں شخصی آزادی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے یہ نظام جمہوری ممالک میں پایا جاتا ہے جہاں ہر فرد اپنی پسند ناپسند کا اظہار کر سکتا ہے۔ اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے اپنی رائے کا اظہار آزادی سے کرتا ہے۔ مارکیٹ میں مختلف النوع اشیاء ہوتی ہیں اور اپنی مرضی سے ان کا انتخاب کر کے خریدتا ہے اور غیر معیاری اشیاء کو رد کر دیتا ہے۔

### 4۔ سستی اور معیاری اشیاء کی فراہمی:

سرمایہ دارانہ نظام میں بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ایک ہی چیز کو تیار کرنے والے مختلف تاجرین کے درمیان مقابلہ ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کے لئے کوششیں کرتے ہیں کہ اشیاء کا معیار بلند ہو اور قیمت کم سے کم ہو۔

### 5۔ کارکردگی کے مطابق معاوضہ:

اس نظام میں ہر فرد کا معاوضہ اس کی قوت کار و استعداد کار اور قابلیت کے مطابق ہوتا

ہے۔ جس شخص میں جتنی زیادہ پیداواری صلاحیتیں ہوں گی اور جتنا وہ زمین و فہم اور ہنرمند ہوگا اتنا ہی اس کا معاوضہ زیادہ ہوگا۔

## 6- مستحکم معاشی نظام

یہ ایسا نظام ہے جو انسانی فطرت اور جبلت کے مطابق ہے اور اس کے فطری تقاضوں کے بعد تشکیل پاتا ہے اس لئے اس کی بنیادیں بہت گہری اور مضبوط ہیں۔ سینکڑوں سالوں سے لوگ اس کو اپنائے ہوئے ہیں اور اس کے تحت زندگی گزار رہے ہیں۔ حالت جنگ سیاسی انتشار معاشی ابتری، افراط زر اور بیروزگاری جیسے مسائل کے باوجود یہ نظام خود کار طریقے سے چل رہا ہے۔

## سرمایہ دارانہ نظام کی خامیاں

جہاں خوبیاں ہوتی ہیں وہاں ہر نظام میں کوئی نہ کوئی خامی یا خامیاں بھی ضرور ہوتی ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام بھی اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود خامیوں سے مبرا نہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں مندرجہ ذیل خامیاں پائی جاتی ہیں:

### 1- معاشی وسائل کا ناموزوں استعمال

سرمایہ داری نظام میں آجر زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کے لئے معاشی وسائل کا نامناسب اور غیر موزوں استعمال کرتے ہیں اور زیادہ منافع کے حصول کے لئے وہ تمام سماجی اور معاشرتی تقاضے بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر انہیں تمباکو کاشت کرنے اور سگریٹ تیار کرنے سے زیادہ منافع مل رہا ہو تو وہ اپنے سرمائے اور زمین کو گندم یا چاول کاشت کرنے کے لئے استعمال نہیں کرے گا۔ اس کے نتیجے میں معاشی وسائل ایک بے کار اور بے مقصد چیز تیار کرنے میں صرف ہوتے ہیں۔

### 2- اخلاقی بے راہ روی

اس نظام میں آجر زیادہ منافع اور اشیاء کی لاگت کم کرنے کے لئے عورتوں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی کام پر لگاتے ہیں جس سے معاشرے کا اخلاقی زوال شروع ہو جاتا ہے۔

### 3- فریبہ نشر و اشاعت

سرمایہ داری نظام میں آجر اپنی مصنوعات کی فروخت بڑھانے کے لئے ہر قسم کے ناجائز چمکنڈے استعمال کرتا ہے اور اپنی مصنوعات کو فروخت کرنے کے لئے ریڈیو ٹیلی ویژن اخبارات اور فلم کے ذریعہ بے پناہ پروپیگنڈا کرتا ہے جس پر ظاہر ہے کہ بہت سا روپیہ خرچ

ہوتا ہے چنانچہ ان اضافی اخراجات کی وصولی بھی وہ صارفین سے ہی کرتا ہے۔ مصنوعات معیاری نہیں ہونیں، نقص اور گھٹیا مال کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے جس سے سادہ لوح قسم کے لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں اور اپنے پیسے ضائع کر بیٹھتے ہیں۔

## اشتمالیت / کیونرزم

یہ نظام مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے مثلاً 'اجتماعیت'، 'خالص اشتمالیت'، 'آمرانہ اشتراکیت' اور مرکزی طور پر منصفیت سمیت بھی کہا جاتا ہے۔

اشتمالیت اور سرمایہ دارانہ نظام اپنی اپنی نوعیت، ہیئت اور ترکیب کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ یہ دونوں نظام ایک دوسرے کی ضد سمجھے جاتے ہیں۔ دونوں نظاموں میں بعد اثمر قین پایا جاتا ہے۔ یہ نظام کارل مارکس نے پیش کیا اور وہی اس کا بانی ہے۔

پس منظر:

دارن مارکس نے سرمایہ داری نظام کا بغور مطالعہ کیا اور یہ محسوس کیا کہ یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں 'امیر' امیر تر ہوتا چلا جاتا ہے اور 'غریب' غریب تر، ان کی جہد ذاتی ملکیت کا تصور ہے نتیجہ یہ نکالا کہ کیوں نہ سرے سے ذاتی ملکیت کا تصور ہی ختم کر دیا جائے۔ ہر چیز ریاست کی تحویل میں دے دی جائے اور ذرائع پیداوار سے ملنے والے منافع کو ریاست خود عوام میں تقسیم کرے۔ طبقاتی امتیاز ختم ہو جائے اور ایک فلاحی ریاست وجود میں آ جائے جس میں تمام افراد کو یکساں اور مساوی بنیادوں پر سہولیات فراہم ہوں۔

چنانچہ کارل مارکس نے اپنی کتاب "سرمایہ داری" میں اشتمالی ریاست کا تصور پیش کیا۔

## اشتمالیت کی خوبیاں

### 1- طبقاتی امتیاز کا خاتمہ / مساوات:

سرمایہ دارانہ نظام میں مختلف طبقے ہوتے ہیں، کچھ لوگ بہت امیر ہوتے ہیں اور کچھ دوسرے اور کچھ بہت ہی غریب ہوتے ہیں لیکن اشتمالی نظام میں طبقاتی امتیاز سرے سے ہوتا ہی نہیں۔ دولت کی تقسیم منصفانہ بنیادوں پر ہوتی ہے لہذا اشتمالی معاشرہ میں نہ تو کوئی بہت زیادہ امیر ہوتا ہے اور نہ ہی بہت زیادہ غریب!

### 2- معاشی تحفظ کی ضمانت:

اس نظام میں تمام افراد کو یکساں طور پر معاشی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ بنیادی ضروریات

زندگی حکومت مہیا کرتی ہے جس کی بدولت ہر شخص عزت و وقار سے زندگی بسر کرتا ہے۔

### 3- معاشرتی مساوات:

اشتمالی نظام میں چور بازاری، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی اور رشوت سے دولت کے انبار جمع کرنے کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔ دولت چند لوگوں کی ملکیت نہیں ہوتی اس لئے لوگوں میں احساس بحرو پیدا نہیں ہوتا لہذا معاشرہ اونچے نیچے اور سامی برائیوں سے پاک رہتا ہے۔

### 4- ذرائع پیداوار کا بھرپور استعمال:

اشتمالیت میں قدرتی طور پر انسانی ذرائع پیداوار کا بھرپور استعمال کیا جاتا ہے۔ تمام معاشی منصوبہ بندی حکومت کرتی ہے لہذا ضیاع کے امکانات کم ہوتے ہیں اور پیداوار میں اضافہ بھرپور طریقے سے ہوتا ہے۔

### 5- نجی اجارہ داری کا خاتمہ:

سرمایہ دارانہ نظام میں بڑے بڑے سرمایہ دار غلط قسم کے استحکام استعمال کر کے نجی اجارہ داریاں قائم کر لیتے ہیں حالانکہ کہا یہ جاتا ہے کہ طلب و رسد کی قوتیں بالکل آزاد ہوتی ہیں۔ اشتمالی نظام میں اشیاء کی طلب و رسد اور قیمت کا تعین حکومت کرتی ہے لہذا نجی اجارہ داریاں قائم ہی نہیں ہو سکتیں۔

### 6- معاشی آزادی کا خاتمہ:

منصوبہ بندی بورژوا افراد کو مختلف پیشوں میں تقسیم کرتے ہیں اور بورژوا کی اجازت کے بغیر کوئی شخص اپنا پیشہ تبدیل نہیں کر سکتا۔ انفرادی طور پر پیشہ کے انتخاب کی آزادی فرد کو نہیں ہوتی۔ یہ صورت حال عام طور پر معاشی ترقی کے لئے سودمند نہیں ہوتی۔

### 7- معاشی استحکام:

اشتمالی معیشت میں افراط زر، افراط آبادی، بے روزگاری یا معاشی پسماندگی جیسے مسائل پیدا نہیں ہوتے۔ اشتمالی معیشت میں اتار چڑھاؤ نہیں ہوتا۔

## اشتمالیت کی خامیاں

اشتمالی نظام معیشت میں مندرجہ ذیل خامیاں واضح طور پر نظر آتی ہیں:

### 1- معاشی حقوق سے محرومی:

اشتمالیت میں افراد کی حقیقی صلاحیتوں کو زندہ لگ جاتا ہے کیونکہ انہیں وہی کام کرنا پڑتا



ہے جو حکومت ان کے ذمے لگا دیتی ہے مثلاً ایک آدمی انجینئر بننا چاہتا ہے مگر منصوبہ بندی بورڈ کہتا ہے کہ ڈاکٹر کی ضرورت ہے تو اسے ڈاکٹر ہی بننا پڑے گا جس کے نتیجے میں اس میں فرد کی رضا شامل نہیں ہوگی نتیجتاً وہ پورے ذوق و شوق سے کام نہیں کرے گا لہذا وہ ڈاکٹری کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ نہیں کر پائے گا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ اس کی تخلیقی صلاحیتیں ختم ہو جائیں گی۔

## 2۔ غیر فطری نظام:

سرمایہ دارانہ نظام کے حامی اشتہالی نظام کو اجتماعی قید خانہ سے تشبیہ دیتے ہیں جنہیں معاشی مساوات کے بدلے میں قواعد و ضوابط کا پابند کر دیا جاتا ہے جبکہ انسان فطری طور پر آزادی پسند ہے جس کی گنجائش اشتہالی نظام میں نہیں ہوتی۔

## 3۔ استعداد کار میں کمی:

ذاتی ملکیت کا احساس انسانی ضمیر میں شامل ہے لیکن اشتہالیت میں ذاتی ملکیت کا تصور ہی نہیں تمام افراد حکومت کے ملازموں کی طرح کام کرتے ہیں اور سرکاری کام میں ذاتی دلچسپی اور دلچسپی سے کام کرنے کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا چونکہ افراد ایک لگی بندی محفہ پر معمول کی طرح کام کرتے رہتے ہیں۔

## 4۔ صارفین کی اکتاہٹ:

اشتہالی معاشرے میں چونکہ تمام ذرائع پیداوار حکومت کے زیر اہتمام ہوتے ہیں اور حکومت جو کچھ اشیاء پیدا کرتی ہے اسی میں سے ہی انہیں خریدنا پڑتا ہے جس سے عوام کا حلقہ انتخاب بہت محدود ہوتا ہے اور ایک قسم کی اشیاء استعمال کر کے وہ اکتا جاتے ہیں جس سے ان کی زندگی میں روحانی اور دلکشی کم ہو جاتی ہے۔

## 5۔ استبداد کی نظام:

اشتہالی نظام ایک پارٹی نظام (One Party System) کے تحت کام کرتا ہے سیاسی آزادی نہیں ہوتی جس کی وجہ سے افراد کل کر اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتے اور انہیں حکومت کے ہر فیصلے پر سر کو جھکا کر پڑنا ہے جس سے لوگ سیاسی تھکن کا شکار ہو جاتے ہیں۔

## مخلوط معاشی نظام

مخلوط معاشی نظام اس وقت دنیا کے بیشتر ممالک میں رائج ہے اور اس کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کی مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ اشتہالیت اور سرمایہ دارانہ نظام دونوں

ایک دوسرے کی ضد ہیں بعد دونوں اپنی اپنی انتہاء پر ہیں یعنی اگر سرمایہ داری نظام میں ہر چیز نجی ملکیت میں ہے تو اشتہالی نظام میں حکومت کے تسلط میں لیکن ان دونوں کے برعکس مخلوط معاشی نظام ایک متوازن نظام ہے۔

## مخلوط معاشی نظام کی خوبیاں

### 1- تیز تر معاشی ترقی:

مخلوط نظام معیشت میں نجی آجر بھر پور سرمایہ کاری کرتے ہیں اور با اعتماد ہو کر مزایع نکالتے ہیں۔ اس سے ملک میں روزگار اور آمدنی کے مواقع بڑھتے ہیں۔

### 2- ضروریات زندگی کی فراوانی:

عوامی نجی ضروریات کا بہت خیال رکھا جاتا ہے اور انہیں بے پناہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ضروریات زندگی باسانی فراہم ہونے لگتی ہیں لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ نجی آجر ضرورت کی اشیاء فراہم کرنے میں ناکام رہتے ہیں تو حکومت خود ان کا انتظام کرتی ہے۔

### 3- غیر معاشی سرگرمیوں کا خاتمہ:

مخلوط نظام معیشت میں صارف کو ایسی اشیاء استعمال کرنے کی اور آجر کو ایسی اشیاء پیدا کرنے کی اجازت نہیں ہوتی جنہیں پیدا کرنے کی قانون منظوری نہیں دیتا۔ اس طرح سے صارف اور آجر دونوں ہی کی شخصی آزادی کو محدود بھی کر دیا جاتا ہے۔ اس سے غیر معاشی سرگرمیوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔

### 4- افرادی قوت کا بھرپور استعمال:

اس نظام میں افراد کو شعبہ منتخب کرنے کی اجازت ہوتی ہے جو لوگ سرکاری شعبوں میں جانا چاہتے ہیں وہ سرکاری ملازمت کر لیتے ہیں اور جو نجی کاروبار کرنا چاہتے ہیں وہ نجی شعبہ میں زندگی گزارتے ہیں۔ اس پیشے کا انتخاب چونکہ فرد کی اپنی رضا پر منحصر ہوتا ہے لہذا وہ اپنے اپنے میدانوں میں استعداد کار کا بھرپور مظاہرہ کرتا ہے۔

## مخلوط معاشی نظام کی خامیاں

جہاں یہ نظام خوبیوں کا حامل ہے وہیں اس میں مندرجہ ذیل خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔

### 1- نجی اور سرکاری شعبوں میں تنازعہ کیفیت:

اس نظام میں نجی اور سرکاری شعبے ایک مستقل تقاضا کی کیفیت میں رہتے ہیں اور نجی

شعبے، بالکل ان کو سرکاری شعبوں سے شفاعت رسانی ہے۔ دونوں شعبے ایک دوسرے سے تعاون پر آمادہ نہیں ہوتے اور اپنے اپنے مفادات کو حاصل کرنے میں لگے رہتے ہیں۔

2۔ سرکاری شعبہ کی پست کارکردگی:

نئی آجرا ہے جام اور مغذات کے تحفظ کے لئے کڑی نگرانی کرتے رہتے ہیں اور ملازمین کو سستی اور کاپالی کا شکار نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس سرکاری شعبے کے افراد یہ سمجھتے ہیں کہ کام ہوتا ہے جو انہیں ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتی جاتی ہے لہذا سرکاری اداروں میں بیداری کاموں کی رفتار بہت سست ہوتی ہے۔

۳- خودساخته اجاره داریابی:

مخلوط نظام معیشت میں چونکہ نجی آجری ہوتے ہیں اور وہ اپنے منافع کے حصول کے لئے سرکاری شعبہ کے آدمیوں کو خرید لیتے اور اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے ملکی قوانین کو توڑنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

اشتراکیت / سوشلزم

استراکیت اپنی اصل میں اشتراکیت ہی کا عکس ہے لیکن اشتراکی نظام کے حامی یہ کہتے ہیں کہ غلامی معیشت میں تبدیلی انقلابی نہیں بلکہ ارتقائی طریقے پر ہونی چاہئے۔ زمین اور تمام بنیادی وسائل سرکاری تحویل میں جانا چاہئیں۔ ذرائع پیداوار کا زیادہ تر حصہ علی حکومت کی تحویل میں ہونا چاہئے تاکہ دولت کی تقسیم منصفانہ بنیادوں پر ہو۔ تاہم اشیائے صرف کی پیداوار بھی شعبے کے ذریعے ہو لوگوں کے معاوضے میں ان کی اپنی قابلیت اور صلاحیت کا خیال رکھا جائے۔

151

اشتمالییت کا بانی کارل مارکس تھا جس نے 188۴ء میں "وقت" پاپی۔ بنیادی طور پر وہ ایک سہانی تھا۔ اس نے ایک ایسی سوسائٹی جس میں غریبوں کی ایک بڑی تعداد مراہم اور رؤسا کی غلامی و ستم سے ہاتھ دھو کر ان کی ہڈیوں کو کھنکھاتا ہو کر ان کی عقلیت و روح پر قابض ہو کر ان کو بے اختیار بنائے گا۔ اس سبب کا خود مشاہدہ کیا تھا۔ ان معاشی ماموروں کے خلاف اس نے دنیا میں ایک کامرست گھس اور طویل عرصے پر محیط کوشش کے بعد اشتمالی نظام پر اپنی شہرہ آفاق تصنیف "تہذیب (The Capital)" تخلیق کی جس میں نظام کا اشتمالی ڈھانچہ پیش کیا۔

1883ء میں ہارس نے وفات پائی اس وقت ویتنامیت اور اشتر اکیٹ ایک ہی معنوں میں مستعمل تھے۔ بعد میں دونوں الفاظ دو علیحدہ علیحدہ نظاموں کی نمائندگی کرنے لگے۔

جدید اشتراکیت جسے جمہوری اشتراکیت (Democratic Socialism) یا آزادانہ اشتراکیت (Liberal Socialism) کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے یا غیر مارکسی اشتراکیت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ نظریہ دراصل برطانیہ کی Fabine Socieity کے دانشوروں جارج برنارڈشا، مسٹر ٹی ویب اور گراہم والٹون نے دیا۔

اشتراکیت کا مقصد تبدیلی بذریعہ انقلاب نہیں بذریعہ ارتقاء تھی۔

تحریف:

اشتراکیت ایک ایسا نظریہ ہے جس کی زد سے بڑے پیمانے کی پیدائش کی اشیاء سرمایہ کو نجی تحويل میں رکھنے کی بجائے انہیں مجموعی طور پر پوری قوم کی ملکیت میں دیا جاتا ہے تاکہ مجموعی قومی دولت کی منصفانہ تقسیم عمل میں آئے اور ایسے کرتے ہوئے لوگوں کی شخصی آزادی اور اشیاء صرف کے استعمال کی آزادی برقرار رہے۔

## اشتراکیت کی خوبیاں

اشتراکیت میں مندرجہ ذیل خوبیاں پائی جاتی ہیں:

### 1- معاشی مساوات:

اشتراکی معاشرہ میں معاشی ناہمواریاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اگر نجی آجروں کو ذاتی کاروبار کرنے اور منافع کمانے کی اجازت ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ حکومت بھی سرکاری ملازمین کے لئے لیبر پالیسیوں کے تحت مراعات کا اعلان کرتی ہے چنانچہ نجی آجر اور سرکاری ملازم کی معاشی حیثیت میں کوئی نمایاں تفاوت باقی نہیں رہتا۔

### 2- معاشی تحفظ:

اشتراکی نظام میں اگر کسی فرد کے پاس نجی کاروبار کی استطاعت نہ ہو تو حکومت اسے روزگار فراہم کرتی ہے اور وہ عزت سے زندگی بسر کرتا ہے۔

### 3- فلاح عامہ:

اشتراکی معاشرے میں تمام لوگوں کو تعلیم، علاج اور روزگار حاصل کرنے کے مواقع یکساں طور پر میسر آتے ہیں معاشرتی فلاح و بہبود کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔

### 4- اجارہ داریوں کا خاتمہ:

چونکہ تمام بڑے بڑے ذرائع خود حکومت کے زیر انتظام پیش ہوتے ہیں لہذا نجی آجرین اجارہ داریاں قائم نہیں کر پاتے اور اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو بھی جائیں تو حکومت انہیں

اپنی تحویل میں لے لی ہے اس طرح صارفین نجی آجروں کی اجارہ داریوں سے بچ جاتے ہیں۔  
5- انسانی قدروں کی بالادستی:

اشتراکی معاشرے میں انسانی قدروں کا خیال رکھا جاتا ہے اور ان کا احترام کیا جاتا ہے۔ انسانیت کی معراج منافع نہیں بلکہ معاشرہ کی بھروسہ ہوتی ہے چنانچہ انسانیت کی قیام و بھروسہ مستعد اول قرار پاتی ہے۔

## اشتراکیت کی خامیاں

### 1- غیر مستعد انتظامیہ:

ذرائع پیداوار کے تمام بڑے بڑے ادارے چونکہ حکومتی احکام میں ہوتے ہیں جنہیں سرکاری افسران کنٹرول کرتے ہیں اور وہ زیادہ تر اپنی ذاتی ترقی کی فکر میں رہتے ہیں چنانچہ یہ لوگ اپنی نوکری مضبوط کرنے اور ترقی کے چکر میں کام کم کرتے ہیں اور دکھاوا زیادہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ان کی استعداد کار نجی آجروں کی مانند نہیں ہو سکتی۔

### 2- نجی آجروں کے خدشات:

نجی آجروں کا کام بہت محدود بنانے پر ہوتا ہے اور وہ کاروبار میں زیادہ سرمایہ نہیں لگاتے اور نہ ہی کاروباری خطرات مولیٰ لیتے ہیں نتیجتاً وہ کلبو کے بل کی طرح ایک ہی دائرے میں گھومتے رہتے ہیں۔ آخر کار ان کی تخلیقی صلاحیتیں دم توڑ دیتی ہیں۔

### 3- اشتہائیت کی راہ:

ذرائع پیداوار کا بڑا حصہ سرکاری کنٹرول میں ہوتا ہے اور نجی شعبہ محدود ہوتا ہے اس لئے کسی وقت بھی نجی شعبہ کو قسم کر کے تمام ذرائع پیداوار کو سرکاری ملکیت میں لایا جاسکتا ہے۔

### 4- صارفین کے لئے مشکلات:

سرمایہ داری نظام میں صارفین کی پسند و ناپسند کے مطابق عمل پیداوار ترتیب دیا جاتا ہے اور صارفین کی حکمرانی ہوتی ہے لیکن اشتراکی نظام میں اس طرح کے تصور کی کوئی گنجائش نہیں۔

## نظریہ افادیت

### (Utilitarianism)

17 ویں صدی عیسوی میں Richard Cumberland نے 1672ء میں شائع شدہ اپنے مضمون "Treatise on Natural Law" میں سب سے پہلے افادیت سے متعلق نظریات و خیالات کا اظہار کیا:

"Denied the rationalist doctrine of innate moral ideas and regarded general welfare as the highest good."

نظریہ افادیت کے مطابق:

"ہر شخص زندگی میں آرام اور خوشی کا متلاشی ہے اور تکلیف سے بچنا چاہتا ہے اس لئے ہر کام کو اس معیار سے جانچنا چاہئے کہ وہ خوشی میں اضافہ یا کمی کرتا ہے۔"

### نظریہ افادیت کا معنی و مفہوم:

نظریہ افادیت سے مراد ہے کہ ریاست کا وجود فرد کے لئے ہے نہ کہ فرد کا ریاست کے لئے اور یہ کہ حکومت اس خدمت سے کی جائے کہ وہ فرد کی مختلف خواہشات کی تسکین یا اس کے حقوق کا تحفظ فراہم کرے۔ ہر انسان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ خوشی اور مسرت کی تلاش کرے اور تکلیف سے دور رہے۔ افراد اور حکومت دونوں کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ جہاں تک ہو سکے خوشی کو زیادہ کریں اور تکلیف کو کم کریں۔ اس نظریہ کے حامیوں کا خیال ہے کہ کسی کام کی اچھائی اس افادہ سے متعین کی جاتی ہے جس سے زیادہ سے زیادہ افراد کو خوشی اور سکون حاصل ہو چنانچہ اس نظریہ میں لفظ "افادہ" کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور اسی بناء پر اسے "نظریہ افادیت" کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کا بنیادی اصول یہ ہے کہ "زیادہ سے زیادہ خوشی زیادہ سے زیادہ افراد کے لئے" اسی اصول کے تحت ریاست کی تنظیم عمل میں آنی چاہئے اور قوانین آئین اور اخلاق بھی اسی اصول کے تحت ہوں۔

### برمی بین تھم کے اغراض و مقاصد:

بین تھم کے خیال میں انگلستان کی حکومت ناجائز طور پر افراد کی آزادی میں مداخلت کرتی اور پارلیمنٹ غلط قسم کے قوانین وضع کرتی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ ان تمام امور میں نظریہ افادیت کے تحت اصلاح کی جائے اور اسے اس میں کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ اس نے اپنے

نظریہ کی بنیاد ”زیادہ سے زیادہ خوشی زیادہ سے زیادہ افراد کے لئے“ کے اصول پر رکھی۔ اس کا خیال تھا کہ قانون کسی مخصوص طبقہ کی خوشی کے لئے نہیں بننا چاہئے بلکہ افادہ کا اصول ہر معاشرتی معاملہ میں استعمال کیا جائے تاکہ عوام کو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو۔ قانون کی حج اطاعت عوام کی منشاء پر ہی منحصر ہو سکتی ہے۔

بین تھم نے افادہ کی تعریف یوں کی ہے:

”کسی مقصد کی وہ خاصیت جو فائدہ مسرت اچھائی یا خوشی پیدا کرتی ہے یا شرارت، تکلیف اور بُرائی کے وقوع کو روکتی ہے۔“

اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ افادہ سے مراد وہ اصول ہے جو کسی فعل کی تصدیق یا مذمت اس بناء پر کرتا ہے کہ اس فعل کا رجحان فرد کی خوشی کو زیادہ یا کم کرتا ہے۔ بین تھم کا کہنا ہے کہ خوشی کا تعین کرنے کے لئے غیر جانبدارانہ رہ یہ اختیار کرنا چاہئے اور کسی خاص طبقہ کی خوشی کو دوسرے کمزور افراد پر زبردستی نافذ نہیں کرنا چاہئے۔

بین تھم کا مقصد عوامی فلاح و بہبود کو فروغ دینا تھا۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ افادیت کا نظریہ معاشرتی مسائل اور خصوصاً آئینی اور قانونی اصلاحات کے لئے بڑا کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ اس نے برطانوی آئین میں کئی اصلاحات تجویز کیں۔ وہ واد الامراء اور بادشاہت جیسے اداروں کا مخالف تھا کہ یہ ادارے مفاد عامہ سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اس کے نزدیک آئینی بادشاہت یا محدود بادشاہت لوگوں کی زیادہ سے زیادہ خوشی کے سامان بہم نہیں پہنچاتی اس لئے وہ ان پر جمہوریہ کو ترجیح دیتا۔

سر ہنری:

Sir Henry Maine قانونی اور عدالتی اصلاحات کے میدان میں بین تھم کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مجھے ایسی کسی قانونی اصلاح کا علم نہیں جو بین تھم کے زمانہ کے بعد نافذ کی گئی ہو اور جس میں اس کے اثرات کا سراغ نہ ملتا ہو۔“

سٹورٹ مل کا نظریہ:

سٹورٹ مل کے خیال میں زیادہ سے زیادہ خوشی کا تعلق ہر فرد سے نہیں جیسا کہ بین تھم کا خیال ہے بلکہ اس سے مراد معاشرہ کی مجموعی خوشی ہے۔ ہر شخص کو چاہئے کہ وہ عوامی خوشی کے فروغ کی کوشش کرے کیونکہ انفرادی خوشی اور عمومی خوشی ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ مل نے سیاسی میدان میں اصلاح کی بعض اہم تجاویز پیش کیں جو درج ذیل ہیں:

1- وہ مفادات کے تحفظ کا زبردست مخالف تھا۔

- 2- اس نے برطانوی پارلیمنٹ میں اقلیتوں کی مناسب نمائندگی کے لئے مناسب نمائندگی (Pro-portional Representation) کے اصول کو اپنانے پر زور دیا۔
- 3- وہ عورتوں کے حقوق کا بڑا حامی تھا اور انہیں مردوں کی بالادستی سے آزاد کرانا چاہتا تھا۔

## نظریہ افادیت کی خوبیاں

اس نظریہ کی خوبیاں درج ذیل ہیں:

### 1- خوشی کا اصول:

یہ نظریہ بنیادی طور پر اخلاقی ہے۔ اس نے تمام سیاسی امور اور اداروں کی بنیاد خوشی کے اصول پر رکھی ہے کیونکہ یہی اصول افراد کے ہر کام میں صحیح اور یقینی رہنمائی کرتا ہے۔

### 2- افادہ کی خصوصیات:

اس نظریہ کے مطابق کسی چیز کی اس وقت تک کوئی قدر و قیمت نہیں جب تک اس کا تعلق کسی فائدہ سے نہ ہو یعنی کوئی چیز اپنی افادیت کے لحاظ سے ہی صحیح ہو سکتی ہے۔ حکومتیں صرف افراد کی بہبود و ترقی کو فروغ دے کر اپنے آپ کو صحیح ثابت کر سکتی ہیں۔

### 3- فلاح و بہبود:

یہ نظریہ انسانیت کی فلاح و بہبود کا مشن ہے۔ اس نے افادہ اور خوشی کے اصول کے تحت قانون سازی میں بہت سی اصلاحات پر زور دیا ہے اور سیاسی میدان میں عملی طور پر نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔

### 4- زندگی کی ٹھوس حقیقت:

یہ نظریہ خیالی اصولوں پر مبنی نہیں اس کے برعکس اس نے زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کا جائزہ لیا ہے اور تمام اصولوں اور نظریات کو خوشی اور تکلیف کے بغیر بے معنی قرار دیا ہے۔

## نظریہ افادیت کی خامیاں

نظریہ افادیت میں درج ذیل خامیاں بیان کی جاتی ہیں:

### 1- مادیت پر یقین:

اس نظریہ کی ایک خامی یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہ صرف مادیت پر یقین رکھتا ہے اور ہر معاملہ میں افادیت پر زور دیتا ہے حالانکہ انسان صرف مادی اور ظاہری خوشی پر یقین نہیں رکھتا بلکہ وہ دائمی اور روحانی خوشی کے حصول کی بھی کوشش کرتا ہے۔



## 2- یک رُخی انسانی فطرت:

انسان ہر کام صرف اپنی خوشی اور مسرت کے لئے ہی انجام نہیں کرتا وہ ہمیشہ خود غرض نہیں ہوتا بلکہ وہ دوسروں کا بھی خیال رکھتا ہے مزید برآں کسی کام کی تحریک میں خوشی اور تکلیف کے علاوہ دیگر عناصر بھی کار فرما ہوتے ہیں لیکن اس نظر پرچے نے انسانی فطرت کے صرف ایک ہی رُخ کا مطالعہ کیا ہے۔

## 3- اچھائی کا اندازہ:

اس نظریہ کے مطابق کسی چیز کی اچھائی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ کیا یہ فرد کی خوشی کا باعث بنتی ہے یا نہیں؟..... لیکن ہر فرد کے نزدیک خوشی کی نوعیت جدا گانہ ہوتی ہے۔ اس طرح ہر فرد کے لئے اچھائی کا معیار بھی ایک سا نہیں رہتا اور انفرادی اعتبار سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔

## 4- خوشی کا تعلق ذات سے:

خوشی کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ اس سے عمومی خوشی مراد لینا درست نہیں۔ ایک کام کسی کے لئے خوشی کا باعث ہو سکتا ہے لیکن دوسرے کے لئے نہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ تمام افراد کے لئے ایک ہی چیز خوشی کا باعث ہو۔

## 5- خوشی اور مسرت میں فرق:

اس نظریہ نے خوشی اور مسرت میں کوئی تفریق نہیں کی حالانکہ ان دونوں میں فرق ہے۔ مسرت عارضی ہوتی ہے اور خوشی زیادہ پائیدار اور مستقل ہوتی ہے اور اس کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔

## 6- خوشی کی نوعیت:

اس نظر پرچے نے خوشی کی نوعیت نہیں بلکہ مقدار کا ذکر کیا ہے۔ اس نے صرف خوشی کی کمی یا زیادتی میں فرق کیا ہے اعلیٰ اور ادنیٰ میں فرق نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ خوشی اعلیٰ خوشی قرار نہیں دی جاسکتی۔

## ماحول:

ان مفکرین کے تصورات کا جائزہ لینے کے بعد یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ اس نظریہ کا زیادہ تر تعلق سیاست سے ہے۔ وہ خوشی کے جذبات سے زیادہ افادیت کے اصول پر زور دیتے ہیں۔ وہ عام خوشی سے مراد عوامی فلاح و بہبود لیتے ہیں چنانچہ یہ نظریہ معاشرتی بہبود کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ بھلائی کا خواہاں ہے۔

اس نظریے نے موجودہ ریاستوں کی پالیسی پر نمایاں اثرات مرتب کئے ہیں۔

## اسلام کا معاشی نظام

اسلام دین فطرت ہے اس میں نسل آدم کی ہر طرح کی ضروریات کو پورا کرنے کے طریقے بیان کئے گئے ہیں۔

مولانا حفیظ الرحمن سیوہاروی اپنی کتاب ”اسلام کا اقتصادی نظام“ میں لکھتے ہیں: ”اسلام نے دور حاضر کی طرح یہ نہیں کیا کہ اول اقتصادی نظام کے نام سے ایک عنوان قائم کرنا اور اس کے تحت ایک خاص نظریہ یا چند مخصوص نظریے بیان کرنا اور پھر ان نظریوں کے پیش نظر مختلف ابواب میں اس کے نظام علمی و عملی پر بحث کر کے کسی مخصوص نام کے ساتھ اس کو موسوم کرتا لیکن اس نے ایسا کیوں نہیں کیا؟۔۔۔ صرف اس لئے کہ موجودہ دنیا کے جتنے اقتصادی نظام ہیں وہ عموماً انسانوں کے خود ساختہ ہیں اور ایسے فلسفہ پر مبنی ہیں جن میں روحانیت اور مذہب کو یا تو سرے سے نظر انداز کر دیا گیا ہے اور یا اس کی بنیاد روحانیت اور مذہب کی مخالفت پر قائم کر کے اس کو فلسفیانہ رنگہ میں ڈھال دیا ہے۔“

لیکن ان تمام نظریات کے برعکس اسلام کا نظام معیشت ایک ہمہ گیر فلسفہ پر قائم ہے جس کا نام اسلام ہے اور یہ صرف انسان کی معاشی بہبود کا ہی خیال نہیں رکھتا بلکہ اس کی حیات کے ہر پہلو خواہ وہ روحانی، مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی ہی کیوں نہ ہو کا خیال رکھتا ہے۔ اس کا مقصد دنیائے ارضی کی بہتری نہیں بلکہ نجات ابدی اور رضائے الہی ہے اس لئے وہ حیات انسانی کے ہر پہلو کے لئے ایک صالح نظام اجتماعی کا طالب ہے اور ان ہی شعبہ ہائے زندگی کا ایک شعبہ صالح معاشی نظام بھی ہے۔ اس کا نظام معیشت کوئی فلسفیانہ علم و فن نہیں بلکہ ایک مکمل نظام کا حصہ ہے جو دوسرے حصوں سے مکمل طور پر مربوط ہے۔

چنانچہ اسلام نے ”نظام اقتصادی“ سے متعلق چند اصول اور اساسی قوانین بیان کر دیئے ہیں جو یوم آخرت تک ہر عقل سلیم رکھنے والے کے نزدیک یکساں طور پر واجب العمل اور قابل قبول ہوں اور عہد نبوت و خلافت راشدہ نے وہ عدیم البشال عملی پروگرام پیش کیا ہے جس کے منظر و دست و دشمن یکساں طور پر ہیں۔

تقریب:

اسلام کے معاشی نظام سے مراد ”اخلاقی اور قانونی ضابطے ہیں جن کی بدولت صرف دولت، پیدائش دولت، تبادلہ دولت اور تقسیم دولت کی سرگرمیوں کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ یہ ضابطے انسان کے خالق عظیم نے بنائے ہیں ان ضابطوں پر کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔“

## اسلامی معاشی نظام کی خصوصیات

### 1- رضائے الہی کا حصول:

اسلامی معاشی نظام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ کوئی کام بھی اللہ کی رضا اور فشاء کے خلاف نہ ہو بلکہ ہر کام اس کی خوشنودی کے تابع ہوتا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے:

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ

”پس جب نماز پوری ہو جائے تو زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ تعالیٰ کے فضل (رزق) کو تلاش کرو۔“ یعنی جہد رزق بھی حکم خداوندی کے تحت ہو۔

### 2- بنیادی ضروریات کی فراہمی:

اسلامی نظام معیشت میں رزق کی فراہمی پاری آئین یا نفع خلوتی ذمہ داری نہیں ہوتی اس کی پشت پر احکام خداوندی موجود ہیں۔ خود اللہ پاک نے فرمایا ہے:

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا. (سورۃ ہود)

”اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کے رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لی ہے۔“

تمام انسانوں کا رزق اللہ تعالیٰ خود ہے۔

### 3- خود کفالت:

اسلامی معاشی نظام اس قدر عمدہ ہے کہ معاشرہ زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبے میں خود کفیل ہو سکتا ہے۔ پیدائش دولت کا عمل اتنے احسن طریقے سے ہوتا ہے کہ طبقاتی امتیاز بھی پیدا نہیں ہوتا اور ہر فرد خود کفیل ہو سکتا ہے۔

### 4- ارتکاف دولت کی ممانعت:

اسلامی معاشرہ میں نجی سرمایہ کاروں کے ہاتھ میں دولت کا ارتکاف نہیں ہونا چاہئے کیونکہ دولت اگر صرف چند افراد یا چند گھرانوں تک محدود ہو تو وہ نہ صرف عام شہریوں کے لئے نقصان دہ ہے بلکہ خود ان کے لئے بھی باعث ہلاکت ہوگی۔

قرآن شریف میں اس بارے میں واضح احکامات ہیں:

”اور جو لوگ خزانہ بنا کر رکھتے ہیں سونے اور چاندی کو اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سوان کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو جس روز کہ اس مال پر جہنم کی آگ دکھائی جائے گی پھر اس سے داغی جائیں گی ان کی پیشانیاں پہلو اور ان کی پیٹھ (اور کہا جائے گا) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے واسطے گڑ رکھا تھا اور چکھو مڑا سے گاڑنے کا۔“  
 ”انقرأ مساکین قرابت داروں اور یتیموں وغیرہ پر اللہ نے جو خرچ کرتے کا یہ طریقہ بتایا ہے اس لئے ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ مال و دولت صرف دولت مندوں تک محدود رہ جائے۔“  
 (سورۃ حشر)

### بہ معاشرتی فلاح و بہبود:

اسلام میں مال و دولت کو جمع کرنے کی خدمت کی گئی ہے اور معاشرتی ترقی و بہبود پر زور دیا گیا ہے۔ انفرادیت کے برعکس اجتماعیت کا درس دیا گیا ہے۔  
 ”کتاب حکمت قرآن پاک میں ارشاد ہے:  
 ”صدقات کسی اور کے لئے نہیں ہیں صرف فقیروں کے لئے اور مسکینوں کے لئے اور ان کے لئے جو صدقات کے وصول کرنے پر مامور ہیں اور ان کے لئے جن کے دلوں میں کلمہ حق کی آفت پیدا کرتی ہے اور ان کے لئے جن کی گردنیں (غلامی سے) آزاد کرانی ہیں اور قرض داروں کے لئے جو کہ قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں اور اللہ کی راہ میں صرف کرنے کے لئے (یعنی مجاہدین اور اعلاء کلمتہ اللہ میں مصروف رہنے والوں کے لئے) اور مسافروں کے لئے یہ اللہ کی جانب سے ٹھہرائی ہوئی بات ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔“  
 (سورۃ توبہ)

### 6- زکوٰۃ:

اسلامی معاشی نظام میں زکوٰۃ فرض کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی ادائیگی ہر صاحب مال پر فرض ہے۔ زکوٰۃ ان لوگوں کی مدد کے لئے ہے جو معاشی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں تاکہ وہ عزت سے زندگی بسر کر سکیں۔

واقموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ. (البقرہ)

”اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔“

وانفقوا فی سبیل اللہ ولا تلقوا بایدیکم الی التہلکۃ. (سورۃ البقرہ)

”اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو

(یعنی اتفاق فی سبیل اللہ سے رکنا خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے)۔“

## 7- قانون وراثت:

اسلامی نظام معیشت میں فوت ہونے والے کا اثاثہ اس کے ورثاء میں ان کے حقوق کے مطابق تقسیم ہونا چاہئے۔

## 8- میانہ روی:

اسلام نے میانہ روی اور اعتدال پسندی پر بہت زور دیا ہے حتیٰ کہ عبادت میں بھی اعتدال کا حکم دیا گیا۔ اسی طرح عام معاشرتی زندگی کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ بے تعیش زندگی تمہارے لئے باعث تباهی ہے۔ خرچ کرتے وقت میانہ روی سے کام لے لے جا اسراف نہ کرو۔ ”اللہ کے نیک بندے جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں۔“

## 9- سود کی ممانعت:

اسلام میں روپیہ پیسہ سے براہ راست روپیہ پیسہ کمانا منع ہے۔ اس لئے سودی کاروبار کو حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام سرمایہ کاری کو بوجھانے، گردش زر کو تیز کرنے اور اشیاء کے لین دین میں ربط پیدا کرنے کو اولین اہمیت دیتا ہے اس لئے قرآن شریف میں ہار اور سود کو حرام ٹھہرایا گیا ہے:

يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُزِيلُ الصَّدَقَاتِ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ. (بقرہ)

”اللہ تعالیٰ سودی کاروبار کو مٹاتا ہے اور صدقات و خیرات کو ترقی دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکر گزار گناہگار کو دوست نہیں رکھتا۔“

## 10- نجی ملکیت کا حق:

معاشرتی جدوجہد کے لئے جو احکام و اصول قرآن حکیم میں مرتب کر دیئے گئے ان کے مطابق جو شخص دولت کماتا ہے یا کسی حلال ذریعہ سے دولت حاصل کرتا ہے وہ شخص اس دولت کا مالک ہے۔

اسلامی معاشرتی نظام کی مندرجہ بالا خصوصیات کو پیش نظر رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام دنیا کے دیگر معاشرتی نظاموں سے اپنی ہیئت ترکیب اور ساخت کے اعتبار سے بالکل منفرد اور جدا ہے اور یہ کسی انسانی ذہن کی کاوش نہیں جس میں کسی غلطی کا احتمال ہو۔



# علم معیشت کے ارتقاء میں مسلم مفکرین کا کردار

## امام ابو یوسفؒ

امام ابو حنیفہؒ کی زندگی میں ان کے سیاسی مسلک اور حکومت کے ساتھ ترک تعاون (عدم تعاون) کی وجہ سے سلطنت عباسیہ اور حنفی مدرسہ فکر کے تعلقات نہایت کشیدہ ہو چکے تھے اور یہ اثر بعد میں اچھی خاصی مدت تک باقی رہا۔ ایک طرف اس مدرسہ فکر (حنفی مسلک) کے اکابر اپنے ترک تعلق پر جیسے رہے چنانچہ امام ابو حنیفہؒ کی وفات کے بعد ان کے نامور شاگرد زفر بن المدیل (م 158ھ) کو جب منصب قضاہ قبول کرنے پر مجبور کیا گیا تو انہوں نے بھی انکار کر دیا اور جان بچانے کے لئے جنگلوں میں روپوش ہو گئے۔ دوسری طرف منصور سے لے کر ہارون الرشید کے ابتدائی عہد تک سلطنت کا رجحان یہ رہا کہ اس مدرسہ فکر (مدرسہ حنفی مسلک) کے اثر کی مزاحمت کی جائے اور اسی بناء پر خلیفہ منصور اور اس کے جانشین یہ کوشش کرتے رہے کہ ملک کے نظام قانون کا جو خلاء ایک مدون قانون مانگ رہا ہے اسے کسی دوسری تدوین سے بھرا جائے۔ اس غرض کے لئے منصور اور خلیفہ المہدی نے بھی اپنے اپنے زمانوں میں امام مالکؒ کو سامنے لانا چاہا اور ان کے مسلک کو رائج کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اسی طرح ہارون الرشید نے بھی 174ھ میں حج کے موقع پر یہ خواہش ظاہر کی کہ ان کی کتاب الموطا کو ملک کا قانون بنا دیا جائے لیکن آخر کار اس مدرسہ فکر (مدرسہ حنفی مسلک) سے ایک ایسی طاقتور شخصیت اٹھی جس نے اپنی اعلیٰ قابلیت اور اپنے زبردست اثر و رسوخ سے سلطنت عباسیہ کے قانونی انتشار کو ختم کیا۔ حنفی فقہ کو ملک کا قانون بنایا اور سلطنت کو ایک آئین پر قائم کر دیا۔ یہ شخصیت امام ابو حنیفہؒ کے سب سے بڑے شاگرد امام ابو یوسفؒ کی تھی۔

آپ کا پورا نام یعقوب بن ابراہیم بن حبیب تھا۔ آپ کی کنیت ابو یوسف تھی اور اسی کنیت سے ان کو شہرت لازوال نصیب ہوئی۔ آپ کی پیدائش 113ھ بمطابق 731ء میں کوفہ میں ہوئی جو ان دنوں علم و عرفان کا منبع کہلاتا تھا۔ آپ کے والد ماجد ابراہیم مالی لحاظ سے بہت

کمزور تھے۔ مگر بھر کی کفالت کا بوجھ بڑی مشکل سے برداشت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ابو یوسفؒ کو چھوٹی عمر میں محنت و مشقت کرنا پڑی۔ جب ابو حنیفہؒ کی شاگردی میں آئے تو ابو حنیفہؒ نے ان کی اور ان کے خاندان کی کفالت کا ذمہ اٹھا لیا۔ جب تک وہ زندہ رہے امام ابو یوسفؒ کی دل کھول کر امداد کرتے رہے۔ آپ امام ابو حنیفہؒ کی شاگردی میں 29 سال رہے۔ آپ بڑے زاہد و عابد تھے اور کثیر تعداد میں اسلامی کتب کے مصنف بھی تھے۔ ان کی چند مشہور تصانیف کے نام یہ ہیں:

- 1- کتاب الآثار
- 2- اختلاف ابن ابی لیلیٰ
- 3- کتاب الخراج
- 4- مالی
- 5- کتاب اختلاف (علماء) اصحاب
- 6- کتاب الروعی مالک بن انس
- 7- کتاب الجوامع
- 8- اصول فقہ
- 9- مسائل

## امام ابو یوسفؒ معاشی افکار

جہاں تک آپ کے معاشی افکار کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں آپ کی تصنیف ”کتاب الخراج“ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے مطالعہ سے آپ کے معاشی افکار با آسانی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ آپ نے یہ کتاب خلیفہ ہارون الرشید کی فرمائش پر سپرد قلم کی تھی۔ اس کی وجہ تحریر کے متعلق خود ابو یوسفؒ رقمطراز ہیں:

”امیر المومنین نے (اللہ ان کی مدد فرمائے) مجھ سے ایک جامع تحریر طلب کی ہے جس کو وہ خراج، عشر، صدقات، زکوٰۃ اور جزیہ کی تحصیل میں اپنا دستور العمل بنا سکیں اور جو ان دوسرے امور میں بھی ان کی رہنمائی کر سکے جن پر غور و فکر اور عمل کرنا ان کی ذمہ داری ہے۔ اس تحقیق سے امیر المومنین کا فضاء یہ ہے کہ اپنی رعایا پر سے ہر طرح کے ظلم کا ازالہ کریں اور ان کے معاملات درست فرمائیں۔“

### 1- ترقیاتی منصوبوں کی لاگت بیت المال سے کرنا:

امام ابو یوسفؒ نے اپنی تصنیف ”الخراج“ میں تحریر کیا ہے کہ:

i- میں نے خلیفہ ہارون الرشید کو بڑے بڑے منصوبے شروع کرنے کا مشورہ دیا اور یہ بھی کہا کہ ان کے اخراجات بیت المال سے ادا کئے جائیں۔ میں نے یہ بھی مشورہ دیا کہ جب خراج وصول کرنے والے آفیسر آپ کے پاس آ کر شکایت کریں کہ قدیمی نہریں بے کار ہو گئی ہیں جس کی وجہ سے زمین بھی بیکار ہوتی جا رہی ہے اور اگر ان نہروں کی از سر نو کھدائی کروادی جائے تو پانی آنے پر بے کار زمین پھر سے آباد ہو کر پیداوار دینی شروع کر دے گی، عوام خوشحال ہو جائیں گے، خراج بھی وصول ہوتا شروع ہو جائے گا تو آپ ان پر عمل کرتے ہوئے تمام اخراجات بیت المال سے ادا کرنے کا حکم جاری فرما دیں کیونکہ عوام کا خوشحال ہونا ان کے برباد ہونے سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ اگر عوام برباد ہو جائیں گے تو خراج ادا کرنے کے قابل نہ رہیں گے جو کہ حکومت کے لئے نقصان دہ ہے۔

ii- نیز یہ بھی مشورہ دیا کہ سواد کے باشندوں کو اگر اپنی بڑی نہروں کی کھدائی اور بھل صفائی کی ضرورت پیش آئے جو دریائے دجلہ و فرات سے نکالی گئی ہیں تو آپ ان کی ضرورت کے مطابق بھل صفائی کھدائی کروادیں اور اس پر ہونے والے اخراجات بیت المال اور اہل خراج دونوں پر ڈال دیں۔ سارا بوجھ اہل خراج پر ڈالنا ٹھیک نہیں۔

iii- وہ چھوٹی چھوٹی نہریں کھالے جو عوام کے کھیتوں، باغات، نخلستان، انگور کے باغوں، ترکاریوں کے کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں ان کے اخراجات وہ لوگ خود برداشت کریں اور یہ خرچ بیت المال سے ادا نہ کیا جائے۔

iv- دجلہ و فرات پر جو گھاٹ بند (ڈیم) اور پانی نکالنے کی جگہیں ہیں ان کی تعمیر و مرمت کرائی جائے اور اخراجات بیت المال سے ادا کئے جائیں۔ ان کا بوجھ کسی صورت میں اہل خراج پر نہ ڈالا جائے کیونکہ یہ تمام ذرائع مسلمانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی تمام تر ذمہ داری امام (خلیفہ) کی ہے۔

v- ان تمام امور کی تعمیر و مرمت اور منصوبوں کی تکمیل کے لئے ایمان دار نیک لوگوں کی ایک کمیٹی بنائی جائے جو ان منصوبوں پر کام کی نگرانی اور اخراجات کا اختیار اپنے ایسے افراد کے ہاتھوں میں دے جو مسلک میں یکے دیا نندار امانت دار خوف خدا رکھتے ہوں جو اللہ کی رضا جوئی کے لئے کام کریں۔ اگر اس سلسلہ میں مکمل چھان بین کے بغیر یہ کام لوگوں کو کرنے کی اجازت دی جائے تو ایسے لوگ بیت المال کا روپیہ اپنے اور اپنے ملنے والوں میں بانٹ دیں گے جس کا جواب خلیفہ کو دینا ہو گا۔



## 2۔ خراج کی شرح:

امام ابو یوسفؒ کا معاشی خیال تھا کہ متعین مقدار غلہ یا درہم کی شمس میں خراج عائد کرنے سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں بیت المال کی آمدنی گھٹ جاتی ہے اور اہل خراج کو بھی ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کا موقع ملتا ہے۔ جب غلہ سستا ہوگا تو خراج میں لئے جانے والے غلہ کی متعین مقداریں ریاست کے لئے کفایت نہیں کریں گیں لیکن ان مقداروں میں اضافہ دشوار ہوگا۔ جب غلہ مہنگا ہوگا تو کاشت کاروں پر بے جا بار پڑے گا اور ریاست متعین مقدار میں تخفیف کے لئے آمادہ نہ ہوگی نتیجہ کے طور پر کاشت کاروں میں اپنی زمینیں چھوڑ کر چلے جانے کا رجحان ہوگا۔ قاضی امام ابو یوسفؒ نے ”نظام المقاسمہ“ یعنی پیداوار میں ایک متعین نسبت کے شرکت کا اصول اپنایا اور تجویز پیش کی کہ یہی طریقہ درختوں، انگوروں کی بیلوں والی زمین، بھجوروں کے لئے بھی اختیار کیا جائے۔ آپ نے کاشت کاروں کے ساتھ بٹائی (مقاسمہ) کی نئی شرحیں تجویز کیں جو خلیفہ مہدی کی مقرر کردہ شرحوں سے اگلی ہیں۔ اس سلسلہ میں جو شرحیں امام ابو یوسفؒ نے تجویز کیں تھیں کچھ اس طرح ہیں:

i۔ دجلہ و فرات کے پانی سے سیراب ہونے والی زمین جہاں قدم اور جو پیدا ہوتے ہیں وہاں سے  $2/5$  حصہ خراج لیا جائے۔

ii۔ کنوؤں سے سیراب ہونے والی زمینوں سے  $3/10$  حصہ خراج لیا جائے۔

iii۔ بھجور، انگور و دیگر باغات پر  $1/3$  حصہ خراج مقرر کیا جائے۔

مندرجہ بالا شرحوں کی روشنی میں امام ابو یوسفؒ کی رائے میں زمین پر خراج مقرر کرنے انصاف کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا کیونکہ ایسا کرنے سے کبھی رعایا کو نقصان ہوگا تو کبھی حکومت کو۔ اس سے شراکت کا طریقہ کہیں بہتر ہے۔ وہ شرکت کے طریقے کو دونوں پارٹیوں (حکومت و رعایا) کے لئے مفید قرار دیتے ہیں۔

## 3۔ تحصیل محاصل کے اصول:

امام ابو یوسفؒ اپنی کتاب امالی میں تحصیل محاصل کے پانچ اصول بیان کرتے ہیں جن کا ترجمہ نجات اللہ صدیقی نے اپنی کتاب ”اسلام کا نظام محاصل“ میں یوں کیا ہے:

i۔ تمام محصولات کی شرح کا تعین مرکزی حکومت کرے۔

ii۔ یہ شرحیں ایسی ہوں کہ خرابی یا محصول ادا کرنے والوں کی قوت برداشت سے زیادہ نہ ہوں۔

iii۔ مقامی افسران کو اس میں اضافہ کرنے یا کمی پا کوئی اور طریقہ وصولی اپنانے کا اختیار نہ ہو۔

- iv- عام رعایا سے کسی قسم کے نذرانے، تحائف، دعوتیں لینے کی سخت سے ممانعت ہو۔
- v- محصول کی وصولی میں نرمی اور اخلاق کا استعمال ہو۔
- vi- محصولات فصل تیار ہوتے ہی وصول کر لئے جائیں تاکہ غلہ کھیتوں میں بڑا خراب نہ ہو۔
- vii- وصولی کے وقت ٹاپ تول کے پیمانے ٹھیک اور درست ہونے چاہئیں۔
- viii- تمام خراج کی تقسیم بھی پانچوں کے ذریعے کی جائے نہ کہ اندازے سے تاکہ کسی کو نقصان نہ پہنچے۔
- ix- خراج اور محصولات کی وصولی میں مارپیٹ سے کام نہ لیا جائے۔
- x- وصول کے کام پر دیانت دار اور خدا خوفی رکھنے والے افسران مقرر کئے جائیں۔
- xi- وصولی کرنے والے عملہ کو معقول معاوضہ ادا کیا جائے۔ جو ان کی اپنی ضروریات یا آسانی پوری کر سکے۔ اس کا یہ فائدہ ہو گا کہ وہ بددیانتی نہیں کریں گے۔
- xii- عاملین محصولات پر کڑی نگرانی رکھی جائے۔
- xiii- اگر کوئی عامل یا افسر بددیانتی کا مرتکب ہو تو اسے دوبارہ پھر کبھی اس کام پر نہ لگایا جائے۔
- xiv- خراج ادا کرنے والوں سے کسی قسم کا زائد خرچہ جیسے عاملین کی اجرت، بار برداری کے اخراجات، بار دانہ کا خرچہ، اناج اکٹھا کرنے والوں کے قیام و طعام جیسے اخراجات وصول نہ کئے جائیں۔
- xv- بار برداری میں اگر اناج میں کچھ کمی بیشی ہو جائے تو اس کو اہل خراج یا عام کاشتکار پر نہ ڈالا جائے۔
- xvi- خراج ادا کرنے والوں پر حکومت اپنا ہنگامی خرچ کا بوجھ نہ ڈالے۔

#### 4- ضرب محاصل کے اصول:

- امام ابو یوسفؒ اپنی کتاب ”الخراج“ میں ٹیکس عائد کرنے کے مندرجہ ذیل اصول بیان کرتے ہیں:
- i- ”لوگوں سے صرف زائد از ضرورت اموال پر ٹیکس عائد کیا جائے۔“
- ii- ان کی رضامندی سے ان پر بار ڈالا جائے۔
- iii- کسی پر اس کی قوت برداشت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے۔
- iv- ٹیکس مال داروں سے لیا جائے اور غریبوں پر خرچ کیا جائے۔
- v- محاصل کی تشخیص اور ان کی شرح کے تعین میں ایک بات کا پورا خیال رکھا جائے کہ

حکومت لوگوں کا خون نہ چس لے۔

vi- ٹیکس وصول کرنے میں ظالمانہ طریقوں سے کام نہ لیا جائے۔

vii- از روئے قانون مقرر کئے ہوئے ٹیکسوں (عوامل) کے سوا کسی قسم کے ناجائز ٹیکس نہ

حکومت لے اور نہ مالکان زمین اپنے عاقلوں کو لینے دیں۔

viii- جو ذی مسلمان ہو جائیں ان سے جزیہ نہ لیا جائے۔ اس سلسلے میں امام صاحب خلفائے

راشدین کے طرز عمل کو بطور نمونہ نظیر پیش کرتے ہیں۔

## 5- بیت المال:

امام ابو یوسفؒ بیت المال کو بادشاہ کی ملکیت کی بجائے خدا اور خلق خدا کی امانت قرار

دیتے ہیں اور خلیفہ کو متعدد مواقع پر حضرت عمرؓ کے وہ اقوال سناتے ہیں جن میں انہوں نے کہا

ہے کہ حکومت کے خزانے کی حیثیت خلیفہ کے لئے ایسی ہے جیسے دینی خیم کے لئے خیم کے مال

کی حیثیت ہوتی ہے۔ اگر وہ غنی ہو تو اسے قرآن کی ہدایت کے مطابق مال خیم میں سے کچھ نہ

لینا چاہئے۔ فی سبیل اللہ اس کی جائیداد کا انتظام کرنا ہے اور اگر وہ حاجت مند ہو تو معروف

طرز سے اتنا حق الخدمت لینا چاہئے جسے ہر شخص جائز تسلیم کرے۔

حضرت عمرؓ بیت المال سے خرچ کرنے میں اس سے بھی زیادہ احتیاط برتتے تھے جتنی

کوئی شخص اپنے مال سے خرچ کرنے میں برتا ہے۔ بیت المال کے مال کو بے دردی سے نہ

خرچ کرنا چاہئے۔ یہ یتیموں، یتیموں، یتیموں، یتیموں، یتیموں کا مال ہے۔

## 6- زمین کا بندوبست:

امام یوسفؒ زمین داری کی اس قسم کو حرام قرار دیتے ہیں جس میں حکومت کا شکاروں

سے مال گزاری وصول کرنے کے لئے ایک شخص (نمبردار، تعلقہ دار) کو ان پر زمیندار بنا کر بٹھا

دیتی ہے اور اسے عملاً یہ اختیار دے دیتی ہے کہ حکومت کا لگان ادا کرنے کے بعد باقی جو کچھ

جس طرح چاہے کاشت کاروں سے وصول کرتا رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ رعیت پر سخت ظلم ہے

مالک کی بربادی کا سبب ہے۔ حکومت کو یہ طریقہ بھی اختیار نہ کرنا چاہئے۔

امام ابو یوسفؒ کے معاشی افکار میں یہ بات بھی اہم ہے کہ وہ اس طریقہ کو بھی قطعی حرام

قرار دیتے ہیں کہ حکومت کسی کی زمین لے کر کسی کو بطور جاگیر دے دے۔ کہتے ہیں کہ امام

(خلیفہ) اس کا مجاز نہیں ہے کہ مسلمان یا دمی کی زمین اس کے قبضے سے لے لے۔ جب تک

کہ از روئے قانون اس پر کوئی ثبوت یا معروف حق واجب نہ آتا ہو۔ من مانے طریقوں پر

لوگوں کی ملکیتیں چھین کر دوسروں کو عطا کرنا ان کے نزدیک ڈاکہ مار کر قبضہ کرنے کا ہم معنی

ہے۔

امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ زمین کے عطیے صرف اس صورت میں جائز ہیں جبکہ غیر آباد اور غیر مملوکہ زمینیں یا لاوارث متروکہ ارضی آبادکاری کی اغراض کے لئے یا حقیقی اجتماعی خدمات کے صلے میں انعام کے طور پر معقول حد کے اندر دی جائیں۔ اس طرح کا عطیہ بھی جس شخص کو دیا جائے وہ اگر تین سال تک اس کو آباد نہ کرے تو اس سے واپس لے لیا جانا چاہئے۔

قاضی صاحب نے اس بات پر زور دیا ہے کہ عاقلین صدقہ و ذکوۃ یا تحصیل جزیہ و خراج پر ایسے افراد کو مقرر کیا جائے جن کی سیرت اچھی اور کردار قابل اعتماد ہو۔ ان کا خیال ہے کہ غیر ذمہ دار والی سرکار اموال کو خود کھاتے ہیں اور اپنے حاشیہ نشینوں کو کھلاتے ہیں۔ خراج وصول کرنے کے لئے خوشامدی افراد کو مقرر کرتے ہیں۔

قاضی ابو یوسف نے تجویز پیش کی ہے کہ والی کے ساتھ ایک فوجی دستہ مقرر کیا جانا چاہئے جو خلیفہ کا وقادار اور قابل اعتماد ہو۔ یہ دستہ فوج کے صالح، صاحب فہم اور خوش حال افراد پر مشتمل ہونا چاہئے۔ اس سے تحصیل میں سہولت پیدا ہوگی اور عمال خراج کی دست درازیوں اور خیانتوں سے اجتناب کریں گے۔ خراج کے محصل اور صدقے کے محصل کا حساب علیحدہ علیحدہ رکھنا چاہئے۔ آپ نے اہل جزیہ و خراج کے ساتھ نرمی کا سلوک کرنے کی تاکید کی ہے۔ ان لوگوں سے حقے تحائف، عذرانے، ہرکاروں کی اجرت (یعنی TADA) کاغذات کی قیمت، ہار برداری کے اخراجات وغیرہ کے نام پر جو ناجائز رقوم وصول کی جاتی ہیں ان کی قطعی ممانعت ہونی چاہئے۔ افسران حکومت کے طرز عمل کی جانچ پڑتال اور ان کے احتساب کے لئے خصوصی عملہ (شاف) مقرر کیا جانا چاہئے۔ یہ عملہ (شاف) ملک میں دورہ کر کے خراج کے عاملوں اور والیوں کے طرز عمل کا جائزہ لے لے اور جائزہ رپورٹ خلیفہ کو دے اور خلیفہ کو باخبر رکھے۔ خلیفہ کو مظالم کے خلاف درخواست کی سماعت خود کرنی چاہئے تاکہ جیلے میں خوف و رعب پیدا ہو اور وہ فلاح کاریوں سے باز رہیں۔

قاضی صاحب نے لکھا ہے کہ سرکاری غلے کی حفاظت کی جانی چاہئے۔ غلے کی تولائی، صفائی، تولائی کے کام میں تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔ غلے کو زیادہ دن کھلیاؤں میں پڑا رہنے نہیں دیا جانا چاہئے۔ حکومت کا حصہ وصول کرنے کے لئے پیداوار کی مقدار اندازہ کے ذریعے متعین نہ کی جائے بلکہ ٹاپ تول کے ذریعے اس کی ٹھیک ٹھیک مقدار معلوم کرنی چاہئے۔ کسی فرد کے ساتھ افراط و تفریط کا سلوک نہیں ہونا چاہئے۔ سرکاری حصہ وصول کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کل پیداوار فروخت کر کے قیمت میں سے حکومت کا حصہ نقد وصول کر لیا جائے یا قیمت کا حصہ نقد تحفہ کرا کے اس کے مطابق حکومت کا حصہ لے لیا جائے۔

کتاب الخراج دراصل امام ابو یوسف کی ایک غویں یادداشت ہے جو انہوں نے خلیفہ ہارون الرشید (170ھ سے 193ھ) کے لئے لکھی تھی۔ خلیفہ بننے کے بعد اس نے رعایا پر نرمی

کرنے اور عدل کے ساتھ شریعت کے مطابق حکمرانی کرنے کا ارادہ کیا اور اس سلسلے میں قاضی ابو یوسفؒ سے رہنمائی چاہی۔ اُس نے قاضی صاحب سے علقہ انتظامی اور مالی امور سے متعلق سوالات کئے تھے اور نظام محاصل کے بارے میں شریعت کے ضوابط دریافت کئے تھے چنانچہ قاضی صاحب نے ”الخراج“ کے نام سے ایک جامع اور مفصل کتاب مرتب کر دی۔

وفات:

امام ابو یوسفؒ 171ھ میں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) مقرر کئے گئے تھے اور 183ھ میں آپ وفات پا گئے۔ کتاب الخراج اسی دوران کی تصنیف ہے جو شہرہ آفاق ہے۔

### امام ابو عبیدہ القاسمؒ

امام ابو عبیدہ القاسم بن سلام الہرویؒ ایک عالم قرآن اور فقیہ تھے۔ آپ کی پیدائش 154ھ میں یا اس کے قریب ملک خراسان کے شہر ہرات میں ہوئی۔ آپ کے والد دوس میں غلام تھے امام ابو عبیدہ القاسمؒ نے اپنا پہلا سبق اپنے والد سے حاصل کیا۔ جوانی کے عالم میں علم حاصل کرنے کے شوق میں بصرہ اور کوفہ کا سفر اختیار کیا۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے اسلامی خلافت کے شروع کے دور کے اساتذہ سے علم فقہ حدیث ادب اور دینی علوم مکمل کئے۔ اسی سرزمین پر آپ نے کئی مناظرے کئے اور ان کی وجہ سے سنی عالم دین اہل تشیع کے مقابل میدان میں نکل کھڑے ہوئے۔ کچھ عرصہ وہاں گزارنے کے بعد آپ واپس خراسان تشریف لائے اور ایک فوجی گھرانے میں اتالیق مقرر ہوئے (اسی گھرانے نے 191ھ میں صوبہ کی گورنری سنبھالی تھی) لیکن آپ کو زیادہ عرصہ یہاں پر نہ رہنا پڑا بلکہ بہت جلد ایک شخص طاہر بن اکسین کی سفارش پر علاقہ طرطوس کا قاضی مقرر کر دیا گیا۔ اسی دوران آپ کے تعلقات والہی صوبہ ثابت بن نصر سے قائم ہوئے۔ اس طرح 18 سال تک آپ عہدہ قضاۃ کے فرائض انجام دیتے رہے کہ والہی طرطوس ثابت بن نصر فوت ہو گئے پھر ان کا بیٹا جاثلیق مقرر ہوا تو بھی آپ نے اس سے دوستانہ مراسم قائم رکھے۔ اس دوران آپ کوئی علمی کام نہ کر سکے۔ 210ھ میں امام ابو عبیدہ القاسمؒ کو سکدوش کر دیا گیا اور آپ پہلے مصر اور پھر وہاں سے بغداد پہنچے۔ بغداد ان دنوں دنیائے اسلام کا علمی مرکز ہونے کے علاوہ سیاسی ثقافتی مرکز بھی تھا جہاں آپ کی شہرت کا چرچا ہوا۔

بغداد کے بعد امام ابو عبیدہ القاسمؒ اپنے علمی محسن عبداللہ کے پاس نیشاپور چلے گئے۔ زندگی کے آخری ایام میں آپ کا معمول تھا کہ رات کا ایک تہائی حصہ عبادت میں ایک تہائی تصنیف و تالیف میں اور ایک تہائی آرام کرنے میں گزارنا شروع کر دیا کہ اس دوران آپ کو خواب میں

زیارت رسول کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہوئی اور پھر امام ابو عبیدہ القاسمؓ نے سفر حج کیا اور اپنی آخری سانس تک مکہ معظمہ میں مقیم رہے۔ یہاں تک کہ 224ھ میں وفات پائی۔

امام ابو عبیدہ القاسمؓ نے بے شمار کتب تحریر کیں جن میں سے میں کو شہرت دوام نصیب ہوئی۔ ان میں سے چند دستیاب ہوئیں اور چھپ کر منظر عام پر آئیں۔ ان کی کتاب ”الاسوال“ جو مالی نظام سے متعلق تھی 235ھ میں قاہرہ میں طبع ہوئی۔ اسی طرح ایک اور کتاب ”الامثال“ عربی ادب سے متعلق ہے۔ آپ نے ایک ضخیم کتاب ”غریب الحديث“ کے نام سے پورے چالیس سال محنت کر کے لکھی۔ جب یہ کتاب گورنر عبداللہ بن طاہر کے پاس آئی تو اس نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا تو اپنی رائے ان الفاظ میں دی:

”جس دماغ کی صلاحیتوں کا مالک ایسی نفیس کتاب تصنیف کر سکتا ہے وہ یقیناً اس بات کا حقدار ہے کہ اسے معاشی فکر سے آزاد کر دیا جائے۔“

چنانچہ ان کا معقول ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔

## امام ابو عبیدہ القاسمؓ کے معاشی افکار

کتاب ”الاسوال“ کی روشنی میں آپ کے معاشی افکار کا پتہ چلتا ہے جو حسب ذیل ہیں:

### 1- عشور:

اسلامی مملکت میں یہ محصول چونکہ تھی جو ذمیوں اور اہل حرب تاجروں سے وصول کی جاتی تھی اور یہ اس وقت وصول کی جاتی تھی جب وہ اپنا سامان ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں لے جاتے یا پھر اپنے ملک سے دوسرے ملک لے جاتے تھے اور اس کی شرح بھی مختلف قبیلوں کے لئے مختلف ہوتی تھی جیسے ذمیوں سے کم شرح وصول کرتے تھے اور اہل حرب سے زیادہ شرح سے وصول کی جاتی تھی۔ اس کا باقاعدہ اجراء حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے ہوا۔ اس سلسلہ میں امام ابو عبیدہ القاسمؓ خود لکھتے ہیں:

”حضرت عمرؓ نے عشور کی وصولی کا نظام ان صلح ناموں کے بعد جاری کیا کیونکہ صلح کے بعد جو شرائط طے پائی تھیں ان کو مد نظر رکھ کر عشور بھی طے کیا جاتا تھا۔ اس سے پہلے عہد رسالت مآب ﷺ اور خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں اس کا رواج نہ تھا۔ آپ ﷺ جن سے عہد و بیان اور صلح کرتے تھے ان پر ایسی کوئی شرط نہ رکھی جاتی تھی۔ اسی طرح زمانہ حضرت ابوبکرؓ میں بھی ایسی کسی شرط کا پتہ نہیں ملتا لیکن جب حضرت عمرؓ نے بھی علاقہ اور ممالک کی فتح کا آغاز کیا تو یہ سلسلہ شروع ہوا۔ جب ذمی لوگ اپنا مال لے کر عشور

وصول کرنے والے کے پاس سے گزرتے تو ابوسفیانؓ کہا کرتے تھے کہ عاشر اس مال سے اس وقت تک کچھ وصول نہ کرے گا جب تک اس کی قیمت سو درہم نہ ہو جائے۔ اسی طرح اہل عراق کہتے تھے کہ جب تک مال کی قیمت دو سو درہم نہ ہو جائے عاشر اس پر عشور وصول نہیں کرے گا۔ اس طرح وہ اس عشور کو زکوٰۃ سے تھوہل کرتے تھے حالانکہ یہ عشور نہ تو زکوٰۃ تھا نہ اس سے مشابہ کیونکہ زکوٰۃ تو سال میں ایک دفعہ اس سال بھر رہنے والے مال پر وصول کی جاتی ہے لیکن عشور کی وصولی تو ہر دفعہ یعنی جب بھی مال ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ یا ایک ملک سے دوسرے ملک جائے کی جاتی تھی۔“

امام ابو عبیدہ القاسمؓ مزید کہتے ہیں:

”جب ایک تاجر ایک سال میں کئی بار عاشر یعنی عشور وصول کرنے والے کے پاس سے گزرتے اسے صرف ایک بار عشور شمالانہ ادا کرنا چاہئے۔“

## 2- جزیہ:

جزیہ وہ فیصلہ شدہ معاوضہ یا ٹیکس ہے جو ذمیوں سے اس بات کے عوض وصول کیا جائے گا کہ ان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ امام ابو عبیدہ القاسمؓ کے نزدیک یہ رقم صرف بالغ مردوں سے وصول کی جائے گی۔ عورتیں اور بچے اس جزیہ سے مستثنیٰ ہوں گے نیز ان کا خیال ہے کہ یہ جزیہ مشرکین عرب کے سوا تمام عرب اور غیر عرب قوم سے وصول کیا جانا چاہئے چاہے وہ اہل کتاب ہوں یا کہ نہ اور اس جزیہ کی کوئی حد بھی مقرر نہ تھی۔ یہ حد مقرر کرنا اسلامی حکومت کے سربراہ پر ہوتی تھی جتنا وہ مقرر کرے۔ اس میں یہ امر ملحوظ خاطر رکھنا ہو گا کہ یہ رقم ذمیوں کی قوت برداشت سے زیادہ نہ ہو اور اگر کوئی ذمی یہ رقم ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو اس سے یہ وصول نہ کی جائے۔ اس کی شرح میں وقتاً فوقتاً تبدیلی ہوتی رہے گی۔“

## 3- خراج:

خراج سے مراد کرایہ محصول آمدنی یا پیداوار ہیں۔ اہل عرب زمینی پیداوار گھر کا کرایہ اور ملکیتی غلام سے حاصل ہونے والی آمدنی کو خراج کہتے تھے۔ امام ابو عبیدہ القاسمؓ کے نزدیک حضرت عمرؓ نے زمین پر خراج وصول کیا ہے یعنی زمین کا کرایہ لیا تھا اور یہ ان زمینوں سے لیا جاتا تھا جو مسلمانوں کی مشترکہ ملکیت ہوتی تھیں جنہیں عرف عام میں فئے کہا جاتا ہے اور ان پر پہلے سے قابض غیر مسلم لوگ ہی کا شکار کرتے تھے۔

خراج فلہ اور نقد دونوں صورتوں میں سے کسی ایک کی شکل میں وصول کیا جاتا تھا کیونکہ غیر مسلم ایک مقررہ شرح سے خراج ادا کرنے کے پابند تھے۔ انہیں آپ حراہ بھی کہہ سکتے ہیں اور خراج کی ادائیگی کے بعد بقیہ تمام آمدنی انہی غیر مسلموں کی ملکیت ہو گی۔ خراج کی شرح بھی

جزیرہ کی طرح زمین کی حالت دیکھ کر اور موسمی حالات کے مطابق کم و بیش کی جاتی جاتی تھی۔ اس میں بھی وہی شرط تھی کہ خراج نہ تو اتنا زیادہ وصول کیا جائے کہ کاشتکار کے گھر کچھ بھی نہ جائے اور نہ اتنا کم کہ اسلامی حکومت کو حفاظتی انتظام کرنا مشکل نظر آئے۔

#### 4- اقطاع:

حکومت وقت کی طرف سے کسی کو جاگیر عطا کرنا "اقطاع" کہلاتا تھا۔ امام ابو عبید القاسم کہتے ہیں کہ ایسا اقطاع عامۃ الناس کی اجتماعی بھلائی کو مد نظر رکھ کر اور مفاد عامہ کے پیش نظر رکھ کر کرنا چاہئے اور جس کو اقطاع کیا جائے اس کا بھی فرض ہے کہ وہ اس جاگیر کو اجتماعی مفاد کے تابع رکھ کر استعمال کرے۔

امام ابو عبید القاسم کے نزدیک اقطاع ایسی جاگیر کا کیا جانا چاہئے جو ایک عرصہ سے غیر آباد ہو یا کبھی آباد تھی لیکن اب کوئی اس کو آباد کرنا قبول نہیں کرتا یا پھر غیر کاشت حالت میں اب موجود ہو اس پر کوئی آباد نہیں ہوتا چاہتا۔ دوسرے یہ کہ ایسی زمین کے متعلق فیصلہ کا اختیار امام کو حاصل ہو چکا ہو۔ یہ زمین ایسی ہونی چاہئے جو نہ تو کسی مسلمان کی ملکیت ہو اور نہ کسی سے معاہدہ کیا گیا ہو۔

#### 5- غنیمت اور فئے کا فرق:

امام ابو عبید القاسم کے نزدیک غنیمت وہ مال ہے جو جنگ کے دوران مشرکین سے بزرگ جنگ حاصل کیا جائے۔ اس کی تقسیم ایسے کی جائے کہ اس کے پانچ حصے مقرر ہوں اور تمام حصص ان مستحقین کو دیئے جائیں اور دیگر لوگوں کو اس میں سے کچھ نہ دیا جائے۔ فئے وہ مال ہے جو جنگ ختم ہونے کے بعد فتح ہونے والے علاقوں کی اسلامی حکومت میں شمولیت سے حاصل ہو۔ یہ مال اجتماعی ملکیت تصور ہوگا اور اس میں عامۃ الناس کا حصہ بھی شامل ہوگا۔ اس کے حصے نہیں کئے جائیں گے۔

فئے کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ ایک لشکر دشمن پر حملہ کی تیاری مکمل کرتا ہے لیکن دشمن کو خبر ہو جاتی ہے وہ کچھ مال و اسباب لے کر حاضر ہوں کہ حملہ نہ کیا جائے بلکہ یہ مال قبول کر لیا جائے۔ یہ بھی فئے ہوگا اور عامۃ الناس کی ملکیت تصور ہوگا۔

#### 6- حمی اور اجتماعی مفاد:

عربی زبان میں ہر وہ شے جس کو کوئی جماعت یا فرد اپنے ذاتی فائدہ کے لئے محفوظ کر لئے حمی کہلاتی ہے۔ اس میں دوسروں کی دخل اندازی منع ہے۔ اسی طرح حدیث نبوی ﷺ ہے کہ کسی زمین کو حمی قرار دینے کا حق صرف اللہ عز و جل اور اس کے رسول مقبول ﷺ کے سوا کسی کو



اس حدیث مبارکہ پر تبصرہ کرتے ہوئے امام ابو عبید القاسمؒ لکھتے ہیں:

”اللہ عزوجل اور رسول اکرم ﷺ کی جانب سے حجتی قرار دینے کے لئے دو شرائط ہیں: اول یہ کہ ایسا علاقہ جس میں راہ خدا میں لڑنے والے مجاہدین کے گھوڑے خوراک حاصل کرتے ہوں۔ ایسا عمل رسول اللہ ﷺ نے خود انجام دیا ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ ایسی زمین جس میں صدقہٴ زکوٰۃ میں حاصل ہونے والے جانور پرورش پاتے ہوں اور یہ زمین اس وقت تک حجتی رہے گی جب تک اس میں پرورش پانے والے تمام جانور اپنے مستحقین کے پاس نہ چلے جائیں۔ اس شرط پر حضرت عمرؓ نے بھی عمل کیا تھا۔“

## علامہ ابن حزمؒ

آپ کا نام ابو محمد علی بن احمد بن سعید ابن حزم ہے۔ وہ ایک مفکر، ماہر معاشیات اور عالم فاضل تھے۔ 7 نومبر 994ء قرطبہ (اندلس) کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ کے پردادا عیسائیت سے تائب ہو کر اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ آپ کے والد بادشاہ منصور المجاہد اور اس کے بیٹے مظفر کے وزیر تھے۔ ابن حزم ابتداء میں شافعی مذہب کے پیرو تھے لیکن بعد ازاں ظاہری فرقے کی بددعوت حمایت کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ فقہی استنباط کی اُن جزئیات کو جن کی بنیاد قرآن و حدیث پر نہیں انہیں رد کر دینا ضروری ہے۔ ابن حزم بالطبع مناظرے پر مائل رہتے تھے۔ آپ ایک جید عالم اور اعلیٰ پایہ کے مناظر تھے۔ ایک مشہور ضرب المثل کے مطابق ابن حزم کا قلم ایسا ہی تیز تھا جیسے حجاج بن یوسف کی تلوار۔ آپ کی مشہور تصنیف ”مکملی“ ہے۔ اس تصنیف میں زندگی کے اُن مسائل سے بحث کی ہے جن کا تعلق معاشیات اور اقتصادیات سے ہے۔ سرمایہ اور محنت کے توازن کے باب میں انہوں نے لکھا ہے کہ کام لینے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ (آزاد یا غلام) دونوں قسم کے اجروں (مزدوروں) سے اس حد تک کام لے کہ وہ اچھی طرح کام انجام دے سکیں اور بقدر طاقت کام لینا چاہئے اور یہ نہ ہو کہ ان کو اتنی محنت کرنی پڑے کہ ان کی صحت و تندرستی جاہ ہو جائے۔ اس سلسلے میں ایک حدیث ہے کہ ”رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تین قسم کے انسان ایسے ہیں جن سے میں قیامت کے دن جھگڑوں گا۔ ان کو مغلوب و مقہور ہی کر کے چھوڑ دوں گا۔ ان میں سے ایک وہ ہے جو مزدور سے کام تو پوری طرح لیتا ہے اور اس کی مناسبت سے اس کی اجرت نہیں دیتا ہے۔“

ابن حزم کا قول ہے کہ ”اجیر (مزدور) مشترک ہو یا خاص یا کارگیر ہو اس پر مال میں نقصان ہو جائے یا ہلاک ہو جانے سے کوئی تاوان نہیں آتا تاوقتیکہ اس کا ارادی قصور یا ضائع کر

دینا ثابت نہ ہو اور ان تمام امور میں جب تک اس کے خلاف گواہ موجود نہ ہوں اجر ہی کا قول مستحکم ہے قسم کے ساتھ؟“

آپ کی تصنیفات کی تعداد تقریباً 400 تھی لیکن ان میں سے زیادہ تراشیلیہ میں سپرد آگ کر دی گئیں۔ آخر یہ علم و ادب کا بیج اور اسلام کا فرزند 28 شعبان 456ھ بمطابق 5 اگست 1064ء کو اس دار فانی سے رخصت ہو گیا جس کے بعد ایک دفعہ منصور الموحد نے اس درخشاں ستارہ علم و حکمت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

”جب کوئی مشکل پیش آتی ہے تو سب علماء کو ابن حزم ہی سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔“

## علامہ ابن حزمؒ کے معاشی افکار

ابن حزم اپنے وقت کے جید محدث اور فقیہ تھے۔ جو کچھ انہوں نے کتاب ”المحلی“ میں لکھا ہے ان کا مطالعہ کر لیا جائے اور ان پر عمل کرانے کی کوشش کی جائے تو نظام اسلام بہت جلد قائم ہو سکتا ہے۔ ذیل میں ہم ان کی کتاب سے ان کے چند معاشی افکار اخذ کرتے ہیں۔

1۔ بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی:

ابن حزم کا موقف یہ ہے کہ معاشرے کے محروم المصیبت افراد کی معاشی کفالت کا بندوبست کرنا خلیفہ کی ذمہ داری ہے۔ ان کی تمام بنیادی ضروریات بیت المال سے پوری کی جائیں گی اور اگر بیت المال ان اخراجات کا متحمل نہ ہو سکے تو خلیفہ ارباب دولت کو مجبور کر سکتا ہے کہ وہ غرباء کی بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی کے لئے رقم مہیا کریں۔ آپ نے اپنی تصنیف ”المحلی“ میں کئی ایسی آیات اور احادیث نقل کرنے کے بعد یہ مسئلہ تحریر فرمایا ہے:

”اور ہر معاشی زندگی کے کفیل دولت کا فرض ہے کہ وہ فقراء اور غرباء کی معاشی زندگی کے کفیل ہوں اور اگر بیت المال کی آمدنی ان غرباء کی معاشی کفالت نہ کر سکے تو سلطان ان ارباب دولت کو اس کفالت کے لئے مجبور کر سکتا ہے (یعنی ان کے فاضل مال سے یہ جبر لے کر فقراء کی ضروریات میں صرف کر سکتا ہے۔) اور ان کی زندگی کے اسباب کے لئے کم از کم یہ انتظام ضروری ہے کہ ان کی ضروری حاجت کے مطابق روٹی مہیا ہو پہننے کے لئے گرمی اور سردی دونوں موسموں کے لحاظ سے لباس فراہم ہو اور رہنے کے لئے ایسا مکان ہو جو ان کو بارش گرمی دھوپ اور سیلاب جیسے امور سے محفوظ رکھ سکے۔“

اور حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”اس بات پر صحابہؓ کا اجماع ہے کہ اگر کوئی شخص بھوکا نکلا یا ضروریات رہائش سے محروم ہے تو مالدار کے فاضل مال سے اس کی کفالت کرنا فرض ہے۔“

## 2- میراث اور وصیت:

غیر وارث اقارب کے سلسلے میں فقہاء وصیت کی فرضیت کو نہیں مانتے۔ ابن حزم کا موقف یہ ہے کہ وصیت غیر وارث اقارب کے لئے فرض ہے۔ وصیت کنندہ کو چاہئے کہ اسے مال میں وصیت کرے جس سے اس ثابت شدہ فریضے کی تکمیل ہو جائے چونکہ ان کے نزدیک وصیت واجبہ کا ترک ظلم کے مترادف ہے اس لئے یہ کام حاکم یا قاضی کے سپرد ہوگا کہ وہ وصیت کے نفاذ کی نگرانی کرے یا عدم وصیت کی صورت میں متاثرین کو ان کے حقوق دلائے۔

مصری حکومت نے ابن حزم کے اس مسلک کی روشنی میں یتیم ہوسے کی میراث کا قانون بنایا ہے چنانچہ مصری قانون نمبر 71 بحریہ 1946ء کی دفعات نمبر 76-79 ابن حزم کی کتاب اٹھلیسے ماخوذ نظر آتی ہیں۔

ابن حزم کے اس مسلک کا مقصد غالباً یہ بھی ہے کہ دولت ترکے کی صورت میں صرف چند ہاتھوں تک ہی محدود نہ رہے بلکہ متوفی کے کنبہ کے زیادہ سے زیادہ لوگوں میں تقسیم ہو جائے۔

میت کے ترکے میں سے جتنے حقوق وابستہ ہیں ابن حزم ان میں حقوق اللہ مثلاً زکوٰۃ حج اور کفارہ وغیرہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ خداوندی حقوق میت کی جھجھک و بھٹکن سے بھی مقدم ہیں جبکہ اکثر حنفی فقہاء کے نزدیک حقوق اللہ کے سلسلے میں متوفی کا وصیت کرنا ضروری ہے۔ فرماتے ہیں:

”اگر میت نے قلیل یا کثیر مال چھوڑا ہو تو سب سے پہلے اس میں سے حقوق اللہ مثلاً حج و زکوٰۃ و کفارات وغیرہ ادا کئے جائیں۔“

ترکے کی تقسیم کے وقت اگر یتیم و مسکین جمع ہوں تو انہیں کچھ نہ کچھ دے دینا چاہئے۔ اکثر فقہاء کا مسلک یہی ہے لیکن ابن حزم کی رائے میں یہ عطیہ اختیاری نہیں بلکہ وجوبی ہے لہذا اگر ورثاء دینے سے انکار کریں تو حاکم ان سے جبراً دلائے۔

ترکے کی مالیت اور حصص کے اعتبار سے حاکم بنانی و مساکین کے حصے کا تعین کر سکتا ہے۔ ابن حزم کا یہ مسلک معاشرے میں تقسیم دولت کے لئے بہترین اصول معلوم ہوتا ہے۔

## 3- اجارہ زمین:

قومی دولت کا انحصار نظام ارضی پر بہت زیادہ ہے۔ کسی زرعی ملک میں جب تک نظام ارضی درست نہ ہو وہاں کے عوام جو اکثر دیہاتی آبادی کے لوگ ہوتے ہیں خوشحال نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ مزدور زمین کے مسئلے پر اکثر فقہاء کی رائے کے برعکس ابن حزم مزدور ارضی کو اجارہ یا ٹھیکے پر دینا بالکل جائز نہیں سمجھتے۔ آپ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”زمین کو کسی حالت میں بھی اجارہ پر دینا جائز نہیں نہ کھیتی باڑی کے لئے نہ باغ لگانے کے لئے نہ تعمیر کرنے کے لئے نہ کسی اور مقصد کے لئے خواہ تھوڑی مدت کے لئے یا زیادہ مدت کے لئے۔ بلا تعین مدت یہ اجارہ داری (ٹھیکہ داری) نہ درہم و دینار کے عوض درست ہے اور نہ کسی چیز کے عوض۔ اگر زمین اجارہ پر دے دی جائے تو اسے صلح کر دیا جائے گا۔“

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

”زمین کو درہم و دینار کے عوض نہ کرایہ پر دے سکتے ہیں نہ سامان طعام کے عوض اور نہ کسی اور چیز کے بدلے۔“

ابن حزم حرم حرمہ زمین میں اجارہ (ٹھیکہ) کے عدم جواز کے بعد زمین کی کاشت کی مختلف صورتیں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

i- اپنے آلات اور حیوانات سے خود کاشت کرے اور بیج ڈالے۔

ii- دوسروں کو زراعت کے لئے بلا معاوضہ دے۔ اگر مالک اور مزارع حیوانات آلات اور بیج میں شریک ہوں مگر زمین کا مالک اس کا کچھ وصول نہ کرے تو اچھا ہے۔

iii- اپنی زمین مزارع کو دے دے اور مزارع اپنے آلات و اموال کی مدد سے خود کاشت کرے اور بیج ڈالے۔ زمین کا مالک اس میں سے پیداوار کا مقرر حصہ مثلاً نصف یا ربع (چوتھائی) یا اس سے کم و بیش لے لے۔ زمین کا مالک اور کوئی شرط نہ لگائے۔ اگر زمین میں کچھ بھی پیدا نہ ہو تو مزارع نہ کچھ دے گا اور نہ لے گا۔

یہ تمام طریقے جائز ہیں۔ اراضی کا مالک اگر ان میں سے کسی طریقے کو پسند نہ کرے تو اپنی زمین واپس لے لے۔

#### 4- اجیر مشترک اور اجیر خاص پر مسئلہ تادان:

اجیر مشترک اس مزدور کو کہتے ہیں جو اپنا ایک مستقل فی کاروبار کرتا ہے اور ہر شخص اس کام کے سلسلے میں اس سے خدمت لیتا ہے۔ مثلاً کپڑا بننے یا سینے وغیرہ کا کام لینا اور اجیر خاص سے مراد وہ مزدور ہے جو اپنی خدمات کسی ایک شخص کے لئے بعض وقف کر دے مثلاً گھر کا ملازم، بھرہ اور باورچی وغیرہ۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ اگر اجیر مشترک یا اجیر خاص سے کام میں کوئی نقصان ہو جاتا ہے تو کیا اجیر پر تادان عائد کیا جائے گا یا نہیں۔ جہاں تک اجیر مشترک کا معاملہ ہے، امام ابو حنیفہ کے نزدیک اجیر نقصان کا ذمہ دار نہیں ہے جبکہ امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک وہ تادان ادا کرے گا۔ بانی رہا اجیر خاص تو وہ تمام فقہائے حنفیہ کے نزدیک تادان سے بری الذمہ ہو گا۔ امام ابن حزم اجیر مشترک اور اجیر خاص میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک دونوں سے کسی قسم کا تادان نہیں لیا جائے گا البتہ اگر انہوں نے نقصان ارادہ کیا ہو تو

پھر وہ نقصان کے ذمہ دار ہوں گے چنانچہ اپنی کتاب ”الحکلی“ میں فرماتے ہیں:

”اجیر مشترک ہو یا خاص یا کارگیر ہو اس پر مال میں نقصان ہو جانے یا ہلاک ہو جانے سے کوئی تاوان نہیں آتا تاوقتیکہ اس کا ارادی قصور یا ضائع کر دینا ثابت نہ ہو اور ان تمام امور میں جب تک اس کے خلاف گواہ موجود نہ ہوں اسی اجیر کا قول معتبر ہے قسم کے ساتھ!“

### 5- بنیادی ضروریات:

ابن حزم کا خیال ہے کہ معاشرہ کے ہر فرد کو بلا تفریق قوم، قبیلہ جو اپنی روزی کمانے کے قابل نہ ہوں بیت المال سے خلیفہ وقت اتنی امداد مہیا کرے کہ وہ پیٹ بھر کر کھانا کھا سکیں۔ دکھ سکھ میں اپنا علاج معالجہ کر سکیں، موسم گرما، سرما میں اپنا تن ڈھانپ سکیں۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر بیت المال ان کی کفالت نہ کر سکے تو خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ اہل ثروت لوگوں کو ان کی کفالت پر مجبور کرے تاکہ وہ مجبور اور نادار لوگ معاشرہ میں باعزت زندگی بسر کر سکیں۔ ابن حزم اپنی تھنیف الحکلی میں ایک حدیث نبوی نقل کرتا ہے جس کے بعد اس نے ایک مسئلہ بھی تحریر کیا ہے جو کچھ اس طرح ہے کہ آبادی کے ارباب دولت کا فریضہ ہے کہ وہ فقراء، غرباء کے معاش کی ذمہ داری قبول کریں۔ اگر بیت المال کی آمدنی اتنی نہ ہو جو ان کی ضروریات پوری کر سکے تو سلطان ان دولت مندوں کو مجبور کر سکتا ہے کہ وہ کفالت کی ذمہ داری پوری کریں۔ (یعنی ان کی فالتو دولت میں سے جبراً لے کر) غرباء، مساکین کی کفالت کرے اور کم از کم ان کو ضروری روٹی، پہنے کے لئے کپڑا (موسم کے مطابق) رہنے کے لئے ایک مکان جس میں وہ گرمی، سردی، بارش، دھوپ سے محفوظ رہ سکیں مہیا کرنے کا بندوبست کرے۔

جناب حفظ الرحمن سیوہاروی اپنی نوشت ”اسلام کا اقتصادی نظام“ میں تحریر کرتے ہیں:

”الحکلی کی چھٹی جلد میں حضرت ابوسعید خدری کی روایت پر بحث کرتے ہوئے ابن حزم لکھتے ہیں: اس بات پر صحابہ کا اجماع ہے کہ اگر کوئی شخص بھوکا، تنگا یا ضروریات رہائش سے محروم ہے تو مالدار کے فاضل مال سے اس کی کفالت کرنا فرض ہے۔“

### حضرت شاہ ولی اللہ

شاہ ولی اللہ صاحب کا اصلی نام احمد تھا۔ ابوالفیاض کنیت تھی اور ولی اللہ عرف ہے۔ اسی عرف نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کے والد شیخ عبدالرحیم حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے عقیدت رکھتے تھے چنانچہ اسی عقیدت کی وجہ سے آپ کا ابتدائی نام قطب الدین رکھا گیا۔ آپ کے والد شیخ عبدالرحیم اپنے وقت کے ایک جید عالم اور مشہور بزرگ تھے۔ فتاویٰ عالمگیری کی نظر ثانی و اصلاح میں آپ بھی شامل تھے۔ شاہ صاحب کا سلسلہ نسب والد ماجد کی جانب سے

حضرت عمرؓ تک اور والدہ کا امام موسیٰ کاظمؑ تک پہنچتا ہے۔ اس لحاظ سے آپ خالص عربی النسل اور نسبتاً فاروقی ہیں۔

آپ کی ولادت 1703ء بوقت طلوع آفتاب دہلی میں ہوئی۔ آپ کی وفات 29 محرم 1174ھ میں بمقام دہلی ہوئی۔ دروازہ کے باہر مہندیوں میں حضرت کا حزار پداوار ہے۔

آپ کی تصانیف کی تعداد 100 سے زائد ہے۔ آپ نے قرآن پاک کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس کا نام فتح الرحمن رکھا۔ اس وقت کے علماء دین آپ کے خلاف ہو گئے اور انتہا یہ ہے کہ آپ کو قتل کرنے کے درپے ہو گئے۔ افسوس کہ آخری عمر میں نجف علی خان حاکم دہلی نے آپ کے ہاتھ کٹوا دیئے لیکن اُس وقت تک آپ خدمت اسلام کا فریضہ انجام دے چکے تھے۔ آپ کی تصانیف میں سے کچھ تو آج نادر و نایاب ہیں جو ملتی ہیں اُن کے نام یہ ہیں:

➤ فتح الرحمن فی ترجمہ القرآن و فارسی

➤ الفوز الکبیر

➤ فتح الکبیر

➤ احادیث سے متعلق المسوئی فی احادیث الوسط المصلی فی شرح النوطا

➤ اسرار شریعت کے متعلق الحجۃ البالغہ..... اس کتاب کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔

➤ عقیدہ الجہد فی احکام الاجتهاد والتعلیل

➤ تصوف سے متعلق حسن العقیدۃ مکاشفۃ البلاغ المبین فی اتباع خاتم النبیین ﷺ

ان کے علاوہ اور بہت سی کتب جو آج بھی بازار میں موجود ہیں آپ لے لکھیں اور ان

سب کو شہرٹ دوام نصیب ہوئی۔ آئیے اب ہم شاہ ولی اللہ کے معاشی افکار اور فرمودات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

## شاہ ولی اللہ کے معاشی افکار

### 1- ارتقاء عمران و اقتصاد:

آپ کا ایک نظریہ جو عمرانی ارتقائی نظریات میں نبھائے خود مکمل اور قدیم ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے دوسرے ماہرین معاشیات کی طرح اپنے نظریات کی بنیاد خواہشات پر رکھی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان اور حیوان کی خواہشات جلی ہیں لیکن انسان کی خواہشات بہت وسیع ہیں اور عقلی ہیں اور یہ عقلی یعنی اور روحانی تقاضوں کے تحت پروان چڑھتی ہیں۔ ان میں سے کچھ گروہی اور کچھ ذاتی ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ان کی تکمیل ایک منظم طریقہ سے کرتا ہے۔ سوال یہ اُبھرتا ہے کہ انسان ان کی تسکین کیونکر کر سکتا ہے۔ انسان اور حیوان دونوں کی خواہشات

کی تسکین کس طرح ہوتی ہے۔ ان کا جواب یہ ہے کہ یہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہے اور اسی وجہ سے اس کی ربوبیت کی وجہ سے ضروری ہے کہ ہر وقت ایک نہ ختم ہونے والا رابطہ قائم رہے یعنی یہ اللہ اور بندے کے درمیان موجود رہے جسے وہ الہام کہتے ہیں اور اسی الہام کے ذریعہ اسے علم ہوتا رہتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کس طرح بسر کرے تاکہ شفاء قدرت پورا ہوتا رہے لہذا ان کی تکمیل کے طریقے بھی الہامی ہیں اور ہر قسم کی معاشی شریعت بھی الگ الگ ہے جو انسان کے اندر خود بخود قدرت الہی کی طرف سے القا کر دی جاتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ معاشی تسکین کا یہ طریقہ فطری ہے اور اسے ہم خارجی طریقہ نہیں سمجھ سکتے کیونکہ جب کوئی خواہش جنم لیتی ہے تو اس کی صورت تسکین کا تقاضا ہوتا ہے کہ اسے تسکین ملے تاکہ اس کی ضرورت نور ربوبیت سے اپنا حصہ حاصل کرے۔

## 2- مادی نقطہ نظر سے انکار:

اسلام انسان کی روحانی فلاح و بہبود کے ساتھ ساتھ اس کی دنیوی ترقی بھی چاہتا ہے اور قرآن کی رو سے آپ اس بات کے قائل ہیں کہ اس دنیا میں انسان اپنی خواہشات کی تکمیل روپے پیسے سے کر سکتا ہے جس کی اسے ہر وقت ضرورت ہوتی ہے اور یہ روپیہ پیسہ انسان کو کئی قسم کی اخلاقی برائیوں سے محفوظ بھی رکھتا ہے اور اگر انسان روپیہ پیسہ کا اس قدر رسیا بن جائے کہ یاد الہی سے غافل ہو جائے تو پھر یہی دولت اس کا دین اور دنیا جاہ و برباد کر دیتی ہے اور انسان معراج انسانیت سے بہت نیچے گر کر حیوان کہلانے لگ جاتا ہے اور اس میں اچھائی بُرائی اپنے اپنے جائز ناجائز حلال و حرام کی تیز نہیں رہتی۔ اس کو اس سے کوئی سروکار نہیں رہتا کہ دولت کیسے کیونکر اور کہاں کہاں سے کن ذرائع سے جمع ہو رہی ہے۔

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں جس کو حفظ الرحمن سیوہاروی اپنی کتاب ”اسلام کا اقتصادی نظام“ میں یوں تحریر کرتے ہیں:

”اس مقام پر دو متعارض قیاس کام کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ نظام معیشت میں دولت ایک محمود شے ہے۔ اس لئے اگر وہ صحیح اصول پر قائم ہے گو اس کی بدولت انسان کا دائمی توازن اعتدال پر رہتا ہے اور اس سے اس کے اخلاق کریمانہ صحیح اور درست رہتے ہیں اور انسان اس قابل بنتا ہے کہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہو۔ اس لئے کہ بے کسانہ اور مجبورانہ افلاس سوئے تدبیر اور مزاج کے اختلال کا باعث ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ دولت و ثروت ایک بدترین چیز ہے جبکہ وہ باہمی منافعات اور بغض و حسد کا سبب بنتی اور خود اہل ثروت کے اطمینان قلب کو حریصانہ کدوکاوش کے زہر سے مسموم کرتی ہے

اور قوموں کو استحصال بالجبر اور دوسروں پر معاشی دستبرد کے لئے آمادہ کرتی ہے کیونکہ اس صورت میں بد اخلاقی کے مرض میں مبتلا کر دیتی ہے۔ آخرت یعنی یاد الہی اور روحانی زندگی سے یکسر غافل و بے پرواہ بنا دیتی ہے اور مظلوموں پر نت نئے مظالم کا دروازہ کھول دیتی ہے لہذا پسندیدہ راہ یہ ہے کہ دولت و ثروت نظام معیشت میں ایسا درجہ رکھتی ہو کہ توسط اور اعتدال پر قائم اور افراط و تفریط سے پاک رہے اور یہ صحیح معاشی نظام کے بغیر ناممکن ہے۔“

### 3۔ انفرادی حق ملکیت:

اسلام میں انسان کو کچھ شرائط کے ساتھ حقوق ملکیت ملتے ہیں جو خالصتاً انفرادی کہلاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں شاہ صاحبؒ کا نظریہ یہ ہے:

”اللہ تعالیٰ نے جب زمین پر اپنی مخلوق پیدا کی تو ان کی معاش اور روزی بھی زمین پر مقدر فرمائی اور زمین کی پیداوار سے ان کے لئے انتفاع، نزاغ پیدا ہوا اور انتفاع کو مباح قرار دیا اور نزاغ کے متعلق حکم الہی یہ ہوا کہ کوئی شخص دوسرے شخص کی مخصوص و مختص چیز میں کسی قسم کی مزاحمت و مداخلت نہ کرے اور یہ اس کی مخصوص چیز اس طرح ہوگی کہ اس چیز پر سب سے پہلے اس کا قبضہ ہوا ہے یا اس کے کسی مورث کا قبضہ تھا یا کسی ایسے طریقہ سے اس چیز پر اس کا جو ان لوگوں میں عمومی طور پر قبضہ اور ملکیت کے لئے معتبر مانا جاتا ہے۔ اس قسم کے قبضہ اور ملکیت میں سوائے جادلہ کے اور سوچ سمجھ کر بلا کسی فریب اور دھوکہ اور قابل اعتماد باہمی رضامندی کے کسی قسم کی مزاحمت کرنا حرام اور ناجائز ہے۔“ (اردو ترجمہ جتہ البالغہ)

### 4۔ ٹیکسوں کا غلط استعمال اور بھاری ٹیکسوں کی مذمت:

شاہ صاحبؒ کا نظریہ یہ ہے:

”آج کل جو شہر برباد ہو رہے ہیں اس کے دو بڑے سبب ہیں: اول ناحق مال بٹورنا، دوم گراں ہار ٹیکس۔ پہلی صورت میں لوگ سرکاری بیت المال کے گرد رخ ہو جاتے ہیں اور مختلف بہانوں سے روپیہ بٹورتے ہیں مثلاً یہ کہتے ہیں کہ ہم سپاہی ہیں ہمیں پنشن ملنی چاہئے۔ ہم زمرہ علماء میں سے ہیں ہمیں کوئی جاگیر ملنی چاہئے۔ اسی طرح دیگر بہانوں سے وہ بیت المال سے روپیہ حاصل کرتے ہیں۔ وہ بیت المال سے مشاہرہ تو حاصل کرتے ہیں لیکن اس کے عوض کوئی کام نہیں کرتے۔ رفتہ رفتہ اس قسم کے لوگوں کی تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے اور پھر وہ ایک دوسرے کے لئے تنگی کا باعث بن جاتے ہیں اور معاشرے پر بھی بار بن جاتے ہیں۔

شہروں کے برباد ہونے کا دوسرا سبب یہ ہوتا ہے کہ حکام کا شکاک و تاجروں اور پیشہوروں پر بھاری ٹیکس لگا دیتے ہیں اور ان کی وصولی کے لئے انہیں بہت تنگ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ



جو لوگ خوش نگیں ادا کرتے ہیں ان کا استحصال کر ڈالتے ہیں اور جو لوگ سخت ہوتے ہیں وہ نگیں ادا کرنے سے انکار کر دیتے ہیں اور بغاوت اختیار کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشرہ قلیل نگیں اور ضرورت کے مطابق محافظین کار (فوج اور انتظامیہ) مقرر کرنے سے ہی اچھا رہ سکتا ہے۔ ہمارے زمانہ کے لوگ اس سے سمجھہ حاصل کریں۔“ (اردو ترجمہ جتہ البالغہ)

## 5- حکومت کے معاشی فرائض:

شاہ ولی اللہ اپنی تصنیف جتہ البالغہ میں حکومت کے معاشی فرائض پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

”حکومت کا فرض ہے کہ وہ عوام کی بہبود اور معاشی فارع البالی کے لئے مختلف اقدامات کرے۔ ناجائز ذرائع آمدنی پر پابندی لگائے اور جوئے سوڈ رشوت ذخیرہ اندوزی اور ناجائز منافع خوری کو مٹانے اور عوام کی خوشحالی کے لئے منصوبہ بندی کرے۔ مثلاً ایسا نہ ہو کہ اکثر لوگ زراعت چھوڑ کر صنعتوں میں چلے جائیں اور زرعی شعبہ نظر انداز کر دیا جائے یا اہل صنعت غیر ضروری اشیاء بنانے میں لگ جائیں اور بنیادی اور ضروری اشیاء کی کمی واقع ہو جائے اور ملک بحران کا شکار ہو جائے۔ اس کے لئے باقاعدہ منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ لوگوں کو زرعی پیداوار میں اضافہ کے لئے اکسایا جائے اور صنعت و حرفت میں انہی چیزوں کو بنانے کی اجازت دی جائے جو معاشرے کے لئے ضروری ہوں۔“

## 6- معاشی بگاڑ کا اخلاقیات سے تعلق:

جب پارس اور روم کے رؤسا کی حکومتیں منظم ہو گئیں تو ان کے فرمانروا امراء رؤسا عیش و عشرت میں دلچسپی لینے لگ گئے۔ یہاں تک کہ اردگرد کے ملکوں سے ایسے لوگ وہاں جمع ہونے لگ گئے جو عیش و نشاط کے لئے نئے نئے طریقے اور سامان مہیا کرتے اور خود بھی دولت سمیٹتے۔ امراء اور رؤسا اپنے لئے یہ بات باعث بے عزتی تصور کرتے کہ ان کے پاس لاکھوں روپوں کا لباس فاخرہ اور سواری کے لئے عالی شان ذرائع رہنے سہنے کے لئے فلک بوس محل اور دنیا کی خوبصورت ہاندیاں اور لوٹریاں نہ ہوں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سلطنت کے کاموں سے غافل ہو گئے۔ اپنی ہر خواہش کی تکمیل کے لئے عوام پر ناجائز نگیں لگا کر بزدور طاقت وصول کرتے۔ عوام بھی تنگ آ گئی۔ اس کی یہ حالت ہو گئی جیسے بیل اور گدھے جو ہر وقت کام میں جتے رہتے ہیں۔ ظلم اور بد اخلاقی کی انتہا ہو گئی تھی۔ انہی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے شاہ ولی اللہ اپنی تجاویز اپنی کتاب جتہ البالغہ میں اس طرح پیش کر رہے ہیں:

”بدن کو مناسب غذا نہ ملے اور انسان ہر وقت احتیاج اور تنگی کا نشانہ بن رہے تو اس کا اثر لازماً اس کے نفس پر پڑتا ہے چنانچہ اس کی اخلاقی ترقی رک جاتی ہے اور وہ ٹھٹھ کر رہ جاتا

ہے۔ پھر پریشان حالی اور افلاس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کو اپنی آخری سعادت و فلاح اور خدا سے رشتہ بندی جوڑنے کے لئے بھی مہلت نہیں ملتی اور انسان کو لہو کے نخل کی طرح صرف اسی کام میں جتا رہتا ہے۔“

اسی طرح آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں:

”جب کسب معاش کے بہترین طریقوں کا فقدان ہو جاتا ہے تو انسانوں کا ایک گروہ چاچلوسی، مصاحبت، چرب زبانی اور دربار داری کو ذریعہ معاش بنا لیتا ہے جس سے اس کے انکار غالبہ ختم ہو جاتے ہیں۔ ذہنی نشوونما کی تمام خوبیاں مٹ جاتی ہیں اور انسان لپکتی اور ذلت پر قانع ہو جاتا ہے۔“

## 7- قمار اور رشہ:

قمار اور رشہ کے متعلق شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق کو پیدا کیا اور بساط ارض پر ان کی معاش کا انتظام فرمایا اور اس سے نفع حاصل کرنے کا موقع بہم پہنچایا تو انسانوں کے درمیان جنگ و جدال اور کشمکش برپا ہو گئی۔ تب خدا کے قانون کا یہ فیصلہ ہوا کہ جو شخص ذاتی غنیمت، فراغت یا دوسرے کسی جائز اور صحیح طریق سے کسی چیز کا مالک ہے اس کی چیز میں دوسرا کوئی شخص مزاحمت اور کشمکش کا حقدار نہیں ہے البتہ دوسرے کو بدل کے ذریعے خریداری اور معتبر و صحیح رضامندی کے ساتھ معاملت سے اس چیز کو حاصل کرنے کا حق ہے بشرطیکہ خرید و فروخت کرنے والوں کے درمیان اس معاملہ کا علم و یقین ہو اور فریب اور چال بازی کا اس میں ہرگز شائبہ نہ ہو اور جبکہ انسان مدنی الطبع ہے اور اس کی معیشت باہمی تعاون کے بغیر ناممکن ہے تو حق تعالیٰ نے باہمی تعاون و معاونت کو بھی ضروری قرار دیا ہے یعنی اگر کوئی معاملہ اس طرح کیا جائے جس میں نہ صحیح بدل موجود ہو اور نہ باہمی تعاون پایا جاتا ہو بلکہ دوسرے کو نقصان دے کر نفع حاصل کرنا مقصود ہو جیسے ”قمار“ یا اس میں صحیح رضامندی موجود نہ ہو جیسے سود تو یہ تمام طریقے باطل اور ظلم ہیں اور ایسے معاملات ناجائز اور حرام ہیں۔“

[www.kitabosunnat.com](http://www.kitabosunnat.com)

## 8- جواہ اور سود:

جواہ اور سود کے متعلق شاہ صاحب فرماتے ہیں:

”واضح رہے کہ جواہ حرام اور باطل چیز ہے اس لئے کہ دراصل وہ لوگوں کے مال کو زبردستی ہتھیا لیتا ہے اور اس کی تہہ میں جہل، حرص، امید، باطل اور فریب اور دھوکا کارفرما ہوتے ہیں اور اس میں امداد باہمی اور تعاون کا ادنیٰ سا بھی دخل نہیں ہوتا ہے۔“

شاہ صاحب کے نزدیک سود کی دو قسمیں ہیں:

”ایک حقیقی رباہ کہلاتی ہے جس کو بغیر قید و بند کے حرام کر دیا گیا ہے۔ دوسری ”ربا فضل“ کہلاتی ہے جیسا کہ سونے چاندی کا کی بیشی سے لین دین کرنا وغیرہ اس لئے ان اشیاء کے خرید و فروخت کے جواز کو تسلیم کرتے ہوئے ان تمام صورتوں کو حرام بتایا گیا ہے جن کا نتیجہ سودی لین دین کے موافق نکلتا ہے تاہم اس غیر فطری کاروبار کا پوری طرح انسداد ہو جائے۔“

## 9۔ عیش پسندی اور تمدن:

شاہ صاحبؒ نے عیش پسندی کو تمدن و معیشت کے لئے راہ فساد بتایا ہے لکھتے ہیں:

”اسی طرح تمدن کی چابی و ہلاکت کے امور میں سے یہ ہے کہ یہ امت کے مالدار زیورات، لباس، مکان، خورد و نوش اور عورتوں کے حسن و زیبائش وغیرہ کی باریک بینیوں اور دقیقہ سنجیوں میں مبتلا ہو جائیں اور حاجات ضروریات سے زیادہ عیش و نعم کی زندگی میں مشغول و متہمک رہنے لگیں۔“

اور آخر کار نتیجہ یہ نکلے کہ: ”لوگوں پر اس کی وجہ سے سخت مصیبت آن پڑے مثلاً لوگوں کے لئے جو زراعت تجارت اور صنعت و حرفت کے مختلف کاموں کو فروغ دینا چاہتے ہیں اور آخر کار اس شہر یا ملک کا یہ ضرر آہستہ آہستہ ایک عضو اجتماعی سے دوسرے عضو میں سرایت کرنا جائے یہاں تک کہ تمام مخلوق ایک عام تباہی میں گرفتار ہو جائے۔“

لہذا رسول اللہ ﷺ نے ان باتوں کی طرف اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی ممانعت کر دی اور حکم دے دیا کہ اس مصنوعی اور تباہ کن عیش پسندی کو ختم ہونا چاہئے اور سادہ زندگی کو اختیار کرنا چاہئے۔

## ابن خلدون

عبد الرحمن ابن خلدون، 27 مئی 1332ء (یکم رمضان 732ھ) تونس (افریقہ) میں پیدا ہوا۔ خلدون لفظ خالہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ ابن خلدون نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی اپنے والد سے حاصل کی۔ قرآن حکیم حفظ کرنے کے بعد مختلف علوم کی طرف متوجہ ہوا اور مختلف درجہ پر پورا پورا عبور حاصل کیا۔ قرآن پاک متعدد ساتوں قرأت کے پڑھا اور حفظ کیا۔ تحصیل علم کے بعد فخر معاش دامن گیر ہوئی اور اپنے احباب کی مدد سے سلطان ابو العلق دوم کے دربار تک رسائی حاصل کی اور وہاں ملازمت اختیار کی۔ کاتب کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ ابن خلدون ایک نامور مؤرخ، ماہر معاشیات، ماہر سماجیات، ایک بہترین سیاست دان اور انسانی مسائل میں دلچسپی لینے والا بہترین طالب علم تھا۔ ابن خلدون چودھویں صدی کا درخشاں ستارہ تھا جس نے اپنے

افکار کی شعاعوں سے افریقہ کی تاریک زندگی کو روشن کیا۔ رابرٹ ٹلنڈ کہتا ہے:

”افلاطون اور ارسطو ابن خلدون کی برابری نہیں کر سکتے اور تمام سیاسی مفکرین تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا ابن خلدون جیسی مایہ ناز ہستی کے ساتھ ذکر بھی کیا جائے۔“

1382ء میں ابن خلدون قاہرہ آگیا جہاں اس نے اپنی زندگی کے بقیہ دن گزارے۔

1400ء میں وہ شاہ مصر کے ہمراہ امیر تیمور کا مقابلہ کرنے کے لئے گیا۔ تیمور بھی ابن خلدون کا قدردان بن گیا اور اس کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوا اور اس سے افریقہ کے حالات پر ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی۔ اس کی سب سے مشہور تصنیف ”مقدمہ“ ہے جو 1377ء میں مکمل ہوا۔

قاہرہ میں قیام کے دوران اس نے اپنی دو مشہور تصانیف ”عربوں کی تاریخ“ اور بربر و عجی کی تکمیل کی۔ ابن خلدون نے 1406ء میں قاہرہ میں ہی وفات پائی۔ مقام السوس ہے کہ اس عالم بے محل فلسفہ و تاریخ کے درخشاں ستارے کی قبر کا نشان تک موجود نہیں ہے۔ کسی کو علم نہیں کہ وہ کہاں دفن ہے۔ آخری عمر میں بادشاہوں اور امراء کی صحبت سے تائب ہو کر گوش نشینی اختیار کر لی تھی۔ قاہرہ میں قلعہ ابن سلام میں مقیم ہوئے۔ باقی زندگی تصنیف و تالیف میں بسر کر دی۔ مصر کی مشہور علمی درس گاہ جامع اللازہر میں بطور استاد درس و تدریس کا کام بھی کرتے رہے۔ آپ کی مشہور تصنیف ”تاریخ و مقدمہ“ ہے۔

## ابن خلدون کے معاشی افکار

### 1- تاریخ اور معاشیات کا میل جول:

ابن خلدون نے اس میل جول کا نتیجہ اس طرح اخذ کیا ہے کہ شروع کے ایام میں انسان وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ غیر زرخیز زمین پر کچھ پیدا کرنے کا علم نہ رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے کسی ایک جگہ جم کر نہ رہتے تھے بلکہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے اور معاشی ضروریات پوری کرنے کے لئے خانہ بدوشی کی حالت میں رہتے تھے۔ اپنے جان و مال کی حفاظت خود کرتے تھے۔ اجتماعی حالت بالکل سادہ تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ان میں کچھ شعور پیدا ہوتا گیا۔ پھر وہ اپنی جسمانی طاقت پر بھروسہ کرنے لگے۔ مادی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے دہر دہر تلاش کرتے پھرتے۔ پھر اللہ پاک نے انہیں کچھ اور عقل اور شعور عطا کیا۔ دماغی قوت کے زور پر ایجادات کرنے لگے۔ پھر وہ وحشیانہ طریقے چھوڑ کر کھیتی باڑی اور تجارت کرنے لگے۔ جول جول ترقی کرتے گئے ان کی حالت بدلتی گئی۔ گھاس پھوس کی بجائے اینٹوں کے مکان تعمیر کرنے لگے۔ کھانے پینے میں خاصیت اور صحت پیدا ہونے لگی۔ پھر اپنے وقت کو بہتر طریقے سے استعمال

کرنے لگے۔ انہوں نے کام تقسیم کر لئے اور ایک دوسرے کے لئے کام کرنا شروع ہوئے۔ اس طرح آہستہ آہستہ کچھ امیر اور کچھ غریب بنتے گئے۔ امیر لوگوں نے سرمایہ کا استعمال کر کے کارخانے بنانے شروع کئے۔ جہاں غریب کام کرتے جن کا معاوضہ امیر ادا کرتے اور جب یہ عمل اپنے کمال کو پہنچتے ہیں تو طبیعت کے اندر ایک تبدیلی کی خواہش ابھرتی ہے جس کا نتیجہ برپادی ہوتا ہے۔ ابن خلدون کے مطابق ہر معاشرے میں کم و بیش 120 سال بعد تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ تمام رسم و رواج بدل جاتے ہیں۔ گویا سابقہ تہذیب کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کی جگہ لینے کے لئے ایک نئی تہذیب جنم لیتی ہے۔ گویا ایک کی موت دوسرے کی پیدائش کا سبب بنتی ہے۔ انسان مہذب سے وحشی اور وحشی سے پھر مہذب بنتا ہے۔ ایک دوسرے کے مال و دولت پر بُری نظریں جماتا ہے۔ ملک گیری کی ہوس پیدا ہوتی ہے۔ جنگ و جدل کا بازار گرم ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے طاقت کا استعمال کیا جاتا ہے حتیٰ کہ اس طرح پھر 120 سال کا عرصہ مکمل ہو جاتا ہے اور پھر پہلے کی طرح نئی تہذیب جنم لیتی ہے اور پہلی کی موت واقع ہو جاتی ہے جو قوم دنیا میں زندہ رہنے کی خواہش مند ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ تہذیب و تمدن صنعت و حرفت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاق و سیرت پر بھی توجہ مرکوز رکھے کیونکہ اس کے بغیر اچھی زندگی ممکن نہیں۔

## 2- نظریہ محنت:

ابن خلدون انسانی اجزوں کو محنت کے تابع رکھتا ہے۔ اس کے خیال میں محنت ہی اصل چیز ہے۔ جتنی محنت ہو اتنی ہی اجرت ہونی چاہئے۔ اس کو وہ اس طرح ثابت کرتا ہے کہ اگر محنت نہ کی جائے تو زمین سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ نیز اگر محنت کر کے جانوروں کا دودھ نہ نکالا جائے تو وہ ان کے تھنوں میں خشک ہو جائے۔ اگر زمین میں ڈھلوان نہ بنائی جائے تو نہروں میں کبھی بھی پانی نہ پہنچ سکے۔ ہاں یہ بات لازمی ہے کہ محنت کے سلسلہ میں اس کا نظریہ یہ ہے کہ انسان سے اتنی محنت کا مطالبہ کیا جائے جتنا وہ ہوا آسانی پورا کر سکے۔ اگر اس سے بہت زیادہ محنت لی جائے گی تو اس کے اعضاء بہت جلد بے کار ہو جائیں گے اور اس طرح ایک وقت ایسا آئے گا کہ دنیا میں محنت کش ناپید ہو جائیں گے اور اس طرح تمام کام ڈک جائیں گے جس کا انجام تباہی و برباد ہوگا۔

## 3- انسانی خواہشات:

عقل کے علاوہ انسان کی اہم قوتیں اس کی خواہشات ہیں۔ یہ محض بھوک اور پیاس جیسی سادہ تحریکات سے لے کر ان وچیدہ خواہشات تک ہو سکتی ہیں جو کسی انتہائی مہذب معاشرے میں پائی جاتی ہیں۔ گویا یہ تمام خواہشات ہی فطری کہلانے کی مستحق ہیں کیونکہ ان کا

تعلق انسانی فطرت سے ہے تاہم ابن خلدون چند خواہشات کو فطری قرار دینے پر اس لئے زیادہ مائل ہے کہ یہ زیادہ بنیادی اہمیت کی مالک ہیں۔ انسانی زندگی کی ابتداء میں نمودار ہوتی ہیں یا پھر اس لئے کہ یہ زیادہ شدید اور ناقابلِ مزاحمت ہیں جو درج ذیل ہیں:

i- ان میں سے غذائی ضروریات کے تحت وجود میں آنے والی خواہشات کو ابن خلدون ”شہوتِ بدنہ“ کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ یہ بھوک اور پیاس پر مشتمل ہیں۔ یعنی کھانے پینے کی خواہش، جسمانی آسائش کی خواہش میں حدت اور شغف کی خواہشات شامل ہیں۔ بالفاظِ دیگر انسان کپڑوں اور سر چھپانے کی ضرورت محسوس کرتا ہے اس کے ساتھ ساتھ جنسی تعلق اور افزائش نسل بھی۔

ii- جسمانی خواہشات کے بعد ”غضب اور انتقام“ کا نمبر آتا ہے۔

iii- غضب اور انتقام کے برعکس ”سکون“ وہ روحانی خواہش ہے جو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو یا انسان ان رکاوٹوں پر قابو پا چکا ہو۔ فتح کے ذریعے حاصل ہونے والا سکون و حقیقتِ غضب کے خاتمے کا باعث ہوتا ہے۔

iv- اس کے بعد ”خوف“ جس کی مخالفت میں اعتماد اور اُمید کی خواہشات پائی جاتی ہیں، تحفظ کی توقع اور خطرات کا فقدان۔

v- ایک اور خواہش جو انسان میں پائی جاتی ہے وہ صحت و وابستگی کی خواہش ہے۔ رشتہ داروں کے ساتھ مل جل کر رہنے یا ان لوگوں کے ساتھ جو متعدد باتوں میں مشابہ ہیں وہ باتیں ہیں جو انسان کو معاشرت پسند بناتی ہیں۔ انسان کی یہ خواہش کئی خواہشات پر مشتمل ہے مثلاً ساتھیوں کے ساتھ رہنا، تعاون، دکھ سکھ میں شریک ہونا، اقرباء کی مدد اور دفاع کرنا۔ اس کے علاوہ یہ خواہش کہ دوسرے بھی اسی قسم کے جذبات کا مظاہرہ کریں۔

اس کے برعکس نفرت اور نقصانات پہنچانے کی خواہش بھی ہے جو غداوت اور رقابت کا سرچشمہ ثابت ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسروں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کا محرک بھی۔

ابن خلدون کے خیال میں یہ وہ بنیادی خواہشات ہیں جو انسانی معاشرے کی تشکیل اور اس کو قابو رکھنے میں محمّد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ یہ اس وقت اور بھی زیادہ مضبوطی اختیار کر جاتی ہیں جب ان کا تعلق فرد کے خاندان یا رشتہ داروں سے ہو۔ یہی خواہشات برادری اور قبیلوں کے مضبوط استحکام کا باعث ہوتی ہیں۔

ان خواہشات کے مقابلہ میں کم ضروری اور غیر اہم خواہشات وہ ہیں جن کا اظہار معاشرہ اور انسانی تنظیم کی تشکیل کے بعد ہوتا ہے۔ مثلاً:

vi- ان میں سب سے اوّل ”غلبہ“ پانے اور دوسروں پر فتح حاصل کرنے کی خواہش۔ غصب کی طرح فتح اور غلبہ کی خواہش بھی روح کو مضبوطی اور پریشانی کا باعث ہوتی ہے۔ انسان کیونکر فطری طور پر حکمانہ روش رکھتا ہے اور دوسروں پر غالب آنے اور انہیں اپنا پابند کرنے کی خواہش رکھتا ہے اس لئے یہ خواہش جنگوں کا باعث ہوتی ہے۔

vii- غلبہ اور فتح عموماً دوسری خواہشات کی تسکین کے لئے حاصل کئے جاتے ہیں مثلاً عز و جاہ اور حسب نسب وغیرہ لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ ان کا اظہار اچھی اور صحیح باتوں کے کرنے سے ہوتا ہے جیسے انصاف و عدل کے ساتھ حکومت کرنا، اپنے ملک کا دفاع کرنا اور رفاہی کام یہ اس لئے کئے جاتے ہیں کہ لوگ ان کاموں کو پسند کریں، سراہیں اور یاد رکھیں۔

viii- ایک اور خواہش ”تحصیل مال و زر“ ہے یعنی زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنا۔ دولت کا حصول اس لئے بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے ذریعے عزت، مرتبہ اور نام حاصل کیا جائے یا پھر عزت اور مرتبہ وغیرہ کا مقصد دولت کا حصول بھی ہو سکتا ہے۔

ix- شفقت ایک ایسا جذبہ ہے جو ان تمام خواہشات کی تسکین کے بعد وجود میں آتا ہے اور دوسروں کی مدد کی خواہش کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے۔

x- اس کے برعکس ”تحقیر“ دوسروں کو گرانا اور ذلیل کرنا، دوسروں کے مساوی ہونا اور تقصیر بھی ان خواہشات میں سے ہیں جن کا اظہار انسانی معاشرے میں ہوتا ہے۔ تھکید ان لوگوں کی کی جاتی ہے جو صاحب اقتدار و اختیار ہوں یا پھر کسی اور پسندیدہ شے کے حامل ہوں۔

xi- آخر میں وہ خواہشات ہیں جن کا تعلق تفریح اور تفرقہ طبع سے ہے۔ ان میں ”طرب“ الحان“ اور ”معرفت“ کی خواہشات شامل ہیں۔

#### 4۔ معاش کے طریقے:

ذریعہ معاش کے درج ذیل اہم طریقے ہیں:

i- قدرتی ذرائع سے فائدہ حاصل کرنا

ii- زراعت

iii- تجارت

iv- صنعت

#### 1۔ قدرتی ذرائع آمدنی سے فائدہ حاصل کرنا:

تمدنی اور ہدویانہ زندگی میں جو چیز مابہ الامتیاز اور مابہ الافراق ہے وہ یہ ہے کہ تمدنی

زندگی کا اکثر حصہ..... گول نہیں..... انسان کے عمل کا نتیجہ ہے بدوؤں کے لئے جو قدرتی چیزیں ضروری ہیں وہ اسی کو صرف کرتے ہیں اور اس میں بہت زیادہ محنت صرف نہیں کرتے اسی لئے ارسطو ان کی یہ تعریف کرتا ہے کہ وہ ”کامل قوم“ ہیں یا وہ یہ کہتا ہے کہ وہ لوگ شکار اور لوٹ مار پر زندگی بسر کرتے ہیں اور ایسا متواتر کام نہیں کرتے جو ان کی زندگی کا کفیل ہو حالانکہ متمدن گروہ پہلے پیداوار کے قدرتی ذرائع سے فائدہ اٹھانے پر مجبور ہوتا ہے۔ پھر ان سے جو کچھ پیدا کرتا ہے ان کو ایسی شکلوں میں ڈھالتا ہے جو ان کی ضروریات کے مناسب ہوں اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم کسب کے ان مختلف ذرائع کی تشریح کریں جو تمدنی زندگی میں استعمال کئے جاتے ہیں اس موضوع پر ابن خلدون بھی ارسطو ہی کی طرح بحث کرتا ہے لیکن یونانی فلسفہ جس چیز کی شرح بہت زیادہ اختصار و تدریج اور ترتیب کے ساتھ کرتا ہے اس کی شرح ابن خلدون نہایت طوالت اور غیر ضروری تفصیلات کے ساتھ کرتا ہے اور یہ ایک حیثیت سے تو دونوں کے ذہنوں کے اختلاف کا نتیجہ ہے پہلا تو ہر چیز سے پہلے منطقی ہے اور دوسرا ایک ہی وقت میں غیر محدود چیزوں پر نظر ڈالتا ہے جو اکثر صحیح ہوتی ہیں لیکن وہ ان کو مرتب اور منظم نہیں کر سکتا اور دوسری حیثیت سے اس بات کا نتیجہ ہے کہ اہل عرب نے کبھی اقتصاد سیاسی یا اقتصاد منزلی کا گہرا مطالعہ نہیں کیا۔

لیکن ابن خلدون نے اپنے موضوع پر ترتیب کے ساتھ بحث نہیں کی اور اس میں اس وقت نظری اور تعلق کو ظاہر نہیں کیا جس کو اپنے مقدمہ کے پہلے حصے میں ظاہر کیا تھا اس لئے وہ درحقیقت ہمارے لئے بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتا البتہ ہماری بحث میں جو چیز اہم ہے وہ یہ ہے کہ ابن خلدون نے ان مظاہر اجتماعہ کی جن کو صنعت اور علوم و فنون کی پیدائش اور ترقی پیدا کرتی ہے ایسی شرح کرنے کی ضرورت کا پورا احساس کیا جس سے ہم اجتماعی زندگی کو سمجھ سکتے ہیں۔

ابن خلدون کی یہ لذیذ محنت اس بات کی مستحق ہے کہ ہم اس پر توجہ کریں کیونکہ ہم ابن خلدون پر اس حیثیت سے بحث نہیں کرتے کہ وہ علوم و فنون کا مورخ ہے بلکہ اس فلسفی سے بحث کرتے ہیں جو مجمع کے کل مظاہر اور کل نتائج پر بحث کرتا ہے۔

ارسطو اور ابن خلدون دونوں انسان کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ قدرتی چیزوں سے فائدہ اٹھائے اور ان میں ہر ایک اس کی وہی دلیل پیش کرتا ہے جس کو دوسرا پیش کرتا ہے البتہ ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ پہلے کی دلیل خالص فلسفیانہ ہے اور دوسرا اپنی دلیل کا مادہ دینی بنیاد پر رکھتا ہے۔ ارسطو کی نگاہ میں قدرت نے اور ابن خلدون کی نگاہ میں خدا نے زمین اور زمین کے تمام خزانوں کو انسان کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے اور قرآن مجید سورج چاند اور ستاروں کا بھی اس پر اضافہ کرتا ہے۔



ارسطو کہتا ہے:

”ضروری غذا کے حاصل کرنے کا یہ ذریعہ بلاشبہ ہر مخلوق کے لئے قدرت کا عطیہ ہے نہ صرف اسکی پیدائش کے پہلے لمحہ سے بلکہ اسی طرح اس وقت تک کے لئے جب وہ پورا طاقتور ہو جاتا ہے اسلئے بلاشبہ ہمارے لئے یہ اعتقاد رکھنا جائز ہے کہ نباتات، حیوانات کیلئے اور حیوانات انسان کیلئے پیدا کئے گئے ہیں۔ ان حیوانات میں جن کو پال سکتے ہیں وہ اس کی خدمت اور غذا کیلئے مخصوص ہیں لیکن ان کا زیادہ تر حصہ (گوکھن نہیں) جو جنگلی ہے اس کی غذا لباس اور بہت سی مفید چیزوں میں اس کے کام آتا ہے اسلئے اگر قدرت نے کوئی چیز بے کار اور بلا مقصد نہیں پیدا کی ہے تو لامحالہ اس نے ان تمام چیزوں کو نوع بشر کے فائدے کیلئے پیدا کیا ہے۔“

اور ابن خلدون کہتا ہے:

”خداوند تعالیٰ نے دنیا کی تمام چیزوں کو انسان کے لئے پیدا کیا ہے اور اپنی کتاب کی بہت سی آیتوں میں اس پر اس کا احسان جتانے ہے..... دنیا اور دنیا کی کل چیزیں انسان کے اقتدار میں ہیں کیونکہ خدا نے اس کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔“

مسلمانوں میں صرف ابوالعلاء معری نے انسان کے خلاف حیوانات اور نباتات کی جانب سے مدافعت کی ہے اور وہ انسان کی طرف مطالب ہو کر کہتا ہے:

”جس چیز کی بسبب تمہارا اعتقاد ہے کہ وہ تمہاری حلال ملک ہے وہ درحقیقت تمہاری نہیں ہے تم حیوان پر صرف ظلم و جور سے اپنی حکومت کرتے ہو کیا تمہارا یہ اعتقاد ہے کہ شہد کی مکھی اپنا شہد اس لئے بناتی ہے کہ تم اس کو ہدیہ بھیجو وہ خود اپنے لئے یہ مشقت برداشت کرتی ہے۔“

جب تک دنیا کا آثار رہے گا وہ جس طرح چاہے اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے بشرطیکہ اپنے بھائیوں کے فوائد کو صدمہ نہ پہنچائے اور وہ اس مقصد کے حاصل کرنے کے تمام ذرائع کو کام میں لا سکتا ہے لیکن ان ذرائع کی دو قسمیں ہیں قدرتی اور اصطلاحی۔ پہلے ذرائع سے جنگلی آدمی کام لیتے ہیں اور وہ تمدن سے پیدا نہیں ہوتے۔ ان کی ایجاد اور ترقی تو تمدن کے عمل عافیت میں ہوتی ہے لیکن وہ تمدن کے بنائے ہوئے نہیں ہوتے۔

اگرچہ ارسطو اور ابن خلدون دونوں حقیقہ طور پر انسان کو قدرت سے فائدہ اٹھانے کا حق دیتے ہیں تاہم اپنے بنیادی اصول کی تطبیق میں دونوں مختلف ہیں۔ ارسطو غلامی کو قائم رکھتا ہے اور اس کو جائز قرار دیتا ہے اور یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ کچھ لوگ آزاد زندگی بسر کرنے کے لئے اور کچھ لوگ غلام بننے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اس بناء پر پہلی قسم کے لوگوں کو دوسری قسم کے لوگوں سے خدمت لینے کا حق حاصل ہے۔

لیکن ابن خلدون غلامی کو قائم نہیں رکھتا البتہ مذہب نے اس کی اجازت دی ہے اپنی

دیکھ لیں کہ انسان کی غذائی کسب کا قدرتی ذریعہ نہیں ہے بلکہ وہ صرف عارضی ذریعہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان فطرتاً آزاد ہے اور مجتمع میں انصاف کے پھیلنے اور ترقی کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اجتماع کا پہلا مقصد اس آزادی کی ضمانت اور شرف بشری کا احترام ہو۔ یہ وہ شرف ہے جس کو انسان نے اس خدا سے حاصل کیا ہے جس نے اس کو اپنی زمین کا خلیفہ بنایا ہے۔ با اس ہمہ ابن خلدون غلامی پر صراحت کے ساتھ اعتراض نہیں کرتا تا کہ مسلمان برہم نہ ہو جائیں بلکہ صرف اس قدر کہنے پر قناعت کرتا ہے کہ آقا کی خدمت کرنا ایک ذلت ہے اور جس بہادر کے دل میں ذرہ برابر بھی خودداری ہوگی وہ اس ذریعے سے اپنی معاش حاصل کرنے پر کبھی راضی نہ ہوگا۔

اسی طرح جنگ کے مسئلے میں بھی دونوں متفق نہیں ہیں۔ ارسطو جنگ کو کسب کے قدرتی ذرائع میں شمار کرتا ہے لیکن ابن خلدون جنگ اور سپہ سالاری کا شمار ان ذرائع میں نہیں کرتا اور اس کا سبب بھی بیحد ہی ہے یعنی خداوند تعالیٰ نے کچھ لوگوں کو ریاست اور حکومت کے لئے اور دوسرے لوگوں کو فرمانبرداری اور اطاعت کے لئے نہیں پیدا کیا ہے اور سچ بات تو یہ ہے کہ انسانیت اور اس کے حقوق کا خیال ابن خلدون کے یہاں ارسطو کے خیال سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہے۔

کسب کے ذرائع اور انسان کی بدویانہ اور شہری زندگی کے درمیان ایک مضبوط تعلق ہے۔ یہ ذرائع بدویانہ زندگی میں زیادہ تر محدود ہوتے ہیں لیکن شہری زندگی میں پیچیدہ اور زیادہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی پیچیدگی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ حقیقی فن بن جاتے ہیں جن کی تعلیم و مشق کے لئے ایک طویل مدت تک اساتذہ کی نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے اس معاملے میں شہری زندگی کی ایک مصنوعی خصوصیت ہے یعنی خود انسان اس کو پیدا کرتا ہے خود اس سے کام لیتا ہے اور خود اس کو ترقی دیتا ہے۔

## ii - زراعت:

ابن خلدون کے خیال میں کسب کا پہلا قدرتی ذریعہ صرف زراعت ہے اور یہ ایک ایسا پیشہ ہے جس میں قبیلہ اس وقت مشغول ہوتا ہے جب وہ ایک جگہ قیام کرتا ہے۔ وہ انسان کا قدیم ترین پیشہ بھی ہے کیونکہ وہ فطرت سے بہت زیادہ قریب ہے۔ اسی لئے عوام کا اعتقاد ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے زراعت کے پیشہ کو پیدا کیا۔

ابن خلدون کہتا ہے کہ وہ نہایت سادہ ذریعہ ہے کیونکہ اس کے لئے علم اور تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی البتہ وہ ترتیب علوم ہی کے درمیان زراعت کا بھی ذکر کرتا ہے لیکن جو کتابیں زراعت سے تعلق رکھتی ہیں وہ صرف علماء کے نزدیک اہمیت رکھتی ہیں حالانکہ وہ زراعت کا کام

بالکل نہیں کرتے اور کھیتی کرنے والے خواہ ابن خلدون کے زمانے میں ہوں خواہ ہمارے زمانے میں ہوں قواعد علیہ کی پابندی نہیں کرتے بلکہ وہ صرف ان تجربوں کے مطابق زمین کی کاشت کرتے ہیں جو عام طور پر معلوم ہیں اور سالہا سال سے ان کی روایت ہوتی چلی آئی ہے۔ بھجج زراعت کے بغیر زندگی نہیں بسر کر سکتا کیونکہ ہر چیز سے پہلے وہ انسان اور حیوان کی ضروری غذاؤں کی پیداوار کا ذریعہ ہے۔ اس کے ساتھ اور تمام ذرائع آمدنی سے اس کی پیداوار سب سے زیادہ ہوتی ہے اور اس میں سب سے کم تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے اور جس طرح وہ کاشت کاروں کا ذریعہ آمدنی ہے اسی طرح حکومت کا ذریعہ آمدنی بھی ہے کیونکہ ٹیکس کا زیادہ تر حصہ محرومہ زمینوں اور ان کی پیداواروں پر لگایا جاتا ہے اس لئے جو حکومت اپنی اور اپنی رعایا کی فوز و فلاح کی ذمہ دار ہونا چاہتی ہے اس کا فرض ہے کہ کاشتکاروں کی حوصلہ افزائی کرے۔

لیکن زراعت زراعت کرنے والوں کی ذلت کا بھی سبب ہوتی ہے اور جنگی قابلیت کو نقصان پہنچاتی ہے۔ ابن خلدون نے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک دن جب رسول اللہ ﷺ نے اہل مدینہ میں سے ایک شخص کے پاس مل دیکھا تو فرمایا: ”یہ جس قوم کے گھر میں آیا اس میں لازمی طور پر ذلت آئی۔“ اس نے اس کی یہ تفسیر کی ہے کہ کاشتکار ٹیکس دینے پر مجبور کیا جاتا ہے لیکن اس حدیث کی صحت پر ہم کس قدر اعتقاد رکھ سکتے ہیں؟ ابن خلدون نے اس کے متعلق کچھ نہیں لکھا لیکن بخاری جنہوں نے یہ حدیث روایت کی ہے کے تمام نقاد متفق ہیں کہ وہ بعض غلطیوں سے محفوظ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ صرف کاشتکار ہی ٹیکس نہیں ادا کرتا کیونکہ تاجر بلکہ ایک معمولی آدمی بھی جو کچھ دولت رکھتا ہے ٹیکس ادا کرتا ہے۔

لیکن زراعت کی پیداوار اس سے زیادہ ہوتی ہے بھتا کاشت کار صرف کرتے ہیں اس کے علاوہ کاشتکاروں کی بہت سی ضرورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو زراعت پورا نہیں کر سکتی اس لئے وہ اپنی فاضل پیداوار کے بدلے میں بعض دوسری چیزیں لیتے ہیں اور انہیں سے تجارت پیدا ہوتی ہے جو ابن خلدون کی رائے میں کسب کا ایک قدرتی ذریعہ ہے۔

### iii- تجارت:

ابن خلدون تجارت پر عیسائی بحث نہیں کرتا اور اس کی تاریخ اس ذہانت اور تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کرتا جیسا کہ مون تھی کیو نے بیان کیا ہے اور اس کا سبب معمولی ہے اور وہ یہ کہ وہ اس تاریخ سے ناواقف تھا نیز اس لئے کہ تجارت اس کے زمانے میں اور اس کے شہر میں وہی پرانی شکل پر قائم تھی اور دور جدید میں اس نے جو وسعت اور پیچیدگی حاصل کر لی ہے اس وقت تک وہ اس درجے تک نہیں پہنچی تھی یا یہ کہ رومن دنیا میں اس نے جس درجہ تک پہنچنا شروع کیا تھا وہ اس سے بھی محروم تھی۔ ابن خلدون تجارتی کمپنی سے بھی ناواقف تھا کیونکہ جیسا کہ تاریخ

بتاتی ہے یہ یعنی طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ عالم اسلام میں تجارتی جماعتیں کبھی نہیں پائی گئیں بلکہ وہ آج بھی اپنے دور پیدائش میں ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ابن خلدون نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ تجارت کی پہلی شکل ضروری سامانوں کا باہمی تبادلہ تھا اور نقد کے ساتھ ان سامانوں کی خرید و فروخت اس کے بعد ہوئی اور وہ اس مناسبت سے مسلمانوں کے یہاں سکے کی تاریخ تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے اور سچائی کے ساتھ یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ مسلمانوں نے سکے کا نظام ایرانیوں اور یونانیوں کے یہاں سے اپنے یہاں منتقل کیا اور انہوں نے پہلی صدی ہجری کے آخر میں جب وہ یونانی اور ایرانی تمدن سے واقف ہوئے سکے ڈھالنا شروع کیا اور جب نقدی کاروبار کا دستور شروع ہوتا ہے تو انسان صرف اسی پر قناعت نہیں کرتا کہ وہ اسی قدر نقدی حاصل کر لے جو صرف اس چیز کی قیمت کے برابر ہو جو بیچی جاتی ہے بلکہ وہ اس چیز میں تصرف کرنے کے اس سے فائدہ بھی حاصل کرنا چاہتا ہے اور تجارت میں یہ ایک عظیم الشان انقلاب ہے کیونکہ تجارت درحقیقت صرف یہ ضرورت پوری نہیں کرتی کہ وہ چیز حاصل کی جائے جو زندگی کے لئے ضروری ہے بلکہ وہ دولت حاصل کرنے کی خواہش کو بھی پورا کرتا ہے۔

اس وقت تجارت ایک فن بن جاتی ہے اور ابن خلدون ماہرین تجارت سے اس کی یہ تعریف نقل کرتا ہے:

”فن تجارت کے معنی یہ ہیں کہ تھوڑی سی قیمت پر خرید جائے اور زیادہ قیمت پر فروخت کیا جائے۔“ ایسی حالت میں جو تاجر اپنے فوائد کا حریص ہے اس کو چاہئے کہ شہر میں صرف وہی سامان لائے جو عام طور پر تمام باشندوں کے لئے مفید ہو اور چھوٹے شہر میں جہاں پیش پرستی کی ضرورتیں محدود ہوتی ہیں۔ تاجر کو خاص طور پر ضروری سامان فروخت کرنا چاہئے اسی طرح دورآمد پیش تاجر کو بازار کو دیکھتے رہنا چاہئے تاکہ وہ بیچنے کا بہترین وقت انتخاب کر سکے ورنہ وہ اپنے آپ کو تباہ کر دے گا۔

ابن خلدون نے یہ خیال بھی ظاہر کرتا ہے کہ تجارت کی دو قسمیں ہیں: ایک تو وہ تجارت جس کو تاجر ملک کے اندر کرتے ہیں اور دوسری وہ جو ملک کے باہر کرتے ہیں۔ اس مناسبت سے وہ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ جو چیزیں دور دراز ملکوں سے لائی جاتی ہیں ان کی قیمتیں لازمی طور پر اس شہر کی چیزوں کی قیمتوں سے جہاں یہ چیزیں لائی جاتی ہیں گراں ہوتی ہیں کیونکہ تاجر ان سامانوں کی اصلی قیمت پر اپنے سطروں کے مصارف اور اپنی محنت کے معاوضے کا بھی اضافہ کر لیتے ہیں۔ وہ اس کی مثال میں ان سامانوں کو پیش کرتا ہے جو سوڈان سے مراکش میں لائے جاتے ہیں۔ یا مراکش سے سوڈان میں لے جائے جاتے ہیں اور ان کا مقابلہ ان سامانوں کی قیمتوں سے کرتا ہے جو ان کی پیداوار کے مقامات پر ہوتی ہیں۔

اسی طرح جو شخص اس نیک زمانے سیاست اور اخلاق کی تاریخ سے واقف ہونا چاہتا ہے اس کے لئے ابن خلدون صحیح نظر کیے پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تاجر کے لئے فائدہ سے بہرہ اندوز ہونا مطلقاً ممکن نہیں ہے بلکہ اس کو یہ فائدہ حکومت کی قوی ضمانت سے حاصل کرنا چاہئے کیونکہ دو خطرے اس کو ہمیشہ دھمکی دیتے رہتے ہیں: ایک تو یہ کہ اکثر خریدار حدین نہیں ہوتے اور جب تاجر ان کے ہاتھ ادھار فروخت کرتا ہے تو اپنا حق ایک طویل زمانے کے بعد اور تقاضا کرنے پر پاتا ہے۔ اس کے لئے خود کاغذوں یا بڑے عہدہ داروں کی خدمت میں ہدایا پیش کر کے یا خوشامد کر کے ان سے دوستی کرنی پڑتی ہے۔ دوسرے اس کے لوٹنے سے ہار نہیں آتی اس مصیبت سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پایہ تخت کے ایک ہوشیار آدمی یا کسی بڑے عہدہ دار کے اثر کا احاطہ حاصل کیا جائے۔

یہ ان اسباب میں سے جن سے ابن خلدون نے یحییٰ بن تہیمہ نکالا ہے جو مون قس کیو نے نکالا ہے۔ ایک سبب ہے یعنی یہ کہ تجارت اخلاق کو خراب کر دیتی ہے ایک دوسرا سبب اور بھی ہے اور وہ یہ کہ تجارت حرص کے مادے کو بہت زیادہ براہمیت کر دیتی ہے اور ان ذرائع سے فائدہ حاصل کرنے میں اکثر کی اخلاق اور مذہب مخالفت کرتے ہیں۔ ہاں ہم مون قس کیو کی طرح ابن خلدون کا بھی یہ خیال ہے کہ سخت اخلاق کے نرم کرنے میں تجارت کا عہدہ اثر پڑتا ہے۔

لیکن ابن خلدون کا یہ فیصلہ عام نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بہت سے تاجر ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اپنی دولت کی کثرت اور اپنی وجاہت کی وجہ سے خود تجارت نہیں کرتے بلکہ اس کو آزاد شدہ غلاموں اور نوکروں کے سپرد کر دیتے ہیں اور اس طریقے سے اس خرابی سے بچ جاتے ہیں جو اس پیشے کو لاحق ہو جاتی ہے۔

ابن خلدون احکام (یعنی گراماں فردوشی کے وقت کے انتظار میں غلبہ وغیرہ کو روک رکھنا) کی مذمت کرتا ہے کیونکہ وہ خریداروں اور خود تاجروں کے فوائد کے لئے مضر ہے۔ وہ تجارت سے متعلق ایک لذیذ توضیح پیش کرتا ہے جس سے اس کی ذہنیت معلوم ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان خریداروں کی رد میں جو معمولی چیز کی قیمت بہت زیادہ دیتے ہیں ان قیمتوں سے لگاؤ رکھتی ہیں اس لئے تاجر کو بھی اس کے فائدے سے برکت نہیں ہوتی اور یہ بھی مادی زندگی میں روج کی محلی تاثیرات میں سے ایک تاثیر ہے۔

#### iv- صنعت:

کسب معاش کا تیسرا ذریعہ صنعت ہے اور اس سے چند فن اور چند پیشے مراد ہیں جن میں بعض بدویانہ زندگی میں بھی پائے جاتے ہیں کیونکہ وہ ضروری حاجتوں کو پورا کرتے ہیں مثلاً

کپڑا بننے کا پیشہ لیکن بعض دوسرے پیشے صرف تمدنی زندگی میں پائے جاتے ہیں جو اسی زندگی کا نتیجہ ہیں مثلاً گرمی اور سردی سے بچنے کی ضرورت ایک بدو کو بھی ہے اس لئے وہ ان کا محتاج ہے لیکن اس کی موٹی جھوٹی زندگی اور دائمی بادیہ گردی اس کو امراض سے محفوظ رکھتی ہیں اس لئے برخلاف اہل شہر کے اس کو اطباء کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تمدن ایسے نئے پیشے بھی پیدا کر دیتا ہے جو افراد میں ایک ایسی خواہش پیدا کر دیتے ہیں جن سے روزی کمانے کے علاوہ اور چیزوں کے متعلق بھی وہ غور و فکر کرنے لگتے ہیں اس خیال سے وہ ان پیشوں کی ترقی دینے کے لئے عمل کرنے لگتے ہیں۔ غرض جس قدر تمدن ترقی کرتا ہے نئی نئی ضرورتیں پیدا کرتا ہے اور ان کے پورا کرنے کے لئے پیشے بھی پیدا کرتا ہے جو مختلف پیشہ شہروں میں مشہور ہیں ابن خلدون ان کی تعداد تفصیل کے ساتھ گناتا ہے اور مفصل طور پر ہر ایک کی شرح کرتا ہے لیکن اس معاملے میں اس نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اگرچہ بعض اوقات ایسی لذیذ تفصیلات پر مشتمل ہوتا ہے جو مورخین کے لئے مفید ہوتی ہیں تاہم ان میں ہر ایک کی تحلیل کرنا تکلیف دہ ہے۔

### 5۔ حکومت کی ذمہ داری:

ابن خلدون کے نزدیک مخلوق خدا کی معاشی ضروریات کو پورا کرنا حکومت وقت کا کام ہے۔ اس لئے حکومت کو ایسے ذرائع اور وسائل پیدا کرنے چاہئیں کہ جہاں عوام محنت کر کے اس کے عوض اپنی معاشی ضروریات مثلاً روٹی، کپڑا، مکان، صحت پوری کر سکیں۔

## ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی 1931ء میں بھارت میں پیدا ہوئے۔ آپ بہت سی کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی اب تک تقریباً 16 کتابیں انگلش 13 کتابیں اردو اور 7 کتابیں عربی زبان میں چھپ چکی ہیں۔ ان کے علاوہ آپ مختلف زبانوں مثلاً انگریزی، ملائیشین، ترمکش، فارسی اور ہندی زبانوں میں چھپنے والے مواد کا ترجمہ کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے 1966ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (انڈیا) سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے 1960ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے ہی معاشیات (Economics) میں ایم۔ اے کیا۔

### Teaching & Research-Experience:

- ★ Distinguished University Professor at the International Islamic University, Kuala Lumpur, Malaysia, August-

September 2006.

- ★ Consultant to a private firm, American Islamic Finance, based in Los Angeles, June 2004 to December 2005.
- ★ Visiting Scholar, Islamic Research and Training Institute, Islamic Development Bank, Jeddah, Saudi Arabia, November 2002- April 2003.
- ★ Fellow, Center for Near Eastern Studies, University of California, Los Angeles, Fall 2001.
- ★ Professor of Economics, King Abdul Aziz University, Jeddah, Saudi Arabia. 1978-2000.
- ★ Professor of Islamic Studies, Aligarh Muslim University, India. 1977-1983.
- ★ Reader (Associate Professor) in Economics, Aligarh Muslim University, India. 1975- 1976.
- ★ Lecturer (Associate Professor) in Economics, Aligarh Muslim University, India. 1961- 1974.

### Academic Honors:

- ★ Professor Emeritus, Aligarh Muslim University, Department of Business Administration, 2010
- ★ Awarded King Faisal International Prize for Islamic Studies, 1982
- ★ Shah Waliullah Award for 2001, Institute of Objective Studies, New Delhi, May 2003
- ★ American Finance House Award, 1993
- ★ Award for Life-long Contributions of Islamic Insurance and Banking, Takaful Forum, New York, 2000
- ★ Topped the list of successful candidates, at the B.A. and M.A. exams at A.M.U., Aligarh (1958 & 1960)

ذیل میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی چند کتابوں سے حوالے درج کئے جا رہے ہیں:

### ۱۔ اسلام کا نظام محاصل:

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے اپنی کتاب ”اسلام کا نظام محاصل“ میں محاصل سے متعلق

لکھتے ہیں:

- 1- تمام محصولات کی شرح کا تعین مرکزی حکومت کرے۔
- 2- یہ شرحیں ایسی ہوں کہ خراجی یا محصول ادا کرنے والوں کی قوت برداشت سے زیادہ نہ ہوں۔
- 3- مقامی افسران کو اس میں اضافہ کرنے یا کمی یا کوئی اور طریقہ وصولی اپنانے کا اختیار نہ ہو۔
- 4- عام رعایا سے کسی قسم کے نذرانے، تحفے، تحائف، دعوتیں لینے کی سخت سے ممانعت ہو۔
- 5- محصول کی وصولی میں نرمی اور اخلاق کا استعمال ہو۔
- 6- محصولات فصل تیار ہوتے ہی وصول کر لئے جائیں تاکہ غلہ کھیتوں میں پڑا خراب نہ ہو۔
- 7- وصولی کے وقت ناپ تول کے پیمانے ٹھیک اور درست ہونے چاہئیں۔
- 8- تمام خراج کی تقسیم بھی پیمانوں کے ذریعے کی جائے نہ کہ اندازے سے تاکہ کسی کو نقصان نہ پہنچے۔
- 9- خراج اور محصولات کی وصولی میں مار پیٹ سے کام نہ لیا جائے۔
- 10- وصول کے کام پر دیانت دار اور خدا خوفی رکھنے والے افسران مقرر کئے جائیں۔
- 11- وصولی کرنے والے عملہ کو معقول معاوضہ ادا کیا جائے۔ جو ان کی اپنی ضروریات یا آسانی پوری کر سکے۔ اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ وہ بددیانتی نہیں کریں گے۔
- 12- عاملین محصولات پر کڑی نگرانی رکھی جائے۔
- 13- اگر کوئی عامل یا افسر بددیانتی کا مرتکب ہو تو اسے دوبارہ پھر بھی اس کام پر نہ لگایا جائے۔
- 14- خراج ادا کرنے والوں سے کسی قسم کا زائد خرچہ جیسے عاملین کی اجرت، بار برداری کے اخراجات، بار دانه کا خرچہ، اناج اکٹھا کرنے والوں کے قیام و طعام جیسے اخراجات وصول نہ کئے جائیں۔
- 15- بار برداری میں اگر اناج میں کچھ کمی بیشی ہو جائے تو اس کو اعلیٰ خراج یا عام کاشتکار پر نہ ڈالا جائے۔



16- خراج ادا کرنے والوں پر حکومت اپنا ہنگامی خرچ کا بوجھ نہ ڈالے۔

ii- بغیر سود کے بنکاری:

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے اپنی کتاب ”بغیر سود کے بنکاری“ (Banking Without Interest) میں اس طرح بحث کی ہے:

”بنک کی تشکیل جائز شک کہنیوں کے اصول پہ کی جائے گی۔ کچھ لوگ شیئر کپٹل (Share Capital) فراہم کریں گے۔ شراکت یا مضاربیت کی بنیاد پہ مشترکہ سرمایہ کاری کی جائے گی۔ جو افراد سرمایہ مہیا کریں گے انہیں شیئر ہولڈرز کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔ ان کی کم از کم تعداد دو ہوگی مگر اصولاً کوئی تعداد مقرر نہیں کی گئی۔ تاہم کم از کم اور زیادہ سے زیادہ تعداد پر پابندی لگائی جاسکتی ہے۔ مقام اور وقت کے لحاظ سے تفاوت ہوگا۔ ہر حصہ دار کی رقم یکساں یا کم و بیش ہو سکتی ہے۔ ہر حصہ دار چند حصص خریدنے کا پابند کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کم از کم اور زیادہ سے زیادہ سرمایہ کی حد بھی متعین کی جاسکتی ہے۔ آخر کار ہر حصہ دار اپنے اثاثوں (Asset) کی پوزیشن کے مطابق بنک کا مالک ہوگا۔“

### 3- مقاصد شریعت:

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی یہ کتاب مرکزی مکتبہ اسلامی نے 2009ء میں شائع کی۔ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی علمی دنیا میں صاحب فکر محقق کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں اسلامی معاشیات آپ کا انحصاری موضوع ہے جس پر آپ کی گرانقدر کاوشیں ہیں۔

مقاصد شریعت پر آپ نے جو مباحث پیش کئے ہیں وہ واقعی آپ کی فکر اور تحقیق کی آئینہ دار ہے یہ الگ بات ہے کہ اس میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن سے اتفاق فقہ کے عام طالب علم کے لئے بھی مشکل ہے لیکن اس کے باوجود یہ کتاب موضوع کے مقاصد پر اہم اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کی تالیف کا مقصد بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے دو بڑی اہم وجہیں لکھی ہیں جس سے آپ کی فکر کا اندازہ ہوتا ہے:

1- اول یہ کہ نئے پیش آمدہ مسائل میں حکم شرعی کی تلاش میں ان مقاصد اور حکمتوں سے استفادہ کے طریقے بتائے جائیں۔

2- دوسرے یہ کہ مقاصد کی بحث فقہی احکام تک محدود نہیں ہے بلکہ دعوت و تربیت اور اصلاح معاشرہ جیسے اہم کاموں میں بھی مقاصد شریعت سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

کتاب کے ابواب پر نظر ڈالنے سے موضوع کی وسعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ابواب اس طرح ہیں:

- 1- مقاصد شریعت ایک عصری مطالعہ
  - 2- مقاصد شریعت کی پہچان اور تطبیق میں عقل اور فطرت کا حصہ
  - 3- مقاصد شریعت کے فہم و تطبیق میں اختلاف کا حل
  - 4- مقاصد شریعت کی روشنی میں اجتہاد کی حالیہ کوششیں
  - 5- مقاصد شریعت کی روشنی میں معاصر اسلامی مالیات کا جائزہ
  - 6- مقاصد شریعت اور مستقبل انسانیت
  - 7- مقاصد شریعت ..... فہم اور تطبیق
- ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی رائے ہے کہ مقاصد کی فہرست میں اضافہ کی ضرورت ہے آپ لکھتے ہیں:

”روایتی فہرست میں سارا زور دفع معصرت پر ہے جبکہ منفعت کا پہلو دب گیا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ موجودہ عالمی اور قومی سطح کے مسائل میں ماحولیاتی حالات پر کنٹرول، کائنات کے قدرتی وسائل کا بچاؤ، عمومی اور کُل جہانی بچانے والے آسٹھوں کے استعمال اور ان کی پیداوار پر پابندی اور موجودہ نیوکلیائی ہتھیاروں نیز کیمیائی اور حیاتیاتی آسٹھوں کا تلف کیا جانا اور اقوام عالم کے باہم امن و چین سے رہ سکنے کے دوسرے تقاضے پورے کرنے سے یہ بہتر ہے کہ ان امور سے مناسبت رکھنے والی اسلامی تعلیمات کو اہمیت کے ساتھ پیش کیا جائے۔ مسئلہ یہ نہیں کہ منطقی طور پر کیا بات کس بات سے نکالی جا سکتی ہے اہم بات یہ ہے کہ نئے حالات میں اسلام اور مسلمانوں کو سیاسی معاشی اور سماجی امور میں دنیا کی رہنمائی کے لئے کس طرح سے زیادہ مدد مل سکتی ہے۔ ہمارے خیال میں گلوبلائزیشن کے چیلنجوں سے عہدہ برآ ہونے میں مقاصد شریعت کی فہرست میں ان چیزوں کے اضافہ سے مدد ملے گی جن کی مقصودیت کو کتاب کو سنت کی سند تو حاصل ہے مگر اب سے پہلے ان کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔“

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے اس فہرست میں جن باتوں کا اضافہ کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

1- انسانی عز و شرف

2- بنیادی آزادیاں

3- عدل و انصاف

4- ازالہ غربت اور کفالت عامہ

5- سماجی مساوات اور دولت و آمدنی کی تقسیم میں پائی جانے والی ناہمواری کو بڑھنے سے روکنا

## ڈاکٹر یوسف عبداللہ قرضاوی

ڈاکٹر یوسف قرضاوی عالم اسلام کے ممتاز ترین سنی العقیدہ عالم دین ہیں۔ آپ 9 ستمبر 1926ء کو مصر میں پیدا ہوئے۔ وہ دو برس عالمی اتحاد برائے مسلم علماء کے صدر رہے۔ آپ ابھی کم عمر تھے کہ آپ کے والد انتقال کر گئے جس کے بعد آپ کے چچا نے آپ کی پرورش کی۔ ان کے خاندان والے انہیں دکاندار یا بڑھتی بننے کو کہتے تھے تاہم وہ اس دوران میں قرآن مجید حفظ کرتے رہے۔ نو برس کی عمر میں حفظ مکمل کر لیا۔ ڈاکٹر یوسف قرضاوی اخوان المسلمون کے بانی امام حسن البنا کے حقیقت مند تھے۔ ان تک یہ تعلق جوانی میں بھی برقرار رہا۔ اخوان المسلمون کے ساتھ تعلق کی بنیاد پر انہیں پہلی بار 1949ء میں جیل بھی جانا پڑا۔

ڈاکٹر یوسف قرضاوی کی بعض تصانیف نے مصری حکومت کو مشتعل کر دیا چنانچہ ان کی قید و بند کا سلسلہ جاری رہا۔ آپ جامعہ الازہر میں بھی زیرِ تعلیم رہے۔ بعد ازاں وہ مصری وزارت مذہبی امور میں کام کرتے رہے۔ پھر آپ قطر چلے گئے جہاں مختلف یونیورسٹیوں میں تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اسی طرح وہ الجزائر کی یونیورسٹیوں میں مختلف فہمہ داریاں ادا کرتے رہے۔

ایک طویل عرصہ تک وہ اخوان المسلمون میں سرگرم رہے اسی دوران میں انہیں اخوانی قیادت نے مختلف مناصب کی پیشکش کی لیکن انہوں نے انہیں قبول نہیں کیا۔ ڈاکٹر یوسف قرضاوی یورپین کونسل فار قادی ایڈریسز کے سربراہ ہیں۔ انہیں عرب دنیا میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے۔ وہ اسلام آن لائن ڈاٹ نٹ پر بھی لوگوں کے سوالات کے جوابات اور فتاویٰ جاری کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت ڈاکٹر یوسف قرضاوی کو معتدل و قدامت پسند قرار دیتی ہے۔ ان کے خیال میں یوسف قرضاوی عصر حاضر کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ بعض لوگ انہیں سخت گیر اسلام پسند قرار دیتے ہیں جو عالمگیر انسانی حقوق جمہوریت کے بعض بنیادی اصولوں کو مسترد کرتے ہیں۔

ڈاکٹر یوسف قرضاوی فلسطینیوں کے اسرائیلیوں پر حملوں کے زبردست حامی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسرائیلی فوجیوں کے خلاف خودکش دھماکے جائز ہیں کیونکہ وہ قابض اور غاصب

ہیں۔ وہ انہیں اشتہادی حملے قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ خود کش حملے صرف اس وقت جائز ہوں گے جب اپنے دفاع کا کوئی دوسرا راستہ نہ رہے۔ ان کے بارے میں ایک تاثر یہ ہے کہ وہ عام اسرائیلی شہریوں کے خلفاء حملوں کے بھی حق میں ہیں تاہم ان کا کہنا ہے کہ وہ اسرائیلی شہری جو فوجی خدمات بھی سرانجام دیتے ہیں عام شہری کی تعریف میں نہیں آتے۔

ڈاکٹر یوسف قرضاوی کے اس موقف کی بناء پر ایک طبقہ انہیں دہشت گردی کا حامل قرار دیتا ہے۔ تاہم شیخ القرضاوی کا کہنا ہے کہ وہ اس قسم کے حملے صرف اسرائیلی اہواف کے خلاف جائز ہیں اس کے علاوہ کہیں بھی ان کی اجازت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 20 مارچ 2005ء کو دوحہ قطر میں کار بم دھماکا ہوا تو انہوں نے اس کی شدید مذمت کی تھی۔ اس واقعے میں ایک برطانوی شہری جان ایلیز مارا گیا تھا۔ شیخ کا کہنا تھا کہ اس قسم کے واقعات ایسے لوگ کرتے ہیں جو اسلامی تعلیمات سے ناواقف ہیں۔ ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ دشمنوں کے ہاتھوں کھیل رہے ہوتے ہیں۔

2006ء میں اسرائیل حزب اللہ جنگ شروع ہوئی تو ایک مسلمان سکالر عبداللہ بن جبرین نے فتویٰ جاری کیا کہ مسلمانوں کے لئے حزب اللہ جیسے دہشت گرد گروہ کی حمایت جائز نہیں کیونکہ یہ شیعہ ہیں۔ تاہم ڈاکٹر یوسف قرضاوی نے کہا کہ مسلمانوں پر اسرائیل کے خلاف حزب اللہ کی مدد لازم ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ شیعہ اور سنی اسلام کے بنیادی اصولوں پر متفق ہیں۔ اختلاف صرف فردی مسائل پر ہے۔ اسی طرح انہوں نے عراق کے سنیوں اور شیعوں سے بھی درخواست کی تھی کہ وہ خانہ جنگی ختم کریں۔

14 اپریل 2004ء کو اسلام آن لائن پر ایک فتویٰ جاری کیا کہ تمام مسلمان امریکی اور اسرائیلی مصنوعات کا بائیکاٹ کریں کیونکہ وہ ان مصنوعات کے بدلے حاصل ہونے والی رقم سے مصوم فلسطینی بچوں کے جسم چھلکی کرنے کے لئے گولیاں اور دیگر اسلحہ خریدتے ہیں۔ اسرائیلیوں کی مصنوعات خریدنا دشمن کی وحشت و جارحیت میں مدد کرنے کے مترادف ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم دشمنوں کو کمزور کریں اگر ان کی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنے سے وہ کمزور ہوتے ہیں تو ہمیں ایسا کرنا چاہئے۔

ڈاکٹر یوسف قرضاوی کا کہنا ہے کہ امریکہ دوسرا اسرائیل بن چکا ہے۔ امریکہ اسرائیل کو رقم، اسلحہ سمیت سب کچھ فراہم کر رہا ہے تاکہ فلسطینیوں کو نیست و نابود کر دے۔

ڈاکٹر یوسف قرضاوی کا کہنا ہے کہ پوری دنیا کے مسلمانوں کو گرین وچ ٹائم کے بجائے کہ عمرہ کے ٹائم کو مد نظر رکھنا چاہئے۔ وہ تصویر کشی کو جائز قرار دیتے ہیں۔ وہ عالم اسلام میں جمہوریت کے قیام کے حامی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مشرق وسطیٰ میں سیاسی اصلاحات کی شدید ضرورت ہے۔

ڈنمارک کے ایک کارٹونسٹ نے پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے حوالے سے توہین آمیز کارٹون بنائے تو ڈاکٹر یوسف قرضاوی نے شدید غم و غصے کا اظہار کیا تاہم ان کا کہنا تھا کہ اس کے جواب میں تشدد کرنا جائز نہیں۔ تاہن البون کے واقعہ کی خبر سننے ہی ڈاکٹر یوسف قرضاوی نے تمام مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ زہیوں کے لئے خون کے عطیات دیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلام صبر و تحمل کا دین ہے۔ وہ انسانی جان کی حفاظت پر زور دیتا ہے۔ معصوم انسانوں پر حملہ گناہ عظیم ہے۔

ڈاکٹر یوسف قرضاوی کا کہنا ہے کہ عراق میں جانے والے سارے امریکی ”حملہ آور“ متصور ہوں گے۔ ان کے درمیان فوجی یا سولین کی کوئی تفریق نہیں اس لئے ان کے خلاف جہاد فرض ہے تاکہ عراق سے انخلاء پر مجبور ہو جائیں۔

ڈاکٹر یوسف قرضاوی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ میں جہاد یعنی ”جدوجہد“ کا لفظ استعمال کر رہا ہوں ”قتل“ کا نہیں۔

ڈاکٹر یوسف قرضاوی کی اب تک 50 سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں جن میں ”اسلام میں حلت و حرمت“..... ”اسلام مستقبل کی تہذیب“..... ”اسلامی تحریکوں کی ترجیحات“ اور ”اسلام میں عورت کا مقام و مرتبہ“ بھی شامل ہیں۔



# اسلامی مملکت میں زکوٰۃ کا کردار

## زکوٰۃ کا معنی و مفہوم:

زکوٰۃ کے لغوی معنی پاکیزگی کے ہیں شرعی اصطلاح میں ”زکوٰۃ“ مال و دولت کے اس مقررہ حصے کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق غرباء کو دیا جاتا ہے۔ یہ مالی عبادت صاحبِ نصاب، مائل اور آزاد مسلمان پر فرض ہے جس کے پاس مال ایک سال تک موجود رہے اس کی فرضیت قرآن اور حدیث سے ثابت ہے۔

## فرضیت زکوٰۃ

زکوٰۃ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر اس مسلمان پر فرض ہے جو کسی مال کے نصاب کا مالک ہو قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

خذ من اموالہم صدقة تطہرہم و تزکیہم بہا۔ (التوبہ: 103)

”ان کے مالوں میں سے صدقہ وصول کر کے انہیں پاک بنائے اور ان کا تزکیہ کیجئے۔“ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یا ایہا الدین آمنوا انفقوا من طیبات ما کسبتم و مما اخرجنا لکم من الارض (البقرہ: 267)

”اے ایمان والو! اس پاک مال میں سے جو تم کما تے ہو اور جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا خرچ کرو۔“

نیز ارشاد ہوا:

واقیموا الصلوٰۃ و آتوا الزکوٰۃ۔ (المائدہ: 20)

”اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔“

اور رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

بني الاسلام علی خمس شهادة ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله و اقام الصلوٰۃ و ايتاء الزکوٰۃ و حج البیت و صوم رمضان۔ (صحیح بخاری و مسلم)

”اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے اس بات کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں

اور یقیناً محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔“

اور رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

امرت ان اقاتل الناس حتی يشهدوا ان لا اله الا الله وان محمد رسول الله و يقيموا الصلوة و يؤتوا الزکوۃ فاذا فعلوا ذلك عصموا مني دماءهم و اموالهم الا بحق الاسلام و حسابهم على الله. (متفق علیہ)

”مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑائی کروں یہاں تک کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں جب یہ کام سرانجام دیں گے تو وہ مجھ سے اپنے خون اور اموال محفوظ کر لیں گے سوائے اسلام کے حق کے اور ان کا حساب اللہ پر ہوگا۔“

آپ ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کی طرف روانہ کیا تو فرمایا:

انک نائى قوما اهل کتاب فادعهم الى شهادة ان لا اله الا الله و انى رسول الله فان هم اطاعوك لذلك فاعلمهم ان الله عزوجل قد افترض عليهم خمس صلوات فى كل يوم و ليلة فان هم اطاعوك لذلك فاعلمهم انه افترض عليهم صدقة فى اموالهم تؤخذ من اغنياءهم و ترد الى فقراءهم فان هم اطاعوك لذلك فاياك و كرائم اموالهم و اتق دعوة المظلوم فانه ليس بينها وبين الله حجاب. (بخاری و مسلم)

”لو تم اہل کتاب کی طرف جا رہے ہو انہیں اس شہادت کی دعوت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ اگر وہ لوگ اس کو تسلیم کر لیں تو پھر ان کو بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر وہ اس کو بھی تسلیم کر لیں تو انہیں خبر دینا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں میں صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے مالداروں سے وصول کر کے ان کے غریبوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ اگر وہ یہ بھی تسلیم کر لیں تو خود کو ان کے قیمتی اموال سے بچانا اور مظلوم کی بددعا سے ڈرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے۔“

**زکوٰۃ نہ دینے والوں کے متعلق حکم:**

زکوٰۃ نہ دینا اگر انکار فرضیت کی وجہ سے ہے تو کفر ہے اور اگر کنہوی اور بغل کی وجہ سے ہے تو گناہ ہے۔ اس سے زکوٰۃ زبردستی وصول کی جائے گی اور وہ سزا کا مستحق ہوگا۔ اگر لڑائی پر آئے تو اس سے اللہ کے حکم کی پابندی اور زکوٰۃ کی ادائیگی تک جنگ کی جائے گی۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فان تابوا و اقاموا الصلوة و آتوا الزكوة فاخوانكم في الدين (التوبہ: 11)  
 ”اگر وہ توبہ کریں نماز کی اقامت کریں اور زکوٰۃ کی ادائیگی کریں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔“

زکوٰۃ نہ دینے پر عذاب:

قرآن پاک جہاں زکوٰۃ دینے والوں کے لئے خیر و برکت اور اجر و ثواب کا وعدہ کرتا ہے وہیں غریبوں کی حق تلفی کرنے اور اپنی تجوریاں بھرنے والوں کے لئے ہولناک اور سخت ترین وعیدوں کا اعلان بھی کرتا ہے۔  
 چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

والذين يكتزون الذهب والفضة ولا ينفقونها في سبيل الله فيشرهم بعذاب اليم يوم يحمى عليها في نار جهنم فتكوى بها جباههم وجنوبهم وظهورهم هذا ما كنزتم لا لنفسكم فذوقوا ما كنتم تكنزون (التوبہ: 34-35)

”اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے آپ انہیں دردناک عذاب کی خبر دیجئے اس روز سونے اور چاندی کو آگ سے تپایا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانی پہلو اور پشتوں کو داغا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا یہ دہی سونا اور چاندی ہے جسے تم اپنے لئے جوڑ جوڑ کر رکھتے تھے اب مرا چکھو اپنے جمع کرنے کا۔“  
 اسی طرح زکوٰۃ نہ دینے والوں کو رسول اللہ ﷺ نے بڑی وعید سنائی ہے اور دنیا میں بُرے انجام اور آخرت میں بُرے حشر سے آگاہ کیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

من اتاه الله مالا فلم يؤد زكوة مثل له يوم القيمة شجاعا القرع له زميتان يطوقه يوم القيمة ثم يأخذ بلهزمته ثم يقول انا مالک انا كنزك ثم تلا النبي ﷺ ولا يحسن الدين..... (بخاری)

”جس کو اللہ نے مال دیا اور اس نے اس کی زکوٰۃ نہ نکالی اس کا مال قیامت کے دن ایک سانپ کی شکل میں لایا جائے گا جس کی دو زبانیں ہوں گی وہ اس کی گردن میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر یہ سانپ اس آدمی کو اپنے جیزوں میں جکڑے گا اور کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں میں حیرا خزانہ ہوں پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی ولا يحسن الدين.....“

عدم ادائیگی زکوٰۃ کی وجہ سے دنیاوی سزاؤں کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا:

مامنع قوم الزكوة الا ابتلاهم الله بالسنين (طبرانی)

”جو قوم زکوٰۃ دینے سے کتراتے ہے اللہ تعالیٰ اسے قحط سالی اور بھوک و افلاس میں گرفتار



کر دیتا ہے۔“

ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

..... ولم يمنعوا زكوة اموالهم الا منعوا القطر من السماء ولو لا البهائم لم يمطروا (ابن ماجہ)

”جب بھی لوگ زکوٰۃ سے غفلت کریں گے باران رحمت سے خدا انہیں محروم کر دے گا اور یہ بے زبان چوپائے اور مویشی ان کے پاس نہ ہوتے تو تم دیکھ لیتے کہ بارش کا ایک قطرہ بھی ان پر نہ گرتا۔“

زکوٰۃ کی مقدار:

زکوٰۃ کی مقدار مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب نے اپنی کتاب ”اسلام ایک نظر میں“ میں یوں بیان کی ہے:

- 1- زرعی پیداوار پر اگر آپاشی کی ضرورت پیش آئی ہو تو پانچ فیصد ورنہ دس فیصد۔
- 2- جمع شدہ رقم، زیوروں اور تجارتی مالوں پر ڈھائی فیصد۔
- 3- جنگل کی چرائی پر پٹے والے مویشیوں میں سے تقریباً ڈیڑھ سے ڈھائی فیصد تک۔
- 4- معدنیات اور زمینوں میں سے بیس فیصد تک۔

مال میں اتنی خیرات کرنا تو ہر مسلمان پر فرض ہے لیکن اتنی زکوٰۃ نکال دینے کے بعد کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس نے حق ادا کر دیا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ اس کے آگے بھی قدم اٹھایا جائے اور زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے اور غریبوں کی مدد کی جائے جتنی مقدار کو اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے اس کو زکوٰۃ کہتے ہیں اور اس کے علاوہ راہ خدا میں مال خرچ کرنے کو صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کہتے ہیں۔

## مصارف زکوٰۃ

زکوٰۃ کے آٹھ معروف ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں ذکر کئے ہیں۔  
ارشاد خداوندی ہے:

الما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملین علیہا والمؤلفۃ قلوبہم و فی الرقاب والغارمین و فی سبیل اللہ و ابن السبیل فریضة من اللہ واللہ علیم حکیم (التوبہ: 60)

”صدقات“ فقراء، مساکین، اس پر کام کرنے والے، جن کے دلوں کی تالیف مطلوب ہو قیدی آزاد کرانے میں مقروض لوگوں کے لئے اللہ کے راستہ میں اور مسافروں کے لئے ہیں۔

یہ اللہ کی طرف سے فریضہ ہے اور وہ جانتے والا حکمت والا ہے۔“

**زکوٰۃ کے جملہ مصارف اور ان کی وضاحت:**

1- **فقرام** سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس اتنا مال نہیں ہوتا کہ وہ اپنے عیال کی ضروریات، خوراک، پانی، لباس اور رہائش پوری کر سکیں۔ چاہے وہ کسی نصاب کے ہی مالک ہوں۔

2- **مسکین** احتیاج میں بھی فقیر سے کم تر ہوتا ہے اور کبھی زیادہ مگر ہر معاملہ میں ان کے احکام ایک ہی ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے بعض احادیث میں مسکین کی تعریف کی ہے۔ چنانچہ ارشاد نبی کریم ﷺ ہے:

”مسکین وہ نہیں ہے جو ایک دو تھنوں یا ایک دو بھجوروں کی خاطر لوگوں کے پاس چکر لگاتا پھرے بلکہ مسکین وہ ہے جس کی ضروریات پوری نہیں ہو رہیں گناہی میں رہتا ہے کہ اس کو خیرات نہیں دی جا رہی اور نہ ہی وہ کھڑا ہو کر لوگوں سے سوال کرتا ہے۔“ (صحیح بخاری)

3- **”عامل علی الزکوٰۃ“** سے مراد زکوٰۃ وصول کرنے والا یا زکوٰۃ کا مگران و منتظم اور تحریر کرنے والا (سیکرٹری) ہے۔ ان کو زکوٰۃ کی مد سے محتواہ ادا کی جاسکتی ہے چاہے وہ غنی ہی ہوں اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

لا تحل الصدقة لغنی الا لخصۃ: لعامل اور رجل اشتراها بماله او غارم او غاز فی سبیل اللہ او مسکین تصدق علیہ منها فاھدیٰ منها لغنی (مسند احمد ابن ماجہ)

”غنی کے لئے صدقہ حلال نہیں ہے مگر پانچ کے لئے صدقہ میں کام کرنے والا جو اپنے مال میں سے اس کو خرید لئے مقروض انسان اللہ کے راست میں لڑنے والا اور مسکین جس کو صدقہ کا مال دیا گیا اور وہ اس میں سے کسی غنی کو ہدیہ دے دے۔“

4- جن کے ”دلوں کی تالیف“ مطلوب ہو۔ اس سے مراد وہ شخص ہے جس کی مالی حالت تو کمزور ہو البتہ برادری میں اس کا اثر و رسوخ ہو۔ ایسے شخص کی دلجوئی کے لئے زکوٰۃ دی جائے تاکہ وہ اسلام میں پختہ ہو جائے اور لوگوں کے لئے مفید ثابت ہو۔ یا وہ اس کے شر سے بچ سکیں اسی طرح اس سے مراد وہ کافر بھی ہے جو ایمان اور اسلام کی طلب و طمع میں ہے اس کو اور اس کی قوم کو اسلام کی ترغیب کے لئے زکوٰۃ دینی چاہئے۔

اسی طرح یہ حصہ مصلحت کی خاطر ہر اس شخص کے لئے استعمال ہو سکتا ہے جو کسی بھی صورت میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے جیسا کہ بعض صحافت سے تعلق رکھنے والے اصحاب قلم وغیرہ۔

5- گردن آزاد کرانے میں اس معرف سے مراد مسلمان غلام ہے چنانچہ زکوٰۃ کے مال

سے اسے خرید کر آزاد کیا جائے یا غلام ”مکاتب“ ہے تو زکوٰۃ سے اس کی کتابت کی اقساط (اس کے مالک کو) ادا کی جائیں تاکہ وہ آزاد ہو جائے۔

6- مقروض سے مراد ایسا صاحب قرض ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی میں مقروض نہیں ہوا اور اس کی ادائیگی بہت مشکل ہو تو اسے زکوٰۃ سے اس قدر دیا جائے کہ قرض بھی ادائیگی اس کے لئے آسان ہو جائے اس لئے کہ رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

لا تحل المسألة الثلاث لذي فقر مدقع او لذي غرم مضطجع او لذي دم موجه. (ترمذی)

”سوال صرف تین قسم کے لوگوں کے لئے جائز ہے: (i) فقیر کے لئے جو بہت شدت میں ہے (ii) مقروض کے لئے جسے قرض کی وجہ سے بہت پریشانی ہے اور (iii) خون کی ویت کی ذمہ داری دینے والا جو اس کے لئے دکھ کا باعث بن گئی ہے۔“ (ترمذی، ابوداؤد)

7- اللہ کے راستہ میں اس سے مراد وہ کام ہیں جو اللہ کی رضا اور خوشنودی کے موجب ہیں بالخصوص اسلامی جہاد جو اللہ کے دین کی عظمت اور اعلاء کے لئے کیا جا رہا ہے بناء بریں غازی کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے چاہے وہ غنی ہے۔

اور اس مد میں وہ تمام شعبے آ جاتے ہیں جو مصلح شرعیہ عامہ میں اپنا اپنا حصہ اور کردار ادا کر رہے ہیں مثلاً شفا خانے، مدارس اور یتیمی کے لئے پناہ گاہیں تعمیر کرنا اور انہیں حصول اہداف کے لئے جاری رکھنا البتہ سب سے پہلے جہادی ضروریات پوری کی جائیں مثلاً آلات حرب کی تحصیل، مجاہدین کے اخراجات اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے دیگر اہم ترین ضروریات۔

8- ”ابن مسیل“ سے مراد وہ مسافر ہے جو اپنے شہر سے دور ہو۔ چنانچہ سفر میں ضروریات پوری کرنے کے لئے اس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ چاہے وہ اپنے علاقے میں غنی ہی ہو۔ اس لئے کہ اگر سفر میں اس کی ضروریات پوری کرتے کے لئے مال نہیں ہے تو وہ محتاج ہے البتہ اس کو اگر معرض مل سکتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ قرض حاصل کرے اور اس وقت تک اس کو زکوٰۃ نہ دی جائے جب تک وہ اپنے علاقے میں غنی ہے۔

## بنیادی مسائل زکوٰۃ

زکوٰۃ اسلام کے بنیادی فرائض میں سے ایک اہم فریضہ ہے۔ یہ قرآن میں توحید کی مالی عبادت ہے اس فرض کی پابندی کے بغیر وہ اپنی عبدیت اور ایمان کا پورا حق ادا نہیں کر سکتے اس لئے اگرچہ خالصتاً رب تعالیٰ کی رضا جوئی اور خوشنودی کے لئے ادا کی جاتی ہے مگر اس کی متعدد برکات ہماری دنیاوی زندگی میں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ اسلام دنیوی اور اخروی زندگی کا حسین

استخراج ہے۔ زکوٰۃ انسان کا تزکیہ نفس کرتی ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے:

”کئی لا یکون دولة بین الاغنیاء منکم۔“

”تاکہ دولت تم میں سے دولت مندوں کے درمیان ہی نہ پھرتی رہے۔“

اور رسول اکرم ﷺ کا یہ فرمانا کہ ”زکوٰۃ ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے

غریبوں پر لوٹا دی جائے گی۔“

یہ آیت اور حدیث اسلام کے مالی نظام کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔ ”دولت صرف امیروں میں ہی نہ پھرتی رہے“ بلکہ اس کی گردش سارے معاشرے میں اس طرح ہو جیسے جسم میں خون حرکت کرتا ہے اور پورے پورے تک پہنچتا ہے۔ اگر کسی عضو کو میسر نہ ہو تو وہ زنجور بن جاتا ہے اسی طرح دولت کسی کو فراہم نہ ہو سکے تو وہ بھی محتاج بن جاتا ہے۔ زکوٰۃ کے ذریعے روپیہ گردش کرتا رہتا ہے اور کسی ایک ہاتھ میں مجمد ہو کر نہیں رہ جاتا جس کی وجہ سے معیشت مستحکم ہوتی ہے۔ زکوٰۃ ایک ایسی عبادت ہے جس کے ذریعے درج ذیل معاشرتی و معاشی مسائل حل کرنے میں مدد ملتی ہے:

### 1- غربت کا علاج:

نظام زکوٰۃ کے ذریعے یہ مطلوب نہیں کہ ہر سال امراء غریب کو چند روپے ان کی ہتھیلی پر رکھ دیں بلکہ اسلام اس کے ذریعے معاشرے سے غربت کا مکمل خاتمہ چاہتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس معاشرہ کے امراء سے ان کی دولت کا اڑھائی فیصد لے کر اس معاشرہ کے غریب پر تقسیم کر دیا جائے جس سے وہ اپنی معاش کا باعزت بندوبست کر سکیں تو وہاں کوئی شخص غریب نہیں رہ سکتا۔

### 2- کفالت عامہ:

اسلام نے نظام زکوٰۃ کے ذریعے معاشرہ کے غریب مساکین اور حاجت مند افراد کو معاشی تحفظ عطا کیا ہے نیز امراء کے مستقبل کو محفوظ رکھنے کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی نظام پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اس نظام میں پورے معاشرے کی فلاح و بہبود مضمر ہے۔

### 3- گردش دولت:

اسلام چاہتا ہے کہ ملکی دولت چند ہاتھوں میں ہی گردش نہ کرتی رہے چنانچہ نظام زکوٰۃ کے ذریعے ملکی دولت مختلف افراد کے ہاتھوں میں جاتی ہے اور اس سے معاشرہ کی اقتصادی خوشحالی ہوتی ہے۔

#### 4- منصفانہ تقسیم دولت:

غیر منصفانہ تقسیم دولت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طبقہ نہایت امیر اور دوسرا طبقہ نہایت غریب ہوتا ہے۔ امیر و غریب کی اس وسیع خلیج کو کم کرنے کا بہترین ذریعہ زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ کی بدولت دولت خود بخود امراء کے ہاتھوں سے نکل کر غریب گھرانوں کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے لہذا یہ بگاڑ پیدا نہیں ہوتا۔

#### 5- بے روزگاری کا علاج:

بہت سے افراد کی بے روزگاری کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے پاس سرمایہ نہیں جس سے وہ کوئی کاروبار، دستکاری یا کھیتی باڑی کر سکیں اس لئے اگر انہیں زکوٰۃ دی جائے تو وہ بے روزگاری سے بچ سکتے ہیں۔

#### 6- جرائم کا خاتمہ:

بہت سے جرائم غربت اور تنگ دستی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ چوری، ڈاکہ، قتل، جیب تراشی، لوٹ مار اور اس قسم کی دوسری برائیاں اکثر رقم نہ ہونے کے باعث سر اٹھاتی ہیں لیکن اگر زکوٰۃ کا نظام صحیح معنوں میں رائج ہو جائے اور حاجت مندوں کی ضروریات پوری ہوتی رہیں تو ان جرائم پر بھی بڑی حد تک قابو پایا جاسکتا ہے۔

#### 7- ظلم و استحصا ل کا خاتمہ:

سرمایہ دار، نادار اور مجبور لوگوں کو سود پر قرض دے کر ہمیشہ کے لئے اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔ غریب اپنی مجبوریوں کی بناء پر عمر بھر مقررہ رہتا ہے اس طرح امیر، غریب کا استحصال کرتا ہے۔ اگر ملک میں شرعی نظام زکوٰۃ نافذ کر دیا جائے تو پھر کسی حاجت مند کو کسی سرمایہ دار کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی کیونکہ زکوٰۃ کی رقم ایسے ہی مظلوموں کا حق ہے۔

#### 8- قومی تجارت میں اضافہ:

جب لوگ اپنی دولت کو زیورات یا نقد بچتوں کی صورت میں سنبھال کر رکھتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روپیہ استعمال میں نہیں آتا اور کساد بازاری پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن جہاں زکوٰۃ کا نظام نافذ ہو وہاں لوگ اپنی دولت کو اس طرح بے کار بنا کر نہیں رکھتے کیونکہ اس طرح ہر سال زکوٰۃ دینے سے وہ کم ہو جائے گی تو لوگ مجبور ہو کر اس رقم کو کاروبار میں لگائیں گے جس سے انہیں خود بھی اور ملکی تجارت کو بھی فائدہ ہوگا۔

## 9۔ گداگری کا انسداد:

زکوٰۃ کے نظام سے چشمہ در گدا گروں کا بھی خاتمہ ہو سکتا ہے کیونکہ بیت المال سے ان کی خدمت کر کے انہیں بھیک مانگنے کی ذلت سے بچایا جاسکتا ہے۔

## 10۔ ارتکاز دولت کا حل:

ایک اندازے کے مطابق ملک کی اسی فیصد دولت صرف بیس فیصد افراد کے قبضہ میں ہے جبکہ اسی فیصد افراد کے ہاتھوں میں صرف بیس فیصد دولت آتی ہے لیکن نظام زکوٰۃ سے سرمایہ داروں کو ہر سال اپنی تمام جمع شدہ دولت سرمائے زیورات اور مال تجارت کا چالیسواں حصہ نکال کر غرباء میں تقسیم کرتا ہو گا جس کے باعث معیشت میں کچھ نہ کچھ اعتدال و توازن برقرار رہے گا اور سرمایہ داروں کے پاس بے تحاشہ دولت جمع نہیں ہو سکے گی۔

## 11۔ طبقاتی کشمکش کا خاتمہ:

جس قوم کے امراء میں غرباء کی تکالیف کا احساس اور ان سے عملی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے وہاں امیر اور غریب کے درمیان بغض، حسد اور نفرت کی بجائے محبت اور شکرگزاری کے تعلقات استوار ہوتے ہیں اور وہ طبقاتی کشمکش کبھی رونما نہیں ہوتی جو عام طور پر فقر و فاقہ کی وجہ سے رونما ہوتی ہے۔

## 12۔ ذخیرہ اندوزی کا علاج:

ہمارے ہاں معیشت کا بنیادی مسئلہ ذخیرہ اندوزی ہے۔ زکوٰۃ اس لعنت کو ختم کرنے کے لئے بھی ضروری ہے اور بہترین نظریاتی معاشرہ قائم کرنے میں معاون و مددگار ہے۔ غرضیکہ نظام زکوٰۃ میں کسی معاشرے کے تمام معاشی مسائل کا حل موجود ہے۔



## حرمت سود

مغربی معیشت دانوں نے اس کی متعدد تعریفیں دے رکھی ہیں۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ سرمایہ یا زر کے استعمال کا معاوضہ (Reward) سود ہے۔ یعنی ایسی رقم جو کہ شرح یا فیصد کے نام سے موسوم ہے وہ سرمایہ کی خدمات کا صلہ ہے۔ جو مقروض اپنے قارض کو طے شدہ شرائط کے تحت ادا کرتا ہے۔ سود مفرد (Simple) یا خالص (Net) اور مرکب (Compound) گویا سود در سود بھی ہو سکتا ہے۔

جدید ماہرین نے سود کے کردار اور جواز کی بابت چند نظریات پیش کر رکھے ہیں جن میں بتلایا گیا ہے کہ سود کیوں ادا کیا جاتا ہے؟ اور یہ کہ اس کی شرح کا تعین کیوں کر کیا جاسکتا ہے؟ ان میں بار آوری یا پیداواری (Productivity) انتظار کشی یا اجتناب پذیری (Abstinence) معاوضہ وقت، زرفقد کی ترجیحیت (Preference) رقوم برائے قرضہ (Loanable Fund) کے نظریات قابل ذکر ہیں۔

مگر اسلام میں سودی کاروبار مطلقاً ممنوع ہے اس لئے سود کی شرح صفر گردانی جاتی ہے۔ بنابرین سرمایہ کا معاوضہ منافع قرار پائے گا یا نقصان ہوگا۔

## سود کے فوائد

اگرچہ سود ایک ضروری برائی (Necessary Evil) ہے تاہم اس کے مثبت پہلو بھی ہیں جن کے باعث اس کا وجود قائم ہے۔ ماہرین معاشیات اس کی حمایت میں جو دلائل دیتے ہیں اور جو اس کے ثمرات گنوائے جاتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

1- کسی ملک یا قوم کی معیشت کا سہارا سود کو گردانا جاتا ہے کیونکہ تمام قسموں کے کاروبار سرمایہ کے ساتھ سرانجام پاتے ہیں اور اس مقصد کے لئے سرمایہ جمع کیا جاتا ہے جسے بعد میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ سرمایہ کا انتہا کرنا اشد ضروری ہے۔ کیونکہ جب تک اجتماع سرمایہ نہیں ہوگا یا سرمایہ اندوزی (Capital Formation) نہیں ہوگی کاروبار نہیں چلایا جاسکتا۔ گویا سرمایہ سازی کے بغیر ممکن نہیں کہ لوگ اپنی خواہشات و ضروریات پر پابندیاں عائد کریں اور اپنی آمدنی میں سے کچھ حصہ پس انداز کر لیں۔ لہذا فاضل آمدنی کو محفوظ کرنے کا طریقہ سود کے لالچ کے موجب ہوگا اس لئے سود

ضروری ہے۔

2- بچت کردہ سرمایہ کاروباری لوگوں کے حوالے کیا جاتا ہے جو تجارت اور دیگر کاروبار میں لگا کر ملکی پیداوار اور ملتی دولت میں اضافہ کرتے ہیں۔ سود کے بند کر دینے سے نہ صرف روپیہ جمع کرنے کا ایک محرک غائب ہو جائے گا بلکہ جو تھوڑا بہت سرمایہ جمع ہو گا وہ بھی کاروبار میں صرف ہوئے کے بعد میسر نہ ہو سکے گا۔

3- سود سرمایہ کے غیر مفید استعمال کو روکتا ہے اور شرح سود وہ چیز ہے جو بہترین طریقہ سے خود بخود اس امر کا انتظام کرتی رہتی ہے کہ سرمایہ زیادہ بار آور سکیموں اور منصوبوں پر لگایا جائے تاکہ نفع زیادہ سے زیادہ حاصل ہو سکے۔

4- قرض انسانی زندگی کی ناگزیر ضروریات میں سے ایک ہے۔ افراد کو اپنے ذاتی معاملات کی خاطر اس کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کاروباری لوگوں کو بھی اس کی حاجت رہتی ہے اور حکومتوں کا کاروبار بھی اس کے بغیر نہیں چل سکتا۔ کیونکہ بہت سے غریب ملک ترقی یافتہ ممالک سے بھاری قرضے سود پر حاصل کر سکتے ہیں۔ اتنا کثیر زر بغیر سود کے حاصل کرنا ممکن نہیں۔ سود کے نہ رہنے سے قرضوں کی بہم رسانی رک جانے سے معیشت پر بہت برے اثرات پڑیں گے بلکہ ترقی رک جانے کا احتمال پیدا ہو جائے گا۔

5- سود کی بندش سے بینکوں کے وسیع کاروبار کے شدید متاثر ہونے کا خطرہ ہے کیونکہ موجودہ دور میں بینکوں کے بغیر گزارہ کرنا دشوار اور مشکل ہے۔

## سود کے نقصانات

روشن پہلو دیکھنے کے بعد اب تاریک پہلوؤں کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس کی بڑی بڑی خامیاں مندرجہ ذیل ہیں:

### 1- اخلاقی و روحانی نقصانات:

اخلاق اور روح ہی انسانیت کا جوہر عظیم ہے۔ اگر کوئی چیز اسے زیاں کاری سے ہمکنار کرے تو وہ قابل ترک ہے اور اس کا استعمال شجر ممنوعہ کے مترادف ہے۔ اس سے کل خود غرضی، سنگدل، تنگ نظری اور زر پرستی جیسی بری عادات پروان چڑھتی ہیں۔ اس کے برعکس خاندانی، فاضلی، ہمدردی، فراخ دلی، عالی ظرفی اور خیر اندیشی سے انسان محروم ہو جاتا ہے۔ جب ایسی صفات عالیہ موجود نہ ہوں تو معاشرہ عدم اطمینانی اور اضطراب کا شکار بن جاتا ہے۔

### 2- تمدنی اور اجتماعی نقصانات:

جس معاشرے میں خود غرضی، حرص و آزمیسی بیماریاں جنم لیں ایک دوسرے سے ہمدردی



دعوائست کا جذبہ موجود نہ ہو بغیر ذاتی فائدے کے ایک دوسرے کی حاجت برآری نہ کی جائے تو ایسی سوسائٹی مستحکم و مضبوط نہیں ہو سکتی۔ سارا معاشرہ ایک دوسرے سے باہم برسرِ پیکار رہے گا۔ اس طرح تہذیب و تمدن کو اجتماعی طور پر نقصان پہنچے گا۔ لوگ محرومی اور حرمانِ لہیبی کا بَدبخت بنیں گے۔ گویا اس طرح ایک قوم دوسری قوم اور ایک ملک دوسرے ملک کے ساتھ اخلاص اور خیر خواہی سے پیش نہیں آئے گا۔

چرچل جیسے امریکہ پسند شخص کو مجبوراً کہا پڑا: ”یہ بیٹے پن کا برتاؤ جو ہمارے ساتھ ہوا ہے مجھے اس کی گہرائی میں بڑے خطرات نظر آتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ اس کا ہمارے باہمی تعلقات پر بہت بُرا اثر پڑا ہے۔“

اسی طرح ڈاکٹر ڈالٹن نے کہا: ”بھاری بوجھ لادے ہوئے ہم جنگ سے نکل رہے ہیں۔ ساری ان قربانیوں اور جفاکشیوں کا بڑا ہی عجیب صلہ ہے۔ جو ہم نے مشترک مقصد کے لئے برداشت کیں اس زوالے ستم ظریفانہ انعام پر آئندہ زمانے کے مؤرخین ہی کچھ بہتر رائے دینی کر سکیں گے۔ ہم نے درخواست گزار کی تھی کہ قرض حسنہ دیا جائے مگر جواب میں کہا گیا یہ عملی سیاست نہیں ہے۔“

### 3- معاشی نقصانات:

اس کا تعلق زندگی کے ان معاملات سے ہے جو کسی نہ کسی طور پر قرض کا لین دین سے ہوتا ہے۔ قرض عموماً تین قسم کے ہوتے ہیں:

- i- حاجت مند لوگ اپنی ضروریات کے لئے لیتے ہیں۔
- ii- تجارتِ صناع اور لینڈ ارڈ لیتے ہیں۔
- iii- حکومتیں اندرون ملک اور بیرون ملک سے قرض لیتی ہیں۔
- i- حاجت مند لوگ مہاجن سے یا بنکوں سے قرض لیتے ہیں۔ یہ ایک عالم گیر مسئلہ ہے اس میں بہت زیادہ شرح سود رائج ہے۔ پرانے وقتوں میں مختلف شرح ہوتی تھی چونکہ قرض لینے کا کوئی منظم ادارہ نہیں ہوتا تھا۔ اس بھاری شرح سود سے نجات پانا مشکل ہے۔ امریکہ میں مہاجنوں کے لئے 30 سے 60 فیصد سالانہ قانوناً مقرر ہے۔ انگلستان کا عام کاروبار 250 تا 400 فیصد سالانہ تک چلتا ہے۔ اس خطہ ارضی میں بھی 300 تا 350 فیصد سالانہ تک مثالیں پائی گئی ہیں۔ البتہ اب سرکاری ادارہ 8 فیصد تا 12 فیصد سالانہ تک قرضے فراہم کر دیتے ہیں۔ اس بلائے مہلک میں غریب اور متوسط الحال طبقوں کی اکثریت بری طرح پھنسی ہوئی ہے اور بھاری شرح سود کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مقروض اس سے جان بمشکل چھڑا سکتا ہے۔

- 2- اس طرح غریب طبقہ کی قوت خریداری بھی سود خوار چھین لیتا ہے۔ اشیاء کی خرید و فروخت کم ہوتی ہے گویا معیشت کی ترقی کو دھچکا لگتا ہے۔
- 3- جب شرح سود اور سود کو قانونی تحفظ حاصل ہو تو سرمایہ دار کاروبار کرنے کی بجائے قرض دے دیتے ہیں۔ چونکہ انہیں بیٹھے بٹھائے بغیر محنت کے مفت آمدنی ہو جاتی ہے۔ سو سائی کے معاشی عمل میں ایک غیر فطری عامل گھس جاتا ہے جو تمام عالمین پیدائش کے برعکس اس پورے عمل کی بھلائی برائی سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ کیونکہ اسے ہر حال میں سود مل جائے گا۔ کاروباری شخص کو چاہے نفع ہو یا نقصان ہو۔
- 4- سرمائے کا ایک معتد بہ حصہ بسا اوقات محض شرح سود چڑھنے کے انتظار میں رکا رہتا ہے اور کسی مفید کام میں صرف نہیں ہو سکتا۔ باوجودیکہ قابل استعمال وسائل بھی موجود ہوتے ہیں۔ روزگار کے طالب بھی اکثر مارے مارے پھرتے ہیں مگر نوکری دستیاب نہیں ہوتی۔ منڈیوں میں حقیقی طلب کے مطابق مال کی کھپت نہیں ہوتی۔
- 5- شرح سود کے لالچ کے موجب سرمایہ دار طبقہ سرمائے کے بہاؤ کو اپنی ذاتی اغراض اور مفاد کی خاطر کھولتا اور روکنا رہتا ہے۔
- 6- تجارت و صنعت کا نظام ایک ہموار طریقہ سے چلنے کی بجائے تجارتی حکمہ کا شکار ہو جاتا ہے۔ کساد بازاری کا دور دورہ ہوتا ہے۔
- 7- سرمایہ مصالح عامہ کی بجائے دیگر کاموں پر صرف ہوتا ہے اس طرح ترقیاتی امور رک جاتے ہیں کیونکہ ان کی طرف کم توجہ ہوتی ہے۔
- 8- سرمایہ دار طویل مدت کے لئے قرض دینے سے اجتناب کرتے ہیں اس لئے اہل صنعت و حرفت بھی اپنے سارے کاروبار میں تنگ نظری و کم حوصلگی کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔
- 9- لمبی مدت کے قرضوں کے لئے ایک خاص شرح سود ابتداء میں مقرر کر دی جاتی ہے۔ اسے باقاعدہ اقساط ادا کرنی پڑتی ہیں۔ اگر قیمتیں گر جائیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس فرد کو اقساط ادا کرنے کی خاطر زیادہ مال بیچنا پڑے گا۔ اسی طرح اگر گرانے ہو جائے تو سود خوار کو خسارہ ہو گا۔
- 10- حکومتوں کے قرضوں کی صورت میں غیر ممالک ان قرضوں کے باعث سیاسی مفاد حاصل کرتے ہیں اور بعض اوقات ملکی سالمیت اور قومی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔
- 11- سرکاری اداروں سے لیا ہوا قرض واپس نہ ہو سکے کی صورت میں مقروض کی جائیداد وغیرہ قرق کر لی جاتی ہے اور اس طرح وہ اپنی تکیلی آمدنی سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بعض اوقات وہ زمین یا مکان یا ٹیلام کر دیئے جاتے ہیں جو قرض کے عوض رہن رکھے

جاتے ہیں۔

12- ”گردش زر رک جانے سے ارتکاز دولت پیدا ہوتا ہے اور معاشرہ گروہوں میں بٹ جاتا ہے۔“

## سود کا اسلامی تصور

### (Islamic Concept of Interest)

قرآن مجید میں سود کے لئے ”ربو“ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کا مادہ ”رب و“ ہے جس کے معنی ہیں زیارت۔

ربو اسے مراد مال کی زیادتی اور اس کا اصل سے بڑھ جانا ہے۔ چنانچہ اس کے معنی کی تصریح بھی خود قرآن میں کر دی گئی ہے:

”اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہیں اپنے اس مال لینے کا حق ہے۔“

”اور جو سود تم نے دیا ہے تاکہ لوگوں کے اموال بڑھیں اللہ کے نزدیک اس سے مال نہیں بڑھتا۔“

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ اصل رقم پر جو زیادتی ہوگی وہ ربو کہلائے گی۔ لیکن قرآن مجید نے مطلق پر زیادتی کو حرام نہیں ٹھہرایا۔ زیادتی تو تجارت میں بھی ہوتی ہے۔ قرآن جس زیادتی کو حرام قرار دیتا ہے وہ ایک خاص قسم کی زیادتی ہے اسی لئے اس کو ”الربو“ کے نام سے یاد کرتا ہے۔

پس سود کی تعریف یہ قرار پائی کہ قرض میں دیئے ہوئے اس مال پر جو زائد رقم شرط اور یقین کے ساتھ کی جائے وہ ”سود“ ہے۔ اس المال پر اضافہ اضافہ کا یقین مدت کے لحاظ سے کیا جانا اور معاملہ میں اس کا مشروط ہونا یہ تین اجزائے ترکیبی ہیں جن سے سود بنتا ہے اور ہر وہ معاملہ قرض جس میں یہ تینوں اجزاء پائے جاتے ہوں ایک سودی معاملہ ہے۔ قطع نظر اس کے کہ قرض کسی بار آور کام میں لگانے کے لئے لیا گیا ہے یا کوئی شخص ضرورت پوری کرنے کے لئے اور اس قرض کا لینے والا امیر ہے یا غریب!

اسلام نے سود کو مطلقاً حرام قرار دیا ہے۔ اسے جا بجا قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ قرآنی آیات ملاحظہ ہوں:

يَسْأَلُ اللَّهُ الرِّبَا وَرِيسَى الصَّدَقَاتِ (البقرہ: 276)

”اللہ تعالیٰ سود کو مناتا ہے اور خیرات بڑھاتا ہے۔“

وذرہ ما بقی من الربو..... وان لبتم فلکم رؤوس لموالکم  
 ”اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو..... اور اگر تم توبہ کر لو تو  
 تمہیں اپنے راس المال (اصل رقم) لینے کا حق ہے۔“

### زمانہ جاہلیت کا ربو:

عربوں کے ہاں اسلام سے قبل ”الربو“ کا اطلاق جس طرز و معاملہ پر ہوتا تھا۔ اس کی متعدد صورتیں روایات میں آئی ہیں جو اس طرح ہیں:  
 مجاہد کہتے ہیں: ”جاہلیت کا ربو یہ تھا کہ ایک شخص کسی سے قرض لیتا اور کہتا کہ اگر مجھے اتنی مہلت دے تو میں اتنا زیادہ دوں گا۔“ (ابن جریر)

## تبادلات

### سود سے چھٹکارہ پانے کے اقدامات:

اسلامی نقطہ نگاہ سے سودی کاروبار کی ممانعت ہے بلکہ سود کا لین دین ناجائز اور حرام ہے۔ البتہ دوسری خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ نہایت کارآمد ہیں۔ بنکوں کی بذولت بازار زر ترقی کرتا ہے۔ لوگوں میں کفایت شعاری اور بچت کی عادت پڑ جاتی ہے۔ سود کی لعنت سے نجات پانے کے لئے حسب ذیل اقدامات اور تجاویز پر عمل کیا جاسکتا ہے:

### 1- قرض حسن:

جمع شدہ سرمایہ کو قرض حسنہ تصور کیا جائے اور کاروبار میں استعمال کیا جائے۔

### 2- بندش (Stoppage):

سود کو قانوناً بند کر دیا جائے اور ایسا مذموم کام کرنے والا مستوجب سنگین سزا ہو اور کسی صورت میں اسے نہ چھوڑا جائے۔ جن لوگوں کے ذمہ سود ہے اسے فوراً معاف کر دیا جائے اور صرف اصل ذریعہ واپس لیا جائے۔

### 3- سرکاری تحویل:

تمام اسلامی ممالک بنکوں کو قومی ملکیت میں لے لیں جیسا کہ پاکستان میں کیا گیا ہے۔ بنکوں کے مالکوں کو اقساط کی صورت میں معاوضہ ادا کر دیا جائے۔ بینکاری کاروبار محنت اور سرمایہ کی شراکت کے طور پر چلایا جائے۔ یا جمع شدہ امانتوں (Deposits) کو قرض حسنہ سمجھ کر کاروبار کیا جائے۔

#### 4- شراکت:

بنک نجی ملکیت میں ہی رہیں مگر سودی کاروبار بند کر دیں۔ جمع شدہ رقم شراکت کے اصول پہ استعمال کی جائیں اور افراد نفع و نقصان میں شامل ہوں۔

#### 5- مضاربیت:

ایس۔ اے ارشاد نے اپنے مقالہ ”سود سے آزاد اسلامی معاشرہ کے لئے معاشی نظام“ میں تاثرات یوں بیان کئے ہیں:

”بلا سود اقتصادی نظام قائم کرنے کے لئے مضاربیت کے اصول پہ مبنی ادارے تشکیل دیئے جائیں۔ محنت اور سرمایہ کو یکجا کر دیا جائے۔ سرمایہ اور محنت فراہم کرنے والے یکساں طور پر نفع اور نقصان میں شریک ہوں۔ یہ نئی نوع انسان کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ اگر سرمایہ اور محنت کو مضاربیت کے اصول پہ مربوط کر دیا جائے اس طریقہ سے محنت اور سرمایہ اکٹھے ہو کر دلی طور پر کام کر سکتے ہیں۔ مزید برآں مزدوروں کی ہڑتال اندرون ملک اور اقتصادی سرد جنگ کے ختم ہو جانے کے باعث عالمی سطح پر بہتر گفتگو ہو سکتی ہے۔

اس اصول سے زراعت، صنعت اور کاروبار کو ترقی دی جاسکتی ہے۔ سرمایہ کی نقل پذیری اور محنت کے استعمال کے لئے یہ ایک اچھا ذریعہ ہوگا۔ ملک میں روزگار فراہم کرنے اور غربت و افلاس کے خاتمہ کے لئے یہ ایک مفید طریقہ مصماہت ہو سکتا ہے۔

#### 6- اصول کمپنی:

ڈاکٹر حجاب اللہ صدیقی نے اپنی کتاب ”بغیر سود کے بنکاری“ (Banking Without Interest) میں اس طرح بحث کی ہے:

”بنک کی تشکیل جائنت شاہ کمپنیوں کے اصول پہ کی جائے گی۔ کچھ لوگ شیئر کمپنیل (Share Capital) فراہم کریں گے۔ شراکت یا مضاربیت کی بنیاد پہ مشترکہ سرمایہ کاری کی جائے گی۔ جو افراد سرمایہ مہیا کریں گے انہیں شیئر ہولڈرز کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔ ان کی کم از کم تعداد دو ہوگی مگر اصولاً کوئی تعداد مقرر نہیں کی گئی۔ تاہم کم از کم اور زیادہ سے زیادہ تعداد پر پابندی لگائی جاسکتی ہے۔ مقام اور وقت کے لحاظ سے تفاوت ہوگا۔ ہر حصہ دار کی رقم یکساں یا کم و بیش ہو سکتی ہے۔ ہر حصہ دار چند حصص خریدنے کا پابند کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کم از کم اور زیادہ سے زیادہ سرمایہ کی حد بھی متعین کی جاسکتی ہے۔ آخر کار ہر حصہ دار اپنے اثاثوں (Asset) کی پوزیشن کے مطابق بنک کا مالک ہوگا۔“

## 7- تجارت خارجی:

جہاں تک بین الاقوامی تجارت کا تعلق ہے اگر اندرون ملک سود کو خارج کر دیا جائے تو بہت سے دولت مند مسلم ممالک مل جائیں گے جو کہ اس کارخیز میں ہاتھ بٹائیں گے۔ بارٹر سسٹم کے مطابق تجارت کی جاسکتی ہے۔ جس میں اشیاء کا اشیاء سے مبادلہ ہوگا۔ بیرونی قرضہ جات نفع اندوز سرمایہ کاری میں حصہ دار ہونے کی بنیاد پر حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

مسلمانوں نے جدہ میں اسلامی ترقیاتی بینک قائم کر دیا ہے۔ یہ ایک خوش آئند اور نیک فال ہے۔ یہ بغیر سود کے چلایا جائے گا اور اگر خلوص نیت سے فرائض سرانجام دے تو غیر ملکی تجارت اور دوسرے عالمی لین دین اس کے توسط سے پورے ہو سکتے ہیں۔ پھر نئے عالمی نظام کی ضرورت نہیں رہے گی۔

## 8- معاوضہ:

بنک مختلف فرائض سرانجام دینے کے صلہ کے طور پر کھاتہ داروں سے قلیل معاوضہ بھی حاصل کر سکتا ہے۔ بڑی ادائیگیاں کرنے کی خاطر چیک یا ڈرافٹ ضروری قرار دے سکتا ہے۔ اسی طرح قیمتی اشیاء کی حفاظت پر بھی معاوضہ وصول کیا جاسکتا ہے جیسا کہ آج کل لا کرز پر ہوتا ہے۔

## 9- امانتیں:

معاوی امانتیں (Term Deposits) بچت امانتیں سود سے مبرا کر دی جائیں یعنی انہیں سود ادا نہ کی جائے بلکہ ان کا سرمایہ مختلف ترقیاتی امور پر صرف کر دیا جائے اور ہر حصہ کے بعد نفع دیا جائے۔

## 10- کھاتہ کھولنا (Opening Account):

تمام گریڈ سرکاری ملازمین کے لئے بینک میں کھاتہ کھولنا ضروری کر دیا جائے۔ ان کی تنخواہ متعلقہ کھاتہ میں جمع ہوتی رہے اور وہ حسب ضرورت رقم چیک کے ذریعے ڈرا کر سکیں۔ اس پر انہیں کوئی سود نہ دیا جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ چیک پر ایک بار ڈیوٹی باندھ دینے سے حکومت کو آمدنی حاصل ہوتی رہے گی۔

## 11- فراہمی مالیات:

جہاں تک بغیر سود کے سرمایہ کی دستیابی کا سوال ہے ہم دیکھتے ہیں کہ مشترکہ سرمایہ دار اور کمپنیوں کے لئے لاکھوں اور کروڑوں روپے آج بھی بغیر سود کے الٹیج کے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ درحقیقت اصل نکتہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص سرمایہ حاصل کرنے والوں کا شریک کار بن جاتا

ہے تاکہ دونوں نفع و نقصان میں شامل ہوں۔ اسلامی معیشت نے آجر اور سرمایہ دار کو برقرار رکھا ہے۔ البتہ سرمایہ دار یا بینکار یا جسے سود پر لین دین کرنے والے کو ساہوکار کہتے ہیں معاشرے سے نکال دیا ہے اور اس طرح ہر قسم کے کاروبار کے لئے مضبوط بنیاد فراہم کی ہے۔ گو اس طرح ایسے کاروبار کی رفتار ابتداء میں دھیمی رہے گا خدشہ ہے مگر بعد میں تیز متعین، مستقل، پائیدار اور شاندار ہو جاتی ہے۔ تجارتی چکر اور معاشی بحران سے کاروبار محفوظ رہ سکتا ہے۔

مندرجہ بالا طریقوں پر عمل کرنے سے فوری طور پر سرمایہ داروں کی طرف سے خصوصاً اور عوام کی جانب سے عموماً منفی اثرات کا اظہار ہو سکتا ہے۔ کیونکہ لوگوں کو بغیر محنت کے سود کی لذت پڑ چکی ہے اور معاشرہ اس کا عادی مجرم بن چکا ہے۔ مگر جب ان کی توجہ قرآنی احکامات نبوی ﷺ اور شذات اور شرعی فرمودات کی طرف مبذول کرائی جائے گی۔ سود کے مضرتناج سے آگاہ کیا جائے گا اور سود سے آزاد قرضوں کے حصول سے روشناس کرایا جائے گا تو یقیناً اطمینان ہو گا۔ آخرت میں اللہ اور رسول اکرم ﷺ سے سرخرو ہونے کا جذبہ و احساس انہیں سودی کاروبار سے باز رکھے گا۔

## 12- ریاستی بینک (State Bank):

مرکزی بینک کے اختیارات میں اضافہ کر دیا جائے اور وہ سارے بینکوں پر مکمل کنٹرول کرے۔ یہ ایک تحقیقی شعبہ قائم کرے جس میں ایسے ماہرین کا تقرر کیا جائے جو اسلامی اور جدید علوم میں دسترس رکھتے ہوں وہ بینک کو ایسی تجاویز، سفارشات تیار کر کے دیں جن پر بغیر سود کے سرمایہ صرف کر دیا جائے تاکہ نفع حاصل ہو۔

## غیر سودی بنکاری

اسلامی معیشت میں بینک کا قیام شرکت العنان کے اصول پر عمل آئے گا یعنی دو یا دو سے زائد افراد کسی کاروبار میں متعین سرمایہ کے ساتھ اس معاہدہ کے تحت شریک ہوں گے کہ سب مل کر کاروبار کریں اور کاروبار کے نفع و نقصان میں متعین نسبتوں کے ساتھ شریک ہوں گے۔ شرکت کی صورت میں یہ لازمی نہیں کہ ہر شریک عملاً بھی کاروبار میں حصہ لے۔ حصہ داروں کی کم سے کم تعداد دو ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے لیکن سہولت کار اور دوسرے مصالح کے پیش نظر یہ مناسب ہوگا کہ تعداد کی کوئی حد مقرر کر دی جائے۔ اس تعداد کا تعین ملک کے حالات اور زمانے کے حساب سے ہونا چاہئے۔

سرمایہ داروں کا فراہم کیا ہوا سرمایہ یکساں بھی ہو سکتا ہے اور غیر مساوی بھی ہو سکتا ہے۔ یہ طریقہ اختیار کرنا زیادہ مناسب ہوگا کہ سرمائے کی ایک خاص مقدار مثلاً ایک لاکھ روپیہ

مقرر کر دیا جائے اور یہ طے کر دیا جائے کہ ہر شریک جتنے حصے چاہے خرید سکتا ہے۔ بنک کے مجموعی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ سرمائے کی تعداد بھی مقرر کی جاسکتی ہے۔

کاروبار بنک کا منافع سرمائے کی نسبت سے ہر شخص کا مقرر کیا جاسکتا ہے۔ اصولاً اس بات کی پوری اجازت ہے کہ منافع کی تقسیم کام کرنے والوں کی صلاحیتوں کے مطابق کی جاسکتی ہے لیکن حسابات میں سہولت کی خاطر سرمائے کے حساب سے ہی ہو۔ دوسری صورت میں اگر نقصان ہو تو وہ بھی شرکاء بنک کے درمیان سرمائے کے حساب سے طے پائے گا اس بات کی وضاحت احکام شریعت سے بھی ہوتی ہے۔

### اثرات (Effects):

صفر شرح سود کے اثرات بہت زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ اس سے مثبت نتائج برآمد ہونے لگتے ہیں جیسا کہ ان نکات سے عیاں ہے:

#### 1- سرمایہ کاری میں وسعت:

اس سے سرمایہ کاری کے پھیلنے کے مواقع پیدا ہوتے ہیں کیونکہ جب بچت شدہ سرمایہ پر سود نہیں ملے گا تو افراد اسے سرمایہ کاری میں استعمال کریں گے۔

#### 2- کاروباری ترغیب:

ظاہر ہے کہ جب بیکار رقم باہر آئے گی تو اسے تجارت و کاروبار میں کھپانے کی رغبت پیدا ہوگی جس سے بہتری ہوگی اور کاروبار پھیلے گا، کئی افراد آگے آئیں گے۔

#### 3- گردش دولت:

سودی معیشت کا سب سے بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ دولت فقط چند خاندانوں میں گھومتی رہتی ہے اور بغیر ہاتھ پاؤں ملائے بینک سے سود ملتا رہتا ہے اور یوں سرمایہ جمع رہتا ہے۔

#### 4- ہنرمندوں کی حوصلہ افزائی:

ہر ملک میں بہت سے افراد ایسے ہوتے ہیں جو تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ تربیت یافتہ اور ہنرمند ہوتے ہیں مگر قلت سرمایہ کے باعث اپنی صلاحیت و محنت اور دیانت و مہارت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ جب بغیر سود کے قرض ملے گا تو انہیں آگے بڑھنے کی جرأت و حوصلہ مندی آئے گی۔ ان میں کام کرنے کا دلولہ و جذبہ ابھرے گا۔

#### 5- صنعت کو فروغ:

نئے کارخانے نصب ہوں گے کیونکہ حصول قرض میں آسانی ہوگی اس کی پرورش ہوگی



جب اندرون ملک صنعت کا جال بچھے گا تو ملک آگے رواں دواں ہوگا اور زیادہ اشیاء برآمد ہوں گی۔

## 6- وسائل کا بھرپور استعمال:

قدرتی و انسانی وسائل کو بہتر طور پر استعمال میں لایا جائے گا۔ کوئی ذریعہ بھی بیکار نہیں رہے گا کیونکہ سرمایہ کے حاصل کرنے میں دشواریاں حائل نہیں ہوں گی۔

## 7- ادائیگی قرض میں سہولت:

سود پر مبنی نظام کے تحت کوئی فرد یا قوم ایک دفعہ قرض کے چنگل میں پھنس جائے تو مع سود قرض سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے بلکہ پہلے قرض کو اتارنے کی خاطر نیا قرضہ لینا پڑتا ہے اور اس جال میں انکے رہنا پڑتا ہے جس طرح پاکستان اور دوسرے ترقی پذیر ملکوں کا براہِ حشر ہو رہا ہے۔

## 8- برائیوں کا خاتمہ:

کئی قسم کی معاشی، سیاسی اور معاشرتی برائیوں کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے۔ حرص و لالچ میں کمی آئے گی، لوٹ کھسوٹ کے دور کرنے کا امکان بنے گا۔ طبقاتی کشمکش کی حوصلہ شکنی ہوگی۔

## 9- بھائی چارہ کی فضاء:

باہمی معاونت و اخوت اور رفاقت پیدا ہوگی جن سے افراد ایک دوسرے کے قریب آئیں گے۔

## 10- متفرق:

- (i) معیشت پہلے پھولے گی۔
- (ii) سرکار کو فراہمی سرمایہ میں آسانی ہوگی۔
- (iii) کئی پروجیکٹ مکمل ہوں گے۔
- (iv) خوشحالی اور فلاح و بہبود میں مدد ملے گی۔
- (v) دوسری اقوام کی محتاجی میں کمی آئے گی۔
- (vi) بینکاری نظام مضبوط ہوگا جس سے لین دین کی نئی راہیں کھلیں گی۔
- (vii) معیشت کے بہت سے شعبوں میں ربط پیدا ہوگا۔

## انشورنس / بیمہ کاری

اس ایسی عہد میں انسان کی حفاظت و نگہداشت اور اس کے مستقبل کو درخشندہ و تابندہ بنانے کے لئے متعدد سکیمیں سوچی اور بنائی جاتی ہیں۔ چنانچہ بیمہ سازی کا بڑا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ مفلوک الحال اور ناگہانی مصیبت کا نشانہ بننے والے فرد کی معاونت و اعانت کی جائے۔ بیمہ عام طور پر جان بدن کے کسی عضو سامان مکان و املاک کا کرایا جاتا ہے۔ بیمہ شدہ (Insured) دوسرے فریق بیمہ کنندہ (Insurer) کو اقساط کی صورت میں مقررہ رقم یعنی پرییم دیتا رہتا ہے اور بدلت پوری ہونے پر جمع کردہ رقم مع منافع ادا کر دی جاتی ہے۔ خلاف معمول واقعہ یا حادثاتی موت کی حالت فوری ادائیگی کی جاتی ہے تاکہ نقصان کا ازالہ ہو سکے۔

### تعریف:

”بیمہ سہ بازی کا ایک معاہدہ ہے۔“

کئی رائٹرز اس کا تعارف یوں کراتے ہیں:

”بیمہ نقصان کے خلاف آلہ (Device) ہے۔ نقصانات کی تقسیم ہے۔ زیاں کاری کا کم کرنا ہے۔ انہیں پورا کرنا (Meeting) نقصانات کا اکٹھا کرنا ہے۔“

### جدید صورت (Modern Form):

بیمہ سازی کی موجودہ حالت کی کڑی (Chain) قدیم یونانیوں (Ancient Greeks) کے میرین قرضوں (Marine Loans) سے جاملتی ہے۔ زر کسی جہاز اور اس کے ساز و سامان کے لئے پیشگی دے دیا جاتا تھا اور اگر سفر بخیر و خوشی گزر جاتا تو بھاری سود دینا پڑتا تھا۔ البتہ نقصان ہونے کی بنا پر خطر (Risk) کی خاطر کافی ادائیگی کی جاتی تھی۔

اس ضمن میں کئی قوانین (Acts) پاس کئے گئے جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(i) میرین انشورنس ایکٹ 1745ء۔ یہ برطانوی جہازوں کے لئے مخصوص تھے دوسرے استفادہ نہیں کر سکتے تھے۔

(ii) لائف انشورنس ایکٹ 1774ء (Life Insurance Act 1774) اس کو جواز بازی (Gambling) ایکٹ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی چار دفعات (Sections) ہیں۔

(iii) میرین ایکٹ 1788ء (Marine Act 1788)

(iv) گیمنگ ایکٹ 1845ء (Gaming Act 1845)

(v) میرین انشورنس ایکٹ 1906ء (Marine Insurance Act 1906)

یہ بہت بڑا ایکٹ ہے جس کی 94 دفعات ہیں جن میں کئی جزئیات پائی جاتی ہیں اس ایکٹ نے 1745ء اور 1788ء کی جنگ لے لی۔ پیر کی ترقی یافتہ شکل لانا لڈ (Lloyd) کہلاتی ہے جس کی رو سے اپنا اپنا حصہ ادا کر کے شرکاء فنڈز برقرار رکھتے تھے۔

### پس منظر (Back Ground):

جہازِ نمک کاروبارِ بیمہ کے آغاز (Origin) کا واسطہ ہے یہ کئی صدی پہلے چالو ہوا تھا اور بہت سے مدارج (Stages) طے کرنا ہوا موجودہ حالات سے ہمکنار ہوا ہے۔ اب یہ تقریباً سائنسی انداز (Scientific Pattern) اپنا چکا ہے کیونکہ اس نقصان سے بچاؤ کی تدبیر ڈھونڈ لی گئی ہیں۔ اس کو کاروباری اور تاجروں کے حلقوں نے شروع کیا تھا اور بالخصوص بحری تجارت (Ocean Trade) سے پہل کی گئی تھی کیونکہ جہاز ہائے بحر (Ships) اور پارہائی کشتیاں طوفانوں کی لپیٹ میں آکر غارت ہو جاتی تھیں اور کافی نقصان اٹھانا پڑتا تھا چنانچہ نقصانات اور فطرت سے تحفظ کی خاطر بیمہ کا سہارا لیا گیا۔ اولیں انڈس کی مسلم حکومت نے تجارت کی حفاظت کے لئے اسے اپنایا۔

سوانا محمد تقی امینی نے اپنی کتاب ”اسلام اور جدید دور کے مسائل“ میں بیمہ پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ کریں:

ذیل میں بیمہ کی ابتدائی تاریخ ذکر کی جاتی ہے تاکہ اس کی اصل غرض واضح ہو بیمہ کی ابتداء کے بارے میں مؤرخین کا اختلاف ہے بعض کی رائے ہے کہ مسلمانوں نے اس کی بنیاد رکھی اور بعض کا خیال ہے کہ یورپین نے اس کی ابتداء کی ہے چنانچہ منشی سو جان رائے نے عہدِ عالمگیر کے حالات میں لکھا ہے:

”سوداگر سڑکوں اور راستوں کی خطرناکی کے باعث اپنا مال ان مہاجنوں (جو نہایت دیانت دار ہوتے تھے) کے سپرد کر دیتے ہیں اور دوسرے مقام پر پہنچ کر بعینہ وصول کر لیتے ہیں۔ اس خدمت کی کچھ اجرت ادا کر دی جاتی ہے اور اس کو بیمہ کہتے ہیں۔“

اور ”ڈریپر“ (Draper) نے لکھا ہے کہ:

”تین کے مسلمانوں نے بحری تجارت کی حفاظت و ترقی کے لئے بیمہ بحری ایجاد کیا تھا۔“

28 دسمبر 1916ء کو سوومند کافرنس دہلی نے ”بیمہ“ کے بارے میں ایک تجویز منظور کی تھی جس میں یہ الفاظ بھی تھے:

”یہ بحری بیمہ مسلمانوں کی ایجاد ہے جبکہ وہ یمن میں حکمران تھے۔“

کئی سال ہوئے پاکستان (پنجاب) میں ایک کتاب ”بیمہ اور اسلام“ کے نام سے شائع

ہوئی تھی جس میں یہ عبارت درج ہے:

”یورپین محققین نے بالاتفاق (بالاتفاق کی بات صحیح معلوم نہیں ہوتی) اس امر کا اعتراف کیا کہ مسلمانان چین نے تجارت کے تحفظ و ارتقاء کے لئے بحری بیمہ کی بنیاد رکھی۔“

پھر اس کے بعد ہے:

”یہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں کہ بیمہ مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس پر تاریخ شاہد ہے جس وقت مسلمان ایک تجارتی قوم کی حیثیت سے اقوام عالم میں سر بلند ہوئے اس وقت بیمہ بحری (Marine Insurance) رائج تھا اور زمانہ (عالمیاً ضامیہ ہے جس سے ضمانت و کفالت مراد ہے) کے نام سے موسوم ہوا۔ جوں جوں مسلمانوں میں شہنشاہیت بڑھتی گئی یہ نام ہلتانی یہودیوں نے اپنے قبضے میں لیا اور جوں ہی مسلمانوں نے قسطنطنیہ سے آگے قدم بڑھائے وہ لوگ جنوبی یورپ چھوڑ کر شمال کی جانب روانہ ہوئے اور ان ہی لوگوں نے انگلستان پہنچ کر وہاں بیمہ کا کام رائج کیا جو بعد میں "LLOYD'S" کے نام سے مشہور ہوا۔“

دوسری رائے کے مطابق بیمہ کی ابتدائی تاریخ کے دو حصے ہیں:

(الف) اس کی ابتداء اٹلی کے تاجروں سے ہوئی۔

چنانچہ چودھویں صدی عیسوی (1347ء) میں اٹلی کے (وینس کے) کے تاجروں نے طے کیا کہ جس تاجر کو کوئی حادثہ پیش آ جائے یا اس کا مال سمندر میں ضائع ہو جائے تو ہم سب مل کر اس کی یا اس کے خاندان کی مالی مدد کریں گے۔

اس معاہدہ کے مطابق وقتی امداد کی یہ صورت ایک عرصہ تک قائم رہی لیکن اس میں اتنی گنجائش نہ ہوتی تھی کہ تاجروں کو کثیر رقم دے کر اس کی تجارت بحال کی جاتی جبکہ بڑا اوقات زیادہ نقصان کی وجہ سے مستقل فنڈ قائم کرنے کی تجویز پر عمل کیا جاتا جس میں ہر شخص ماہوار یا تجارتی سفر کے ختم پر ایک مخصوص رقم جمع کرتا اور حادثہ پیش آنے کے وقت جمع شدہ رقم سے مدد کی جاتی تھی۔

پھر اس کے بعد ترقی ہوئی تو تاجروں کے ساتھ جہاز کے کپتان کو بھی مدد میں شامل کر لیا گیا یعنی اگر ”کپتان“ جہاز کے ساتھ طوفان کی زد میں آ جاتا یا وہ بحری ڈاکوؤں کے ہاتھ لگ کر دیا جاتا تو اس فنڈ سے اس کے اہل و عیال کی بھی مدد کی جاتی تھی۔

پھر جب اور زیادہ ترقی ہوئی تو جہاز میں سفر کرنے والے مسافروں کو بھی حادثاتی مدد میں شامل کیا جانے لگا چنانچہ اس کے لئے خاص طور سے اصل کرایہ سے کچھ زائد رقم وصول کی جاتی اور حادثہ پیش آنے کی صورت میں اس کے ذریعے درمیانہ کی مدد کی جاتی تھی۔

جہاز کے مسافروں کے شامل ہونے کے بعد بیمہ کے نظام میں وسعت ہوئی اور اس کو منظم شکل دینے کے لئے قانون وضع کرنے کی ضرورت پیش آئی چنانچہ اوامر پارلیمان

(Orphaned Barcelona) کے نام سے 1436ء، 1458ء، 1461ء اور 1484ء میں ضابطہ قوانین ترتیب دیئے گئے۔ نیز ”ہالینڈ“ میں کچھ لوگوں (جن کے مفاد جہازوں کی بچائی سے متاثر ہوتے تھے) نے مل کر اس سسٹم کو رواج دیا جس کو گارنٹی ایسوسی ایشن (Guarantee Association) کہتے ہیں۔ اس میں شرکاء حصہ دار کو حصہ رسد اور کر کے نقصان کے وقت اس کو بحال رکھتے تھے۔

(ب) اس کی ابتداء انگلستان سے ہوئی ہے چنانچہ پہلے اس کے ذریعے موتی کی تجھیز و تکلیفیں و بندوبست کیا گیا، پھر بیوہ اور یتیموں کی کفالت کا انتظام ہوا اس کے بعد 1583ء میں موتی کے قرض کی ادائیگی کے لئے ایک مختصر نظام بیمہ کا رواج ہوا۔ پھر انیسویں صدی 1870ء میں بیمہ زندگی کو منظم شکل دینے کے لئے ”لائف انشورنس ایکٹ“ (Life Insurance Act) وضع کیا گیا۔

اس لحاظ سے بیمہ اموال (حکلی میں) کا رواج بیمہ زندگی کے بعد ہوا جس کا ابتدائی سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ لندن میں 1666ء میں ایک زبردست آگ لگی جس سے چار دن تک اموال و جائیداد کا نقصان ہوتا رہا۔ (نقصان کا اندازہ تقریباً ایک کروڑ اشرفی ہے) اس کے بعد لوگوں کو تلافی نقصان کا خیال ہوا اور بیمہ اموال کی بنیاد پڑی۔

پھر 1911ء میں بیمہ کو زیادہ مفید و عام بنانے کے لئے ”لائف جارج“ نے انگلستان میں سماجی بیمہ کی تجویز پیش کی جس کے دو حصے تھے:

### i- تندرستی کا بیمہ:

اس میں بیماری معذوری (ہاتھ پاؤں کٹ جانے کی وجہ سے) اور زچگی کے زمانہ میں مالی مدد کی جاتی تھی۔

### ii- بے روزگاری کا بیمہ:

اس میں کچھ خاص تاجروں کو بے روزگاری کے زمانہ میں مالی مدد ملتی تھی۔

پھر اس کے بعد سماجی بیمہ کو ترقی دینے کے لئے اقتصادی بورڈ کی جانب سے سماجی تحفظات کے تحت مختلف قسم کی جامع تجویزیں پیش ہوتی رہیں بالآخر برطانوی پارلیمنٹ نے یہ فیصلہ کیا کہ ”ضعفی بیماری“ بے روزگاری اور حادثات کی وجہ سے نقصان کی تلافی کے لئے تمام مزدوروں اور کارمگروں کا بیمہ کرایا جائے۔

برطانیہ کے بعد دوسرے ملکوں میں سماجی بیمہ کے سلسلہ میں مختلف اقدامات کئے گئے اور اب تقریباً ہر ترقی یافتہ ملک امریکہ، نوزی لینڈ، آسٹریلیا، کینیڈا، جرمنی، فرانس اور روس میں محدود و غیر محدود طریقہ پر حکومت کی طرف سے سماجی تحفظات کے تحت اس بیمہ کا انتظام ہے جس کی کسی

قدر تفصیل اس طرح ہے:

جن حالات میں انسان روزی کمانے سے قاصر رہتا اور اس کو سماجی تحفظات کی ضرورت ہوتی ہے وہ حسب ذیل ہیں:

- 1- بیماری
  - 2- زچگی
  - 3- صحتی حادثات
  - 4- بے روزگاری
  - 5- غرضی
  - 6- معذوری (ہاتھ پاؤں وغیرہ کٹ جانے کی وجہ سے)
  - 7- روزی کمانے والے کی موت (Death of the Breadwinner) وغیرہ
- ان سب کو سماجی احتیاجات (Social Contingency) کہتے ہیں جن میں تحفظات کے دو طریقے رائج ہیں:

الف: سماجی اعانت میں تنہا حکومت متاثر لوگوں کی مدد کرتی یعنی گزربسر اور طبی امداد وغیرہ کا خود بندوبست کرتی ہے۔ یہ اعانت ان غرباء کے لئے خاص ہوتی ہے جن میں رقم جمع کرنے کی سکت نہیں ہوتی۔

ب: معاشرتی بیمہ میں ایک فنڈ قائم کیا جاتا ہے جس سے بیمہ وار کی کفالت کی جاتی اور طبی مدد دی جاتی ہے۔ اس فنڈ میں درج ذیل لوگوں کی رقمیں شامل ہوتی ہیں:

i- وہ جن کو بیمہ کرانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ii- وہ جو بیمہ دار کو ملازم رکھتے ہیں۔

iii- حکومت جس کے شریک ہونے کی کئی شکلیں ہیں:

(a) نقد رقم دیتی ہے۔

(b) انتظامی امور کے اخراجات برداشت کرتی ہے۔

(c) طبی ضروریات کا بندوبست کرتی ہے۔

عموماً معاشرتی بیمہ کا نظام ملازمین کے لئے ہے لیکن مذکورہ بالا ملکوں میں اس کے تحت ”سلیف ایمپلائڈ“ (Self Employed) (خود کاروبار کرنے والوں) کا بھی بیمہ کیا جاتا ہے جن کو ملازمین سے راکم تقریباً ڈیڑھ گنا رقم دینی پڑتی ہے البتہ سماجی تحفظات کی مذکورہ دونوں شکلوں میں صرف قلیل آمدنی والے ہی شامل ہوتے ہیں خواہ وہ ملازم ہوں یا خود کاروبار کرتے ہوں۔“

اس سے پوری طرح اندازہ ہو چکا ہے کہ بیمہ کا آغاز قدیم اہل عرب نے کیا تھا اور بعد

میں یہ کئی سیرحیاں (Stages) عبور (Cross) کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ آٹھویں صدی کے اختتام پر مسلمانوں نے بحری سائنس پر خاص توجہ دی اسے ترقی یافتہ بنایا اور بحر اوقیانوس میں ایک طاقتور بیڑا تیار کیا نیز عبدالرحمن نے سب سے پہلے اسے شروع کیا اور باقاعدہ ایڈمرل کا تقرر کیا۔ مزید برآں عبدالرحمن سوم کے دور حکومت میں عرب نیوی (Navy) بہت زیادہ مضبوط قوت بن گئی تھی اور ان کے جہاز بحر الکاہل سے مشرقی جانب چین، فلپائن اور ایسٹ انڈیز (East Indies) تک اور غربی طرف بحر اوقیانوس کے جزائر تک سفر کرتے تھے۔

چنانچہ خطرات اور نقصانات سے تحفظ حاصل کرنے کی خاطر شہرِ مکہ کی بنیاد پر بیسہ سازی کا بندوبست کیا گیا۔ ایک قسم کے مشترکہ فنڈ سے ہر جانہ دیا جاتا تھا۔

## انشورنس کے ممنوع ہونے کے اسباب

بیسہ بھی ان اہم موضوعات میں شامل ہے جن کی سخت مخالفت کی جاتی ہے اور مسلم مفکرین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ دراصل اس کے نقطہ فنی پہلو کو سامنے رکھا گیا ہے اور مثبت پہلو اوجھل ہونے کے سبب تاریک رخ مزید بوجھل (Heavy Loader) بنا دیا گیا ہے۔ اس کے نقصانات کی فہرست جو اعتراضات کی شکل میں پائی جاتی ہے اس کو بیان کیا جاتا ہے:

### 1- معاشی نظام کے منافی:

سید مودودی نے کسی فرد کے سوال کا جواب یوں دیا تھا:

”اگر ہم اپنے معاملات کو ان اداروں کے ہاتھ میں دے دیں اور ان کے اصول و قواعد کے تابع ہو کر اپنا رویہ ان میں لگائیں اور اپنے کاروبار ان کے ذریعے سے چلائیں تو اس کا طبیعی نتیجہ یہ ہو گا کہ ہم ایک معاشی گروہ کی حیثیت سے ان کے اجتماعی نظام میں جذب ہو جائیں گے۔“

آخر کسی مفید چیز کو اپنے نظم معیشت کا حصہ بنا دینے میں کیا حرج ہے؟ غیروں کی اچھی چیز لینے سے فائدہ ہی ہو گا۔

### 2- مجبوری:

ایک ماہر کا رائے یہ ہے:

”واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے ابتداء میں جو نقشہ قائم کیا تھا کاش کچھ دن بھی مسلمان اس نقشہ کو باقی رکھتے تو آج گھبرا گھبرا کر نہ دنیا انشورنس کے دامن میں پناہ ڈھونڈتے نہ غریب مخلوق اور کاشتکاروں کی مشکلات کا حل ہاتھی اتحاد والی سودخور انجمن میں سوچا جاتا۔ گویا بیچہ مرگ

(سرا ہو کار) سے کال کر اس کے حلق پر ان انجنیوں کی چھری چلائی جاتی ہے۔ مسلمان علماء کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ سود اور بیمہ وغیرہ کی شکلوں کے جواز کی صورت پیدا کی جائے۔ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام کے نظام میں ان مشکلات کے حل کی کوئی تدبیر نہ تھی اور گویا یورپ کا ذہن پہلی دفعہ ان مسائل کی طرف متغزل ہوا۔ لیکن کیا سمجھئے کہ کسی تصویر کے ایک حصے کے دیکھنے سے پوری تصویر کا حال معلوم نہیں ہو سکتا۔ اس زمانہ کی سرمایہ دار حکومتیں نادار بے روزگار باشندوں کی معاشرتی کفالت کی ذمہ داری لیتی بھی ہیں تو محدود پیمانے پر ہے۔ مجبوراً بیمہ کرنا پڑتا ہے۔ چند چوٹی کے سرمایہ داروں نے بیمہ کو ایک باقاعدہ تجارتی کاروبار بنا کر غریب پالیسی ہولڈروں کی آمدنی میں خود کو بھی حصہ دار بنا لیا ہے۔ نیز ایسی کمپنی متونی قبل از وقت کی اولاد کی جو بھی امداد کرتی ہے اس امداد کا بار ملک کے تمام باشندوں پر نہیں بلکہ صرف انہی چند ہزار لوگوں کی جیب پر پڑتا ہے جو اس بیمہ کمپنی میں شریک ہوتے ہیں۔ کیونکہ بیمہ کمپنی کے مضمکین یا منیجر ادائیگی اپنی جیب سے نہیں کرتے بلکہ پالیسی ہولڈرز یا بیمہ شدہ افراد کی رقم سے جو منافع حاصل ہوتا ہے۔ اس کا ایک حصہ کسی دوسرے بیمہ شدہ قبل از وقت مرنے والے افراد کی اولاد کو یک مشت ادا کر دیتے ہیں پھر سودی کاروبار کی جملہ خرابیاں بھی اس میں شامل ہوتی ہیں۔

اگر اسلامی معاشی نظام کی ترویج ہو تو نہ کوئی باپ اپنے مرنے سے اس لئے خوفزدہ رہ سکتا ہے کہ اس کے بچے یتیم ہو جائیں گے۔ بیوی بیوہ ہو کر لاوارث ہو جائے گی نہ کسی کو اس کا خطرہ رہ سکتا ہے کہ میں اگر اتفاقی طور پر کسی مصیبت یا مرض کا شکار ہوا اور میرا ہاتھ خالی ہو گیا تو علاج کون کرائے گا؟ میرے بچے کیا کھائیں گے۔ اگر کسی تاجر کو تجارت میں خسارہ آ جائے کسان کو ذراعت میں نقصان پہنچے کوئی انگڑا ہو جائے امداد ہو جائے بوڑھا ہو جائے سب کو اطمینان ہے کہ میری اولاد کے لئے بہت المال یعنی سرکاری خزانہ میں مستقل کافی رقم پڑی ہے جو ملک کے مقروضوں کا قرض توڑنے کے لئے استعمال میں آئی جائے نہ سودی قرض کی حاجت نہ جائیداد بیچنے کی چنداں ضرورت کہ ان کے قرض کی ادائیگی کا سامان حکومت کے خزانہ میں موجود ہے۔ بیوپار کرنے والے مسافر جو ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہتے ہیں نہ انہیں اس کی فکر کہ کسی جگہ جا کر میرا ہاتھ خالی ہو جائے گا۔ ہر ضلع ہر تعلقہ کے مقامی خزانہ میں اس کی امداد کا فنڈ موجود ہے۔“

### 3- ظلم (Cruelty):

عظیم صدیقی کے مطابق:

”انٹرنس کا موجودہ مسلم جسے سرمایہ دارانہ نظام نے تشکیل دیا ہے ایک نظر فریب قسم کا نظام ظلم ہے۔ اس نظام ظلم کے تحت غریبوں سے اکٹھے کئے ہوئے سرمائے کا بھاری منافع بڑے



بڑے کاروباری اداروں، بنکوں اور خود انشورنس کمپنیوں میں بٹ جاتا ہے۔ نیز بیمہ کمپنیوں کے ڈائریکٹر تو بڑی چیز ہوتے ہیں ان کے ایجنٹ تک اتنے بڑے بڑے کمیشن اور سفر خرچ وصول کرتے ہیں۔ اونچے اونچے سرکاری عہدوں پر رہ کر اتنی کمائی نہیں کی جاسکتی۔ چند سال کی محنت سے جو ایجنٹ ایک مقررہ مدت میں وثیقہ دار (Palley Holder) فراہم کر دیتا ہے وہ پھر بقیہ ساری عمر بغیر کام کئے اچھے معیار کی زندگی گزار سکتا ہے۔“

مزید لکھتے ہیں:

”بیمہ عام لوگوں کی مجبورانہ ضرورت تھی مگر بیمہ کمپنیاں ان کی خدمت کرتے نہیں آتیں ان کی پونجی کو سود پر چڑھا کر نفع اندوزی کرنے لگتی ہیں۔ ایسے کاروباری اداروں کا دوسروں کو اخلاقی روح کا واسطہ دلانا بہت ہی ناقابل فہم بات ہے۔“

#### 4- ناجائز فائدہ:

نیز یہ کہ:

”لائف انشورنس کا موجودہ نظام خالص اقتصادی لحاظ سے ایک نظام ظلم ہے جس کے پس پردہ اصل فائدہ تو وہی طبقہ اٹھاتا ہے جس کے پاس پہلے ہی ضرورت سے زیادہ دولت سمٹ رہی ہے اور حقیر اور برائے نام مفاد عوام کا رکھا گیا ہے جسے نفسیاتی سحر کاری اور حسابی جادوگری سے عوام کے سامنے من موہنے انداز میں پیش کیا جاتا ہے لیکن اگر ہم بحیثیت ایک سچے خدا پرست مسلمان کے اس مسئلے کو لیں تو ہمارے لئے اتنی بات جان لینا کافی ہے کہ سودی کاروبار کی ہر شکل کو اللہ عزوجل اور رسول اللہ ﷺ نے حرام ٹھہرایا ہے۔ کتاب الہی اس بارے میں بالکل ناظر اور حدیث نہایت صریح ہے۔ کیوں نہ ہم بغیر کسی تاویل کے یہ تسلیم کر لیں کہ سود پر چلنے والا نظام بیمہ اسلامی نظام نہیں ہو سکتا۔“

#### 5- نفرت و عداوت:

ایک خامی یہ گنوانی جاتی ہے کہ کئی افراد کے مابین حقارت و محاصمت کے جذبات ابھرتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جس سے بے چینی و افتراقی پھیلتی ہے۔ نیز یہ کہ کینہ و بغض جنم لیتا ہے۔ مگر بیمہ کرانے سے ایسی عادات کیوں پیدا ہوتی ہیں؟

#### 6- دیشقوں کی خرید و فروخت:

ایک بڑا اعتراض یہ اٹھایا جاتا ہے کہ انشورنس کمپنیاں سرکاری وثیقے اور کفالتیں (Securities) کے خریدنے اور بیچنے کی سرگرمیوں میں حصہ لیتی ہیں جن میں سودی عنصر ملوث

ہوتا ہے اس لئے ممنوع ہے لہذا بیمہ کا کاروبار بھی منکوک قرار پاتا ہے۔

### 7- پریمیم (Premium):

یہ ایسی رقم ہوتی ہے جو پالیسی ہولڈر اقساط کی صورت میں بیمہ کمپنی کو ادا کرتا رہتا ہے۔ ملائے کرام خامی بتلاتے ہیں کہ اس طرح جمع شدہ سرمایہ ناجائز کاروبار میں لگایا جاتا ہے اس طرح بیمہ کنندگان بھی اس سود والے کاموں میں شریک بن جاتے ہیں اور گنہگار ٹھہرتے ہیں۔

### 8- وائرٹوں کی حق تلفی:

ایک فرد کی موت واقع ہونے کی صورت میں رقم نامزد کردہ ورثاء کے حصے میں آتی ہے دیگر قانونی و شرعی وارثان بازگشت (Reversioners) محروم رہتے ہیں۔ اس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ اس کا قصور دار بیمہ کروانے والا شخص ہے اسے کون روکتا ہے کہ پالیسی میں سارے رشتہ داروں کو حقدار گردانا جائے۔ فقط یہ کہہ دینا کافی ہے کہ میری زندگی کے بعد میرے وارث شریعت کے مطابق حصہ لیں گے۔

### 9- انجمن سرمایہ داران:

ڈاکٹر اسرار احمد انشورنس کمپنی کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

”گویا یہ فی الحقیقت سرمایہ داروں کی ایک گواہی ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ صرف سرمایہ داروں کے سرمایہ کا تحفظ ہے اور کسی لایحکون دولت بین الاقضاء منکم کی جیتی جاگتی تصویر یہ سرمایہ داری کی لعنت کو تقویت پہنچانے والی شے ہے جس کی حرمت کا اسلام نے فیصلہ فرمادیا ہے۔“

مولانا محمد تقی امینی نے توضیح اس طرح کی ہے:

ابن عابدین (پیدائش 1198ھ / 1784ء وفات 1252ھ / 1836ء) کے زمانہ میں موجودہ بیمہ کا رواج نہ تھا صرف بحری بیمہ کی ایک شکل ”سوکرة“ کے نام سے رائج تھی جس کے بارے میں وہ کہتے ہیں:

”تاجروں کی یہ عادت ہے کہ جب وہ مال تجارت کے لئے کسی ”حرابی“ سے مال بردار جہاز کرایہ پر لیتے ہیں تو کرایہ کے علاوہ مزید ایک متعینہ رقم اس کے حوالے کرتے ہیں تاکہ وہ دوسرے حرابی سے مال پہنچانے کا معاملہ کر لے۔ یہ حرابی دارالحرب کا باشندہ ہوتا ہے جو اسے حاصل کر کے دارالاسلام کے سرحدی مقامات پر ٹھہرتا ہے۔ یہ شخص گویا وکیل اور مال پہنچانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اگر تجارتی مال کو راستہ میں جلتے ڈوبنے اور لوٹنے سے کوئی نقصان پہنچا تو یہ

نقص اسی متعینہ رقم کے عوض نقصان کی پوری تلافی کرتا ہے۔ اس رقم کو ”سوکرا“ اور اس پر معاملہ کرنے والے کو صاحب سوکرا کہتے ہیں۔“

لفظ ”سوکرا“ دراصل ”Securite“ سے عربی بنایا گیا ہے جس کے معنی فرانسیسی زبان میں ”امان و اطمینان“ ہیں۔

کلام عرب میں ”بیرہ“ کے لئے پہلے یہی لفظ مستعمل تھا اب ”عقد تائین“ اس کے لئے وضع ہو گیا ہے۔ نیز پہلے اس کا تعلق حربی و دارالحرب سے تھا۔ اب ہر جگہ اس کا رواج عام ہو گیا ہے۔

#### 10- ربا و جوام:

جدید دور کے کئی معقفین نے خامیاں منوائیں ہیں مثلاً:  
”انٹرنس کی بنیاد سود اور جوئے پر ہے۔“

#### 11- مدت کا تعین:

اس کا ایک بہت بڑا نقص یہ گنا جاتا ہے کہ عرصہ وقت متعین ہوتا ہے جس پر مقررہ شرح سے بولس ملتا رہتا ہے جس میں ربو اشافل ہوتا ہے جو حرام ہے اس لئے بیرہ بھی ناجائز ہے۔

#### 12- نفع و نقصان:

چند صاحبان ایک اعتراض یہ بھی کرتے ہیں کہ ایک فریق کو فائدہ ملتا ہے اور دوسری پارٹی کو زیان کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ اگر کوئی فرد بیرہ پالیسی کی مدت مقررہ سے قبل انتقال کر جائے تو پوری رقم اس کے وارثوں کو مل جاتی ہے لہذا بیرہ کبھی کو خسارہ ہوتا ہے۔ یہ غلط ہے کیونکہ کبھی نے کاروبار کی صورت میں بہت زیادہ افراد و املاک کا بیرہ کر رکھا ہوتا ہے اسے جمع شدہ نقد سے ہی ادائیگی کرنی ہوتی ہے۔ اب یہ کاروبار خاصا ترقی کر گیا ہے۔ کئی اقسام کی احتیاطی تدابیر اختیار کر لی گئی ہیں لہذا نقصانات کے امکانات کافی حد تک کم ہو گئے ہیں۔

#### 13- شرط لگانے والا معاہدہ:

یہ شرط بد نے یا بندھنے والا معاہدہ ہوتا ہے کیونکہ شرطوں کے بغیر یہ طے بھی نہیں پاسکتا اس لئے اسلام میں منع ہے۔ غلط قسم کی شرائط ختم کی بھی جاسکتی ہیں جس سے اس کو جائز بنایا جاسکتا ہے۔

#### 14- اخلاقی معیار کی نفی:

علمائے کرام نے اس کے خلاف ایک قسم کی جنگ چھیڑ رکھی ہے مگر اس پر زور دیتے رہتے ہیں۔

## 15- جدیدیت پسندوں کا نقطہ نظر:

موجودہ دور کے چند مفکر ہنسکی طرز استدلال اور قسم کی ہے ان کے مطابق یہ سود اور جوا کے ذمے میں نہیں ہے۔

یہ ایسا آلہ نہیں جس سے رضاے الہیہ کے برعکس کام ہو۔ انشورنس کمپنی امدادی ادارہ ہے۔ افراد خانوادہ اور ملک کے تحفظ کی ضمانت ملتی ہے۔ جبری بچت ہے جس سے کثیر سرمایہ جمع ہوتا ہے جس کو سرکاری کارخانہ امور پر صرف کیا جاسکتا ہے۔ مظلوموں، یتیموں اور یتیموں کی دست گیری ہو سکتی ہے اولاد کی تعلیم و تربیت و شادی بیاہ کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ سرمایہ کاری پھیلنے سے روزگار کے نئے مواقع کھلتے ہیں۔ سرکار بڑے بڑے ترقیاتی پروجیکٹ مکمل کر سکتی ہے۔ صنعت افروزی ہو سکتی ہے تجارت کو تقویت پہنچتی ہے۔ قوی سلامتی، خود اعتمادی و خود انحصاری بڑھ سکتی ہے۔

غربت کا علاج کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

## اصلاحی اقدامات

انشورنس / بیمہ کاری کی درگتی کے لئے یہ تجاویز دی جاتی ہیں، یہ طریقے بھی کہلاتے ہیں:

### 1- زر ضمانت:

حکومت کو اس امر پر رضامند کیا جائے کہ وہ کمپنی کا زر ضمانت اپنے سرکاری یا نیم سرکاری صنعتی و تجارتی امور میں حصہ داری کے حصول پر صرف کرے اور کمپنی کو متناسب منافع ادا کرے۔

### 2- استعمال سرمایہ:

کمپنی اپنے دوسرے سرمائے کو بھی ایسے نفع بخش کاموں میں لگائے جن میں سود کی بجائے اسے متناسب منافع حاصل ہو سکے۔ کسی سودی کاروبار میں رقم نہ لگائی جائے۔

### 3- شرطیں (Conditions):

بیمہ زندگی یا دوسری اشیاء صرف ان لوگوں کا قبول کیا جائے جو دو شرطوں کو تسلیم کر لیں۔  
اول یہ کہ ان کی موت کے بعد صرف ان کی جمع شدہ رقم ان کے جائز وارثوں میں تقسیم کی جائے گی۔ دوم یہ کہ شرعی قاعدے کے مطابق یہ رقم وارثان بازرگشت میں تقسیم ہوگی۔

## 4- منافع (Profit):

بیمہ کرائے والوں میں سے جو لوگ اپنی رقوم پر منافع چاہتے ہوں ان کا رویہ ان کی اجازت سے اسی قسم کے صنعتی، تجارتی، ذراعتی یا دیگر کاموں میں شراکت اور مضاربیت کے اصول پر لگا دیا جائے تاکہ انہیں موزوں منافع مل سکے۔

## 5- تحویل میں لینا:

تمام مسلم ممالک بھی نجی بیمہ کمپنیوں کو سرکاری تحویل میں لے لیں اور اس طرح حاصل شدہ رقوم ترقیاتی اور منافع آور پروجیکٹوں پر صرف کی جائیں اور منافع پالیسی ہولڈروں کے مابین ان کی پالیسی کے مطابق تناسب شرح سے تقسیم کیا جائے تاکہ کسی کو نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ نیز سب قسم کی احتیاطی تدابیر حکومت خود وضع کرے اور پوری طرح عمل درآمد کرائے تاکہ کام خوش اسلوبی سے چلتا رہے۔

## 6- پابندی:

کئی شعبہ میں کام کرنے والی کمپنیوں کو پابند بنایا جائے کہ وہ کاروبار کے ایسے طریقے منتخب کریں جن میں قمار (جوا)، اور ربا (سود)، ضرر اور غرر (فریب) کے عناصر شامل نہ ہوں نیز بلا سود کاموں میں سرمایہ استعمال کیا جائے۔

## 7- مصالحو عامہ:

دکانوں، مکانوں، کارخانوں، جہازوں، موٹر گاڑیوں، سکوروں، رکشوں وغیرہ کی بیمہ کاری کا معقول بندوبست ہونا چاہئے تاکہ نقصان کی صورت میں ازالہ ہو سکے۔

## 8- تلافی:

سرکاری ملازمین، نجی اداروں میں کام کرنے والوں کی معذوری اور بیماری کی صورت میں نقصان کو پورا کرنے کی ذمہ داری ادارہ شعبہ یا فرم پر ڈالی جائے اور وہی مدد کرے۔

## 9- ضابطہ اخلاق:

بیمہ کاری (Insuring) کے کاروبار کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے کے لئے ہدایات و اہل احکامات کا ایک ایسا ایجنڈا مرتب کیا جائے جس میں اس سے متعلق ساری تفصیلات طے کروہ ہوں اور سرکاری و نجی شعبوں میں انشورنس کمپنیوں کو اس چارٹر کی مکمل پیروی کرنے کا پابندی بنایا جائے۔

سفارشات کی تیاری کے لئے محیث دانوں، قانون دانوں، عالموں اور زندگی کے دیگر

شعبوں سے وابستہ ماہروں کی خدمات سے مستفاد رہی جائیں تاکہ جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہم رہیں۔ سوڈ جوئے اور دھوکہ دہی کے دھندے سے اجتناب برتا جائے۔

### 10- کچھ نظائر (Some Precedents):

اسلامی تعلیمات میں پیرہ کاری کے ضمن میں کئی اہم مثالیں بھی ملتی ہیں جن کے سیاق و سباق کو سامنے رکھتے ہوئے نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دقت حائل نہیں ہوتی کہ اس کا جواز بنتا ہے۔ گویا صدیوں پہلے سے پیرہ کی تنظیم کسی نہ کسی صورت میں موجود رہی ہے البتہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں مناسب تبدیلیاں کی جاتی رہی ہیں۔ ان میں سے کئی کا ذکر بے جا نہیں ہے۔

## اسلام میں انشورنس کا متبادل

بے شک موجودہ زمانے میں انشورنس کی بڑی اہمیت ہے اور ساری دنیا میں اس کا چلنا ہے مگر نہ اس دلیل سے کوئی حرام چیز حلال ہو سکتی ہے اور نہ کوئی حلال چیز حرام ہو سکتا ہے۔ کچھ دنیا میں ہو رہا ہے وہ سب حلال ہے یا اسے اس بناء پر حلال ہونا چاہئے کہ دنیا میں اس چلن ہو گیا ہے۔

ایک مسلمان قوم ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم جائز و ناجائز میں فرق کریں اور اپنے معاملات کو جائز طریقوں سے چلانے پر اصرار کریں۔

ذیل میں چند تدابیر درج کی جا رہی ہیں جن کو اپنا کر بیسے کی قباحتوں کو رفع کیا جاتا ہے۔

1- حکومت کو اس امر پر راضی کیا جائے کہ وہ کمپنی کا زر ضمانت اپنے کسی سرکاری یا سرکاری صنعتی یا تجارتی کام میں حصہ داری کے اصول پر لگا دے اور کمپنی کو اس کا نقصان متعین نہیں بلکہ متناسب منافع دے۔

2- کمپنی اپنے دوسرے سرمائے کو بھی ایسے منافع بخش کاموں میں لگائے جن میں سود بجائے متناسب منافع اس کو حاصل ہو۔ کسی قسم کے سودی کاروبار میں اس کے سرمائے کوئی حصہ نہ لگایا جائے۔

3- زندگی کا بنیہ صرف انہی لوگوں کا قبول کیا جائے جو دو باتوں کو تسلیم کریں: ایک یہ کہ ان کی موت کے بعد صرف ان کی اپنی جمع شدہ رقم ہی وارثوں کو دی جائے گی۔ دوسرا یہ کہ شرعی قاعدے کے مطابق یہ رقم تمام وارثوں میں تقسیم ہوگی۔

4- پیرہ کرانے والوں میں سے جو لوگ اپنی رقم پر منافع چاہتے ہوں ان کا رویہ یہ ہو

اجازت سے اسی قسم کے تجارتی کاموں میں حصہ داری کے اصول پر لگا دیا جائے جن کا ذکر اوپر نمبر 2 میں کیا ہے۔

درج بالا چار اصلاحات اگر آپ نافذ کر سکیں تو اس سے صرف یہی فائدہ نہ ہوگا کہ آپ کی کمپنی کا کاروبار پاک ہو جائے گا بلکہ اس سے ملک میں انشورنس کی اصلاح چاہنے والوں کو عام طور پر بڑی مفید رہنمائی ملے گی۔



# جدید معاشی مسائل اور ان کا اسلامی حل

قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے  
 ”واقعی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی (اچھی) حالت میں تغیر نہیں کرتا جب تک وہ لوگ اپنی  
 صلاحیت کی حالت کو نہیں بدلتے۔“ (الرعد)  
 علامہ اقبالؒ نے اس آیت کا یوں ترجمہ کیا ہے:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی

نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

موجودہ زمانے میں ملکوں اور قوموں کے اور بحیثیت مجموعی دنیا کے معاشی مسائل کو جو  
 اہمیت دی جا رہی ہے شاید اس سے پہلے کم از کم نمایاں طور پر ان کو اتنی اہمیت کبھی نہیں دی گئی۔  
 انسان کی زندگی میں اس کی معاش جس قدر اہمیت رکھتی ہے اُس کے لحاظ سے ہر زمانہ  
 میں افراد جماعتوں، قوموں، ملکوں اور تمام انسانوں نے اس کی طرف بہر حال توجہ کی ہے لیکن  
 آج اس توجہ کو جس چیز نے زیادہ نمایاں کر دیا ہے وہ معاشیات کے نام سے ایک باقاعدہ علم کا  
 بڑی بڑی کتابوں، بھاری بھرکم اصطلاحوں اور پُر شوکت اداروں کے ساتھ موجود ہونا اور ساتھ ہی  
 ضروریات زندگی کی پیدائش، فراہمی اور اکتساب کے طریقوں کا پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے چلے  
 جانا ہے۔

اب اگر ہم اصطلاحی اور فنی پیچیدگیوں سے بچ کر ایک سیدھے سادھے طریقے سے  
 دیکھیں تو انسان کا معاشی مسئلہ ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ تمدن کی رفتار ترقی کو قائم رکھتے ہوئے کس  
 طرح تمام انسانوں کو اُن کی ضروریات زندگی بہم پہنچنے کا انتظام ہو اور کس طرح معاشرہ میں ہر  
 شخص کو اپنی استعداد اور قابلیت کے مطابق ترقی کرنے اور اپنی شخصیت کو نشوونما دینے اور اپنے  
 کمال لائق تک پہنچنے کے مواقع حاصل رہیں۔

## زمانہ قدیم میں مسئلہ معاش:

قدیم ترین زمانہ میں انسان کے لئے معاش کا مسئلہ قریب قریب اتنا ہی سہل تھا جتنا  
 حیوانات کے لئے ہے۔ اللہ عزوجل کی زمین پر بے شمار سامان زندگی پھیلا ہوا ہے ہر مخلوق کے  
 لئے جس قدر رزق کی ضرورت ہے وہ بافراط مہیا ہے۔ ہر ایک اپنا رزق تلاش کرنے کے لئے



نکلتا ہے اور جا کر خزانہ رزق میں سے حاصل کر لیتا ہے۔ کسی کو نہ اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور نہ اس میں کا رزق کسی دوسرے مخلوق کے قبضہ میں ہے تقریباً یہی حالت انسان کی بھی تھی کہ گیاہ اور قدرتی رزق خواہ وہ پھلوں کی شکل میں ہو یا شکار کے جانوروں کی شکل میں حاصل کر لیا، قدرتی پیداوار سے بدن ڈھانکنے کا انتظام کر لیا، زمین میں جہاں موقع دیکھا سر چھپانے اور پڑ رہنے کی ایک جگہ بنالی لیکن اللہ عزوجل نے انسان کو اس لئے پیدا نہیں کیا تھا کہ وہ زیادہ مدت تک اسی حال میں رہے۔ اس نے انسان کے اندر ایسے فطری داعیات رکھے تھے کہ وہ انفرادیت چھوڑ کر اجتماعی زندگی اختیار کرے اور اپنی صنعت سے اپنے لئے اُن ذرائع زندگی سے بہتر ذرائع پیدا کر لے جو قدرت نے مہیا کئے تھے۔ عورت اور مرد کے درمیان دائمی تعلق کی فطری خواہش انسانی بچے کا طویل مدت تک ماں باپ کی پرورش کا محتاج ہونا، اپنی نسل کے ساتھ انسان کی گہری دلچسپی اور خونی رشتوں کی محبت، یہ وہ چیزیں تھیں جو اسے اجتماعی زندگی پر مجبور کرنے کے لئے خود فطرت ہی نے اس کے اندر رکھ دی تھیں۔ اسی طرح انسان کا خورد و پیداوار پر قانع نہ ہونا اور زراعت سے اپنے لئے خود غلہ پیدا کرنا، چوں کہ جسم ڈھانکنے کی بجائے اپنی صنعت سے اپنے لئے لباس تیار کرنا، غاروں اور بھٹوں میں رہنے پر مطمئن نہ ہونا اور اپنے لئے خود مکان بنانا، اپنی ضروریات کے لئے جسمانی آلات پر اکتفا نہ کرنا اور پتھر، لکڑی، لوہے وغیرہ کے آلات ایجاد کرنا، یہ بھی فطرت ہی نے اُس کے اندر ودیعت کیا تھا اور اس کا بھی لازمی نتیجہ یہی تھا کہ وہ رفتہ رفتہ متہدن ہو۔ پس اگر انسان متہدن ہوا تو اُس نے کوئی جرم نہیں کیا بلکہ عین اُس کی فطرت کا تقاضا اور اُس کے خالق کا قضاء یہی تھا۔

### تمدن کی پیدائش:

تمدن کی پیدائش کے ساتھ درج ذیل چند چیزیں ناگزیر تھیں:

- 1- انسان کی ضروریات زندگی بڑھیں اور ہر شخص خود اپنی تمام ضروریات فراہم نہ کر سکے بلکہ اُس کی کچھ ضرورتیں دوسروں سے اور دوسروں کی اُس سے متعلق ہوں۔
- 2- ضروریات زندگی کا مبادلہ (Exchange) عمل میں آئے اور رفتہ رفتہ مبادلہ اشیاء کا ایک واسطہ (Medium of Exchange) مقرر ہو جائے۔
- 3- اشیائے ضرورت تیار کرنے کے آلات اور نقل و حمل کے وسائل میں اضافہ ہو اور جتنی نئی چیزیں انسان کے علم میں آئیں اُن سب سے وہ فائدہ اٹھانا چلا جائے۔
- 4- آدمی کو اس امر کا اطمینان حاصل ہو کہ وہ چیزیں جن کو اُس نے خود اپنی محنت سے حاصل کیا ہے وہ آلات جن سے وہ کام کرتا ہے وہ زمین جس پر اُس نے گھر بنایا ہے وہ جگہ جس میں وہ اپنے پیشہ کا کام کرتا ہے یہ سب اُسی کے قبضہ میں رہیں گی اور اس

کے بعد ان لوگوں کی طرف منتقل ہوں گی جو دوسروں کی یہ نسبت اُس سے قریب تر ہیں۔

اس طرح مختلف پیشوں کا پیدا ہونا، خرید و فروخت، اشیاء کی قیمتوں کا تعین، روپے کا معیار قیمت کی حیثیت سے جاری ہونا، بین الاقوامی لین و دین اور درآمد برآمد تک نوبت پہنچنا، نئے نئے آلات و وسائل پیدا کرنا، استعمال میں آنا اور حقوق ملکیت و وراثت کا وجود میں آنا، یہ سب عین متقاضی فطرت تھا اور ان میں سے کوئی چیز بھی گناہ نہ تھی اور اب اس سے توبہ کرنے کی ضرورت ہو۔

مزید برآں تمدن کے نشوونما کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ:

1- مختلف انسانوں کی قوتوں اور قابلیتوں کے درمیان جو فرق خود فطرت نے رکھا ہے اس کی وجہ سے بعض انسانوں کو اپنی اصلی ضرورت سے زیادہ کمانے کا موقع مل جائے اور بعض اپنی ضرورت کے مطابق اور بعض اُس سے کم کمائیں۔

2- وراثت کے ذریعہ سے بھی بعض کو زندگی کا آغاز کرنے کے لئے اچھے وسائل مل جائیں اور بعض کم وسائل کے ساتھ اور بعض بے وسیلہ کارزار حیات میں قدم رکھیں۔

3- قدرتی اسباب سے ہر آبادی میں ایسے لوگ موجود رہیں جو کسب معاش کے کام میں حصہ لینے اور اسباب زندگی کے مبادلہ میں شریک ہونے کے قابل نہ ہوں مثلاً بچے بوڑھے بیمار، معذور وغیرہ۔

4- بعض انسان خدمت لینے والے اور بعض خدمت انجام دینے والے ہوں اور اس طرح آزادانہ صنعت و تجارت اور زراعت کے علاوہ نوکری اور مزدوری کی صورتیں بھی پیدا ہو جائیں۔

یہ سب بھی بجائے خود انسانی تمدن کے فطری مظاہر اور قدرتی پہلو ہیں۔ ان صورتوں کا رونما ہونا بھی اپنی جگہ کوئی بُرائی یا گناہ نہیں ہے کہ ان کے استیصال کی فکر کی جائے۔ تمدن کی خرابی کے دوسرے اسباب سے جو بُرائیاں پیدا ہوئی ہیں، اُن کے اصل سبب کو نہ پا کر بہت سے لوگ گھبرا اٹھتے ہیں اور کبھی شخصی ملکیت کو، کبھی روپے کو، کبھی مشین کو، کبھی انسانوں کی فطری نامساوات کو اور کبھی خود تمدن ہی کو کوٹنے لگتے ہیں لیکن درحقیقت یہ غلط تشفیص اور غلط تجویز علاج ہے۔

انسانی فطرت کے تقاضے سے تمدن میں جو نشوونما ہوتا ہے اور اس نشوونما سے فطرت جو صورتیں رونما ہوتی ہیں، اُن کو روکنے کی ہر کوشش نادانی ہے اور اس کے نتیجے میں فلاح کے بجائے جہاں نقصان کا زیادہ امکان ہے۔ انسان کا اصل معاشی مسئلہ یہ نہیں ہے کہ تمدن کی ترقی کو کس طرح روکا جائے یا اُس کے قدرتی مظاہر کو کس طرح بدلا جائے بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ تمدن

کے تشوہا کی فطری رفتار کو برقرار رکھتے ہوئے اجتماعی ظلم و بے انصافی کو کیسے روکا جائے اور فطرت کا یہ منشاء کہ ہر مخلوق کو اس کا رزق پہنچے کیونکر پورا کیا جائے اور ان رکاوٹوں کو کس طرح دور کیا جائے جن کی بدولت بہت سے انسانوں کی قوتیں اور قابلیتیں محض وسائل کے فقدان کی وجہ سے ضائع ہو جاتی ہیں۔

### معاشی انتظام کی خرابی کا اصل سبب:

نظام معیشت کی خرابی کا نقطہ آغاز خود غرضی کا عدم اعتدال سے بڑھ جانا ہے۔ پھر دوسرے ردائل اخلاق اور ایک فاسد نظام سیاست کی مدد سے یہ چیز بدھمتی اور پھیلنے لگتی ہے یہاں تک کہ پورے معاشی نظام کو خراب کر کے زندگی کے باقی شعبوں میں بھی اپنا زہریلا اثر پھیلا دیتی ہے۔ اگر انسان کی تمام اخلاقی صفات کو توازن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا اور خارج میں بھی ایک ایسا نظام سیاست موجود ہوتا جو زور و قوت کے ساتھ عدل قائم رکھتا تو ان سے کوئی خرابی پیدا نہ ہو سکتی تھی لیکن جس چیز نے انہیں خرابیوں کی پیدائش کا ذریعہ بنا دیا وہ یہ تھی کہ جو لوگ فطری اسباب سے بہتر معاشی حیثیت رکھتے تھے وہ خود غرضی، تنگ نظری، بداندیشی، بخل، حرص، بددیانتی اور نفس پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ شیطان نے انہیں یہ سمجھایا کہ تمہاری اصل ضرورت سے زائد جو وسائل معیشت چسپیں ملتے ہیں اور جن پر تمہیں حقوق ملائے ہوئے ہیں ان کے صحیح و معقول مصرف صرف دو ہیں:

- 1- ایک یہ کہ ان کو اپنی آسائش، آرامش، لطف، تفریح اور خوش باشی میں صرف کرو۔
- 2- دوسرے یہ کہ ان کو مزید وسائل معیشت پر قبضہ کرنے کے لئے استعمال کرو اور بن پڑے قوانین کے ذریعہ سے انسانوں کے خدا اور ان داتا بھی بن جاؤ۔

## اسلام میں معاشی مسائل کا حل

اسلام نے تمام مسائل حیات میں اس قاعدے کو ملحوظ رکھا ہے کہ زندگی کے جو اصول فطری ہیں ان کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے اور فطرت کے راستے سے جہاں انحراف ہوا ہے وہیں سے اس کو موڑ کر فطرت کے راستے پر ڈال دیا جائے۔

دوسرا اہم قاعدہ جس پر اسلام کی تمام اجتماعی اصلاحات مبنی ہیں وہ یہ ہے کہ صرف خارجی طور پر نظام تمدن میں چند ضابطے جاری کرنے ہی پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ سب سے زیادہ زور اخلاق اور ذہنیت کی اصلاح پر صرف کیا جائے تاکہ نفس انسانی میں خرابی کی جڑ کٹ جائے۔ تیسرا اساسی قاعدہ جس کا نشان آپ کو تمام اسلامی نظام شریعت میں ملے گا یہ ہے کہ حکومت کے جبر اور قانون کے زور سے صرف وہیں کام لیا جائے جہاں ایسا کرنا ناگزیر ہو۔

ان تین قاعدوں کو ملحوظ رکھ کر اسلام زندگی کے معاشی شعبے میں اُن تمام غیر فطری طریقوں کو زیادہ سے زیادہ اخلاقی اصلاح اور کم سے کم حکومتی مداخلت کے ذریعہ سے مٹانا ہے جو شیطانی اثر سے انسان نے اختیار کئے ہیں۔ یہ امر کہ انسان اپنی معاش کے لئے جدوجہد کرنے میں آزاد ہو یہ بات کہ آدمی اپنی محنت سے جو کچھ حاصل کرے اس پر اسے حقوق بالکافہ حاصل ہوں اور یہ کہ انسانوں کے درمیان ان کی قابلیتوں اور ان کے حالات کے لحاظ سے فرق و تفاوت ہو ان سب چیزوں کو اسلام اُس حد تک تسلیم کرتا ہے جس حد تک یہ فناء فطرت کے مطابق ہیں۔ پھر وہ ان پر ایسی پابندیاں عائد کرتا ہے جو انہیں حد فطرت سے تجاوز اور ظلم و بے انصافی کا موجب نہ بننے دیں۔

### حصول دولت:

سب سے پہلے دولت کمانے کے سوال کو لیجئے اسلام نے انسان کے اس حق کو تسلیم کیا ہے کہ خدا کی زمین میں وہ اپنی طبیعت کے رجحان اور اپنی استعداد و قابلیت کے مطابق خود اپنی زندگی کا سامان تلاش کرے لیکن وہ اُس کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اپنی معاش حاصل کرنے کے لئے اخلاق کو خراب کرنے والے یا تمدن کے نظام کو ہکا بٹا کرنے والے ذرائع اختیار کرے۔ وہ کسب معاش کے ذرائع میں حرام اور حلال کی تمیز قائم کرتا ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ جن جن کو ایک ایک نقصان رساں طریقہ کو حرام کر دیتا ہے۔ اس کے قانون میں شراب اور دوسری نشہ آور چیزیں نہ صرف بجائے خود حرام ہیں بلکہ ان کا بیٹنا، بیچنا، خریدنا، رکھنا سب حرام ہے۔ وہ زنا اور رقص و سرود اور اسی قسم کے دوسرے ذرائع کو بھی جائز ذرائع کسب معاش تسلیم نہیں کرتا۔ وہ ایسے تمام وسائل معیشت کو بھی ناجائز ٹھہراتا ہے جن میں ایک شخص کا فائدہ دوسرے لوگوں کے یا سوسائٹی کے نقصان پر مبنی ہو۔ رشوت، چوری، جوا اور سٹے دھوکے اور فریب کے کاروبار اشیاء ضرورت کو اس غرض سے روک رکھنا کہ قیمتیں گراں ہوں، معاشی وسائل کو کسی ایک شخص یا چند اشخاص کا اجارہ قرار دینا کہ دوسروں کے لئے جدوجہد کا دائرہ تنگ ہو ان سب طریقوں کو اس نے حرام ٹھہرایا ہے نیز کاروباری ایسی تمام شکلوں کو اس نے چھانٹ چھانٹ کر ناجائز قرار دیا ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے نزاع (Litigation) پیدا کرنے والی ہوں یا جن میں نفع و نقصان بالکل بخت و اتفاق پر مبنی ہو یا جن میں فریقین کے درمیان حقوق کا تقنین نہ ہو۔ اگر آپ اسلام کے اس تجارتی قانون کا تفصیلی مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ آج جن طریقوں سے لوگ کروڑ پتی اور ارب پتی بنتے ہیں ان میں سے بیشتر طریقے وہ ہیں جن پر اسلام نے سخت قانونی بندشیں عائد کر دی ہیں۔

اسلام جن وسائل کسب معاش کو جائز ٹھہراتا ہے اُن کے دائرے میں محدود رہ کر کام کیا

جائے تو اشخاص کے لئے ہے اندازہ دولت سیٹھے چلے جانے کا بہت کم امکان ہے۔

### حقوق ملکیت:

اب دیکھیں جائز ذرائع ہے جو کچھ انسان حاصل کرے اس پر اسلام اس شخص کے حقوق ملکیت تو تسلیم کرتا ہے مگر اس کے استعمال میں اسے بالکل آزاد نہیں چھوڑتا بلکہ اس پر بھی متعدد طریقوں سے پابندیاں عائد کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کمالی ہوئی دولت کے استعمال کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں:

i۔ اس کو خرچ کیا جائے۔

ii۔ اسے حریص نفع آور کاموں پر لگا دیا جائے۔

iii۔ اسے جمع کیا جائے۔

ان میں سے ایک ایک پر اسلام نے جو پابندیاں عائد کی ہیں انہیں ذیل میں درج کیا جا رہا ہے:

### اصول صرف / خرچ:

خرچ کرنے کے جتنے طریقے اخلاق کو نقصان پہنچانے والے ہیں یا جن سے سوسائٹی کو نقصان پہنچتا ہے وہ سب ممنوع ہیں۔ آپ جوئے میں اپنی دولت نہیں اڑا سکتے، آپ شراب نہیں پی سکتے، آپ زنا نہیں کر سکتے، آپ گانے بجانے اور ناچ رنگ اور عیاشی کی دوسری صورتوں میں اپنا روپیہ نہیں بھا سکتے، آپ ریشمی لباس نہیں پہن سکتے، آپ سونے اور جواہر کے زیورات یا برتن استعمال نہیں کر سکتے، آپ تصویروں سے اپنی دیواروں کو مزین نہیں کر سکتے، غرض یہ کہ اسلام نے ان تمام دواؤں کو بند کر دیا ہے جن سے انسان کی دولت کا بیشتر حصہ اس کی اپنی نفس پرستی پر صرف ہو جاتا ہے۔ وہ خرچ کی جن صورتوں کو جائز رکھا ہے وہ اس قسم کی ہیں کہ آدمی بس ایک اوسط درجہ کی شستہ اور پاکیزہ زندگی بسر کر لے۔ اس سے زائد اگر کچھ چاہتا ہو تو اسے خرچ کرنے کا راستہ اس نے یہ بخود کیا ہے کہ اسے تنگی اور بھلائی کے کاموں میں رفاہ عام میں اور ان لوگوں کی امداد میں صرف / خرچ کیا جائے جو معاشی دولت میں سے اپنی ضرورت کے مطابق حصہ پانے سے محروم رہ گئے ہیں۔

### سرمایہ پرستی کا استیصال:

کچھ لوگ جو اپنی ضرورت سے زیادہ کمالی ہوئی دولت کو پھر مزید زائد از ضرورت دولت کمانے میں لگا دیا ہیں گے اس کے استعمال کے طریقوں پر اسلام نے چند قانون پابندیاں عائد کر دی ہیں۔ اس تنگی ہوئی دولت کے استعمال کا یہ طریقہ کہ اسے سود پر چلایا جائے اسلامی

قانون میں قطعی حرام ہے۔ اگر آپ کسی کو اپنا مال قرض دیتے ہیں تو خواہ اس نے وہ قرض اپنی ضرورتوں پر خرچ کرنے کے لئے لیا ہو یا وسیلہ معاش پیدا کرنے کے لئے بہر حال آپ اس سے صرف اپنا اصل مال ہی واپس لینے کے حق دار ہیں۔ اس طرح اسلام ظالمانہ سرمایہ داری کی کمر توڑ دیتا ہے اور اس سب سے بڑے ہتھیار کو کھنکھراتا ہے جس کے ذریعے سرمایہ دار محض اپنے سرمایہ کے بل پر اس پاس کی معاشی دولت سمیٹا چلا جاتا ہے۔ رہا فاضل دولت کے استعمال کا یہ طریقہ کہ اسے انسان خود اپنی تجارت یا صنعت و حرفت یا دوسرے کاروبار میں لگائے یا دوسروں کے ساتھ نفع و نقصان کا شریک ہو کر سرمایہ فراہم کرے تو اسلام اسے جائز دیکھتا ہے اور اس سے جو زائد از ضرورت دولت اشخاص کے پاس سمٹ جاتی ہے اس کا علاج دوسرے طریقوں سے کرتا ہے۔

### تقسیم دولت اور کفالت عامہ:

اسلام نے زائد از ضرورت دولت کے جمع کرنے کو معیوب قرار دیا ہے بلکہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ مال تمہارے پاس ہے یا تو اسے اپنی ضروریات خریدنے پر صرف کرو یا کسی جائز کاروبار میں لگاؤ یا دوسروں کو دو کہ وہ اس سے اپنی ضروریات خریدیں اور اس طرح پوری دولت برابر گردش میں آتی رہے لیکن اگر تم ایسا نہیں کرتے اور جمع کرنے ہی پر اصرار کرتے ہو تو تمہاری اس جمع کردہ دولت میں سے از روئے قانون اڑھائی فیصد سالانہ رقم لکھوا لی جائے گی اور اسے ان لوگوں کی اعانت پر صرف کیا جائے گا جو معاشی جدوجہد میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہیں یا سنی و جہد کرنے کے باوجود اپنا پورا حصہ پانے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اسی چیز کا نام زکوٰۃ ہے اور اس کے انتظام کی صورت جو اسلام نے تجویز کی ہے وہ یہ ہے کہ اسے جماعت کے مشترک خزانہ میں جمع کیا جائے اور خزانہ ان تمام لوگوں کی ضروریات کا نفیل بن جائے جو مدد کے حاجت مند ہیں۔

یہ دراصل معاشرہ کے لئے انشورنس کی بہترین صورت ہے اور ان تمام خرابیوں کا استیصال کرتی ہے جو اجتماعی امداد و معاونت کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ سرمایہ داری نظام میں جو چیز انسان کو دولت جمع کرنے اور اسے نفع آور کاموں میں لگانے پر مجبور کرتی ہے اور جس کی وجہ سے لائف انشورنس وغیرہ کی ضرورت پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص کی زندگی اس نظام میں اپنے ہی ذرائع پر منحصر ہے۔

بوڑھا ہو جائے اور کچھ بچا کر نہ رکھا ہو تو بھوکا مر جائے۔ ہال بچوں کے لئے کچھ چھوڑے بغیر مرے تو وہ دربدر مارے مارے پھریں اور بھیک کا ٹکڑا تک نہ پاسکیں۔ بیمار ہو جائے اور کچھ بچا بچایا نہ رکھا ہو تو علاج تک نہ کرا سکے۔ گھر جل جائے یا کاروبار میں نقصان ہو

یا کوئی اور آفت ناگہانی آ جائے تو کسی طرف سے اس کو سہارا ملنے کی امید نہیں۔ اسی طرح سرمایہ داری نظام میں جو چیز محنت پیشہ لوگوں کو سرمایہ داروں کا ذریعہ غلام بن جانے اور ان کی شرائط پر کام کرنے کے لئے مجبور کر لی ہے وہ بھی ایسا ہے کہ جو کچھ اس کی محنت کا معاوضہ سرمایہ دہر دیتا ہے اسے لینا اگر غریب آدمی قبول نہ کرے تو قاتل کرے اور ننگا بھرے۔ سرمایہ داری کی بخشش سے منہ موڑ کر اسے دو وقت کی روٹی میسر آنی مشکل ہے۔ پھر یہ لغت کبریٰ جو آج سرمایہ داری نظام کی بدولت دنیا پر مسلط ہے کہ ایک طرف لاکھوں کروڑوں انسان حاجت مند موجود ہوں اور دوسری طرف زمین کی پیداوار اور کارخانوں کی مصنوعات کے انبار لگے ہوئے ہیں مگر غریبے نہیں چاہتے حتیٰ کہ لاکھوں من گیہوں سمندر میں پھینکا جاتا ہے اور بھوکے انسانوں کے پیٹ تک نہیں پہنچتا اس کا سبب بھی یہی ہے کہ حاجت مند انسانوں تک وسائل معیشت پہنچانے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ان سب کے اندر قوت خریداری پیدا کر دی جائے اور وہ اپنے حسب حاجت اشیاء خریدنے کے قابل ہو جائیں تو صنعت تجارت ذراعت غرض ہر انسانی حرفت پہلے پہلے چلتی چلی جائے۔

اسلام زکوٰۃ اور بیت المال کے ذریعہ سے ان ساری غریبوں کا استعمال کرتا ہے۔ بیت المال ہر وقت آپ کی پشت پر ایک مددگار کی حیثیت سے موجود ہے۔ آپ کو فکر فردا کی ضرورت نہیں۔ جب آپ حاجت مند ہوں بیت المال میں جائے اور اپنا حق لے آئے پھر تنگ ڈپازٹ اور انشورنس پالیسی کی کیا ضرورت؟..... آپ اپنے ہال بچوں کو چھوڑ کر باطمینان تمام دنیا سے رخصت ہو سکتے ہیں۔ آپ کے پیچھے جماعت کا خزانہ ان کا قلیل ہے۔ بیماریاں بڑھاپے آفات ارضی و سماوی..... ہر صورت حال میں بیت المال وہ دائمی مددگار ہے جس کی طرف آپ رجوع کر سکتے ہیں۔ سرمایہ دار آپ کو مجبور نہیں کر سکتا کہ آپ اسی کی شرائط پر کام کرنا قبول کریں۔ بیت المال کی موجودگی میں آپ کے لئے فاقے اور بزدلی اور بے سائگی کا کوئی خطرہ نہیں۔ پھر یہ بیت المال سوسائٹی کے تمام اُن لوگوں کو اشیائے ضرورت خریدنے کے قابل بنا دیتا ہے جو دولت پیدا کرنے کے بالکل ناقابل ہوں یا کم پیدا کر رہے ہوں۔ اس طرح مال کی تیاری اور اس کی کھپت کا توازن عظیم قائم رہتا ہے اور اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ آپ اپنے دیوالیہ پن کو دنیا بھر کے سر چمکانے کے لئے دوڑتے پھریں اور آخر کار دوسرے سیاروں تک پہنچنے کی ضرورت پیش آئے۔

زکوٰۃ کے علاوہ دوسری تدبیر جو ایک مٹنی ہوئی دولت کو پھیلانے کے لئے اسلام نے اختیار کی ہے وہ قانون وراثت ہے۔ اسلام کے سوا دوسرے قوانین کا رجحان اس طرف ہے کہ جو دولت ایک شخص نے زہری بھر سیٹی ہے وہ اس کے مرنے کے بعد بھی مٹنی رہے مگر اس کے برعکس اسلام یہ طریقہ اختیار کرتا ہے کہ جس دولت کو ایک شخص سمیٹ کر قید کرتا رہا ہے اس کے

مرنے ہی وہ پھیلا دی جائے۔ اسلامی قانون میں بیٹے بیٹیاں باپ ماں بیوی بھائی بہن سب ایک شخص کے وارث ہیں اور ایک ضابطہ کے مطابق سب پر میراث تقسیم ہونی ضروری ہے۔ قرہنی رشتہ دار موجود نہ ہوں تو دور پر سے کے رشتہ دار تلاش کئے جائیں گے اور ان میں یہ دولت پھیلائی جائے گی۔ کوئی رشتہ دار سرے سے موجود ہی نہ ہو تب بھی آدمی کو متعلق بنانے کا حق نہیں ہے۔ اس صورت میں اس کی وارث پوری جماعت ہے۔ اس کی سینی ہوئی تمام دولت بیت المال میں داخل کر دی جائے گی۔ اس طرح خواہ کوئی شخص کروڑوں اور اربوں کی دولت جمع کر لے اس کے مرنے کے بعد دو تین پشتوں کے اعداء وہ سب کی سب چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر پھیل جائے گی اور دولت کا ہر سناؤ بتدریج پھیلاؤ میں تبدیل ہو کر رہے گا۔

### معاشی مسائل اور حل / اہم نکات:

ذیل میں کچھ اہم نکات درج کئے جا رہے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر امت مسلمہ کو ورثہ مسائل پر قابو پایا جاسکتا ہے:

- 1- مسلم ممالک میں تعلیم کو فروغ دیا جائے تاکہ پسماندگی دور ہو۔
- 2- عالم اسلام کی الگ امن فوج بنائی جائے جو مسلم ممالک میں الجھاد پیدا ہونے کی صورت میں ان متحارب ملکوں میں بھیج کر امن قائم کرائے۔ یہ فوج وہی کردار ادا کرے جو اقوام متحدہ کی امن فوج ادا کرتی ہے۔ اس کے تمام اخراجات بھی تمام مسلم ممالک خود مل جل کر برداشت کریں۔
- 3- مسلم ممالک کے مفاد کی نگرانی کرنے کے لئے مسلم ممالک کے سربراہ گاہے بگاہے مل بیٹھ کر باہمی صلاح مشوروں سے اسلام دشمن قوتوں کا مقابلہ کرنے کی تدابیر عمل میں لایا کریں۔
- 4- عالم اسلام کو حفاظت خود اختیاری کو مد نظر رکھتے ہوئے بہترین جنگی سامان کی تیاری پر دھیان دینا چاہئے تاکہ مسلمان جنگی میدان میں کسی سے پیچھے نہ رہ جائیں۔
- 5- تمام مسلم امہ کو آپس میں دفاعی معاہدے کرنے چاہئیں تاکہ اگر کسی ملک پر حملہ ہو جائے تو دوسرے اسلامی ممالک اس کی مدد یہ سمجھ کر کریں کہ یہ حملہ ان کے ملک پر ہوا ہے۔
- 6- روس نے دنیا کو دکھانے کے لئے تو وسط ایشیا کی ریاستوں کو آزادی دے دی ہے لیکن اعدوں خانہ ان پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہے اور اپنا تسلط قائم رکھنے کے لئے ان کو مسلم ریاستوں کی دولت مشترکہ میں باغ و عنبر کی کوشش کر رہا ہے۔ ان مسلم ریاستوں کو روس کے ایسے چکر دلوں میں نہیں آنا چاہئے اور نہ کسی ایسی دولت مشترکہ کی رکنیت قبول کریں۔



کرتی چاہئے۔

- 7- وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں کے پاس جنگی طیارے وافر مقدار میں موجود ہیں۔ مسلمان ممالک امریکہ، برطانیہ، فرانس یا روس سے خریدنے کی بجائے ان مسلمان ریاستوں سے خریدنے چاہئیں تاکہ اس کا فائدہ مسلم ریاستوں کو حاصل ہو۔
  - 8- وسط ایشیا کی ریاستوں میں اسلامی لٹریچر زیادہ سے زیادہ تعداد میں بھجویا جائے۔ اس کے علاوہ ان نوآزاد مسلم ریاستوں میں مسلمان مبلغین زیادہ سے زیادہ دورے کریں اور ان کو اسلامی اقدار سے روشناس کرائیں۔
  - 9- عالمی جنگ (عراق کو سمیت امریکہ) میں جدید ٹیکنالوجی کے فوائد منظر عام پر آئے ہیں لہذا ضروری ہے کہ مسلمان ممالک زیادہ سے زیادہ جدید ٹیکنالوجی سے فوج کو متعارف کرائیں اور اپنی افواج کو ہر نئی جنگی چال، ہر نئے ہتھیار اور نئے نئے جنگی طریقوں سے ہر وقت باخبر رہیں۔ ان کی پیشہ ورانہ مہارت اور فرائض میں غفلت سے کام نہ لیا جائے۔
  - 10- سب سے اہم بات یہ ہے کہ اپنے اندر خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کیا جائے خود کو کبھی کمزور نہ سمجھا جائے اور اس وہم کو بھی دل سے نکال دینا چاہئے کہ مغربی طاقتیں ہم پر حملہ آور ہو جائیں گی۔
- اگر مندرجہ بالا تہاویز پر عمل کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلم اُمہ کی دھماک ایک بار پھر دنیا بھر کے غیر مسلم ممالک پر نہ بیٹھ جائے۔



# بیع و شراء کی جدید صورتیں

## لیزنگ / اجارہ کاری (Leasing)

اس کی اصطلاحی تعریف یہ ہے ہدایہ میں ہے:  
 الاجارة عقد يرد على المنافع بعوض (ہدایہ ج 3)  
 ”اجارہ وہ عقد (معاہدہ) ہے جو کسی شے کے عوض منفعت پر کیا جاتا ہے۔“  
 الحکمت کے مرتبین نے ذرا اور زیادہ واضح تعریف کی ہے:  
 بيع المنفعة المعلومه في مقابلة عوض معلوم  
 ”کسی معلوم منفعت کے مقابلہ میں کسی متعین عوض کا معاملہ (بیع) کرنے کو اجارہ کہتے ہیں۔“

”بیع منفعت“ کے لفظ سے بیع و شراء سے یہ طہرہ ہو گیا اس لئے کہ اس میں دونوں طرف عوض اور مال ہوتا ہے اور ہبہ ہدیہ اور عاریت وغیرہ سے بھی یہ طہرہ ہے اس لئے کہ ہبہ وغیرہ میں منفعت کا معاہدہ نہیں بلکہ اعیان یعنی اشیاء کا معاہدہ ہوتا ہے اس کی کچھ اصطلاحوں کا ذکر اجیر مشترک اور اجیر خاص کے بیان میں آئے گا۔  
 اوپر ذکر آچکا ہے کہ اجارہ میں مقصود منفعت ہوتی ہے اب اس کی دو قسمیں ہیں: ایک منفعت اشیاء سے حاصل کی جاتی ہے اس کی تین صورتیں ہیں:

- 1- زمین یا مکان کرایہ پر دیا جائے یا لیا جائے۔
- 2- دوسرے سامان جیسے برتن، شامیانہ، فرنیچر وغیرہ کرایہ پر دیا جائے یا لیا جائے۔
- 3- تیسرے سواریاں، سائیکل، موٹر، ٹریکٹر وغیرہ کرایہ پر دی جاتی ہیں۔

دوسرے منفعت کا معاملہ عمل سے متعلق ہو یعنی جیسے ہم مختلف قسم کے کاریگروں سے کام لیتے ہیں یا مزدوروں سے کام لیتے ہیں اس کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک اجیر خاص دوسرے اجیر مشترک۔ اجیر خاص جیسے اساتذہ دفتروں کے ملازمین یا گھریلو خدام وغیرہ۔ اجیر مشترک جو کسی ایک شخص یا ادارہ کا پابند نہ ہو بلکہ وہ آزادانہ اپنا کام کرتا ہو جیسے مختلف قسم کے کاریگر ٹریکٹر ڈرائیور، نقلی درزی، رنگریز، دھوبی، بکسر، دلال وغیرہ اور دوسرے پیشہ ور۔

اجیر خاص ہو یا اجیر مشترک یا کرایہ دار جو چیز ان کے تحت دی جاتی ہے وہ امانت ہوتی

ہے مثلاً مزدور کے سپرد جو کام ہے وہ امانت ہے، کاریگر کے یہاں جو سامان ہے وہ اس کے یہاں امانت ہے، اسی طرح کرایہ دار کے تصرف میں جو مکان یا دوکان ہے وہ امانت ہے، اس کی حفاظت ان پر ضروری ہے۔

## کرایہ پر لینا یا دینا

اپنی کسی چیز کو کرایہ پر دینا یا کسی دوسرے کی چیز کو کرایہ پر لینا جائز ہے، اس کے بارے میں چند ضروری مسائل لکھے جاتے ہیں:

1- کرایہ کا معاملہ آسنے سامنے بھی طے ہو سکتا ہے اور خط و کتابت سے بھی، اگر کوئی گونا گویا چیز کو کرایہ پر دے گا تو اشارہ سے بھی معاملہ طے ہو سکتا ہے۔ اسی طرح تعاطی یعنی بات چیت کے بغیر طرز عمل سے بھی معاملہ طے ہو سکتا ہے مثلاً آپ بس یا ٹیکسی پر بیٹھ گئے اور بس اور ٹیکسی والے نے کوئی اعتراض نہیں کیا، جو کرایہ مقرر تھا آپ نے اسے دے دیا اور کوئی بات نہیں ہوئی، اسی کو تعاطی کہتے ہیں۔

2- کرایہ پر دینے والے اور لینے والے دونوں کا عاقل ہونا ضروری ہے یعنی وہ بڑے بچے اور نقصان فائدہ کی تمیز کر سکتا ہو، بالغ ہونا ضروری نہیں ہے۔

بیع و شراء کی طرح اس میں ماضی کے صیغہ سے معاملہ طے ہونا چاہئے، مستقبل کے صیغہ سے جائز نہیں۔

3- اگر کوئی چیز کرایہ پر لی جائے تو دو باتیں طے ہونی چاہئیں، ایک یہ کہ اس کا کرایہ کتنا ہو گا؟ دوسرے یہ کہ وہ کتنے دنوں کے لئے یا کس کام کے لئے کرایہ پر لے رہا ہے۔ مثلاً اگر کوئی مکان کرایہ پر لیا یا سواری، برتن یا کپڑا کرایہ پر لیا تو اس کا کرایہ بھی طے ہونا چاہئے اور مدت بھی یعنی ایک سال، دو سال یا ایک ماہ دو ماہ یا ایک دن دو دن کے لئے لے رہا ہے یا کچھ دو گھنٹے کے لئے، سواری میں کرایہ اور مدت کے ساتھ یہ بھی طے ہونا چاہئے کہ وہ سواری کس کام کے اور کتنی مسافت کے لئے لے رہا ہے، مثلاً کسی نے موٹر سائیکل یا رکشہ کرایہ پر لیا تو یہ بتا دینا چاہئے کہ سوار ہونے کے لئے لے رہا ہے یا سامان ڈھونے کے لئے اور وہ اسے کہاں تک یا کتنے میل لے جائے گا تاکہ بعد میں دونوں میں کوئی اختلاف نہ ہو۔

4- اگر کسی نے مکان کرایہ پر لیا اور کرایہ اور مدت نہیں طے کی یا یہ کہا کہ میں اس کی مرمت کرا دیا کروں گا یا سفیدی کرا دیا کروں گا تو یہ معاملہ عاریت کا ہونا چاہئے، اس لئے عاریت کے جو شرائط ہیں اس کے مطابق معاملہ کرنا چاہئے۔

5- اگر سو روپے ماہوار کے حساب سے کرایہ طے ہوا تو یہ معاملہ صرف ایک مہینہ کے لئے

سمجھا جائے گا دوسرے مہینہ میں دونوں کو پھر سے معاملہ کرنا چاہئے اگر مالک مکان چاہے تو ایک ماہ کے بعد کرایہ دار سے مکان خالی کر سکتا ہے البتہ اگر مالک مکان نے دوسرے مہینہ کی پہلی تاریخ کو کوئی اعتراض نہ کیا تو پھر وہ دوسرے مہینہ میں اسی کرایہ پر رہ سکتا ہے۔

گویا اس صورت میں ہر ماہ مالک مکان کرایہ بڑھا بھی سکتا ہے اور اپنا مکان خالی بھی کر سکتا ہے لیکن اگر کرایہ دار نے سال دو سال یا دس بیس سال کے لئے کوئی مکان یا زمین مدت مقرر کر کے کرایہ پر لی تو پھر اس مدت تک مالک کو نہ تو کرایہ بڑھانے کا حق ہے اور نہ اس کو نکالنے کا۔

6- مکان یا دوکان کرایہ پر لے لیا مگر اس نے اسے استعمال نہیں کیا تو جتنے دن اس کو اپنے قبضہ میں رکھے گا اتنے دن کا کرایہ دینا پڑے گا۔

7- اگر سواری کرایہ پر کی تو اس پر اتنے ہی آدمی سوار ہو سکتے ہیں جتنے آدمی سوار ہونے کے لئے وہ بنائی گئی ہے یا اس میں عام طور پر جتنے آدمی سوار ہوتے ہیں مثلاً آپ نے رکشا کرایہ پر کیا تو اس پر صرف دو ہی آدمی کو بیٹھنا چاہئے یا ریل کے ڈبہ میں جتنے آدمیوں کی جگہ ہوا اتنے ہی آدمیوں کو بیٹھنا چاہئے اسی طرح موٹر بس یا سائیکل وغیرہ کا حکم ہے اگر خود مالک زیادہ آدمیوں کو بٹھالے تو اس کو یہ حق ہے مگر سیٹ سے زیادہ اگر وہ سواری بٹھائے گا تو دوسری سواریوں کو اعتراض اور کرایہ میں کمی کرنے کا حق ہو گا اور حکومت بھی اس میں مداخلت کر سکتی ہے۔

8- مشترک مکان، دوکان یا کوئی مشترک چیز کرایہ پر نہیں دی جاسکتی۔

9- مکان کی آرائش و زیبائش کے لئے کوئی چیز کرایہ پر لینا ناجائز ہے البتہ اگر کسی کام کے لئے لائی گئی ہو اور ضمانت اس

سے آرائش و زیبائش بھی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

10- کتاب یا قرآن پاک کرایہ پر دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو اس

کے عدم جواز کے قائل ہیں کیونکہ یہ عام افادہ کی چیز ہے اس کو مفت دینا چاہئے البتہ حفاظت کے خیال سے اس کی ضمانت لی جاسکتی ہے۔ ضمانت خواہ مالی ہو یا جانی یعنی کوئی کفیل اور ضامن بن جائے مگر امام مالک، امام شافعی، امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کتابوں کو کرایہ پر دینے لینے کی اجازت دیتے ہیں موقع و محل اور ضرورت کے لحاظ سے ان دونوں راویوں میں سے کسی ایک پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

11- گائے، بھینس یا بکری کو دودھ پینے کے لئے کرایہ پر دینا درست نہیں ہے بلکہ عاریض دینا مناسب ہے اسی طرح درخت کو کرایہ پر دینا کہ وہ پھل کھایا کرے گا یا ادھار پر جانور کو

دینا کہ جو بیچ پیدا ہوں گے اس میں دونوں نصف نصف لیں گے یا مرضی کو دینا کہ جو اڑے ہوں گے وہ دونوں کے آدمے آدمے ہوں گے یہ سب ناجائز ہے۔ ان چیزوں کو اجرت پر دینا چاہئے یعنی بکری یا گائے دی اور اس کی چرواہی ملے کر لی کہ سال میں ہم تم کو اتنا روپیہ یا ایک جوڑا کپڑا دیں گے تم ان کو چلایا کرو دیہاتوں میں دونوں صورتیں رائج ہیں مگر شریعت میں پہلی صورت ناجائز ہے اور دوسری جائز ہے۔ پہلی صورت ناجائز اس لئے ہے کہ جو چیز ابھی وجود میں نہ آئی ہو اس کی خرید و فروخت اور کرایہ پر دینا ناجائز ہے اس لئے کہ اس میں اختلاف کی بڑی گنجائش ہے۔

### کرایہ کا معاملہ کب ختم ہو سکتا ہے؟

1- جب کوئی چیز کرایہ پر لی یا دی جاتی ہے تو کرایہ پر لینے والے اور دینے والے دونوں آپس میں گویا کرایہ کا معاہدہ کرتے ہیں۔ اگر صحیح طریقہ پر معاملہ ملے ہو گیا ہے تو اب ان میں سے کسی کو بغیر کسی حذر یا مجبوری کے اس معاہدہ کو توڑنا جائز نہیں۔ مثلاً کرایہ پر دینے کے بعد مالک کو اس کا کرایہ زیادہ ملنے لگے تو کرایہ دار کو پریشان کر کے معاہدہ ختم کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہئے۔<sup>(۱)</sup> اسی طرح کرایہ دار کو بھی بغیر کسی حذر کے معاملہ کو ختم نہ کرنا چاہئے۔

2- کہیں جانے کے لئے رکشہ، موٹر یا اور کوئی سواری منگائی پھر ارادہ بدل گیا تو رکشے اور موٹر کو واپس کر سکتے ہیں لیکن اگر رکشہ والے کا وقت زیادہ ضائع ہوا ہے یا موٹر کی میل سے جل کر آئی ہے تو رکشہ والے کو اتنے وقت کی ضروری اور موٹر والے کو پٹرول کی قیمت اور اتنے وقت کی اجرت دینی چاہئے۔

3- کرایہ دار یا مالک میں سے کوئی مرجائے تو اب پچھلے کرایہ کا معاملہ ختم ہو گیا (بشرطیکہ یہ معاملہ انہوں نے اپنے لئے کیا ہوا اگر کسی دوسرے کے لئے معاملہ کیا ہے تو ان کی موت سے دوسرے کا معاملہ ختم نہیں ہوگا۔ صاحب ہدایہ نے اسی لئے عقد الاجارۃ للفیس کی قید لگا دی ہے) اب اس کے ورثہ کو سنے سرے سے معاملہ کرنا چاہئے۔ آئمہ ثلاثہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کے یہاں کسی کی موت سے اجارہ ختم نہیں ہوتا ان کے ورثہ اسے پورا کریں۔

4- اس شرط پر کرایہ کا ایڈوانس دینا یا لینا جائز نہیں ہے کہ اگر میں کرایہ پر نہ لوں گا یا اگر سواری سے نہ جاؤں گا تو پھر ایڈوانس کی رقم مالک مکان یا سواری والے کی ہو جائے گی یہ مالک کی زیادتی ہے۔ ریل کا ٹکٹ لینے کے بعد اگر اس کو واپس کیا جائے تو اس میں کچھ رقم کاٹ لی جاتی ہے اسلامی حکومت میں ایسا نہ کیا جائے گا اس کی واپسی میں

گورنمنٹ کا کوئی نقصان نہیں ہے۔

پگڑی لینا دینا:

آج کل عام طور پر مکان یا مکان کو کرایہ پر لینے یا حق کو خالی کرانے کے لئے مالک کرایہ دار سے کچھ رقم لے کر جسے پگڑی کہا جاتا ہے اپنا مکان یا مکان اسے کرایہ پر دیتا ہے اسی طرح جب اسے خالی کرانا ہوتا ہے تو مالک کرایہ دار کو کچھ پگڑی کی رقم دے کر اسے خالی کرانا ہے اور اتنا ہی نہیں بلکہ کرایہ دار کی مرضی کے بغیر دوسرے کسی کرایہ دار سے پگڑی کی رقم لے کر مکان خالی کر کے اس کے حوالہ کر دیتا ہے اور یہ رقم نہ تو کرایہ میں محسوب ہوتی ہے اور نہ بعد میں ادا کی جاتی ہے یہ تمام صورتیں ناجائز ہیں اور پگڑی کی رقم لینے والے کے لئے حرام ہے اور دسپنہ والا رشوت دسپنہ کا مرگب ہوا۔ اسی طرح کا معاملہ کرنا صریح ظلم اور مصیبت کا معاملہ ہے۔ قرآن پاک میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے:

لَا يَظْلِمُونَ وَلَا يَظْلَمُونَ (بقراء)

”نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔“

اس کی تشریح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے:

”لا ضرر ولا ضرار“ نہ تو نقصان اٹھایا جائے اور نہ نقصان پہنچایا جائے۔“

دوسری حدیث میں ہے:

مَلْعُونٌ مِّنْ حَسَارٍ مَّوْمِنًا أَوْ مَكْرِهٍ (مشکوٰۃ)

”وہ شخص ملعون ہے جو کسی مسلمان کو نقصان پہنچائے یا اس کے ساتھ دھوکہ دے۔“

کرے۔“

ان ہی آیات قرآنی اور احادیث نبوی ﷺ کی روشنی میں فقہاء نے یہ اصول بنا دیا ہے:

لَا يَجُوزُ لِرَجُلٍ مِّنْ أَهْلِ الْإِسْلَامِ قَبْضُ مَالِ أَحَدٍ بِلَا وَجْهِ شَرْعِيٍّ.

(فتاویٰ عالمگیری ج 4)

”کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی کا مال بغیر کسی شرعی سبب کے لے لے۔“

مولانا مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا مفتی عبدالرحیم مدظلہ دونوں حضرات نے

اسے ناجائز قرار دیا ہے۔ پگڑی کی رقم دو سبب سے ناجائز ہے۔ ایک تو غیر شرعی طریقہ پر کسی

مال لے لینا دوسرے اس پر رشوت کی تعریف بھی صادق آتی ہے اور رشوت کا حکم اوپر بیان کیا

جا چکا ہے۔

اگر مالک کرایہ دار سے کہتا ہے کہ مکان خالی کر دیجئے تو کچھ مہلت لے کر اسے خالی

دینا چاہئے البتہ اگر کرایہ دار کو دوسرا مکان نہیں مل رہا ہے یا بہت گراں مل رہا ہے اور فوراً خالی

دینے کی صورت میں اس کے لئے اور اس کے ہاں بچوں کے لئے کئی دھرا لٹکانہ نہیں ہے تو اسلامی اخوت کا تقاضا کہ مالک مکان اسے دھرا انتظام کرنے تک مہلت دے۔ اللہ تعالیٰ تقاضے میں مہلت دینے والے کو پسند کرتا ہے۔

”جو کسی مسلم کی تکلیف دور کرے تو روزِ ثامت اللہ تعالیٰ اس کی تکلیف دور کرے گا۔“  
(ترمذی و ابوداؤد)

## قسطوں کا کاروبار

اس سے مراد ہے ادھار فروخت یعنی ایسی بیع جس میں قیمت بعد میں ادا کی جائے۔ یہ ادائیگی یکمشت بھی ہو سکتی ہے اور قسطوں میں بھی۔

### شرائط (Conditions):

- 1- اس کے لوازمات یہ ہیں:
- 1- شے کی قیمت پہلے سے متعین ہو۔
- 2- قیمت کی ادائیگی کی تاریخ یا مدت متعین ہو۔
- 3- یہ بات بھی طے شدہ ہو کہ قیمت یکمشت ادا کی جائے گی یا قسطوں میں۔

### شرعی احکام:

- 1- بیع موبل کے درست ہونے کے لئے ان باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:
- 1- فروخت کی جانے والی شے فروخت کنندہ (Seller) کی ملکیت ہو اور اس کے قبضہ میں ہو قبضہ خواہ حقیقی یا مادائی (Physical) ہو یا حکمی (Constructive) یعنی اصلاحی ہو۔
- 2- فروخت کنندہ کو اختیار ہے کہ وہ خریدار کی کوئی چیز بطور رہن رکھ لے۔
- 3- فروخت کنندہ شے یا جائیداد پر منافع کمانے کا حق دار اسی صورت میں ہو گا کہ وہ شے اس کے ضمان (Risk) میں ہو نہ کہ کسی اور کے ضمان میں۔
- 4- بیع موبل کی تعریف کی رو سے ضروری ہے کہ فروخت کی جانے والی شے کا قبضہ فوری طور پر خریدار کو دے دیا جائے بصورت دیگر بیع درست نہ ہو گی یعنی قیمت اور شے دونوں مستقبل میں دینا طے پائے تو ایسی بیع موبل صحیح نہ ہو گی۔
- 5- اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنی رپورٹ میں بیع موبل کے فقہی اصول کی روشنی میں بالکل کو سرمایہ کاری کی تجویز پیش کی اور کہا کہ بیع موبل کا طریقہ صنعتی اور زرعی شعبہ کے علاوہ ادھار دہنی اور بیرونی تجارت میں سرمائے کی فوری ضروریات کی فراہمی کے لئے مفید ثابت ہو سکتا

ہے۔ مثلاً اگر بازار میں کھانسی پوری کی قیمت خرید 150 روپے ہو اور ایک سرائے کے حصول کے خواہشمند کسانوں کو ایک مہینے عرصہ کے بعد ادائیگی کی شرط پر 140 روپے فی پوری ملے گا۔

داعی و خارجی تجارت کے سلسلے میں یہ طریق کار جو بچ کیا گیا۔ یعنی ایک تجارتی فرم کسی ملکی رو کا عدد یا صنعت کار سے کوئی چیز خریدنا چاہتی ہے یا دوسری ملک سے درآمد کرنا چاہتی ہے اور اس تجارتی فرم کو اس مقصد کے لئے ایک سے سرائے درکار ہے۔ اس سلسلے میں اسلامی نظریاتی کونسل نے درج ذیل مسئلے کا اظہار کیا:

”ایک متعلقہ فرم کے ساتھ معاہدہ کے تحت وہ چیز اپنے حساب میں خریدے یا درآمد کرے اور متعلقہ فرم کو پہلے سے طے شدہ قیمت جس میں بینک کا معقول منافع شامل ہو، فروخت کرے اور حقیقتہً فرم معاہدہ کے مطابق مقررہ وقت پر شے کی قیمت ادا کر دے۔“

یہ طریقہ اگرچہ شریعت کے مطابق ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ فروخت کی جانے والی ”شے“ خریدار کے حوالے کئے جانے سے پہلے بینک کے قبضہ میں آئے۔ تاہم فروخت کنندہ (Seller) کا شے کو بینک کی خاطر الگ کر کے رکھ دینا بھی کافی ہے اور بیچنے والا بینک کی طرف سے متعلقہ خریدار کو وہ شے دے ڈالے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی رائے میں یہ طریقہ سادہ بھی ہے اور اس طریقہ میں بینکوں کے لئے نقصانات سے بچ کر منافع حاصل کرنے کا موقع بھی زیادہ ہوتا ہے۔ سوائے اس صورت کے جس میں خریدار دیکھ بھال نہ کرے یا رقم ادا نہ کرے۔

اگرچہ حق مؤمل کا طریقہ شرعی لحاظ سے سرمایہ کاری کے طریقہ کے طور پر اختیار کیا جا سکتا ہے لیکن بلا امتیاز اور ہر جگہ پر اختیار کر لینا غلط ہے۔ مثلاً جس کے نتیجے میں سود کے لئے چھ روپہ ملائے گئے کا امکان ہے، لہذا ایسی اصطلاحی تدابیر اختیار کی جانی چاہئیں کہ یہ طریقہ تاگزیر ضرورتوں میں ہی استعمال کیا جائے۔ مثلاً لازمی اشیاء کی قیمت خرید پر مارگ اپ کا تعین کرنے کے سلسلے میں بھی بینکوں کو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے تاکہ سود کسی دوسری صورت میں اس معاملہ میں داخل نہ ہو جائے۔

اس سلسلے میں اسلامی نظریاتی کونسل نے تجویز کیا ہے کہ طریت بینک کو ان ذیلی شعبوں اور اشیاء کا تعین کرنا چاہئے جن کی خرید و فروخت حق مؤمل کے طریقہ سے کی جاسکتی ہے۔ مثلاً ایسے بینک کو دیا تو ان اشیاء اور ذیلی شعبوں (Sub-Sectors) کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے اور مختلف اشیاء اور شعبوں میں منافع کی یکساں یا مختلف شرحوں کا تعین کرتے رہنا چاہئے اور ایسے تمام اقدامات کرنے چاہئیں جن کے نتیجے میں وہ منافع کو رد کر جائے۔

اس ضمن میں معروف ماہر محمد اکرم خان کی رائے یہ ہے۔



”بچہ مرا بچہ جسے اسلامی نظریاتی کونسل نے قبول نہیں کیا“ بھی اس سے ملتی جلتی بچہ ہی ہے۔ بچہ مرا بچہ میں خریدار اور فروخت کنندہ کے درمیان لاگت پر ایک متعین شرح منافع طے پا جاتی ہے مذکورہ بالا مثال میں گویا یہ طے پا جاتا ہے کہ بچہ اپنی لاگت یعنی 150 روپے فی تھیلا پر 10 روپے فی تھیلا نفع لے گا۔

دونوں حالتوں میں رہا کا شائبہ ہے۔ فقہاء نے جن عملی دشواریوں کے پیش نظر اس قسم کے سودے صرف اجازت کے طور پر رد کر رکھے ہیں انہیں پورے مالیاتی نظام کی بناء قرار دینے سے بگاڑ و فساد پیدا ہو سکتا ہے کہ سود متعین دروازے سے دوبارہ گھس آئے۔ بچہ موبل ہو یا بچہ مرا بچہ دونوں عملی صورتوں میں بچہ کو اس بات سے آخر کیا چیز روک سکتی ہے کہ وہ اپنا منافع رائج الوقت سودی کے برابر طے کرے۔ نام کے فرق سے رہا منافع نہیں ہو جائے گا۔ تیسرے یہ کہ اس میں ایک بچہ کے اندر دو بچہ پائی جاتی ہیں یعنی ایک قیمت رائج الوقت اور دوسری ادھار قیمت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صراحت سے ایسے سودوں سے منع فرمایا ہے۔“

بچہ موبل کے بارے میں مفتی سیاح الدین کا کاخیل کا نقطہ نظر یہ ہے:

”جس طرح یہ جائز ہے کہ بائع (Seller) اور مشتری (Buyer) کے درمیان عقد بچہ (Contract of Sale) ہو جائے ثمن (Price) کی ادائیگی فی الحال (On the Spot) ہو اس طرح یہ بھی جائز ہے کہ عقد بچہ میں دونوں اپنی رضامندی سے یہ طے کر دیں کہ مشتری ثمن کی ادائیگی کچھ عرصہ بعد کرے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ادائیگی کی میعاد معلوم (Known) و معین (Predetermined) ہو۔ اس کو بچہ موبل کہتے ہیں یعنی ایسی بچہ جس میں ادائے ثمن (Payment of Price) کے لئے اجل (Time Period) یعنی میعاد مقرر کی گئی ہو۔“

وَضَحِ الْبَيْعُ بَشَمَنِ حَالٍ وَ ثَمَنِ مَوْجَلٍ اِلَى اَجَلٍ مَعْلُومٍ (درختار)

اور اس کے جواز کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عدم جواز کی کوئی دلیل شارح (اللہ تعالیٰ) سے منقول نہیں ہے۔ اس لئے اشیاء میں اباحت اصولیہ (اجازت) کے اصول کے مطابق یہ بھی جائز ہے لیکن اس کے ساتھ جواز کے لئے ایک نقلی (حدیث سے) دلیل بھی موجود ہے:

عن عائشہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اشتوی طعاما من یہودی الى اجل و رهنه ذرعه من حلیہ (بخاری شریف جلد اول مسلم شریف جلد دوم)

”حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک یہودی سے کچھ غلہ (30 صاع جو) میعاد پر خریدا اور (اس کے ثمن کے بدلے) لوہے کی زرہ اس کے ہاں رہن رکھ دی تھی۔“

”تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے عمل مبارک سے اس کا جواز ثابت

ہوا مگر فقہاء کرام نے اس بیع مؤجل کی حقیقت بتاتے وقت یہ نہیں لکھا کہ بیع مؤجل میں بائع اور مشتری آپس میں جوٹن (Price) طے کرتے ہیں اور اس شے کی اس وقت کی عام بازاری قیمت سے زائد ہوتا ہے تاکہ بیع مؤجل کے مفہوم میں یہ صورت بھی داخل ہو جائے اور بیع مؤجل کے جواز کے حکم کے ساتھ یہ بھی ثابت ہو جائے کہ یہ صورت بھی جائز ہے۔ اب رہی یہ بات کہ اگر ٹرن کی زیادتی بائع نے اس لئے طے کی ہے کہ وہ اس کی وصولی کچھ عرصے کے بعد کرے گا اور وہ اپنے ذہن میں ادائے ٹرن میں تاخیر کی وجہ سے اضافہ کر رہا ہے اور مشتری اس اضافہ ٹرن کو اس لئے قبول کر رہا ہے کہ فی الحال اس کے پاس مال نہیں ہے کہ وہ بازار میں رائج الوقت قیمت پر نقد ٹرن دے کر خرید سکے تو یہ ایک ایسی صورت ہے جس پر علحدہ بحث کی جاسکتی ہے کہ بیع بالاجل کی صورت میں رائج الوقت بازاری قیمت سے زیادہ ٹرن لینا یا دینا شرعی احکام کے مطابق یا نہیں ہے لیکن اتنی بات بہر حال واضح ہے کہ بیع مؤجل کے مفہوم میں یہ لازماً شامل نہیں ہے اور جب کہا جائے کہ شریعت اسلامی میں بیع مؤجل بھی جائز ہے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جہاں تاخیر کے ساتھ میعاد کی مناسبت سے ٹرن زائد طے ہوا ہو تو وہ بھی لازماً اس حکم جواز میں داخل ہے۔“

منفی سیاح الدین کا کاغذ لکھتے ہیں:

”اگر کچھ مخصوص حالات میں ادھار پر کسی شے کی فروخت بازاری قیمت سے زائد پر کی جاسکتی ہے تو اس اجازت کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ تاجر طبقہ مستقل طور سے اس کو کاروبار تجارت کا ایک عام طریقہ بنائیں اور سود کے متبادل کے طور پر اس کو بازاروں، منڈیوں اور تجارتی اداروں میں اختیار کیا جائے اور سود کا ایک حیلہ بنایا جائے بلکہ فقہاء کرام کا مطلب صرف یہ تھا کہ اگر کسی خاص موقع پر کسی معقول وجہ سے ادھار کا ٹرن بازاری موجودہ قیمت سے بڑھ کر لیا جائے تو اس کی گنجائش اس وجہ سے ہے کہ وہاں اس اضافے کے لئے ایک معقول بنیاد موجود ہے۔“

تھانڈی سود میں بھی وہ سارے مفاسد و معضرات ہیں جو صرفی سود میں ہیں اور اب اس حقیقت کو سب نے تسلیم کیا ہے کہ سود خواہ ذاتی مصارف کے لئے لی ہوئی رقم پر ہو یا تجارتی کاروبار کی غرض سے لئے ہوئے قرض پر ہو ہر صورت حرام اور موجب فساد معاشرہ ہے پس جو خرابیاں اور برے نتائج سودی کاروبار کے ہیں وہ سب کے سب ادھار جہنگ فروخت کرنے کے کاروبار میں بھی ہیں۔ تو یہ اگرچہ ریو حقیقی نہیں لیکن ریو ایسی ضرور ہے اگر ادھار جہنگ خریدنے والا اس چیز کو تاجر سے ذاتی استعمال کے لئے لے رہا ہو تب بھی بائع ظلم کر رہا ہے کہ محض میعاد کی وجہ سے ٹرن میں اضافہ کر کے ایک مجبور شخص کا استحصال کر رہا ہے اور یہ ظلم ہے اور اگر خریدار عام بازاری قیمت سے جہنگ خرید کر آگے فروخت کرتا ہے اور تجارت کر رہا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ

اس شخص کو اصل قرار دے کر اس پر منافع لگائے گا تو صارفین کو وہ چیز مہنگی ملے گی۔ پہلا خریدار سینکڑوں صارفین سے زائد قیمت لے لے کر اس پہلے بائع کو پہنچا دیتا ہے۔ ایک شخص کو تو مالی فائدہ حاصل ہوتا ہے اور سینکڑوں ہزاروں کو نقصان پہنچ رہا ہے..... جب کہ شریعت ایسے معاملہ کو جس میں خاص شخص کا فائدہ ہو جب کہ اس کا نقصان عام ہو برداشت نہیں کرتی۔

مولانا محمد طاسین رقمراز ہیں:

”..... صاف نظر آتا ہے کہ یہ معاملہ اپنی حقیقت و ماہیت اپنے فشاء و مقصد اور اپنے لازمی اثرات و نتائج کے لحاظ سے ربوہ النسیہ جیسا معاملہ ہے۔ وہ اس طرح کہ اس میں ایک شخص جس کی قیمت نقد سے بازار میں عام طور پر مثلاً ایک سو روپے ہوتی ہے جبکہ ایک سال کے ادھار پر وہ ایک سو پچاس روپے میں بیچی جاتی ہے تو اس میں پچاس روپے کا جو اضافہ ہوتا ہے وہ دراصل ایک سال کی مدت و مہلت کا معاوضہ ہوتا ہے نیز جس طرح ربوہ النسیہ میں مقروض سے قرض کے اصل مال پر زائد لیا جانے والا مال بلا عوض ہوتا ہے اور مقروض کی حق تلفی قرار پاتا ہے اسی طرح زیر بحث معاملے میں بیچی جانے والی شے کی اصل قیمت پر ادھار کی وجہ سے جو اضافہ ہوتا ہے بیچنے والے کی طرف سے خریدار کے لئے اس کا کوئی معاوضہ موجود نہیں ہوتا لہذا بیچنے والا جو زائد لیتا ہے خریدار کا حق لیتا ہے اور اس کی حق تلفی کرتا ہے نیز جس طرح ربوہ النسیہ میں قرض دہندہ کا مقصد بغیر کسی دماغی و جسمانی محنت و مشقت کے اور بغیر نقصان برداشت کرنے کی کسی ضمانت کے اپنے سرمائے اور شمول کو بڑھانا ہوتا ہے۔ اسی طرح زیر بحث بیع موبل کے معاشرے میں فروخت کنندہ کا مقصد بغیر کسی پیدا آور محنت اور عملی جدوجہد کے اور بغیر نقصان برداشت کرنے کی کسی ذمہ داری کے نفع کمانا اور اپنے سرمائے کو بڑھانا ہوتا ہے پھر جس طرح ربوہ النسیہ کے رواج سے معاشرے میں معاشی عدم توازن اور غیر فطری نشیب و فراز رونما ہوتا ہے اور ملکی دولت چند اغنیاء اور سرمایہ داروں کے درمیان سمٹ کر رہ جاتی ہے اسی طرح زیر بحث معاملہ کے بھی عام رواج سے معاشرے میں ویسی ہی معاشی حالت پیدا ہوتی ہے۔ غرضیکہ وہ تمام اخلاقی، معاشرتی اور معاشی برائیاں جو ربوہ النسیہ کے عملی رواج سے ظہور میں آتی اور معاشرے کے توازن کو بگاڑتی ہیں اور جن کی وجہ سے اسلام نے ربوہ النسیہ کو قطعی طور پر حرام اور ممنوع ٹھہرایا ہے وہ سب زیر بحث بیع موبل کے معاملے سے بھی لازماً ظہور میں آتی ہیں لہذا اصول قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ اس معاملے کا بھی وہی حکم ہونا چاہئے جو معاملہ ربوہ النسیہ کا ہے یعنی حرام کیونکہ بنیادی طور پر ان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔“

## حصص کی خرید و فروخت / بیع سلم

بیع سلم کو بیع سلف بھی کہتے ہیں جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ایک معاہدہ کے تحت بائع مشتری سے ایک غیر حاضر بیع کی قیمت پیشگی وصول کر لیتا ہے اور بیع ایک مقررہ مدت کے بعد مشتری کے سپرد کر دیتا ہے۔ البتہ وہ مشتری کو جس بیع کا وعدہ کرتا ہے اس کا نصف اس طرح بیان کر دیتا ہے کہ کسی قسم کا ابہام نہیں رہتا۔

بیع سلم از روئے قرآن حدیث تعالٰی صحابہ رضی اللہ عنہم اور اجماع فقہاء امت کے جائز ہے۔ فقہاء نے قرآن مجید کی اس آیت کو سلم کی سند جو از قرار دیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَعْتُمْ بَدِينِ الْإِجْلِ مَسْمُومٍ فَكْتَبُوهُ (بقرہ 2: 282)

”اے ایمان والو! جب تم آپس میں ادھار کا معاملہ ایک مدت مقررہ تک کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک حدیث مبارکہ میں ہر ایسی شے کی بیع سے منع فرمایا جو بائع کے پاس موجود نہ ہو مگر سلم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت مرحمت فرمائی۔ آپ ﷺ نے ایک دوسری روایت میں فرمایا:

”من اسلف فليسلف في كيل معلوم و وزن معلوم و الى اجل معلوم۔“  
”جو شخص پھلوں میں بیع سلف کرے اسے چاہئے کہ وزن معلوم پیمانہ معلوم اور مدت معلوم تک سلف کرے۔“

عن عبد الله ابن ابي او لى قال: انا كنا لنسلف على عهد رسول الله ﷺ و ابي بكر و عمر (رضی اللہ عنہما) في الحنطة و الشعير و التمر و الزبيب  
”عبد اللہ بن ابی اویلی فرماتے ہیں: ہم لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں گیسوں جو چھوہارے اور منقہ میں بیع سلف کیا کرتے تھے۔“

### شرطیں (Conditions):

سلم کی صفیہ کے لئے جو شرائط ضروری ہیں انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:  
اول شرط عقد: نفس عقد میں جو شرط ہے وہ صرف ایک ہی کہ عقد سلم میں دونوں عالموں میں سے کسی کے واسطے شرط خیار نہ ہو یعنی اگر کسی نے اپنے واسطے شرط کیا تو سلم باطل ہوگئی اور اگر راس المال پر قبضہ ہونے کے بعد دونوں جدا ہو گئے پھر کسی نے ثابت کیا کہ یہ مال میری ملکیت ہے پھر مستحق نے اجازت دی تو سلم صحیح رہے گی اور اگر عاقدین میں سے کسی واسطے خیار شرط ہو

مگر جذائی بدنی سے پہلے اس نے اپنا خیار ساقط کر دیا۔

حالانکہ اس المال مسلم الیہ کے ہاتھ میں قائم ہے تو عقدہ سلم جائز ہو جائے گا اور اگر اس المال تلف ہو گیا یا تلف کر دیا گیا ہو تو بالاتفاق عقدہ مذکور بدل کر جائز نہ ہوگا۔

دوم شرائط عوض: وہ شرائط جو عوض سے متعلق ہیں وہ تعداد میں 16 ہیں جن میں سے 6 کا تعلق اس المال سے ہے اور 10 کا تعلق مسلم فیہ (جس مال یا سودا یا شے میں سلم ٹھہرتا ہو) سے ہے۔ شرائط عوض کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

### شرائط راس المال:

راس المال میں چھ شرطیں ہیں:

(i) راس المال کی جس معلوم ہو یعنی کرنسی ہوگی یا مال؟ کیلی ہوگی یا وزنی اور کیلی میں اتنا ج ہوگا یا پھل؟ وغیرہ۔

(ii) بیان قسم مثلاً روپے یا ریال یا ڈالر۔ یہ شرط اس وقت ہے جب ایک شہر میں مختلف سکے رائج ہوں۔

(iii) بیان صفت کھرایا کھونا یا اوسط درجہ کا۔ یہ شرط ان دنوں تھی جب سکے سونے یا چاندی کے تھے جو کھوئے ہونے کے باوجود قابل قدر تھے ان کا کھونا ہونا یہ ہوتا تھا کہ ان کے نشانات مٹے ہوتے تھے ورنہ وہ سونا یا پلاٹینیوم تو ہوتے ہی تھے۔

(iv) بیان مقدار راس المال یہ اس وقت ہے جب راس المال مقداری ہو یعنی کیلی یا وزنی ہو اور اگر مقداری نہ ہو تو صرف اشارہ ہی کافی ہے۔ اس کی مقدار جاننا بالاتفاق فقہاء شرط نہیں۔

اگر دو مختلف چیزوں میں سلم ٹھہرائی اور راس المال کیلی یا وزنی ہے تو سلم جائز نہ ہوگی یہاں تک کہ ہر ایک کا الگ الگ حصہ بیان کیا جائے۔ یہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کی رائے ہے اور اگر کیلی یا وزنی نہ ہو تو پھر تفصیل کی ضرورت نہیں۔ البتہ صاحبین (ابو یوسف اور امام محمدؒ) کے نزدیک سب صورتوں میں سلم جائز ہے۔

(v) درہم و دینار (یعنی کرنسی) خوب جانچے ہوئے ہوں اور مقدار معلوم ہو۔

(vi) راس المال پر مجلس سلم (یعنی جس مجلس میں سلم کا سودا ہوا ہے) میں ہی قبضہ کر لینا بہت اہم ہے۔

### مسلم فیہ کی شرائط:

(i) مسلم فیہ کی جس متعین ہو مثلاً گندم روٹی، کھجور یا زیتون۔

(ii) اس کی نوع کا بیان ہو مثلاً پہاڑی پیاز یا میدانی پیاز، سوائی شہد یا بہاولپوری شہد وغیرہ۔

(ii) اس کی صفت کا بیان ہو مثلاً عمدہ گیہوں یا اونی گیہوں، اعلیٰ کھجور یا اوسط درجہ کی۔  
(النباتہ)

(iv) اس کی مقدار بذریعہ پیمانہ یا وزن یا گنتی معلوم ہو۔ (بدائع)

(v) اس کی میعاد معلوم ہو حتیٰ کہ اگر فی الحال سپرد کرنے پر سلم شہرائی تو جائز نہیں۔ پھر کم از کم میعاد ایک ماہ ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ (الحیط)

(vi) جس شے میں سلم شہرائی گئی ہے وہ وقت عقد سلم سے میعاد سپردگی تک برابر موجود رہی ہو یعنی بازار میں اس کا آنا منقطع نہ ہو (الفتح) اور منقطع کا مفہوم یہ ہے کہ بازار میں آنا بند ہو جائے بے شک لوگوں کے گھروں میں موجود ہو۔ (السرائج)

(vii) سلم فیہ ایسی شے ہو جو معین کرنے سے متعین ہوتی ہو اور جو چیز خود بخود متعین ہو مثلاً (کرسی) نقدی اس میں سلم جائز نہیں۔ (النباتہ)

(viii) سلم فیہ چار جنس میں سے ہو سبلی ہو یا وزنی ہو یا گنتی کے قابل ہو یا ناپنے کی چیز ہو۔ (الحیط) لہذا حیوان یا اس کے جسم کے اعضاء کی سلم جائز نہیں۔ (السرائج)

(ix) جس سلم فیہ کی منتقلی پر اخراجات آتے ہوں اس کا منتقلی کا مقام معلوم ہونا ضروری ہے۔ (الکافی)

(x) سلم کے دونوں بدل میں سے کسی میں قدر و جنس کی کوئی علت نہ ہو اور یہ نقد کے سوا تمام صورتوں میں جاری ہے کیونکہ درہم، ریتار کو وزنی چیزوں کی سلم میں دینا بوجہ لوگوں کی ضرورت کے جائز ہے۔ (الذخیرہ)

جب بیع سلم درست ہو گئی پھر مسلم فیہ کو مسلم الیہ (بائع) نے اپنے وقت پر حاضر کیا تو رب السلم (یعنی مشتری) کو انکار کا کوئی حق نہیں لیکن اگر شرط کے خلاف ہوا تو مسلم الیہ پر جبر کیا جائے گا کہ وہ ویسی ہی چیز حاضر کرے جیسی چیز پر عقد ہوا ہے۔

### عہد حاضر میں بیع سلم سے متعلق اشکالات کے جوابات:

(a) دوسرے البرکہ سمینار میں سوال پیش کیا گیا کہ ”کیا بیع سلم کا ایسا عقد (معاہدہ) جائز ہے کہ جس میں قیمت کا تعین کسی خاص بازار کی ادائیگی کے دن والی قیمت (یا اس بازار کی قیمت میں 10 فیصد کمی) کے مطابق کیا گیا ہو؟“ سمینار کے فتاویٰ نمبر 1 میں درج ذیل جوابات دیئے گئے:

(i) بیع سلم میں دراصل قیمت کا تعین دونوں اطراف (پارٹیوں) کے مابین عقد (معاہدہ) کے وقت کرنا ضروری ہے۔

(ii) اگر پارٹیوں میں قیمت کا تعین معاہدہ کے دن والی کسی خاص قیمت کے مطابق

طے پا جائے تو یہ بھی جائز ہے۔

(iii) اگر فریقین میں قیمت کا تعین کسی خاص بازار کی قیمت سے کمی یا بیشی پر طے ہو جائے تو یہ دونوں حالتیں بھی جائز ہیں۔

(iv) مگر کسی بازار کی مستقبل کی قیمت کے مطابق قیمت کا تعین جائز نہیں ہے۔

(b) ایک اشکال یہ پیش کیا گیا کہ کیا کسی ایسی چیز کی فروخت جائز ہے جس کی قیمت ادا کر دی گئی ہو اور وہ خریدار کے قبضہ میں نہ آئی ہو۔ اگر یہ جائز نہ ہو تو کیا قیمت ادا کرنے والے کے لئے ایسی چیز کی بیع مسلم اس بنیاد پر جائز ہے کہ وہ چیز مستقبل میں اسے حاصل ہو جائے گی اور وہ معاہدہ کے وقت ادا کی جانے والی اور حاصل (رقم) میں باہمی تعلق بھی ظاہر نہ کرے اور کیا قیمت ادا کرنے کے لئے اس چیز کی بنیاد پر تجارت کرنا جائز ہے؟

(i) ایسی چیز جس کی قیمت ادا کر دی گئی ہو لیکن قبضہ میں نہ آئی ہو فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

(ii) مگر قیمت ادا کرنے والے کے لئے ایسی چیز کی بیع مسلم کرنا جائز ہے اور معاہدہ کے وقت پہلے معاہدہ کے تحت ادا کی جانے والی اور نئے معاہدہ کے تحت حاصل ہونے والی رقم کے درمیان باہمی تعلق پیدا کرنا ضروری نہیں۔

(iii) مندرجہ بالا (جواز) کو تجارت کے طور پر اختیار کر لینا جائز نہیں ہوگا کیونکہ بیع مسلم کو صرف پیدا کرنے والوں (Producers) کی ضرورت کے لئے استثنائی طور پر جائز کیا گیا ہے یہ جواز انفرادی سطح کے لئے جائز ہے۔ باقاعدہ تجارت کے لئے جائز نہیں ہے لیکن اگر بعض اسلامی ممالک کے اقتصادی حالات کسی ظلم کی روک تھام کے لئے اس کے متقاضی ہوں اور کسی بڑی مصلحت کے پیش نظر ایسا کرنا ضروری ہو تو اسے تجارت کے طور پر جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ البتہ ایسی بڑی مصلحت کا تعین شریعت بورڈ کرے گا۔

(iv) ایک سوال یہ کیا گیا کہ مثال کے طور پر ایک ایسا شخص کسی دوسرے شخص سے ایک سوٹن بیج ماہ جنوری 2013ء میں نقد ادائیگی سے اس بنا پر خریدے کہ وہ بیج اسے جولائی 2013ء میں مل جائیں گے۔ اب مارچ 2013ء میں ایک تیسرا شخص آیا اور کہنے لگا کہ اس خریداری کے نصف حصے میں مجھے بھی شریک کر لو۔ کیا اس شخص کے لئے اس دوسرے شخص کو دوسرے حصے گئے معاہدے کے برابر اس سے کم یا زیادہ قیمت پر شریک کرنا جائز ہے؟

(v) موجودہ زمانے میں بھی اسے استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔ کوئی صنعت کار کسی

مالیاتی کمپنی یا بینک سے معاہدہ کر کے مطلوبہ رقم لے سکتا ہے جس سے قرض کیا ہے اسے سامان سپلائی کرنا ہو گا جسے بیچ کر منافع لیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر محمود غازی کے مطابق: ”اگر شریعت کے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے کسی ادارہ یا اداروں کی تنظیم نو کرنی پڑے تو تردد نہیں ہونا چاہئے۔ اگر بینک روزمرہ فراہم کنندہ کے ساتھ ٹریڈنگ کمپنی کے طور پر کام کریں تو بہت جلد ایک ایسا انتظامی اور مانیٹرنگ ڈھانچہ بنالیں گے جس کی مدد سے تجارت کو اسلامی خطوط پر فروغ دینے میں بڑا کردار ادا کر سکیں گے۔“

البتہ ہنگامی انتظامات کے حوالے سے موصوف کی تجویز اس طرح ہے:

”سارے بینک مل کر بینکرز ایکویٹی (Banker's Equity) یا بینکنگ کونسل کی طرز پر ایک مشترکہ فورم (پلیٹ فارم) یا بیورو قائم کر کے ضروری مہارتیں (Skills) مہیا کر کے کام کر سکتے ہیں اور یہ کونسل یا بیورو یا بورڈ اپنے رکن بینکوں کے لئے خدمات سر انجام دیں گے۔“

جدید دور کے مقاصد اور ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے ہر بینک کو گائیڈنگ اور کونسلنگ ونڈو (GCW) قائم کرنی چاہئے اور مفید مشورے لینے کی خاطر ماہرین معاشیات و مالیات کا تقرر کیا جائے تاکہ ان کی ماہرانہ آراء سے استفادہ کیا جاسکے۔

## حقوق مجروحہ کی خرید و فروخت / استصناع

یہ بھی بڑا مفید اور اہم موضوع ہے جو علم معاشیات میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔ قابل قدر مولانا مفتی جسٹس (Justice) محمد تقی عثمانی نے اپنی کتاب ”اسلامی بینکاری کی بنیادیں“ میں اس پر روشنی ڈالی ہے اور حسب ذیل اقتباسات (Extracts) اسی سے اخذ کردہ ہیں:

”استصناع بیع کی دوسری قسم ہے جس میں سوا چیز کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ہو جاتا ہے استصناع کا معنی ہے کسی تیار کنندہ (مینوفیکچرر) کو یہ آرڈر دینا کہ وہ خریدار کے لئے متعین چیز بنا دے۔ اگر تیار کنندہ (Manufacturer) اپنے پاس سے خام مال لگا کر خریدار کے لئے چیز تیار کرنے کی ذمہ داری قبول کر لیتا ہے تو استصناع کا عقد وجود میں آ جائے گا لیکن استصناع کے بیع ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ قیمت فریقین کی رضامندی سے طے کر لی جائے اور مطلوبہ چیز (جس کی تیاری مقصود ہے) کے ضروری اوصاف بھی متعین کر لئے جائیں۔“

استصناع کے معاہدے کی وجہ سے تیار کنندہ پر یہ اخلاقی ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے کہ وہ اس چیز کو تیار کرے لیکن تیار کنندہ کے اپنا کام شروع کرنے سے پہلے فریقین میں سے کوئی بھی



دوسرے کو نوٹس دے کر معاہدہ منسوخ کر سکتا ہے البتہ تیار کنندہ کے کام شروع کرنے کے بعد معاہدہ ایک طرفہ طور پر ختم نہیں کیا جاسکتا ہے۔

### استصناع اور سلم میں تفاوت:

استصناع کی یہ نوعیت مد نظر رکھتے ہوئے اصناع اور سلم میں کئی فرق ہیں جو یہاں مختصر ا بیان کئے جا رہے ہیں:

- 1- استصناع ہمیشہ ایسی چیز پر ہوتا ہے جسے تیار کرنے کی ضرورت ہو جبکہ سلم ہر چیز کی ہو سکتی ہے خواہ اسے تیار کرنے کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔
- 2- سلم میں یہ ضروری ہے کہ قیمت مکمل طور پر پیشگی ادا کی جائے جبکہ اصناع میں یہ ضروری نہیں ہے۔
- 3- سلم کا عقد جب یہ ایک مرتبہ ہو جائے تو اسے ایک طرفہ طور پر منسوخ نہیں کیا جاسکتا جبکہ عقد اصناع کو سامان کی تیاری شروع ہونے سے پہلے منسوخ کیا جاسکتا ہے۔
- 4- سپردگی کا وقت سلم میں بیع کا ضروری حصہ ہے جبکہ اصناع میں سپردگی کا وقت مقرر کرنا ضروری نہیں ہے۔

### استصناع اور اجارہ میں فرق:

”یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ استصناع میں تیار کنندہ خود اپنے خام مال سے چیز تیار کرنے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے لہذا یہ معاہدہ اس بات کو بھی شامل ہوتا ہے کہ اگر خام مواد تیار کنندہ کے پاس موجود نہیں ہے تو وہ اسے مہیا کرے اور اس بات کو بھی کہ مطلوبہ چیز کی تیاری کے لئے کام کرے۔ اگر خام مواد گاہک کی طرف سے مہیا کیا گیا ہے اور تیار کنندہ سے صرف اس کی محنت اور مہارت مطلوب ہے تو یہ معاہدہ اصناع نہیں ہوگا اس صورت میں یہ اجارے کا عقد ہوگا جس کے ذریعے کسی شخص کی خدمات ایک متعین معاوضے کے بدلے میں حاصل کی جاتی ہیں۔

جب مطلوبہ چیز کو بائع تیار کر لے تو اسے خریدار کے سامنے پیش کرے۔ فقہاء کے اس بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں کہ اس مرحلے پر خریدار یہ چیز مسترد کر سکتا ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ خریدار وہ چیز دیکھنے پر اپنا خیار ردیت استعمال کر سکتا ہے اس لئے کہ استصناع ایک بیع ہے اور جب کوئی شخص کوئی ایسی چیز خریدتا ہے جو اس نے دیکھی نہیں ہے تو دیکھنے کے بعد اسے سودا منسوخ کرنے کا اختیار ہوتا ہے استصناع پر بھی یہی اصول لاگو ہوگا۔ لیکن امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ ”اگر وہ (فراہم کردہ) فریقین کے اطمینان عقد کے وقت طے شدہ اوصاف کے مطابق ہے تو خریدار اسے قبول کرنے کا پابند ہوگا اور وہ خیار ردیت

استعمال نہیں کر سکے گا۔ خلافت عثمانیہ میں فقہاء نے اسی نقطہ نظر کو ترجیح دی تھی اور حنفی قانون اسی کے مطابق بدون کیا گیا تھا اس لئے کہ جدید صنعت و تجارت میں بڑی نقصان کی بات ہوگی کہ تیار کنندہ نے اپنے تمام وسائل مطلوبہ چیز کی تیاری پر لگا دیئے اس کے بعد خریدار کوئی وجہ بتائے بغیر سودا منسوخ کر دئے اگرچہ فراہم کردہ چیز مطلوبہ اوصاف کے مکمل طور پر مطابق ہو۔

### فراہمی کا وقت:

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے استصناع میں یہ ضروری نہیں ہے کہ سامان کی فراہمی کا وقت متعین کیا جائے تاہم خریدار سامان کی فراہمی کے لئے زیادہ سے زیادہ مدت مقرر کر سکتا ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر تیار کنندہ فراہمی میں متعین وقت سے تاخیر کر دے تو خریدار اسے قبول کرنے اور قیمت ادا کرنے کا پابند نہیں ہوگا۔

یہ بات یقینی بنانے کے لئے کہ سامان مطلوبہ مدت میں فراہم کر دیا جائے گا اس طرح کے بعض جدید معاہدے ایک تعزیری شق پر مشتمل ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں اگر تیار کنندہ فراہمی میں متعین وقت سے تاخیر کر دے تو اس پر جرمانہ عائد ہوگا جس کا حساب یومیہ بنیاد پر کیا جائے گا، کیا شرعاً بھی اس طرح کی کوئی تعزیری شق شامل کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اگرچہ فقہاء استصناع پر بحث کے دوران اس سوال پر خاموش نظر آتے ہیں لیکن انہوں نے اس طرح کی شرط کو اجارے میں جائز قرار دیا ہے۔ فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے کپڑوں کی سلائی کے لئے کسی خیاط کی خدمات حاصل کرتا ہے تو فراہمی کے حساب سے اجرت مختلف ہو سکتی ہے۔ مستاجر (جو کپڑے سلوانا چاہتا ہے) یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر خیاط ایک دن میں یہ کپڑے تیار کر دے تو وہ سو روپے اجرت دے گا اور اگر وہ دو دن میں تیار کرتا ہے تو وہ اسی (80) روپے دے گا۔

اسی طرح سے استصناع میں قیمت کو فراہمی کے وقت کے ساتھ منسلک کیا جاسکتا ہے۔ اگر فریقین اس بات پر متفق ہو جائیں کہ فراہمی میں تاخیر کی صورت میں فی یوم متعین مقدار میں قیمت کم ہو جائے گی تو یہ شرعاً جائز ہوگا۔

### استصناع بطور طریقہ تمویل:

استصناع کو مخصوص معاہدوں میں تمویل کی سہولت فراہم کرنے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے خاص طور پر ہاؤس بلڈنگ فنانس کے شعبے میں۔

اگر کلائنٹ کے پاس اپنی زمین ہے اور وہ گھر کی تعمیر کے لئے تمویل چاہتا ہے تو تمویل کار اس کھلی زمین پر استصناع کی بنیاد پر گھر تعمیر کر دینے کی ذمہ داری قبول کر سکتا ہے اور اگر کلائنٹ کے پاس اپنی زمین نہیں ہے اور وہ زمین بھی خریدنا چاہتا ہے تو بھی تمویل کار یہ ذمہ داری قبول کر سکتا ہے کہ وہ اسے زمین کے ایسے قطعے پر تعمیر شدہ گھر مہیا کرے گا جس کی

تفصیلات پہلے سے طے کر لی گئی ہوں۔

چونکہ استصناع میں یہ ضروری نہیں کہ قیمت پیشگی ادا کی جائے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ بیع پر قبضے کے وقت ادا کی جائے (بلکہ قیمت فریقین کے طے شدہ معاہدے کے مطابق کسی بھی وقت تک مؤجل ہو سکتی ہے۔) اس لئے فریقین جس طرح چاہیں قیمت کی ادائیگی کا وقت اس کے مطابق طے کیا جاسکتا ہے قیمتوں کی ادائیگی قسطوں میں بھی ہو سکتی ہے۔

یہ بھی ضروری نہیں کہ تمویل کار گھر کی خود تعمیر کرے بلکہ وہ کسی تیسرے فریق کے ساتھ متوازی استصناع کے معاہدے میں بھی داخل ہو سکتا ہے یا وہ کسی ٹھیکے دار کی خدمات بھی حاصل کر سکتا ہے (جو کلائنٹ کے علاوہ ہو) دونوں صورتوں میں وہ لاگت کا حساب لگا کر استصناع کی قیمت کا تعین اس انداز سے کر سکتا ہے کہ اس سے اسے لاگت پر معقول منافع حاصل ہو جائے اس صورت میں کلائنٹ کی طرف سے قسطوں کی ادائیگی عین اس وقت سے بھی شروع ہو سکتی ہے جب فریقین نے معاہدے پر دستخط کئے ہیں اور تعمیر کے دوران اور مکان کلائنٹ کے حوالے کئے جانے کے بعد بھی جاری رہ سکتی ہیں۔ قسطوں کی ادائیگی محفوظ بنانے کے لئے زمین یا مکان یا کسی اور جائیداد کا ملکیت نامہ آخری قسط کی ادائیگی تک تمویل کار کے پاس بطور توثیق کے رکھا جاسکتا ہے۔

تمویل کار کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ معاہدے میں طے شدہ بیانات کے بالکل مطابق مکان تعمیر کرنے کسی بھی فرق کی صورت میں ہر ایسا خرچہ جو اسے معاہدے کی شرائط کے مطابق بنانے کے لئے ضروری ہو تمویل کار کو برداشت کرنا پڑے گا۔

استصناع کے ذریعے کو منصوبوں کی تمویل (Project Financing) کے لئے بھی انہی خطوط پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی کلائنٹ اپنی فیکٹری میں ایئر کنڈیشن پلانٹ لگوانا چاہتا ہے اور پلانٹ تیار کرنے کی ضرورت ہے تو تمویل کار استصناع کے معاہدے کے ذریعے پہلے بیان کردہ طریق کار کے مطابق پلانٹ مہیا کرنے کی ذمہ داری قبول کر سکتا ہے اسی طرح استصناع کے معاہدے کو کسی پل یا شاہراہ کی تعمیر کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

جدید BOT معاہدات (خرید و چلاؤ اور منتقل کرد Buy, Operate & Transfer) کو بھی استصناع کی بنیادوں پر تشکیل دیا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی حکومت ایک ہائی وے تعمیر کرنا چاہتی ہے تو وہ سڑک بنانے والی کمپنی کے ساتھ استصناع کا عقد کر سکتی ہے اور قیمت کے طور پر اسے مخصوص مدت تک شاہراہ کو چلانے اور ٹول (Toll) حاصل کرنے کا اختیار دیا جاسکتا ہے۔“

## قمار کی جدید شکلیں

سرکاری رقوم کا غنیمت ساز و سامان کی خرید و فروز ہرگز زنی کی آمدنی بھی ناجائز ہوتی ہے۔ اسلام میں نہ صرف خبیث طریقوں کی کمائی سے روکا گیا ہے بلکہ طیب اور حلال رستوں سے روزی حاصل کرنے کو ثواب قرار دیا گیا ہے اور مستحسن اقدامات سے اللہ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور اس قسم کے رزق میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ زیادہ حرام کی نسبت کم حلال بہتر اور پسندیدہ ہے اور اسی سے رضائے الہی حاصل ہو سکتی ہے۔ حرام کی کمائی سے انسان کا حرص و لالچ بڑھ جاتا ہے۔ اور اس کے انجام کے اثرات بُرے پڑتے ہیں۔ عاقبت خراب ہوتی ہے۔ بہت سے فسادات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ موجودہ دور میں دنیا مصائب کے عمیق گرداب میں مبتلا ہے اور پریشانیوں میں مبتلا ہے اضافہ ہو گیا ہے۔

قمار بازی کی جدید شکلیں جن میں کرکٹ میچوں پر جوا، پرائز بانڈ نمبر، سٹ بازی، چور بازار، سنگٹک اور ذخیرہ اندوزی جیسی مہلک برائیاں معاشرے کو گھمن کی مانند کھا رہی ہیں اور یہ سب آمدنی کے ناجائز وسائل ہیں ان سے اجتناب ضروری ہے۔ ملک و ملت کی بھلائی اسی میں ہے کہ یہ ذرائع ممنوع قرار دیئے جائیں۔

قمار اور سٹ کے متعلق شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق کو پیدا کیا اور بساط ارض پر ان کی معاش کا انتظام فرمایا اور اس سے نفع حاصل کرنے کا موقع بہم پہنچایا تو انسانوں کے درمیان جنگ و جدال اور کشمکش برپا ہو گئی۔ تب خدا کے قانون کا یہ فیصلہ ہوا کہ جو شخص ذاتی محنت و راست یا دوسرے کسی جائز اور صحیح طریق سے کسی چیز کا مالک ہے اس کی چیز میں دوسرا کوئی شخص مزاحمت اور کشمکش کا حقدار نہیں ہے البتہ دوسرے کو بدل کے ذریعے خریداری اور معتبر و صحیح رضامندی کے ساتھ معاملت سے اس چیز کو حاصل کرنے کا حق ہے بشرطیکہ خرید و فروخت کرنے والوں کے درمیان اس معاملہ کا علم و یقین ہو اور فریب اور چال بازی کا اس میں ہرگز شائبہ نہ ہو اور جبکہ انسان مدنی الطبع ہے اور اس کی معیشت یا ہی تعاون کے بغیر ناممکن ہے تو حق تعالیٰ نے باہمی تعاون و معاونت کو بھی ضروری قرار دیا ہے یعنی اگر کوئی معاملہ اس طرح کیا جائے جس میں نہ صحیح بدل موجود ہو اور نہ باہمی تعاون پایا جاتا ہو بلکہ دوسرے کو نقصان دے کر نفع حاصل کرنا مقصود ہو جیسے ”قمار“ یا اس میں صحیح رضامندی موجود نہ ہو جیسے سود تو یہ تمام طریقے باطل اور ظلم ہیں اور ایسے معاملات ناجائز اور حرام ہیں۔“

اسلام کے معاشی نظام میں آمدنی حاصل کرنے کے متعدد ذرائع سے منع کیا گیا ہے۔ اس باب میں انہی پر روشنی ڈالی جائے گی۔ ان میں چند وسائل یہ ہیں:

### 1- اکتناز (Accumulation):

اکتناز کا مادہ کُز ہے۔ کُز کے لغوی معنی اس مال کے ہیں جو کسی طرف میں محفوظ کر کے رکھا گیا ہو یا زمین میں دفن کر دیا گیا ہو۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ ”بڑی دولت“ کے معنوں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

ان يقولوا لولا انزلنا عليه كُز.....

”(کافر) یہ کہنے لگیں کہ اس پر کوئی خزانہ کیوں نہیں نازل ہوا۔“

واما الجدار فكان للغلمين يخمين في المدينة و كان تحت كُز لهما.....

”اور وہ جو دیوار تھی سودو خیم لڑکوں کی تھی (جو) شہر میں (رہتے تھے) اور اس کے نیچے

ان کا خزانہ (دفن) تھا۔“

### اصطلاحی مطلب:

شرعی اصطلاح میں کُز سے مراد وہ مال ہے جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے اور جس مال کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے وہ کُز نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں جس مال کی زکوٰۃ ادا کر دی گئی ہو وہ کُز نہیں ہے اگرچہ سات زمینوں کے اندر دفن ہو اور جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے وہ کُز ہے خواہ ظاہر ہی کیوں نہ ہو اور اس مفہوم پر حضرت ابوذر غفاریؓ اور چند اہل زہد کے سوا باقی اکابر صحابہؓ اکابر تابعینؓ اور جمہور علماء امت کا اتفاق ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے دور میں اگرچہ بیت سے صحابہ کرامؓ غریب و نادار تھے لیکن حضرت عثمان غنیؓ - عبدالرحمن بن عوفؓ اور طلحہؓ جیسی مقدس ہستیاں بھی جن کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ آپ نے ان کو یہ حکم نہیں دیا کہ اپنا تمام مال صدقہ کر دو بلکہ احادیث سے ایسی بکثرت پیش ملتی ہیں کہ بعض صحابہؓ نے اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہا تو آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کیونکہ مستقبل کی ضروریات کے لئے بچت ناگزیر ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت کعب بن مالک کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

امسک عليك بعض مالک لعلو خير لک

”اپنا کچھ مال اپنے پاس بھی رہنے دے یہ حیرے حق میں بہتر ہوگا۔“

البتہ اگر ملک میں قحط سالی ہو لوگ بھوکے مر رہے ہوں بیت المال کی آمدن کفایت نہ کرتے اس صورت میں صرف زکوٰۃ کی دھولی پر ہی اکتفا نہیں کیا جائے گا اور امراء کے لئے دولت جمع کرنا بھی جائز نہ ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا فرمان یہ ہے:

”جب سورۃ توبہ کی یہ آیت نازل ہوئی جس میں مال و دولت کو جمع کرنے والوں کے لئے آخرت کے دردناک عذاب کی وعید ہے تو صحابہ فکر میں پڑ گئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا میں تمہاری اس فکر اور پریشانی کو دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ چنانچہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی! آپ ﷺ کے اصحاب پر اس آیت کا بڑا بوجھ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ تو اسی لئے فرض کی ہے کہ اس کی ادائیگی کے بعد جو مال باقی رہ جائے وہ پاک ہو جائے۔“

## 2- احکام (Hoarding):

سادہ لفظوں میں اشیائے ضرورت کو روک رکھنا کہ قیمتیں بلند ہونے پر انہیں فروخت کر کے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کیا جائے گا اس کو احکام کہا جاتا ہے۔

### لفظی معنی:

لفظ احکام عربی لغت میں ح۔ک۔ر سے مشتق ہے۔ ابن منظور (م 711ھ) نے احکام کے معنی ادخار الطعام للتربص تحریر کیا ہے یعنی غلے کا منبگا ہونے کے انتظار میں ذخیرہ کرنا۔ ابن سیدہ کے نزدیک احکام کا مفہوم یہ ہے الاحکام جمع الطعام مما یؤکل و احتساب انتظار وقت الغلاء بہ یعنی اشیاء خوردنی کا اس لئے ذخیرہ کرنا تاکہ ان کی قیمتیں بڑھ جائیں۔ علامہ زبیدی (م 1206ھ) نے احکام کے لفظی معنی یہ بیان کئے ہیں۔ احتبس انتظار الغلاء بہ اشیاء کو گراں بیچنے کے لئے روک رکھنا احکام کہلاتا ہے۔ ان تمام معانی کا خلاصہ یہ ہے کہ علماء لغت کے نزدیک احکام غلہ منبگے داموں فروخت کرنے کے لئے ذخیرہ کرنے کو کہتے ہیں۔

### اصطلاحی مطلب:

علماء اسلام نے احکام کی مختلف اصطلاحی تعریفیں کی ہیں۔

امام محمد الدین ابن الاثیر (م 606ھ) نے احکام کی اصطلاحی تعریف یہ بیان کی ہے: ”احتکر طعاما ای اشتراہ وجسه لبقل فیغلو“  
”اشیاء خوردنی کا ذخیرہ کرنا یعنی ان کو خرید کر اپنے پاس رکھ لینا تاکہ ان کی قیمت ہو ان کی قیمتیں بڑھ جائیں۔“

مذاہل علی قاری (م 1014ھ) نے مرقاة المفاتیح میں احکام کی یہ تعریف کی ہے:

احتکار هو حبس الطعام حين احتاج الناس به حتى یغلو

”لوگ جب اشیاء خوردنی کے محتاج ہوں اس وقت ان اشیاء کی فروخت روک دینا تاکہ

ان کی قیمتوں میں گرائی ہو جائے احکام کہلاتا ہے۔“

شیخ عبدالحق محدث دہلوی (1052ھ) نے احکام کے اصطلاحی مفہوم کو اس طرح بیان کیا ہے:

”شریعت میں کسی شخص کا اشیاء خوردنی کی فروخت کو اس نیت سے روک دینا تاکہ اسے زیادہ مہنگے داموں فروخت کرے، احکام کہلاتا ہے۔“

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

”اور ہم نے ان (انبیاء کرام) کی جانب وحی کی نیک کاموں کے کریں اور نماز قائم کرنے کی اور زکوٰۃ دینے کی اور وہ تمہارے عبادت گزار تھے۔“ (انبیاء: 73)

### 3- چوری / سرقت (Theft):

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ایک حدیث مروی ہے:

”حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ قریش ایک خاتون کے بارے میں بہت فکر مند تھے جس نے دور نبوی ﷺ میں فتح مکہ کے موقع پر چوری کی تھی کہنے لگے کون اس کی آنحضرت ﷺ سے سفارش کرے گا؟ بعض لوگوں نے کہا حضرت اسامہؓ حضور ﷺ کے محبوب ہیں وہی یہ جرا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اسامہؓ نے آنحضرت ﷺ سے سفارش کی تو آپ ﷺ کے چہرہ انور کا رنگ بدل گیا اور آپ ﷺ نے فرمایا تو خدا کی حدود میں سفارش کرتا ہے۔ اسامہؓ نے کہا یا رسول اللہ! میرے لئے خدا سے معافی مانگئے۔ جب شام ہوئی حضور ﷺ نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا۔ اللہ کی اس طرح حمد کی جس کا وہ حقدار ہے۔ پھر فرمایا تم سے پہلے لوگ اسی سبب سے ہلاک ہوئے کہ جب ان میں سے کوئی شریف آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے اور..... میں..... اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرے تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دوں۔ پھر آپ ﷺ نے اس عورت کا ہاتھ کاٹ دینے کا حکم دیا جس نے چوری کی تھی۔ چنانچہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔“

آپ ﷺ نے چوری کی سزا کے لئے مقدار کا تعین بھی فرمایا۔

### 4- عیش و تنعم سے پرہیز:

دین اسلام میں تنعم و عیش کی زندگی گزارنے سے منع کیا گیا ہے۔ اگرچہ انسان اپنی رقم اور وسائل آمدن کو اپنی ذاتی ملکیت کی بنا پر استراحت و راحت کی خاطر کئی اختیارات رکھتا ہے اور انہیں استعمال کرنے کا مجاز و مجتار ہے مگر اسے ایک خاص حد سے بالکل تجاوز نہیں کرنا چاہئے اس سے خرابیاں جنم لیتی ہیں اور فضول خرچی کی عادت عود کر آتی ہے جس طرح خواتین میں کثرت زیورات قیمتی ملبوسات اور آرائش و زینت نیز گراں قدر چیزوں کی خریداری وغیرہ علاوہ

اگرچہ پیش رفت اور مردوں میں اسراف و فحاشی اخراجات اور ضروریات انسانی سے الگ خارج از اعتدال تفریحی اخراجات کا ایسا ہمہ گیر شوق و ذوق پیدا ہو جائے کہ ساری قوم اس میں مبتلا نظر آنے لگے اور یہاں تک فحش پہنچ جائے کہ بازاروں میں عام حاجات کی اشیاء کے مقابلہ میں بناوٹی حسن اور زیبائش کی اشیاء کا لین دین بڑھ جائے۔ اہل صنعت و حرفت کی نظر ان ہی امور کی دیدہ ریزی اور لطافت آفرینی میں محو اور مصروف ہو جائے۔ تجارت کی تجارت کا فروغ صرف اسی پر رہ جائے۔ مردوں کی محنت کا ثمرہ دولت اسی پر خرچ ہونے لگے اور عام ضروریات کی تجارت خام اجناس کی زراعت اور رفاہ عام کے سلسلہ کی صنعت و حرفت کساد بازاری کے نذر ہونے لگے تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس قوم کا اقتصادی جہاز گرداب ہلاکت میں گھر چکا ہے اور آج نہیں تو کل اس کے لئے سخت کی جگہ تختہ اور زربفت و کنو اب کی جگہ ٹاٹ و پلاس بھی میسر نہیں آئے گا۔

ملک کی ایسی خستہ حالت کو روکنا اور اس کے انفرادی اختیارات کی اس آزادی پر اخلاقی اور آئینی پابندیاں عائد کرنا اور اس ملک کی اقتصادی زندگی کو تباہی و بربادی سے بچانا حکومت کے اہم فرائض میں سے ہے۔ اسی لئے اسلام نے اگرچہ ”ذرائع آمدنی“ اور ”آمدنی“ کی بہت سی شقوں میں انفرادی حق ملکیت کو حلیم کیا ہے لیکن ساتھ ہی اس کا یہ منشاء اور یہ خواہش ہے کہ اختیار کی یہ باگ اس قدر ڈھیلی نہ رہے دی جائے جس کی بدولت عام انسانی دنیا اقتصادی بد حالی میں گرفتار ہو جائے اور صرف چند سو یا چند ہزار انسانوں کی سرمایہ دارانہ عیش پسندی کی مرضیات میں ڈوب کر خدا کی عام مخلوق ہلاکت و تباہی کے گھاٹ اتر جائے۔ اسلام کے مایہ ناز فلسفی شاہ ولی اللہ نے اس مسئلہ کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ تمدن و معیشت کے فساد کی راہوں میں یہ بہت بڑی راہ قیاد ہے لکھتے ہیں:

”اسی طرح تمدن کی تباہی و ہلاکت کے امور میں سے یہ ہے کہ امت کے مالدار زیورات، لباس، مکانات، خورد و نوش اور عورتوں کے حسن و زیبائش وغیرہ کی باریک بینیوں اور دقیقہ بندیوں میں مبتلا ہو جائیں اور حاجات و ضروریات سے زیادہ عیش و تنعم کی زندگی میں مشغول و منہمک رہنے لگیں۔“

### 5- تکبر سے اجتناب (Avoidance of Pride):

چونکہ اسلام دین فقر و حقارت ہے اس لئے اس کی تعلیمات زندگی کے سب شعبوں پر حاوی ہیں اور اس کو بہتر ڈھب (Style) سے گزارنے کے لئے بہت سی اصولی ہدایات بھی دی گئی ہیں اس لئے کہ فرزند ان تو حید صراط مستقیم سے نہ بھٹکنے پائیں۔ غرور کرنا انسان کے اچھے اوصاف میں شامل نہیں ہے۔ بتائیں اس کو سختی سے روکا گیا ہے اور اس کے عبرتناک انجام کو



مثالوں سے واضح کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم نے جب قارون جیسے زبردست سرمایہ داریت (Capitalism) ذہن رکھنے والے کو اس کا یہ فرض یاد دلایا تھا تو اس نے نہایت غرور و تمکنت سے اس کے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

”قارون! موسیٰ کی قوم میں سے تھا! پس وہ ان کے مقابلہ میں اترانے اور شرارت کرنے لگا۔ بات یہ تھی کہ ہم نے اس کو دولت کے اتنے خزانے بخشے تھے کہ اس کے نقل و حمل سے طاقتور مزدور بھی تک جاتے تھے (یا اس کی کنبیوں کے نقل و حمل سے مضبوط مزدور بھی تک جاتے تھے) جب اس کی قوم نے اس سے کہا کہ تجھی نہ کر بلاشبہ اللہ تعالیٰ تجھی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ تجھ کو دیا ہے اس کے ذریعے سے آخرت کا سامان کر اور اس کو نہ بھول کہ دنیا میں تجھے کیا کچھ ملا ہوا ہے اور لوگوں کے ساتھ اسی طرح بھلائی کر جس طرح اللہ تعالیٰ نے تجھ پر بھلائی کے دروازے کھول دیئے ہیں اور زمین میں فساد کا خواہش مند نہ بن۔ اللہ تعالیٰ مفسدوں کو ناپسند کرتا ہے۔“ (سورۃ القصص)

تو قارون نے جواب میں یہ کہا:

قال انما اوتيته على علم عندى (القصص)

”یہ مال تو مجھ کو میرے اُس ہنر کی بدولت ملا ہے جس کا میں واقف کار ہوں یعنی میری سرمایہ داری قابلیت و ہنرمندی کا نتیجہ ہے اس صورت میں دوسروں کو اس میں شریک نہیں کر سکتا۔“

اس پر حق تعالیٰ نے سرمایہ داروں کی اس ذہنیت کو رد کرتے ہوئے یہ ذہن نشین کرایا کہ جب دولت مذموم سرمایہ داری تک پہنچ جاتی ہے تو پھر بڑی سے بڑی قوت و طاقت پکڑ جانے کے باوجود اللہ تعالیٰ اس کو فنا کر دیتا اور ہلاک کر ڈالتا ہے چنانچہ گزشتہ قوموں میں بھی سرمایہ داروں کے ساتھ اس نے یہی کیا ہے۔

اولم يعلم ان الله قد اهلك من قبله من القرون من حواشد منه قوة واکثر جمعا (القصص)

”کیا اس کے علم میں یہ نہیں ہے کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ ایسی کتنی ہی جماعتیں تباہ کر چکا ہے جو اس سے زیادہ قوت والی اور سرمایہ دار تھیں۔“

اور بلا آخر اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا تا کہ سرمایہ دار عبرت حاصل کریں اور اپنے مال میں جماعتی حصہ داری کو فراموش نہ کریں۔

فخفنا به وبادارہ الارض فلما كان له من فتنه ينصرونه من دون الله وما كان من المنتصرين

”پس ہم نے اس کو اور اس کے دولت خانہ کو تہ زمین و فساد دیا، پھر کوئی جماعت اس کی

مدد کے لئے سامنے نہ آئی جو اللہ کے مقابلہ میں ہوتی اور نہ وہ خود مدد لاسکا یعنی خدا کا انتقامی ہاتھ جب ایسے سرمایہ داروں کو ہلاک کرتا ہے تو پھر کوئی نصرت و مدد ان کو نہیں پہنچا سکتی۔“

ان آیات سمینہ (Clear) کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ غرور کا سر نیچا ہوتا ہے اور اس کا انجام اچھا نہیں ہوتا اس لئے اپنے خاندان مال و متاع اور بلند مرتبت و منصب پر اترنے کی بجائے مجر و انکساری سے کام لینا چاہئے۔

”ایک بادشاہ نے کسی فقیر سے کہا کہ مجھ سے کچھ مانگ۔ میں تیری خواہش بخوشی قبول کروں گا۔ فقیر نے زیر لب تبسم کیا اور کہا میں اپنے غلاموں کے غلام سے کیا مانگوں؟ بادشاہ نے متعجب ہو کر پوچھا یہ تم نے کیا کہا؟ فقیر نے جواب دیا اے بادشاہ! سن تو حرص اور امید دونوں کا غلام ہے اور یہ دونوں میرے غلام ہیں اس لئے تو میرے غلاموں کا غلام ہے۔“

امام غزالیؒ اپنی مشہور تصنیف ”احیاء علوم الدین“ میں لکھتے ہیں:

”خلیفہء وقت نے حضرت ابو حازمؒ کی خدمت میں عریضہ بھیجا کہ آپ کو جو حاجت ہو وہ لکھ کر بھیج دیں تاکہ ہم اس کو پورا کریں۔ آپ نے جواب میں لکھ کر بھیجا کہ میں نے اپنی تمام حاجات اللہ کے حضور پیش کیں جو اس نے منظور کیں ان کو میں نے قبول کر لیا اور جو نا منظور کیں میں نے ان پر قناعت سے کام لیا۔ اب کون سی چیز باقی رہ گئی ہے جو تم کو لکھ بھیجوں۔“

بعض صوفیاء کا ارشاد ہے کہ جس طرح تو قصاص کے ذریعے اپنے دشمن سے بدلہ لیتا ہے اسی طرح اپنی قناعت سے حرص کا انتقام لے۔ حضرت ذالنون مصریؒ فرماتے ہیں جس نے قناعت اختیار کی اس کو اہل زمانہ سے آرام حاصل ہوا۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں قناعت ایسی تلوار ہے جس کا وار خالی نہیں جاتا۔ حضرت بنان بن حمال کہتے ہیں طمع آزاد بندے کو قیدی بنا دیتی ہے اور قناعت قیدی کو آزاد کر دیتی ہے۔ حضرت محمد واسعؒ اس قدر قناعت پسند تھے کہ خشک روٹی پانی میں گھول کر کھا لیا کرتے اور فرماتے کہ خشک روٹی پر قانع کبھی مخلوق کا محتاج نہیں ہو سکتا۔

افریقہ کا رہنے والا ایک بھکاری حلب کے بزازوں کے بازار میں کہہ رہا تھا اے دولت مندو! اگر تم میں انصاف ہوتا اور ہم میں قناعت تو سوال کا رواج دنیا سے ختم ہو جاتا۔ اے قناعت تو تو مجھے مالدار کر دے کہ تجھ سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے۔

## 6۔ سود کی ممانعت:

اسلام میں سودی کاروبار سے روکا گیا ہے کیونکہ اس میں مجبوری و اضطراری کی کیفیت پائی جاتی ہے۔

آپ ﷺ نے اس طرح کے کاروبار کو ممنوع قرار دیا۔ قرآن مقدس میں آیا ہے:

احل الله البيع و حرم الربو بمحقق الله الربو او پرہی الصدقات واللہ لا یحب کل

کفار الیم۔

”اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا۔ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کی پرورش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کافرو بدکار کو پسند نہیں کرتا۔“

عن جابر قال لعن رسول اللہ ﷺ اکل الربوا و موكله و كتابه و شاهديه۔  
”حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے سود دینے والے سود لکھنے والے اور گواہوں پر لعنت فرمائی اور کہا یہ سب برابر ہیں۔“

عن ابی ہریرۃ عن رسول اللہ ﷺ قال یاتی علی الناس زمان لا یبقی احد الا اکل الربوا ان لم یاکلہ فاصابہ من یخارہ و یروی من غبارہ۔

”ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ سوائے سود کھانے والوں کے کوئی باقی نہیں رہے گا۔ اگر کوئی شخص ہو گا بھی تو اس کو سود کا بخار پہنچے گا اور ایک روایت میں ہے کہ اس کو سود کا غبار پہنچے گا۔“

عن علی قال نہی رسول اللہ ﷺ عن بیع المضطر و عن بیع الغرور عن بیع الثمرة قبل ان تدرک۔

”حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجبوری کی خرید و فروخت، بیع غرر اور پھلوں کو پکنے سے پہلے فروخت کرنے سے منع کیا۔“

## 7- حرام اشیاء کے استعمال پر پابندی:

ایسا کاروبار جو اسلام کی نگاہ میں معصیت ہو مثلاً شراب، مردار، خنزیر اور بت وغیرہ وہ اشیاء ہیں جن کی خرید و فروخت اسلامی نقطہ سے ممنوع ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے:

انما حرم علیکم المیتۃ و الدم و لحم الخنزیر و ما اھل بہ لغیر اللہ۔  
”اے مسلمانو! تم پر مردار، خون اور خنزیر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام کی چیز کو حرام کیا گیا ہے۔“

ایک اور حدیث مبارکہ ہے:

”جابرؓ کہتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی خرید و فروخت کو حرام قرار دیا ہے۔ جابرؓ کہتے ہیں کہ ہمیں نے رسول اللہ ﷺ کو فتح کے سال جب وہ مکہ میں تھے یہ کہتے سنا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے شراب، مردار، سور اور بتوں کا بیچنا حرام قرار دیا ہے۔ سوال کیا کہ مردار کی چربی کے بارے میں کیا رائے ہے۔ ہو کشتیوں میں ملی جاتی اور چمڑوں کو اس سے چکنا کیا جاتا ہے اور لوگ اس سے روشنی کرتے ہیں (چراغ جلاتے ہیں) آپ ﷺ نے فرمایا اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں وہ حرام ہے۔“

اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا اللہ یہود پر لعنت کرے جب اللہ تعالیٰ نے مردار کی چربی کو حرام قرار دیا تو یہ چربی کو کھلاتے بچ ڈالتے اور اس کی قیمت کھا جاتے۔“ (شق علیہ)

عن ابی حنیفۃ ان النبی نہی عن لئمن الدم و لئمن الکلب و کسب البقی و لئمن اکل الربوا و موکله و الواضمة و المستوحمة و المصور۔

”ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے خون کی قیمت کتنے کی قیمت اور زنا کار عورت کی کمائی سے منع فرمایا ہے اور سود کھانے اور سود دینے والے پر نیز جسم کو گوندھنے اور گدھوانے والے اور تصویق بنانے والے پر لعنت فرمائی ہے۔“

## 8- کئی تجارتی شکلوں کا روکنا:

اہل عرب کے ہاں تجارت میں خرید و فروخت کی بعض صورتیں رائج تھیں جو پسندیدہ نہ تھیں رسول اللہ ﷺ نے انہیں ختم کر دیا۔ یہ حسب ذیل ہیں:

عن جابر قال نہی رسول اللہ ﷺ عن المخابرة و المحاقلة و المزانية و المحاقلة ان یبع الرجل الزرع بمائة فوق حنطة و المزانية ان یبع النمل فی رؤوس النخل بمائة فوق و المخابرة کراء الارض بالثلث و الربع (رواہ مسلم)

”جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مخابرہ، محاقلہ اور مزانیہ سے منع فرمایا ہے۔ محاقلہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی کھڑی فصل کو سو فریق (پیانہ) غلہ کے بدلے بیچ دے۔ مزانیہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے درخت کی کھجوروں کو عام کھجوروں سے سو فریق کے عوض بیچ دے اور مخابرہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی زمین کو ایک تہائی یا چوتھائی پیداوار پر مٹائی کے لئے دے دے۔“

وعنه قال نہی رسول اللہ ﷺ عن المحاقلة و المزانية و المخابرة و المعاومة و عن الثنایا و رخص فی العرایا۔

”جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محاقلہ، مزانیہ، مخابرہ، معاومہ اور ثنایا سے منع فرمادیا اور عرایا کی اجازت دے دی۔“

عن وائل بن الاسقع قال سمعت رسول اللہ يقول من باع عیبا لم یدبہ لم یزل فی صفت اللہ اولم تنزل الملائكة لئله۔

”وائل بن الاسقع کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ جو شخص عیب وار چیز کو بیچے اور اس کے عیب کو ظاہر نہ کرے وہ ہمیشہ غضب الہی کا شکار رہتا ہے یا فرشتے اس پر ہمیشہ لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔“

## 9- جھگڑے کی صورت:

وہ معاملات جن میں جاہلین کے درمیان نزاع و مناقشہ کی صورتیں موجود ہوں یا کوئی ایسا

پہلو ہو جس میں اختلاف کی گنجائش ہو اس معاملہ کو مشکوک قرار دیا کیونکہ اس میں کسی خریق کو بھی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے اور یہ چیز متعدد تجارت کے لئے کسی طرح مناسب نہیں۔

عن ابی ہریرۃ قال نہی رسول اللہ ﷺ عن بیعتین فی بیعة.

”رسول اللہ ﷺ نے ایک معاملے کو دوسرے معاملے سے منع فرمایا۔“

عنه قال نہی رسول اللہ ﷺ عن بیع و شرط۔

”رسول اللہ ﷺ نے بیع کے ساتھ شرط لگانے سے منع فرمایا۔“

عن حکیم بن خزام قال نہی رسول اللہ ﷺ ان یرفع لیس عندی۔

”حکیم بن خزام کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے مجھ کو منع فرمایا۔ ایسی شے کے فروخت کرنے

سے جو میری ملکیت نہیں۔“

10- دھوکا دہی کی روک تھام

ایسا معاملہ جس میں دھوکا و فریب مضمر ہو مثلاً اچھی چیزوں کے اہم و بری چیزیں ملا دی

جائیں اور پتہ نہ چلنے دیا جائے یا ایک چیز پر نظر رکھی جائے تاکہ اسے حاصل کر لیں لیکن اسے

معاملے میں شامل نہیں کیا بلکہ کسی اور طریق سے حاصل کرنے کا طریقہ اپنایا گیا جیسا کہ:

عن ابی ہریرۃ قال نہی رسول اللہ ﷺ عن بیع الحماة و بیع الغرر (مسلم)

”رسول اللہ ﷺ نے دھوکے کے معاملے کو حرام قرار دیا اور بکر پھینک کر کسی شے کی

خریداری کو بھی۔“

نہی رسول اللہ ﷺ عن النجش.

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجش سے منع فرمایا۔“

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے دھوکا کے کاروبار سے منع کیا ہے۔

ایک بار آنحضرت ﷺ غلہ کے ایک ڈھیر کے قریب سے گزرتے تو آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ اس

میں داخل کیا تو فرمایا اے غلہ والے یہ کیا ہے؟ اس نے کہا یا رسول اللہ ﷺ اس

پر بارش ہوئی تھی۔ آپ ﷺ نے کہا تو نے اس کو غلہ کے اوپر کیوں نہ رکھا تاکہ لوگ دیکھ سکیں۔

جو فرد دھوکہ باز ہے وہ مجھ سے نہیں۔

11- قبحہ گری (Prostitution):

اسلام نے عصمت فردگی کے پیشہ کو حرام قرار دیا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں بعض لوگ اپنی

لوٹریوں کو اس پیشہ پر مجبور کرتے۔ قرآن حکیم میں اس کی ممانعت کی گئی۔ ارشاد ربانی ہے:

ولا تکرھوا فیذکھ علی البغاء ان اردن تحصن لتبغوا عرض الحیوة الدنیا

(النور: 33)

”اور اپنی لوطیوں کو اگر وہ پاک دامن رہنا چاہیں تو (سبے شرفی سے) دنیوی زندگی کے فوائد حاصل کرنے کے لئے بدکاری پر مجبور نہ کرنا۔“

مشکوٰۃ المصابیح میں حضرت رافع بن خدیج سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”زانیہ عورت کی کمائی پلید ہے۔“

## 12- رقص اور جنسی فنون:

رقص، خوش گمانی، حیا سوز، ایکٹنگ اور اس قسم کے دوسرے بے ہودہ کام جن سے جنسی پہچان پیدا ہو سب ممنوع ہیں۔ اسلام یہ درس دیتا ہے کہ ان امور سے بھی پرہیز کرو جو برائی کی طرف رہنمائی کرنے والے ہوں۔ ارشاد ربانی ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الزَّوْنٰی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَمَبِیْلًا (بنی اسرائیل: 32)

”زنا کے قریب (بھی) نہ چلو کہ وہ بے حیائی اور بری راہ ہے۔“

## 13- لوث مار:

کسی مسلمان کا مال اس کی رضا مندی کے بغیر حاصل کرنا جائز نہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے لوث مارنے اور مثلاً کرنے سے منع کیا ہے۔ حضرت عمران بن حصین سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص لوث ڈالے وہ ہم میں سے نہیں۔

## 14- ظلم و غصب:

کسی کے مال یا جائیداد کو غصب نہیں کیا جاسکتا۔ ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظَلَمًا اِنَّهٗمْ یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَّ سَیَصْلُوْنَ

سَعِیْرًا

”بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھا لیتے ہیں وہ بس اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھرتے ہیں اور عنقریب وہ دہکتی ہوئی آگ میں جموٹکے جائیں گے۔“ (النساء: 10)

حضرت سعید بن زید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص ازراہ ظلم ایک ہاشت زمین لے گا قیامت کے دن سات زمینوں تک اس کے گلے میں بطور طوق ڈالی جائے گی۔

## 15- اخسار میزان:

دھوکہ کی ایک قسم تاپ تول میں کمی ہے۔ ایسے لوگوں کی کمائی بھی حرام کی ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

وَبَلِّغِ لِلْمُطَّقِّينَ الَّذِينَ إِذَا أَكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوهُمْ

يَخْسِرُونَ

”بڑی خرابی ہے (ناپ تول میں) کمی کرنے والوں کی کہ جب لوگوں سے ناپ کر لیں پورا ہی لے لیں اور جب انہیں ناپ کر یا تول کرویں تو گھٹا دیں۔“ (نطفہ نمین: 361)

## 16- قسمت بتانے اور فال گیری کا کاروبار:

حضرت حصہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص نجومی کے پاس آیا اور اس سے کوئی سوال پوچھا۔ اس کی چالیس دن رات کی نماز قبول نہیں کی جاتی۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کابن کے پاس آئے اور جو کچھ وہ کہتا ہے اس کی تصدیق کرے..... تو وہ اس چیز سے بیزار ہوا جو محمد ﷺ پر اتاری گئی ہے۔ حضرت ابو مسعود انصاری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کابن کی اجرت سے منع کیا ہے۔

## 17- رونا پینہ اور گانا بجانا:

اسلام میں رو پیٹ یا گانہ کر کمانی کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے اور ایسی کمانی کو حرام قرار دیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کی قیمت اور گانے والیوں کی کمانی سے منع کیا ہے۔ حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گانے بجانے والی لوطیوں کو نہ خریدو نہ بیچو نہ ان کو گانا سکھلاؤ ان کی قیمت حرام ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے رونے دھونے اور گانا بجانے کی اجرت چونکہ معصیت کا معاوضہ ہے اس لئے اس کا دینا اور لینا دونوں ہی ناجائز ہیں۔

## 18- رشوت ستانی (Corruption):

یہ جدید دور کے سرطان کی مانند ہے جس کے منفی اثرات معاشرے پر چھا چکے ہیں۔ دیگر ترقی پذیر ممالک بالعموم اور پاکستان بالخصوص اس کی سخت لپیٹ میں ہے۔ سرکاری سطح پر اس کے خاتمہ کی کوئی سنجیدہ اور حتمی کوشش نہیں کی جا رہی اس لئے مہلک جراثیم مزید پھلتے جا رہے ہیں۔

عن ابی حمید الساعدی قال قال رسول اللہ ﷺ ھدایا العمال غلول (مسند احمد)  
”ابو حمید الساعدی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سرکاری ملازمین جو بدیہ وصول کرتے ہیں یہ خیانت ہے۔“..... اور

”ان ہی ابو حیدر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن الحنفیہ نامی ایک شخص کو قبیلہ ازد پر عامل بنا کر بھیجا۔ جب وہ وہاں سے سرکاری مال لے کر چلا تو بیت المال میں داخل کرتے وقت انہوں نے کہا کہ یہ تو ہے سرکاری مال اور یہ ہدیہ ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خلیہ دیا اور اس میں حمد و ثناء کے بعد فرمایا: میں تم میں سے ایک شخص کو اس حکومت کے کام میں جو اللہ نے میرے سپرد کی ہے عامل بنا کر بھیجتا ہوں تو وہ آ کر مجھ سے کہتا ہے کہ یہ تو ہے سرکاری مال اور یہ ہدیہ ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ لوگ خود ہدیے دیتے ہیں تو کیوں نہ وہ اپنے باپ اور اپنی ماں کے گھر بیٹھا رہا کہ اس کے ہدیے اسے وہیں بچنے رہنے؟“ (بخاری، مسلم، ابوداؤد)

عن بريدہ عن النبی ﷺ قال من استعملناه علی عمل فزقناه رزقا فما اخذ بعد فہم غلول

”بریدہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کو ہم کسی سرکاری خدمت پر مقرر کریں اور اسے اس کام کی تنخواہ دیں وہ اگر اس تنخواہ کے بعد اور کچھ وصول کرے تو یہ خیانت ہے۔“ (ابوداؤد)

عن ربيع بن ثابت الانصاری ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلا یرکب دابة من فہم المسلمین حتی اذا عصفها ردها فہم ومن کان یومن باللہ والیوم الآخر فلا یلبس لوبا من فی المسلمین حتی اذا اخلفہ رده فہم (ابوداؤد)

”ربیع بن ثابت انصاری کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ یہ حرکت نہ کرے کہ مسلمانوں کے فے (یعنی پٹیک کے مال) میں سے ایک جانور کی سواری لیتا رہے اور جب وہ پیکار ہو جائے تو اسے پھر سرکاری اصطبل میں داخل کر دے اور جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کا یہ کام بھی نہیں ہے کہ مسلمانوں کے فے میں سے ایک کپڑا برتے اور جب وہ پرانا ہو جائے تو اسے واپس کر دے۔“

عن عبد اللہ ابن عمرو قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی راہ و نشی (ابوداؤد)

”عبد اللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ لعن رسول اللہ ﷺ نے راشی و نشی والے اور نیٹے والے دونوں پر لعنت فرمائی۔“

عن عدی بن عمرو الکندی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال یا ایہا الناس من عمل منکم لنا علی عمل فکتمنا منہ مخیطا فیما فوقہ فہو غل یاتی بہ یوم القیمة (ابوداؤد)



”عدی بن عیسرہ الکندی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگو! جو شخص ہماری حکومت میں کسی خدمت پر مقرر کیا گیا اور اس نے ایک ٹاگا یا اس سے بھی حقیر تر کوئی چیز ہم سے چھپا کر استعمال کی تو یہ خیانت ہے جس کا بوجھ اٹھانے جوئے وہ قیامت کے روز حاضر ہوگا۔“

یہ ہیں اس مسئلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر جملہات اور یہ اپنے مدعا میں ماتھے واضح ہیں کہ ان پر کسی تشریح و توضیح کے اضافے کی ضرورت نہیں۔ جو لوگ اپنی حرام خوری کے لئے طرح طرح کے حیلے اور بہانے پیش کرتے ہیں اور اسے اپنی زہانی چال بازیوں کے ذریعہ سے حلال بنانے کی کوشش کرتے ہیں آپ ان سے کہئے کہ اگر حرام کھاتے ہو تو کم از کم اسے حرام تو سمجھو شاید کبھی اللہ اس سے بچنے کی توفیق دے دے۔ لیکن اگر حرام کو حلال بنا کر کھایا تو تمہارے ضمیر مردہ ہو جائیں گے پھر کبھی حرام سے بچنے کی خواہش دل میں پیدا ہی نہ ہو سکے گی اور جب خدا کے ہاں حساب دینے کھڑے ہو گے تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ حقیقت تمہارے بدلنے سے نہیں بدل سکتی۔ حرام حرام ہی ہے خواہ تم اسے حلال بنانے کی کتنی ہی کوشش کرو۔

پھر لوگوں سے کہئے کہ خدا اور آخرت اور حساب اور جزا و سزا یہ سب تمہارے نزدیک محض افسانہ ہی افسانہ ہے تب تو حلال و حرام کی بحث فضول ہے۔ جانوروں کی طرح جس کھیت میں ہریالی نظر آئے اُس میں کھس جاؤ اور جائز و ناجائز کی بحث کے بغیر کھاؤ جتنا کھایا جاسکے۔ لیکن اگر تمہیں یقین ہے کہ اوپر کوئی خدا بھی ہے اور کبھی اس کے سامنے جا کر حساب بھی دینا ہے تو فوراً اس بات پر بھی غور کر لو کہ آخر یہ حرام کی کمانی کس کے لئے کرتے ہو؟ کیا اپنے جسم و جان کی پرورش کے لئے؟ مگر یہ جسم و جان تو اس خدمت پر تمہارے احسان مند نہ ہوں گے بلکہ تمہارے خلاف خدا کے ہاں الٹا استغاثہ کریں گے کہ تو نے ہمیں اس ظلم کی امانت میں دیا تھا اور اس نے ہمیں حرام کھلا کھلا کر پرورش کیا۔ پھر کیا یہی بچوں کے لئے کرتے ہو؟ مگر یہ بھی قیامت کے روز تمہارے دشمن ہوں گے اور تم پر الٹا الزام رکھیں گے کہ یہ ظالم خود بھی بگڑا اور ہمیں بھی بگڑا دیا۔ پھر آخر یہ عذاب الہی کے خطرے میں اپنے آپ کو کس لئے ڈال رہے ہو؟ کون ہے جو اس ناجائز خدمت پر تمہارا احسان مند ہوگا؟ کس سے اس بے جاسوسی پر سزا کی توقع رہیجے؟ اور غور الٹا ظالم ظلمت جس کے ایک جز کی حیثیت سے آپ لوگو کو کام کرنا ہے۔ یہ اپنے حساب خود ناہک۔ اب اس کی حیثیت بالکل خیر کے نظام جسمانی کی ہے جس کی ہوتی ہوں اور رنگ و رنگ میں حرام سرایت کئے ہوئے ہے۔ اُس کے کل پڑے بن کر آپ لوگ پہلے ہی گناہ عظیم میں مبتلا ہیں۔ اب اس پر خیانت اور رشوت اور باطل طریقوں کے ارتکاب کا اضافہ کر کے اپنے آپ کو کیوں مزید خطرے میں ڈالتے ہیں؟ کیا کبھی موت آنی ہی نہیں ہے؟ یا مرنے کے بعد کوئی جائے پناہ تجویز کر رکھی ہے جہاں خدا کی پکڑ سے بچ جائے کی امید ہے؟

مفتی غلام رسول سعیدی نے اپنی تفسیر ”تبیان القرآن“ میں اس طرح لکھا ہے:

”علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی متوفی 1205ھ لکھتے ہیں:

کوئی شخص حاکم یا کسی اور افسر مجاز کو کوئی چیز دے تاکہ وہ اس کے حق میں فیصلہ کر دے یا حاکم کو اپنی منشاء پوری کرنے پر ابھارے۔“ (تاج العروس ج 10)

امام ابوبکر احمد بن حسین متوفی 458ھ روایت کرتے ہیں:

”مسروق بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے پوچھا گیا کہ سحت کا کیا معنی ہے؟ انہوں نے کہا رشوت! پھر سوال کیا گیا کہ فیصلہ پر رشوت لینے کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے کہا یہ کفر ہے کیونکہ اہل تعالیٰ نے فرمایا ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کے (نازل کردہ) احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ (المائدہ: 44).....“ (سنن کبریٰ ج 10)

کسی پر ظلم کرنے کے لئے یا کوئی ناجائز کام کرانے کے لئے کچھ دینا رشوت ہے اور اپنا حق حاصل کرنے کے لئے یا خود کو ظلم سے بچانے کے لئے کچھ دینا یہ رشوت نہیں ہے۔“

امام ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص متوفی 370ھ کی روایت اس طرح ہے:

روایت ہے کہ نبی ﷺ نے خیر کا مال غنیمت تقسیم کیا اور بڑے بڑے عطا کیا دیئے اور عباس بن مرداس کو بھی کچھ مال دیا تو وہ اس پر ناراض ہو گیا اور شعر پڑھنے لگا نبی ﷺ نے فرمایا (کچھ اور مال دے کر) ہمارے متعلق اس کی زبان بند کر دو پھر اس کو کچھ اور مال دیا حتیٰ کہ وہ راضی ہو گیا۔“ (احکام القرآن ج 2)

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی 458ھ کے مطابق:

حضرت ابن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ جب وہ حبشہ کی سرزمین پر پہنچے تو ان سے ان کا کچھ سامان چھین لیا گیا، انہوں نے اس سامان کو اپنے پاس رکھا اور دو دینار دے کر وہ سامان چھڑا لیا۔

وہب بن منہ بیان کرتے ہیں کہ جس کام میں رشوت دینے والا گناہ گار ہوتا ہے یہ وہ نہیں ہے جو اپنی جان اور مال سے ظلم اور ضرر و دور کرنے کے لئے دی جائے رشوت وہ چیز ہے کہ تم اس چیز کو حاصل کرنے کے لئے کچھ دو جو تمہارا حق نہیں ہے اس میں دینے والا گنہگار ہوتا ہے۔“ (سنن کبریٰ ج 10)

مزید برآں یہ کہ:

”قاضی خاں اوزجندی حنفی متوفی 594ھ نے رشوت کی چار قسمیں لکھی ہیں:

- 1- منصب قضاء کو حاصل کرنے کے لئے رشوت دینا اس میں رشوت دینا اور لینا دونوں حرام ہیں۔
- 2- کوئی شخص اپنے حق میں فیصلہ کرانے کے لئے رشوت دے یہ رشوت جائزین سے حرام

ہے خواہ وہ فیصلہ حق اور انصاف پر مبنی ہو یا نہ ہو کیونکہ فیصلہ کرنا قاضی کی ذمہ داری اور اس پر فرض ہے۔

3- اپنی جان اور اپنے مال کو ظلم اور ضرر سے بچانے کے لئے رشوت دینا یہ لینے والے پر حرام ہے دینے والے پر حرام نہیں ہے اسی طرح اپنے مال کو حاصل کر لے کے لئے بھی رشوت دینا جائز ہے اور لینا حرام ہے۔

4- کسی شخص کو اس لئے رشوت دی کہ وہ اس کو سلطان یا حاکم تک پہنچا دے تو اس کا دینا جائز ہے اور لینا حرام ہے۔“

### 19- چند دیگر:

(i) الميسر والانصاب والازلام زوجس من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون

”جو اہل بیت اور پائے (یہ سب) شیطان کے گندے کام ہیں پس ان سے بچتے رہو تاکہ تم نجات پاؤ۔“ (المائدہ: 90:5)

(ii) کل مسکر خمر و کل مسکر حرام۔

”ہر نشہ آور چیز خمر (شراب) ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔“ (مسلم)

(iii) ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام۔

”جس چیز کا کثیر حصہ نشہ لائے اس کا تھوڑا حصہ بھی حرام ہے۔“ (ابن ماجہ)

(iv) لعن الله الخمر و شاربها و ساقبها و بائعها و مبتاعها و عاصرها و معتصرها و حاملها و المحمولة اليه .

”اللہ تعالیٰ نے شراب پر لعنت کی ہے اور اسے پینے والے اور پلانے والے پر اور اسے بیچنے والے اور خریدنے والے پر اور اسے نچوڑنے والے اور نچوڑوانے والے پر اور اسے اٹھانے والے اور جس کے لئے اٹھائی گئی اس پر بھی لعنت بھیجی ہے۔“ (ابن داؤد)



اسلام

— اور —

جدید سیاسی نظریات

# علم سیاسیات

## علم سیاسیات کی نوعیت

اسلامی دنیا نے مدون اسلامی زندگی کے پُر جوش اور صداقت انگیز مظاہرے دیکھے ہیں۔ اسلامی دور حکومت میں سیاسی آمار کا اتنا غلبہ رہا ہے کہ صدیوں تک غیر مسلموں کا دور بھی ان سے فائدہ اٹھاتا رہا۔ اسلامی سیاست نے ایسے علماء پیدا کئے جنہوں نے چار سو سال تک یورپ کے سیاسی ماحول پر اثر ڈالا۔ ہمارے نظام نے سیاسی خیالات اور سیاسی رجحانات پیدا کئے جن کی قوت سے سیاسی کتابیں قلمبند کی گئیں، ان کتابوں کے نظریات نے مغرب کو نظریات دیئے جن کی موجودہ آواز ماضی سے ہم آہنگی کا ثبوت دے رہی ہے۔ آج سے صدیوں پہلے علماء سیاست کے متعلق وہ کچھ کہہ چکے ہیں جن کو عصر حاضر کے علماء نے آج اپنی زبان و قلم سے ادا کیا ہے۔

ابن خلدون:

علامہ ابن خلدون "سیاست" کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"سیاست اس ذمہ داری کا نام ہے جس کی رو سے عام انسانی نگہداشت (کفالت) کا کام پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے جس کے ذریعے خدا کی نیابتی حکومت بندگان خدا میں اللہ عزوجل کے قوانین کو نافذ کرتی ہے اور احکامات کے اجراء کو عمل میں لاتی ہے۔ اس کام میں انسانی بہتری اور مفاد عامہ کا لحاظ رکھتی ہے اور قانون (شرائع) کو فیصلہ کن قوت تسلیم کرتی ہے۔"

علامہ ابوالبقاء حنفی:

علامہ ابوالبقاء "سیاست" کی تعریف یہ کرتے ہیں:

"وہ کام جس کا مقصد انسان کی بہتری کے لئے ایسا راستہ پیدا کرنا ہے جو حال اور مستقبل کی رہنمائی کے لئے ضمانت بن سکے۔ سیاست انبیاء کی ذمہ داری ہے جو اپنے عام اور خاص ظاہری اور باطنی دائرہ میں اسی طرح کام کرتی ہے جس طرح حکمران صرف ظاہری حلقہ اثر میں اس ذمہ داری کے مالک ہوتے ہیں۔"

## علامہ ابوالحسن ماوردی:

شارح قانون اسلام علامہ ابوالحسن ماوردی نے زیادہ صاف و سلیس بیان اختیار کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

”اسلامی حکومت ایک قسم کی قیادت ہے جو دین کی حفاظت اور دنیا کی

سیاست پر مبنی ہے۔“

گویا دین کی حفاظت کے بعد دنیا کے کاموں میں اس کا حصہ لینا سیاست پر موقوف ہے۔ اسلامی حکومت کے قائد کے لئے سیاست ایک خدائی آلہ کار ہے جس کا کام اجتماعی نظام کا اتحاد ہے۔

## علامہ ابن تیمیہ:

امام ابن تیمیہ کے نزدیک حکومت ایک امانت ہے جس کا کام سیاست عدل کو برقرار رکھنا

ہے۔

## امام غزالی:

امام غزالی کے نزدیک دنیا ایک ارضی نظام ہے جس سے انسان خاص تعلق رکھتا ہے۔ انسان ایک وحدت ہے مگر یہ وحدت اجتماعیت میں کم ہو جاتی ہے۔ اسلامی زندگی کا تعلق اسلام کے قوانین سے ہے اور یہ قوانین معاملات دنیا کے دائرہ میں سیاست کے کارنامے ہیں۔

## شاہ ولی اللہ:

آخری دور کے علماء میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے اسلامی زندگی کے سیاسی بحران کو حکیمانہ طرز بیان کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ تصریح کرتے ہیں کہ اسلام کے اجتماعی نظام کا تعلق سیاست سے ہے اور سیاست کی اساس معتدل و اجابت پر ہے۔ انبیاء کی جدوجہد کا مدار بھی درحقیقت دو چیزوں صحیح انسانی تہذیب اور امت کی سیاست پر رہا ہے۔

## حکومت اور سیاست کا آئینی ربط:

امام رازب فرماتے ہیں:

”انسانی سرگرمیوں کا دار و مدار تین حقیقتوں پر ہے:

- 1- عمارۃ الارض..... یعنی روئے زمین پر عمرانی تمدن کے بروئے کار لانے پر۔
- 2- خلافت..... یعنی اسلامی طرز کی نیابتی حکومت پر جو سیاست کے اعتبار سے اللہ عزوجل کے اقتدار اعلیٰ کی مکمل اطاعت کرے۔
- 3- مکارم شریعت..... یعنی اسلامی قانون کے اعلیٰ اوصاف پر۔

مزید تصریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خلافت کا استحقاق سیاست کی بناء پر حاصل ہوتا ہے۔

## سیاست کی اقسام:

اہم راجب کے نظریہ کی روش سے سیاست کی دو قسمیں ہیں:

1- فرد کی سیاست

2- معاشرہ کی سیاست

معاشرہ یا اجتماع سے پہلے فرد کو سیاسی کردار میں کالں ہونا چاہئے۔ جو فرد اپنی جگہ بہتر سیاست پر قادر نہیں ہے وہ حکومت کی سیاست کی ہاگ ڈور کو نہیں چلا سکتا۔ حکومت بہت پہلے قانون کو جانتا ضروری ہے اور قانون کے ساتھ سیاست عامہ کا جاننا لازمی ہے۔

## علم سیاسیات کی وسعت

علم سیاسیات کا ہر جزوی علم ریاست و حکومت کے ان مسائل اور نظریات کا مطالعہ کرتا ہے جن کا اس سے بلا واسطہ تعلق ہوتا ہے لیکن علوم سیاسیات کا نام بھی جامع نہیں۔ بے شک ریاست اسکی مختلف النوع اور ہمہ گیر چیز ہے کہ جس کا تعلق انسانی معاشرے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں سے ہے۔

علم سیاسیات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کے پس منظر اور ماضی پر نظر ڈالیں جس سے مراد یہ ہے کہ ریاست کا ظہور کیسے ہوا؟ وہ کیا اسباب تھے جن کے باعث اس کی ضرورت محسوس ہوئی؟ اسباب کو سمجھنے سے بھی ہم ریاست کے مقصد کا تعین کر سکتے ہیں اور اس کو مؤثر اور مفید تنظیم کے طور پر زندہ رکھ سکتے ہیں۔ ریاست کی تخلیق اور ابتداء کا مطالعہ اس علم کا لازمی حصہ ہے اور مکمل اسے تاریخی تحقیق کا نام دیتا ہے۔

علاوہ ازیں ریاست کی موجودہ کارکردگی یعنی حال کا مطالعہ بھی ضروری ہے جس سے مراد یہ ہے کہ ہم معلوم کر سکیں کہ ریاست کا مثبت اور منفی پہلو کون کون سا ہے۔ مکمل اس دور کے مطالعہ کو ریاست کا تجزیاتی مطالعہ کہتا ہے۔

علم سیاسیات محض سیاسی اداروں، حکومت اور ریاست کے مطالعہ پر یہ اکتفا نہیں کرتا بلکہ سیاسی نظریات پر بھی بحث کرتا ہے۔ آج کی دنیا میں سیاسی نظریات خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس وقت دنیا میں دو قسم کی ریاستیں ہیں:

1- جمہوری ریاستیں

2- آمرانہ ریاستیں

## علم سیاسیات کی وسعت

علم سیاسیات کی وسعت میں مندرجہ ذیل امور کا مطالعہ شامل ہے:

### ماضی کا مطالعہ:

ریاست کی موجودہ حیثیت کو سمجھنے کے لئے ماضی پر نظر ڈالنا ضروری ہے کیونکہ ریاست کی شکل بدلتی رہتی ہے۔ حال کی صورت و تاریخی شکل کی تنظیم سے ہوتی پھر ایشیائی سلطنتیں وجود میں آئیں۔ ان کے بعد یونانی و رومی سلطنتوں کا دور آیا۔ پھر سلطنت روم کا دور شروع ہوا۔ اس کے بعد یورپ میں جاگیر دارانہ نظام قائم ہوا۔ اس کے بعد قومی ریاستیں وجود میں آئیں۔ سب سے پہلے بادشاہت اس کے بعد جمہوریت اور جمہوریت کا دور آیا۔

علم سیاسیات حکومت کے ارتقاء اور ابتداء سے متعلق نظریات کا جائزہ لیتا ہے۔

### حال کا مطالعہ / تجزیاتی مطالعہ:

علم سیاسیات ریاست کی شکل یا نوعیت اور اہمیت کا مطالعہ کرتا ہے۔ ریاست معاشرے کی منظم شکل ہے۔ اس کا مقصد انسانی زندگی کو بہتر اور خوشحال بنانا ہے۔ ریاست حکومت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی اور علم سیاسیات حکومتوں کی بناوٹ، ان کی کارکردگی، نظام قانون اور آئین حکومت کے مختلف اداروں کے فرائض متعین کرتی ہے۔ ان میں ریاست اور شہریوں کے باہمی تعلقات کا موضوع بھی شامل ہے۔ یہ لاپرواہیوں کے آئین کے تعلقات اور بین الاقوامی قوانین کو بھی زیر بحث لاتی ہے۔

### مستقبل کا مطالعہ:

علم سیاسیات ماضی کے علاوہ مستقبل پر بھی نظر رکھتا ہے اور ماضی و حال کے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں سیاسی اداروں کی اصلاح کرتا ہے۔

مستقبل اس بارے میں لکھتا ہے:

”علم سیاسیات ریاست کا گزشتہ موجودہ اور آئندہ کے لحاظ سے مطالعہ ہے۔ یہ ریاست کی نوعیت کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی نشوونما اور ترقی کے اصول وضع کرتا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات میں سیاسی اداروں اور سرگرمیوں میں ضروری اصلاحات بھی تجویز کرتا ہے۔“

### حکومت کا مطالعہ:

علم سیاسیات نہ صرف ریاست کا مطالعہ کرتا ہے بلکہ حکومت کا بھی جائزہ لیتا ہے۔



حکومت ریاست کا لازمی جزو ہے اس کے بغیر ریاست معرض وجود میں نہیں آ سکتی چنانچہ علم سیاسیات حکومت کے مختلف پہلوؤں کا تفصیل سے جائزہ لیتا ہے۔

### مطالعہ انسان:

ریاست کا قیام انسانی فطرت اور ضروریات کے تحت عمل میں آتا ہے اور یہ فرد کی بہبود کے لئے کوشاں رہتی ہے۔ بقول ارسطو:

”ریاست فرد کی بنیادی ضروریات کی بناء پر وجود میں آتی ہے اور زندگی کی اعلیٰ اقدار کی خاطر اپنا وجود برقرار رکھتی ہے۔ یہ زندگی کے اعلیٰ مقاصد کو حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے اور انسان کی زندگی کے لئے ناگزیر ہے۔“

چنانچہ انسان علم سیاسیات کے مطالعہ کا اہم جزو ہے۔ اچھا شہری ہی اچھی ریاست کے قیام کا ذمہ دار ہے۔

### بین الاقوامی تعلقات کا مطالعہ:

موجودہ دور میں کوئی ریاست دوسری ریاستوں سے الگ تھلک نہیں رہ سکتی۔ تمام ریاستوں کے افراد کو چاہئے کہ وہ آپس میں بہتر تعلقات قائم رکھیں تاکہ انہیں ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو بہتر طور پر سمجھنے کا موقع حاصل ہو۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب مختلف ریاستیں آپس میں دوستانہ اور خوشگوار تعلقات قائم کریں۔ اس قسم کے تعلقات سے قیام امن میں مدد ملتی ہے۔

درج بالا علوم کے علاوہ ریاست کا اثر معاشی، اخلاقی اور تمدنی زندگی پر بھی ہوتا ہے اس لئے ان علوم کو بھی جو ان کا مطالعہ کرتے ہیں علوم سیاسیات میں شامل کرنا چاہئے مگر ایسا نہیں ہے لہذا عمرانیات، قانون، معاشیات وغیرہ کو بھی علوم سیاسیات میں شامل کرنا مناسب نہیں۔ اسے ریاست اور حکومت کے مخصوص مسائل اور دیگر علوم کا اپنے اپنے مخصوص مسائل کے مطالعہ کے لئے وقف ہونا چاہئے تاکہ اس تقسیم کار سے ہر ایک علم ترقی کر سکے اور اس کے لئے علم سیاسیات کی اصطلاح زیادہ مناسب موزوں اور درست ہے۔

## علم سیاسیات کے مطالعہ کی اہمیت

قدیم یونانی مفکرین کے افکار میں علم سیاسیات کو ایک ممتاز مقام حاصل رہا۔ ارسطو نے علم سیاسیات کو سب سے برتر علم گردانا تھا۔ ارسطو علم سیاسیات سے متعلق مزید کہتا ہے:

”انسان صرف معاشرتی حیوان ہی نہیں سیاسی حیوان بھی ہے۔ اس

لئے سیاسی معاشرے کی ترقی ضروری ہے۔“

یونانی مفکرین کی تعلیمات میں ریاست کے علم کو دوسرے تمام علوم پر فوقیت حاصل ہے۔ جس طرح کوئی فرد معاشرہ کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتا اسی طرح سیاسی معاشرہ کے بغیر تہذیب و تمدن کی ترقی محال ہے۔ دراصل انسان نے جتنی بھی ترقی کی ہے وہ سیاسی معاشرہ کی رہین منت ہے۔ علم سیاسیات کے مطالعہ سے ہمیں سیاسی معاشرہ یعنی ریاست اور حکومت کی اہمیت کا پتا چلتا ہے۔ یہ علم ہمیں بتاتا ہے کہ ریاست کا اصل مقصد کیا ہے اور وہ کس حد تک اپنے اصل فرائض کو سرانجام دے رہی ہے۔

ایمرن علم سیاسیات کے بارے میں لکھتا ہے:

”یہ انسانیت کی خدمت کے لئے ایک بہترین علم ہے۔“

جارج برنارڈ شا علم سیاسیات سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

”یہ ایک ایسا علم ہے جس سے تہذیب و ثقافت کو بچایا جاسکتا ہے۔“

## علم سیاسیات کے مطالعہ کی اہمیت / افادیت

ذیل میں نکات کے ذریعے علم سیاسیات کے مطالعہ کی اہمیت / افادیت کو واضح کیا جا رہا

ہے:

### سیاسی شعور میں اضافہ:

علم سیاسیات کے مطالعہ سے ہی فرد اس قابل ہوتا ہے کہ حکومتوں کی تشکیل کے سلسلہ میں اپنے فرائض مناسب طور پر ادا کر سکے۔ وہ اپنے ووٹ کا صحیح استعمال کرے ووٹ کے صحیح استعمال کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ رائے و ہند گمان کو اس بات کا پورا پورا علم ہو کہ حکومت کے اصل فرائض کیا ہیں اور مختلف سیاسی جماعتیں اپنے دور اقتدار میں کس حد تک ان مقاصد کے حصول میں کوشاں رہیں۔

مختلف حکومتوں کے دور حکومت کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ شہری جدید حکومتوں کو درپیش مسائل کی نوعیت کو سمجھتے ہوں۔ موجودہ دور میں ملکی سیاست پر بین الاقوامی حالات گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ سیاسیات کے مطالعہ سے ایک شہری کو بین الاقوامی تعلقات اور بین الاقوامی سیاسی مسائل کا بخوبی علم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بین الاقوامی برادری کا رکن ہونے کی حیثیت سے ہر شہری اپنے فرائض خوش اسلوبی سے ادا کر سکتا ہے۔

## بنیادی حقوق کا تحفظ:

موجودہ دور میں بنیادی حقوق کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوری ممالک میں شہریوں کے بنیادی حقوق کو عام طور پر دستوری قانون کا حصہ بنا دیا جاتا ہے۔ شہریوں کو اپنے حقوق کی اہمیت کا شعور نہ ہو تو ایک طرف شہری آزادیاں خطرے میں پڑ جاتی ہیں جبکہ دوسری طرف حکومت میں استبدادیت کا رنگ غالب آ جاتا ہے لیکن اگر شہری اپنے حقوق کی نگہداشت کے لئے ہر وقت مستعد ہوں اور ان میں حکومت یا کسی دوسرے ادارے کی طرف سے ہر قسم کے جابرانہ اقدام کے خلاف سینہ سپر ہو جانے کا جذبہ پایا جاتا ہو تو ملک میں آزادی کا دور دورہ ہوگا۔

علم سیاسیات کے مطالعہ سے ایک شہری میں اپنے حقوق کے تحفظ کا شعور اجاگر ہوتا ہے۔

## سیاسی تربیت:

دور حاضر میں امور حکومت کی انجام دہی بلاشبہ ایک مشکل فریضہ ہے۔ علم سیاسیات کے مطالعہ سے ایک فرد کو نہ صرف اپنے ووٹ کے صحیح استعمال کی تربیت حاصل ہوتی ہے بلکہ وہ خود بھی اس قابل ہو جاتا ہے کہ انتخابات میں حصہ لے کر براہ راست کاروبار حکومت میں شرکت کرے چنانچہ علم سیاسیات کے علمی پہلو کے مطالعہ سے ایک فرد کو حکومت کے مختلف اداروں کی تشکیل ان کے فرائض اور طریق کار کا علم ہو جاتا ہے۔ مزید برآں مقامی حکومت خود اختیاری کے اداروں کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لئے سیاسیات شہریوں کو تربیت فراہم کرتی ہے۔

## جمہوریت کی کامیابی:

موجودہ دور جمہوریت میں سیاسیات کے مطالعہ کی اہمیت اور بھی بڑھ چکی ہے۔ آج کے دور میں حکومت چلانے پر کسی مخصوص فرد یا گروہ کو اجارہ داری حاصل نہیں بلکہ یہ اختیار عوام کو حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی سے نمائندگان کا انتخاب کر کے حکومت کی تشکیل کریں۔ جمہوریت کا تقاضا ہے کہ حکومت کی تمام پالیسیاں اور قوانین عوام کی خواہشات کے آئینہ دار ہوں۔ ظاہر ہے کہ جدید حکومتوں کے تنظیمی ڈھانچے اور ان کے مسائل کو ایک عام فرد کے لئے سمجھنا مشکل ہے۔ علم سیاسیات کے مطالعہ سے ہر شہری کو امور حکومت سے متعلق تمام باتوں کا پوری طرح علم ہو جاتا ہے۔

## طرز عمل کی اصلاح:

علم سیاسیات کے مطالعہ سے شہریوں کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس قسم کے دستوری

ذرائع سے وہ اپنے جائز مطالبات منظور کروا سکتے ہیں۔ بالفرض اگر حکومت اپنے اصل فرائض سے پہلو تہی کر رہی ہو تو شہریوں کو قانونی حدود کے اندر رہتے ہوئے یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ حکومت کے طرز عمل کو درست کریں۔

علم سیاسیات کے مطالعہ سے شہریوں کو ایسے قانونی ذرائع کی اہمیت اور ان کے استعمال سے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں اور وہ غیر دستوری ذرائع استعمال کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ غیر قانونی ذرائع کے استعمال سے نہ صرف اصل مقصد کا حصول مشکل ہو جاتا ہے بلکہ تباہی و بربادی قوم کا مقدر بن جاتی ہے۔

### حالات و واقعات سے آگاہی:

علم سیاسیات ایک معاشرتی علم ہے جس کا دوسرے معاشرتی علوم سے گہرا تعلق ہے۔ آج کے بیشتر سیاسی مسائل کی نوعیت کو جاننے کے لئے تاریخ، معاشیات، نفسیات اور اخلاقیات سے مدد لینا پڑتی ہے کیونکہ معاشی، سماجی اور مذہبی تصورات سیاسی حالات پر اثر انداز ہوتے ہیں چنانچہ علم سیاسیات کے مطالعہ سے ایک فرد کو تاریخی حقائق، ملک کے معاشی مسائل اور ملک کی نظریاتی اساس سے متعلق معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ دراصل ان تمام پہلوؤں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی فرد اس قابل ہوتا ہے کہ اپنے ملک کے سیاسی مسائل حل کرنے میں نمایاں کردار ادا کر سکے۔

### اجتماعی مفادات کی فوقیت:

ہر ریاست کے اندر مختلف ادارے مختلف النوع مقاصد کے حصول کے لئے سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ آج کا شہری بیک وقت کئی اداروں کا رکن ہوتا ہے جبکہ بعض افراد اس کے ساتھ ساتھ مختلف سیاسی اداروں سے بھی وابستگی رکھتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ ہر شہری اپنی وفاداریوں کو صحیح ترتیب دے سکے۔ اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اپنے کس قسم کے مفادات کو اجتماعی مفادات پر قربان کر دینا چاہئے۔

### اعلیٰ جمہوری اقدار:

جمہوری نظام حکومت کو چلانے کے لئے سیاسی اخلاقیات کے اصولوں کی پاسداری ضروری ہے۔ جمہوری نظام اس وقت تک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا جب تک معاشرہ میں اعلیٰ جمہوری اقدار موجود نہ ہوں۔ جمہوری نظام میں مختلف النوع نظریات کے پیچھے کی اجازت ہوتی ہے۔ ہر شہری سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ مختلف نظریات کو تحمل سے سنے اور قانونی حدود میں رہتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ اسی طرح سیاستدانوں اور سیاسی جماعتوں کے

لئے بھی ضابطہ اخلاق کی پابندی ضروری ہے۔ علم سیاسیات عوام اور سیاسی قائدین کو سیاسی اخلاقیات سے روشناس کراتا اور انہیں اعلیٰ جمہوری اقدار اپنانے کا درس دیتا ہے۔

## سیاسی نظریات کی مختصر تاریخ

تخلیق انسانی کا اصل مقصد یہ ہے کہ ایک خاندان وجود میں آئے جو ارتقائی مراحل طے کر کے ایک معاشرے اور پھر ایک قوم کی شکل اختیار کر جائے۔ پھر اس خاندان، معاشرے یا قوم کو نظم و ضبط کا حامل بنانے کے لئے چند ایک اصول و ضوابط کا پابند بنانا ضروری تھا۔ بعد ازاں حالات و واقعات کے تغیر و تبدل کے نتیجے میں ان اصول و ضوابط کو بھی معاشرتی ضروریات کے مطابق ڈھالنا تھا کیونکہ ضروریات اور واقعات کے پیش نظر تبدیلی بھی ایک متحرک و فعال معاشرے کی دلیل ہے لہذا انسان اور اس کے رہن سہن کے لوازمات بود و باش اور طور طریقہ معاشرہ کہلائے اور اس معاشرہ کو چلانے کے لئے اصول و قواعد کی تخلیق کرنے والوں، ان کی تنقید کرنے والوں اور انہیں بروئے کار لانے والوں کو صاحب اختیار سیاسی اداروں کا نام دیا گیا۔ چنانچہ انتظامیہ بھی سیاست کے زیر اثر ہو کر کار فرما ہونے لگی۔

جوں جوں وقت گزر رہا گیا، سیاست اپنے رنگ بدلتی گئی۔ انسانی فکر میں تغیر آیا، بود و باش کے طریقوں میں تبدیلی آئی اور دنیا کی جغرافیائی و طبعی تقاضوں کے تحت مختلف اقوام نے اپنی سہولت کے لئے مخصوص اصول وضع کر کے ان پر عمل کیا۔ اس طرح مختلف ممالک میں انداز سیاست بھی مختلف طریقے سے عمل پیرا ہوئی۔ جس ملک اور قوم کو جو طریقہ حکومت زیادہ مناسب لگا اس نے وہی اپنایا۔ اس طرح مختلف ادوار میں اور مختلف ملکوں میں نوع نوع سیاسی افکار کی حکومتیں رہیں اور تبدیل ہوتی رہیں۔

انسان نے اپنی اجتماعی زندگی کی ترتیب و تہذیب کے لئے جو ادارے قائم کئے ان میں ریاست کا ادارہ سب سے اہم اور بنیادی ہے۔ ریاست وہ ہیئت سیاسی ہے جس کے ذریعے ایک ملک کے باشندے ایک باقاعدہ حکومت کی شکل میں اپنا اجتماعی نظم قائم کرتے ہیں چنانچہ پوری انسانی تاریخ ریاست کے قیام اور استحکام اس کی تنظیم و تہذیب اور اس کے فروغ و ارتقاء کی تاریخ ہے۔ دور حاضر میں اجتماعی زندگی میں مختلف الانواع پیچیدگیوں کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے ریاست کا دائرہ کار بڑھتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں ریاست کا کام محض امن و امان قائم رکھنا ہی نہیں رہ گیا ہے بلکہ اجتماعی عدل اور سماجی انصاف کا قیام بھی ریاست کے سپرد ہو گیا ہے۔ آج ریاست و معاشرے کے لئے ایک مثبت کردار ادا کرنے والا ایک با اختیار ادارہ جانا جاتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہے۔

## قدیم ترین مہذب اقوام:

تاریخ طبری کے مطابق تاریخ میں قدیم ترین مہذب اقوام میں جن ممالک کا شمار ہوتا ہے ان میں یونان، بابل، مصر، چین، روم، ہندوستان اور ایران شامل ہیں۔ تقریباً 2000 سال قبل مسیح بابل میں ایک متمدن قوم نے ایک مضبوط حکومت بنا کر اپنا جاہ و جلال دکھایا لیکن وہاں کے اکابرین نے حکومت و ریاست میں الوہیت کا رنگ پیدا کر دیا جس کی بناء پر پوری کی پوری قوم ایک عجیب عذاب میں مبتلا ہوئی چنانچہ لوگوں نے الوہیت کے اس نظریہ کے داعی لوگوں کو یکسر مسترد کر کے قابل عمل سیاست کی بنیاد رکھی۔ ایسی سیاست جس میں محض مطلق العنانیت پر مبنی حکمرانی نظر نہ آتی ہو بلکہ رعایا میں سے بھی کچھ نمائندگی ہو جو رعایا کے مسائل کو مکاحقہ ارباب اختیار تک پہنچا سکیں۔

## ارسطو:

یونانی فلسفی ارسطو نے تسلیم کیا تھا کہ انسان ایک سیاسی حیوان ہے جس کو مضبوط زندگی گزارنے کے لئے خوراک اور بود و باش کی سہولتوں کے علاوہ ایک ریاست کی ضرورت ہے جس کو چلانے کے لئے کوئی مقتدر انسان ہو چنانچہ یونانیوں نے سلطنت کو خود سلطنت کی غایت تصور کیا۔ سلطنت اصل تھی اور جمہور اس کے ماتحت اجزاء۔ اس طرح ہر فرد سلطنت کا خدمت گزار تھا۔

## کنفیوشس اور مہاتما بدھ:

چین کے قدیم پیشوا کنفیوشس اور ہندوستان کے روحانی رہنما مہاتما بدھ کے تصورات کے مطابق حکومت میں کچھ باتیں اچھی نظر آتی ہیں کیونکہ سیاست کسی بھی معاشرہ میں جہاں حکومت کی قوت حاصل کرنے کے لئے کچھ لوگوں کے درمیان رسد کشی کا موجب بنتی ہو وہاں جمہوری طور پر ہر انسان زندگی گزارنے کے لئے سیاسی نظام میں خوبیاں بھی موجود ہوتی ہیں۔ کوئی بھی حکمران متان صورت اس نظر ہے کہ حقیت ہاتھ میں نہیں تھامتا کہ وہ حاکم بننے ہی اس معاشرے کو تھیں نہیں دے گا جس میں سے وہ ابھر کر اس قدر بلند درجے تک پہنچا ہے البتہ ہندوستان کے سیاسی میدان میں ایک نظریہ اور بھی نظر آتا ہے جس کو نظریہ کوٹلیا کہتے ہیں۔ اس نظریہ کی زد سے باج سے پہلے نزاع کی کیفیت ہوتی ہے۔ ہر شخص خود غرض ہوتا ہے اور انسان کی کیفیت ایک بڑے سردر میں مچھلیوں کی سی ہوتی ہے۔ یعنی ہر طاقتور مچھلی کمزور مچھلی کو کھانے کے درپے ہوتی ہے۔

”کوٹلیا“ اس صورت حال کو بھی منطق مابہی سے تعبیر کرتا ہے۔

مولانا حامد الانصاری اپنی کتاب ”اسلام کا نظام حکومت“ میں درج ذیل نظریات کا ذکر کرتے ہیں:

## 1- نظریہ آبائی:

آبائی معاشرہ کتبہ اور قبیلہ دونوں پر حادی رہا ہے۔ کتبہ اس معاشرے کی چھوٹی حکومت ہے اور قبیلہ بڑی۔ مذہبی دور میں حضرت آدم علیہ السلام بنی ابراہیم اور بنی اسرائیل کی حکومتوں میں آبائی معاشرہ کا رنگ صاف نمایاں ہے۔ ارسطو کے زمانے سے لے کر انیسویں صدی عیسوی تک مشکل سے ایسا دور گزرا ہوگا جس میں علمائے ریاست کی ایک نہ ایک جماعت نے نظریہ آبائی پر اس کی تائید میں قلم نہ اٹھایا ہو۔

## 2- نظریہ جبر:

حکومت ظلم و جبر کا نتیجہ ہے جس کی لاشی اس کی بھینس جس میں طاقت اس کی حکومت۔ جو قہر و غلبہ سے تسلط حاصل کرنے وہی سلطنت کا مالک ہے۔ اس نظریے کے ماتحت قوت ہی حق کی دلیل ہے۔ ”پلوٹارک“ (میونخ کیلوی)..... ”برنیوس شاہ گال“ (قدیم یونانی مفکر) کی زبان سے یہ نظریہ ادا کیا ہے کہ تمام قوانین میں سب سے قدیم تر قانون وہ ہے جو قوی کو کمزور پر حکمران بناتا ہے۔ اکثر فلسفی بھی ہم کو یہی بتاتے ہیں اور ان میں سے زیادہ مطلق العنان جابر بادشاہ ہمیں یہی باور کرانا چاہتے ہیں کہ حکومت نظریہ جبر پر قائم ہے۔

## 3- نظریہ معاہدہ عمرانی:

حکومت حکمران اور عوام کے درمیان ایک معاہدہ ہے۔ گویا جب عوام بد نظمی سے گھبرا گئے تو انہوں نے اپنی خوشی سے اپنے اختیارات حکمران کے سپرد کر دیئے۔ اس نظریے کے ماتحت رائے عامہ کا اختیار باقی رہتا جس کا قدرتی نتیجہ جمہوری انقلاب ہے۔ یہ تصویر اپنی حقیقت کے اعتبار سے نظریہ جبر کے برعکس ہے۔

ایک اور خیال کے مطابق فطرت یعنی قدرت ایک ایسی سوسائٹی تشکیل دینا چاہتی تھی جو اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے اپنی صلاحیتوں کو باہمی امداد کے ذریعے استعمال کر کے افادیت، انزاس دینا اور رونق جہاں کا باعث بنے۔ اس لئے انسان کو سماج پسند پیدا کیا۔ فطری طور پر انسان نہ تو اکیلا رہ سکتا ہے اور نہ ہی بے لگام زندگی گزارنا چاہتا ہے۔

## قدیم یونانی سیاسی فلسفہ:

چار سو سال قبل مسیح میں یونان میں باقاعدہ اجتماع اور سپارٹا نامی تدریس گاہیں موجود تھیں۔ ان دونوں تدریس گاہوں میں خوشگوار مقابلے کا ماحول تھا۔ یونانی لوگ اس بات پر بھی

دنیا کی دوسری قوموں پر فوقیت رکھتے تھے کہ وہ ہر چیز کو تنقیدی اور تحقیقی نظر سے دیکھتے تھے۔ یونانی لوگ ہر وقت سوچ بچار میں لگے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہاں پر چھوٹی چھوٹی شہری ریاستیں تھیں ہر ریاست کے اپنے قوانین تھے۔ لوگ اپنی ریاست کے قوانین کی سختی سے پابندی کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ جب سقراط کو اس کے دوستوں نے مشورہ دیا کہ یونانی حکومت نے تمہیں موت کی سزا سنائی ہے تو تم یہاں (جیل) سے بھاگ جاؤ تو سقراط نے یہ کہہ کر فرار ہونے سے انکار کر دیا کہ میں اپنی ریاست کے قانون کو نہیں توڑ سکتا۔

شہری ریاستوں میں تین قسم کے طبقے پائے جاتے تھے ان طبقات کو جاننا تہا بہ ضروری ہے کیونکہ یونانی سیاسی فلسفے کی بنیاد ہی یہ طبقات ہیں اور سارا یونانی فلسفہ انہی طبقات کے گرد گھومتا ہے۔

یونانی شہری ریاستوں میں طبقات کی درجہ بندی کچھ اس طرح تھی:

1- جاگیردار طبقہ

2- کاروباری طبقہ

3- غلام طبقہ

یونانی لوگ جاگیردار طبقے کو ہی ریاست کا والی وارث تصور کرتے تھے اور یہ لوگ ہی ریاست کے شہری مانے جاتے تھے اور دوسرے دونوں طبقے پہلے طبقے کے لئے کام کرتے تھے۔ مثال کے طور پر کاروباری طبقہ ان کے مال و اسباب کی دیکھ بھال کرتا تھا جس میں زمینوں اور اس سے متعلقہ تمام امور کا حساب کتاب وغیرہ جبکہ غلام طبقہ ان کے گھریلو کام کاج کرتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دوسرے دونوں طبقے پہلے طبقے کے کام کاج کے لئے ہوتے تھے اور وہ ریاست کی کسی سرگرمی میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ یونانی لوگوں کے مطابق دوسرے دونوں طبقوں کو جاگیردار طبقے کا غلام بن کر رہنا چاہئے کیونکہ ان میں ایک اچھا شہری بننے کی خوبیاں نہیں ہیں۔ یونان میں صرف ان لوگوں کو شہریت حاصل تھی جو ریاست کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور باقی دونوں طبقے ان کے کام کرتے تھے۔

## اسلامی عہد میں سیاست

اسلامی عہد میں ارقم بن ارقم کے مکان میں خفیہ اجتماعات امت کی تنظیم کا نتیجہ نیک کام شروع ہوا تھا جس کی تکمیل اس وقت ہوئی جب مدینہ طیبہ نبوت اور خلافت کا پایہ تخت بن گیا۔ مکہ میں ملت ابراہیمی کی شیرازہ بندی بین الاقوامی تعلقات کے لئے اصولی ہجرت کا انشاء اور اسلامی معاشرہ کے استحکام کے لئے بیعت (اجتماعی حلف) کا نفاذ مدینہ میں انصار و مہاجرین کے بھائی چارہ کی تشکیل بدر کی جنگ حدیبیہ کی صلح، مکہ کی فتح، فتح کے بعد انسانی مساوات اور امن



آزادی اور اخوت کا اعلان عالمِ مسلمین عالم کے درباروں میں سفیروں کی روانگی، بیرونی سفیروں کی عدتہ میں باریابی، صوبائی تنظیم، حکام کا تقرر، فرامین کا اجراء اور عقیدہ کی شورائی مجلس میں رائے عامہ سے منصب حکومت کا فیصلہ یہ ایسے کارنامے ہیں جن کا تعلق سر تا سر اسلامی سیاست سے تھا۔ اسلام کی تاریخ حکمرانی:

اسلام کی تاریخ حکمرانی پر سیاسی نقطہ نظر سے غور کریں تو سیرت ابن ہشام، تاریخ طبری، تاریخ ابن کثیر، تاریخ فتوحات اسلامیہ میں جا بجا اسلامی سیاست کے آثار ملتے ہیں۔ زمانہ حال کے فاضل مؤرخ اور عالم اجتماعیات محمد کروعلی نے اپنی کتاب ”الاسلام والحضارة العربیہ“ جلد دو میں ”السیاسة فی الاسلام“ کے عنوان کے تحت اسلامی سیاست کے ہر دور کے واقعات پیش کئے ہیں۔

### جولیو کسٹلاٹ کا اعتراف:

مسٹر جولیو کسٹلاٹ اپنی کتاب ”قانون تاریخ“ میں کھلے دل سے ان عظیم ترقیوں کا اعتراف کرتے ہیں جس کا اظہار خلافت راشدہ کے سیاسی دور میں ہوا وہ لکھتے ہیں:

”ایسا معلوم ہوا ہے کہ دنیا دائرہ اسلام میں آنے کے لئے تیار تھی۔“

حضرت محمد ﷺ کے بعد اسلامی تمدن آنا فانا بروئے کار آیا۔ دسویں صدی عیسوی سے چودھویں صدی تک تو ایسا زمانہ گزرا ہے جب یورپ میں اس تمدن کے علاوہ اور کوئی تمدن نہ تھا۔“

### کاؤنٹ ہنری کا اعتراف:

کاؤنٹ ہنری لکھتے ہیں:

”ابھی سو سال نہ ہوئے تھے کہ اسلام کی حکومت سب جگہ پر چھا گئی اور دنیا کی کوئی طاقت اس کو ابھرنے، اوپر اٹھنے اور ساری کائنات تک اپنی روشنی پہنچانے میں مانع نہ ہو سکی۔“

### سیاست میں ارتقاء:

غید نبوی ﷺ میں سیاست کے بنیادی اصول متعین صورت میں سامنے آئے اور خلافت راشدہ میں سیاسی حکمت عملی کا آفتاب نصف النہار تک پہنچ کر مشرق و مغرب کے سر پر طلوع ہوا۔ خلافت راشدہ کے بعد اگرچہ امامت و خلافت کے تصورات نے سلطنت و شہنشاہیت کی شکل اختیار کر لی لیکن صدیوں تک اسلامی سیاست کے اثرات موجود رہے۔

# اسلامی ریاست کے اہم خصائص اور اساسی تصورات

ہجرت مدینہ کے فوراً بعد رسول اللہ ﷺ نے اسلامی ریاست کی بنیاد رکھ دی۔ آپ ﷺ اس ریاست کے اوّل شہری تھے آپ ﷺ نے ریاست کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے تمام شہریوں کے حقوق و فرائض متعین فرمائے جن پر خود بھی سختی سے کاربند رہے اور حکومت کی سطح پر ان کے تحفظ کی ضمانت مہیا کی۔ آپ ﷺ کے مقررہ کردہ اصول اور ضابطوں سے پورے عالم کے انسانوں نے نہ صرف راہنمائی حاصل کی بلکہ انہیں انسانی بنیادی حقوق کے قوانین کا درجہ دیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس ریاست میں شہریوں کو بنیادی حقوق کے تحفظ کی ضمانت حاصل نہ ہو جس معاشرے میں لوگوں کو جان مال اور عزت و آبرو کا تحفظ حاصل نہ ہو وہاں لوگوں کے لئے امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے جو اصول اور ضابطے مقرر فرمائے اور پھر لوگوں کو ان پر عمل کر کے دکھایا، ان میں اسلامی ریاست کے شہریوں کو تمام بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔

رسول اقدس ﷺ نے شہریت کے اس پہلو کا آغاز مدینے میں قدم مبارک رکھتے ہی کر دیا تھا۔ آپ ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں کے شہریوں کے ساتھ معاہدہ کیا جو ”بیثاق مدینہ“ کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدے کے ایک فریق مدینہ منورہ کے یہودی بھی تھے۔ آپ ﷺ نے حتی الامکان اس معاہدے کو نبھانے کی کوشش فرمائی۔ بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے اس دستاویز کی رو سے مدینہ شریف کے شہریوں کے لئے امن و سکون اور اطمینان و استحکام کی بنیاد رکھ دی تھی۔

اسی طرح آپ ﷺ نے مسلمانوں کے دو عناصر مہاجرین و انصار کے درمیان ”مواخات“ اور بھائی چارہ قائم فرما کر مسلمانوں کا ایک بہت بڑا معاشرتی اور معاشی مسئلہ نہایت عمدہ طریقے سے حل فرمایا۔

## اہم خصائص:

اسلامی طرز حکومت چاند سورج کی طرح اپنا روشن وجود رکھتا ہے اور اس وجود کے ساتھ اس کی وہ تمام خصوصیات وابستہ ہیں جن کی بناء پر دنیا کے نظام ہائے حکومت کے مقابلہ میں اس کا امتیاز معلوم ہوتا ہے۔ اس طرز کو دنیائے قدیم اور دنیائے جدید کے کسی نظریہ حکومت سے مکمل مطابقت نہیں دی جاسکتی۔ ارسطو کے زمانہ سے اس وقت تک حکومت کے بہت سے نظریئے دنیا کے سامنے آچکے ہیں لیکن ان میں سے کسی میں وہ تمام باتیں موجود نہیں ہیں جن کا اسلام کے طرز حکومت میں سمجھا ہوا ضروری ہے۔

اسلامی طرز حکومت میں ہر حکومت کا اچھا پہلو نظر آتا ہے اور ہر فاسد پہلو اس کے وارہ تصور سے خارج ہو جاتا ہے۔ اس کو کسی ایک نظریہ کے مطابق ظاہر کرنے سے زیادہ یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ ایک مثالی اور معتدل طرز حکومت ہے جس میں تمام نظریوں کا اعتدال موجود ہے۔

اسلامی طرز حکومت چند بنیادی اصولوں پر مبنی ہے جن کو تسلیم کرنے کے بعد اسے ترقی پذیر طرز حکومت کہنا عین صحیح ہوگا کیونکہ یہ اپنی بنیادوں پر قائم ہونے کے بعد ہر زمانہ کے ترقی یافتہ حالات اور ضروریات سے مطابقت پیدا کر سکتی ہے۔ یہی وہ اصول ہیں جن کو ذہن نشین رکھنے سے دوسرے نظریات حکومت سے اس کا جزوی اور کلی امتیاز سامنے آ جاتا ہے۔ اس میں بادشاہت کی مرکزی شان اور اقتدار اعیان حکومت کی بجائے جمہوریت کی ہمہ گیر حقوق پسندی اور فرض شہائی اشتراکیت کا ہمہ گیر جذبہ مساوات اور احساس دردمندی آمریت (ڈکٹیٹر شپ) کی مرکزیت اور طاقت کمال اعتدال کے ساتھ جمع ہیں۔

فرق اتنا ہے کہ دوسرے نظریات اپنی خوبیوں کے گراں بار دامنوں کو حکمت عملی کے میدان میں نہیں سنبھال سکے۔ اسلامی حکومت نہ صرف یہ کہ ان تمام خوبیوں کی اہمیت ہے بلکہ ان پر عمل پیرا ہونے میں کامیاب ہو چکی ہے۔

## اسلامی حکومت کے بنیادی اصول

مستور نبی کریم ﷺ کے اقوال اور آپ ﷺ کی سیرت مطہرہ کی روشنی میں ان تمام حقوق کا جائزہ لیں جو بحیثیت انسان شہریوں کو حاصل ہیں اور جن کی رعایت کرنے سے ہر شہری کی زندگی امن و سکون کا گہوارہ بن جاتی ہے۔

## قانون کی پابندی:

ہر شہری کی یہ ذمہ داری ہے کہ ریاست کے قانون کی پابندی کرے۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنی ذات مبارکہ کو بھی ریاست کے قانون کا پابند بنایا۔ آپ ﷺ کے دست مبارک سے

اگر کسی کو معمولی سی تکلیف بھی پہنچتی تو اپنے آپ کو بدلے کے لئے پیش فرما دیتے۔ آپ ﷺ نے قانون کے نفاذ میں کبھی بھی کسی سفارش یا کسی منصب و مقام کو رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ قریش کے معزز خاندان بنو مخزوم کی ایک عورت پر جب چوری کا الزام ثابت ہو گیا تو لوگوں کے کہنے پر حضور نبی کریم ﷺ کے محبوب خادم حضرت اُسامہ بن زیدؓ نے سفارش کی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”پہلی قومیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ اُن کے بڑے جرم کرتے تھے تو

چھوڑ دیئے جاتے تھے اور غرباء پر حد جاری کرتے تھے۔ خدا کی قسم! اگر میری

بٹی فاطمہ بھی چوری کرتے تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔“

آپ ﷺ نے شہریوں پر بھی حکام کی اطاعت کو لازمی قرار دیا۔ اس بارے قرآن مجید

کا واضح ارشاد ہے:

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور اُن

لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔“

اس بارے میں یہ یاد رکھئے کہ احکام کی اطاعت ہر جائز و ناجائز کام میں بغیر تحقیق کے

نہیں کی جائے گی بلکہ اطاعت صرف جائز امور میں ضروری ہے اور گناہ کے کاموں میں

حکمرانوں کی اطاعت منع ہے۔

حضور رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لئے کوئی اطاعت نہیں۔“

اس ضمن میں دوسری حدیث مبارکہ ہے:

”اللہ اور رسول ﷺ کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں۔ اطاعت صرف معروف میں

ہے۔“

بلکہ ایسے حکمران کے خلاف کلمہ حق کہنا سب سے بڑا جہاد ہے جو ظالم اور فاسق و قاجر

ہو: ”ظالم سلطان کے خلاف کلمہ حق بلند کرنا افضل ترین جہاد ہے۔“

تحفظ جان:

اسلام میں انسانی جان کس قدر محترم ہے اس کا اندازہ قرآن مجید کی اس آیت سے کیا

جاسکتا ہے:

”جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ

سے قتل کیا اُس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کیا اور جن نے کسی کی جان بچائی اُس نے گویا تمام

انسانوں کو زندگی بخشی۔“

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

”ایک آدمی کے قتل پر اگر آسمان و زمین کی سب مخلوق بھی متفق ہو جائے تو اللہ ان سب کو سزا دیے بغیر نہ چھوڑے گا۔“

اسلام نے چند مخصوص صورتوں مثلاً قصاص، جہاد اور حدود شرعیہ کے علاوہ کسی بھی حالت میں انسانی جان کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دی۔

### قتل اولاد:

ظہور اسلام سے پہلے اہل عرب اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل کر دیتے۔ لڑکیوں کی پیدائش کو اپنے لئے باعث تنگ و عار سمجھ کر انہیں زندہ درگور کرنا عزت و بہادری کی علامت سمجھتے۔ نبی رحمت ﷺ کی تشریف آوری کی بدولت ان بے قصور جانوں کو بھی زندہ رہنے کا حق ملا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

”اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ تمہیں بھی ہم رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی ہم دیں گے۔“

نیز فرمایا کہ بچوں کو زندہ درگور کرنے کے جرم پر قیامت کے دن سخت باز پرس ہوگی:

”جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی؟“

### قتل مومن:

کسی مومن کو قتل کرنا کتنا سنگین جرم ہے؟ اس بات کا اندازہ اس حدیث سے کیجئے:

”کسی مسلمان کے قتل کے مقابلے میں پوری دنیا کا زوال اللہ کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔“

اللہ عز و جل نے ارشاد فرمایا:

”وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرتا ہے اس کی سزا جہنم ہے اور اُس پر اللہ کا غضب اور لعنت ہے اور اللہ نے اُس کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔“

نبی کریم ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا:

”لوگو! تمہارے خون، مال اور عزتیں ایک دوسرے پر قطعاً حرام کر دی گئیں۔ ہمیشہ کے لئے ان چیزوں کی حرمت ایسی ہے جس طرح آج تمہارے اس دن کی اس مبارک مہینے کی اس شہر مکہ میں ہے۔ خبردار! ایسا نہ ہو کہ تم میرے بعد ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو اور کفار کے زمرے میں شامل ہو جاؤ۔“

## خودکشی:

تحفظ جان کا صرف یہ مطلب نہیں کہ دوسروں کو نہ قتل کیا جائے بلکہ اسلام میں جس طرح دوسروں کی جان لینے کو ممنوع ٹھہرایا گیا ہے اسی طرح خود اپنی جان کو بھی ہلاکت میں نہ ڈالنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس طرح خودکشی کا راستہ بند کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔“

## غیر مسلم کو قتل کرنا:

اسلام نے صرف مسلمان کے خون کو ہی محترم قرار نہیں دیا بلکہ غیر مسلم کے خون کی حرمت کو بھی تسلیم کیا ہے البتہ جو غیر مسلم دین حق کی راہ میں رکاوٹ بننے ہوں یا مسلمانوں کے خلاف جارحیت کے مرتکب ہوں اور اسلامی ریاست کا وجود مٹانے کے دسپہ ہوں ان لوگوں سے جنگ کرنے اور انہیں قتل کرنے کی نہ صرف اجازت بلکہ حکم دیا گیا ہے۔ اس صورت کے سوا غیر مسلموں کے قتل کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

”جس نے کسی ذمی کو قتل کیا اللہ تعالیٰ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے۔“

ایک اور حدیث ہے:

”جس نے کسی معاهد غیر مسلم کو قتل کیا وہ کبھی جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکے گا۔“

ایک مرتبہ کسی غزوہ میں مشرکین کے چند بچے زد میں آ کر ہلاک ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ کو سخت دکھ ہوا۔ بعض صحابہ نے عرض کیا: یہ تو مشرک بچے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

”مشرک بچے بھی تم سے بہتر ہیں۔ خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو۔ خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو۔ ہر جان خدا ہی کی فطرت پر پیدا ہوتی ہے۔“

ایک غزوہ میں ایک عورت ہلاک ہوئی آپ ﷺ اس کی لاش کو دیکھ کر سخت رنجیدہ ہوئے اور فرمایا:

”جاؤ خائفہ سے کہہ دو کہ عورتوں، بچوں اور معذوروں کو قتل نہ کرو۔“

اسلامی ریاست کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے عین رات جنگ میں بھی حضور نبی کریم ﷺ نے اپنی ریاست کے شہریوں کی جانوں کے تحفظ کا کس قدر اہتمام فرمایا! فتح مکہ کے واقعات سے اس کا آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ مکہ میں شاید ہی کوئی شخص ایسا تھا جو بلا واسطہ یا بلا واسطہ آپ ﷺ کی اور آپ ﷺ کے صحابہ کی اذیت کا سبب نہ بنا ہو۔ آج آپ ﷺ کو اس بات پر پوری قدرت حاصل تھی کہ ایک ایک کی بُرائی کا بدلہ چکاتے مگر انتقام لینے کی پوری قدرت کے باوجود رسول کریم ﷺ نے اُن کی جان بخشی اور امان حاصل کرنے کی بہت سی

آسان صورتوں کا اعلان فرمایا۔ فتح مکہ کے بعد عام اجتماع میں مجرموں سے ان کے جرائم کا اقرار کرا لینے کے بعد آپ ﷺ نے اعلان فرمایا:

”تم پر آج کوئی گرفت نہیں ہے۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔“

**تحفظ ملکیت:**

- 1- اسلام نے مال کے معاملے میں ہر شہری کو یہ حق دیا ہے کہ:
- جائز اور حلال ذرائع سے مال کمائے اور شریعت کے مقرر کردہ حقوق کی ادائیگی کی پابندی کے ساتھ اُسے اپنی ملکیت میں رکھے۔
- 2- اپنے مال کو جائز ضروریات میں استعمال کرے۔
- 3- مزید نفع حاصل کرنے کے لئے مال کو کاروبار میں لگائے۔
- 4- اپنے مال کو کسی وارث کے جائز حقوق کو متاثر کئے بغیر دوسرے شخص کی ملکیت میں منتقل کرے۔

حضور نبی کریم ﷺ نے مسلمان کی جان اور عزت و آبرو کی طرح اس کا مال بھی دوسرے مسلمانوں پر حرام قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ایک مسلمان کا سب کچھ دوسرے مسلمان پر حرام ہے اُس کا خون، اُس کی عزت و آبرو اور اُس کا مال۔“

خطبہ جتہ الوداع میں نبی کریم ﷺ نے حرمت جان کے ساتھ حرمت مال کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ پہلے ہی ”تحفظ جان“ کے عنوان کے تحت گزر چکا ہے۔ تحفظ ملکیت کے حق کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے کیجئے:

”جو شخص اپنا مال بچانے میں مارا جائے وہ شہید ہے۔“

قرآن کریم کا واضح حکم ہے:

”اور تم باطل طریقے سے ایک دوسرے کے مال نہ کھاؤ۔“

کسی کی زمین ناجائز طور پر چھیننے کے بارے میں رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

”جس شخص نے کسی کی ایک بالشت برابر بھی زمین ظلم کر کے لی اس کی گردن میں اس کے برابر ساتوں زمینوں کا طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا۔“

اگر حکومت کو اجتماعی مفاد کے لئے کسی کی ذاتی ملکیت اپنے قبضے میں لینے کی ضرورت پڑ جائے تو ضرورت ہے کہ وہ مالک کی رضامندی سے پورا معاوضہ دے کر حاصل کی جائے۔ دو قیمتی بچوں نے مدینہ میں اپنی ملکیتی زمین مسجد نبوی کے لئے بلا قیمت حضور نبی کریم ﷺ کو پیش کی تھی مگر آپ ﷺ نے وقت کی عام شرح کے مطابق پوری قیمت دے کر زمین حاصل کی۔

غزوہ تبوک کے موقع پر رسول کریم ﷺ نے صفوان بن امیہ سے چند زرہیں حاصل

کیں۔ جب اُس نے کہا: کیا آپ ﷺ بلا معاوضہ لینا چاہتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں یہ مستعار ہیں۔ ان میں سے جو ضائع ہوں گی اُن کا معاوضہ دیا جائے گا۔

اسلام نے دوسرے کا مال اُس کی رضامندی اور دلی خوشی کے بغیر ہتھیانے کی تمام صورتوں مثلاً چوری، دیکیتی، غصب، جوا، سود وھوکا اور خیانت کو ناجائز قرار دیا۔ چوری بھی چونکہ دوسرے کی ملکیت پر بے جا زیادتی ہے اس لئے اسلام نے اس کی انتہائی سخت سزا مقرر کی۔ ارشاد الہی ہے:

”اور چور خواہ مرد ہو یا عورت، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ اُن کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرت تاک سزا ہے۔“

### تحفظ آبرو:

عزت و آبرو کے معاملے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ معاشرے کا ہر فرد صاحت عزت ہے۔ اس بارے میں اسلام حاکم، محکوم، امیر، غریب اور کسی اونچ نیچ کا کوئی فرق روا نہیں رکھتا لہذا اسلامی ریاست کے ہر شہری کا ایک اہم حق ہے کہ اس کی عزت و آبرو کا تحفظ کیا جائے۔

اسلام میں اُن تمام امکانی صورتوں سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے جن سے دوسرے مسلمانوں کی بے عزتی اور بے آبروئی ہوتی ہو چنانچہ قرآن مجید میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے:

- 1- ایک دوسرے کا مذاق نہ اُڑایا جائے۔
- 2- ایک دوسرے کو عیب نہ لگایا جائے اور لعن طعن نہ کیا جائے۔
- 3- ایک دوسرے کو بُرے ناموں اور بُرے القاب سے یاد نہ کیا جائے۔
- 4- بدگمانی سے احتراز کیا جائے۔
- 5- دوسروں کی غیبت اور بدگمانی نہ کی جائے۔
- 6- ایک دوسرے کے عیوب اور خامیاں تلاش نہ کی جائیں۔

حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

”جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرتا ہے اللہ عز و جل قیامت کے دن اُس کی پردہ پوشی کرے گا۔“

رسول اللہ ﷺ کا ایک اور ارشاد مبارک ہے:

”جو شخص اپنی عزت کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے، شہید ہے۔“

خطبہ حجۃ الوداع میں نبی کریم ﷺ نے جان و مال کے ساتھ ہی حرمت آبرو کا بھی حکم دیا ہے۔

رسول اقدس ﷺ نے لوگوں کی توجہیں و تذلیل کرنے اور انہیں بلاوجہ مارنے پٹنے سے



منع فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

”مسلمان کی پشت محترم ہے (اس کی پٹائی نہیں کی جاسکتی) الا یہ کہ اُس نے سزا کے قابل جرم کیا ہو۔ جس نے بلا وجہ کسی مسلمان کو مارا اُس پر خدا غضب ناک ہوا۔“

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

”جس نے کسی دوسرے کی بے عزتی یا آبروریزی کی ہو یا کوئی اور ظلم کیا ہو وہ آج معاف نہ کرا لے۔ اس دن سے پہلے جب نہ کوئی روپیہ پیسہ ہو گا نہ مال دولت البتہ جو نیک عمل اُس کے پاس ہو گا وہ لے لیا جائے گا (اُس ظلم کے برابر) اور اگر نیک عمل نہ ہو گا تو مظلوم کی برائیوں اُلے کر اُس پر اہل دی جائیں گی۔“

اسلام میں یوں تو ہر فرد کی عزت و آبرو کے تحفظ پر زور دیا گیا ہے لیکن خواتین کی عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے غیر معمولی تحفظات کا اہتمام کیا گیا ہے۔ سورہ انور میں مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو الگ الگ حکم دیا گیا ہے کہ اپنی لگاؤں میں پتلی رکھیں اور اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کریں۔“

”سورہ انور میں دوسری جگہ پاک دامن عورتوں پر جہتیں لگانے والوں کو اللہ عزوجل نے دنیا و آخرت میں ملعون قرار دیا ہے اور انہیں سنگین سزا کی وعید سنائی ہے۔

نچی زندگی کا تحفظ:

اگر آپ کو ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہے کہ آپ کے گھر یا چار دیواری کے اندر کے معاملات پر کوئی شخص تاکہ جھانک یا دیگر ذرائع سے مطلع ہونے کی کوشش کر رہا ہے یا مخفی حالات معلوم کرنے کے درپے ہے یا آپ کے عیوب اور خامیاں معلوم کرنے کے لئے جاسوسی کر رہا ہے تو یقیناً آپ کے نئے آزادی و سکون کی فضاء میں سانس لینا محال ہو جائے گا۔ آپ کا گھر آپ کے لئے قید خانے کا سماں پیش کرے گا۔ اس چیز کا سدباب کرنے کے لئے اسلام نے شہریوں کی نچی زندگی کو مکمل تحفظ فراہم کیا ہے۔ اسلام میں چار دیواری اور گھر کو ایسے محفوظ قلعے کی حیثیت دی گئی ہے جس میں کسی کو مداخلت کا حق حاصل نہیں ہے۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ کوئی شخص کسی کو گھر میں جھانکتے ہوئے دیکھے اور اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر کوئی سزا اخذ نہیں ہے۔

سورہ انور میں شہریوں کی نچی زندگی کو تحفظ دینے کے لئے مسلمانوں کو بہت سی ہدایات دی گئی ہیں:

1- اُس وقت تک کسی کے گھر میں داخل نہ ہوں جب تک معروف طریقے سے گھر والوں سے اجازت نہ لے لیں۔

- 2- اگر گھر میں کوئی موجود نہ ہو تو تب بھی واضح اجازت کے بغیر گھر میں داخل نہ ہوں۔
  - 3- اگر اُن کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے بلکہ لوٹ جانے کو کہا جائے تو واپس چلے جائیں۔
  - 4- البتہ ایسے مکانات میں ضرورت سے بغیر اجازت کے داخل ہونا جائز قرار دیا گیا ہے جو نجی رہائش گاہیں نہ ہوں مثلاً دفاتر، پبلک عمارات، ہوٹل، مہمان خانے، دوکانیں، مدارس وغیرہ۔
  - 5- اسی طرح (سورہ احزاب میں) یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر کسی گھر میں ضرورت و اجازت سے جاؤ تو وہیں دھڑنا مار کر مت بیٹھ جاؤ اور نہ غیر ضروری باتیں کرنے میں لگے، رہو بلکہ اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد فوراً واپس چلے جاؤ تاکہ تمہارے اس طرز عمل سے صاحب خانہ کی نجی زندگی اور ذاتی معاملات میں خلل نہ پڑے۔
  - 6- ان ہدایات کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا گیا کہ اگر دروازے پر ہی کوئی چیز لٹکی ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔
- مسلمانوں کو دوسروں کے نجی معاملات کی ٹوہ لینے زار ٹٹولنے اور پھر انہیں دوسروں کے سامنے بیان کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

”اور تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔“

اگر کوئی شخص کسی کے عیب پر مطلع ہو جائے تو اُسے پردہ پوشی کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جس شخص نے کسی کے عیب کو دیکھا اور اس کی پردہ پوشی کی اس نے گویا ایک زندہ درگور انسان کو زندہ کیا۔“

حضور نبی کریم ﷺ نے حکمرانوں کو بھی تجسس کرنے سے منع فرمایا ہے۔ حدیث میں ہے:

”حکمران جب لوگوں کے اندر شبہات کے اسباب تلاش کرنے لگے تو وہ انہیں بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔“

اس سے صاف واضح ہے کہ ایک اسلامی ریاست کے لئے اپنے ملک کے شہریوں کے خلاف مختلف طریقوں سے جاسوسی کا جال پھیلانے اور اُن کے خفی حالات معلوم کر کے انہیں بلیک میل یا پریشان کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

## شخصی آزادی کا تحفظ:

اسلامی ریاست میں بغیر جرم کے ثابت ہوئے کسی شہری کو قید یا نظر بند کرنے کی کوئی مجبائش نہیں ہے۔ شخصی آزادی ہر شہری کے بنیادی حقوق میں شامل ہے۔

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ مسجد نبوی میں خطبہ دے رہے تھے کہ ایک شخص نے کھڑے ہو کر اپنے ہمسائے کے بارے میں پوچھا کہ اُسے کس جرم میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ جب آنحضرت ﷺ پر یہ بات ظاہر ہوئی کہ اسے بغیر کسی جرم کے ثبوت کے گرفتار کر لیا گیا ہے تو آپ ﷺ نے اسی وقت اُس کی رہائی کا حکم صادر فرمایا۔

رسول اکرم ﷺ کا معمول تھا کہ جب تک کسی معاملے کی پوری طرح تحقیق کر کے اُس کی تہہ تک نہیں پہنچ جاتا، اور جرم کا شک و شبہ سے بالاتر ثبوت فراہم نہ ہو جاتا، کسی کو کسی قسم کی سزا نہ دیتے۔ اس سلسلے میں حضرت ماعزؓ کو رحم کرنے کا تفصیلی واقعہ مطالعے کے قابل ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ حضرت ماعزؓ سے جرم اور اس کی نوعیت کے بارے میں مختلف انداز میں بار بار استفسار فرماتے رہے یہاں تک کہ آپ ﷺ کو اس امر کا قطعی طور پر یقین ہو گیا کہ فی الواقع ماعزؓ نے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اُس کے بعد آپ ﷺ نے رحم کا حکم فرمایا۔

جرم و سزا کے معاملے میں اسلام کا انداز فکر یہ ہے کہ شہریوں کو خواہ مخواہ سزا دینے کے لئے جیسے بہانے اور اسباب و شواہد نہ تلاش کئے جائیں بلکہ جب تک جرم قطعیت کے ساتھ ثابت نہ ہو جائے سزا دینے سے اجتناب کیا جائے۔

حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

”جس حد تک ممکن مسلمانوں (شہریوں) کو سزا سے بچاؤ۔ کوئی مجبائش لگتی ہو تو انہیں چھوڑ دو۔ یہ بات کہ امام کسی مس کو چھوڑ دینے میں غلطی کر جائے اس بات سے بہتر ہے کہ وہ اس کو سزا دینے میں غلطی کر جائے۔“

ایک دوسری حدیث میں ہے:

”جب تک بچانے کی کوئی راہ مل رہی ہو اُس وقت تک لوگوں کو سزا سے بچاؤ۔“

اس بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ایک واضح اصول مقرر فرمایا ہے:

”حد و شرعیہ کو شکوک و شبہات کی بناء پر ساقط کر دیا کرو۔“

قرآن حکیم میں اللہ عز و جل کا واضح حکم ہے کہ جو شخصی آزادی شہریوں کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے مرحمت ہوئی چوں اللہ کا رسول بھی اُن سے سلب نہیں کر سکتا چہ جائیکہ کوئی اور حکمران ان کو سلب کر سکے۔ ارشاد الہی ہے:

”کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اُسے کتاب و حکمت اور نبوت عطا کرے اور وہ

لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے غلام بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ ربانی (خدا کے غلام) بنو۔“

### ظلم کے خلاف احتجاج کا حق:

اسلام نے ایک طرف شہریوں کو یہ حکم دیا ہے کہ کسی پر ظلم نہ کریں اور دوسری جانب انہیں یہ حق بھی دیا ہے کہ اگر ان پر ظلم ہو تو وہ اس کے خلاف آواز اٹھائیں اُسے خاموشی سے برداشت نہ کریں بلکہ ظالم کو ظلم سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔

مشہور حدیث ہے:

”افضل ترین جہاد یہ ہے کہ ظالم حاکم کے سامنے کلمہ حق کہا جائے۔“

ایک اور حدیث ہے:

”لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اُس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو بعید نہیں اللہ ان پر عذاب عام نازل کر دے۔“

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”اپنے بھائی کی مدد کرو! خواہ ظالم ہو یا مظلوم۔ عرض کیا گیا کہ وہ مظلوم ہو تو اُس کی مدد کریں گے مگر ظالم ہو تو کیسے مدد کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اسے ظلم سے روک دو۔“

رسول اکرم ﷺ سراپا رحمت تھے۔ آپ ﷺ نے زندگی بھر کسی پر ذرہ بھر ظلم نہیں کیا۔

تاہم اگر کسی کو آپ ﷺ سے کوئی شکایت ہوئی تو آپ ﷺ اسے اظہار کی اجازت دیتے اور اپنے آپ کو بدلے کے لئے قیض فرما دیتے۔ غزوہ بدر میں آپ ﷺ شخصیں درست فرما رہے تھے۔ حضرت سواذ بن غزیہ صف سے کچھ آگے بڑھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے انہیں تیر چھو

کر صف میں برابر ہونے کا حکم دیا۔ وہ کہنے لگے: یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے مبعوث فرمایا۔

ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فوراً اپنا شکم مبارک کھول کر فرمایا: سواذ! اپنا بدلہ لے لو۔ سواذ دوڑ کر آپ ﷺ کے جسم اطہر کے ساتھ لپٹ گئے اور شکم مبارک کو چوم لیا۔

ایک شخص حضور نبی کریم ﷺ سے اپنے قرض کی ادائیگی کا تقاضا کرتے ہوئے سخت

کلائی سے پیش آیا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اُس کے گستاخانہ طرز عمل پر غصہ آ گیا اور اُس کی مرمت کے لئے اٹھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اسے کہنے دو! اسے کہنے دو! جس کا کچھ

حق نکلا ہے وہ ایسی باتیں کر سکتا ہے۔“

قرآن مجید میں ہے:

”اللہ عزوجل اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بد گوئی پر زبان کھولے مگر یہ کہ کسی پر ظلم

”کیا گیا ہو۔“

اللہ عزوجل کے نزدیک بدگوئی نہایت بُرا فعل ہے مگر جب ظلم حد سے بڑھ جائے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے اور اضطرابی حالت میں ظالم کے خلاف بُرے الفاظ زبان سے نکلنے لگیں تو ایسی صورت حال اللہ کے نزدیک قابل معافی ہے۔ ظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والے پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔

### اظہار رائے کی آزادی:

رسول اکرم ﷺ کو اللہ عزوجل کی جانب سے حکم تھا:

”معاملات میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا کیجئے۔“

چنانچہ آپ ﷺ کی جانب سے صحابہ کرام کو یہ آزادی حاصل تھی کہ وہ ملکی معاملات میں اپنی رائے کا برملا اظہار کرتے اور آپ ﷺ ہمیشہ اظہار رائے میں اُن کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ غزوہٴ احد کے موقع پر حضور نبی کریم ﷺ اور معمر صحابہ کرام کی رائے یہ تھی کہ مدینہ کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے جبکہ نوجوان صحابہ کرامؓ نے یہ رائے دی کہ شہر سے باہر نکل کر جنگ کی جائے۔ آپ ﷺ نے اکثریت کی رائے کو قبول کرتے ہوئے مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کرنے کا ارادہ فرمایا۔

ایک غزوہ میں آپ ﷺ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ فلاں فلاں مقام پر قیام کریں۔ ایک صحابی نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ یہ ارشاد وحی الہی ہے یا آپ ﷺ کی ذاتی رائے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری ذاتی رائے ہے۔ صحابی نے عرض کیا کہ فلاں مقام مناسب نہیں بلکہ اُس کی بجائے فلاں فلاں جگہ قیام کیا جائے۔ آپ ﷺ نے صحابی کی رائے کو قبول فرمایا۔

ایک بار رسول اللہ ﷺ مالی غنیمت تقسیم فرما رہے تھے کہ کسی نے کہا: یہ ایسی تقسیم ہے جس میں اللہ کی مرضی کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے ان ناروا کلمات کو سنا مگر معاف فرمادیا۔

ایک اور شخص نے کہا کہ آپ ﷺ نے عدل سے کام نہیں لیا۔ آپ ﷺ نے اُس سے کوئی باز نہ س نہ فرمائی اور فرمایا کہ ”اگر میں عدل نہ کروں گا تو اور کون عدل کرے گا؟“ ایک مرتبہ حضرت زبیرؓ اور ایک انصاری کا کوئی معاملہ آپ ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا۔ آپ ﷺ نے حضرت زبیرؓ کے حق میں فیصلہ فرمایا۔ انصاری نے غصے میں آ کر کہا کہ آپ ﷺ نے اپنے پھوپھی زاد بھائی کے حق میں فیصلہ کر دیا ہے۔ آپ ﷺ نے اس گستاخی پر درگزر کیا اور انصاری کو کچھ نہ کہا۔

البتہ ایسے موقع پر جہاں خدا کی نافرمانی ہو رہی ہو اور نہ انہوں کا ارتکاب ہو رہا ہو تو ان برائیوں کو روکنا اور اُن کے خلاف نفرت کا اظہار کرنا حضور نبی کریم ﷺ نے ہر مسلمان پر ضروری قرار دیا ہے۔ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث قابل غور ہے:

”تم میں سے جو شخص برائی دیکھے اگر ہاتھ سے مٹانے کی طاقت رکھتا ہو تو ہاتھ سے مٹا دے ورنہ زبان سے روکے اور اس کی بھی طاقت نہ ہو تو بُرائی کو دل سے بُرا سمجھے لیکن یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔“

البتہ اس بارے میں یہ بات ضرور یاد رکھئے کہ اسلام اظہار رائے کی غیر مشروط آزادی نہیں دیتا بلکہ شریعت نے حدود مقرر کی ہیں جس کی رو سے بُرائی کو پھیلانے کے لئے کسی شہری کو آزادی نہیں دی جاسکتی۔ اظہار رائے کی آزادی کو صرف اور صرف نیکی کے فروغ کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے اور بس!

### عقیدے کی آزادی:

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ صحیح دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم بھی یہی ہے کہ تمام اسلام کی دعوت قبول کرے۔ رسول اکرم ﷺ کی کوشش اور خواہش بھی یہی ہے کہ ہر شخص اسلام کی دعوت پر لبیک کہے۔ قرآن مجید میں ہے: ”شاید آپ ﷺ اس صدمے سے اپنے آپ کو ہلاک کر دیں گے کہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔“

لیکن اسلام کا یہ اصول ہے کہ دین اسلام قبول کرنے کے لئے کسی پر جبر نہیں کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”دین کے قبول کرنے میں کوئی جبر نہیں ہے۔“

مزید ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے انکار کرے۔“

قرآن مجید میں حضور نبی کریم ﷺ سے ارشاد ہوتا ہے:

”اے نبی! نصیحت کئے جائیں۔ آپ ﷺ تو بس نصیحت کرنے والے ہی ہیں! اُن پر

جبر کرنے والے نہیں ہیں۔“

ایک اور جگہ ارشاد رب العالمین ہے:

”پس اگر یہ لوگ (ہدایت سے) منہ موڑتے ہیں تو اے محمد ﷺ آپ پر صاف صاف

پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔“

حضور نبی اکرم ﷺ کو ہدایت کی گئی ہے کہ آپ مکرین اسلام سے کہہ دیں:

”ہمارے لئے ہمارے اعمال اور تمہارے لئے تمہارے اعمال۔ ہمارے اور تمہارے

درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہے۔"

آپ جانتے ہیں کہ دین اسلام کی فقہ اور اہل اسلام کی تاریخ کی کتب میں ذمیوں کے احکام اور احوال سے متعلق مستقل ابواب موجود ہیں۔ اگر اسلامی ریاست کے شہریوں کو عقیدے کی آزادی کا حق حاصل نہ ہوتا تو نہ اسلامی ریاستوں میں ذمیوں کا وجود ہوتا نہ کتب تاریخ میں ان کے حالات ہوتے اور نہ فقہ کی کتب میں ان کے متعلق مسائل و احکام ہوتے۔

البتہ یہ بات ہرگز نہ بھولنے کے بعد ہرگز اجازت نہیں دے سکتی کہ وہ دوبارہ کفر میں لوٹ جائیں بلکہ ایسے شخص کو شریعت کی اصطلاح میں "مرتد" کہا جاتا ہے۔ اگر وہ اپنے ارتداد سے باز نہ آئے تو سزائے موت کا مستحق ہے۔ ارتداد کی اجازت کو عقیدے کی آزادی قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ یہ ایک طرح کی دینی عیاشی، خواہشات نفسانی کی پیروی اور فساد کی جڑ ہے جس کی اسلام میں کوئی منجائش نہیں ہے۔

### حق مساوات:

آپ اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے معاشرے کا بغور جائزہ لیں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ مسلمانوں میں آج بھی اقتدار، دولت، نسب اور پیشوں کی بنیاد پر اونچے نیچے کا تصور موجود ہے۔ حالانکہ اسلام میں اس کی کوئی منجائش نہیں ہے۔ یہی بات ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے قریباً چودہ سو سال پہلے جنت الوداع کے خطبے میں ان الفاظ میں بیان فرمائی:

"کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر نہ کسی گورے کو کالے پر اور نہ کسی کالے کو گورے پر ماسوا تقویٰ کے۔ تم سب آدمی کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔"

قرآن مجید بھی دنیا کے تمام انسانوں کو بحیثیت انسان مساوی قرار دیتا ہے۔ ارشاد الہی ہے:

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"

ان ارشادات کی روش سے اسلامی ریاست کے تمام شہری قانون کی نظر میں برابر حیثیت کے حامل ہوں گے۔ معاشرتی زندگی میں اگر کسی کو برتری اور فضیلت حاصل ہوگی تو وہ شخص تقویٰ کی بنیاد پر ہوگی اس کے علاوہ اور کوئی چیز معیار فضیلت نہیں ہے۔

اسلام بنے خونی رشتے کی بنیاد پر تمام نئے نوع انسان کو آپس میں بھائی بھائی قرار دیتا

ہے۔ اسی طرح ایمان کی بنیاد پر تمام مسلمانوں کو ایک برادری قرار دیا ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

”میں گواہی دیتا ہوں کہ سارے انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔“

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

”تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔“

نبی اکرم ﷺ نے اگرچہ کسی شخص کے ساتھ کبھی کوئی زیادتی نہیں کی لیکن آپ اس بارے میں اس قدر فکرمند اور محتاط تھے کہ لوگوں سے بار بار فرمایا کرتے تھے کہ جس سے کوئی زیادتی ہوئی ہو وہ مجھ سے بدل لے چنانچہ آپ ﷺ کی حیات طیبہ میں کئی ایسے واقعات ملتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اپنے آپ کو بدلے کے لئے پیش فرمایا۔

ایک مرتبہ حضرت سواذ بن عمر کو حضور نبی کریم ﷺ نے کسی بات پر تنبیہ کرنے کے لئے چھڑی چھو دی۔ انہوں نے کہا:

”یا رسول اللہ ﷺ! میں تو قصاص لوں گا۔ آپ ﷺ نے فوراً شکم مبارک کھول کر ان کے سامنے کر دیا۔“

اسی طرح آپ ﷺ نے میدان بدر میں حضرت سواذ بن غزیہ کو اسی طرح ایک مجلس گفتگو کے دوران حضرت اسید بن حضیر کو اور تقسیم غنیمت کے وقت ایک صحابی کو چھڑی کی ٹوک سے پہنچنے والی تکلیف کا بدلہ لینے کی پیشکش کی۔

قبیلہ قریش کے ایک خاندان بنی مخزوم کی فاطمہ نامی ایک عورت کا چوری کی سزا میں حضرت اُسامہؓ کی سفارش کے باوجود ہاتھ کاٹنے کے فیصلے کے بارے میں واقعہ آپ پڑھ چکے ہیں۔

### حصول انصاف کا حق:

اللہ عزوجل نے نبی کریم ﷺ کو ہدایت فرمائی کہ آپ ﷺ اعلان کر دیں:

”اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل قائم کروں۔“

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

”اے محمد ﷺ! آپ ان سے کہہ دیجئے کہ میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے۔“

اس سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بطور خاص عدل و انصاف کے قیام پر مامور

کیا گیا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

”امام عادل کا ایک دن ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔“



نیز آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”مخلوق میں خدا کو سب سے زیادہ محبوب امام عادل ہے اور خدا کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض آدمی امام ظالم ہے۔“

نبی اکرم ﷺ نے ان احکام پر کماحقہ عمل فرمایا۔ آپ ﷺ نے اپنی ذات کو بھی قصاص کے لئے پیش فرمایا۔ آپ ﷺ نے امیر غریب، ادنیٰ، اعلیٰ، مسلم، غیر مسلم، آقا، غلام، عکبران اور عام شہری کے درمیان عدل و انصاف کے معاملے میں اصول مساوات پر سختی سے عمل فرمایا۔

آپ ﷺ نے معاشرے میں عدل و انصاف کے قیام کے لئے جو اصول پیش فرمائے اگر اُن پر عمل کیا جائے تو معاشرے سے ظلم و نا انصافی کا مکمل طور پر خاتمہ ہو سکتا ہے۔ اُن اصولوں کا خلاصہ ملاحظہ کیجئے:

- 1- ہمیشہ سچی گواہی دی جائے خواہ سچی گواہی کی زد گواہی دینے والے کے ذاتی مفاد پر یا اُس کے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے مفاد پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔
  - 2- گواہی دیتے وقت کسی شخص کا مقام و منصب یا اُس کی معاشی و معاشرتی حیثیت کا لحاظ نہ کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ چیزیں گواہی کی صحت پر اثر انداز ہو جائیں۔
  - 3- گواہی دیتے وقت تمام حالات و واقعات کو جوں کا توں بیان کیا جائے۔ اپنی طرف سے کسی بات کی کمی بیشی نہ کی جائے۔
  - 4- معاملہ خواہ کسی دشمن کا ہی کیوں نہ ہو عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔
  - 5- بدلہ لیتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ بدلہ مظلوم کے نقصان کے بالکل برابر لیا جائے نہ کم نہ زیادہ۔
- ان سب شرائط کی پابندی ضروری ہے۔ اگر ان میں سے ایک شرط بھی ساقط ہو گئی تو عدل کے تقاضے پورے نہ ہو سکیں گے۔

### معاشی تحفظ کا حق:

رسول اکرم ﷺ کا لایا ہوا دین محض چند عقائد، عبادات اور اخلاقیات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ آپ ﷺ کی تعلیمات اپنی جامعیت کے لحاظ سے انسانیت کے تمام شعبوں پر حاوی ہیں۔ معاشی مسئلہ بھی انسانی زندگی کے اہم ترین مسائل میں سے ہے۔ اس مسئلے کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کا کامل اور مکمل حل اسلام نے پیش نہ کیا ہو۔

معاشی مسائل کے حل کے لئے کچھ ذمہ داریاں اسلامی ریاست کے شہریوں پر عائد ہوتی ہیں اور کچھ اسلامی ریاست پر۔ اُن میں سے ہر ایک کا الگ الگ مطالعہ کیجئے:

## 1- شہریوں کی ذمہ داری:

ہر شہری جو جسمانی طور پر کسب معاش کی استطاعت رکھتا ہو، پر ضروری ہے کہ کسب معاش کے لئے اپنی صلاحیتوں کو بہتر طور پر صرف کرے۔ اس بارے میں حضور نبی کریم ﷺ کے ارشادات ملاحظہ کیجئے:

- i- "حلال کمائی کی تلاش ایمان کے بعد بڑا فریضہ ہے۔"
- ii- "ہاتھ کی کمائی کھانے سے بہتر تم نے کبھی کوئی کھانا نہیں کھایا۔"
- iii- "اللہ تعالیٰ اُس بندہ مومن کو عزیز رکھتا ہے جو کسی پیشے کے ذریعے سے اپنی روزی کمانا ہے۔"

کسب معاش کے بڑے بڑے راستے تجارت، زراعت اور محنت و مزدوری ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے تینوں کو اہمیت دی ہے۔ تجارت کا پیشہ آپ ﷺ کے نزدیک کسب معاش کے ذرائع میں سے سب سے زیادہ پسندیدہ تھا۔ آپ ﷺ عقلمند، جوانی میں خود بھی تجارت کیا کرتے تھے۔ سچے اور امین تاجروں کے بارے میں رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ "وہ قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوں گے۔"

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "افضل کمائی بیع مبرور (ایمانداری والی تجارت) اور آدمی کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا ہے۔"

زراعت کے بارے میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

"رزق کو زمین کی پنہانیوں میں تلاش کرو۔"

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابی کو دیکھا کہ اُن کے ہاتھ میں مزدوری کرنے کی وجہ سے نشان پڑے ہوئے ہیں۔ ارشاد فرمایا:

"یہ وہ ہاتھ ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو پیارا ہے۔"

رسول اکرم ﷺ اعلان نبوت سے پہلے خود بھی مزدوری پر کھریاں چراتے رہے ہیں۔ البتہ یہ بات یاد رکھئے کہ اسلام نے کسب معاش کے باب میں حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی حدود متعین کی ہیں اور ہر ایسا کاروبار اور ہر کاروبار کا ہر ایسا طریقہ جو معاشی استحصال یا دینی بنے راہ روی کا سبب بنتا ہو، ممنوع، ظہر ایسا ہے مثلاً سود، ٹپ، تول میں کمی، غلامی، ذخیرہ اندوزی، نشہ آور اشیاء کی خرید و فروخت اور فحاشی اور بدکاری کے ذریعے سے آمدنی اور اس قسم کے دوسرے کاروبار پر پابندی لگا دی گئی ہے۔

ہر شہری کے لئے اپنے قریبی رشتہ داروں کی کفالت کو درجہ بدرجہ ضروری قرار دیا گیا ہے مثلاً والدین، بیوی، بچے اور دیگر رشتہ دار حضور نبی کریم ﷺ نے ایک ایسے شخص کو جو اپنے والد کی

کفالت میں پس و پیش کرتا تھا ارشاد فرمایا:

”تو اور تیرا مال دونوں تیرے باپ کی ملکیت میں ہیں۔“

تمام شہریوں پر قہیوں، یواؤں اور بے سہارا افراد کی مالی امداد ضروری ہے۔

معذور اور بھوکے افراد کو حق دیا گیا ہے کہ اہل ثروت کے ہاں اپنے خورد و نوش کی

ضرورت کو پورا کریں۔ ارشاد الہی ہے:

”کوئی حرج نہیں اگر کوئی اندھا یا لنگڑا یا مریض (کسی کے گھر سے) کھائے۔“

اس آیت کی رو سے معذور افراد کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ جس مسلمان کے گھر سے

چاہیں کھانا طلب کر سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ صاحب استطاعت لوگوں کو بھی حکم دیا گیا ہے کہ اپنی ضرورت سے

زائد مال مستحقین پر خرچ کریں۔ حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد

ہے:

”جس شخص کے پاس اپنی حاجت سے زائد سواری ہو وہ اس شخص کو دے دے جس کے

پاس سواری نہ ہو۔ جس کے پاس اپنی ضرورت سے زائد خورد و نوش کا سامان ہو اس کو چاہئے کہ

فاضل سامان، ثاوار اور حاجت مند کو دے دے۔“

اس حدیث کے راوی ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ”نبی کریم ﷺ اسی طرح مائی کی

مختلف قسموں کا ذکر فرماتے رہے حتیٰ کہ ہم نے یہ گمان کر لیا کہ ہم میں سے کسی شخص کو اپنی

ضرورت سے زائد مال پر کوئی حق نہیں ہے۔“

دولت مند شہریوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ ضرورت مندوں کو فراخ دلی سے قرض دیں۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”کسی بندے کے لئے یہ مناسب نہیں کہ اس کا بھائی اس سے

قرض مانگے اور وہ قرض دینے کی گنجائش رکھتا ہو پھر بھی اس سے انکار کر دے۔“

## 2۔ اسلامی ریاست کی ذمہ داری:

i۔ اسلامی ریاست کی یہ اہم ترین ذمہ داری ہے کہ وہ شہریوں کے لئے کسب حلال

مواجہ فرام کرے اور کسب حرام کے دروازے بند کرے۔ احادیث میں بکثرت ایسے

واقعات ہیں کہ مشرک نبی کریم ﷺ نے انہیں انہی کو سوال کرنے سے منع فرمایا۔

انہیں تجارت یا محنت مزدوری پر لگایا۔

ii۔ ریاست کی دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ جو لوگ اپنے زیر کفالت افراد کے حقوق کی

نہ کرتے ہوں وہ قانوناً انہیں کفالت کا پابند بنائے۔

iii۔ اسلامی ریاست کی تیسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ نظامِ زکوٰۃ قائم کرے صاحبِ نصاب

- لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرے اور مستحقین کی فلاح و بہبود پر خرچ کرے۔
- iv- اس کی چوتھی ذمہ داری یہ ہے کہ جن افراد کا کوئی کفیل نہ ہو ان کی کفالت وہ خود کرے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”جس کا سر پرست نہ ہو اس کا سر پرست اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہے۔“
- v- رسول اکرم ﷺ نے مرنے والے شخص کے فرض کی ادائیگی اور اس کے پسماندگان کی کفالت بھی ریاست کی ذمہ داری قرار دیا۔ فرمایا: ”یو مسلمان قرض چھوڑ کر مر جائے اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہے اور جو مال چھوڑ جائے وہ وارثوں کا ہے۔“

### 3- حق اُجرت و معاوضہ:

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں مزدور کا یہ حق ہے کہ اس سے بلا معاوضہ کوئی کام نہ لیا جائے اور کام کے معاوضے میں اسے پوری اُجرت دی جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

”مزدور کی مزدوری اس کا پینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔“

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”قیامت کے دن میں تین آدمیوں کا دشمن ہوں گا۔ ایک وہ شخص جس نے میرا مال لے کر عہد کیا مگر پھر گیا۔ دوسرا وہ جس نے آزاد آدمی کو بیچ کر اس کا مول کھایا۔ تیسرے وہ جس نے مزدور سے پوری محنت لی اور پھر اس کی اُجرت ادا نہ کی۔“

آپ ﷺ نے یہ حکم بھی فرمایا ہے کہ ”مزدور کی اُجرت طے کئے بغیر اس کو کام پر نہ لگایا جائے۔“

## ذمیوں کے خصوصی حقوق

اسلام نے غیر مسلم شہریوں کو بھی بہت زیادہ حقوق دیے ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ غیر مسلموں سے بھی حسن سلوک، عمدہ اخلاق اور رواداری سے پیش آتے تھے۔ آپ ﷺ نے نجران کے عیسائی وفد کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا۔ آپ غیر مسلم مہمانوں کی نفس نفیس خدمت کرتے۔ اسلام میں کفار کے معبودان باطلہ کو بھی گالی دینے سے منع کیا گیا ہے اس خیال سے کہ وہ جواباً اللہ تعالیٰ کو گالیاں دیے لگیں گے۔

حضور نبی کریم ﷺ نے ان غیر مسلم عوام کے حقوق بھی متعین فرمائے ہیں جو اسلامی ریاست کے باشندے بن کر رہ رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

”اگر تم کسی قوم سے لڑو اور اس پر غالب آ جاؤ اور وہ قوم اپنی اور اپنی اولاد کی جان بچانے کے لئے تم کو خراج دینا منظور کر لے تو پھر بعد میں اس مقررہ خراج سے ایک دانہ بھی

زائد نہ لینا کیونکہ وہ تمہارے لئے ناجائز ہوگا۔“

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

”خبردار! جو شخص کسی معاہدہ پر ظلم کرے گا یا اس کے حقوق میں کمی کرے گا یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالے گا یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے بغیر وصول کرے گا“ اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود مستغیث ہوں گا۔“

اندازہ کیجئے جو اسلام غیر مسلموں کو اسنے حقوق دیتا ہے وہ مسلمانوں کے حقوق کو کیسے نظر انداز کر سکتا ہے۔

## اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق

اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ ”دین اسلام“ کے سوا تمام ملل، ادیان باطلہ اور ان کے ماننے والے کافر ہیں۔ ”دین اسلام“ برحق اور اس کے ماننے والے ہی مومن مسلمان ہیں۔ فرمان خداوندی ہے:

”اسلام ہی اللہ کے نزدیک دین ہے۔“ (آل عمران: 19)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”اور جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرتا ہے وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان والوں میں سے ہوگا۔“ (آل عمران: 85)

نیز ارشاد ہے:

”آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی ہے اور میں نے تمہارے لئے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا ہے۔“ (المائدہ: 3)

اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات کی بناء پر مسلمان یقین کرتا ہے کہ اسلام سے پہلے والے ادیان منسوخ ہو چکے ہیں اور اب انسانوں کے لئے ”ضابطہ حیات“ صرف ”اسلام“ کے نام سے مقرر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے علاوہ کوئی اور دین کو قبول کرے گا اور نہ ہی کسی دوسری شریعت پر راضی ہو گا لہذا جو شخص معمولات زندگی کو اسلام کے مطابق نہیں بناتا وہ کافر ہے۔

غیر مسلم سے مراد ہر وہ شخص ہے جو اسلام کے درج ذیل بنیادی عقائد پر ایمان نہیں لاتا:

1- اللہ پر ایمان

2- اللہ کے فرشتوں پر ایمان

3- اللہ کی کتابوں پر ایمان

4- اللہ کے رسولوں پر ایمان (اس میں یہ بات شامل ہے کہ رسول کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ہر حیثیت سے اللہ کے آخری نبی سمجھا جائے)

5۔ آخرت پر ایمان

اس کے باوجود اسلام نے جہاں مسلمانوں پر کچھ حقوق و فرائض عائد کئے ہیں اسی طرح غیر مسلموں پر بھی کچھ ذمہ داریاں عائد کی ہیں اور اس کے بدلے میں کچھ رعایتیں دی ہیں جنہیں ان کے حقوق کہا جاتا ہے۔

اب ہم ذیل میں غیر مسلموں اور ذمیوں کے چند حقوق کا تذکرہ کرتے ہیں:

### 1۔ انسانی زندگی کا حق:

اسلامی نظام حیات میں ہر فرد کو اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں سے پورا پورا استفادہ کرنے کی آزادی دی گئی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

”جس نے کسی شخص کا ناحق خون کیا یا زمین میں فساد انگیزی کی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی شخص کو زندہ رکھا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندہ رکھا۔“ (المائدہ: 32)

اسلام نے ذی کے خون کو بھی خونِ مسلم کے برابر درجہ دیا ہے۔

اسلام تو حالت جنگ میں بھی عورتوں، بچوں، ذمیوں، یناروں اور یوزخوں پر رحمت و رازق کی اجازت نہیں دیتا۔ ہاں البتہ ایسے لوگ اگر خود جنگ میں حصہ لے رہے ہوں تو اسلام میں شخص کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنی دشمنی کے مطابق زندگی بسر کرے۔

### 2۔ شخصی تحفظ کی ضمانت:

امام خطاب کا کہنا ہے کہ صرف دو صورتوں میں کسی شخص کو زیرِ حراست رکھ جاسکتا ہے

i۔ جب باقاعدہ عدالتی فیصلے کے مطابق سزا کے طور پر کسی کو قید کیا جائے۔

ii۔ تحقیقات کی غرض سے کسی کو حراست میں لیا جاسکتا ہے۔

لہذا اسلامی شریعت کے مطابق قانونی جواز کے بغیر کسی شخص کو قید و بند میں نہیں رکھا جاسکتا اور فرد کی آزادی باضابطہ عدالتی کارروائی کے تحت ہی سلب کی جاسکتی ہے یعنی اس پر الزام لگانا، کٹلی عدالت میں اس پر مقدمہ چلانا اور اسے قید کا پورا پورا تجربہ دینا۔

### 3۔ تحفظ ملکیت:

ہر فرد کو اختیار ہے کہ وہ جائز ذرائع سے اپنی محنت سے ملے ہوئے پریشانی چاہے دولت لے۔ انفرادی ملکیت کی حفاظت کے لئے اسلام نے بڑے جامع قوانین پیش کئے ہیں تاکہ انسان کی دولت ڈاکہ اور چوری سے محفوظ رہ سکے۔ اسی طرح چند قیود کے ساتھ ہر فرد کو اپنے دولت خرچ کرنے کا بھی اختیار دیا گیا ہے۔

## 4- روزگار کا حق:

تمام افراد معاشرہ کو بنیادی ضروریات کی فراہمی کی ضمانت دینا ایک اسلامی حکومت کا فرض ہے اس میں مسلم یا غیر مسلم بھی شامل ہیں۔ اگر دشمن قوم کا بھی کوئی فرد اسلامی معاشرے میں آ جائے تو اسلامی حکومت کا فرض ہو گا کہ اسے بھوکا نہ رہنے دیا جائے۔ رخصی ہو تو علاج کرایا جائے۔ اسلامی ریاست معذور لوگوں کی خود کفالت کرتی ہے۔

## 5- عورتوں کے حقوق کا تحفظ:

تاریخ انسانی کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا جائے تو یہ بات نکھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ عورت کو پہلی مرتبہ اسلام نے ہی پستی سے نکال کر اس کا اصل مقام دلایا۔ اس کی پیدائش کو موجب رحمت قرار دیا۔ بیوی کی حیثیت سے اس کے حقوق متعین کئے اور ماں کی حیثیت سے اس کو بلند مرتبہ عطا کیا۔ اسلام نے اس کی نزاکت اور لطافت کے پیش نظر مرد کو اس کی عزت و آبرو کا محافظ قرار دیا۔ اس کی عصمت و آبرو کو متاع عظیم قرار دیا گیا جس کی حفاظت کے لئے نہایت مؤثر اقدامات اور تدابیر پیش کی گئیں۔

روزی کمانے کی اصل ذمہ داری مرد پر ڈالی گئی لیکن اس کے ساتھ ساتھ عورت کو معاشی حقوق بھی عطا کئے۔

معاشی حقوق کے ساتھ ساتھ اسے خانگی حقوق بھی عطا کئے گئے حتیٰ کہ عورت کو شوہر کے انتخاب کا حق دیا گیا۔ عدم پناہ کی صورت میں خلع کا بھی اختیار دیا گیا۔ مطلقہ اور بیوہ عورت کو نکاح ثانی کا حق حاصل ہے۔ اسلامی معاشرہ پر لازم ہے کہ عورتوں کے حصول تعلیم کے لئے سہولیات مہیا کرے۔

## 6- خاندانی زندگی کا حق:

اسلام نے خاندانی زندگی کی بقاء کے لئے مختلف معاملات کو منضبط کیا ہے۔ اس ضمن میں بالغ افراد کی شادی کر دینے کا حکم دیا۔ اس کے علاوہ ہر فرد کا خلیہ تسلیم کیا گیا ہے۔ ایک شخص کو پورا آئینی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے گھر میں دوسرے کے شور و شغب سے دوسروں کی تانک جھانک سے اور دوسروں کی مداخلت سے محفوظ و مامون رہے۔ اس کی گھریلو بے تکلفی اور پردہ داری برقرار رہنی چاہئے۔

## 7- حصول تعلیم کا حق:

اسلامی ریاست کا یہ فرض ہے کہ معاشرہ میں تعلیم عام کرنے کی طرف بھرپور توجہ دے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے صوبائی عمال کو اسلامی تعلیمات کی درس و تدریس کا فریضہ سونپ رکھا تھا۔

فرمان نبوی ﷺ کے مطابق تعلیم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ جنگ بدر میں جو کفار قید ہوئے تھے ان کی رہائی کے لئے بطور تاوان مسلمان بچوں کو تعلیم دینے کی شرط رکھی گئی تھی۔

### 8- اظہار رائے کی آزادی:

اسلامی ریاست میں ہر شخص حکومت پر تنقید کر سکتا ہے بلکہ نیکی کا حکم اور برائی سے روکنا تو اسلام میں ایک عظیم فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ خلفاء راشدین کے زمانہ میں ایک آدمی خلیفہ وقت سے کسی معاملے پر باز پرس کر سکتا تھا۔ اسلامی نقطہ نظر سے دین کے معاملے میں بھی جبر کی کوئی گنجائش نہیں۔

### 9- قانون کی بالادستی:

اسلامی ریاست میں قانون کا اطلاق تمام شہریوں پر یکساں ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں کوئی طبقہ مراعات یافتہ نہیں بلکہ قانون تمام شہریوں کو یکساں طور پر تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ چوری کے ضمن میں لائی جانے والی عورت کے متعلق جب ایک صحابی نے حد میں نرمی کی سفارش کی تو آپ ﷺ نے سختی سے جواب دیا اور مسادات کے اصول پر ذرہ بھر آٹھ نہ آنے دی اور آئندہ کے لئے عملی طور پر حدود کے نفاذ کا اعلان کیا۔

### 10- ضمیر و مذہب کی آزادی:

اسلام میں مذہب کے معاملے میں جبر کو تسلیم نہیں کیا گیا اور اس اصول کے تحت ہر شخص کو آزادی عطا کی کہ وہ کفر و ایمان میں سے جو راہ چاہے اختیار کرے۔ اسلامی معاشرہ میں تمام مذہبی اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی جاتی ہے اور انہیں ان کے عقیدہ کے مطابق مذہبی رسومات ادا کرنے کی پوری آزادی دی جاتی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے اپنی کسی بھی غیر مسلم رعایا کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کو غیر مذہب کے لوگوں سے رواداری کی تلقین کی گئی ہے۔

### 11- عزت و ناموس کا تحفظ:

اسلام نے تمام مومنوں کو ایک دوسرے سے رواداری سے پیش آنے کی تلقین کی اور کسی پر جہت لگانے کو سنگین جرم قرار دیا گیا اور اس کے لئے اسی (80) کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی۔ انسان کی عزت و آبرو کی حفاظت کرنا ریاست کا اولین فرض ہے۔ سورہ حجرات میں اس حق کی پوری تفصیل موجود ہے اور اس میں واضح کر دیا گیا ہے کہ کسی کا مذاق نہ اڑایا جائے نہ بے القاب دیئے جائیں نہ ہی اس کی بُرائی کی جائے۔ اس طرح ہر شخص کا یہ بنیادی حق ہے کہ کوئی اس کی عزت پر ہاتھ نہ ڈالے۔



## 12- سیاسی حقوق:

اسلام ریاست کے سیاسی معاملات میں کسی ایک مخصوص فرد یا گروہ کی اجارہ داری قبول نہیں کرتا بلکہ حکومت کا کاروبار چلانا تمام افراد کی مشترکہ ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔ اسلام نے حکومت کے نظام میں استبدادی رجحانات ختم کرنے کے لئے حکومت پر تمام قسم کے معاملات میں مشورہ کرنے کی پابندی عائد کر رکھی ہے۔

## دیگر اہم حقوق

## ضرورت مندوں اور غریبوں کے حقوق:

ضرورت مند اور غریب بھی ہمارے معاشرے کا حصہ ہیں۔ اسلام ان کی مدد کرنے پر زور دیتا ہے، اہم ایسے صدقہ و خیرات کے علاوہ زکوٰۃ کے ذریعے ان کی مدد کر سکتے ہیں۔ کسی محتاج یا ضرورت مند کو ہجر کرنا نہیں چاہئے بلکہ اس سے نرمی کا برتاؤ کرنا چاہئے اور اس کی مدد کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جو لوگ دوسروں کی مدد نہیں کرتے اور اپنے مال کو ذخیرہ کرتے ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

”اور جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خبر سنا دو۔“ (التوبہ: 34-35)

## جنگی قیدیوں کے حقوق:

اسلامی قانون کے تحت مسلمان قیدیوں کو رہائی دلانے کے لئے سرکاری خزانے سے رقم ادا کی جانی چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ کے دور میں دشمن کے جنگی قیدیوں کے سلسلے میں یہ اصول طے کیا گیا کہ جنگی قیدیوں کو قتل کرنے کی بجائے ان سے فدیہ لے کر یا پھر مسلمان قیدیوں کے بدلے ان کو رہا کیا جائے گا۔ اسلامی تاریخ کے کسی بھی دور میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جس میں جنگی قیدیوں کے ساتھ برا سلوک کیا گیا ہو۔ جنگ بدر میں گرفتار ہونے والوں سے رسول اللہ ﷺ نے اچھا سلوک کرنے کی ہدایت کی تھی۔ عورتوں اور بچوں کی گرفتاری کی صورت میں بچے کو ماں کے ساتھ رکھا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ حضور نبی کریم ﷺ نے جنگی قیدیوں کے لئے یہ فدیہ تجویز کیا کہ وہ ایک مسلمان کو زیور تعلیم سے آراستہ کرے تو اسے چھوڑ دیا جائے گا۔

## بیماروں اور معذوروں کے حقوق:

اسلام ایک جامع مذہب ہے اس میں ہر بات بڑی وضاحت سے بتائی گئی ہے اور معاشرتی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کے متعلق احکامات ہمیں دین نے نہ سکھائے ہوں۔ اسی

لئے ہمارا مذہب ہمیں بیماروں کی حراج پڑی سکھاتا ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد رسول کریم ﷺ ہے:

”تم بیمار کی حراج پڑی کرنے کے لئے جتنے قدم چل کر جاؤ گے، تمہیں اتنے قدموں کا ثواب ملے گا۔“

معذور افراد بھی ہمارے معاشرے کا اہم حصہ ہیں اپنی معذوری کے سبب بعض اوقات وہ خود کو دوسروں کے مقابلے میں کمتر سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ معاشرے میں افراد کا رویہ ایسا ہونا چاہئے جس سے ان کو یہ احساس نہ ہو کہ ان پر رحم یا ترس کھایا جا رہا ہے بلکہ ان کی عزت نفس کا خیال رکھتے ہوئے ان کو ایسے کام سونپے جاسکتے ہیں جن کی انجام دہی کے سلسلہ میں ان کی معذوری رکاوٹ نہ بنے۔

### مزدوروں کے حقوق:

معاشرے میں طبقاتی تقسیم اس طرح سے ہے کہ چند لوگ بے حد امیر ہیں جبکہ دوسرے بہت غریب ہیں جو محنت مشقت کر کے گزر اوقات کرتے ہیں۔ اس طبقہ سے تعلق رکھنے والے محنتی اور جفاکش لوگوں کو حقارت سے دیکھنا خدا کے غضب کو دعوت دینا ہے۔ ہمارا مذہب ہمیں یہ سبق سکھاتا ہے کہ ایسے افراد کو ان کی محنت کا جائز معاوضہ ادا کیا جانا چاہئے اور ان کے ساتھ سختی کا سلوک کرنے کی مخالفت کرتا ہے۔

حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد پاک ہے:

”مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو۔“

اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم محنت کش کو اس کا معاوضہ وقت پر ادا کر دیں تاکہ اسے معاشی تنگدستی کے سبب پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔

## مسلمانوں کا تصور ریاست

ریاست کا لفظ ”راس“ سے نکلا ہے۔ راس کے معنی رئیس سردار یا حاکم کے ہیں۔ اس مصدر کے حوالے سے ریاست سے مراد زمین کا وہ مخصوص خطہ یا علاقہ ہے جہاں لوگ کسی حاکم کے تحت ایک خاص نظام کے ذریعے زندگی بسر کرتے ہیں۔ پس اس تعریف سے ریاست کے چار بنیادی عناصر کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے:

- 1- علاقہ (جہاں لوگ آباد ہوں)۔
- 2- آبادی (جو اس علاقہ میں ہو)۔
- 3- مقتدر اعلیٰ کا وجود یعنی با اختیار حاکم جس کی آبادی مطیع ہو۔

4۔ حکومت یا نظام جس کے تحت کاروبار ریاست چلتا ہو۔  
 ”اسلامی ریاست سے مراد زمین کا وہ خطہ ہے جہاں اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کا مانا جائے یعنی اس میں اسلامی اصول و قوانین رائج ہوں۔“

اسلامی ریاست میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی رہ سکتے ہیں اور انہیں اپنے مذہب کے مطابق زندگی بسر کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ ایسے غیر مسلم جو اسلامی ریاست میں مسلمانوں کے تحفظ میں رہیں اُدی کہلاتے ہیں۔

اسلامی ریاست میں اللہ تعالیٰ مقتدر اعلیٰ ہوتا ہے اور اسی کا قانون چلتا ہے البتہ ان قوانین کا نفاذ اس کے بندوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس حوالے سے اسلامی ریاست کو خلافت بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں حاکم (خلیفہ) اللہ تعالیٰ کے حکم کو اس کے نائب ہونے کی حیثیت میں نافذ کرتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کی کیوں ضرورت پیش آتی ہے؟  
 اسلام ایک اجتماعی دین ہے جو انسانوں کے باہمی تعلقات کو بھی منظم کرتا ہے۔ وہ دوسرے مذاہب کی طرح صرف خدا اور اس کے بندے کے درمیان تعلقات منظم نہیں کرتا بلکہ وہ یہ بھی انتظام کرتا ہے کہ خدا کے بندے آپس میں کس طرح کے تعلقات اور رویے اپنائے ہوئے ہیں۔ کیا ایک انسان اپنے دوسرے بھائی کا حق تو نہیں مار رہا ہے؟ کیا کوئی طاقتور طبقہ کمزور طبقے کا استحصال تو نہیں کر رہا؟ اسی طرح عدل و میزان کے اعلیٰ و ارفع اصول جو اسلام نے پیش کئے ہیں آیا انہیں ان کی عدالتوں، پنچائتوں اور دفاتروں میں نفاذ کیا جا رہا ہے یا صرف تلاوت کی حد تک اسے مسلمان پڑھ لیتے ہیں؟ اس لحاظ سے اسلامی ریاست کا وجود اور قیام ہر مسلمان معاشرہ پر واجب ہے۔ اسلام جہاں عبادات میں اجتماعیت کا قائل ہے وہاں وہ معاشرتی نظام میں اس سے بھی زیادہ اجتماعیت کا علمبردار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مدینہ پہنچتے ہی اسلامی ریاست کی داغ بیل ڈالی۔ اسلامی ریاست میں چونکہ مقتدر اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے اس لئے بنیادی طور پر قوانین و احکامات اللہ کے ہی رائج ہوں گے۔ انسانوں کی عدوی اکثریت کو بھی ان قوانین کے بدلنے یا ان سے سرتابی کرنے کا اختیار نہیں۔ اس لئے اسلامی ریاست اور اسلام کے سیاسی نظام کی ہیئت کدائی جمہوریت سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ جمہوریت میں انسانوں کی عدوی اکثریت ہی کسی چیز کے غلط یا صحیح ہونے کا فیصلہ کرتی ہے اور عدوی اکثریت سے قوانین وضع ہوتے ہیں۔ چاہے وہ قوانین اخلاقی اور منطقی لحاظ سے کتنے ہی غیر مناسب اور معیجہ خیز کیوں نہ ہوں۔ اسلامی ریاست میں انسانوں کے فیصلوں کا بھی احترام کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں یا عدل و میزان سے متصادم نہ ہوں۔ ایسے فیصلے دراصل اللہ تعالیٰ کے احکامات کے نفاذ کی کڑی

ہوتے ہیں لیکن جس چیز میں حاکم مطلق (اللہ تعالیٰ) نے فیصلہ کر دیا اس کے مقابلے میں دوسرا فیصلہ نہیں لایا جاسکتا۔

قرآن میں ارشاد ہے:

ترجمہ: ”اور جو لوگ اللہ کے اُتارے ہوئے (قرآن) کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ ظالم ہیں۔“

اسی طرح دوسری جگہ ایسے لوگوں کے متعلق ارشاد ہوا کہ ”یہ فاسق ہیں۔“

تیسری جگہ ارشاد ہوا کہ ”یہ کافر ہیں۔“

ایک اور فرق جو اسلامی ریاست اور جمہوری ریاست میں ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں اہل علم اور بے علم کے دوٹ میں تفریق کی گئی ہے۔ اس لئے کسی تنازعہ یا مسئلہ کے حل کے لئے ارشاد ہوا:

ترجمہ: ”پس (اے مسلمانو!) اہل عمل سے پوچھو اگر تمہیں کسی چیز کا علم نہ ہو۔“ (القرآن)

لیکن جمہوریت میں ایک آدمی ایک ووٹ (One Man One Vote) کا نظریہ عالم اور جاہل کے درمیان تفریق نہیں کرتا۔

بقول علامہ اقبال:

جمہوریت ایک طرز حکومت ہے کہ جس میں  
بہروں کو گنا کرتے ہیں تو لا نہیں کرتے

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلامی ریاست میں انسانوں کی کثرت کا کوئی مفہوم یا تصور نہیں۔ اسلامی ریاست میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کا نفاذ اور ریاست کے امور باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔

ترجمہ: ”اور وہ (مومن لوگ) اپنے فیصلے باہمی مشورے سے کرتے ہیں۔“ (القرآن)

اور دوسری جگہ ارشاد ہوا:

ترجمہ: ”اور انہیں فیصلوں میں شامل کیجئے۔“ (القرآن)

اگر ہم تاریخ کی طرف نظر دوڑائیں تو ہمیں علم ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبیجا ہوا ہر نبی تبلیغ دین کو انفرادی سطح سے شروع کر کے اجتماعی سطح پر ریاست کے قیام کی صورت میں لے جانا چاہتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ نبی ریاست کے قیام کے بدھ تک پہنچ سکے اور کچھ کو ان کے حالات یا وقت نے ایسا کرنے کی اجازت نہ دی۔

اسلامی فکر کے مطابق ایک صحت مند اور قرآنی معاشرہ کی تشکیل کے لئے ریاست کا قیام ضروری ہے چونکہ اسلامی ریاست میں مقتدر اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے اس لئے تو انہیں اسی کے نافذ کئے جائیں گے۔ اسلام میں ریاست کے حاکم کو جو اللہ کے احکام نافذ کرنے امام کہتے

ہیں اور اس منصب کو "امامت" کہتے ہیں۔

امامت کے مسئلہ پر تمام فقہائے اُمت متفق ہیں۔ اس سلسلے میں علامہ ابن حزم اپنی مشہور کتاب "الفصل بین الملل والنحل" میں لکھتے ہیں:

"تمام اہل سنت اور تمام مرجعہ اور تمام شیعہ اور تمام خوارج امامت کے واجب پر متفق ہیں اور اس پر بھی کہ ایسے حاکم کی اطاعت فرض ہے جو عادل ہو اللہ کے احکامات نافذ کرے اور احکام شریعت جو آنحضرت ﷺ لے کر آئے ہیں کے مطابق حکومت کرے۔" (جلد چہارم ص 87)

یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے فوراً بعد امامت کا مسئلہ زیر غور آیا اور یہ اتنا اہم معاملہ تھا کہ آنحضور ﷺ کی تجسیم و تکفین سے بھی قبل اس کا فیصلہ کیا گیا۔

## اسلامی ریاست کی خصوصیات

اسلامی ریاست میں اقتدار اعلیٰ اللہ کی ذات ہوتی ہے اور اسی کے احکام کے نفاذ کے لئے ریاست کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے اس حوالے سے ریاست کی درج ذیل خصوصیات ہیں:

1- اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے پاس:

اسلامی ریاست میں اقتدار حکومت طاقت اور قانون کا سرچشمہ خدائے بزرگ و برتر کی ذات ہوتی ہے۔ کسی شخص کو اس کے احکامات کے مقابلے میں اپنے احکام جاری کرنے کا اختیار نہیں۔ اسلام کے نقطہ نظر سے اس کائنات کا خالق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی مالک ملک اور رب العالمین ہے۔ اس لئے حکمرانی کا حق صرف اسی کو پہنچتا ہے۔ اس کی سلطنت میں اسی کی مخلوق پر اس کے سوا کسی اور کا حکم چلنا منطقی اور اخلاقی لحاظ سے غلط ہے۔ اقتدار اعلیٰ اور حق حاکمیت اصلاً صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ اس میں کوئی فرد یا خاندان یا طبقہ بلکہ پوری نوع انسانی بھی ذرہ برابر شریک نہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

ان الحكم الا لله (القرآن)

ترجمہ: "بے شک حکمرانی کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے۔"

دوسری جگہ ارشاد ہوا:

فالْحُكْمُ لِلَّهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ (القرآن)

ترجمہ: "پس حکمرانی اللہ بزرگ و برتر کے لئے ہے۔"

نیز فرمایا:

ولا يشرك في حكمه احدا (القرآن)

ترجمہ: ”اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں بتاتا۔“

ان آیات کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کا صرف رب اور اللہ ہی نہیں بلکہ بادشاہ اور حکم دینے والا بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان پیدا ہونے کی طور پر اللہ تعالیٰ کی مخلوق رعیت بندہ اور محکوم ہے اور حقیقی فرمانروا اور قانون ساز فقط اللہ ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

ان الامر كله لله (القرآن)

ترجمہ: ”بے شک حکم دینا صرف اللہ ہی کے لئے ہے۔“

دوسری جگہ ارشاد ہوا:

الا لله الخلق والامر (القرآن)

ترجمہ: ”خبردار تخلیق کرنا اور حکم دینا اسی کے لئے ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کا حاکم حقیقی، مقتدر اعلیٰ اور قانون ساز اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا نبی اس دنیا میں اس کا نمائندہ اور اس کے احکام و مرضیات کا شارح ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی اطاعت و راصل اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ ارشاد ہوا:

من يطع الرسول فقد اطاع الله (القرآن)

ترجمہ: ”جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے گویا اللہ کی اطاعت کی۔“

## 2- حاکم وقت اللہ کا خلیفہ:

اسلامی ریاست میں اللہ کے احکام جاری و نافذ کرنے کے لئے انسانوں میں سے ایک ایسے انسان کی ضرورت ہوتی ہے جو اس عظیم کام کی قیادت کا بیڑہ اٹھائے۔ یہ انسان خلیفہ اللہ فی الارض ہوتا ہے جسے امام یا صرف خلیفہ بھی کہتے ہیں۔ خلیفہ اپنی خواہشات کی تکمیل نہیں چاہتا نہ ہی اس کا مقصد لوگوں کو اپنی اطاعت میں لانا ہوتا ہے۔ وہ تو اللہ کے قوانین کو اقتدار کی طاقت سے اس کے بندوں پر لاگو کرتا ہے۔ اس فریضے کی انجام دہی کے لئے خلیفہ کی اطاعت بھی مسلمانوں پر واجب قرار دی گئی ہے۔

ارشاد ہوا:

اطيعوا الله و اطيعوا الرسول و اولی الامر منكم (القرآن)

ترجمہ: ”اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے حاکم کی۔“

اسی فکر و جذبہ سے سرشار ہو کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ بننے ہی لوگوں

سے فرمایا:

”میں آپ لوگوں پر حکمران بنایا گیا ہوں حالانکہ میں آپ کا سب

سے بہتر آدمی نہیں ہوں..... میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور رسول ﷺ کا مطیع رہوں اور اگر میں اللہ اور رسول ﷺ کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تم پر واجب نہیں۔ میں پیروی کرنے والا ہوں۔ حتیٰ راہ نکالنے والا نہیں ہوں۔“ (تاریخ طبری: 2/250)

اسی طرح حضرت عمرؓ نے فرمایا:

”لوگو! کوئی حقدار شخص اپنے حق میں اس درجہ کو نہیں پہنچا کہ اللہ کی معصیت میں اس کی اطاعت کی جائے۔“ (کتاب الخراج، ص: 117)

### 3- ریاست کے امور باہمی مشورے سے چلانا:

اللہ کے احکام کے نفاذ کے لئے خلیفہ اہل علم لوگوں سے مشورہ کرتا ہے تاکہ اللہ کے مقصود و مراد تک صحیح رسائی ہو۔ اس لحاظ سے اسلامی سیاسی نظم میں ڈکٹیٹر شپ اور مطلق العنان حکومت کی نفی ہوتی ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ مشورہ اہل رائے اور اہل علم سے ہی کیا جاتا ہے نہ کہ جاہل لوگوں سے۔

”مشاورت“ اسلامی نظام حکومت کا ایک اہم عنصر ہے جس کے بغیر خلافت، ملوکیت کا روپ دھار لیتی ہے۔ خود آنحضرت ﷺ ایسے امور میں جن میں وحی نازل نہیں ہوتی تھی، صحابہؓ سے مشورہ کرتے تھے۔ صحابہؓ ”بھی امور طے کرتے وقت آپس میں مشورہ کرتے تھے۔ ان کی اس اچھی عادت کا قرآن میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے:

وامرهم شورى بينهم (القرآن)

”اور ان کے امور آپس میں مشورے سے طے پاتے ہیں۔“

اسی مشاورت کے اصول کے تحت آنحضرت ﷺ نے جنگوں کے طریق کار اور بالیسوں کو وضع کیا، قوموں سے معاہدے کئے۔ اذان کو عداۓ صلوٰۃ کے طور پر منتخب فرمایا اور جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک کرنے کے بارے میں مشورہ فرمایا۔

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد مشاورت سے ہی حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ حضرت عثمانؓ کے انتخاب کے وقت تو مدینہ کی گلیوں سے گزرتے ہوئے تجارتی قافلوں میں شامل مردوں اور خاندان عورتوں سے بھی خلیفہ کے تقرر کے بارے میں مشورہ کیا گیا۔ ہر خلیفہ راشد نے امور حکومت میں مشورے کے لئے ایک مجلس مشاورت تشکیل دی تھی جس میں جلیل القدر صحابہ اور دانشور شامل ہوتے تھے۔ امور مملکت کے فیصلے اس مجلس میں بحث و تمحیص اور غور و فکر کے بعد ہی سرانجام پاتے تھے اور خلیفہ ان کے

مشوروں کا پابند ہوتا تھا۔

#### 4۔ تمام انسانوں کو مساوی حقوق:

اسلامی ریاست میں تمام بسے والے شہریوں کو بحیثیت انسان اور شہری برابر حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ اس میں نسل، رنگ، زبان، علاقہ اور حتیٰ کہ مذہب کی بھی تفریق نہیں کی جاتی۔ اسلامی نظریہ تخلیق کے مطابق تمام انسان بنیادی طور پر برابر ہیں۔ ان کی تخلیق بھی بنیادی طور پر ایک مرد اور عورت سے عمل میں لائی گئی ہے۔ بعد میں جب انسان تعداد کے لحاظ سے بڑھنے لگے تو انہیں قبائل اور گروہوں میں پہچان کی خاطر تقسیم کر دیا گیا۔

یہ گروہ اور قبائل محض پہچان کے لئے بنائے گئے۔ ان کو کسی فضیلت یا برتری کا معیار نہیں بنایا جاسکتا۔ کیونکہ فضیلت یا برتری کا معیار تو تقویٰ ہے۔ قرآن میں اس نظریہ کو ایک آیت میں نہایت جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

يا ايها الناس انا خلقكم من ذكر و انثى و جعلكم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اكرمكم عند الله اتقاكم (الحجرات: 13)

”اے لوگو! بے شک ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں قبیلوں اور گروہوں میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے سے پہچانے جاؤ۔ بے شک تم میں سب سے زیادہ فضیلت والا وہ ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ فضیلت والا ہے۔“

مندرجہ بالا آیت میں خطاب تمام انسانیت کو ہے۔ کسی خاص گروہ، قوم یا مذہب کے پیروکاروں کو نہیں۔ اسی مساوات کے تصور کو الطاف حسین حالی نے اس انداز میں پیش کیا ہے:

یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدیٰ کا

کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

اسی نظریہ مساوات انسانی کو آنحضرت ﷺ نے تفصیل و تشریح سے حجۃ الوداع کے مبارک موقع پر ارشاد فرمایا:

يا ايها الناس الا ان ربكم واحد لا فضل لعربی على عربى ولا لعجمى ولا لعجمى على عربى ولا لاسود على احمر ولا لاحمر على اسود الا بالتقوى (القرآن)

ترجمہ: ”لوگو! غور سے سنو بے شک تمہارا رب ایک ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر اور کسی کالے کو گورے پر اور کسی گورے کو کالے پر کوئی برتری یا فضیلت حاصل نہیں سوائے تقویٰ (نیک اعمال) کی بنیاد پر۔“

اگر مذکورہ آیت اور حجۃ الوداع کے اس خطاب کے الفاظ کے انتخاب پر غور کیا جائے تو

[www.kitabosunnat.com](http://www.kitabosunnat.com)



پتہ چلتا ہے کہ:

1- دونوں میں خطاب پوری انسانیت سے ہے کسی خاص گروہ یا مذہب کے پیروکاروں سے نہیں۔ پس اسلامی ریاست میں نہ صرف مسلمانوں کے بلکہ تمام انسانوں کے شہری حقوق برابر ہوں گے۔

2- دونوں میں انسانوں کو مخاطب کر کے مساوات کی پہلے علت اور وجہ بیان کی گئی ہے اور وہ دو ہیں: ایک طبی تخلیق کے لحاظ سے کہ تمام انسان مرد اور عورت کے ایک جوڑے سے پیدا کئے گئے ہیں اور دوسرا یہ کہ تمام انسانوں کی اس تخلیق کو نشوونما اور اس کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے والا رب ایک اللہ ہے۔ پس جب تمام انسان اپنی تخلیق اور نشوونما کے اعتبار سے ایک ہی ہیں تو پھر ان میں بحیثیت انسان کے تفاوت کیا مگر افسوس کے ہم مسلمان آج پھر نسل و وطن اور ذات و پات کی بنیاد پر فضیلت کا دعویٰ کرنے لگے ہیں اور عرب کی دوسری قومیں آج بھی خود کو عرب ہونے کے لحاظ سے دوسری غیر عرب قوموں سے برتر سمجھتی ہیں اور نعرۂ افتخار بلند کرتی ہیں۔

نحن ابناء العرب

”ہم عربوں کی اولاد ہیں۔“

ہمارے ہاں آج بھی سید ذات کی بنیاد پر غیر سید ذات پر فضیلت کا اس درجہ تک دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ایک سید لڑکی کا غیر سید سے نکاح نہیں ہو سکتا۔ یہ سب مشرکانہ باتیں ہیں جن کو ختم کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ تشریف لائے تھے۔

انسانی مساوات کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس ایک بڑے معزز قبیلہ کی عورت کو لایا گیا جس نے چوری کی تھی۔ آپ ﷺ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر فرمایا تو کچھ صحابہ آپ ﷺ کے پاس سفارش کے لئے آئے۔ آپ ﷺ ان کی سفارش سن کر سخت غصہ میں آ گئے اور اٹھ کر لوگوں سے یوں مخاطب ہوئے:

”اے مسلمانو! تم سے پہلی قومیں اسی لئے برباد کر دی گئیں کہ جب ان کی قوم کا آدمی آدمی جرم کرتا تو اسے سخت سزا دیتے اور جب اعلیٰ فرد جرم کرتا تو اسے چھوڑ دیتے تھے۔ خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر فاطمہ بنت محمد ﷺ بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتا۔“

5- ریاست کے معاملات میں عدل:

عدل کے معانی حق والے کو اس کا حق دے دینا اور چیز کو اس کی جگہ پر رکھ دینا کے ہیں۔ تو گویا عدل حقدار کو اس کا حق دینا اور چیزوں کو مناسب جگہ پر رکھنے کا نام ہے۔ عدل کا

متضاد ظلم ہے۔ قرآن میں عدل کے حق میں اور ظلم کی مذمت میں لاتعداد احکامات آئے ہیں۔ اسلامی ریاست میں تمام امور اور معاملات کی بنیاد عدل ہوتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ  
وَالْوَالِدِينَ وَالْأَقْرَبِينَ ۝

”اے ایمان والو! اللہ کے لئے انصاف کی ڈٹ کر گواہی دو چاہے وہ خود تمہارے تمہارے والدین اور قریبی لوگوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔“

عدل کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اس کام اور کردار کے مطابق جزا و سزا دی جائے اور اس میں اپنے پرانے دوست اور دشمن کی تفریق نہیں ہونی چاہئے۔

وَلَا يَجْرُ مَعَكُمْ حُشَانُ قَوْمٍ إِلَّا أَنْ لَا تَعْدِلُوا اْعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ  
”اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر راضی نہ کر دے کہ تم ان کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو کہ یہ تقویٰ کے قریب تر ہے۔“

انبیاء کی بعثت اور کتابوں کے نازل ہونے کا مقصد ہی لوگوں میں انصاف کا قیام تھا۔  
لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ  
بِالْقِسْطِ (الحجید: 25)

”بے شک ہم نے رسولوں کو واضح نشانیاں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتابیں نازل کیں اور میزان آتارا تاکہ لوگوں میں انصاف کا دور دورہ ہو۔“

اس لئے اسلامی ریاست کا یہ فریضہ ہے کہ وہ عدل قائم کرے۔ تمام لوگوں کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے لئے مساوی مواقع فراہم کرے۔

## 6۔ اسلامی ریاست میں اظہار رائے کی آزادی:

اسلام میں قانون سازی کا حق اور اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے پاس ہوتا ہے۔ اس لئے انسان اپنی رائے کے لحاظ سے برابر ہوتے ہیں۔ انسانوں کا کام اللہ کے احکامات کی تشریح، تعبیر، تفسیر اور تنقید (نافذ کرنا) اس لئے ہر انسان کو آزادی ہے کہ وہ معقول دلائل کی بنیاد پر اپنی رائے کا اس سلسلے میں اظہار کرے۔

اسلام مزاج کے اعتبار سے آزادی اور حریت کا دین ہے۔ وہ لوگوں کو سیاسی آزادی کا حق عطا کرتا ہے۔ اسلام میں لوگوں کو حق حاصل ہے کہ وہ اسلامی حدود کے اندر رہتے ہوئے حکومت کی پالیسیوں کے بارے میں کوئی بھی رائے رکھ سکتے ہیں۔ وہ اپنی رائے کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے تقریر و تحریر سے بھی مدد لے سکتے ہیں لیکن یہ خیال رہے کہ اسلام آزادی رائے

کی آڑ میں کسی شخص کو دنگا فساد، اشتعال انگیزی یا فحش نگاری کی اجازت نہیں دیتا۔

اس آزادی کی اسلام اخلاقی حدود کے اندر ہی اجازت دیتا ہے۔

اسلامی تاریخ کے اولین دور میں عرب کے بدو خلفائے اسلام پر بھرے عجمی میں تنقید کرتے تھے اور خلفاء اسی مثبت تنقید کی روشنی میں اپنا حکم بدل لیتے تھے۔ اس کی دلیل یہ مثال وہ واقعہ ہے جس میں حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ تقریر کے دوران لوگوں کو عورتوں کا زیادہ مہر مقرر کرنے سے منع فرمایا تو ایک عورت مجمع میں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ حضرت عمرؓ سے مخاطب ہو کر کہا:

”اے عمر! تمہیں یہ کس نے حق دیا ہے کہ تم عورتوں کے اس حق کو خصب کرو جو انہیں خدا نے دیا ہے۔“

یہ کہہ کر عورت نے قرآن کی یہ آیت پڑھی:

وَلَوْ اَتَيْتُم اَحَدَهُن قَنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْهُ مِنْ شَيْءٍ (القرآن)

ترجمہ: ”اور اگر تم نے ان میں سے (عورتوں میں سے) کسی کو ڈھیر سارا خزانہ بھی دے دیا ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔“

عورت کی یہ دلیل سن کر حضرت عمرؓ نے ہرلا کہا:

”عورت نے ٹھیک کہا اور عمرؓ نے غلطی کی۔“

اسی طرح دوسرا واقعہ بھی حضرت عمرؓ کا ہے جب آپؓ جمعہ کا خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے تو ایک بدو کھڑا ہو گیا اور فرمایا:

”اے عمرؓ خدا کی قسم ہم تیری بات ہرگز نہ سنیں گے جب تک تو یہ نہ بتائے کہ مال غنیمت کے کپڑے سے ہمارا کرتہ تو نہیں بناتیرا کیسے بن گیا ہے؟“

اس اعتراض پر حضرت عمرؓ بیٹھ گئے اور انہوں نے اپنے بیٹے کو حکم دیا کہ وہ اس کا جواب دے۔ آپؓ کا بیٹا کھڑا ہو گیا اور اس نے بتایا کہ ”اے لوگو! میں نے اپنے حصے کا کپڑا والد صاحب کو دے دیا تھا جس سے ان کا کرتہ بن گیا ہے۔“ اس پر بدو خاموش ہو گیا۔

7- عقیدے کی آزادی:

اسلام بنیادی طور پر آزادی اور وسعت انظرنی کا دین ہے۔ لوگوں کو طاقت کے ذریعے اپنے پیروکار نہیں بنانا بلکہ قوی دلائل سے اپنی صداقت کا لوگوں کو قائل کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَا اِكْرَاهُ فِى الدِّينِ

ترجمہ: ”دین میں زبردستی نہیں ہے۔“

اسلامی ریاست میں غیر مسلم اپنی روایات، عقیدہ اور تہذیب کے مطابق زندگی بسر کر سکتے ہیں اور ان کے مذہبی حقوق کا اسی طرح تحفظ کیا جائے گا جس طرح مسلمانوں کے مذہبی حقوق کا۔

## اسلامی ریاست کے مقاصد

قرآن و سنت کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی ریاست کے مقاصد درج ذیل ہیں:

- 1- اجتماعی اطاعت، اقامت صلوٰۃ
- 2- معاشی نظام کا قیام (ایتائے زکوٰۃ)
- 3- امر بالمعروف
- 4- نہی عن المنکر
- 5- مصالح شرعیہ کا تحفظ
- 6- عدل کا قیام

### 1- اجتماعی اطاعت:

انسان کا من حیث انسان ہونا اجتماعیت کا تقاضا کرتا ہے۔ اس اجتماعیت کے استحکام کے لئے ضروری ہے کہ تمام انسان کسی ایک ہستی کی اطاعت کریں تاکہ ان کے درمیان فیصلوں اور تنازعات کی صورت میں اختلاف رائے نہ ہو مثلاً اگر انسانوں میں یہ جھگڑا پڑ جائے کہ وراثت میں کن لوگوں کو حصہ ملنا چاہئے اور کتنا ملنا چاہئے تو انسان ساری عقل اور ساری کاوش کے باوجود کسی حقیق علیہ نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا کیونکہ ہر وارث اپنے حصے کے حق میں دلائل دے گا۔ انجام لڑائی جھگڑا اور قتل و غارت ہو گا یا جس کی لاشی اس کی جھینس کے مصداق طاقتور فریق ساری وراثت کا حقدار بن جائے گا اور یہی کچھ زمانہ جاہلیت میں ہوتا رہا ہے کہ ساری وراثت یا تو اولاد اکبر کے اصول کے تحت صرف بڑے بیٹے کو مل جاتی تھی یا اولاد مذکور کے قانون کے تحت صرف بیٹوں کو حاصل ہوتی تھی۔ اس طرح کمزور صنف یعنی بیٹیاں وراثت سے محروم رہ جاتی تھیں مگر انسان نے جب اسلام قبول کر کے اللہ تعالیٰ کی اجتماعی طاقت اختیار کی تو بیٹیوں کو بھی حصہ مل گیا اور انسان نے مسلمان ہو کر قرآنی قانون وراثت کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور اس طرح مورث کی وفات کے بعد وراثت کے جھگڑے سے نجات حاصل کر لی۔ یہی حال معاشرت، معیشت اور سیاست کے بنیادی اصولوں کے طے ہو جانے کا ہے۔

قرآن نے اس اجتماعی اطاعت کو نظام صلوٰۃ کے تحت منظم کیا ہے۔ قرآن میں اقامت

صلوٰۃ کا سنکڑوں جگہ مختلف انداز میں ذکر ہوا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن نے جس جگہ بھی مومنوں کی تعریف کی ہے یا اسلامی حکومت کی ذمہ داریوں کا تعین کیا ہے وہاں ان کی پہلی خصوصیت اقامت صلوٰۃ کو قرار دیا ہے۔ یاد رہے کہ اقامت صلوٰۃ سے مراد صرف مسجد یا گھر میں نماز کی ادائیگی ہی نہیں بلکہ اپنی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی اس طرح اطاعت ہے جس طرح مسجد میں ہم خدا کے حضور سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔

ہر پیغمبر نے اپنی قوم کو اقامت صلوٰۃ کا حکم دیا اور جن لوگوں نے اس پیغمبر کی یہ بات نہ مانی وہ دراصل صلوٰۃ کا صحیح مطلب سمجھتے تھے ورنہ چند رکعت کی ادائیگی ان کے لئے بارگراں نہ تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اقامت صلوٰۃ قبول کرتے ہی انہیں غریبوں اور کمزور لوگوں کے معاشرتی و معاشی استحصال کی اجازت نہ ہوگی۔

اسلامی ریاست کا اولین مقصد ہی اقامت صلوٰۃ ہے جس کا مطلب اپنی تمام حرکات و سکنات کو اللہ کے احکام کا پابند بنانا ہے۔ اقامت صلوٰۃ کے بعد کوئی شخص سید پٹھان یا برہمن ہونے کی بنیاد پر دوسروں پر ترجیح حاصل نہیں کر سکتا۔ افسر ماتحت، امیر غریب سب مساوی ہو جاتے ہیں۔ اس طرح احترام آدمیت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

قرآن میں اسلامی ریاست کے اس اولین مقصد کی طرف یوں توجہ دلائی گئی ہے:

الذین ان مکفہم فی الارض اقامو الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف و نہوا عن المنکر ۝

ترجمہ: ”یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین پر انہیں اقتدار عطا کریں تو وہ اقامت صلوٰۃ کریں گے، زکوٰۃ دیں گے اور نیکی کا حکم دیں گے اور بُرائی سے روکیں گے۔“

## 2- معاشی نظام کا قیام:

مذکورہ بالا آیت سے اسلامی ریاست کا دوسرا ہدف استحصال سے پاک معاشی نظام کا قیام ہے جسے قرآن ایتائے زکوٰۃ کے اصول پر قائم کرتا ہے۔ قرآن میں جہاں بھی اقامت صلوٰۃ کا ذکر آیا ہے وہاں ساتھ ہی ایتائے زکوٰۃ کا حکم آیا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا لازمی تقاضا اپنے ان غریب و محروم بھائیوں کو اپنی کے پاؤں پر کھڑا کرنے میں مدد دینا ہے جو کسی وجہ سے معاشی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہوں۔ اسلام معاشی استحکام کو اسلامی ریاست و معاشرے کے لئے لازمی عنصر قرار دیتا ہے۔ قرآن میں بار بار غریبوں کو کھانا کھلانے، ان کی مدد کرنے، انہیں اپنے وسائل میں شریک کرنے کا حکم آیا ہے۔ اسلام اس حقیقت کو باغ و دہل تسلیم کرتا ہے کہ معاشی عدم استحکام کا شکار افراد ہوں یا قوم اسلام کے مقاصد کو پورا نہیں کر سکتے۔ حدیث میں تو فقر اور غربت کا شکار انسان کے لئے اسلام پر قائم رہنا بھی مشکوک قرار دیا گیا ہے۔

حدیث میں آیا ہے:

كاد الفقر ان يكون كفراً

ترجمہ: ”یعنی قریب ہے کہ غربت انسان کو کفر تک لے جائے۔“

حضرت ابو بکرؓ کے دور میں جب ایک قبیلے نے حکومت کو زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کیا تو آپ نے ان کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ یہ اس لئے کہ ایک طرف تو زکوٰۃ کا حکومت کو ادا نہ کرنا اجتماعی اطاعت (اسلامی ریاست کا اولین مقصد) کے خلاف تھا اور دوسری طرف یہ اسلام کے معاشی نظام کے قیام اسلامی ریاست کے دوسرے مقصد کی راہ میں روڑے اٹکانے کے مترادف تھا حالانکہ ان لوگوں نے عقائد میں نہ اللہ کی معبودیت سے انکار کیا تھا نہ رسول ﷺ کی رسالت سے۔

### 3- امر بالمعروف:

اسلامی ریاست کا تیسرا بڑا مقصد امر بالمعروف (نیک کاموں کا حکم دینا) ہے۔ معروف کا لفظی ترجمہ عام طور پر نیکی یا نیک کام کیا جاتا ہے مگر حقیقت میں معروف سے مراد ہر وہ کام ہے جو معاشرہ کی نشوونما و اصلاح کے لئے ضروری اور پسندیدہ ہو۔

اسلامی ریاست کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے پسندیدہ کاموں پر لوگوں کو ترغیب دلائے۔ اگر وہ زبانی ترغیب و ہدایت کے باوجود پسندیدہ کام نہ کریں تو انہیں اپنے حکم سے کرائے۔ حکم سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اگر محکوم بات نہ مانے تو اسے طاقت سے منوائے۔ پس معلوم ہوا کہ اسلامی ریاست پسندیدہ کام کے فروغ کے لئے نافرمان اور سرکش افراد کے خلاف طاقت کا استعمال بھی کرے گی کیونکہ جہاں تبلیغ و نصیحت سے کام نہ چلے وہاں طاقت کا استعمال ایک ناگزیر حقیقت ہے ورنہ پورا معاشرہ چند سرکش افراد کی سرکشی اور نازیبا حرکات کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔

اللہ تعالیٰ اس مقصد کے حصول کے لئے ایک گروہ کی خاص طور پر تیاری کا حکم دیتا ہے کیونکہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سلسلے میں سرکش غنڈے اور آوارہ لوگوں سے مقابلے اور ٹکراؤ کا خدشہ ہے جس کی تاب ایک صالح فرد یا دو تین صالح افراد نہیں لاسکتے۔

ارشاد ربانی ہے:

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (القرآن)

ترجمہ: ”اور تم میں سے ایک ایسا گروہ ہونا چاہئے جو نیکی کی طرف لوگوں کو بلائے پسندیدہ کاموں کا حکم دے اور ناپسندیدہ کاموں سے روکے۔“

اسلامی ریاست میں اس مقصد کے حصول میں عوام پر تعاون بھی فرض ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان ○

ترجمہ: ”تقویٰ اور نیکی کے کاموں میں تعاون کریں اور گناہ اور ظلم کے کاموں میں تعاون نہ کریں۔“

#### 4- نبی عن المنکر:

اسلامی ریاست کا چوتھا مقصد ناپسندیدہ کاموں سے روکنا ہے جسے قرآن کی اصطلاح میں ”نبی عن المنکر“ کہا گیا ہے۔ لفظ ”منکر“ معروف کا متضاد ہے۔ ”منکر“ کا عام ترجمہ ”برائی“ کیا جاتا ہے۔ وسیع تر معنوں میں ”منکر“ ہر وہ کام ہے جو معاشرہ کی ترقی و نشوونما میں رکاوٹ ہو۔ ایسے کام خدا کے نزدیک ”ناپسندیدہ کام“ کہلاتے ہیں۔

”امر بالمعروف“ کی طرح ”نبی عن المنکر“ کا فریضہ بھی بنیادی طور پر اسلامی ریاست کا ہے اور اس میں تعاون عوام کا فرض ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

من رای منکم منکرا فلیخبرہ بیدہ فان لم یستطیع فیلسانہ وان لم یستطیع فبقلمہ و ذلک اصنعف الایمان.

ترجمہ: ”تم میں سے جو برائی دیکھے پس اسے چاہئے کہ وہ اسے ہاتھ (طاقت) سے روک دے اور اگر اس کی اسے طاقت نہ ہو تو اسے اپنی برائی کو زبان (تبیخ) سے روک دے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو اسے اپنے دل میں نہ آجیے اور یہ ایمان کی کمزور ترین نشانی ہے۔“

حدیث بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ ”نبی عن المنکر“ کا فریضہ ہر مسلمان پر اپنی استطاعت اور حالات کے مطابق عائد ہوتا ہے مگر حکومت پر فریضہ اول درجے کا یعنی طاقت سے برائی روکنے کا عائد ہوتا ہے جبکہ عوام پر ان کی استطاعت اور حالات کے مطابق یہ فریضہ عائد ہوتا ہے۔

#### 5- مصالح شرعیہ کا تحفظ:

اسلام کی آمد کا ایک بڑا ہدف مصالح شرعیہ کا تحفظ ہے۔ مصالح شرعیہ سے مراد وہ فوائد (Interest) ہیں جو شریعت معاشرے کے ہر فرد کو فراہم کرتی ہے چاہے وہ فرد مسلمان ہو یا غیر مسلم، امیر ہو یا غریب۔ مصالح شرعیہ درج ذیل ہیں:

1- تحفظ جان

2- تحفظ مال

3- تحفظ نسب

4- تحفظ شہرت

5- تحفظ عقل

اسلام نے ان تحفظات کو یقینی بنانے کے لئے حدود و قصاص کی سزائیں مقرر کی ہیں۔ یہ سزائیں ان افراد کو دی جائیں گی جو ان تحفظات کو سمیٹا کر کریں گے مثلاً:

الف: تحفظ جان کی خاطر قاتل کو قصاصاً قتل کیا جائے گا۔ زخم کے بدلے زخم لگایا جائے گا۔

ب: تحفظ مال کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے چور کی سزا ہاتھ کاٹنا مقرر کی ہے۔

ج: تحفظ نسب کو یقینی بنانے کے لئے زنا کی سزا کوڑے مقرر کی ہے۔

د: تحفظ شہرت کے لئے قذف (کسی پر بدکاری کرنے کی تہمت لگانا) کی سزا اسی (80) کوڑے متعین کر دی گئی ہے۔

ر: عقل کے تحفظ کے مقصد کے حصول کے لئے شراب نوشی کی سزا بعض فقہاء کے نزدیک چالیس اور اکثر کے نزدیک اسی (80) کوڑے ہے۔

## 6- عدل کا قیام:

دنیا میں کوئی بھی معاشرہ کسی وقت بھی تنازعات سے پاک صاف نہیں رہا۔ افراد کے آپس میں قبیلوں کے مابین اور گروہوں کے درمیان سینکڑوں تنازعات جنم لیتے رہتے ہیں۔ انسان معاشرتی طور پر خود پسند واقع ہوا ہے۔ وہ اپنے خصائص اور اپنی اقدار کو ہی زمانے کی بہترین اقدار سمجھتا ہے اور اپنے خصائص و اقدار سے مختلف خصائص و اقدار کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ دوسری طرف معاشرتی حیوان ہونے کے ناطے وہ روزمرہ سینکڑوں لوگوں سے معاشرتی تعامل (Social Interaction) کرتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر اختلافات اور تنازعات جنم لیتے ہیں۔ اگر ان تنازعات کے حل کے لئے کوئی ریاستی اور بااختیار ادارہ قائم نہ ہو تو یہ تنازعات تصادم جنگ اور خونریزی پر انجام پذیر ہوں۔ اس لئے ریاست کا ایک اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ ان تنازعات کو ختم کرائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تنازعات کن قوانین کے تحت نمٹائے جائیں گے۔ ظاہر ہے اس سلسلہ میں اسلامی قوانین اور تعلیمات کو بنیاد بنایا جائے گا۔ پس مساوات انسانی کے اصول کے تحت بڑے چھوٹے قوی ضعیف امیر غریب سب کے لئے ایک ہی قسم کے قوانین ہوں گے۔ نیز اسلامی ریاست معاشرہ کے تمام افراد کے لئے ایسے وسائل مادی طور پر فراہم کرے گی جو ان کی نشوونما اور ترقی کے لئے ضروری ہوں۔

اگر ریاست اسلامی عدل کے نفاذ کا فریضہ سرانجام نہ دے تو جس کی لاشی اس کی بھینس کے مصداق طاقتور کمزور پر چڑھ دوڑے۔ ہر طبقہ اپنے مطلب اور فائدے کے قوانین و اصول وضع کرے اور دوسروں کو ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے مجبور کرے۔



قرآن میں ارشاد ہوا:

واذا حکمتکم بین الناس ان تحکمو بالعدل ○ (58:4)  
 ”اور جب تم لوگوں کے (تنازعات میں) فیصلے کرنے لگو تو (تم پر لازم ہے) عدل کے ساتھ فیصلے کرو۔“

عدل ایک ایسا فریضہ ہے جسے دشمنوں کے ساتھ بھی کرنے کا حکم آیا ہے۔  
 ارشاد ربانی ہے:

ولا یجوز منکم شنان قوم الا ان لا تعدلوا اعدلوا هو اقرب للتقوی ○ (5:8)  
 ”اور کسی قوم سے تمہاری دشمنی تمہیں ان کے ساتھ ناانصافی کرنے پر مائل نہ کر دے۔  
 عدل کرو کہ یہ تقویٰ کے قریب ترین ہے۔“  
 ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

ان الله یامر بالعدل والاحسان ○ (النحل: 90)  
 ”بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کرنے کی تلقین کرتا ہے۔“  
 اسلام میں عدل کی اہمیت کا اندازہ حضرت علیؓ کے اس قول سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:  
 الملک یشقی مع الکفر ولا یشقی مع الظلم.  
 ”ملک (سلطنت) کفر کے ساتھ تو بقاء پذیر ہو سکتی ہے مگر ظلم کے ساتھ بقاء پذیر نہیں ہو سکتی۔“ ظلم عدل کا متضاد ہے۔

عدل قرآن کریم کی ایک بنیادی قدر و اصطلاح ہے جسے معاملات میں مسلمانوں کا اولین اہم ترین فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مادہ ”عدل“ ہے جس کا معنی دونوں اطراف کا برابر ہونا ہے۔ یعنی افراط و تفریط کو چھوڑ کر درمیانی راہ اختیار کرنے کو اعتدال کہا جاتا ہے۔ کسی کی محنت کا جو حق بنتا ہے اسے دے دینا۔ معاملات میں توازن برقرار رکھنے کو بھی عدل کہا گیا ہے اور اس کے لئے میزان کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

واقیموا الوزن بالقسط ولا تخسروا المیزان ○ (القرآن)

”اور تم میزان کو عدل سے برقرار رکھو اور میزان میں کمی نہ کرو۔“

یعنی توازن کو ہاتھ سے کبھی بھی جانے نہ دو۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے کہ:

”تم لوگوں کے جھگڑے چکانے میں عدل کے ساتھ فیصلے کرو۔“

عدل کے ساتھ گواہی دینے کا حکم قرآن میں اس صراحت اور وضاحت کے ساتھ آیا ہے کہ کئی گواہی چاہے اپنے خلاف اپنے قریبی رشتہ داروں کے خلاف یا امیر لوگوں کے خلاف بھی جائے تو بھی اسے یہ گواہی دینی چاہئے کیونکہ کئی گواہی کے چھپانے سے قرآن کا نظام

عدل قائم نہیں رہ سکتا۔ ہر رسول کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایک میزان (اصول عدل) بھی نازل کی تاکہ وہ نظام معاشرت کو انصاف (قسط) کے ساتھ قائم رکھیں۔ آنحضرت ﷺ کو بھی یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں میں عدل کریں۔

## اسلامی ریاست کی اہمیت

ایک مسلم معاشرے کے لئے اسلامی ریاست کا قیام ناگزیر ہے کیونکہ اس کے بغیر دینی احکامات پر عمل درآمد ممکن نہیں ہو سکتا۔ ایک مسلم معاشرے کے لئے اسلامی ریاست کی ضرورت و اہمیت کو درج ذیل نکات کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے:

### 1- تکمیل دین کا تقاضا:

دین کی تکمیل کے لئے اسلامی ریاست کا ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر اسلام کے ضابطوں کو نافذ کرنا ناممکن ہے۔

### 2- تائید اسلام:

اسلام کے حقیقی مقاصد کے حصول کے لئے اسلامی حکومت کا ہونا انتہائی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر مسلمانوں کو وہ طاقت حاصل نہیں ہو سکتی جس سے اسلام کی حفاظت کی جا سکے۔ اقتدار کے حصول کی دعا خود حضور نبی کریم ﷺ نے فرمائی ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوتا ہے:

ترجمہ: ”اور (میرے رب) اپنی طرف سے اقتدار کو میرا دعا گو بنا دے۔“

### 3- قومی ترقی میں اہم کردار:

ایک مسلم معاشرے کی قومی ترقی میں اسلامی ریاست بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ریاست کی کوششیں ایک اجتماعی شکل میں ملک و قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے مواقع فراہم کرتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ معاشی منصوبوں کی تکمیل بین الاقوامی معاہدے اور خارجہ پالیسی جیسے معاملات جو قومی ترقی کے لئے بہت اہمیت کے حامل ہیں ریاست کے بغیر نہیں چل سکتے۔

### 4- بیرونی سرمایہ اور فنی مہارت کا حصول:

دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات استوار کر کے بیرونی سرمایہ اور فنی مہارت حاصل کرنا صرف ریاست کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

## 5- داخلی امن:

ملک کے اندر امن و امان کی صورت حال کو قائم رکھنا صرف ریاست کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ داخلی امن کے بغیر معاشرہ تباہی کا شکار ہو جاتا ہے کیونکہ بڑے عناصر جو فتنہ فساد پھیلاتے ہیں ان کی سرکوبی صرف ریاست ہی کر سکتی ہے۔

## 6- اسلام کی تبلیغ و اشاعت:

اسلام کی منظم طریقے سے تبلیغ و اشاعت صرف ریاست ہی کر سکتی ہے اس لئے ایک مسلم معاشرے میں اسلامی ریاست کا ہونا ناگزیر ہے۔

## 7- امر بالمعروف و نہی عن المنکر:

اچھائی کے حکم کی اشاعت اور بُرائی کے کاموں کو روکنا اسلامی ریاست کے بغیر بہت مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

ترجمہ: ”یہ وہ لوگ ہیں جب ہم انہیں زمینی اقتدار بخشیں گے تو یہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور اچھائی کا حکم دیں گے اور بُرائی سے روکیں گے۔“

## 8- نظام عدل کا قیام:

نظام عدل کے بغیر ریاست کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس کے بغیر نہ تو اسلام کی تکمیل ہو سکتی ہے اور نہ ہی قوم ترقی کر سکتی ہے۔ اسلام کی تکمیل اور ملک و قوم کی ترقی کے لئے نظام عدل کا قیام ضروری ہے اور نظام عدل کے قیام کیلئے اسلامی ریاست کا ہونا ناگزیر ہے۔

## ماہصل:

درج بالا تفصیل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ۔

1- ریاست کا ادارہ انسانی سماج کی ایک بنیادی ضرورت ہے اور اس کے بغیر منظم اجتماعی زندگی کا تصور مشکل ہے۔

2- اسلام انسان کی پوری زندگی کے لئے ہدایت ہے اور اس نے اجتماعی زندگی کے لئے بھی واضح رہنمائی دی ہے۔

3- اسلام دین و سیاست میں کوئی فرق قائم نہیں کرتا اور پوری زندگی خدا کے قانون کے تابع کرنا چاہتا ہے۔

4- اسلامی ریاست ایسے اقدامات کرتی ہے جس سے تمام لوگوں کی دنیا اور آخرت سنور جائے۔ اس لئے ایک اسلامی ریاست کے مقاصد بہت اعلیٰ ہوتے ہیں اور یہ دیگر ممبری اور لادینی ریاستوں سے بہت ممتاز اور اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔

## خلفائے راشدین کے انتخاب کی نوعیت

خلفائے راشدین کے زمانے میں خلیفہ کے منتخب کرنے میں کسی قسم کے سرکاری دباؤ یا اثر و رسوخ کے متعلق سوچا بھی نہیں جاسکتا اسی طرح کسی قسم کی طاقت کا استعمال کرنے کا بھی سوچنا غلط ہے۔ عوام نے اپنی آزاد رائے سے ہمیشہ خلیفہ یعنی سربراہ مملکت اسلام کا انتخاب کیا۔ خلیفہ اول کے انتخاب کے وقت انصار کی جماعت نے اکٹھے ہو کر اور ہم مشورہ ہو کر آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ صرف حضرت علیؓ نے کچھ ماہ بعد یہ فرض ادا کیا اور یہ دیر کرنے کی وجہ بھی انہوں نے خود بیان کر دی تھی۔

خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کا نام حضرت ابوبکرؓ نے صاحب الرائے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کرنے کے بعد پیش کیا تھا اور عام مسلمانوں نے اس کی بھی تائید کر دی تھی۔ خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ کے انتخاب کے وقت حضرت عمرؓ کی وصیت کردہ چھ رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اس کا فیصلہ بھی عوام نے صادر کیا تھا۔

البتہ چوتھے خلیفہ کے انتخاب میں انصار و مہاجرین کی ایک جماعت نے آغوش نبوت میں پرورش پانے والے ولما در رسول مقبول حضرت علیؓ کو خلیفہ بننے پر مجبور کیا مگر انہوں نے جواب دیا تھا: ”انہیں امیر بننے کی بجائے وزیر بننا زیادہ پسند ہے۔ تم جس کو چاہو منتخب کر لو میں راضی ہوں۔“ لیکن لوگوں نے بہت زیادہ زور دیا۔

حضرت علیؓ مسجد نبویؐ میں عوام کی رائے سے مسند خلافت پر رونق افروز ہوئے۔ چاروں خلفاء میں سے کوئی بھی اپنی مرضی سے طاقت یا خواہش سے مسند خلافت پر نہیں

آیا۔

### خلیفہ کا انتخاب:

جب رسول خدا ﷺ پر بیماری نے حملہ کیا اور آپ ﷺ نقل و حرکت کرنے سے مجبور ہوئے تو آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو نبوت کا سب سے اہم منصب یعنی مسجد نبویؐ کی امامت کی اجازت فرمائی تو یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی جانشینی کی طرف اشارہ تصور کیا جاسکتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آپ ﷺ کی ظاہری حیات مبارکہ میں سترہ نمازوں کی امامت فرمائی چونکہ اسلام میں نظام شورائی (شوری) کی بہت اہمیت ہوتی ہے اسی لئے آپ ﷺ نے کسی کو وضاحت کے ساتھ اپنا جانشین نامزد نہ فرمایا اور نہ ہی نظام شورائی کو توڑنا پسند فرماتے تھے۔

آپ ﷺ کی محبت اور تعلیم نے آپ ﷺ کے صحابہ میں ایسی بصیرت اور قوت فیصلہ ودیعت کر دی تھی کہ آپ ﷺ کو اپنے بعد اسلام میں کسی غلطی کی گنجائش یا امکان نہ رہ گیا تھا اور اسی وجہ سے آپ ﷺ نے مستقبل کے بارے میں صراحت سے کوئی وصیت کرنے کی بجائے سکوت فرمایا زیادہ مناسب خیال فرمایا۔

آپ ﷺ کے وصال کے بعد منافقوں کی جماعت کو جو دوسری اور اسلام کے پردے میں اسلام کی جڑیں کھوکھلی کرنا چاہتے تھے، فتنہ انگیزی کا موقع میسر آ گیا۔ انہوں نے آپ ﷺ کی تعظیم و تحسین سے بھی پہلے آپ ﷺ کی جانشینی کا جھگڑا کھڑا کر دیا اور اگر اس کا فوری افساد نہ کیا جاتا تو حالات نازک صورت اختیار کر جاتے۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کو یہ اطلاع ملی تو آپ نے حضرت عمرؓ اور عبیدہ بن الجراحؓ کو ہمراہ لیا اور سقیفہ بنی سعد (ساعد) جا پہنچے لیکن وہاں کے حالات ہی عجیب صورت اختیار کر چکے تھے۔

انصار دعویدار تھے کہ انہیں بھی حضور ﷺ کی جانشینی میں حصہ دار بنایا جائے اور قریش کے ساتھ ان کا بھی ایک نائب رسول ہونا چاہیے۔ اگر کسی ایک شخص کے دو جانشین ہوتے تو نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ اسلام کا شیرازہ بکھر جاتا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے موقع کی نزاکت کو بھانپ لیا اور انصار کو نہایت نرمی اور حلیمی سے سمجھایا اور ان کی اسلامی خدمات کا اعتراف بھی کیا۔ انہیں مشورہ دیا کہ ابوعبیدہؓ اور عمر بن خطابؓ یہاں موجود ہیں ان میں سے جسے پسند کر لو بیعت کر لو۔ جب حضرت عمرؓ نے آپؐ کی زبان سے یہ الفاظ سنے تو فوراً اپنا ہاتھ بڑھایا اور آپؐ کے ہاتھ میں دے دیا اور فرمایا: ”آپؐ ہم سب میں بزرگ ہیں۔ ہم سب میں بہتر ہیں اور رسول خدا ﷺ کے سب سے زیادہ مقرب ہیں اس لئے ہم آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔“ یہاں دو امور سمجھنے کے لائق ہیں:

1- خلفاء راشدین میں سے ہر ایک کا انتخاب کس طرح عمل میں آیا؟

2- خلفاء راشدین کے انتخاب میں مشترک اصول کا جائزہ۔

خلفاء اربعہ کا انتخابی طریقہ کار:

پہلے جزو کا مختصر جواب یہ ہے کہ خلفاء راشدین کے زمانہ میں خلیفہ کے منتخب کرنے میں کسی قسم کے سرکاری دباؤ یا اثر و رسوخ کے متعلق سوچا بھی نہیں جاسکتا اسی طرح کسی قسم کی طاقت کا استعمال کرنے کا بھی سوچنا عبث ہے۔ عوام نے اپنی آزاد رائے سے ہمیشہ خلیفہ یعنی سربراہ مملکت اسلام کا انتخاب کیا۔

## 1۔ خلیفہ اول کا انتخاب:

حضرت ابوبکرؓ 13ھ میں بیمار ہوئے جب ناتوانی زیادہ ہوئی تو حضرت عمرؓ امامت کراتے رہے۔ جب اٹھنے بیٹھنے سے معذور ہوئے تو اپنا جانشین مقرر کرنے کے لئے صحابہ کرامؓ سے مشورہ فرمایا اور حضرت عمرؓ کو نامزد کیا۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے عرض کیا:

”بلاشبہ حضرت عمرؓ کی اہلیت میں کوئی شک و شبہ نہیں لیکن وہ کسی قدر سخت ہیں۔“

حضرت عثمانؓ نے فرمایا:

”ان کا باطن ان کے ظاہر سے اچھا ہے۔“

حضرت طلحہؓ جو حضرت ابوبکرؓ کی عیادت کے لئے تشریف لائے تھے انہوں نے بھی حضرت عمرؓ کی ورثی اور سخت مزاج طبیعت کی شکایت کرتے ہوئے کہا:

”جب وہ آپ کے سامنے اتنے سخت ہیں تو آپ کے بعد نہ جانے کیا کریں گے۔“

خلیفہ اول نے جواب میں فرمایا:

”جب ان پر خلافت کا بوجھ پڑے گا تو آپ نرم ہو جائیں گے۔“

ایک اور صحابی نے عرض کیا: ”آپ ان کی ورثی کے باوجود ان کو اپنا جانشین بنانا چاہتے ہیں! خدا کو کیا جواب دیں گے۔“

حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا:

”میں عرض کروں گا کہ خدا یا میں نے تیرے بندوں میں ایسے شخص کو

منتخب کیا تھا جو ان میں سب سے اچھا تھا۔“

یہ کہنے کے بعد حضرت عثمانؓ کو وصیت لکھوانا شروع کر دی۔ ابھی ابتدائی چند الفاظ ہی لکھوائے تھے کہ غشی طاری ہو گئی۔ حضرت عثمانؓ نے خود ہی حضرت عمرؓ کا نام لکھ دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب ہوش میں آئے اور تحریر پڑھا کر سنی! جب حضرت عمرؓ کا نام سنا تو ان کی زبان سے بے اختیار ”اللہ اکبر“ کے الفاظ نکل گئے اور فرمانے لگے: خدا تم کو جزائے خیر دے تم نے میرے دل کی بات لکھ دی۔ جب وصیت نامہ مکمل کر دیا تو اپنے غلام کو حکم دیا کہ اسے لے جا کر صحابہ کے مجمع میں سناؤ اور خود بالاخانہ پر تشریف لے گئے اور جو لوگ وہاں جمع تھے ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: میں نے اپنے کسی عزیز کو خلیفہ نہیں بنایا بلکہ اس شخص کو منتخب کیا ہے جو میرے نزدیک تم سب سے بہتر ہے۔ سب نے اس حسن انتخاب کی تائید کی۔

خلیفہ اول کے انتخاب کے وقت انصار کی جماعت نے اسٹھ ہو کر اور ہم مشورہ ہو کر

آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ صرف حضرت علیؓ نے کچھ ماہ بعد یہ فرض ادا کیا اور یہ دیر کرنے کی وجہ بھی انہوں نے خود بیان کر دی تھی جس کا ذکر ہم قبل ازیں کر چکے ہیں۔

## 2- خلیفہ ثانی کا انتخاب:

خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کا نام حضرت ابو بکرؓ نے صائب الرائے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کرنے کے بعد پیش کیا تھا اور عام مسلمانوں نے اس کی بھی تائید کر دی تھی۔

## 3- خلیفہ ثالث کا انتخاب:

حضرت عمرؓ کو سب سے اہم مسئلہ جانشینی کا معلوم ہوا۔ جب آپؐ کی زندگی میں جانشین بنانے کے لئے لوگوں کا اصرار بڑھنے لگا تھا تو آپؐ نے فرمایا:

”حضرت علیؓ۔ حضرت عثمانؓ۔ حضرت زبیرؓ۔ حضرت طلحہؓ۔ حضرت سعدؓ اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ جن کو رسول کریم ﷺ نے جنت کی بشارت دی تھی اور ان کی اسلام میں بڑی خدمات تھیں، نامزد کرنے کے بعد فرمایا ان میں جس پر کثرت رائے ہو جائے اسے امیر بنانا۔ یہ بھی تاکید فرمائی کہ میرے بعد تین دن کے اندر اندر یہ مرحلہ طے ہو جائے۔

پھر جب مصیب کو حکم دیا کہ میرے دن سے فراغت کے بعد ان چھ اصحاب کو ایک مکان کے اندر بند کر دینا اور جب تک کسی کا انتخاب نہ ہو جائے اس وقت تک نہ کھولنا۔ عبداللہ مشورے میں شریک رہیں گے لیکن امدت سے ان کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔

کثرت رائے کے بعد اگر کوئی شخص خلافت کا داعی رہے تو اسے قتل کر دینا۔“

خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ کے انتخاب کے وقت حضرت عمرؓ کی وصیت کردہ چھ رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔ اس کا فیصلہ بھی عوام نے صادر کیا تھا۔

## 4- خلیفہ چہارم کا انتخاب:

جب چوتھے خلیفہ کا وقت آیا تو عثمانؓ شہید ہو چکے تھے۔ تین دن منہ خالی رہی ہر طرف باغی چھائے ہوئے تھے۔ حضرت علیؓ کی ذات ہی ایسی تھی جس پر سب کا اتفاق ہو سکتا تھا اس لئے انصار و مہاجرین جن میں حضرت طلحہؓ۔ حضرت زبیرؓ۔ حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا خلیفہ کا انتخاب ضروری ہے۔ آپؐ نے کہا جسے تم منتخب کر لو گے میں قبول کر لوں گا تو انہوں نے کہا:

آپ کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا مستحق نہیں چنانچہ مسجد نبوی ﷺ میں اجتماع ہوا انصار اور مہاجرین نے بیعت کر لی اس طرح حضرت علیؓ مسند خلافت پر بیٹھے۔

چوتھے خلیفہ کے انتخاب میں انصار و مہاجرین کی ایک جماعت نے آغوش نبوت میں پرورش پانے والے داماد رسول حضرت علیؓ کو خلیفہ بننے پر مجبور کیا مگر انہوں نے جواب دیا: ”انہیں امیر بننے کے بجائے وزیر بننا زیادہ پسند ہے تم جس کو چاہو منتخب کر لو میں راضی ہوں۔“

لیکن لوگوں نے بہت زیادہ زور دیا تو حضرت علیؓ مسجد نبوی میں عوام کی رائے سے مسند خلافت پر قدم رنجہ ہوئے اور مجمع عام میں آپ کی بیعت ہوئی۔

ان تمام انتخابات کی تفصیل ہم ان کے مقامات پر کر چکے ہیں، تفصیل جاننے کے لئے ہر خلیفہ کا طریق انتخاب خلافت اس خلیفہ کے حالات سے معلوم کیا جاسکتا ہے جو کہ پچھلے اوراق میں ہم درج کر چکے ہیں۔

جہاں تک مشترکہ انتخابی اصول کا تعلق ہے جو کہ دوسرے جزو سے متعلق ہے تو اس سلسلے میں ہم یوں کہیں گے کہ خلفائے راشدین کے انتخاب میں جمہوری طریقہ (شورائی کا مشورہ) ایسا اصول نظر آتا ہے جو کہ سب کے انتخاب میں مشترک ہے لیکن حضرت علیؓ کے انتخاب میں اس پر کما حقہ پورا پورا عمل نہیں کیا گیا کیونکہ اسلامی مملکت کا بڑا حصہ شام اس انتخاب میں شامل نہیں تھا اور نہ ہی یہ انتخاب مکمل ہوا مگر چونکہ انصار و مہاجرین سے تعلق رکھنے والے مقتدر حلقوں نے ان کی بیعت کر لی تھی اس بناء پر انہیں بھی خلفاء راشدین میں شمار کیا جاتا ہے۔

چونکہ اس کی مفصل بحث حوالہ جات کے ساتھ ہم پیچھے کر چکے ہیں اور تمام حوالے گزشتہ اوراق میں دیے جا چکے ہیں اس لئے نئے سرے سے حوالہ جات کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

## خلافت راشدہ کا سیاسی نظام

معاشرہ میں تین طبقات اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ پیدا ہونے لگے تھے لیکن ابھی ان میں اتنا بعد نہیں پیدا ہوا تھا کہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں۔ لباس، رہن سہن اور کھانے پینے میں مختلف طبقات کا فرق نمایاں تھا۔ عام لوگ لمبا کرتہ کمر پر چڑے کی جینی اور اونٹ کے بالوں کی ڈھیل عبا پہنتے تھے۔ سروں پر عقال باندھا جاتا تھا۔ متوسط اور اعلیٰ طبقہ کے لوگ پاجامے پر لمبا کرتہ اور فخنوں تک لمبا چونہ پہنتے کہ اس پر ریشمی پٹکا لپیٹ لیتے تھے۔ سر پر عمامہ باندھتے۔ کندھوں پر طیلانی چادر پڑی رہتی تھی۔ عورتوں کا لباس بھی عمامہ اور عبا کے سوا کچھ ہوتا تھا۔

حضور نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد اسلام میں خلافت کا قیام عمل میں آیا۔ حضرت ابو بکرؓ سب سے پہلے خلیفہ منتخب ہوئے اور حضرت علیؓ تک کا دور خلافت راشدہ کا دو کھلا ہوا ہے جو



کہ تیس سال کے عرصہ پر محیط ہے۔ خلافت دراصل ایسی دنیوی حکومت کو کہتے ہیں جس کی بنیاد اسلامی قوانین پر مبنی ہو۔ اس کے بارے میں دین کا حکم ہے کہ خلیفہ وقت جب تک قرآنی احکامات کی پوری طرح پابندی کرتا رہے اس کی اطاعت اور فرمانبرداری تمام اہل اسلام پر لازمی ہے مگر جب وہ اس سے منحرف ہو جائے تو اسے خلیفہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اس کے متعلق ہمیں ان الفاظ کو یاد کرنا چاہئے جو حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ بننے کے بعد اہل اسلام کو مخاطب کر کے فرمائے تھے:

”جب تک میں خدا اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کروں میری اطاعت تم پر واجب ہے اور اگر ان کی نافرمانی کروں تو تم بے شک میرے احکام کی تعمیل نہ کرنا۔“

**حضرت ابوبکرؓ سے حضرت عثمانؓ:**

حضرت ابوبکرؓ کے عہد سے حضرت عثمانؓ کے ابتدائی دور تک اسلامی ریاست برابر وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں کی سیاسی قوت کا یہ عالم تھا کہ روم کی عظیم الشان سلطنت جس کا اقتدار یورپ تک پھیلا ہوا تھا ہمیشہ لرزہ بر اندام رہتی تھی۔ عہد عثمانی میں جب مسلمانوں کا بڑی جڑا بھی تیار ہو گیا تو ان کی عزت و عظمت کا آفتاب نصف النہار تک پہنچ گیا۔ مشرق میں اسلامی حکومت کا اقتدار ترکستان تک پہنچ چکا تھا۔ افغانستان کے بیشتر علاقے اسلامی علم کے سامنے سرنگوں تھے۔ مجاہدین کی نگاہیں ہندوستان کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ بدقسمتی سے اس زمانہ میں وہ عظیم فتنہ اٹھا جس نے مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مسلمان مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔

**حضرت علیؓ کا دور:**

حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں مسلمان خانہ جنگی کا شکار ہو کر خود آپس میں ہی قتل و غارتگری کرتے رہے۔ جو تکویر حضرت عثمانؓ کی شہادت کے لئے بے نیام ہوئی تھی حضرت حسنؓ کی خلافت سے دشمنی وادری تک لاکھوں توحید پرستوں کا خون چاٹ گئی۔ اس خانہ جنگی سے مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچا اور امت مسلمہ میں جو تفرقہ پڑ گیا تھا وہ آج تک ختم نہیں ہو سکا۔ اگر مسلمانوں کا سیاسی اور مذہبی اتحاد قائم رہتا تو وہ دعوت اسلام کو تمام یورپ اور افریقہ کے جنوبی کونوں تک پہنچا دیتے لیکن خلافت راشدہ کے عہد میں جو فتنہ چا ہوا اس نے مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دیا اور اس کے بعد بھی تاریخ اسلام مختلف ادوار میں اپنوں ہی کے خون سے لالہ زار ہوتی رہی۔

## خلافت کا قیام قرآن و سنت کے مطابق:

پہلے چاروں خلفائے اسلام نے اپنی خلافت کو قرآن و سنت کے مطابق قائم رکھا اور اسی لئے اسلام دنیا میں پھیلتا چلا گیا اور حکومت کی دستور کی روح اسی طرح قائم رہی جیسے عہد رسالت میں تھی۔ اسی لئے عہد خلافت کو خلافت راشدہ کہا جاتا ہے اور چاروں خلفائے اسلام کو خاندانے راشدین کہا جاتا ہے۔

## سلطنت کی بنیاد جمہوریت اور مشاورت:

خلافت راشدہ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ عہد خلافت میں اسلامی نظام سلطنت کی بنیاد جمہوریت اور مشاورت کے نظام پر قائم کی گئی تھی۔ خلیفہ کا انتخاب جمہوریت کے اصولوں پر کیا جاتا تھا اور باقی تمام فیصلے اکابرین اور صاحب الزرائے لوگوں کے مشوروں سے کئے جاتے تھے اور اس کا آغاز حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب سے ہوا اور ساری امت مسلمہ نے اسے بخوشی قبول کیا۔ حضرت عمرؓ کی مازدگی سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے تمام صحابہ کرام سے مشورہ کیا۔ سب کے سب حتیٰ کہ حضرت علیؓ بھی اس پر راضی تھے۔ حضرت عثمانؓ کا انتخاب بزرگ ترین صحابہ کی کمیٹی نے مدینہ کے سب افراد سے مشورہ کر کے کیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ کو خلافت کا بوجھ سنبھالنے کے لئے جب مہاجرین اور انصار کے چند بزرگوں نے درخواست کی تو آپؐ نے فرمایا:

”تمہیں کسی کو خلیفہ بنانے کا اختیار نہیں ہے۔ یہ تو اہل شوریٰ اور اہل

بدر کا کام ہے جس کو وہ چاہیں گے وہی خلیفہ ہوگا۔ ہم سب جمع ہوں گے اور پھر اس پر غور ہوگا۔“

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنی مرضی سے اپنے آپ کو امت پر مسلط نہیں کر سکتا بلکہ خلیفہ کا انتخاب جمہوری طرز پر اہل شوریٰ کے باہمی فیصلہ سے عمل میں آتا ہے۔ اسی طرح امت کے لوگوں کو یہ جمہوری حق حاصل تھا کہ وہ ہر قسم کا جائز اعتراض کر سکتے ہیں۔ اگر کسی جگہ کے لوگ کسی حاکم کے رویہ کو خلاف اسلام قرار دیتے اور اسے ناپسند کرتے تو خلیفہ وقت جائز تفتیش کے بعد وہاں سے تبدیل کر دیتا اور اس تفتیش کے دوران مختلف لوگوں سے مشورہ لیا جاتا۔ اسی طرح تمام مسائل کا حل قرآن و سنت کی روشنی میں نکالا جاتا۔ اگر کوئی مسئلہ حل نہ ہوتا تو اسے اہل شوریٰ کے سامنے پیش کیا جاتا اور پوری بحث و تحقیق کے بعد فیصلہ کیا جاتا۔

## شہریوں کو شخصی اور سیاسی آزادی:

خلافت راشدہ کے عہد میں تمام شہریوں کو ان کے شخصی اور سیاسی آزادی کے حقوق کی

پوری حفاظت کی جاتی تھی۔ مسلم اور غیر مسلم میں کوئی امتیاز نہ تھا اور عدل و انصاف کے تقاضے پورے کئے جاتے تھے اور اس میں مسلم اور غیر مسلم میں کسی قسم کی تمیز نہیں کی جاتی تھی۔ حضرت عثمانؓ نے انصاف کا تقاضا پورا کئے بغیر باغیوں کا قتل گوارا نہ کیا تھا بلکہ وہ اس پاداش میں خود شہید ہو گئے۔

حضرت علیؓ نے بھی یہی سلوک خارجیوں سے روا رکھا۔ ان کو ہر قسم کی آزادی دی لیکن ساتھ یہ بھی کیا کہ تم کسی قسم کی بد امنی نہیں پھیلاؤ گے اور نہ ہی کسی پر ظلم ڈھاؤ گے۔ اگر اس کی خلاف ورزی ہوئی تو تمہارے خلاف جنگ ہوگی۔

خلافت راشدہ ایک معیاری خادم خلق ریاست تھی جس کا کام ملک کو صرف بیرونی حملوں سے بچانا ہی نہ تھا بلکہ عوام کا ہر قسم کا خیال رکھنا اور زندگی کی آسانیاں فراہم کرنا ان کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔ حضرت عمرؓ کا یہ قول تھا کہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ خوش نصیب وہ حاکم ہے جس کے ذریعے اس کی رعایا خوش حال ہو اور سب سے زیادہ بد بخت حاکم وہ ہے جس کی وجہ سے اس کی رعایا بد حال ہو۔ اس لئے سب عمال کو آپ نے علم دیا کہ تم کج روی سے باز رہو تاکہ تمہارے ماتحت بھی کج روی نہ کر سکیں۔ اسی لئے جہاں جہاں بھی مسلمان گئے۔ انہوں نے اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کا حد درجہ خیال کیا۔ ہر مسلمان تعلیم نبوی کا مجسمہ ثبوت مہیا کرتا اور غیروں کے لئے بہترین نمونہ فراہم کرتا اسی لئے ان کی قابل رشک زندگی حسن سلوک سے متاثر ہو کر لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو جاتے تھے۔

### خلافت راشدہ میں بیت المال کا کردار:

فلاح ریاست کا بیشتر انحصار بیت المال کے قیام پر تھا۔ بیت المال کسی کا شخصی خزانہ نہ تھا بلکہ عوام کا تھا اور اس کے انتظام اور دیکھ بھال کے لئے مجاہد مقرر کیا جاتا تھا اور وہ اس میں جتنا بھی خرچ کرتے تھے وہ احکام شریعت کے مطابق کرتے تھے اور کوئی اپنے آپ پر یا اپنی مرضی سے نہیں کرتے تھے۔ یہ مسلمانوں کی امانت تصور ہوتی تھی اور اس میں خیانت کرنا نہ صرف گناہ تھا بلکہ تادیبی کارروائی کی جاسکتی تھی۔

تمام قسم کے ٹیکس، زکوٰۃ اور صدقات کی رقوم بیت المال میں جمع کی جاتیں اور تہیوں، بیواؤں اور محتاجوں کو باقاعدہ وظیفہ دیئے جاتے تھے۔ اموی دور میں جب بیت المال حاکم وقت کی ذاتی ملکیت بنا تو اسلامی روح فوت ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی جمہوری نظام کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

کسی حکومت کا دستور اور قانون کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو اگر اس کے سربراہ اور منتظم سیرت و کردار کی خوبیوں سے عاری ہوں تو وہ نظام حکومت عوام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں

دے سکتا۔ اس لحاظ سے جب ہم خلافت راشدہ کے دور کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ عہد خلافت کی خوبیوں اور برکتوں کا سرچشمہ خلفاء کا بے داغ اور مثالی کردار تھا۔

## خلافت راشدہ کی خصوصیات

خلافت راشدہ تاریخ اسلام کا مثالی اور سنہری دور کہلاتا ہے۔ مقدمہ ابن خلدون میں ان الفاظ میں خلافت کا مفہوم بیان کیا گیا ہے:

”خلافت کے لغوی معنی جانشینی کے ہیں۔ اس کے اصطلاحی معنی آنحضرت ﷺ کے جانشین کی حیثیت سے دینی اور دنیاوی امور میں حکمرانی کا حق تھا۔ یہ حق فرمانروائی شریعت کے دستور اور قوانین کا بابت تھا۔ خلافت کا حقیقی مفہوم ناموس اسلام کا تحفظ اور شرعی زاویہ حکومت کے نظم و نسق، تنظیم اور اس کا قیام تھا۔“

راشدہ کا لفظ رشد سے ہے جس کے معنی ہدایت کے ہیں۔ خلفائے راشدین سے مراد وہ خلفاء ہیں جنہوں نے حضور اکرم ﷺ کے بعد صحیح جانشین ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں پر حکومت کی اسی حکومت کو خلافت راشدہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

خلفائے راشدین کا ایک ایسا مثالی دور تھا جس کی نہ صرف مسلم مورخین نے تعریف کی ہے بلکہ غیر مسلم مؤرخوں نے بھی اسے خوب سراہا ہے۔ اس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ عالم بھی قاصر ہے۔ اس دور کی چیدہ چیدہ خصوصیات درج ذیل ہیں:

### 1- شورائی حکومت:

خلافت راشدہ کی بہت بڑی خوبی ہے کہ اس میں تمام معاملات کو مشوروں سے طے کیا جاتا تھا جیسا کہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب ایک جمہوری طریقہ سے طے پایا۔ حضرت عمرؓ کی ناحزگی سے قبل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اکابر صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت عثمانؓ کا انتخاب بھی اکابر صحابہؓ کی ایک کمیٹی نے مدینہ منورہ کے سب افراد سے مشورہ کر کے کیا اور اسی طرح حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ کا انتخاب بھی باہمی مشاورت کے بعد طے پایا۔

خلافت راشدہ میں شورایت کی روح کارفرما تھی اور ہر مسئلہ کو جس میں کوئی واضح امر نہ ہوتا اسے علمائے المسلمین کے سامنے پیش کیا جاتا اس طرح اس نظام حکومت میں جمہوریت اور مساوات کی روح قائم تھی۔

## 2- خلیفہ کا مقام اور حیثیت:

خلفائے راشدین رسول کریم ﷺ کے سچے اور صحیح پیروکار تھے۔ ان میں ہر ایک خلق محمدی کا پیکر اور تعلیمات اسلامی کی مکمل تصویر تھی۔ سادگی و تواضع، امانت و دیانت، عبادت و ریاضت، شجاعت و خدمت ان سب کا شعار تھا۔ انہوں نے قرآن و حدیث کے مطابق حکومت کی اور اپنے عمل میں آنحضور ﷺ کی زندگی کا مکمل خاکہ پیش کر کے رسول خدا ﷺ کے صحیح جانشین ہونے کا حق ادا کیا۔

## 3- بیت المال کا صحیح استعمال:

خلافت راشدہ کے سنہری دور میں بیت المال کی حفاظت بطور امانت کی جاتی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے معمولی رقم بھی نہ لیتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے عوام کے وظائف مقرر کئے تو اپنے لئے صرف اتنا ہی روزانہ مقرر کیا جس سے دو وقت کی روٹی چل سکے۔ حضرت عثمان غنیؓ کا تو معاملہ ہی الگ تھا اس لئے انہوں نے بیت المال سے کچھ بھی نہ لیا۔ حضرت علیؓ نے بیت المال کی حفاظت کی اور اس سلسلہ میں سختی سے باز پرس کرتے تھے۔

## 4- خوشحالی اور فارغ البالی:

خلافت راشدہ کے عہد میں اتنا سکون تھا کہ اگر کوئی عورت حجاب تک لٹ و دق صحرا میں ہاتھوں پر سونا اچھالتی ہوئی گزر جاتی تو اسے عصمت و آبرو پر حرف آنے کا اندیشہ نہ ہوتا اور نہ جان و مال کے ضائع ہونے کا فکر ہوتا۔ خوشحالی اور فارغ البالی کا یہ عالم تھا کہ لوگ گھروں سے صدقات لے کر نکلتے مگر کوئی شخص نہ ملتا جو اسے قبول کرے۔ یہ خوشحالی اور فارغ البالی سیدنا عثمان غنیؓ کے دور میں بام عروج پر تھی۔

## 5- عصبیتوں سے پاک حکومتیں:

خلفائے راشدینؓ کے دور کی ایک خوبی یہ تھی کہ اس میں قبائلی، نسل اور وطنی تعصبات سے بالاتر ہو کر تمام لوگوں سے یکساں سلوک کیا گیا تاہم حضرت عثمان غنیؓ کی حکومت کے آخری چھ سال میں اور حضرت علیؓ کے زمانے میں اموی اور ہاشمی عصبیتوں نے دوبارہ سر اٹھایا لیکن اسلامی اخوت اور دینی جذبے نے اپنا اثر دکھایا اور امت مسلمہ کی کشتی کلوڑے کلوڑے ہونے سے بچ گئی۔

## 6- اللہ اور رسول ﷺ کے احکام کی پیروی:

خلفائے راشدین کے دور کی ایک خوبی یہ تھی کہ اس میں ملکی اور دینی معاملات میں ہمیشہ قرآن و سنت کو اولین حیثیت دتی تھی۔

سُننِ داری میں ہے کہ ”جب کوئی معاملہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس آتا تو وہ پہلے یہ دیکھتے تھے کہ اس معاملے میں کتاب اللہ کیا بتاتی ہے۔ اگر وہاں واضح حکم نہ ملتا تو آپ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس معاملے میں کیا فیصلہ کیا تھا۔“

### 7- خدا خونی اور پرہیزگاری:

خلفائے راشدین کے دل خدا خونی اور اسلام پسندی سے معمور تھے۔ خود غرضی ہوں پرستی اور حرص و لالچ نے ان کو چھوا تک نہ تھا۔ ان کی دنیا طلبی کی کوئی خواہش نہ تھی۔ ہر وقت ہر کام میں خوفِ خدا مد نظر ہوتا تھا۔ تمام خلفائے راشدین آنحضور ﷺ کے مقرب ترین صحابہ تھے۔

اس لئے عادات و افعال اور اخلاق و پرہیزگاری میں بہت بلند تھے۔

### 8- اشاعتِ دین:

خلافتِ راشدہ میں دعوتِ اسلام اور اسلامی تعلیمات کو عام کرنے اور فروغ دینے کے سلسلے میں بڑا اہتمام کیا گیا تھا۔ خلفائے راشدین اس بات پر کڑی نگاہ رکھتے تھے کہ دین کی روح کمزور نہ ہونے پائے۔

قرآن و حدیث کی خوب اشاعت ہوئی۔ جگہ جگہ مسجدوں کی تعمیر ہوئی۔ دینی تعلیمات کو فروغ دینے کے لئے اطرافِ ممالک میں مبلغ بھیجے جاتے تھے۔

خلیفہ اور والی بذاتِ خود جمعہ کا خطبہ دیتا اور لوگوں کو اسلامی تعلیمات سکھاتا تھا۔

### 9- استحکامِ اسلام:

خلفائے راشدین نے اسلام کے استحکام اور مضبوطی کے لئے ہر ممکن کوشش کی اور اسلام کے مقابلے میں تمام بغاوتوں اور فتنوں کی سرکوبی کر کے باغیوں اور سرکشوں کو اسلام کا مطیع و فرمانروا بنایا۔

### 10- اصلاحِ معاشرہ:

خلفائے راشدین نے ان تمام معاشرتی، اقتصادی اور تمدنی برائیوں کا خاتمہ کر دیا تھا جو معاشرے کے بگاڑ کا موجب ہوتی تھیں۔ مثلاً ”زنا“ قمار بازی، سود خوری، اقرباء پروری، بہتان تراشی، ذاکر زنی، کم تولنا، جھوٹ، فریب دہی وغیرہ۔

### 11- احتسابِ عمال:

خلفائے راشدین مملکتِ اسلامیہ کے دور دراز صوبوں تک کے اعمال پر بھی کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ مختلف ذرائع سے ان کی کارکردگی کا باقاعدہ جائزہ لیتے رہتے تھے۔ بدعنوانی کے

مذاکر کی خاطر تقرر کے وقت ہر ایک کے ذاتی اثاثہ کا ریکارڈ رکھ لیتے تھے اور جب کوئی اپنے عہدے سے سبکدوش ہوتا تو موازنہ کر لیتے کہ کہیں کسی عامل نے اپنے منصب سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ مال و متاع تو جمع نہیں کر لیا۔

تمام اعمال کو حج کے موقع پر مکہ میں حاضری کا حکم تھا۔ ان کی موجودگی میں اعلان عام کیا جاتا تھا کہ جس شخص کو جس عامل سے شکایت ہو پیش کرے۔ چنانچہ لوگ اپنی شکایت پیش کرتے۔ اگر کوئی عامل بلاوجہ کسی پر کوئی زیادتی کرتا تھا تو حضرت عمرؓ مجمع عام میں سزا دیتے تھے۔

## 12- عدل و انصاف:

خلافت راشدہ تاریخ اسلام کا مثالی اور سنہری دور عدل و انصاف کی وجہ سے بھی ہے۔ عدل و انصاف ہی کسی حکومت کی مضبوطی کا باعث ہوتا ہے جس حکومت میں عدل و انصاف ہو وہ چند دنوں کی مہمان ہوتی ہے۔ عدل کی تین صورتیں ہیں: سماجی، قانونی اور اقتصادی۔ عدل خلفائے راشدین کے عہد میں عدل و انصاف کی تین صورتیں قائم تھیں۔

## 13- حاکمیت الہی:

اسلام کی رو سے حقیقی فرمانروا اور حاکم اللہ تعالیٰ ہے جس کا اقتدار اعلیٰ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ انسان کے لئے ایک نیا حق ذمہ داری ہے۔ خلفائے راشدین کی عہد میں قانون کو بالادستی حاصل تھی اور تمام شہری قانون کی نظر میں برابر تھے۔

خلفائے راشدہ کی سلطنت کی اساس انسانیت پر تھی۔ خلافت راشدہ ہی ایک ایسی حکومت ہے جس کا اصول رشد اور نیکوکاری ہے۔

خلافت راشدہ تاریخ اسلام کا سنہری اور مثالی دور فتوحات کی تصویر بھی ہے۔ اس زمانہ میں مسلمان سرزمین عرب سے اٹھے عراق، ایران، شام، اردن، مصر اور فلسطین پر قابض ہو گئے۔

انہوں نے ذرائع آمد و رفت کو بہتر بنانے کے لئے بہت سی سڑکیں بنائیں۔ پینے کے پانی کے لئے حوض، تالاب اور نہریں بنوائیں۔

خلافت راشدہ کی ایک اہم خوبی یہ تھی کہ ہر شخص کو خلیفہ پر اور اس کی پالیسیوں پر تنقید کرنے کا پورا حق تھا۔

تمام رعایا کو مساوی حقوق حاصل تھے۔ امیر غریب غلام، آزاد، گورے، کالے میں کوئی تمیز نہ تھی۔ ہر کسی کو بنیادی حقوق حاصل تھے۔ حضرت عمرؓ کا قول تھا: ”کسی شخص کو موقع نہ دوں گا کہ وہ کسی کی حق تلفی یا کسی پر زیادتی کر سکے۔“

ان کے دور میں غیر مسلموں کے ساتھ بڑی رواداری اور فراخ دلی کا سلوک کیا جاتا جس

کی وجہ سے بہت زیادہ ذیلی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔  
خلافت راشدہ ایک معیاری اور فلاحی نظم حکومت کی مظہر تھی اس کا نصب العین عوام کی اصلاح و فلاح، عدل و انصاف اور ریاست کی ترقی و خوشحالی کو ملحوظ خاطر رکھنا تھا۔  
امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے:

”رسول اللہ ﷺ کے بعد افضل الناس حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ اور پھر حضرت علیؓ یہ سب حق پر تھے اور حق پر رہے۔“  
شیخ الہند محمود الحسن کہتے ہیں:

”جب اسلامی حکومت کا مکمل سے مکمل اور اعلیٰ سے اعلیٰ ظہور ہو تو وہ خلافت راشدہ ہے۔“

المختصر یہ کہ خلافت راشدہ دنیائے اسلام کا ایک درخشاں و تابناک اور مثالی و ستہری دور تھا۔ اس مختصر مدت میں خلفائے راشدین نے جو بیش بہا خدمات انجام دیں وہ تاریخ اسلام کا انتہائی حیرت انگیز اور قابل فخر کارنامہ ہے۔

## خلافت راشدہ کے عہد میں غیر مسلموں کے حقوق

حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں جب بیت المقدس فتح ہوا تو آپؓ نے وہاں کی غیر مسلم رعایا کو درج ذیل عبارت کی صورت میں امان اور ان کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی:

”یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیر المؤمنین حضرت عمرؓ نے اہل ایلیا کو دی۔ یہ امان جان و مال، مگر جا، صلیب، تند رست، بیمار اور ان کے تمام اہل مذہب کے لئے ہے۔ نہ ان کے گرجا گھروں میں سکونت اختیار کی جائے گی نہ وہ ڈھائے جائیں گے۔ نہ ان کے احاطہ کو نقصان پہنچایا جائے گا نہ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں کمی کی جائے گی۔ مذہب کے بارے میں ان پر قطعاً کوئی جبر نہیں کیا جائے گا۔ مزید برآں ان میں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔“

حضرت عمرؓ نے ایسے معاہدے باقی اقوام کے ساتھ بھی کئے جس میں مندرجہ ذیل الفاظ بھی زیر بحث آئے:

”جان و مال مذہب اور شریعت کو امان ہے۔“

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں جتنے بھی گورز تھے ان کو ان شرائط پر سختی سے عمل کرنے کی سخت پابندی تھی۔ جزیہ کی وصولی کے متعلق بھی یہ ہدایات تھیں کہ کوئی رقم جبر، ظلم اور تلکد سے وصول نہ کی جائے۔ یہاں تک اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ جب کسی علاقہ کا خراج وصول ہوتا تو وہاں کے دس آدمیوں کو صرف اس لئے بلایا جاتا تھا کہ وہ آکر اس بات کی تصدیق کریں کہ خراج کی وصولی میں کسی قسم کی سختی تو نہیں برتی گئی۔



## مساوات:

دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ فاتح اور مفتوح کبھی برابر نہیں سمجھے گئے۔ جب بھی کسی دور میں جنگیں ہوئیں مفتوحین کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کیا گیا اور اب بھی کیا جاتا ہے لیکن تاریخ اسلام اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ اہل اسلام کا ماضی و حال بے داغ ہے۔ انہوں نے قیدیوں کے ساتھ اسی طرح ذمیوں کے ساتھ مساویانہ سلوک کی مثالیں قائم کیں۔ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دیتا تو اس کے قصاص میں مسلمان کی گردن بھی کاٹ دی جاتی۔

## ایمانی وعدہ:

تاریخ اس بات کی بھی شہادت دیتی ہے کہ فاتحین مفتوحین کے ساتھ کئے ہوئے وعدوں کی اکثر خلاف ورزی کر دیتے ہیں ان پر عرصہ حیات تک کر دیا جاتا ہے لیکن خلفائے راشدین کی یہ سب سے بڑی خوبی اور خصوصیت تھی کہ وہ اپنے عمال کو یہی ہدایت دیتے تھے کہ کسی ذمی کے ساتھ جو وعدہ کیا جائے اسے پورا کیا جائے اور اگر گروعی طور پر کیا جائے تو اس کی خلاف ورزی ہرگز نہ ہو۔

## بیت المال پر حقوق:

اکثر لوگوں کا یہ خیال تھا کہ بیت المال میں مختلف مدوں میں جتنی رقمیں جمع ہوتی ہیں ان کو صرف مسلمانوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جاتا تھا۔ بیت المال سے جن رقوم کا تدارک معذور قبیہوں اور یتیموں پر خرچ ہوتا وہ صرف مسلمانوں تک محدود نہ تھا بلکہ ذمیوں کو بھی ان کی ادائیگی ویسے ہی ہوتی جیسے مسلمانوں کو ادا کی جاتیں۔

## بایبندیاں:

حضرت علیؓ نے اپنے عمال کو خاص ہدایات دے رکھی تیں خاص طور پر آپؓ نے عمرو بن مسلمہ کو تحریر فرمایا:

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے علاقہ کے ذمی دہقانوں کو تمہاری درشت مزاحی کی شکایت ہے۔ اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے تم کو سختی اور نرمی دونوں سے کام لینا چاہئے لیکن سختی ظلم کی حد تک نہ پہنچ جائے اور نرمی نقصان کی حد تک۔ ان پر جو مطالبہ ہو اسے وصول کیا کرو لیکن ان کے خون سے اپنا دامن محفوظ رکھو۔“

ذمیوں کی ایک نہر میں شگاف پڑ گیا تھا اس کے عامل کو آپؓ نے لکھا: ”تمہارے علاقہ کے ذمیوں نے درخواست دی ہے کہ اس نہر کے شگاف کو پُر کرنا مسلمانوں کا فرض تھا۔ تم اسے دیکھ کر درست کرا کے آباد کرو۔ میری عمر کی قسم اس کا آباد رہنا زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے

کہ وہ ملک سے نکل جائیں یا عاجز ہو جائیں یا بھلائی کے کاموں میں حصہ لینے کے قابل نہ رہیں۔“

مندرجہ بالا تشریحات اور مثالوں سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ مسلمانوں نے غیر مسلموں سے ہر معاملہ میں مساویانہ سلوک روا رکھا۔ ان کی فلاح و بہبود کا اسی طرح خیال رکھا گیا جیسے دیگر مسلمانوں کا! عدل و انصاف کے قائم کرنے میں مسلم اور غیر مسلم میں کسی قسم کی تمیز روا نہ رکھی جاتی اور یہی وہ خصوصیات ہیں جس نے اسلام کو ایک عالمگیر مذہب بنا دیا۔

## اسلامی دستور

اسلامی ریاست کے بنیادی اصول ہی اسلامی دستور کی حیثیت رکھتے ہیں جن کا ذکر ذیل میں کیا جا رہا ہے:

### 1- توحید:

توحید اسلامی ریاست کا بنیادی اور بہت ہی اہم اصول ہے۔ توحید سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل یقین رکھنا اور اسے وحدۃ الشریک ماننا۔ اللہ تعالیٰ نے توحید کا درس دینے کے لئے ہی بڑی تعداد میں انبیاء دنیا میں بھیجے ہیں۔

### 2- اقتدار اعلیٰ:

اسلامی ریاست میں اقتدار اعلیٰ کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ”بے شک حکمرانی کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے۔“

اقتدار اعلیٰ کا مالک اللہ تعالیٰ کو ماننا اسلامی ریاست کا بنیادی اصول ہے۔ یہ اقرار کیا جاتا ہے کہ بے شک اقتدار اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور اسلامی ریاست کے عوام اقتدار کو ایک مقدس امانت کے طور پر قرآن و سنت کی حدود کے اندر رہ کر استعمال کریں گے۔

### 3- اطاعت اور وفاداری:

اطاعت اور وفاداری اسلامی ریاست کا اہم اصول ہے۔ اسلامی ریاست میں جو حکمران ہو عوام اس کی اطاعت کرنے اور اس کا وفادار رہنے کی پابند ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ”اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب حکمت ہیں۔“

لیکن حکمران کی اطاعت صرف اُسی صورت میں کی جاسکتی ہے جب وہ نیکی کے کام کرے۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی نافرمانی کرے اور بُرائی میں مبتلا ہو تو پھر اُس کی اطاعت لازم نہیں ہے۔

#### 4- شوریٰ:

اسلامی ریاست کا اہم اور بنیادی اصول یہ ہے کہ اسلامی ریاست شوریٰ ہوتی ہے۔ اسلامی ریاست کے تمام اجتماعی معاملات کی انجام دہی مجلس شوریٰ کے سپرد ہوتی ہے اور تمام اجتماعی معاملات مجلس شوریٰ کے ممبران کے باہمی مشورے سے انجام پاتے ہیں۔ قرآن پاک کی سورہ شوریٰ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

ترجمہ: ”اور اُن کے معاملات آپس میں طے ہوتے ہیں۔“

#### 5- مساوات:

اسلامی ریاست میں مساوات یعنی برابری کا اصول اپنایا جاتا ہے اور تمام شہریوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ اس میں رنگ و نسل کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ امیر غریب اور آقا و غلام کو مساوی حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے شہریوں کے حقوق کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے اور اُن کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اپنے آخری خطبے میں حضور نبی کریم ﷺ نے مساوات کا درس دیتے ہوئے فرمایا:

”لوگو! غور سے سنو۔ بے شک تمہارا رب ایک ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر اور کسی کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں سوائے تقویٰ کے۔“

#### 6- غیر مسلموں کے حقوق:

اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اُن کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ غیر مسلم شہریوں کی جان و مال عزت و آبرو کی حفاظت اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

#### 7- عورتوں کا احترام:

اسلامی ریاست میں عورتوں کے احترام کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور انہیں اُن کا جائز مقام دیا جاتا ہے۔ عورتوں کو جو مقام و مرتبہ اسلامی ریاست میں حاصل ہوتا ہے وہ کسی اور ریاست میں نہیں ہوتا۔ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد پاک ہے:

”اے لوگو! تمہارے حقوق تمہاری بیویوں پر ہیں اور تمہاری بیویوں

کے حقوق تم پر ہیں۔ عورتوں کے ساتھ بھلائی کے ساتھ پیش آنے رہو۔“

## 8- عدل و انصاف:

عدل و انصاف اسلامی ریاست کا بنیادی اصول ہے۔ عدل سے مراد یہ ہے کہ ہر طبقہ کے عوام کو مکمل انصاف فراہم کیا جائے۔ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ قانون سب کے لئے یکساں ہو۔ عدل و انصاف کے تقاضے اسلامی قوانین کے تحت پورے کئے جائیں۔ اس طرح معاشرے میں امن اور سکون کی فضاء قائم ہوتی ہے۔

## 9- جہاد:

اسلامی ریاست میں سلامتی امن خوشحالی اور دین حق کی سر بلندی کے لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جہاد فرض کر دیا ہے۔ جذبہ جہاد کی بدولت ہی مسلمان قوم دوسری قوموں پر غلبہ حاصل کرتی ہے کیونکہ جہاد کو دونوں صورتوں میں بہترین انجام ملنے کا یقین ہوتا ہے۔ یعنی مر گئے تو شہید بن گئے تو غازی!

## 10- حاکم وقت اللہ کا نائب ہوتا ہے:

اسلامی ریاست میں اقتدار اعلیٰ کا مالک اللہ تعالیٰ کو مانا جاتا ہے اور حاکم وقت اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے قوانین کو عوام پر لاگو کرتا ہے۔ حاکم وقت کو اس وقت تک اقتدار سنبھالنا ہوتا جب تک وہ اللہ اور رسول ﷺ کا مطیع رہتا ہے۔ جب وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرنے لگے تو عوام پر بھی اس کی اطاعت لازم نہیں رہتی اور اسے اقتدار سے الگ کر دیا جاتا ہے۔

## 11- اظہار رائے کی آزادی:

اسلامی ریاست میں ہر شخص کو اظہار رائے کی آزادی ہوتی ہے۔ اسلامی ریاست میں صرف اللہ تعالیٰ کے احکامات قوانین شریعت کی صورت میں لاگو ہوتے ہیں۔ اسلامی ریاست میں چونکہ تمام معاملات باہمی صلاح مشورے سے انجام پاتے ہیں اس لئے اس سلسلے میں ہر شخص آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے۔

## 12- محاسبہ:

اسلامی ریاست کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں احتساب کا عمل ہر شخص کے لئے ایک جیسا ہوتا ہے۔ عوام کے علاوہ حکومت میں شامل افراد کا محاسبہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

## 13- عدلیہ کی آزادی:

اسلامی ریاست میں عدلیہ آزاد ہوتی ہے۔ وہ فیصلے کرنے میں کسی قسم کے دباؤ کا شکار نہیں ہوتی بلکہ بغیر کسی امتیاز کے آزادی کے ساتھ مقدمات کے فیصلے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ اگر مجرم کے کٹہرے میں حاکم وقت بھی کھڑا ہو تو پھر بھی اُن کی قوت فیصلہ کمزور نہیں پڑتی بلکہ عدلیہ بغیر کسی لچک کے عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔

## 14- رفاہ عامہ کے کام:

اسلامی ریاست کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ رفاہ عامہ کے کاموں کی طرف خصوصی توجہ دیتی ہے۔ عوام کی فلاح و بہبود کے لئے سکول، ہسپتال، سڑکیں، نہریں اور پل تعمیر کرتی ہے۔ عوام کے لئے ملازمتوں کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرتی ہے۔ عوام کی خوشحالی کے لئے ایسی پالیسیاں بناتی ہے جن کی بدولت ملکی معیشت مستحکم ہو۔

## 15- امر بالمعروف اور نہی عن المنکر:

اسلامی ریاست کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر وقت اچھے کاموں کے فروغ اور برائیوں کے خاتمے کے لئے کوشاں رہتی ہے۔

## حاکمیت الہیہ

## اسلام کا تصور اقتدار اعلیٰ:

اسلام کا تصور اقتدار اعلیٰ مغربی اقتدار اعلیٰ کے تصور سے بہت مختلف ہے۔ مغربی اقتدار اعلیٰ کے تصور کے مقابلے میں اسلامی تصور زیادہ واضح اور اعلیٰ خصوصیات کا حامل ہے۔ اسلام میں اقتدار اعلیٰ کا مالک صرف اللہ تعالیٰ کو مانا جاتا ہے جبکہ مغربی مفکرین فرد یا افراد کی جماعت کو اقتدار اعلیٰ کا مالک قرار دیتے ہیں۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا جو خصوصیات اللہ تعالیٰ کی ذات میں پائی جاتی ہیں وہ کسی فرد یا افراد کی جماعت میں ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی مفکرین آج تک اقتدار اعلیٰ کی مکمل اور جامع تعریف کرنے سے قاصر ہیں۔ اقتدار اعلیٰ کا مغربی تصور نصابوں کی طرح بدلتا رہتا ہے۔ کبھی وہ اقتدار اعلیٰ کی ڈور حکمران جماعت کے ہاتھوں میں تھا دیتے ہیں اور کبھی عوام اور دونوں کو اقتدار اعلیٰ کا اصل مالک ماننے لگتے ہیں۔ درج ذیل نکات میں اقتدار اعلیٰ کے اسلامی اور مغربی تصور میں اختلاف کی وضاحت کی جاتی ہے:

## 1- حاکمیت اعلیٰ:

اقتدار اعلیٰ کے اسلامی تصور میں صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔  
اقتدار اعلیٰ کا مالک اللہ تعالیٰ ہے جبکہ مغربی تصور میں اقتدار اعلیٰ کا مالک حکمران کو مانا جاتا ہے۔  
جمہوری نظام میں اقتدار اعلیٰ کی اصل طاقت عوام ہوتے ہیں۔

## 2- واضح تصور:

اقتدار اعلیٰ کا اسلامی تصور واضح ہے۔ اس میں اقتدار اعلیٰ کا مالک اللہ تعالیٰ ہے جبکہ  
مغربی تصور غیر واضح اور ابہام کا شکار ہے کیونکہ مغربی مفکرین آج تک اقتدار اعلیٰ کے اصل مالک  
کا تعین نہیں کر سکے۔

## 3- خصوصیات:

اسلامی تصور میں یہ بات کامل یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اقتدار اعلیٰ کی خصوصیات  
کی حامل صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جبکہ مغربی تصور کے مطابق یہ خصوصیات کسی فرد یا حکمران  
جماعت میں نہیں ہو سکتیں۔

## 4- قانون کی وضعگی:

قانون وضع کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں  
کہ وہ قانون بنائے اور دوسرے اس کی پابندی کریں۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتا  
ہے:

ترجمہ: ”وہ پوچھتے ہیں کہ اختیارات میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے! کہہ دو کہ اختیارات تو  
سارے اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔“

اس سے ثابت ہوا کہ قانون بنانے والا صرف خدا ہے کسی انسان کو قانون بنانے اور  
اس کی پابندی کروانے کا اختیار نہیں ہے جبکہ اقتدار اعلیٰ کے مغربی تصور میں مقتدر اعلیٰ یعنی حکمران  
فرد یا جماعت کو قانون وضع کرنے کے وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔

## 5- ناقابل ترمیم دستور:

اقتدار اعلیٰ کے اسلامی تصور میں اس کے دستور کو ناقابل ترمیم سمجھا جاتا ہے۔ قرآن مجید  
میں اللہ تعالیٰ نے جو احکامات اور قوانین بیان کئے ہیں ان میں قیامت تک کوئی ترمیم نہیں ہو  
سکتی جبکہ اقتدار اعلیٰ کے مغربی تصور میں مقتدر اعلیٰ قوانین میں ترمیم کرنے کے وسیع اختیارات کا  
مالک ہوتا ہے۔

## 6- قرآن و سنت کے مطابق فیصلہ:

اقتدار اعلیٰ کے اسلامی تصور میں صرف وہی فیصلہ درست تسلیم کیا جاتا ہے جو قرآن اور سنت کے مطابق کیا جائے۔ اس میں اکثریت کو کوئی دخل نہیں ہوتا جبکہ مغربی تصور میں اکثریت کا فیصلہ درست مانا جاتا ہے خواہ یہ قرآن و سنت کے منافی ہی کیوں نہ ہو۔

## 7- قانونی اور سیاسی اقتدار اعلیٰ میں فرق:

اقتدار اعلیٰ کے مغربی تصور کے مطابق قانونی اور سیاسی اقتدار اعلیٰ میں فرق ہے اور ان دونوں کے مالک بھی الگ الگ ہیں جبکہ اسلامی تصور میں قانونی اور سیاسی اقتدار اعلیٰ میں کوئی فرق نہیں اور ان دونوں قسم کے اقتدار اعلیٰ کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

## 8- آزادی اور حقوق کا تحفظ:

اقتدار اعلیٰ کے اسلامی تصور میں ہر فرد کو آزادی حاصل ہوتی ہے اور اس کے حقوق کا تحفظ کیا جاتا ہے جبکہ مغربی تصور میں آزادی اور حقوق کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی۔

## 9- مرضی میں فرق:

اقتدار اعلیٰ کے اسلامی تصور میں حکومت میں شامل افراد اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق عمل کرتے ہیں جبکہ مغربی تصور میں حکومت کا مقصد عوام کی مرضی کے مطابق عمل کرنا ہوتا ہے۔

# اسلامی تصور اقتدار اعلیٰ کی خصوصیات

اسلامی اقتدار اعلیٰ کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

## 1- دوامی حیثیت:

اقتدار اعلیٰ کا غیر فانی ہونا اسلامی اقتدار اعلیٰ کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ اسلامی اقتدار اعلیٰ کی نہ تو کوئی ابتداء ہے اور نہ ہی کوئی اختتام۔ یہ وہ صفت ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات باصفات کے لئے مخصوص ہے۔ اس کی حاکمیت نامعلوم زمانہ تک ہے۔ غیر اسلامی اقتدار اعلیٰ میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ آئے روز بدلتا رہتا ہے اور اس طرح اس میں ابدیت کا پہلو بالکل نظر نہیں آتا۔ عالمی نظام کو مناسب انداز میں چلانے کے لئے ایک ایسے اقتدار اعلیٰ کی ضرورت ہے جو ابتداء سے لے کر اختتام تک رہے۔ اسلام کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے اس ضرورت کو پورا کر کے باقی تمام تصورات پر برتری حاصل کر لی ہے۔

## 2- وحدت اقتدار:

اسلامی اقتدار اعلیٰ کی اس خصوصیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر لحاظ سے منفرد اور یکساں ہے اپنی صفات میں یکساں ہے اور صفات کے تقاضوں میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے: ”اس کے مانند کوئی چیز نہیں ہے۔“ سورۃ اخلاص میں ارشاد ہوتا ہے:

”کہو اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا اور کوئی اس کا ہمسر اور ثانی نہیں۔“

اسلامی اقتدار اعلیٰ میں اللہ تعالیٰ کی ذات ہی مقتدر اعلیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں یکساں ہے اور تمام کائنات کا مالک ہے۔ تمام اختیارات صرف اسی کو حاصل ہیں۔ وہ اپنی ذات میں واحد ہے ساری کائنات پر اسی کی بادشاہی ہے اور اس کے اقتدار اعلیٰ میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں۔

## 3- قدرت کاملہ:

اسلامی اقتدار اعلیٰ کی ایک اہم خصوصیت جو قرآن مجید میں بیان کی گئی ہے وہ اقتدار اعلیٰ کی قدرت کاملہ ہے۔ اس کی مملکت کی کوئی حد نہیں زمین و آسمان چاند و ستارے کائنات ہر چیز پر صرف اللہ کا حکم چلتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے اختیارات میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

i- ”خبردار ہو جاؤ کہ پیدا کرنا اور حکومت کرنا اسی کے لئے مخصوص ہے۔“

ii- ”اے نبی (ﷺ) فرشتے تیرے پروردگار کے حکم کے بغیر نہیں اترتے۔“

iii- ”بے شک اللہ تعالیٰ کائنات کی ہر چیز پر قادر ہے۔“

اللہ تعالیٰ کا اختیار صرف دنیا تک ہی محدود نہیں بلکہ دنیا کے خاتمے کے بعد قیامت کے دن کا مالک بھی اللہ تعالیٰ ہی ہوگا۔ اس دن بھی اس کا اقتدار ہوگا قیامت کے دن بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہر چیز پر چلے گا۔

## 4- بالا دستی:

اسلامی اقتدار اعلیٰ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے بالا و برتر ہے۔ وہ سب سے بزرگ و برتر حیثیت کا مالک ہے کوئی دوسرا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

i- ”بے شک ساری قوت اللہ ہی کے لئے ہے۔“



ii- ”بے شک تیرا رب قوت والا اور غالب ہے۔“

iii- ”اللہ بادشاہ برحق بلند و بالا دست ہے۔“

مندرجہ بالا آیات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کائنات کی ہر شے پر اللہ تعالیٰ کا کنٹرول ہے اور اس کے اقتدار کے ماتحت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ سے اوپر کوئی اقتدار اعلیٰ نہیں ہے۔ اس کی ذات ہر کی سے محفوظ اور ہر نقص سے خالی ہے اور تمام کائنات پر صرف اللہ تبارک و تعالیٰ و عزوجل ہی کا حکم چلتا ہے۔

### 5- مطلق العنان:

اسلامی اقتدار اعلیٰ مطلق ہے تمام اشیاء پر اللہ تعالیٰ کا مکمل کنٹرول ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے: ”بے شک اللہ ہر شے پر قادر ہے۔“

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

”جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسی کا ہے بے شک اللہ بے نیاز اور قابل ستائش ہے۔“

### 6- لامحدود حاکمیت:

اللہ تعالیٰ کی حاکمیت لامحدود ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ صرف سیاسی معاملات میں مقتدر ہستی ہے بلکہ پوری انسانی زندگی اور کائنات کا پورا نظام اس کی ہمہ گیر اور لامحدود حاکمیت کے زیر اثر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اپنی مثال آپ ہے۔

### 7- ناقابل تقسیم:

اسلامی تصور اقتدار اعلیٰ کے مطابق اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ناقابل تقسیم ہے۔ اس کی حاکمیت میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کے برعکس مغربی تصور اقتدار اعلیٰ کے مطابق اقتدار چھوٹی سطح سے لے کر بڑی سطح تک تقسیم ہوتا ہے جبکہ اسلامی تصور اقتدار اعلیٰ کے مطابق اقتدار اعلیٰ ناقابل تقسیم ہوتا ہے اور مقتدر اعلیٰ کا اختیار صرف اللہ پاک کے پاس ہے جو پوری کائنات کا خالق اور مالک ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

i- ”بے شک اللہ واحد اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔“

ii- کلمہ طیبہ میں فرمایا گیا ہے:

”نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔“

iii- ”اگر زمین و آسمان میں ایک کے سوائے اور بھی خدا ہوتے تو ان دونوں کا کام بگڑ

”جانتا۔“

”کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے کہ جو تم کو آسمان و زمین سے رزق دیتا ہو۔“

8۔ تسلسل:

اللہ تعالیٰ کا اس دنیا کے سارے حصوں پر مسلسل اور میوٹر کنٹرول ہے کوئی بھی ہستی اسے معطل نہیں کر سکتی۔ اسے ایک ایک پل کی خبر ہے۔ دنیا و کائنات کی کوئی بھی چیز اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

”اس کو نہ کسی وقت نیند آتی ہے اور نہ اونگھ اور نہ اسے دنیا و مافیہا کی حفاظت تھکا دیتی

ہے۔“

## مغربی اور اسلامی اقتدار اعلیٰ میں فرق

ہم ذیل میں مغربی اقتدار اعلیٰ اور اسلامی اقتدار اعلیٰ میں فرق کو نکات کی مدد سے واضح کرنے کی کوشش کریں گے:

### 1۔ ملکیت میں فرق:

اسلامی نقطہ نگاہ سے اقتدار اعلیٰ کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

”اور ہم نے انسانوں اور جنوں کو اپنی بندگی کے لئے پیدا کیا۔“

جبکہ مغربی تصور یہ ہے کہ مقتدر اعلیٰ کا انسان ہونا ضروری ہے اس کے بغیر مقتدر اعلیٰ کا تصور مشکل ہے۔

### 2۔ اختیارات میں فرق:

اسلام کے مطابق کوئی فرد خدا کے احکامات اور قوانین کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ جو کچھ فرماتے ہیں وہ اٹل ہوتا ہے اس میں چلک نہیں ہوتی۔

جبکہ مغربی اقتدار اعلیٰ کے قوانین آئے دن ترمیم و تہتیک کے مراحل سے گزرتے رہتے ہیں کیونکہ ان پر بہت سے اندرونی اور بیرونی عوامل اثر انداز ہوتے ہیں۔

### 3۔ دوامی حیثیت:

اللہ تعالیٰ کا اقتدار ہمیشہ قائم رہنے والا ہے اسے کبھی بھی زوال نہیں آئے گا۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ اس وقت بھی تھا جب کچھ اور تخلیق نہیں ہوا تھا وہ اس وقت بھی

رہے گا جب کوئی بھی باقی نہیں رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی ہی لازوال ہے اور اس کا اقتدار بھی زوال سے نا آشنا رہے گا۔ اسلامی ریاست میں ایک خلیفہ کا دور اختتام کو پہنچتا ہے تو عوام دوسرے خلیفہ کو منتخب کر لیتے ہیں۔ یوں انتظامی مشینری تبدیل ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا اقتدار بے پیمانہ قائم رہتا ہے۔

#### 4۔ مطلق العنان حیثیت:

اللہ تعالیٰ کے لئے قادر اور مقتدر مالک الملک، ملک الناس کے الفاظ قرآن پاک میں آتے ہیں۔ وہ قادر المطلق ہے ہر شے پر قادر ہے۔  
قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:  
”نہایت بزرگ و برتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں کائنات کی سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“

مزید ارشاد ہوتا ہے:

- i- ”جو کچھ چاہے پورا کر سکتا ہے۔“ (ہود: 107)
- ii- ”جو کچھ وہ کرتا ہے اس کی کوئی پریش نہیں۔“ (الانبیاء: 23)
- iii- ”اس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اقتدار ہے۔“ (المومنون: 88)

#### 5۔ لاشریک / واحد:

مغربی اقتدار اعلیٰ کا تصور واضح نہیں ہے۔ وہاں فرد کے اقتدار اعلیٰ میں کئی دوسرے افراد شریک ہیں لیکن اسلامی اقتدار اعلیٰ میں صرف خدائے واحد کا اختیار تسلیم کیا گیا ہے کوئی دوسرا اس کے ساتھ شریک نہیں۔ اسے ہم وحدت اقتدار بھی کہہ سکتے ہیں۔  
قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:  
”وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔“

#### 6۔ تسلسل:

اللہ تعالیٰ کا اقتدار اعلیٰ مسلسل موثر رہتا ہے اس کو کوئی معطل نہیں کر سکتا۔ وہ ہر دم موجود اور خردوار ہے۔ اسے اک اک چیز کی خبر ہے۔ کوئی شے اس کے علم سے مخفی نہیں۔  
قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:  
”اس کو نہ کسی وقت نیند آتی ہے اور نہ آگہ اور اسے دنیا و مافیہا کی خبر ہے۔“ (البقرہ)

جبکہ مغربی اقتدار اعلیٰ میں تسلسل نہیں ہے بادشاہ وقت کو سب کے بارے میں خبر نہیں

ہوئی۔

## 7- جامعیت:

اگر کسی اقتدار اعلیٰ کو جامعیت حاصل ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا اقتدار اعلیٰ ہے۔ وہ بڑی قدرتوں اور قوتوں والا ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر کوئی شے حرکت نہیں کر سکتی۔ سب کچھ اس کا ہے جو کہ آسمانوں اور زمینوں میں ہے۔ چاند، سورج، ستارے، سمندر، جنگل، زمین، چرند اور انسان سبھی اس کی تخلیق ہیں اور اس کے سامنے بے بس ہیں۔ وہ تمام عناصر پر کنٹرول رکھتا ہے۔ اس کے اقتدار کی حدیں ماپی نہیں جاسکتیں۔

سورہ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے:

”اس کی حکومت زمین سے آسمان تک ہے۔“

اگر انسان یہ کوشش کرے کہ اس کی حکومت سے کہیں باہر نکل جائے تو وہ بالکل نہیں ہو سکتا۔ اللہ پاک کا اقتدار بہت مضبوط ہمہ گیر اور جامع ہے۔ جن اور انسان سب اس کے تابع ہیں۔ وہ وحدہ لا شریک اور قادر مطلق ہے۔

## 8- لامحدود حیثیت:

اللہ پاک کا اقتدار اعلیٰ بے حد و حساب ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے تمام قوانین خود اس کے اپنے تخلیق کردہ ہیں۔ ریاست میں کوئی ایسا اقدام نہیں اٹھایا جاسکتا جو اس کے دیئے گئے قوانین سے متصادم ہو۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”پیروی کرو اس قانون کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور اسے چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔“ (الاعراف: 3)

اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ وہ کسی کو جوابدہ نہیں، سب اس کو جوابدہ ہیں۔ وہ کسی کا پابند نہیں، سب اس کے پابند ہیں۔ اس کا حکم قانون کا درجہ رکھتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”حکم اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں، اس کا فرمان ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی و اطاعت نہ کرو۔“ (یوسف: 40)

ایک اور جگہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

”اور جو اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں، وہی کافر ہیں۔“

(المائدہ: 44)

## 9۔ منفرد حیثیت:

اللہ پاک یکتا ہے اور اس کا اقتدار بھی یکتا ہے۔ اس جیسا کوئی ہے اور نہ ہوگا وہ منفرد ہے۔ نہ اس نے کسی کو جتنا اور نہ وہ کسی سے جتنا گیا۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کا اقتدار بالکل اچھوتا اور تنہا ہے۔ کوئی اور ہستی اقتدار اعلیٰ کا حامل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہر شے مخلوق ہے خود اللہ کی بنائی ہوئی ہے۔ اس لئے وہ ہر شے سے بالاتر قوی تر عظیم تر اور برتر ہے۔ اس نے جو قوانین عطا کئے ان میں تبدیلی کا اختیار قیامت تک کسی فرد یا ہستی کو حاصل نہ ہوگا۔

سورہ اخلاص میں اللہ تعالیٰ کے منفرد اقتدار کا ذکر کیا گیا ہے:

”کہو کہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ اس نے کسی کو جتنا اور نہ وہ کسی سے جتنا گیا۔“

## 10۔ ناقابل تقسیم اور ناقابل انتقال:

مغربی اقتدار اعلیٰ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتا رہتا ہے اور اس طرح ریاست میں بیک وقت کئی مقبضیتیں اقتدار اعلیٰ میں شریک ہوتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ کو نہ تقسیم کیا جاسکتا ہے اور نہ منتقل ہوتا ہے اور دائمی طور پر ایک ہی ہستی کے پاس رہتا ہے اور اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تقسیم اور منتقل نہیں کیا جاسکتا۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

”بادشاہی میں اس کا کوئی شریک نہیں۔“ (بنی اسرائیل: 111)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

”خبردار! خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا ہے۔“ (الاعراف: 54)

## ماحول:

درج بالا تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ اقتدار اعلیٰ اللہ ہی کو حاصل ہے کیونکہ یہ تمام خصوصیات اللہ تعالیٰ ہی میں پائی جاتی ہیں کسی اور میں یہ خصوصیات نہیں ملتیں۔ اسی لئے اقتدار اعلیٰ خدا ہی کو دیا گیا ہے کیونکہ اللہ پاک ہی تمام کائنات کا خالق ہے۔ وہی رب ہے اور سب کو پالتا ہے۔ ہر شے کا مالک بھی وہی ہے اور حکومت بھی صرف اسی کی ذات کو حاصل ہے۔ وہ قادر مطلق ہے اور اس کا اختیار لامحدود ہے کراں وسعتوں کا حامل اور ہر دہاؤ سے آزاد ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

”اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے۔“

اللہ کی سیاسی اور قانونی حاکمیت اسلام کے بنیادی اصول ہیں۔ دین اسلام قوانین کا

مجموعہ ہے اور یہ تمام قوانین اللہ کے قائم کردہ ہیں اور کوئی انسان ان قوانین سے انحراف نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے آخرت کی نوید سنائی ہے کہ اگر کوئی اس کے حکم کے بغیر کام کرے گا تو اسے سزا ملے گی۔ ان تمام خصوصیات کی وجہ سے اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔

پس کوئی اسلامی دستور اس کے بغیر نہیں بن سکتا کہ اس میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی سیاسی اور قانونی حاکمیت کا اقرار کیا جائے اور الفاظ صریح یہ لکھا جائے کہ یہ ریاست اللہ کی مطیع ہے۔ اس کو حاکم اعلیٰ تسلیم کرتی ہے اور اس کے احکام کو واجب التعمیل مانتی ہے۔

## دین و سیاست کا امتزاج

اسلام کا تمام تر نظام سیاست و معاشرت احکام خداوندی کے تحت ہے اور اس سلسلے میں اللہ عزوجل کی آخری الہامی کتاب ”قرآن پاک“ مکمل ضابطہ حیات اپنے اندر سمبھائے ہوئے ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ کامیاب زندگی گزارنے کے لئے اس جامع ترین کتاب الہی میں نہایت اعلیٰ اور پختہ اصول ہمیں میسر آتے ہیں اور اگر کوئی بات فہم میں نہ آئے تو رسول مقبول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سنت ہمیں منزل کی روشنی سے فیض یاب کرتی ہے۔ اسی طرح باقی امور میں اجماع، اجتہاد، استحسان، قیاس اور استدلال وغیرہ ایسی متفق علیہ اقدار ہیں جن کے ذریعے تمام مسلمان دینی اور دنیوی مسائل کا حل تلاش کر لیتے ہیں۔

ذرا غور فرمائیے کہ فرمان الہی اور حدیث نبوی کے بعد ہمیں ہمارے مسائل حل کرنے کے لئے اگر کسی چیز کا سہارا لینا پڑتا ہے تو وہ مل بیٹھ جانے کے بعد کسی ایک مسئلے پر باہمی مشاورت اور استدلال کا ذریعہ ہے اور یہ چیز مسلمانوں کی خود ساختہ نہیں ہے بلکہ حکم خداوندی ہے کہ جب کوئی ایسی مشکل پیش آ جائے یا کوئی اہم منصوبہ تفصیل دینے کی ضرورت ہو تو آپس میں مل بیٹھو اور مشورہ کرو۔ سیاسی زندگی میں تو مشاورت از بس لازمی جزو زندگی قرار دیا گیا ہے۔ قرآن میں اللہ عزوجل فرماتا ہے:

”و امرهم شورى بينهم۔“

”وہ اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں۔“

سید اسعد گیلانی ”اسلام کا شورا کی نظام“ میں لکھتے ہیں:

”اسلام کی داخلی قوت کی دو بنیادیں ہیں: اولاً توسیع و رسالت

آخرت اور دوم روزمرہ کی عملی زندگی میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر شورایت

انہی دو قوتوں کے بل پر آغاز اسلام میں مسلمانوں کی فکری یلغار کا کوئی مقابلہ

نہ کر سکتا تھا۔ اہل اسلام نے دیکھ لیا کہ ابھرتے ہوئے اسلامی دور نے سب

شورائیت کو چھوڑا اور ملوکیت کی طرف راغب ہوئی تو اسلامی ممالک کو کس قدر شدید دھچکا لگا۔ ملوکیت کے زمانے میں بادشاہ خدا کی بجائے کوئی فرد جلالہ الملک بن کر نمودار ہوتا ہے تو پوری کی پوری مملکت اسلامیہ میں خلفائے راشدین کے اتباع سنت نبوی کی پیروی کی بجائے قیصر و کسریٰ کی رسم ولی عہدی جاری ہو جاتی ہے۔ مشاورت کا اصول ختم ہوا تو پسندیدہ افراد کی طرف سے قصیدہ گوئی کا عمل شروع ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جبریت، ملوکیت، استبداد اور مطلق العنانیت کا کوئی واسطہ اسلامی نظام حکومت سے نہیں ہے حالانکہ مشورہ کو اہل ایمان کی بہترین صفات میں شمار کیا گیا ہے۔“

سورۃ آل عمران میں مشورہ کا حکم دیا گیا ہے، فرمان الہی ہے:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ

”اے محبوب! ان سے معاملات میں مشاورت کرو۔“

اس طرح ثابت ہوا کہ مشاورت اسلامی طرز زندگی کا ایک اہم ترین ستون ہے اور مشورے کے بغیر اجتماعی امور کا چلانا جاہلیت کا ہی کام ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ اللہ کے مقرر کردہ ضابطے کی صریح خلاف ورزی ہے۔

اسلام میں مشاورت کو کیوں اہمیت دی گئی ہے اس کی درج ذیل تین وجوہ ہمارے سامنے آتی ہیں:

1- جس معاملے کا تعلق دو یا زائد آدمیوں کے مفاد سے ہو اس میں کسی ایک شخص کی اپنی رائے سے فیصلہ کر ڈالنا اور دوسرے متعلقہ شخص کو نظر انداز کر دینا سراسر زیادتی ہے۔ مشترک معاملات میں کسی فرد واحد کو اپنی من مانی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ مشترک رائے کو مد نظر رکھا جائے اور جہاں کثرت سے کوئی مسئلہ حل ہوتا ہو اسے حل کر لیا جائے۔ چاہے اس میں کسی ایک فریق کا مفاد متاثر ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔

2- مشاورت کے وقت کوئی شخص کسی مسئلے کو اپنا مسئلہ نہ بنائے۔ وہ اپنی ذاتی اغراض کے تحت دوسروں کا حق تلف نہ کرے۔ خود کو بڑا اور دوسرے فریق کو حقیر نہ جانے۔ جب مشاورت کی بات ہو تو سب برابر ہوتے ہیں۔ اخلاقی اعتبار سے بھی یہ امر بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ متکبر اور خود پسند شخص اپنے تکبر اور سینہ زوری کی بناء پر کسی حقدار کا حق چھین لے اور لوگوں کی مشفقہ رائے کو یکسر نظر انداز کر دے۔

3- یہ کہ جن معاملات کا تعلق دوسروں کے حقوق سے ہو ان میں فیصلہ کرنا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ خدا ترس انسان یہ جانتا ہے کہ اس کی کس قدر سخت جوابدہی اس کو اپنے

رب کے سامنے کرنی پڑے گی۔ ایک مشترکہ معاملہ جن جن سے بھی متعلق ہو ان سب کو اس کا فیصلہ کرنے میں شریک مشورہ کرے تاکہ زیادہ سے زیادہ صحیح بے لاگ اور مبنی برانصاف فیصلہ کیا جاسکے۔

### احکام الہی کا تقاضا:

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

امروہم شوری بینہم

یہ قاعدہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مندرجہ ذیل پانچ باتوں کا تقاضا کرتا ہے:

- 1- اول یہ کہ اجتماعی معاملات میں جن لوگوں کے حقوق و مفادات سے تعلق رکھتے ہوں انہیں اظہار رائے کی مکمل آزادی ہو اور انہیں ان حقائق سے باخبر رکھا جائے کہ معاملات دراصل کس طرح چلائے جا رہے ہیں۔
- 2- دوم یہ کہ اجتماعی معاملات کو چلانے کی ذمہ داری جس شخص پر ڈالنی ہو اس کو عوام کی رضامندی سے مقرر کیا جائے اور اس رضامندی کا حصول آزادانہ رائے دہی کے ذریعے ہونا چاہئے۔ اس میں کوئی مکڑ فریب جبر یا خوف شامل نہیں ہونا چاہئے۔
- 3- سوم یہ کہ سربراہ کار کو مشورہ دینے کے لئے بھی وہ لوگ مقرر کئے جائیں جن کو قوم کا اعتماد حاصل ہو اور وہ کسی طرح کے دباؤ، لالچ اور لوبہ میں آئے والے نہ ہوں اور انہیں خود اپنے مخصوص مفادات عزیز نہ ہوں بلکہ وہ مشورہ دینے وقت صرف اور صرف حق کی بات کریں۔
- 4- چہارم یہ کہ مشیران حضرات اپنی پوری صلاحیتوں کو مکمل صداقت، نیک ایمان اور روشن ضمیری کے ساتھ بروئے کار لائیں اور مشورہ دیتے وقت کسی قسم کی خیانت یا غداری نہ کریں۔
- 5- پنجم یہ کہ جو مشورہ اہل شوری کے اجماع سے دیا جائے اور اسے اکثریت کی تائید حاصل ہوا اسے تسلیم کر لیا جائے۔

### ماحصل:

درج بالا بحث سے یہ تو واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کے ہر معاملے چاہے وہ معاشرتی ہو یا معاشی ہمیں ایک احتیاج نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام کے ان اصولہائے شوری کی اس توضیح سے یہ بنیادی بات بھی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ شوری مسلمانوں کے معاملات کو چلانے میں سلیقہ، انصاف اور عقار کل نہیں ہے بلکہ لازماً اس دین کے حدود سے محدود ہے جو اللہ عزوجل نے خود اپنی تشریع سے فرمائے ہیں۔ کوئی بھی شخص اس بات پر قادر نہیں کہ جن امور پر اللہ



عزوجل اور اس کے پیارے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اپنے فیصلے دے دیئے ہوں، ان کو پس پشت ڈالتے ہوئے کثرت رائے سے کوئی نئی بات اپنے مفاد کی خاطر منظور کر لیں۔ ارکان شوریٰ شرعی معاملات میں اس امر پر تو مشورہ دے سکتے ہیں کہ کس نص کا صحیح مفہوم کیا ہے لیکن اس غرض سے کوئی مشورہ نہیں دے سکتے کہ جس معاملہ کا فیصلہ اللہ عزوجل اور اس کے آخری نبی و رسول ﷺ نے کر دیا ہو اس میں وہ خود کوئی اپنا فیصلہ کریں۔

## خلافت و امامت

خلافت کا لفظ ”خلف“ سے نکلا ہے جس سے مراد ”نائب“ ہے اور نائب خواہ کسی کی زندگی میں یا اس کی زندگی کے بعد۔

خلافت کے لغوی معنی کسی کا قائم مقام ہونا کسی کے بعد آنا کسی کی جگہ ناظم امور بننا کے ہیں۔ اس کے معنی اس انداز سے بھی لئے جاسکتے ہیں کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی بجائے کوئی کام سرانجام دے خواہ وہ کام اس کی زندگی میں ہو خواہ اس کے بعد تو وہ خلافت کہلائے گا۔

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

”اگر ہم چاہتے تو ہم تم سے فرشتوں کو پیدا کر دیتے کہ وہ زمین میں جائیں ہوں۔“

## خلافت کی تعریف:

شاہ ولی اللہ کے مطابق:

”خلافت وہ عمومی ریاست ہے جو دین کی طرف عملاً متوجہ رہتی ہے۔“

ابن عابدین حنفی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں ان کے نزدیک:

”وہ عمومی ریاست جو دینی اور دنیاوی امور میں نبی کریم ﷺ کی نیابت میں کام کرتی ہو خلافت کہلاتی ہے۔“

## خلیفہ کی حیثیت

ایک اسلامی ریاست میں خلیفہ کا انتخاب عوام کی رائے اور مرضی سے کیا جاتا ہے۔ خلیفہ نہ صرف عوام کا نمائندہ ہے بلکہ اسلامی ریاست میں اس کی سب سے اہم ذمہ داری اسلامی نظام حیات کا نفاذ ہے۔ خلیفہ دینی اور دنیاوی دونوں طرح کے فرائض ادا کرنے کا پابند ہوتا ہے کیونکہ دیگر مذاہب کی طرح اور خصوصاً عیسائیت کی طرح اسلام میں دین اور سیاست کا تصور الگ الگ نہیں بلکہ یکجا ہے۔

## خلافت / امامت کی اہمیت

اسلامی حکومت کی پوری تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں کسی خاص تنظیم سے روشناس نہیں کرایا گیا۔ بنیادی اصول قرآن پاک میں دے دیے گئے ہیں اور ملت اسلامیہ ان بنیادی اصولوں کو اپنے وقت کی ضرورت کے مطابق استعمال کر کے احکام الہی کی حدود میں رہتے ہوئے سیاسی اداروں کی تشکیل کرتی رہتی ہے۔ اسلامی حکومت کی تنظیم میں پہلا ادارہ خلافت ہے جو کہ قرآن اور سنت کی روشنی میں حضور نبی کریم ﷺ اور ان کے بعد خلفائے راشدین کے دور میں وقت کی ضرورت کو پورا کرتا رہا اور ملت اسلامیہ کے لئے قابل تقلید ہوا۔

## خلافت / امامت کی خصوصیات

خلافت / امامت کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

### 1- اللہ کے قانون کی بالادستی:

خلافت راشدہ میں قانون کی نظر میں سب مساوی تھے۔ خود سربراہ مملکت کو اگر اپنا حق مانگنا ہوتا تو عدالت میں خود جاتا تھا۔ عدلیہ خود مختار و پائیدار تھی اور عالمہ کی گرفت سے آزاد تھی۔ لادینی طاقتوں پر دین کی فوقیت مسلم تھی۔

### 2- امور کی انجام دہی کیلئے باہم مشورہ:

ملت اسلامیہ کے تمام کام باہم مشورہ سے کئے جاتے۔ ”مشورہ“ خلافت راشدہ کی خصوصیت تھی۔ حضور نبی کریم ﷺ خود بھی صحابہ سے مشورہ کر کے تمام کام سرانجام دیتے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ وغیرہ نے عوام کو آزادانہ رائے کے اظہار کا حق دیا ہوا تھا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خلیفہ وقت غلو کام اگر کرتا تو عوام کے سامنے جوابدہ ہوتا۔ شورشی اگر خلیفہ سے اختلاف کرتی تو خلیفہ کو شورشی کے فیصلے ماننے پڑتے یا دلیل دے کر اپنی بات کو ثابت کرنا پڑتا۔

### 3- قرآن اور سنت کے مطابق فیصلے:

خلیفہ اور عامل کا اصل مقصد اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کو عملی طور پر نافذ کرنا تھا جس سے خلیفہ وقت اور عوام ایک دوسرے کے نزدیک ہو جاتے ہیں۔

### 4- جمہوریت کا فروغ:

خلفائے راشدینؓ کے دور میں کوئی شخص خلیفہ کو روک ٹوک سکتا تھا۔ حضرت عمرؓ کا نظریہ تھا

کہ جس چیز سے عوام محروم ہوں اس سے خود کو بھی محروم کر دو۔

### 5- امن و امان قائم کرنا:

خلیفہ وقت کی ذمہ داری ہے کہ معاشرہ میں خون خرابہ کی وجوہات کو ختم کر کے امن قائم کرے۔ اپنے محققین کے ذریعے وہ ایسا کر سکتا ہے۔ خلیفہ وقت کے لئے ضروری ہے کہ وہ شریعتوں کا قلع قمع کرے، ریاست کا وقار بلند کرے۔ شریعت کی سرکوبی کر کے ریاست میں رہنے والوں کو تحفظ فراہم کرے۔

### 6- مساوات قائم کرنا:

اسلام کا اصل مقصد تمام لوگوں کے ساتھ ایک قانون کے تحت یکساں سلوک کرنا ہے۔ کالے گورے، امیر غریب اور عورت و مرد تمام لوگوں کے ساتھ مساوی برتاؤ کرنا ہی اسلام ہے۔ اسلام میں مساوات قائم کرنے کی ذمہ داری بھی حکومت کی ہے کہ حالات چاہے کچھ ہوں تمام انسان برابر ہیں۔

قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”اے انسانو! ہم نے تم کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہیں مختلف گروہوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تاکہ ایک دوسرے کی پہچان کر سکو۔“

یعنی مساوات قائم کی گئی ہے۔ تمام لوگ ایک ہی ہیں برتری اگر ہے تو وہ صرف تقویٰ کی بنا پر۔ سب ایک ہی نسل سے ہیں۔ برتری اور امتیاز کو اسلام ختم کرتا ہے۔

نبی پاک ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

”تم سے پہلے جو امتیں گزری ہیں وہ اسی لئے تباہ ہوئیں کہ وہ لوگ کم درجے کے تجربوں کو قانون کے مطابق سزا دیتے تھے اور اونچے درجے والوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اگر محمد ﷺ کی اپنی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں ضرور اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔“

## خلافت / امامت کی ذمہ داریاں

اسلامی نظام میں خلافت ایک بہت اہم ادارہ ہے اس کی وجہ وہ تمام اہم ذمہ داریاں ہیں جو اس ادارے کے سپرد ہیں اور جن کی انجام دہی سے ہی ایک اسلامی معاشرے کا قیام اور ترقی ممکن ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں حکومت دے دیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے، برائی سے روکیں گے اور اللہ ہی کے اختیار میں ہے انجام

کار“ (اج: 41)

اس آیت سے خلافت کی چار ذمہ داریاں نمایاں ہوتی ہیں جو پورے معاشرے کو اپنے اندر سوسلیتی ہیں۔ امام ابن تیمیہ کے نزدیک:

### 1- نماز سے مراد:

نماز سے مراد پورے عبادات کے نظام کو قائم کرنا یعنی خلافت کی ذمہ داری ہے کہ وہ عبادات کے معاملات پورے کرے۔ مساجد کی تعمیر کروانا اور اس کے نظام کی دیکھ بھال کہ اس میں قابل اور مناسب تعلیم یافتہ افراد متعین ہوں۔ دفاتر اور کارخانوں کے اوقات اس طرح متعین کرنا کہ وہاں ان اوقات کے دوران نماز پڑھنے کا وقت دیا جائے۔ روزہ کے احترام کو قائم کیا جائے۔

### 2- زکوٰۃ کے نظام سے مراد:

زکوٰۃ کے نظام سے مراد اسلام کے مکمل معاشی نظام کو قائم کرنا تاکہ معاشرے میں توازن قائم ہو اور کچھ نہ ہو۔ اسلام جائز طریقے سے کمائی ہوئی دولت رکھنے سے منع نہیں کرتا اور ناجائز آمدن کے ذرائع بند کرتا ہے۔ سود کو ختم کیا جائے غریب کو غریب تر اور امیر کو امیر تر ہونے سے بچایا جائے۔ تمام لوگوں کو بنیادی ضروریات فراہم کی جائیں۔ مرد و عورت کی شادی کا انتظام کیا جائے مثلاً جہیز کے نظام کو ختم کرنا یا بیٹیوں کو فروخت کرنے کے طریقے کو ختم کیا جائے۔

### 3- نیکی کا حکم دینے سے مراد:

نیکی کا حکم دینے سے مراد نیکی کو فروغ دینا۔ تعلیمی نظام کے ذریعے بے لوگوں میں نیکی کا جذبہ پیدا کیا جائے اور ایسا ماحول پیدا کیا جائے جس سے لوگوں کو نیک کام کرنے کے مواقع نصیب ہوں۔ رشوت، سفارش، بددیانتی کو ختم کر دیا جائے۔ تعلیمی نظام اور دیگر ابلاغ عامہ کے ذریعے لوگوں کو نیکی، اچھائی، بہتر اور مستحسن طریقوں کی طرف راغب کیا جائے۔ تعلیمی نصاب میں رد و بدل ہو۔ استاد کے اخلاق سے طالب علم متاثر ہوں۔

### 4- برائی کو روکنے سے مراد:

برائی کو روکنے کے لئے نظام عدل اور پولیس کا انتظام کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ خلافت نے پہلے تو عبادات کا نظام، معاشی نظم و ضبط کا نظام قائم کر دیا اور لوگوں کو نیکی کا حکم دیا اس کے باوجود بھی اگر افراد قانون شکنی کریں تو حکومتیں انہیں سزائیں دیتی ہیں کہ اگر کوئی فرد اخلاقی یا سماجی برائی کا مرتکب ہوتا ہے تو سزا پاتا ہے۔ سیاسی نظام عدل اور انتظامیہ قائم کرنا اور پھر

انصاف کے ذریعے مجرم ہی کو سزا دی جائے کسی دوسرے سے بے گناہ کو نہ دی جائے۔

اس کے علاوہ بھی ایک اسلامی ریاست میں خلافت کی بہت زیادہ ذمہ داریاں ہیں کہ سارا نظام خلافت ہی کے تلے چلتا ہے۔ اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں بھی خلافت ہی کی ذمہ داریاں ہیں۔ خلافت کی دیگر ذمہ داریاں درج ذیل ہیں:

- 1- عدل و انصاف
- 2- بنیادی ضروریات کی فراہمی
- 3- عوام کے لئے روزمرہ سہولیات کی فراہمی
- 4- معاشی نظام اور دولت کی منصفانہ تقسیم
- 5- مساوات
- 6- شعائر دین کے قیام کا فریضہ ادا کرنا
- 7- امن و امان قائم کرنا
- 8- ملکی سرحدوں کا تحفظ
- 9- دین کی اشاعت کے لئے تبلیغ کا فریضہ
- 10- ضرورت مند اور مستحق افراد کی مالی امداد
- 11- زکوٰۃ، عشر، جزیہ و دیگر شرعی واجبات کی وصولی
- 12- ایماندار افراد کا حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر تقرر
- 13- ریاست و حکومت کے معاملات کو اپنی ذاتی نگرانی میں ادا کرنے کا فریضہ
- 14- مساجد میں نظام صلوٰۃ کا بندوبست کرنا
- 15- لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرنا
- 16- اسلامی اقدار کا فروغ اور توحشات پر مبنی رسوم و رواجات کا خاتمہ
- 17- تعلیم کے فروغ اور غربت و جہالت کا خاتمہ
- 18- اسلامی حدود و قیود کا نظام

## اسلامی ریاست میں خلیفہ کے اوصاف اور فرائض

خلیفہ وقت کو جس طرح ذمہ داریاں پوری کرنی ہوتی ہیں اور جس طرح عدل معاشرے میں قائم کرنا ہوتا ہے اس کے لئے ایسی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے جو اسلامی تعلیمات کو ان کی روح کے مطابق سمجھے اور عمل کرے۔ اسلامی نظام حکومت میں اللہ کا کوئی شریک نہیں اس کا دیا ہوا ضابطہ حیات اور شریعت جوں کی توں نافذ کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

”قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب اور سب سے زیادہ قریب مقام پانے والا شخص امام عادل ہوگا اور سب سے زیادہ مبغوض اور شدید ترین عذاب کا مستحق وہ شخص امام جابر ہوگا۔“ (ترمذی)

## خلیفہ کے اوصاف

خلیفہ میں دوسروں کی نسبت کچھ اہم خصوصیات ہونا ضروری ہیں:

مسلمان ہو:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأَطِيعُوا أَمْرًا مَعَكُمْ. (النساء)

”اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور ان لوگوں کی جو

تم میں سے اولی الامر ہوں۔“

اولی الامر کا مسلمانوں میں سے ہونا واضح ہوا تو سربراہ مملکت کے لئے ضروری ہوا کہ وہ مسلمان ہو تاکہ اپنی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کر سکے۔ جو خود ان نظریات کا ماننے والا نہ ہوگا وہ کس طرح اسلامی ریاست کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کر سکے گا۔

سورۃ الحج میں ارشاد ہوتا ہے:

الَّذِينَ ان مَعَهُم فِي الْأَرْضِ الْخَامِ وَالصَّلَاةِ وَالْأَمْرَ الزَّكَاةَ وَأَمْرًا مَعَهُم بِالْمَعْرُوفِ

وَنَهْيِهِ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاللَّهُ عَذِيقُهُ الْأَمْرَ.

سچے مومنوں کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ جو نبی ہم ان کو زمین میں اقتدار دیتے ہیں تو وہ رسول اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام کی طرح بلاتا خیر صلوٰۃ، زکوٰۃ، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے نظام قائم کرتے ہیں اور کل امور کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ یہ چار نظام یعنی صلوٰۃ، زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اپنی اپنی منفرد حیثیت بھی رکھتے ہیں اور ان کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ معاشرے کی ان چار بنیادوں کو قائم کرنا اولی الامر کی ذمہ داری ہے۔ سربراہ مملکت مسلمان ہوگا تب ہی ممکن ہے ملت اسلامیہ کے لئے صراطِ مستقیم کا راستہ واضح کرے گا اور افراد ملت کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نظام اسلام کو رائج کرنے کا حکم دے گا۔

سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خُذُوا حُلُمًا.

”اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو (حلقہ) اسلام میں یا حدود اللہ میں پورے کے پورے

داخل ہو جاؤ۔“

حکومت کا فرض منجھی ہے کہ افراد معاشرہ کے تعلیم و تربیت کا انتظام کرے اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ جب سربراہ مملکت خود قرآن حکیم کے مطابق زندگی گزار رہا ہو۔ حضرت ابو بکرؓ نے ارشاد فرمایا:

”جو شخص محمد ﷺ کے اُمت کے معاملات میں سے کسی معاملے کا ذمہ دار بنایا گیا اور پھر اس نے کتاب اللہ کے مطابق کام نہ کیا اس پر اللہ کی لعنت!“

مشورہ کرنے والا:

اسلامی ریاست کے سربراہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ باہم مشورہ سے تمام مسائل حل کرنے کی کوشش کرے کیونکہ اسلامی سیاسی نظام کی بنیاد ہی مشورہ پر ہوتی ہے۔ خلیفہ وقت جو سربراہی کی ذمہ داری پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کوئی کام بھی بغیر مشورہ کے نہیں کرے۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اگر آپ ﷺ کے بعد ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جس کے متعلق نہ قرآن میں کوئی حکم ہو اور نہ آپ ﷺ سے ہم نے کچھ سنا ہو تو کیا کریں گے؟

تو حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”میری اُمت کے عابد لوگوں کو جمع کرو اور اس معاملے کو آپس کے مشورہ کے لئے پیش کر دو۔ کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کر ڈالو۔“

حضور نبی کریم ﷺ کی ذات جو اتنی مکمل تھی کہ ملت اسلامیہ کے لئے رہتی دنیا تک ایک نمونہ ہے جسے مسلمانوں نے تقلید کرنا ہے کلام الہی میں اللہ ایسی ہستی کو حکم دیتا ہے کہ اسے نبی ﷺ ان سے معاملات میں مشاورت کرو۔ اب حضور اکرم ﷺ کے لئے جو حکم ہے وہ رہتی دنیا تک ملت اسلامیہ کے لئے حکم ہے۔ ثابت ہوا کہ خلیفہ وقت کو بھی ہر کام میں دوسروں سے مشورہ لے لینا چاہیے۔

### جسمانی عیب سے پاک:

خلیفہ کے لئے ضروری ہے کہ اس کے تمام اعضاء درست ہوں تاکہ حکومتی ذمہ داریاں نبھانے میں کسی قسم کی کوئی شکایت نہ ہو۔ صحیح الکلام ہونا ضروری ہے تاکہ اپنی بات دوسروں کو آسانی سے سمجھ سکے۔

### اللہ کے قانون کے مطابق کام کرنے والا:

حکام کی صرف اس حد تک پیروی کی جاتی ہے جب تک کہ وہ اللہ اور رسول ﷺ کی پیروی کریں۔ رسول اکرم ﷺ کی اطاعت کو بھی معروف کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے۔ خلیفہ

وقت جب تک اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے قانون الہی کے مطابق حکم صادر کرے گا تب تک عوام پابند ہیں کہ اس کے احکام کی تعمیل کریں۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

”مسلمانوں کے فرمانروا پر یہ فرض ہے کہ وہ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرنے اور امانت ادا کرنے۔ پھر جب وہ اس طرح کام کر رہا ہو تو لوگوں پر یہ فرض ہے کہ اس کی سنیں اور مانیں اور جب انہیں پکارا جائے لبیک کہیں۔“

سورۃ المائدہ میں ارشاد ہے:

فاحکم بینہم بما انزل اللہ.

”پس تم لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے کرو۔“

حدیث نبوی ﷺ ہے: ”تم پر لازم ہے کہ کتاب اللہ کی پیروی کرو جس چیز کو اس نے حلال کیا ہے اسے حلال کرو اور جسے اس نے حرام کیا ہے اسے حرام کرو۔“

## خليفة کے فرائض

اسلامی ریاست کو حدود انہی کے مطابق چلانے کے لئے خلیفہ وقت کو اہم ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں جس کے لئے اسے اپنا تن من دھن سب کچھ لگانا پڑتا ہے۔

حدیث رسول ﷺ ہے:

”کوئی حاکم جو مسلمانوں کی حکومت کا کوئی منصب سنبھالے پھر اس

کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے جان نہ لڑائے اور خلوص کے ساتھ کام نہ

کرسے وہ مسلمانوں کے ساتھ جنت میں قطعاً داخل نہ ہوگا۔“

خلیفہ کو جب اس کے منصب پر فائز کر دیا جاتا ہے تو اسے مختلف اقدامات کرتے وقت حلال اور حرام کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنی پڑتی ہیں۔ بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرائض کی ادائیگی کے سلسلہ میں یہ دیکھ لیا جائے اسلامی نقطہ نگاہ سے ان فرائض کو کن گروہوں میں بانٹا گیا ہے۔

## قرض:

وہ اعمال جن کو قطعی طور پر لازم قرار دیا گیا ہے ان کے نہ کرنے پر اللہ سے سزا مسترد کی ہوئی ہے۔ یہ انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔

## حرام:

وہ اعمال جن کو اللہ تعالیٰ نے کرنے سے مکمل طور پر منع فرمایا ہے۔ اس کے کرنے والوں کے لئے شدید عذاب کی خبر ہے۔



## مستحب:

یہ وہ اعمال ہیں کہ اگر کر لئے جائیں تو اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہیں اور نہ کرنے پر کوئی عذاب یا سزا نہیں۔

## مباح:

ان کے کرنے پر نہ تو ثواب مقرر ہے اور نہ کرنے پر عذاب بھی مقرر نہیں۔ خلیفہ کی ذمہ داری ہے کہ ملت اسلامیہ میں حلال اور حرام کی تمیز پیدا کرے انہیں فرائض کی ادائیگی کی ترغیب دے اور حرام سے روک کر رکھے۔

خلیفہ کے فرائض کے سلسلہ میں یہ بات شامل ہے کہ وہ عوام کو عین احکامات الہی کے مطابق زندگی گزارنے کی تمام سہولیات بہم پہنچائے۔ مختلف مفکرین نے خلیفہ وقت کی ذمہ داریوں کو احاطہ تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے۔

شاہ ولی اللہ ابن خلدون، الماوردی جیسے مفکرین اسلام نے خلیفہ کو مندرجہ ذیل فرائض ادا کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے:

## 1۔ امن و امان قائم کرنا:

خلیفہ وقت کی ذمہ داری ہے کہ معاشرہ میں خون خرابہ کی وجوہات کو ختم کر کے امن قائم کرے۔ اپنے معتقدین کے ذریعہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ شاہ ولی اللہ الماوردی اور ابن خلدون نے خلیفہ کی اس ذمہ داری کو سب سے اہم قرار دیا ہے تاکہ عوام کی جان و مال کو تحفظ حاصل ہو۔ خلیفہ وقت کیلئے ضروری ہے کہ وہ شریعتوں کا قلع قمع کر کے ریاست کا وقار بلند کرے۔ شریعت کی سرکوبی کر کے ریاست میں رہنے والوں کو تحفظ فراہم کرے۔

## 2۔ شریعت کے مطابق سزا نافذ کرنا:

معاشرے کے شریعت پسند لوگوں کو غیر تاک سزائیں دینا بھی خلیفہ وقت کی ذمہ داری ہے۔ اسلامی سزائوں کا نفاذ بہت ضروری ہے۔ خلیفہ کو ذمہ برابر بھی نرمی کا برتاؤ نہیں کرنا چاہئے۔ محرمین اگر اسلامی حدود اور قانون کی خلاف ورزی کریں تو خلیفہ ہی ذمہ دار ہے کہ اللہ کے قانون کی بالادستی قائم ہو۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوْا اللّٰهَ کَیْ تَحْبُوْا ۚ وَ اطِیْعُوْا الرَّسُوْلَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلٰی الْعٰلَمِیْنَ عَلٰی ۙ

نہ کرنے والوں کو سورۃ المائدہ میں اللہ نے فاسق، فاجر اور کافرین کہہ کر پکارا ہے لہذا کتاب اللہ کی پیروی کرنا خلیفہ وقت کے لئے سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

حدیث نبوی ﷺ ہے:

طاعة في معصية الله انما الطاعة في المعروف.

”اللہ کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں، اطاعت صرف معروف میں ہے۔“

حضرت ابو بکرؓ نے خلیفہ بننے ہی خطاب کیا:

”میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہوں اور

جب میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تم پر نہیں۔“

حضرت علیؓ نے خلیفہ خلافت میں کہا:

”میں اللہ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے تم کو جو حکم دوں اس کی اطاعت تم پر فرض ہے

خواہ وہ حکم تمہیں پسند ہو یا ناپسند اور جو حکم میں تمہیں اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے دوں تو

معصیت میں کسی کے لئے اطاعت نہیں، اطاعت صرف معروف میں ہے، اطاعت صرف معروف

میں ہے، اطاعت صرف معروف میں ہے۔“

### 3- مساوات قائم کرنا:

اسلام کا اصل مقصد تمام لوگوں کے ساتھ ایک قانون کے تحت یکساں سلوک کرنا ہے۔

کالے گورے امیر و غریب اور عورت اور مرد تمام لوگوں کے ساتھ مساوی برتاؤ کرنا ہی اسلام

ہے۔ اسلام میں مساوات قائم کرنے کی ذمہ داری بھی خلیفہ وقت کی ہے کہ حالات چاہے کچھ

بھی ہوں تمام انسان برابر ہیں۔ واصل قرآن میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اللہ نے تمام

لوگوں کی تخلیق ایک ہی طرح کی ہے۔ قرآن تو وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے۔“

ارشاد ہے:

”اے انسانو! ہم نے تم کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہیں مختلف

گروہوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تاکہ ایک دوسرے کی پہچان کر سکو یعنی مساوات قائم کی گئی

ہے۔ تمام لوگ ایک ہی ہیں برتری اگر ہے تو وہ صرف تقویٰ کی بناء پر۔ سب ایک ہی نسل سے

ہیں برتری اور امتیاز کو اسلام ختم کرتا ہے۔“

خلیفہ وقت اس کے لئے سب سے زیادہ ذمہ دار ہے کہ لوگوں کو قانون کی نظر میں ایک

ہی طرح سے دیکھے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

”تم سے پہلے جو آئیں گزری ہیں وہ اسی لئے تباہ ہوئیں کہ وہ لوگ کم درجے کے

بھروسوں کو قانون کے مطابق سزا دیتے تھے اور اونچے درجے والوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ تم ہے

اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے اگر محمد ﷺ کی اپنی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری

کرتی تو میں ضرور اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔“

## شوری

شوری اسلامی حکومت کا خاصہ و لازمہ ہے اور امامت الکبریٰ کے عہدہ کے لئے لازمی وصف ہے جو کبھی اس سے جدا نہیں ہو سکتا۔ اسلامی حکومت کی صحیح تصویر کے لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شوری حکومت کی جان ہے بلکہ شوری ہی حکومت ہے۔

ہر ریاست اسلامی کا پورا کام اس کی تاسیس و تشکیل سے لے کر مقتدر اعلیٰ خلیفہ یا امیر مملکت یا رئیس مملکت یا امام یا اولی الامر کے انتخاب اور تشریح و انتظامی معاملات تک اہل ایمان کے باہمی مشورے سے چلنا چاہئے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ مشاورت بلا واسطہ ہو یا منتخب نمائندوں کے ذریعے سے۔

واموہم شورى بینہم (الشوری: 34)

”اور مسلمانوں کا کام آپس کے مشورہ سے چلنا ہے۔“

اسلام کی شوری حکومت (ریاست عامہ) کا قیام و دوام شوری پر منحصر ہے۔ اس کا بننا باقی رہنا قوت و اقتدار میں رہنا انتظامات کی ترقی وغیرہ امت کی دائے عامہ اہل حل و عقد (قابل مشیران حکومت) کے مشورہ جماعت کے خدا داد اجتہاد اور شوری کے بحث و مباحثہ پر موقوف ہے۔ چنانچہ اولی الامر (خلیفہ) ہر اہم معاملہ میں شوری (مجلس مشورہ) سے مشورہ کرنے کا پابند ہوتا ہے لیکن فیصلہ کا اختیار خلیفہ کے ہاتھ میں ہی ہوتا ہے چنانچہ شوری اسلامی حکومت کی جان ہوتی ہے بلکہ شوری ہی حکومت ہے۔

## شوری کے عناصر

شوری (مجلس مشورہ) کے مندرجہ ذیل اجزاء یا عناصر ہوتے ہیں:

### 1- امام یا خلیفہ:

یہ شوری حکومت کا منتخب رہنما و قائد اعلیٰ ہوتا ہے۔

### 2- اُمت اسلامیہ کا گروہ:

خدائے واحد کو ماننے والوں اور فطری قوانین کو ماننے والے ہوں۔ ایمان دار ہوں خدا ترس اور نیکو کاروں کا عالمگیر گروہ ہو۔ یہ افراد شوری کے انتخاب میں حصہ لینے کے حقدار ہوتے ہیں۔ ان کی اہلیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ظالم فاسق و فاجر خدا سے غافل اور حد سے گزر جانے والے نہ ہوں بلکہ ایمان دار خدا ترس اور نیکوکار ہوں۔ اگر کوئی ظالم یا کاسق امارت خلافت امارت کے اعلیٰ منصب پر قابض ہو جائے تو اس کی امارت اسلام کی نگاہ میں باطل ہے۔

## 3۔ مجلس اہل حل و عقد:

تیسرا عنصر مجلس اہل حل و عقد (حکومت کے مدبروں، مفکروں، مشیروں کی مجلس) کا مرکزی ادارہ ہے جس کے ارکان قابلیت کے لحاظ سے اعلیٰ کردار کے مالک اور بلند خدمات کی وجہ سے پوری طرح اُمت کی نظروں میں قابل و اہل تصور کئے جاتے ہوں۔ بوقت ضرورت انہی میں سے خلیفہ یا امام منتخب کر لیا جاتا ہے۔

## 4۔ ارکان شوریٰ:

اسلامی ریاست کے وہ عام شہری جو اسلام کے فطری قوانین کے پابند ہوں بشرطیکہ اوسط درجہ کے علم و عقل سے بہرہ مند ہوں اُمت کے وہ تمام افراد جو شوریٰ میں شرکت کر سکیں جو اجتماعی نظم کے خواہاں ہوں ذاتی غرض اور حرص و لالچ اور شخصی نفع امدوزی کے تصور سے خالی ہوں یعنی امین ہوں اور اس درجہ سلامتی فکر کے مالک ہوں کہ صحیح رائے پیش کر سکیں شوریٰ کے رکن بن سکتے ہیں۔ (اشتراک کا یہ طریقہ حالات کے مطابق بدل سکتا ہے۔)

## ہائے دہندگان یعنی ووٹر

ووٹ دینے کا حق ہر کسی کو ہے بشرطیکہ وہ انسانیت اور اسلام کے معاشرہ اخوت کا رکن ہو۔ عاقل ہو بالغ ہو قانون کا پابند ہو اور کسی معاملے میں رائے دینے کے لئے جتنا علم، قابلیت، سمجھ بوجھ ضروری ہے اس سے محروم نہ ہو یا بالغ نہ ہو۔ استعواب رائے عامہ (General Election) کی صورت میں حق رائے دہی کی دو شرطیں ہیں:

1۔ اسلام

2۔ اسلامی شعور

اس کے علاوہ کسی علمی ڈگری و سند کی ضرورت نہیں۔ نہ ثروت مندی کی اور نہ خاص قیمت جاہ و ثروت کے مالک ہونے کی شرط نہ ہی رنگ و نسل، قوم یا وطن کی قید عائد ہوتی ہے۔ اس صورت میں مردوں، عورتوں، بوزعموں، شہرچہ و دیہاتی، مقیم اور مسافر سب رائے دینے کے حقدار ہیں رائے دہی کے مالک ہیں۔

## ایوان شوریٰ

تدریجی کے جلسوں کے لئے ایوان کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے جس طرح مصر حاضر میں ہر دارالعوام کی ایک عمارت ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلام کی بعثت کے بعد مکہ میں مسلمانوں کے اجتماع اور باہمی مشوروں کے لئے دارالارقم ابتدائی ایوان تھا جس کو دارالسلام (ایوان حکم برداری)

کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ دراصل یہ مشہور صحابی حضرت ارقم بن ارقم کا گھر تھا جو انہوں نے مسلمان صحابہؓ کو جمع ہونے یا بھی مشورہ کرنے اور اسلام قبول کرنے والے صحابہؓ کی پناہ گاہ کا دیتا تھا۔ شروع شروع میں اسی گھر میں نمازیں باجماعت ادا کی جاتی رہیں جبکہ اس کے مقابلے میں کفار کا مرکز ”دارالندوہ“ تھا۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں عہد سعادت تک کھلے میدانوں سے ایوان کا کام لیا جاتا تھا۔ مسجد نبویؐ بہت ہی با عظمت اجتماعوں کے لئے وقف تھی۔ خلاف راشدہ میں سب سے پہلے ایوان شوریٰ سقیفہ بنی ساعدہ کا ایک مکان مقرر ہوا تھا۔ اسی سقیفہ بنی ساعدہ میں خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ کا انتخاب معرض وجود میں آیا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے انتخاب کے متعلق خاص شوریٰ صدیق اکبرؓ کی قیام گاہ پر منعقد ہوئی تھی۔ عام شوریٰ کے متعلق صرف اتنا معلوم ہے کہ عوام الناس ایک مقام پر جمع تھے جہاں ان کی رائے لی گئی۔ یہ معلوم نہیں کہ یہ اجتماع مسجد نبویؐ میں تھا یا کسی اور جگہ۔ حضرت عثمانؓ کے متعلق ”دارالمسور“ کو ایوان شوریٰ کی حیثیت سے استعمال کیا گیا۔ چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ کے انتخاب کے لئے مسجد نبویؐ کو ایوان شوریٰ کا درجہ حاصل ہوا اور یہی مسجد نبویؐ استصواب رائے عامہ کے لئے بھی استعمال ہوئی۔ یہ ہے ایوان شوریٰ کی تاریخ جس کا مقصد یہ بیان کرنا تھا کہ عصر حاضر میں اگر ایوان شوریٰ کی بلڈنگ کی ضرورت محسوس ہو تو ایوان تعمیر کرنے کا جواز ہے۔ اسلامی تاریخ اجازت دیتی ہے کہ ایوان شوریٰ اسلام کے عمرانی رجحان کے عین مطابق ہوگا۔

## شوریٰ کی اہمیت

اسلام کا تمام تر نظام سیاست و معاشرت احکام خداوندی کے تحت ہے اور اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ”قرآن پاک“ مکمل ضابطہ حیات ہے۔ ہمارے لئے زندگی کے تمام مسائل کا حل اس میں سمودیا گیا ہے۔ یہ ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ کامیاب زندگی گزارنے کے لئے اس جامع کتاب الہی میں نہایت اعلیٰ اور پختہ اصول ہمیں میسر آتے ہیں۔ اگر کوئی بات فہم میں نہ آئے تو حضور اکرم ﷺ کی سنت ہمیں منزل کی روشنی سے فیض یاب کرتی ہے اسی طرح باقی امور میں اجماع اجتہاد استحسان قیاس اور استدلال وغیرہ ایسی مختلف علیہ اقدار ہیں جن سے ذریعے شوریٰ اور عام مسلمان دنیوی اور دنیادی مسائل کا حل تلاش کر لیتے ہیں۔

ذرا غور فرمائیے کہ فرمان الہی اور حدیث نبوی ﷺ کے بعد ہمیں ہمارے مسائل حل کرنے کے لئے اگر کسی چیز کا سہارا لینا پڑتا ہے تو وہ شوریٰ ہے جو مل بیٹھ کر کسی ایک مسئلے پر الہی مشاورت اور استدلال کے ذریعے فیصلہ پر پہنچتی ہے۔ یہ طریقہ مسلمانوں کا خود ساختہ نہیں ہے بلکہ تعلیم خداوندی کے تحت ہے۔

ترجمہ: ”مسلمانوں کا کام آئیں میں مشورہ سے چلتا ہے۔“ (الشوری: 38)

یعنی جب کوئی مشکل پیش آ جائے یا کوئی اہم منصوبہ تشکیل دینے کی ضرورت ہو تو آپس میں مل بیٹھو اور مشورہ کرو۔ سیاسی زندگی میں تو مشاورت از بس لازمی جزو زندگی قرار دیا گیا ہے۔ یہی و امرہم شوریٰ بینہم کی تفسیر ہے۔ اسی طرح شوریٰ کے قیام کے لئے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

و مشاورہم فی الامر۔

”اے نبی ﷺ ان سے معاملات میں مشورہ کیا کرو۔“

اس طرح ثابت ہوا کہ مشاورت اسلامی طرز حکومت و اسلامی زندگی کا اہم ترین ستون ہے اور مشورے کے بغیر اجتماعی امور کا چلانا جاہلیت کا ہی کام ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہہ لیجئے کہ اللہ کے مقرر کردہ ضابطے و احکام کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔

سید اسد گیلانی صاحب اپنی تصنیف ”اسلام کا شورائی نظام“ کے حرف اول میں فرماتے ہیں کہ اسلام کی داخلی قوت کی دو بنیادیں ہیں: اولاً توحید و رسالت و آخرت اور دوم روزمرہ کی عملی زندگی میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر شورائیت۔

انہی دو قوتوں کے بل بوتے پر آغاز اسلام میں مسلمانوں کی فکری یلغار کا کوئی مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اہل اسلام نے دیکھ لیا کہ ابھرتے ہوئے اسلامی دور نے جب شورائیت کو چھوڑا اور ملوکیت کی طرف راغب ہوئی تو اسلامی ساکھ و قوت کو کتنا شدید وچکا لگا۔ ملوکیت کے زمانہ میں بادشاہ خدا کی بجائے کوئی فرد جلالۃ الملک بن کر نمودار ہوتا ہے تو پوری کی پوری مملکت اسلامیہ خلفائے راشدین کے اتباع و سنت نبوی کی پیروی کی بجائے قیصر و کسریٰ کی رسم و رواج جاری ہو جاتی ہے۔ مشاورت کا اصول ختم ہوا، استبداد اور مطلق العنانیت کا دور شروع ہو گیا۔ پسندیدہ شاعروں کوگوں کی طرف سے قصیدہ گوئی کا عمل شروع ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ بیزیت، ملوکیت، استبداد اور مطلق العنانیت کا کوئی واسطہ اسلامی نظام حکومت سے نہیں ہے حالانکہ مشورہ کو اہل ایمان کی بہترین صفات میں شمار کیا گیا ہے۔

اسلام میں مشاورت کو کیوں اہمیت دی گئی ہے اس کی تین وجوہات ہمارے سامنے آتی

ہیں:

۱۔ کہ جس معاملے کا تعلق دو یا دو سے زائد آدمیوں کے مفاد سے ہو اس میں کسی ایک شخص کی اپنی رائے سے فیصلہ کر ڈالنا اور دوسرے متعلقہ شخص کو نظر انداز کر دینا سراسر زیادتی و ظلم ہے۔ حضرت علیؑ کو حضور اکرم ﷺ نے وصیت کی تھی کہ ”جب تک دونوں پارٹیوں (مدعی و مدعا علیہ) کا بیان نہ سن لو کوئی فیصلہ نہ کرنا۔“

چنانچہ مشترکہ معاملات میں کسی فرد واحد کو اپنی من مانی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ مشترکہ رائے کو مد نظر رکھا جائے اور جہاں کثرت رائے سے کوئی

مسئلہ حل ہوتا ہو تو اس کو حل کر لیا جائے چاہے اس میں کسی ایک فریق کا مفاد متاثر ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔

- 2- یہ کہ مشاورت کے وقت کوئی شخص کسی مسئلے کو اپنی انا کا مسئلہ نہ بنائے۔ وہ اپنی ذاتی اغراض کے تحت دوسروں کا حق تلف نہ کرے۔ خود کو بڑا اور دوسروں کو حقیر نہ جانے۔ جب مشاورت کی بات ہو تو سب کی بات کا احترام کیا جائے۔ اخلاقی اعتبار سے بھی یہ امر بالکل قبیح معلوم ہوتا ہے کہ متکبر اور خود پسند شخص اپنے تکبر اور سینہ زوری کی بناء پر کسی حقدار کا حق چھین لے اور شوری کی صفحہ رائے کو جس قدر نظر انداز کر دے۔
- 3- یہ کہ جن معاملات کا تعلق دوسرے کے حقوق سے ہو ان میں فیصلہ کرنا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ خدا ترس انسان یہ جانتا ہے کہ اس کی کس قدر سخت جواب دی ہے۔ اس کو اپنے رب کے سامنے جواب دینا پڑے گا۔ ایک مشترکہ معاملہ جن جن سے بھی تعلق ہو ان سب کو اس کا فیصلہ کرنے میں شریک مشورہ کرے تاکہ زیادہ سے زیادہ صحیح اور بے ناگ اور مٹی پر انصاف فیصلہ کیا جاسکے۔
- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

واھم شوریٰ بہتھم

- یہ قاعدہ طریقہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مندرجہ ذیل پانچ باتوں کا تقاضا کرتا ہے:
- 1- اول یہ کہ اجتماعی معاملات میں جن لوگوں کے حقوق و مفادات سے تعلق رکھتے ہوں انہیں اظہار رائے کی مکمل آزادی ہو اور انہیں حقائق سے باخبر رکھا جائے کہ معاملات دراصل کس طرح چلائے جا رہے ہیں۔

- 2- دوم یہ کہ اجتماعی معاملات چلانے کی ذمہ داری جس شخص (خلیفہ نائب امیر یا امام) پر ذاتی ہو اس کو عوام کی رضامندی سے مقرر کیا جائے اور اس رضامندی کا حصول آزاوانہ رائے دی کے ذریعے ہونا چاہئے۔ اس میں کوئی مکر و فریب جبر یا خوف شامل نہیں ہونا چاہئے۔

- 3- سوئم یہ کہ سربراہ کار (خلیفہ) کو مشورہ دینے کے لئے بھی وہ لوگ مقرر کئے جائیں جن کو قوم کا اعتماد حاصل ہو۔ وہ کسی دباؤ لائی لوبھ میں آنے والے نہ ہوں اور خود اپنے مخصوص مفادات بھی عزیز نہ ہوں بلکہ وہ مشورہ دیتے وقت صرف اور صرف حق کی بات کہیں۔

- 4- چہارم یہ کہ مشیران حضرات اپنی پوری صلاحیت و قابلیت کو مکمل صداقت، سخی ایمان اور روشن ضمیری کے ساتھ بروئے کار لائیں اور مشورہ دیتے وقت کسی قسم کی خیانت یا غداری نہ کریں۔

5- ختم یہ کہ جو مشورہ اہل شوری کے اجتماع سے دیا جائے اور اسے اکثریت کی تائید حاصل ہو اسے تسلیم کر لیا۔ اعتراض برائے اعتراض کے اصول کو نہ اختیار کیا جائے۔

اسلام کے ان اصول ہائے شوری کی اس توضیح سے یہ بنیادی بات سمجھ میں آتی ہے کہ شوری مسلمانوں کے معاملات کو چلانے میں مطلق العنان اور محض رکن نہیں ہے بلکہ لازماً اس دین کے حدود سے محدود ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنی تشریع سے فرمائے ہیں۔ کوئی بھی رکن شوری اس بات پر قادر نہیں ہے کہ جن امور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اکرم ﷺ نے اپنے فیصلے دے دیئے ہوں ان کو پس پشت ڈالتے ہوئے کثرت رائے سے کوئی نئی بات اپنے مفاد کی خاطر منظور کر لیں۔ ارکان شوری شرعی معاملات میں اس امر پر تو مشورہ دے سکتے ہیں کہ کس شخص کا صحیح مفہوم کیا ہے لیکن اس غرض سے کوئی مشورہ نہیں دے سکتے کہ جس معاملہ کا فیصلہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اکرم ﷺ نے کر دیا اس میں وہ خود کو کوئی اپنا فیصلہ کرے۔

شوری کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے امام رازیؒ اپنی ”تفسیر کبیر“ میں یوں ارشاد فرماتے ہیں:

”صحابہ کے بارے میں یوں بیان کیا جاتا ہے کہ جب ان کے وہرہ کوئی معاملہ پیش ہوتا تو وہ جمع ہو جاتے اور مشورہ کے ذریعے اسے طے کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس صفت کو سراہا ہے تعریف کی ہے کہ وہ کسی معاملہ میں انفرادیت نہیں برتتے بلکہ اس کے برعکس جب تک کسی معاملے پر متفق رائے نہیں ہو جاتے اقدام نہیں کرتے۔ اس بات کو قرآن پاک کی اس آیت کی شان نزول قرار دیا گیا کہ **وامرہم شورىٰ بینہم**“

شوری کے قیام کی اہمیت کے لئے بخاری و مسلم میں حدیث نبویؐ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ”قیامت تک میری امت میں ایک طبقہ ضرور رہے گا جو دین کو ہر طرح کی تحریف و تغیر سے محفوظ رکھے گا اور کسی فتنہ پرور کو فتنہ اندازی کا موقع نہ دے گا۔“ یعنی وہ مخصوص طبقہ شوری کے ممبران و اراکین ہوں گے جو دین کو خالص رکھیں گے۔

شوری کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ایسے فیصلے کئے جائیں جن سے قوم کی اصلاح ہو جن سے امت اسلامیہ کی مشکلات دور ہوں۔ ایسے فیصلے ہرگز قابل قبول نہیں ہوں گے اور نہ ہی ان پر کسی صورت میں عمل درآمد ہوگا جو شریعت خداوندی اور احکام نبوی ﷺ کے خلاف ہوں گے۔ حدیث نبویؐ ہے جو امام بخاریؒ نے بیان کی ہے کہ:

”جب حاکم ظلم سے یا اہل علم کے خلاف کوئی فیصلہ کرے تو وہ فیصلہ قابل استرداد ہو

گا۔“

شورائیت کی اہمیت کے متعلق ایک اور حدیث حضرت علیؑ سے مروی ہے۔ ایک مرتبہ میں نے (حضرت علیؑ) حضور اکرم ﷺ سے دریافت کیا کہ اگر میرے سامنے کوئی ایسا معاملہ پیش آ



جائے جس کے بارے میں نہ تو کوئی فیصلہ نازل ہوا ہو اور نہ ہی سنت سے فیصلہ ملے تو ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا چاہئے۔ آپ ﷺ کیا حکم دیتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم اس معاملہ کو دین کی سمجھ بوجھ رکھنے والوں اور خدا ترس مومنوں کی شوریٰ کے حوالے کر دو اور تم اپنی تنہا رائے سے فیصلہ نہ کرو۔“

الفرض جمہوریت کی روح کو قائم رکھنے کے لئے شریعت نے پہلے ہی قدم پر انسان کے اندر باہمی مشورے سے کام لینے کا اشتیاق پیدا کر دیا ہے تاکہ دل کی گہرائیوں اور فکر و خیال کی وسعتوں میں شوراِ بیت کی روح جاری و ساری رہے اور اس کے ہر کام میں اجتماعیت نمایاں نظر آئے اور انفرادیت کے استبداد سے چھٹکارا حاصل رہے۔ اسلام جس اجتماعی زندگی کو پیدا کرنا چاہتا ہے اور اپنے ماننے والوں میں جس قسم کے اتحاد کو رائج دیکھنا چاہتا ہے اس کے لئے ناگزیر تھا کہ وہ شوریٰ پر پورا زور صرف کرتا۔ اس امر سے قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مشاورت سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ محبت و یکاگت کی فضاء پیدا ہوتی ہے۔ شوراِ بیت سے لوگوں کی جھوٹی "اتنا" اور بے جا خودداری کو راستی کی روشنی مل جاتی ہے۔ افراد کے اذہان سے بغض و فساد و بد امنی کے خیالات ختم ہو جاتے ہیں۔

شوریٰ کے لاتعداد فوائد اور اس کے ناقابل تصور نتائج مندرجہ احادیث کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیں:

1- ”مشورہ کرنا شرمندگی سے محفوظ رہنے کا ذریعہ ہے (قلعہ ہے) اور ہلاکت سے بچنے کی ایک چٹا گاہ ہے۔“

2- ”وہ آدمی ناکام نہیں ہوا جس نے استشارہ کیا اور اس شخص کو شرمندگی اٹھانی نہ پڑی جس نے مشورے سے کام لیا۔“

3- استمعینو علی امورکم بالمشارۃ

”اپنے کاموں میں باہمی مشورہ سے مدد حاصل کرو۔“

4- حضرت علیؓ کا ارشاد گرامی ہے:

”باہمی مشورے سے کام کرنا ہی اصل ہدایت ہے۔ وہ شخص خطرات میں گھر گیا جس نے اپنی انفرادی رائے کے ساتھ انفرادیت اختیار کی۔“

## عصر حاضر میں شوریٰ کے انتخاب کی عملی صورت

جیسا کہ لفظ شوریٰ سے ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا ادارہ ہے جو خلیفہ کو وقتاً فوقتاً اپنے مفید مشوروں سے مستفید کرتا ہے اور خلیفہ یا نائب (وائسرائے) کے لئے بھی لازم ہے کہ وہ اس سے ہر اہم معاملہ میں مشورہ کرتا رہے۔ خلیفہ (امام نائب وائسرائے جو بھی نام ہو) شوریٰ کا

پسندیدہ اور مرضی عامہ کا مظہر اتم ہوتا ہے۔ اس لئے اجتماعی طاقت رکھنے والا زیر دست نمائندہ ہوتا ہے۔ اس کا درجہ صدر اور ڈائریکٹر شپ کے ڈائریکٹر کے درمیان ہے۔ خلیفہ نہ تو سو فیصدی شوروی سے فیصلہ حاصل کرنے کا پابند ہے اور نہ ہی شوروی کو سو فیصدی نظر انداز کرنے والا آمر یا امر ہے۔

اسلامی ریاست میں مقتدر اعلیٰ تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے وہی زمین و آسمان کا مالک ہے اور بادشاہ کل ہے اور عبادت کے لئے وہی ہے۔ وہ اکیلا واحد زمین آسمان کا حکمران ہے۔ ساری بادشاہت اسی کی ہے البتہ اس نے انسان (خلیفہ) کو زمین پر اپنا نائب (وائسرائے) بنایا ہے تاکہ وہ اللہ (جو حقیقی مالک و حکمران ہے) کے احکام و شریعت کو بطور نائب نافذ کرے اور حکمرانی کا حق ادا کرے۔ بالفاظ دیگر خلیفہ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کے ملک میں اُس کے تفویض کردہ اختیارات کو اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔ وہ مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک (خدا) کا نائب ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے خفاء کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اُس کا کام مالک کے خفاء کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کردہ اختیارات کو من مانے طریقے سے استعمال کرنے لگے یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کر کے اس کے خفاء کی پیروی اور اُس کے احکام کی تکمیل کرنے لگے تو یہ سب غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے۔ مندرجہ بالا تصور حاکمیت کا فطری اور منطقی تقاضا یہ ہے کہ اطاعت خداوندی اور وقاداری کو مد نظر رکھ کر رسول اکرم ﷺ کی سنت کے مطابق احکام الہی کو جاری کرنا خلیفہ وقت کا کام ہے۔ ریاست میں باقی تمام وقاداریاں اسی بنیادی وقاداری کی تابع ہوں۔

ارشاد رب العالمین ہے:

”اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول اکرم ﷺ کی اور اُن لوگوں کی جو تم سے صاحب امر ہوں (یعنی اولی الامر تم میں سے) پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع و جھگڑا ہو جائے تو اُسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو۔ اگر تم واقعی اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یکی ایک سیدھا طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔“ (سورۃ النساء: 50)

یہ آیت اسلام کے پورے مذہبی تمدنی اور سیاسی نظام کی بنیاد اور اسلامی ریاست کے دستور کی اولین دفعہ ہے۔ اس میں حسب ذیل اصول مشتمل طور پر قائم کر دیے گئے ہیں۔

اسلامی نظام میں اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے۔ ایک مسلمان سب سے پہلے بندہ خدا ہے باقی جو کچھ بھی ہے اس کے بعد ہے۔ مسلمان کی انفرادی زندگی اور مسلمانوں کے اجتماعی نظام

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

دلوں کا مرکز و محور خدا کی قربانمندی اور وفاداری ہے۔ دوسری اطاعتیں اور وفاداریاں صرف اور صرف اس صورت میں قبول کی جائیں گی کہ وہ خدا تعالیٰ کی اطاعت اور وفاداری کے مد مقابل نہ ہوں بلکہ اس کے تحت ہوں اور اس کے تابع ہوں۔ ورنہ ہر وہ حلقہ اطاعت تو ذکر پھینک دیا جائے گا جو اصلی و بنیادی اطاعت کا حریف ہو۔ یہی بات حدیث میں یوں فرمائی گئی ہے:

”خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لئے کوئی اطاعت نہیں۔“ (الدریث)

جیسا کہ تاریخ اسلام کے مطالعہ سے معلوم ہے خلیفہ کا انتخاب شوری (مجلس مشاورت) کرتی تھی اور مجلس شوری کی اہلیت و قابلیت خدا ترستی و کردار اور دین اسلام سے محبت لگاؤ پر کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہ ہوتی تھی لہذا عصر حاضر میں شوری کے اراکین کا انتخاب ہم موجودہ پارلیمنٹ (اسمبلی) سے کر سکتے ہیں کیونکہ ممبران اسمبلی پہلے ہی منتخب ہو کر آئے ہوتے ہیں۔ اس شوری کے اراکین بھی عوامی نمائندے ہی تصور ہوں گے۔ ہمارے موجودہ زمانے کی سینٹ کی حیثیت کچھ نہ کچھ شوری سے ملتی جلتی ہے لہذا کسی حد تک ہم موجودہ سینٹ کو شوری کے متبادل کا درجہ دے سکتے ہیں جو صدر (خلیفہ) کو منظور دینے کی پابند ہوگی۔ وہاؤ ڈال کر اس سے اپنی بات منوانے کا اختیار نہیں ہوگا۔ خلیفہ (صدر) مشورہ لینے کا پابند ہوتا ہے۔ مکمل طور پر عمل کرنے اور معاملہ سے اتفاق کرنے کا پابند نہیں ہے۔ اسلام میں خلیفہ کے اختیارات وسیع ہیں۔ کسی حد تک موجودہ امریکہ کے صدر کے اختیارات سے ملتی جلتے ہیں۔

الغرض اگر موجودہ پارلیمنٹ کو ذریعہ انتخاب نہیں تسلیم کرتے تو عوام سے ڈائریکٹ انتخاب کے ذریعہ شوری کا انتخاب کیا جاسکتا ہے لیکن اس عمل میں ملک کو ذیل انتخابات کا مالی بوجھ برداشت کرنا پڑے گا اور وقت بھی اور امن و امان کا مسئلہ بھی پیش آئے گا۔ بہتر یہی ہے کہ موجودہ پارلیمنٹ (اسمبلی) میں سے ہی شوری کا انتخاب کر لیا جائے۔

## بنیادی انسانی حقوق

اسلام ایک ایسا اسلامی نظام رائج کرتا ہے جو حقوق کے تحفظ کی پوری ضمانت دیتا ہے اور جس میں حقوق و فرائض میں گہرا ربط رہتا ہے۔ اسلامی نظام حیات کے مطابق شہریوں کے تمام افعال احساس ذمہ داری کے تحت سرانجام پاتے ہیں۔ اسلام میں افراد کے حقوق کا تحفظ کرنا حکومت کی اولین ذمہ داری ہے۔ اسلام میں شہریوں کے بعض حقوق تو شرعی قوانین میں موجود ہیں جن کو نافذ کرنا ہر اسلامی ریاست پر فرض ہے۔ علاوہ ازیں کچھ ایسے حقوق بھی اسلامی ریاست میں نافذ کئے جاسکتے ہیں جو موجودہ ریاست نے زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے

مطابق تسلیم کر لئے ہوں۔ حقوق کا تصور دراصل جامد نہیں بلکہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اور تمدن کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ نشوونما پاتا رہتا ہے بشرطیکہ وہ اسلامی نظام عدل کی روح کے منافی نہ ہوں۔

دور حاضر میں صنعتی اور تکنیکی ترقیوں نے معاشی، تعلیمی، ثقافتی اور سماجی شعبہ میں جہاں بے شمار نئے حقوق کو تسلیم کرانا ممکن بنایا، وہاں صنعتی معیشت کے فروغ کے باعث بعض نئے مسائل نے جنم لیا جنہیں حل کرنا حکومت کی ذمہ داری تھی۔ مثلاً جدید صنعتوں اور سڑکوں پر بے پناہ ٹریفک کے باعث فضائی آلودگی کا مسئلہ پیدا ہوا تو شہریوں کی صحت کا تحفظ حکومت پر فرض بن گیا۔

اسی طرح نقل و حرکت کے ذرائع میں تیزی سے ترقیوں کے باعث سفر کو محفوظ رکھنے کے لئے شہریوں کو حادثات سے تحفظ دینے کا حق تسلیم کرنا پڑا۔ ظاہر ہے ایک ہم عصر اسلامی ریاست کو اپنے مسائل کے پیش نظر اس قسم کے بیشتر حقوق کو تسلیم کرنا ہوگا۔ یہ ضروری ہے کہ اسلامی ممالک میں بنیادی حقوق کو دستوری تحفظ دیا جائے تاکہ ان کا تقدس برقرار رہے۔ ہم ذیل میں مختصراً ان بنیادی حقوق کا ذکر کرتے ہیں جن کی اسلامی تعلیمات میں صراحت کر دی گئی ہے۔

### 1- انسانی زندگی کا حق:

اسلامی نظام حیات میں ہر فرد کو اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں سے پورا پورا استفادہ کرنے کی آزادی دی گئی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

”جس نے کسی شخص کا ناحق خون کیا یا زمین میں فساد انگیزی کی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی شخص کو زندہ رکھا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندہ رکھا۔“ (المائدہ: 32)

اسلام نے ذی کے خون کو بھی خون مسلم کے برابر درجہ دیا ہے۔ اسلام تو حالت جنگ میں بھی عورتوں، بچوں، زخمیوں، بیماروں اور بوڑھوں پر دست درازی کی اجازت نہیں دیتا۔ ہاں البتہ ایسے لوگ اگر خود جنگ میں حصہ لے رہے ہوں تو اور حکم ہے نیز اسلام ہر شخص کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرے۔

### 2- شخصی تحفظ کی ضمانت:

امام خطابؓ کا کہنا ہے کہ صرف دو صورتوں میں کسی شخص کو زیر حراست رکھا جاسکتا ہے:

الف: جب باقاعدہ عدالتی فیصلے کے مطابق سزا کے طور پر کسی کو قید کیا جائے۔

ب: تحقیقات کی غرض سے کسی کو حراست میں لیا جاسکتا ہے۔

لہذا اسلامی شریعت کے مطابق قانونی جواز کے بغیر کسی شخص کو قید و بند میں نہیں رکھا جاسکتا اور فرد کی آزادی باضابطہ عدالتی کارروائی کے تحت ہی سلب کی جاسکتی ہے۔ یعنی اس پر الزام لگانا، کھلی عدالت میں اس پر مقدمہ چلانا اور اسے دفاع کا پورا پورا موقع دینا۔

### 3- تحفظ ملکیت:

ہر فرد کو اختیار ہے کہ وہ جائز ذرائع سے اپنی محنت کے بل بوتے پر جتنی چاہے دولت کمائے۔ انفرادی ملکیت کی حفاظت کے لئے اسلام نے بڑے جامع قوانین پیش کئے ہیں تاکہ انسان کی دولت ڈاکہ اور چوری سے محفوظ رہ سکے۔ اسی طرح چند قیود کے ساتھ ہر فرد کو اپنی دولت خرچ کرنے کا بھی اختیار دیا گیا ہے۔

### 4- روزگار کا حق:

مباشرہ کے تمام افراد کو بنیادی ضروریات کی فراہمگی ضمانت دینا ایک اسلامی حکومت کا فرض ہے اس میں مسلم یا غیر مسلم سبھی شامل ہیں۔ اگرچہ مشن قوم کا بھی کوئی فرد اسلامی معاشرے میں آجائے تو اسلامی حکومت کا فرض ہوگا کہ اسے بھوکا نہ رہنے دیا جائے۔ زخمی ہو تو علاج کرایا جائے۔ اسلامی ریاست معذور لوگوں کی خود کفالت کرتی ہے۔

### 5- عورتوں کے حقوق کا تحفظ:

تاریخ انسانی کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا جائے تو یہ بات نکھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ عورت کو پہلی مرتبہ اسلام نے ہی پہنچی سے نکال کر اس کا اصل مقام دلایا۔ اس کی پیدائش کو موجب رحمت قرار دیا۔ بیوی کی حیثیت سے اس کے حقوق متعین کئے اور ماں کی حیثیت سے اس کو بلند مرتبہ عطا کیا۔ اسلام نے اس کی نزاکت اور لطافت کے پیش نظر مرد کو اس کی عزت و آبرو کا محافظ قرار دیا۔ اس کی عصمت و آبرو کو متاع عظیم قرار دیا گیا جس کی حفاظت کے لئے نہایت مؤثر اقدامات اور تدابیر پیش کی گئیں۔

روزی کمانے کی اصل ذمہ داری مرد پر ڈالی گئی لیکن اس کے ساتھ ساتھ عورت کو معاشی حقوق بھی عطا کئے۔

معاشی حقوق کے ساتھ ساتھ اسے خانگی حقوق بھی عطا کئے گئے حتیٰ کہ عورت کو شوہر کے انتخاب کا حق دیا گیا۔ عدم پناہ کی صورت میں خلع کا بھی اختیار دیکھایا۔ مطلقہ اور بیوہ عورت کو نکاح جانی کا حق حاصل ہے۔ اسلامی معاشرہ پر لازم ہے کہ عورتوں کے حصول تعلیم کے لئے سہولیات مہیا کرے۔

## 6- خاندانی زندگی کا حق:

اسلام نے خاندانی زندگی کی بقاء کے لئے مختلف معاملات کو منضبط کیا ہے۔ اس ضمن میں بالغ افراد کی شادی کر دینے کا حکم دیا۔ اس کے علاوہ ہر فرد کا تخلیہ تسلیم کیا گیا ہے۔ ایک شخص کو پورا آئینی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے گھر میں دوسرے کے شور و شغب سے دوسروں کی تا تک ہمانک سے اور دوسروں کی مداخلت سے محفوظ و مامون رہے۔ اس کی گھریلو بے تکلفی اور پردہ داری برقرار رکھنی چاہئے۔

## 7- حصول تعلیم کا حق:

اسلامی ریاست کا یہ فرض ہے کہ معاشرہ میں تعلیم عام کرنے کی طرف بھرپور توجہ دے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے صوبائی عمال کو اسلامی تعلیمات کی درس و تدریس کا فریضہ سونپ رکھا تھا۔ فرمان نبوی ﷺ کے مطابق تعلیم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ جنگ بدو میں جو کفار قید ہوئے تھے ان کی رہائی کے لئے بطور تاوان مسلمان بچوں کو تعلیم دینے کی شرط رکھی گئی تھی۔

## 8- اظہار رائے کی آزادی:

اسلامی ریاست میں ہر شخص حکومت پر تنقید کر سکتا ہے بلکہ نیکی کا حکم اور نہائی سے روکنا تو اسلام میں ایک عظیم فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ خلفاء راشدینؓ کے زمانہ میں ایک آدمی خلیفہ وقت سے کسی معاملے پر باز پرس کر سکتا تھا۔ اسلامی نقطہ نظر سے دین کے معاملے میں بھی جبر کی کوئی گنجائش نہیں۔

## 9- قانون کی بالادستی:

اسلامی ریاست میں قانون کا اطلاق تمام شہریوں پر یکساں ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں کوئی طبقہ مراعات یافتہ نہیں بلکہ قانون تمام شہریوں کو یکساں طور پر تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ چوری کے ضمن میں لائی جانے والی عورت کے متعلق جب ایک صحابیؓ نے حد میں نرمی کی سفارش کی تو آپ ﷺ نے سختی سے انکار کر دیا اور مسادات کے اصول پر ڈٹہ برابر آٹکچ نہ آنے دی اور آئندہ کے لئے عملی طور پر حدود کے نفاذ کا اعلان کیا۔

## 10- ضمیر و مذہب کی آزادی:

اسلام میں مذہب کے معاملے میں جبر کو تسلیم نہیں کیا گیا اور اس اصول کے تحت ہر شخص کو آزادی عطا کی کہ وہ کفر و ایمان میں سے جو راہ چاہے اختیار کرے۔ اسلامی معاشرہ میں تمام مذہبی اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی جاتی ہے اور انہیں ان کے عقیدہ کے مطابق مذہبی رسومات ادا کرنے کی پوری آزادی دی جاتی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے اپنی کسی بھی غیر مسلم رعایا کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کو غیر مذہب کے لوگوں سے رواداری کی تلقین کی گئی ہے۔

### 11- عزت و ناموس کا تحفظ:

اسلام نے تمام مومنوں کو ایک دوسرے سے رواداری سے پیش آنے کی تلقین کی اور کسی پر تہمت لگانے کو سنگین جرم قرار دیا گیا اور اس کے لئے اسی (80) کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی۔ انسان کی عزت و آبرو کی حفاظت کرنا ریاست کا اولین فرض ہے۔ سورہ حجرات میں اس حق کی پوری تفصیل موجود ہے اور اس میں واضح کر دیا گیا ہے کہ کسی کا خدق نہ اڑایا جائے نہ بُرے القاب دیئے جائیں نہ ہی اس کی بُرائی کی جائے۔ اس طرح ہر شخص کا یہ بنیادی حق ہے کہ کوئی اس کی عزت پر ہاتھ نہ ڈالے۔

### 12- سیاسی حقوق:

اسلام ریاست کے سیاسی معاملات میں کسی ایک مخصوص فرد یا گروہ کی اجارہ داری قبول نہیں کرتا بلکہ حکومت کا کاروبار چلانا تمام افراد کی مشترکہ ذمہ داری قرار دیا گیا۔ اسلام نے حکومت کے نظام میں استبدادی رجحانات ختم کرنے کے لئے حکومت پر تمام قسم کے معاملات میں مشورہ کرنے کی پابندی عائد کر رکھی ہے۔

## فلاح عامہ

یہ کہنا ہی غلط ہے کہ اسلام میں بھی فلاح عامہ ہے بلکہ اصل میں یوں کہنا چاہئے کہ اسلام ہی فلاح عامہ ہے۔

انسانوں کے لئے عدل قائم کرنا اور اس بات کا فیصلہ کرنا کہ کیا چیز عدل ہے اور کیا انصاف نہیں انسانوں کے خالق اور رب کا ہی کام ہے۔ انسان اپنا مالک آپ نہیں کہ وہ اپنے لئے معیار عدل خود تجویز کر لینے کا مجاز ہو۔ کائنات میں انسان کی حیثیت مملوک اور رعیت کی ہے اور خدا مالک ہے۔ اس لئے معیار عدل تجویز کرنا مالک کا کام ہے۔ اس کے علاوہ انسان اگر مل کر بھی اپنا دماغ استعمال کر لیں تو انسان کا علم محدود ہے اور عقل کی کوتاہی و نارسائی و بے بسی عقل خواہشات اور تعقبات کی دھند سے کسی حال میں بھی مفر نہیں ہے۔ اس لئے اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ انسان خود اپنے لئے ایسا نظام بنا سکے جو درحقیقت عدل برمی ہو۔ انسانی باتوں کے بنے ہوئے نظام میں چاہے کتنا ہی عدل کیوں نہ نظر آئے بہت جلد عملی تجربہ اس کے ناقص پن کو واضح کر دیتا ہے۔ اجتماعی عدل کا قیام صرف اور صرف اس صورت میں ممکن ہے

سب عدل کا نظام عالم الغیب والشفادہ جنتی نے بنایا ہو۔

(بی) عدل ہی اسلام کا مقصود ہے:

اسلام آیا ہی اس لئے ہے کہ انصاف قائم کرے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

لقد ارسلنا رسلنا بالبینۃ و النزلنا معهم الکتاب و المیزان ليقوم الناس بالقسط (الحجۃ)

”ہم نے اپنے رسولوں کو روشن نشانیاں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان: زن کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔“

اگر فرد بالکل مکمل عدل کا نظام چاہتا ہے تو اسے اس کے سوا اور کچھ نہیں کرنا کہ اسلام پر ہے۔ نا پورا قائم کر دیا جائے۔ عدل اسلام سے الگ کسی چیز کا نام نہیں۔ اسلام خود انصاف ہے۔ اس کا قائم ہو جانا اور عدل کا قائم ہو جانا ایک ہی چیز ہے۔ ان میں کوئی فرق نہیں۔ قرآن و حدیث میں کافی تاکید آئی ہے۔

خارج عامہ کے طریقے:

یہ مندرجہ ذیل ہیں:

1- نظریہ ملکیت:

اسلام کا تصور ملکیت بالکل بے مثال اور منفرد نظریہ ہے۔ اسلام میں شخصی ملکیت کی اجازت ہے لیکن یہ مطلق ملکیت کی بجائے نیابتی ملکیت کا عمدہ نمونہ پیش کرتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا کا نائب ہے اور اس کو عطا کردہ صلاحیتیں اور ذرائع سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ اس لئے اسے چاہئے کہ اللہ کی اس دی ہوئی نعمت کا شکر ادا کرے اور ان ذرائع کو اللہ کی مرضی کے مطابق صرف کرے۔ گویا انسان کی آزادی پر زور دیا گیا ہے لیکن صرف اس حد تک کہ دوسرے اس کی آزادی سے نقصان نہ اٹھائیں گویا آزادی کی حدود ہیں۔

2- اسلام اور گردش دولت:

دین اسلام میں انتقال دولت کا تصور مندرجہ ذیل صورتوں میں ممکن ہے:

وراثت فقط وہ معتبر ہے جو کسی مال کے جائز مالک سے شرعی طور پر پہنچے۔

ہبہ یا عطیہ وہ جائز ہے جو ملک کے جائز مالک نے شرعی حدود کے اندر رہ کر دیا ہو اور حکومتی عطیہ بھی صرف اس صورت میں جائز ہے جو کسی صحیح خدمت کے معاوضے کے طور پر دیا ہو نیز صرف وہی حکومت عطیہ دے سکتی ہے جو شرعی دستور کے مطابق چلائی جا رہی ہو اور عوام میں سے محاسبہ کر سکیں۔



کسب وہ جائز ہے جو حلال طریقہ سے ہو۔ سب ناجائز طریقے یعنی ناپ تول میں کمی بیشی، رشوت، نصیب، قہر، گری، احکام، اکتناؤ، سود، جوا، دھوکے کا سودا، نشر اور اشیاء کا کاروبار ان تمام پر پابندی ہے اور اسلامی ریاست میں دوسرے مسلمانوں کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں سے پوچھ سکیں کہ بھائی یہ جائیداد کہاں سے آئی ہے اور اگر اس کا ناجائز ہونا ثابت ہو جائے تو حکومت اسے ضبط کر سکتی ہے۔

لا تاكلوا اموالکم بینکم بالباطل۔

### 3- حرمت سود:

اسلام نے فلاح عامہ کے حصول کے لئے سود کو منع قرار دیا ہے کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ سود استحصال کا ذریعہ ہے اور استحصال فلاح عامہ کے خلاف ہے اور سود سے تقسیم دولت میں بھی عدم توازن پیدا ہو جاتا ہے اور غریب امیر کا فرق بڑھتا جاتا ہے جو کسی طرح بھی فلاح عامہ کے حق میں مناسب نہیں۔

### 4- صرف کا طریق:

اسلام نے صرف کے بارے میں اعتدال کا اصول دیا ہے۔ اگر فرق بڑھ جائے تو بچت کم ہونے کی صورت میں سرمایہ کاری کم ہوتی ہے اور زیادہ صرف کی صورت میں طلب زیادہ ہو جاتی ہے اس طرح طلب اور رسد کا فرق بڑھ جاتا ہے اور قیمتوں میں اضافہ ہونے سے افراط زر پیدا ہو جاتا ہے اور افراط زر عدل کے خلاف ہے کیونکہ اس سے غرباء اپنی ضروریات کے حصول کے قابل بھی نہیں رہتے۔

اسی طرح بخل سے بھی فلاح عامہ / عدل کو نقصان پہنچتا ہے کیونکہ تفریط زر کا خطرہ ہے اور تفریط زر بھی فلاح عامہ کے خلاف ہے۔ گویا فلاح عامہ کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ اعتدال کا راستہ اختیار کیا جائے۔

حدیث مبارکہ: خیر الامور اوسطہا

### 5- زکوٰۃ (Zakat):

فلاح عامہ کے قیام کے سلسلے میں اسلام کا سنہری اصول زکوٰۃ ہے جس کی مصلحت دنیا کا کوئی اور نظام پیش نہیں کر سکتا اور جس کے فوائد کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ یہ تقسیم دولت میں عدم مساوات کا بہترین حل ہے۔ اسلامی شریعت کے مطابق دولت صرف امراء میں ہی گردش نہیں کرنی چاہئے بلکہ غرباء اور بے صلاحیت لوگوں کا بھی اس پر حق ہے۔ اس لئے جو لوگ کسی محرومی کی وجہ سے معاشی طور پر کمزور ہیں اور اپنی ضروریات کے حصول میں ناکام ہیں، اسلام زکوٰۃ کے

ذریعہ ان کو ضروریات فراہم کرتا ہے۔ اس طرح اُمراء کی دولت کم اور غرباء کی استعداد میں اضافہ ہوتا ہے اور معاشرہ فلاح عامہ کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔

دولت کے ارتکاز کے خاتمے کا ایک اور سنہری اصول اسلام کا نظام وراثت ہے۔ جو کسی کے مرنے کے فوراً بعد اس کی دولت کو مختلف وارثوں میں تقسیم کر کے اس کی کارکردگی (Efficiency) بڑھا دیتا ہے۔

### 6- محنت کار و سرمایہ دار:

دین اسلام اس بات کو پسند کرتا ہے کہ مالک زمین اور حراوغ یا کارخانہ دار اور مزدور کے درمیان خود باہمی رضامندی سے معروف طریقے پر معاملات طے ہوں اور مزدوروں کا استحصال نہ ہو۔ انہیں ان کے کام کے مطابق بروقت اور مناسب معاوضہ مل جائے اور دوسری طرف مزدور محنت سے کام کریں تاکہ سرمایہ دار کا اُن کو کرایہ پر لینے کا مقصد پورا ہو سکے لیکن اگر ان معاملات میں ظلم ہو رہا ہو تو وہاں اسلامی حکومت مداخلت کا پورا پورا حق رکھتی ہے کیونکہ ان تعلقات کے خوشگوار ہونے سے ہی عدل قائم ہوگا کہ دونوں فریقین مطمئن ہوں۔

### 7- مسلم ریاست اور انصاف:

فلاح عامہ کے ضمن میں مسلم ریاست بہت اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ اسلامی تعلیمات کو اپنانے سے معاشرے میں فلاح عامہ کو یقینی بنایا جاسکتا ہے لیکن بعد میں اگر کوئی کمی ہو تو حکومت مداخلت کر کے وہاں فلاح عامہ کا قیام کر سکتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شعبہ صحیح طریقے سے کام نہیں کر رہا ہو یا وہاں اجرت کام کے مقابلے میں کم ہو تو حکومت مداخلت کا سب سے بہتر کردار لگانا اجرت نفع اور محنت کو کنٹرول کرتا ہے کہ ایک توازن قائم رہے اور بگاڑ و فساد سر نہ اٹھائے۔

### 8- قومیانہ کاری:

انصاف کے قیام کے لئے جہاں حکومت ضرورت محسوس کرے وہاں مختلف شعبوں کو قومیانہ (Nationalize) کی بھی اجازت ہے بشرطیکہ اس کا مقصد فلاح عامہ ہو۔ مثلاً اگر کسی منصوبے میں زیادہ سرمایہ کاری کی ضرورت ہو یا کسی شعبے میں اجارہ داری سے عوام کو نقصان ہو رہا ہو تو گورنمنٹ دخل اندازی کر سکتی ہے تاکہ بے اعتدالی کا قلع قمع کیا جاسکے۔ اس سے زیادتی و ظلم دور ہوگا اور سازگار فضاء قائم رہے گی۔

### 9- بیت المال (Baitul-Mal):

اسلام نے فلاح عامہ کے سلسلے میں بیت المال کے قیام کا جڑ بھی لازمی قرار دیا ہے

تاکہ اگر مندرجہ بالا طریقوں کے باوجود کچھ حد تک ظلم (عدل کا الٹ) رہے تو بیت المال سے اس کا خاتمہ کیا جاسکے۔ مثلاً ضرورت مندوں کی امداد پر بیت المال کے بارے میں اسلام کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ یہ اللہ اور اس کے بندوں (مسلمانوں) کا مال ہے اور کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ اس کے تمام امور کا فیصلہ قوم کے آزاد نمائندوں کے مشورے سے ہونا چاہئے اور مال شرعی طور پر لیا اور دیا جانا چاہئے اور مسلمانوں کو اس عیب کا پورا حق ہونا چاہئے۔ بیت المال کے روپے کو خرچ کرنے کے بارے میں اسلامی ریاست کو بھی چند حدود کا پابند کر دیا گیا ہے۔

## عدل

اسلام کا نظام عدل یا سماجی انصاف معاشرہ کے لئے رحمت کا باعث ہے۔ لفظ عدل کے معنی عی برابر کرنا، سیدھا کرنا یا توازن قائم رکھنا ہے۔ عدل کے مقابلے میں لفظ ظلم آتا ہے۔ اس پوری کائنات کا قائم کرنے والا اللہ تعالیٰ کا ایک صفاتی نام بھی عادل ہے اور اسی نے اس دنیا کا نظام عدل و توازن پر قائم رکھا ہے۔

قرآن و احادیث میں کئی جگہ عدل و انصاف کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔

ایک جگہ فرمایا: اعدلوا هو اقرب للتقویٰ ”عدل کرو کہ یہ تقویٰ کے قریب ہے۔“

سورۃ انعام میں ہے: ”تیرے رب کا کلمہ صدق و عدل میں مکمل ہے۔“

عدل کی دو بڑی اقسام ہیں:

1- انفرادی عدل

2- اجتماعی عدل

### 1- انفرادی عدل:

اسلام اعتدال پسند دین ہے اور اس میں کسی بھی معاملے میں افراط و تفریط نہیں بلکہ درمیانی راہ دکھائی گئی ہے۔ معاشرتی طور پر بھی ہم دیکھتے ہیں وہی شکل کامیاب ہے جو اعتدال کی راہ پر گامزن ہے۔ اسلام نے ہمیں کھانے پینے عبادت اور دوسرے تمام معاملات میں توازن قائم رکھنے کی تعلیم دی ہے۔ اگر ایک انسان اپنی انفرادی زندگی میں حقوق اللہ اور حقوق العباد میں اعتدال رکھتا ہے تو اس سے نہ صرف اس کی صحت اور گھریلو زندگی بہتر ہوگی بلکہ اس کے رشتہ داروں اور بھائیوں سے بھی بہتر تعلقات قائم ہوں گے اور وہ کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی یا ناانصافی نہیں کرے گا۔ اگر ہر مسلمان اسی سوچ پر کاربند ہوگا تو اس کا لازمی اثر معاشرہ پر پڑے گا۔ یوں ایک اسلامی و دلائی معاشرہ قائم ہوگا۔

## 2- اجتماعی عدل:

اجتماعی عدل سے مراد پورے معاشرے کے ہر شعبہ زندگی میں بحیثیت مجموعی عدل قائم کرنا ہے۔

معاشرتی عدل کے حوالے سے قرآن نے سورۃ البقرہ میں فرمایا: ”اور تیسوں کے حق میں انصاف قائم کرو۔“

دوسری جگہ فرمایا: ”ناپ تول میں پوری طرح انصاف کرو۔“  
 حتیٰ کہ نکاح کے سلسلہ میں سورۃ النساء میں فرمایا: ”اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ایک سے زائد بیویوں میں انصاف نہیں کر سکو گے تو ایک ہی نکاح کرو۔“  
 اس معاشرتی عدل کے ضمن میں اسلام ہمیں معاشی طور پر بھی عدل کا حکم دیتا ہے فرمایا: ”کھاؤ بیوی لیکن فضول خرچی سے بچو۔“

سورۃ فرقان میں ہے: ”اللہ کے نیک بندے جب خرچ کریں تو نہ فضول خرچی کریں نہ بخل سے کام لیں بلکہ اعتدال کی راہ پر چلیں۔“

ایک جگہ فرمایا: ”فضول خرچ شیطان کے بھائی ہیں۔“  
 معاشی عدل کے حوالے سے نبی اسلام نے ایک دوسرے کی ضرورت پوری کرنے، قرض دینے اور دوسرے کی مدد کرنے کی تلقین کی ہے۔ اس سے جہاں ایک مسلمان کی حاجت پوری ہو گی وہاں دوسرے کو اس نیک کام پر اجر و ثواب بھی ملے گا۔

## عدالتی انصاف:

اس حوالے سے قرآن نے فرمایا:

اعدلوا هو اقرب للتقویٰ

”عدل کرو کہ یہ تقویٰ کے قریب ہے۔“

ججوں اور قاضیوں کو حکم دیا:

”جب لوگوں کے جھگڑے مٹانے لگو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔“

اسی ضمن میں سورۃ بقرہ میں ہے: ”اور دستاویز لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔“

اسی سماجی انصاف کے حوالے سے آپ ﷺ کی حیات مبارکہ کا وہ مشہور واقعہ کہ جب قریش کی ایک معزز عورت نے چوری کی تو اس کی سفارش کرنے والے لوگ آگئے جس پر آپ ﷺ نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ ”اگر فاطمہ بنت محمد ﷺ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔“

اسلام میں عدالتی عدل و انصاف کے حوالے سے کسی قسم کی رو رعایت نہیں ہے حتیٰ کہ

امیر فریب یا رنگ و نسل یا مذہب کا بھی کوئی امتیاز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضور پاک ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے دور میں بعض اوقات مسلمان کے مقابلے میں عیسائی اور یہودی مقدمہ جیت گئے کیونکہ عدل و انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے۔ آج ہمارے معاشرہ میں ظلم و زیادتی میں اضافہ کا بڑا سبب بھی یہی عدالتی انصاف کی عدم دستیابی یا فوری انصاف نہ ملنا ہے۔

عدل کو قرآن پاک نے میزان بھی فرمایا ہے جس کے معنی توازن اور اعتدال ہی کے ہیں جیسا کہ سورۃ الرحمن میں فرمایا: ”اللہ نے آسمانوں کو بلند کرنے کے بعد ان میں توازن قائم کر دیا ہے۔ خبردار اس توازن کو درہم برہم نہ کرنا۔“

وہیے بھی جب ہم نظام کائنات پر غور کرتے ہیں تو یہ الہامی عدل کا ایک منہ بولا ثبوت ہیں کیونکہ ہر ایک شے اپنے وقت اور اپنے مدار میں قائم و دائم ہے۔

### عدل کے ثمرات:

اسلام نے نہ صرف عدل و انصاف کا حکم دیا ہے بلکہ اس کے دینی و دنیاوی فضائل و ثمرات سے بھی ہمیں آگاہ کیا ہے۔ حدیث میں فرمایا:

”قیامت کے دن عادل امراء و ملوک اللہ کے دائیں جانے والے ہوں گے۔“

عدل سے انسان میں تقویٰ پیدا ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ یہ آخرت کی کامیابی کا موجب ہے۔ اس سے انسان امن و امان میں آ جاتا ہے اور بربادی سے بچ جاتا ہے۔ یوں عادل شخص کو بے شمار اسلامی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے دور حکومت کو عدل و انصاف کے حساب سے بہترین گردانا جاتا ہے۔ آپؓ ہی کا فرمانا ہے: ”عدل مظلوم کی جنت اور ظالم کے لئے جہنم ہے۔“

عدل و انصاف کی ان خوبیوں کے باعث یہ نظام دوسرے سرمایہ دارانہ اور مارکسی نظریات سے مختلف ہے کیونکہ وہاں عدل کے اپنے ہی پتالے ہیں جبکہ اسلام میں کسی کو کوئی خاص مقام حاصل نہیں بلکہ عدل کے کنہرے میں بادشاہ و عوام سبھی ایک ہی جگہ کھڑے ہوتے ہیں۔ یوں اسلام کا نظام عدل دوسروں سے مختلف ہے۔

### اسلامی ریاست میں عدلیہ

عدلیہ حکومت کا وہ شعبہ ہے جو عدل و انصاف کے تقاضے پورے کر کے ملک میں امن و امان کی فضاء قائم کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ دنیا کی سب سے پہلی اسلامی ریاست مدینہ میں قائم ہوئی اور حضور نبی کریم ﷺ نے سربراہ مملکت کی حیثیت سے عدالتی

فرائض سرانجام دینے اور یوں اسلامی ریاست کے قیام کے ساتھ ہی عدلیہ کا شعبہ بھی قائم ہو گیا۔ اسلام میں عدل و انصاف کی ضرورت و اہمیت پر بہت زور دیا گیا ہے اور عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے کا فریضہ عدلیہ سرانجام دیتی ہے اس لئے اسلام میں عدلیہ کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ عدلیہ کے بطور محافظ بنیادی حقوق کی وضاحت عدلیہ کے فرائض کی روشنی میں آسانی کے ساتھ کی جاسکتی ہے جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

### 1- عدل کی فراہمی:

لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کر کے فوری عدل فراہم کرنا عدلیہ کا بنیادی مقصد ہے۔ مقدمات مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں یعنی دیوانی اور فوجداری۔ عدلیہ ملکی قوانین کے تحت مقدمات کے فیصلے کر کے انصاف فراہم کرتی ہے اور حق دار کو اس کا حق دلاتی ہے جبکہ مجرم کو کفر کردار تک پہنچاتی ہے۔

### 2- قوانین کی تشریح:

کچھ قوانین غیر واضح اور تشریح طلب ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی عدلیہ کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ اس نوعیت کے قوانین کی وضاحت اور تشریح کرے۔ عدلیہ جرم کے محرکات کا جائزہ لے کر اس بات کا اندازہ لگائے کہ جرم کی نوعیت کیا ہے اور وہ جرم کن حالات میں سرزد ہوا ہے۔

### 3- آئین کی وضاحت اور حفاظت:

آئین کی توضیح اور حفاظت بھی عدلیہ کے فرائض میں شامل ہے۔

### 4- بنیادی حقوق کا تحفظ:

وہ حقوق جو ایک جمہوری ریاست میں شہریوں کو آئینی طور پر حاصل ہوتے ہیں وہ شہریوں کے بنیادی حقوق کہلاتے ہیں۔ عدلیہ شہریوں کے ان بنیادی حقوق کا تحفظ کرتی ہے۔

### 5- وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے تنازعات کا حل:

وفاقی طرز حکومت میں مرکز اور صوبوں کے مابین اختیارات کی تقسیم ہوتی ہے۔ اگر کبھی ان اختیارات پر کوئی تنازعہ ہو جائے تو عدلیہ ایسے تنازعات کا فیصلہ بڑے احسن طریقے سے کرتی ہے۔

### 6- انتظامی فرائض:

عدلیہ بعض اوقات انتظامی فرائض سرانجام دینے میں بھی بہت اہم کردار ادا کرتی ہے

مثلاً عدالتی عملے کی بھرتی، لائسنس جاری کرنا، تاہلغ افراد کی جائیداد کے لئے ولی مقرر کرنا، کورٹ میرج اور دیوالیہ افراد کے اداروں کو کسی کی تحویل میں دینا وغیرہ عدلیہ کے انتظامی فرائض میں شامل ہے۔

### 7- مشاورتی فرائض:

کچھ ریاستوں میں اعلیٰ عدلیہ مشاورتی فرائض بھی سرانجام دیتی ہے۔ اگر مرکزی حکومت کسی مسئلے سے دوچار ہو تو عدلیہ حکومت کو اس مسئلے کے حل کے لئے مشورہ دیتی ہے۔

### 8- عدالتی نظر ثانی:

عدلیہ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لئے نظر ثانی کا اختیار رکھتی ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک مقدمے کا فیصلہ ہو جانے کے بعد کچھ حقائق ایسے سامنے آتے ہیں جو مقدمے پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں عدلیہ کو اپنے ہی کئے ہوئے فیصلے پر نظر ثانی کر کے فیصلہ تبدیل کرنے کے اختیارات ہوتے ہیں۔



# اسلامی ریاست اور جہاد

## جہاد کا لغوی مفہوم:

”جہاد“ کا لفظ ”جد“ سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے کسی مقصد کے حصول کے لئے بھرپور کوشش اور دوڑ دھوپ کرنا۔

## جہاد کا اصطلاحی مفہوم:

ہر اس کوشش اور جنگ و دو کو جہاد کہا جاتا ہے جو دین کی حمایت، اشاعت، تحفظ اور سر بلندی کے لئے کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں، خواہ ان کا تعلق جسم و جان سے ہو یا مال دولت سے یا علم و حکمت سے..... ان سب کو اللہ کے دین کی اشاعت اور سر بلندی کے لئے خرچ کرنے کا نام جہاد ہے گویا کسی بھی کام کے لئے زبان، قلم، ذہانت، مال اور طاقت پر مبنی اپنے پورے وسائل اور صلاحیتیں صرف کر دینے کا نام جہاد ہے۔

یہ لفظ جب اسلامی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے تو ”جہاد فی سبیل اللہ“ کے الفاظ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے گویا اسلام کی حفاظت، مدافعت اور مسلمانوں پر زیادتی اور ظلم کو روکنے کے لئے جو جنگ کی جاتی ہے اسے جہاد کہا جاتا ہے اس کا دوسرا نام قتال فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں لڑنا ہے۔

جہاد اپنے اندر وسیع مفہوم رکھتا ہے اور اس کی وسعت تمام زندگی پر چھائی ہوئی ہے اور اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے اس کے ہر حکم پر عمل کے لئے کوشش کرنا جہاد ہے جبکہ قتال صرف اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑنے کا نام ہے اس لحاظ سے قتال جہاد کی بہت سی اقسام میں سے ایک قسم ہے۔

## جہاد کی اقسام

جہاد کے وسیع مفہوم کو ذہن نشین کرنے کے لئے اس کی اقسام کو سمجھنا ضروری ہے لہذا اس کی اقسام ذکر کی جاتی ہیں:

### 1- نفس کے خلاف جہاد:

جہاد بالنفس سے مراد ہے اپنے جسم و جان کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرامہرداری میں لگا



اور اپنے نفس کی ناجائز خواہشات کا مقابلہ کرنا۔ اسے نفس کے خلاف جہاد کرنے کو اصل جہاد فرمایا ہے چونکہ اپنی خواہشات کا مقابلہ کرنا اور تزکیہ نفس کے لئے کوشش کرنا جنگ سے کم مشکل نہیں ہے۔

## 2- علمی و فکری جہاد:

علم سے جہاد کرنا یہ ہے کہ دین کا علم سیکھے اور سکھائے اور دوسرے لوگوں کو نیکی کا راستہ دکھائے اسے جہاد بالتبلیغ، جہاد بالدعوت یا تقریری جہاد کا نام بھی دیا جاتا ہے اور اپنی تقریر و تحریر اور تبلیغ و دعوت سے دوسرے لوگوں کو فائدہ پہنچانا جہاد بالعلم کہلاتا ہے۔

## 3- مالی جہاد:

مالی جہاد یہ ہے کہ ایک مسلمان اسلام کی ترقی، دین کی اشاعت اور محتاج انسانوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اپنا مال اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے خرچ کرے۔ اگر جنگ کا موقع ہو تو مجاہدین کو اسلحہ فراہم کرنے کے لئے اپنا مال اللہ کی راہ میں قربان کر دے اور عام حالات میں غریب اور مفلس مسلمانوں کی مالی ضروریات کو پورا کرے یا دیگر رفاہی کاموں پر اپنا سرمایہ صرف کرے جیسا کہ فرمان الہی ہے:

انما المومنون الذين آمنوا بالله ورسوله ثم لم يرتدوا وجاهدوا باموالهم و  
انفسهم في سبيل الله (الحجرات: 5)

”مومن وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے شک نہ کیا اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کیا۔“

## 4- برائی کے خلاف قولی و قلمی جہاد:

جہاد کی ایک صورت یہ ہے کہ لوگوں کو تبلیغ کے ذریعے راہ حق دکھائی جائے۔ اسلام ہر مسلمان پر اجتماعی ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے ایمان، اپنے تقویٰ، اپنی اصلاح اور اپنی پاکبازی پر اصرار نہ کرے بلکہ کلہ حق کہنے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھانے نہ کرے۔

(انوار القرآن ص 238)

## کفار سے جہاد کا حکم اور اس کی فرضیت

جہاد کی فرضیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كتب عليكم القتال وهو كره لكم وعسى ان تكرهوا شيئا وهو خير لكم وعسى ان تحبوا شيئا وهو شر لكم والله يعلم وانتم لا تعلمون (البقرہ: 216)

”قتال کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے اور وہ تم کو (طبعاً) ناگوار لگتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ تم کسی بات کو ناگوار سمجھو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور ممکن ہے تم ایک کام کو بھلا سمجھو لیکن وہ تمہارے حق میں بُرا ہو اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔“  
اور ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے یوں حکم دیا:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (البقرہ: 244)

”اور اللہ کے راستے میں لڑو اور جان لو بے شک اللہ تعالیٰ خوب سننے والا اور خوب جانتے والا ہے۔“

ایک مقام پر مشرکین کے متعلق فرمایا:

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَأَحْصُرُوهُمْ وَقَعِدُوا لَهُمْ كِلَ مَوْعِدٍ (التوبہ: 5)

”ان مشرکوں کو جہاں پاؤ مارو، پکڑو اور گھیرو اور ہر جگہ ان کی ناک میں بیٹھو۔“  
ایک جگہ پر اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ . (التوبہ: 39)

”لڑو ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور نہ آخرت کے دن پر اور حرام نہیں سمجھتے ان چیزوں کو جن کو اللہ نے اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اور سچے دین اسلام کو قبول نہیں کرتے اہل کتاب میں سے یہاں تک کہ وہ ذلیل (ماتحت) ہو کر اپنے ہاتھوں سے جزیہ دینا منظور نہ کر لیں۔“

ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبُ الرِّقَابِ (محمد: 4)

”پس جب تمہارا کافروں سے مقابلہ ہو تو ان کی گردنیں مارو۔“

حضرت سلمہ بن نفیل بیان کرتے ہیں کہ میں حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک شخص آنحضرت کے پاس آیا اور کہنے لگا یا رسول اللہ! گھوڑے چھوڑ دیئے گئے ہیں اور اسلحہ رکھ دیا گیا ہے اور کچھ لوگوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ اب لڑائی (جہاد) ختم ہو چکی ہے (یہ سن کر) حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

کہ یہ لوگ (جو جہاد ختم ہونے کا گمان کر رہے ہیں) جھوٹے ہیں جہاد تو ابھی شروع ہوا ہے اور میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ اللہ کے راستے میں جہاد کرتی رہے گی اور اس کی مخالفت کرنے والے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خاطر کچھ لوگوں کے دل

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

لڑے کرے گا تاکہ ان کے ذریعے ان (مجاہدین) کو روزی دے (یعنی اُمت کے یہ مجاہد لوگ کافروں سے لڑیں گے تو ان کے مال ان کے ہاتھ آئیں گے) یہ (مجاہدین) قیامت تک جہاد کرتے رہیں گے اور گھوڑوں کی پیشانی (جنگلی اسلحہ) میں ہمیشہ کیلے خیر رکھ دی گئی ہے۔ قیامت کے دن تک (اور) جہاد بند نہیں ہوگا یہاں تک کہ یا جوج و ماجوج نکل آئیں۔“ (سنن نسائی)

حضرت عائشہؓ ارشاد فرماتی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ سے ہجرت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”خروج مکہ کے بعد ہجرت ہائی نہیں رہی البتہ جہاد اور بہت باقی ہے اور جب تمہیں (امیر کی طرف سے) نکلے کا حکم دیا جائے تو تم (جہاد میں) نکل پڑو۔“ (صحیح مسلم)

جہاد سے پہلو تہی کرنے یا جہاد چھوڑنے پر سخت وعید:

”اے پہلو تہی کرنے یا جہاد چھوڑنے پر سخت وعید سناتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَلَا اَنْ كَانْ اَبَاءُكُمْ وَاِبناءُكُمْ وَاُخْوانُكُمْ وَاَزْواجُكُمْ وَاَشْبارُكُمْ وَاَمْوالُكُمْ  
اَقْرَبَتْكُمْ وَاَتَجَارَةُ تَخْشَوْنَ كَسَادَها وَاَسَاكِنُ تَرْضَوْنَها اَحَدُكُمْ مِنْ اَللّٰهِ وَاَرْسَلْنا فِيْ سَبِيلِنا فِتْرَباْصَوا حَتّٰى يَأْتِىَ اَللّٰهُ بِاَمْرٍ وَاَللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ  
(التوبة: 24)

”آپ فرما دیجئے اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور بھائی تمہاری بیویاں اور تمہارا خاندان اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے بند ہو جانے کا تمہیں ڈر ہے اور وہ گھر جس کو تم پسند کرتے ہو تمہیں اللہ نے اور اس کے رسول سے اور اس کے راستے میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہیں تو تم انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم (عذاب و سزا) بھیج دیں اور اللہ تعالیٰ نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیتے۔“

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَالَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ اتَّقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اتَّقُوا إِلَى الْأَرْضِ  
أَرْضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ  
تَنْفَرُوا يَعْذِبُكُمْ عَذَابُ الْيَمِّا وَاَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا وَاللّٰهُ عَلَى كُلِّ  
شَيْءٍ قَدِيرٌ . (التوبة: 38-39)

”اے ایمان والو! تم لوگوں کو کیا ہوا؟ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے راستے میں (جہاد کے لئے) کوچ کرو تو تم زمین پر گرے جاتے ہو کیا تم آخرت کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر راضی ہو چکے ہو (حالانکہ) دنیا کی زندگی کا نفع اٹھانا تو آخرت کے مقابلے میں (کچھ بھی نہیں) بہت تھوڑا ہے اگر تم (جہاد میں) نہیں نکلو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں سخت سزا دے گا اور تمہارے

بدلے دوسری قوم کو پیدا کر دے گا (اور ان سے اپنا کام لے گا) اور تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔“

اللہ تعالیٰ غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ جانے والے منافقوں کا تذکرہ فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

لرح المخلفون بمقعدهم خلف رسول الله و كرهوا ان يجاهدوا باموالهم و انفسهم في سبيل الله و قالوا لا تنفروا في الحر قل نار جهنم اشد حرا لو كانوا يفقهون فليضحكوا قليلا و ليبكوا كثيرا جزاء بما كانوا يكسبون فان رجعتك الله الي طائفة منهم فاستأذنوك للخروج فقل لن تخرجوا معي ابدا و لن تقاتلوا معي عدوا انكم رضيتم بالعود اول مرة فاقعدوا مع الخالفين ولا تصل علي احد منهم مات ابدا ولا تقم علي قبره انهم كفروا بالله و رسوله و ماتوا و هم فاسقون (التوبة: 81-84)

”یہ پیچھے رہ جانے والے (منافق) خوش ہو گئے رسول اللہ ﷺ کے (تشریف لے جانے کے) بعد اور انہیں اللہ کے راستے میں اپنے مال و جان سے جہاد کرنا ناگوار ہوا اور (وہ دوسروں کو بھی) کہنے لگے کہ تم گرمی میں نہ نکلو آپ فرما دیجئے کہ جہنم کی آگ زیادہ گرم ہے اگر ان کو سمجھ ہوتی پس وہ ہنس لیں تھوڑا (یعنی چند روز) اور روکیں بہت (یعنی آخرت میں) اپنے اعمال کے بدلے میں تو اگر اللہ تعالیٰ آپ کو (اس سفر سے واپسی پر) ان کے کسی گروہ کی طرف واپس لائیں پھر یہ لوگ آپ سے جہاد میں نکلنے کی اجازت مانگیں تو آپ فرما دیجئے تم ہرگز میرے ساتھ نہیں نکلو گے اور نہ میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے لڑو گے تم نے پہلی بار بیٹھ رہنے کو پسند کیا تھا بس تم لوگ پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھ رہو اور ان میں سے کوئی نہ مر جائے تو کبھی بھی آپ ان کی نماز جنازہ نہ پڑھئے اور نہ ان کی قبر پر کھڑے ہوں کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا ہے اور حالت کفر پر ہی مرے ہیں۔“

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”جب تم خرید و فروخت میں مشغول ہو جاؤ گے اور گائے کی دم پکڑ لو گے اور کھیتی باڑی سے دل لگا لو گے اور جہاد کو چھوڑ دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت کو مسلط فرما دے گا اور اس وقت تک تم سے اس ذلت کو نہیں ہٹائے گا جب تک تم اپنے دین کی طرف نہیں لوٹ آؤ گے۔“ (ابوداؤد)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”جو شخص اس حال میں مر گیا کہ نہ تو اس نے جہاد کیا اور نہ اس کے دل میں جہاد کا شوق ابھرا تو وہ نفاق کے ایک حصے پر مارا۔“ (صحیح مسلم)

حضرت ابوہامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

”جس شخص نے (خود بھی) جہاد نہ کیا اور نہ کسی مجاہد کو سامان فراہم کیا اور نہ کسی مجاہد کے پیچھے اس کے گھروالوں کی بھلائی کے ساتھ دیکھ بھال کی تو اللہ تعالیٰ قیامت سے پہلے اسے کسی مصیبت میں مبتلا فرمادے گا۔“ (ابوداؤد ابن ماجہ)

## اہل قتال کے حقوق

اہل قتال جن پر تلوار اٹھانا جائز ہے ان پر بھی دست درازی کا غیر محدود حق حاصل نہیں ہے بلکہ اس کے لئے کچھ حدود اور پابندیاں ہیں۔ اب ہم ذیل میں ان حدود کا ذکر کرتے ہیں:

### 1- غفلت میں حملہ کرنے سے احتراز:

اہل عرب راتوں کو خصوصاً آخر شب میں جبکہ لوگ بے خبر سوئے ہوتے تھے اچانک حملہ کر دیتے تھے۔ رسول اکرم ﷺ نے اس عادت کو بند کر دیا اور یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ صبح ہونے سے پہلے کسی دشمن پر حملہ نہ کیا جائے۔

### 2- آگ میں جلائے کی ممانعت:

عرب اور غیر عرب شدت انتقام میں دشمن کو زندہ جلا دیا کرتے تھے۔ رسول اکرم ﷺ نے اس وحشیانہ حرکت کو بھی ممنوع قرار دے دیا۔

### 3- قتل صبر کی ممانعت:

عرب وغیر عرب میں یہ بھی قبیح حرکت پائی جاتی تھی کہ وہ مد مقابل پر فتح پانے کے بعد جوش انتقام کو فرو کرنے کے لئے دشمن کو باندھ کر قتل کرنے اور تکلیفیں دے دے کر مارنے کی بھی ممانعت فرمائی۔

### 4- لوٹ مار کی ممانعت:

جنگ خیر میں صلح ہو جانے کے بعد جب اسلامی فوج کے بعض نئے جوان کچھ بے قابو ہو گئے اور انہوں نے غارت گری شروع کر دی۔ یہودیوں کے سردار نے جب آ کر یہ شکایت کی تو آپ نے لوگوں کو جمع کر کے یہ فرمایا کہ

”اللہ نے تمہارے لئے یہ جائز نہیں کیا کہ اہل کتاب کے گھروں میں بلا اجازت گھس جاؤ۔ ان کی عورتوں کو مارو پیڑو اور ان کے پھل کھا جاؤ۔ حالانکہ ان پر جو کچھ واجب تھا وہ تمہیں دے چکے۔“

### 5- تباہ کاریوں کی ممانعت:

انواج کی پیش قدمی کے وقت فصلوں کو خراب کرنا، کھیتوں کو اجاڑنا، بستیوں میں قتل عام

اور آتش زنی کرنا یہ معمول کی کارروائیاں تھیں مگر اسلام ان کو فساد سے تعبیر کرتا ہے اس لئے اسلام نے ایسی حرکتوں سے سختی سے منع کیا ہے۔

### 6- جنگی قیدیوں کے قتل کی ممانعت:

اسلام نے اس کی بھی اصلاح کی فتح تکہ کے موقع پر آنحضرت ﷺ جب شہر میں فاتح بن کر داخل ہوئے گئے تو فوج میں اعلان کر دیا تھا کہ  
 ”کسی دشمنی پر حملہ نہ کیا جائے کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جائے کسی قیدی کو قتل نہ کیا جائے اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے وہ آمان میں ہے۔“

### 7- مشلہ کی ممانعت:

دشمن کی لاشوں کی تذلیل کرنا اور ان کے اعضاء کو کاٹنے سے بھی اسلام نے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ فوجوں کو بھیجتے وقت تین باتیں خصوصاً فرماتے تھے:

- i- بدعہدی نہ کرنا
- ii- مال غنیمت میں خیانت نہ کرنا
- iii- مشلہ نہ کرنا

### 8- سفیروں کے قتل کی ممانعت:

سفیروں اور قاصدوں کے قتل کو بھی رسول اکرم ﷺ نے ممنوع قرار دیا ہے۔ مسلمہ کذاب کا سفیر عبادہ بن حارث جب اس کا گستاخانہ پیغام لے کر حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

”اگر قاصدوں کا قتل ممنوع نہ ہوتا تو میں تجھے قتل کر دیتا۔“

### 9- بدعہدی کی ممانعت:

دھوکہ دہی معاہدہ توڑنے اور عبادت گزاروں پر دست درازی کی ممانعت میں بے شمار احادیث مروی ہیں۔ اسلام نے بدعہدی کو بدترین گناہ قرار دیا ہے اور اسے منافقانہ خصلت شمار کیا ہے۔

### 10- بدظہمی اور انتشار کی ممانعت:

اصل عرب کی عادت تھی کہ جب جنگ کو نکلنے تو راستہ میں جو ملتا اسے تنگ کرتے اور جب کسی جگہ اترتے تو ساری منزل پر پھیل جاتے تھے۔ یہاں تک کہ راستوں پر چلنا مشکل ہو جاتا تھا۔ جنگی اصلاحات کرنے والے داعی اسلام نے اس کی بھی ممانعت کر دی۔ ایک مرتبہ جب آپ ﷺ کو دوران سفر جہاد اس قسم کی شکایت ملی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

”جو کوئی منزل، مذبح، قبر، گھر یا رہائش گاہ کو لٹا دے، اس کا جہاد نہیں ہوگا۔“

## 11- شور شرابہ اور ہنگامہ کرنے کی ممانعت:

عربوں کی جنگ میں اس قدر شور اور ہنگامہ برپا ہوتا تھا کہ اس کا نام ہی ”دغی“ (شور شرابہ) پڑ گیا تھا۔ اسلام لانے کے بعد بھی عربوں نے یہی طریقہ اپناتا چاہا مگر رسول اکرم ﷺ نے اسے سختی سے منع کر دیا۔

## وحشیانہ افعال کے خلاف عمومی ہدایات:

فوج کی روانگی کے وقت اسلام میں جو عمومی ہدایات منقول ہیں وہ یہ ہیں:

- 1- عورتیں بچے اور بوڑھے قتل نہ کئے جائیں۔
- 2- مسئلہ نہ کیا جائے۔
- 3- راہبوں اور عابدوں کو ستایا نہ جائے اور نہ ان کی عبادت گاہیں مسمار کی جائیں۔
- 4- کوئی پھل دار درخت نہ کاٹا جائے اور نہ کھیتیاں جلائی جائیں۔
- 5- آبادیاں ویران نہ کی جائیں۔
- 6- جانوروں کو ہلاک نہ کیا جائے۔
- 7- ہر حال میں بدعہدی سے احتراز کیا جائے۔
- 8- جو لوگ اطاعت اختیار کر لیں ان کے مال و جان کی حفاظت مسلمانوں کی طرح کی جائے۔
- 9- اموال غنیمت میں خیانت نہ کی جائے۔
- 10- جنگ میں پیچھے نہ پھیری جائے۔

## اشاء قتال ممنوعہ اور غیر ممنوعہ امور

### اشاء قتال ممنوعہ امور کی فہرست:

- 1- مقابلہ نہ کرنے والے قتل نہ کئے جائیں۔
- 2- دشمن کو تکلیف دہ طریقہ سے قتل نہ کیا جائے۔
- 3- غیر فوجی لوگوں کو قتل نہ کیا جائے۔
- 4- دشمن کے چوپایوں کو ہلاک نہ کیا جائے۔
- 5- فصلوں وغیرہ کو تباہ نہ کیا جائے۔
- 6- جنگی قیدیوں کو قتل نہ کیا جائے۔

- 7- دھوکہ دہی اور فراڈ بازی سے کام نہ لیا جائے۔
- 8- دوران جنگ عورتوں کی بے حرشتی نہ کی جائے اور گرفتار ہو کر آنے والی عورتوں سے زنا نہ کیا جائے۔
- 9- شکست خوردہ دشمن کا سرکاٹ کر اعلیٰ حکام کو بھیجنا ممنوع ہے۔
- 10- کسان، تاجر، دوکاندار اور ٹھیکیدار وغیرہ اگر جنگ میں حصہ نہ لیں تو انہیں کچھ نہ کہا جائے۔
- 11- جنگ کے دوران غیر مسلموں کو صفوں میں آگے رکھنا اور پیچھے رہنا ممنوع ہے۔
- 12- بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل نہ کیا جائے۔
- 13- ملٹی عملہ اور سفیروں کو قتل کرنا ممنوع ہے۔
- 14- ضرورت سے زائد جانوروں کو ذبح کرنا ممنوع ہے۔

### اثنائے جنگ غیر ممنوعہ امور کی فہرست:

- دوران جنگ مندرجہ ذیل امور کو جائز قرار دیا گیا ہے:
- 1- دوران جنگ پروپیگنڈا کرنے کی اجازت ہے تاکہ دشمنوں کی صفوں میں افتراق پیدا ہو سکے۔
- 2- دشمن کا محاصرہ کرنے یا اس کی گھات میں بیٹھنے کی اجازت ہے۔
- 3- دشمن کے کمزور فریب کی طرف رجوع کرنے کی اجازت ہے۔
- 4- دشمن پر شب خون مارنے کی اجازت ہے۔
- 5- دشمن کو قتل کرنے کی اجازت ہے۔
- 6- دشمن کی چانسپاد پر قبضہ کیا جاسکتا ہے لیکن اسے چاہ ویر باد کرنا منع ہے۔
- 7- دشمن کے پانی کی سپلائی بند کی جاسکتی ہے یا پینے کے پانی کو ناکارہ بنایا جاسکتا ہے۔
- 8- دشمن کے ملک سے خوراک اور چارہ حاصل کرنے کی اجازت ہے۔
- 9- مفتوحہ ملک کے لوگ اگر جارحیت کا مظاہرہ کریں تو ان کو انفرادی یا اجتماعی سزا دی جاسکتی ہے۔

## جنگی قیدیوں کی اقسام

دوران جنگ قید ہونے والوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

- 1- مسلمان قیدی
- 2- دشمن کے (غیر مسلم) قیدی



مسلمان قیدیوں سے مراد وہ قیدی ہیں جو لڑائی میں دشمن کی قید میں گرفتار ہو جائیں اسلامی ریاست پر فرض ہے۔ وہ اپنے قیدیوں کو دشمن کی قید سے رہا کروانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرے اور اگر اس مقصد کے لئے خزانہ سے کچھ رقم بطور معاوضہ ادا کرنی پڑے تو ادا کر دی جائے۔

ایک مسلمان قیدی کو اپنی عزت بحال رکھنے کے لئے ہر حربہ اختیار کرنے کی اجازت ہے۔ وہ دشمن کی قید سے بھاگ سکتا ہو تو بھاگ جائے۔ اگر مسلمان قیدی دشمن کو کوئی نقصان بھی پہنچا دے تو اسلام کی طرف سے کوئی مواخذہ نہیں۔

### دشمن کے قیدیوں سے سلوک:

اسلام میں دشمن کے قیدیوں سے مندرجہ ذیل قسم کا سلوک کیا جائے گا:

- 1- کسی قیدی کو قیدی کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا۔
- 2- قیدیوں کو اچھی خوراک کھلائی جائے گی اور انہیں رہائش بھی فراہم کی جائے گی۔ ان سے خوراک اور رہائش کی قیمت وصول نہیں کی جاسکتی۔
- 3- قیدیوں کے آرام و آسائش کا خیال رکھا جائے گا اور انہیں گرمی اور سردی سے تحفظ فراہم کیا جائے گا۔
- 4- قید کے دوران ایک ماں کو اس کے بچے سے علیحدہ نہیں کیا جائے گا۔
- 5- دوران قید عورتوں کی عصمت کی حفاظت کی جائے گی۔
- 6- اگر امیر یا امام چاہے تو قیدیوں سے فدیہ لے کر آزاد کر سکتا ہے۔
- 7- اگر دشمن کا کوئی قیدی صدق دل سے اسلام قبول کر لے تو اسے آزاد کیا جاسکتا ہے۔
- 8- کسی قیدی کو غلام بنالینے کا حکم قرآن کریم میں نہیں دیا گیا۔



# جدید سیاسی افکار اور اسلامی سیاسی فکر کا تقابلی مطالعہ

ہر دور کے کچھ مخصوص نعرے ہوتے ہیں جو رفتہ رفتہ ہر شخص کی زبان پر رواں ہو جاتے ہیں۔ ہر کس و نا کس بغیر کچھ سوچے سمجھے ان کو رٹنے اور دہرانے لگتا ہے۔ ان نعروں کا رواج عام عقل و فہم کی موت کے مترادف ہے۔ جب یہ ذہنوں پر چھا جاتے ہیں تو آزادی فکر باقی نہیں رہتی۔ عامی اور عالم اُن پڑھ اور پڑھے لکھے سب ان ہی کا سہارا لینے لگتے ہیں اور سمجھ بوجھ کی صلاحیتوں کو یہ آکاش نکل نیم مردہ کر دیتی ہے۔

پروفیسر خورشید احمد اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ”اسلامی نظریہ حیات“ میں لکھتے ہیں: ”ہمارے دور میں بھی کچھ ایسے نعرے ہیں جو رواج عام اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں نعرہ ہے ’بازمانہ ساز‘ اس سلسلہ میں آئے دن یہ بات بڑے زور شور سے دہرائی جا رہی ہے کہ زمانہ بدل چکا ہے مذہب کو زمانے کی تبدیلیوں کا ساتھ دیتے ہوئے نئے حالات کے مطابق بدلنا چاہئے۔ اگر مذہب کو دور حاضر اور اس کے نظریات سے ہم آہنگ نہ کیا گیا تو اس کے خلاف بغاوت ہو جائے گی اور اسے زندگی سے بے دخل ہونا پڑے گا۔ جمود کا نتیجہ موت ہے ہمیں زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ بدلنا ہو گا ورنہ موت کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ آج جسے دیکھو وہ کسی نہ کسی عنوان سے یہی درس دیتا نظر آتا ہے لیکن اس نعرے پر ایمان بالغیب لانے کی بجائے اس کے تمام پہلوؤں پر عقل و تجربے کی روشنی میں غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے اور محض اس لئے کسی بات کو قبول کرنے کی غلطی نہ کی جائے کہ اس کا اظہار بہ نکرار ہو رہا ہے۔“

## جمود اور تغیر:

اس امر میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ زمانہ ہمیشہ رنگ بدل رہا ہے بہت کچھ بدل چکا ہے اور مزید بدلے گا یہ بھی ایک حقیقت ہے لیکن یہاں چند ایک سوال ابھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں:

- 1- کیا ہر تبدیلی صحت مند ہے؟
- 2- کیا ہر تعمیر باعث خیر ہے؟
- 3- کیا تاریخ عالم کا ہر قدم عروج کی طرف اٹھتا ہے؟
- 4- کیا ہر حرکت بلندی ہی کی سمت جاتی ہے؟

### حرکت مقصودہ:

جب آپ تاریخ کی روشنی میں ان سوالات پر غور کریں گے تو لازماً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان کا جواب نفی میں ہے۔ ہر حرکت ترقی کے مترادف نہیں ایک قسم کی حرکت اگر آپ کو ثریا کی بلند ہوں تک لے جاسکتی ہے تو ایک دوسری قسم کی حرکت تحت المرئی کی پستیوں تک لے آتی ہے۔ مطلوب و مقصود صرف حرکت نہیں بلکہ صحیح سمت میں حرکت ہے۔

### ترقی کی اصطلاح:

ترقی ایک اضافی اصطلاح ہے۔ ترقی اور تنزل کا فیصلہ منزل کے لحاظ سے ہی ہو سکتا ہے۔ ہم صرف اسی حرکت کو ترقی کہہ سکتے ہیں جو صحیح راہیت سے ہمیں اپنی منزل کی طرف لے جا رہی ہو جو حرکت منزل کے برعکس سمت میں لے جائے وہ ترقی نہیں تنزل ہے۔

### حرکت سے پہلے سمت حرکت کا تعین:

حرکت سے پہلے سمت حرکت اور منزل مقصود کا تعین ہونا چاہئے ورنہ محض جمود کو توڑنے کے شوق میں کوئی حرکت کر کے آپ اپنی منزل سے اور بھی دور ہٹ سکتے ہیں۔ تہذیبی اور تہذیبی زندگی میں اصل معیار وہ مقصد ہوتا ہے جو آپ حاصل کرنا چاہیں اگر آپ کا مقصد اور آپ کی منزل اسلام ہے تو پھر وہ حرکت جو اس کی مخالف سمت میں لے جائے خواہ وہ کتنی ہی سبک رفتار کیوں نہ ہو ترقی منکوس ہوگی بلکہ یہ حرکت جتنی تیز ہوگی تنزل اتنا ہی تیز رفتار ہوگا۔

### نقائی جمود کی ایک متبادل تصویر:

اسی طرح اندھی تقلید اور کوراندہ نقالی صرف ماضی کی ہی نہیں ہوتی حالی کے مروجہ نظریوں اور ضابطوں کی بھی ہو سکتی ہے بلکہ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو نقالی دراصل جمود ہی کی ایک متبادل تصویر ہے اگرچہ یہ بڑی پُر فریب ہوتی ہے اور عقل و فکر کو دونوں ہی صورتوں میں مضطرب کر دیا جاتا ہے۔ جمود میں آپ ماضی کی پرستش کرتے ہیں اور لیکر کے فقیر جتے رہتے ہیں تو نقالی میں آپ ماضی کی بجائے کسی نئے سورج کی پرستش شروع کر دیتے ہیں آپ کی اپنی خودی کے لئے جمود اور نقالی دونوں ہی تباہ کن ہیں۔

## تقلید کے نقصانات:

جو لوگ زمانے کی چال کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں وہ درحقیقت بھول جاتے ہیں کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر دوسروں کی تقلید ہی کی دعوت دے رہے ہیں۔ یہ ذہن نشین ہونا چاہئے کہ تقلید اگر ”جدید“ کی کی جائے تو وہ کوئی قائل فخر چیز نہیں بن جاتی بلکہ اس کے نقصانات اپنی حالت پر قائم رہتے ہیں اور جن کی بناء پر قوم کی اپنی عقلی صلاحیتیں کبھی اُبھرے نہیں پائیں اس کی وجہ سے انسان کی روح میں جمود اور احساس کمتری پھست ہو جاتا ہے۔ پوری قوم زمانے کو بدلنے کے بجائے بس خود اپنے ہی آپ کو بدلنے میں لگی رہتی ہے اور اسے بھی دوسروں کی ”شاگردی“ کے مقام سے آگے بڑھنا نصیب نہیں ہوتا۔

## تہذیب کا ایک خاصہ عروج و زوال:

زمانے کی تبدیلی کا ڈھنڈا اپنے والے اس امر کو قطعاً ملحوظ نہیں رکھتے کہ زمانہ تو باہمی بدلنے کے لئے ہے۔ اگر آج وہ ایک خاص سمت میں تبدیل ہوتا ہے تو کل کسی دوسری سمت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والے ہمیشہ اپنے ہی دور کی غالب تہذیب کو ترقی کا کمال سمجھتے رہے ہیں لیکن چشمِ تاریخ نے بارہا اس امر کا مشاہدہ کیا ہے کہ بڑی سے بڑی طاقتور تہذیب بھی ایک نہ ایک دن زوال کی نذر ہو جاتی ہے۔

یونانی تہذیب کے غلبے کے زمانے میں یونانیت زدہ لوگ اسی کو تہذیب انسانی کا حرفِ آخر سمجھتے تھے اور اس سے انحراف و اختلاف کو دیوانگی پریشان خیالی اور کفر خیال کرتے تھے لیکن ایک دن اس تہذیب کی اہل سنت سے اینٹ بج گئی اور اب اس کی حیثیت آثارِ قدیمہ کی ہی ہے۔ روم کے دورِ عروج میں بھی مقامِ درجہ رومی تہذیب کو حاصل ہوا لیکن بالآخر اس تہذیب کے بھی پرچے اڑ گئے اور آج اس کے آثارِ سطحِ زمین پر نہیں زیرِ زمین ڈھونڈے جا رہے ہیں۔

ایرانی تہذیب کی قسمت بھی اس سے مختلف نہ ہوئی اور بھی کچھ دن 36 تہذیبوں کے ساتھ ہوا جو اپنے اپنے زمانے میں غالب اور ناقابلِ تغیر سمجھی جاتی تھیں۔ اگر ماضی کی تمام غالب تہذیبیں قابلِ تغیر ثابت ہوئیں اور ایک دن کامیاب وہی لوگ ہوئے جو ان کی نقالی نہیں کرتے تھے ان کی جگہ ایک دوسرا نظام پیش کرتے تھے تو مستقبل کے متعلق یہ کیوں تصور کر لیا جائے کہ جدید مغربی تہذیب کو سخر نہیں کیا جاسکتا؟

## کمتر ذہنیت کی کمتر سوچ:

محض یہ چیزیں کہ جا ایک خاص تہذیب کو غلبہ حاصل ہے اس بات کا ثبوت نہیں ہے

کہ یہی تہذیب مبنی برحق بھی ہے اور نہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اسی کو ہمیشہ قائم رہنا ہے اور پھر نوع انسانی کے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنے آپ کو اسی کے مطابق ڈھال لے۔ طاقت اور غلبہ حق کے معیارات کو تبدیل نہیں کر دیتا اور اقتدار کسی چیز کو محاسن کا پیکر نہیں بنا دیتا اور نہ ہر رائج شدہ چیز ناقابلِ تغیر اور ناقابلِ تسخیر ہوتی ہے۔

یہ کمزوروں کی سنت ہے کہ وہ طاقت کی پوجا کرتے ہیں اور ہر چہتے سورج کے آگے جھک جاتے ہیں۔ یہ کم نظروں کا طریقہ ہے کہ وہ شخص اس بناء پر کسی مسلک کو اختیار کر لیتے ہیں کہ اسے اقتدار اور غلبہ حاصل ہے اور یہ نہیں دیکھتے کہ وہ کہاں تک صحیح ہے اور کہاں تک غلط ہے حالانکہ دیکھنے کی اصل چیز غلبہ اور طاقت نہیں بلکہ کسی چیز کا حق یا باطل ہونا ہے۔ اگر زمانہ بدل رہا ہے تو اس کو مزید بھی بدلا جاسکتا ہے لیکن محض زمین و آسمان کی گردش اور ماہ و سال کی آمد و رفت کی وجہ سے زندگی کے اصول حق و باطل کے معیار اور خیر و شر کے تعینات نہیں بدلے جاسکتے۔

### مسلل ارتقاء کا نظریہ یا ناگزیر ترقی کا اصول:

جن عوامل نے جدید ذہن کی تعبیر کی ہے ان میں وہ فکر و فلسفہ بھی شامل ہے جو ہر نئی چیز کو خوب تر قابلِ احترام اور لائق اختیار سمجھتا ہے مغرب کے ذہن کو "ہیومنزم" (Humanism) کے فلسفہ نے بہت متاثر کیا ہے۔ تاریخ میں اس فلسفے کی اساس "ناگزیر ترقی کا اصول" (Inevitability of Program) ہے۔ اس کی رو سے ہر آنے والا دن گزرے ہوئے دن سے بہتر ہے۔ انسان کا ورثہ روز بروز بڑھ رہا ہے حالِ ماضی سے اچھا ہے اور مستقبلِ حال سے بہتر ہوگا۔ ہمارے قدم لازماً ترقی اور عروج کی طرف اٹھ رہے ہیں اور اب پیچھے ہٹنے کا کوئی امکان نہیں۔ اس اصول کو ہیگل کے فلسفہ تاریخ اور مارکس کی معاشی تعبیر تاریخ نے بڑی تقویت پہنچائی۔ یہ اسی انداز فکر کا نتیجہ ہے کہ ماضی کی ہر چیز کو کم مایہ اور حقیر جبکہ حال کی ہر شے کو قابلِ قدر سمجھا جا رہا ہے اور ترقی کا لازماً تقاضا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ تعبیر زمانہ کے نام پر ہر قدم چیز کو بدل ڈالا جائے۔

یہ نظریہ بدیہی طور پر غلط ہے ہمیں انسانی تاریخ میں ارتقاء کی کوئی سیدھی تکیہ نظر نہیں آتی۔ یہ تاریخ بڑی کج رو واقع ہوئی ہے اس میں ترقی بھی ہے اور تنزل بھی عروج بھی ہے اور زوال بھی ارتقاء بھی ہے اور انحطاط بھی فراز بھی ہے اور نشیب بھی۔ ہر بعد کے دور کو پچھلے دور سے بہتر سمجھنا تاریخی لحاظ سے ایک بالکل غلط مفروضہ ہے جسے ہر گز صحیح ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

جدید غلامہ تاریخ میں سے کوئی بھی ہیگل اور مارکس کی اس توجیہ کو صحیح نہیں سمجھتا اور تاریخی حقائق اس کی توثیق کرنے سے انکاری ہیں۔ "مسلل ارتقاء کا نظریہ" آج علمی حیثیت

سے ایک متردک نظریہ ہے لیکن ان کے دلوں سے جس فاسد تصور سے جنم لیا ہے وہ عام پڑے لکھے لوگوں کے دماغ پر مسلط ہے اور وہ اپنی ترقی پسندی کا دھول پٹنے کے لئے کھن فیض کے طور پر ہر قدیم چیز پر ناک بھوں چڑھاتے اور ہر نئی چیز کی طرف بے سوچے سمجھے لپک پڑتے ہیں حالانکہ قدیم کو لازماً نرا اور جدید کو لازماً اچھا سمجھنا اور تمام قدیم چیزوں کو تبدیلی کے خداد پر چھوڑ دینا ایک غلط روش ہے جس کے لئے کوئی دلیل موجود نہیں۔

### تغیر زمانہ کی نوعیت:

اب سوال یہ ہے کہ زمانے کے تغیر کی نوعیت کیا ہے؟ اور یہ تغیر زندگی کے کس دائرے میں واقع ہو رہا ہے؟

تغیر کے وجود سے انکار ناممکن ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اقرار ہر حال میں ضروری ہے لیکن جس چیز کا سمجھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس تغیر کی نوعیت کیا ہے اس لئے کہ اس کی نوعیت کو سمجھنے بغیر کوئی صحت مند اجتماعی پالیسی اختیار نہیں کی جاسکتی۔

انسان کی اجتماعی زندگی میں جو تبدیلی بھی آرہی ہے وہ ذرائع اور وسائل کی دنیا میں ہے مقاصد اور اصول و اخلاق کی دنیا میں نہیں۔ فنی ایجادات اور تکنیکی انکشافات انسان کے وسائل اور فطری قوتوں پر اس کے اختیار کو برابر بڑھا رہے ہیں لیکن یہ ساری تبدیلی ذرائع و وسائل ہی کی حد تک ہو رہی ہے۔ اس تبدیلی کا یہ تقاضا ہرگز نہیں کہ مقاصد زندگی اصول اخلاق اور اقدار حیات کو بھی تبدیل کر دیا جائے۔ اگر ہوائی جہاز جیٹ راکٹ کے استعمال سے زمین کی پٹائیوں پہنچ گئی ہیں تو اس کے یہ معنی کب ہیں کہ خیر و شر کے اصولوں کی صداقت پر اس کے اثرات پڑیں؟

میزائل اور آبدوزوں کے استعمال کا آخر یہ تقاضا کب ہے کہ جھوٹ، سود، شراب اور دوسرے منکرات کو جائز قرار دیا جائے؟ صنعتی ترقی کا آخر یہ تقاضا کب ہے کہ اصول انصاف کو بھی بدل دیا جائے؟

### سطحی نظر کے کرشمے:

جو حضرات سطحی نظر رکھتے ہیں وہی اس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ یہ تغیرات اصولوں میں رد و بدل کے متقاضی ہیں۔ درحقیقت تمام ایجادات و انکشافات انسان کے لئے ہیں۔ انسان کے لئے تمام مادی ترقیات اسی وقت مفید ہو سکتی ہیں جب وہ اس کی پہلائی کے لئے استعمال ہوں خود غلط فہمی اور تبدیلی کے اصول ان کی خاطر نہ بدلے جائیں۔ یہ تو ہیں جو انسان کو حاصل ہوئی ہیں لیکن وقت بگڑ رہا ہے جب وہ اعلیٰ مقاصد حیات کی تابع ہوں اور اپنے ریلے میں انہیں بہا کر نہ لے جائیں۔ مقاصد و اصول کو ان کے مطابق نہیں بلکہ ان کو مقاصد و اصول کے مطابق بدلنا

چاہئے۔ مقاصد و اصول کی حیثیت تو ان معیارات کی ہے جن سے عقلی ترقیات کے حسن و خج کو ناپا جائے گا، اگر ان ترقیوں کے باوجود انسان ہی پریشان و مضطرب رہتا ہے تو پھر ساری مادی ترقی بے کار ہے۔

### ثبات اور تغیر:

انسانی زندگی میں تغیر کا منہاج کچھ ایسا ہے کہ تبدیلی کے ساتھ ساتھ ثبات اور دوام کا بھی ایک پہلو موجود ہے۔ تبدیلی ہر لمحہ آتی ہے لیکن بنیادی حقیقت کو متاثر کئے بغیر اپنا ظہور کرتی رہتی ہے مثلاً انسان کے جسم اور اس کی ذات کو لیں، سائنس کے مشاہدات ہمیں بتاتے ہیں کہ انسان کے جسمانی نظام میں ہر لمحہ تغیرات واقع ہو رہے ہیں۔ ایک بچے کے جسم کا ایک ایک ریشہ جوان ہونے تک بدل جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہتا ہے حتیٰ کہ ایک خاص مدت میں ہر مرحلہ انسان کا جسم اپنے کو بالکل تبدیل کر کے ایک نیا جسم بن جاتا ہے لیکن اس تبدیلی میں بنیادی نظام وہی رہتا ہے اور ہر شخص کی اساسی شخصیت اس کی ”انا“ غیر متبدل رہتی ہے۔ اسی کیفیت کو ”نکولائی بردایف“ (Nicolai Berdyve) ان الفاظ سے تعبیر کرتا ہے:

”انسانی ذات تغیرات کے جلو میں عدم تغیر کا نام ہے۔“

جبکہ برگساں نے اس حقیقت کو یوں ادا کیا ہے:

”ہم میں تغیر تو آتا ہے لیکن ہماری بنیادی حقیقت معدوم نہیں ہوتی۔“

یہ فطرت کا خاتون ہے جو ہر شعبہ زندگی میں جاری و ساری ہے۔ انسان کی اجتماعی اور تہذیبی زندگی میں بھی ہمیں یہی جلوہ گر نظر آتا ہے۔

مندرجہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہے:

- 1- ہر تبدیلی موجب خیر ہی نہیں ہوتی ہے۔ جو چیز مطلوب ہے وہ محض تبدیلی نہیں بلکہ صحیح سمت میں تبدیلی ہے۔
- 2- محض زمانے کے چلن کی اجراع کسی فرد یا قوم کے لئے فلاح کا باعث نہیں ہو سکتی۔
- 3- کسی چیز کے غالب ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ لازماً اچھی اور صحیح بھی ہے یا یہ کہ وہ ناقابلِ تسخیر ہے۔
- 4- ناگزیر ترقی کا اصول ایک فاسد اصول ہے جس کی تائید تاریخ سے نہیں ہوتی۔
- 5- زمانے کے تغیر کی نوعیت بڑی غور طلب ہے۔ تبدیلی کا دائرہ بڑا محدود ہے، تبدیلی بنیادوں میں نہیں صرف فرد و جمہور میں ہوتی ہے۔ انسانی فطرت، کائنات کے بنیادی قوانین اور ہدایت و ضلالت کے ضابطہ میں کسی تغیر کا سوال نہیں۔
- 6- زندگی صرف تغیر کا نام نہیں بلکہ وہ تغیر اور ثبات دونوں کے توازن سے قائم ہے اور صحت

مند نظام دعی ہو سکتا ہے جو دونوں پہلوؤں میں کامل توازن قائم کرے۔

### موجودہ حالات اور مسلمان:

پوری انسانی تاریخ اس امر پر گواہ ہے کہ ہمیشہ عظیم کارنامے ان ہی لوگوں نے انجام دیے ہیں جو حالات کی زد پر بیٹے کی بجائے ان کا مقابلہ کرنے اُٹھے ہیں۔ زندگی کے اہم نقوش انہوں میں نہیں چھوڑے جو مرغِ ہادفا کی طرح ہوا کے رخ پر مڑتے اور دوسروں کی تھالی کرتے رہے بلکہ ان لوگوں نے چھوڑے ہیں جو ہوا کے رخ سے لڑے ہیں اور زندگی کے دھارے کو موڑ کر رکھ دیا ہے۔ قابلِ تقلید وہ نہیں ہے جو گرگٹ کی طرح صبح و شام رنگ بدلتا ہے بلکہ وہ ہے جو خود اپنا کوئی رنگ رکھتا ہے اور دنیا کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔

مسلمان دنیا میں زمانے کے پیچھے چلنے کے لئے پیدا نہیں کئے گئے ہیں وہ تو پوری انسانیت کی طرف اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ جسے اللہ عزوجل اور اس کا محبوب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نیکی کہتے ہیں اس کا حکم دیں اور جسے اللہ عزوجل اور اس کا حبیب ﷺ بدی کہتے ہیں اسے مٹائیں اور دنیا میں اللہ عزوجل و رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی روش کو عام کر دیں۔ وہ دوسروں کے رنگ میں رنگے جانے کے لئے نہیں ہیں بلکہ دوسروں کو اپنے رنگ میں رنگنے کے لئے ہیں۔ اصل میں مسلمان کا مقام یہ ہے۔

درحقیقت مسلمان کے لئے اس سے بڑی کوئی ذلت نہیں ہو سکتی کہ وہ اللہ عزوجل کے پیغام کا امین ہونے کے باوجود زمانے کو اپنے دین کے مطابق بدلنے کی بجائے خود زمانے کی زد پر بہنے لگے اور اس کے ساتھ اپنے دین کو بھی مسخ کرنے کی کوشش کرے۔ یہ بزدلوں اور کم نظر لوگوں کا طریقہ ہے بلکہ یہ ان لوگوں کا طریقہ ہے جنہیں ہوائیں خس و خاشاک کی طرح اڑائے لئے پھرتی ہیں۔ جن کی اپنی جڑ نہیں ہے کہ وہ اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو سکیں۔ یہ مسلمان کا شیوہ نہیں بلکہ مسلمان کا شیوہ تو یہ ہے کہ وہ زمانے سے نہیں بلکہ زمانہ اس سے ہے۔

### جدید تہذیب کا ارتقاء:

مغربی ممالک ہمیشہ سے اس قدر متقدم اور ترقی یافتہ نہ تھے جتنے کہ آج ہیں۔ مغربی تہذیب اپنی موجودہ شکل میں صرف پانچ سو سال قدیم ہے۔ یورپ میں اس سے پہلے کے زمانہ کو ”دور تاریک“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

کسی تہذیب کی روشنی یا علامات دراصل اس کے اصول و عقائد اخلاقی اقدار اور سماجی اداروں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہی وہ عناصر ترکیبی ہیں جن کے مجموعے کا نام ”تمدن“ ہے۔ ان عناصر میں کچھ اثر قبول کرنے والے ہوتے ہیں کچھ اثر ڈالنے والے!..... جو عناصر اثر ڈالنے والے ہوتے ہیں دراصل وہی کسی دور کی مخصوص تہذیب کا ڈھانچہ متعین کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان



عناصر کو "عصری تحریکات" کا نام دیا جاتا ہے۔ جدید سیاسی افکار کے ضمن میں عصری تحریکوں میں درج ذیل پانچ عناصر تہذیب کو شامل کیا جاسکتا ہے:

1- فلسفہ مادیت

2- نظریہ الحاد

3- حاکمیت جمہور

4- جذبہ قوم پرستی

5- حیوانی ازدواج کا نظریہ

ان جدید عصری تحریکوں کو بخوبی سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سرسری طور پر ان کے تاریخی ارتقاء کا جائزہ لیا جائے۔

عناصر تہذیب دو عوامل کے پیدا کردہ ہوتے ہیں:

1- ماضی کے اثرات

2- اس دور کے مخصوص حالات و تصورات

موجودہ تہذیب بھی انہی دو عوامل کے عمل اور رد عمل کا نتیجہ ہے۔

سیاست اور معیشت پر جاگیردارانہ نظام حاوی تھا۔ ہر ملک چھوٹی چھوٹی جاگیروں میں منقسم تھا اور ہر جاگیردار اپنے علاقے میں خود مختار تھا۔ جاگیردار اپنے "آدمیوں" کے ارادہ و عمل پر کلی اختیار رکھتا تھا اس کے زیر حکم افراد اگرچہ اصطلاحی معنوں میں ان کے غلام نہ تھے لیکن ان کی حیثیت غلاموں سے کسی طرح بہتر نہ تھی۔

معاشرے میں صرف دو طبقے تھے: ایک امراء اور جاگیرداروں کا جس میں اصحاب جائیداد اور مذہبی پیشوا شامل تھے اور دوسرے نیم غلام عوام۔ ان دونوں طبقات کی زندگی میں معاشرتی اور معاشی اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق تھا۔ جنگ و جدال جاگیرداروں کا دن رات کا مشغلہ تھا جن میں عوام کی آزمائش کی جاتی تھی۔ کسان تو دیسے بھی تنگ تھے پھر ہمدردی جنگوں نے تو ان کی کمر بالکل ہی توڑ دی تھی۔

یہ سب کچھ تو تھا ہی لیکن ستم یہ کہ ان تمام نا انصافیوں اور زیادتیوں کو برحق ثابت کرنے کے لئے سہارا مذہب ہی کا لیا جاتا تھا۔ اس دور کا نسخہ مذہب ایک ایسا طبع بنا ہوا تھا جس کو برحق و بد مذہب چیز پر چڑھا کر خوشنما اور قابل قبول بنایا جاسکتا تھا۔ وہ برسر اقتدار طبقے کے ہاتھ میں اور حقیقت ایک ایسا ہتھیار تھا جس سے یہ طبقہ اپنی ہر جائز و ناجائز غرض پوری کرتا تھا۔

یہ حالات تھے جب مسلمانوں نے یورپ کے کچھ حصے کو فتح کیا اور باقی کچھ حصے سے تجارتی تعلقات استوار کئے۔ اس دور کا مسلمان علم و ہنر کا دلدادہ اور صنعت و حرفت کا ماہر تھا۔ مسلمانوں سے تعلقات کی بناء پر یورپ کے عیسائیوں میں بھی علمی ذوق پیدا ہوا اور ان میں سے

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

کچھ نے مسلم علماء اور قدیم یونانی فلسفیوں کے افکار کا مطالعہ کیا اس طرح تقریباً ایک ہزار سال کے بعد یورپ میں علوم و فنون کی تجدید ہوئی۔ تاریخ کی اصطلاح میں اس تجدید کو ”نفاثہ ثانیہ“ کہا جاتا ہے۔ اس مطالعہ کی بناء پر یورپ کے عیسائیوں میں روشن خیالی پیدا ہوئی ان کی نظر میں غیر معقول نظریات کھٹکنے لگے۔ بہت سے لوگوں نے جاہلانہ ادہام کے خلاف احتجاج کیا لیکن عیسائیت کے مذہبی رہنماؤں نے ان سب پر ارتداد کا فتویٰ لگا کر نہایت سخت سزائیں دیں۔ ایک اندازے کے مطابق کلیسا کے سز یافتہ افراد کی تعداد تین لاکھ سے کسی طرح کم نہیں ان میں سے تیس ہزار افراد کو زندہ جلا دیا گیا۔

اہل کلیسا کے ان لرزہ خیز مظالم اور چہرہ دستیوں سے پورے یورپ میں ایک ہلچل مچا دی لوگ کلیسا سے متنفر ہو گئے۔ بد قسمتی سے اس عداوت کے جوش میں انہوں نے مذہب کے پورے نظام کو تہہ و بالا کر دینے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ وہ جنگ جو شروع شروع میں عیاشی قسم کے اہل کلیسا کے خلاف لڑی جا رہی تھی وہ بعد میں عیسائی مذہب کے خلاف بھی شروع ہو گئی اور بعد ازاں ہر مذہب کے خلاف ہو گئی چنانچہ قصہ میں آ کر وہ ہدایت الہی کے ہی پانگی ہو گئے۔ گویا اہل کلیسا کی حماقت کی وجہ سے پندرہویں اور سولہویں صدی میں ایک ایسی جذباتی کشش شروع ہوئی جس میں چڑ اور ضد سے بہک کر تبدیلی کے جذبات خالص ”الحاد“ کے راستے پر پڑ گئے۔ اس طویل کشش کے بعد مغرب میں تہذیب الحاد کا دور دورہ شروع ہو گیا۔

غرضیکہ وہ لوگ جو مذہب کو کسی خاص شکل میں ایک اجتماعی نظام کی حیثیت سے زندہ رکھنا چاہتے تھے بالواسطہ طور پر خود ہی اس کے خاتمے کا سبب بنے۔ فلسفہ اخلاق، معیشت اور سیاست ہر جگہ سے مذہب کو بے دخل کر دیا گیا۔ مشاہدہ و تجربہ علم کا واحد ذریعہ بنے۔ ہر ان دیکھی چیز کا انکار روشن خیالی کا ثبوت قرار پایا۔ اخلاق کا معیار ذاتی منافع سمجھا گیا قیامت کا عقیدہ باطل گردانا گیا۔ قانون سازی کی راہ میں الہامی اور اخلاقی پابندیوں کو جہالت اور نادانی پر مبنی رکاوٹ قرار دیا گیا۔ اس طرح پوری زندگی کو غیر مذہبی اور مادی بنا دیا گیا۔



اسلام

— اور —

جدید معاشرتی نظریات و تحریکات

## معاشرہ

معاشرہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی مل جل کر رہنا، ایک ساتھ اکٹھا رہنے کے ہیں۔ عام مفہوم میں معاشرہ لوگوں کے اُس اتحاد کا نام ہے جو مل جل کر اپنے مشترکہ مقاصد کے حصول میں مسلسل عمل پیہم ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ انسانوں کا وہ بڑا گروہ ہوتا ہے جو مخصوص جغرافیائی حد میں منظم ہو گیا ہو اور اپنے مشترکہ مقاصد کو پانے کے لئے ایک ساتھ مل کر جدوجہد کر رہا ہو۔

علم عمرانیات کی رو سے معاشرتی زندگی کے تانے بانے کا نام معاشرہ ہے۔ افراد معاشرے کی بنیادی اکائیاں ہیں جو مل جل کر گروہ بناتے ہیں۔ یہی گروہ جب رواں ہوتے ہیں تو ادارے وجود میں آتے ہیں۔ ادارے مربوط ہو کر سماجی تنظیموں کا روپ دھار لیتے ہیں اور تنظیمیں مل کر معاشرہ کو جنم دیتی ہیں۔

گویا ایک معاشرہ میں مختلف منصب اور کارہائے منصب رکھنے والے افراد موجود ہوتے ہیں جیسے استاد شاگرد، گاہک، دوکاندار، امیر، غریب، ڈاکٹر، مریض، افسر، ماتحت وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح ایک معاشرہ میں لاتعداد معاشرتی ادارے پائے جاتے ہیں۔ معاشرہ کے افراد اپنی تمام ضروریات انہی اداروں کی وساطت سے پوری کرتے ہیں جیسے خاندان، سکول، کالج، یونیورسٹیاں، مساجد، بازار، دوکانیں، ٹیکسٹریاں، کارخانے، ہسپتال وغیرہ وغیرہ۔

معاشرہ کی اصطلاح میں افراد اور گروہی زندگی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک ہر فرد معاشرہ سے وابستہ رہتا ہے، معاشرہ میں زندگی بسر کرتا ہے، اپنے جیسے افراد کے ساتھ تفاعل کے بغیر مکمل انسان نہیں بن سکتا۔ برٹریڈ رسل کے بقول:

”معاشرہ انسانوں کا بڑا گروہ ہوتا ہے جس میں افراد اپنی ساری

زندگیاں بسر کرتے ہیں۔“

### معاشرہ کی تعریف:

چند مفکرین کی تعریفیں مندرجہ ذیل ہیں:

☆ ایف۔ ایچ۔ گڈنگز کے مطابق:

”معاشرہ ایک جیسے خیالات رکھنے والے افراد کا مجموعہ ہے جو ہم خیالی

کا شعور رکھتے ہیں اور اسی بناء پر مشترکہ مفادات کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔“

☆ سمنر اور کیلر کے مطابق

”معاشرہ ایسے افراد کا مجموعہ ہے جو اشتراک عمل کے ذریعے مسائل حیات کے حصول اور بقائے نسل کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔“

☆ لٹنن کے مطابق:

”افراد کا ایسا گروہ جو طویل عرصہ سے ایک جگہ مقیم ہو اور اشتراک عمل کی بدولت وہ اتنا منظم ہو جائے کہ لوگ اس گروہ کو ایک وحدت کا درجہ دے دیں تو وہ گروہ معاشرہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔“

☆ برنریڈ رسل کے مطابق:

”افراد کا ایسا گروہ جس میں لوگ اپنی پوری عوامی زندگی بسر کرتے ہیں معاشرہ کہلاتا ہے۔“

معاشرہ کا معنی و مفہوم:

معاشرہ کا لغوی معنی ایک سے زائد اشخاص کا مل جل کر زندگی بسر کرنا ہے۔

اصطلاح میں معاشرے سے مراد کسی جگہ یا علاقے کے لوگوں کا طرز زندگی ہے جس میں ان کے خانگی اور شہری تعلقات دونوں شمار ہوتے ہیں یعنی ایک ہی طرح کے اوصاف کے حامل یکساں عقائد و نظریات رکھنے والے افراد کا مخصوص ثقافتی و معاشرتی عادات و اطوار کے مطابق زندگی گزارنا کہ جن کی اقدار باہم مشترک ہوں چونکہ عملی زندگی ضرور کسی نہ کسی عقیدہ یا نظریہ کا نتیجہ ہوتی ہے اس لئے ہر معاشرہ اپنے اندر چند مخصوص عقائد و نظریات رکھتا ہے۔

معاشرہ کی اہمیت:

انسان اپنی ضروریات اکیلا مہیا نہیں کر سکتا اس کے لئے وہ دوسروں کے تعاون کا محتاج ہے۔ جتنا زیادہ انسانی ضروریات میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اس تناسب سے علوم و فنون میں ترقی ہوتی جاتی ہے جبکہ اس کے ساتھ ہی معاشرتی نظم میں وسعت آتی رہتی ہے جس قدر معاشرتی اکائی منظم اور وسیع ہوگی اسی قدر سہولتیں بھی وافر میسر ہوں گی اس طرح کنبہ سے قبائل گاؤں اور قصبہ کی صورت میں زندگی منظم ہو جاتی ہے۔ قصبوں اور شہروں کے باہمی اتحاد اور ارتباط سے ریاست تشکیل پاتی ہے جس میں رہنے والے لوگ قوم قرار پاتے ہیں جو اپنی مخصوص خصوصیات کے باعث دوسری اقوام سے ممتاز ہو سکتے ہیں۔

## اسلامی معاشرتی نظریہ:

اسلام کے معاشرتی نظام کا سنگ بنیاد یہ نظریہ ہے کہ دنیا کے سب انسان ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے ایک انسانی جوڑا پیدا کیا پھر اسی جوڑے سے ساری کائنات وجود میں آئی۔ ابتداء میں سب لوگ ایک ہی امت تھے ان کا ایک ہی دین ایک ہی زبان تھی۔ ان میں کوئی نظریاتی اختلاف نہیں تھا۔ پھر جوں جوں ان کی تعداد بڑھتی گئی وہ زمین پر پھیلنے لگے تو قدرتی طور پر وہ مختلف نسلوں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہو گئے۔ ان کی زبانیں وضع قطع لباس اور رہن سہن کے طریقے الگ الگ ہو گئے اور جگہ جگہ آب و ہوا نے ان کے رنگ و روپ اور خدوخال تک تبدیل کر دیے۔

یہ سب اختلافات فطری ہیں اس لئے اسلام ان کے وجود کی نفی نہیں کرتا اور نہ ہی انہیں مٹانا چاہتا ہے لیکن اسلام ان فطری اختلافات کے نتیجے میں جو لوگوں نے نسل رنگ زبان قومیت اور وطنیت کے تعصبات پیدا کر لئے ہیں ان کو غلط قرار دیتا ہے۔ اسلام بنیاد کو مد نظر رکھتا ہے کہ تم سب ایک ماں اور باپ کی اولاد ہو لہذا ایک دوسرے کے بھائی ہو اور انسان ہونے کی حیثیت سے برابر ہو۔ اس اعتبار سے یہ بھائی اور بھائی شریف اور کمین اور اپنے اور غیر کے جتنے فرق پیدائش کی بنیاد پر کر لئے اسلام کے نزدیک اسلام سے عدم واقفیت کی بناء پر یہ جاہلیت کی باتیں ہیں۔

بلکہ انسانوں کے مابین اصل فرق اخلاق اور اصولوں کا ہو سکتا ہے۔ اس نظریے کی بنیاد پر اسلام ایک فکری اخلاقی اور اصولی معاشرہ تعمیر کرتا ہے جس میں انسانوں کے باہمی رابطے کی بنیاد اس کی پیدائش رنگ نسل وطن نہیں بلکہ ایک عقیدہ اور ایک اخلاقی ضابطہ ہے۔ ہر وہ شخص جو توحید و رسالت کا اقرار کر لے اور اسلامی شریعت کو اپنا قانون زندگی تسلیم کر لے وہ اس معاشرے میں شامل ہو سکتا ہے۔

## اسلام کا نظام معاشرت:

اسلام اپنا ایک مضبوط اور پائیدار نظام معاشرت رکھتا ہے جس کے اصول و ضوابط مستحکم اور مستقل ہیں جس کا پورا مزاج عدل و انصاف سے مرکب ہے اور جس کے تمام اجزاء باہم مربوط اور ہم آہنگ ہیں۔ یہ نظام ایسا جامع اور ہمہ گیر ہے کہ زندگی کے تمام خواہر اور ہر طرح کی سرگرمیاں اس کے دائرے میں آ جاتی ہیں۔ یہ انسان کے ضمیر قلب اور اس کے معاملات زندگی دونوں پر محیط ہے اور اپنی ہدایات اور قانون سازی میں دین اور دنیا پر حاوی ہے۔

## اسلامی نظام معاشرت کی بنیادیں:

عمومی طور پر اسلام ایک ایسے معاشرے کا طالب ہے جو ہمہ گیر، مصنوعی اختلافات سے پاک، تعصبات سے منزہ، رنگ، نسل، وطن اور زبان کی حد بندیوں اور جغرافیائی سرحدوں سے آزاد مساوات، اجتماعی عدل و انصاف، ایقائے عہد، ایثار، صدق، کسب حلال، ہمدردی اور ایک عالمگیر برادری کی بنیاد پر قائم ہو جس کی بنیادیں مذکورہ اخلاق یعنی جھوٹ، غیبت، منافقت، تکبر، حسد، بغض اور کینہ سے پاک ہوں بلکہ ایک اخلاقی، فکری اور اصول معاشرہ ہو جس کے افراد میں باہم ہمدردی، انسانیت اور موداعہ کا رشتہ ہو۔

## اسلامی نظام معاشرت کے اصول:

اب ہم نے یہ دیکھا ہے کہ وہ کیا اصول اور طریقے ہیں جو اسلام نے معاشرے میں یکجہتی، یکجہتی، ہم رنگی اور انسانی اجتماع کی مختلف صورتوں کو ترقی دینے کے لئے مقرر کئے ہیں۔ اس سلسلے میں اسلام نے خاندان، قربانیت، محلہ داری یا محاسن، مسجد، احترام روایات، نظام تعلیم اور حدود و تعزیرات کی شکل میں کچھ مستقل ادارے قائم کئے ہیں جن کی تفصیلات آگے چل کر پڑھیں گے۔

## آنحضرت ﷺ کا حسن معاشرت:

رسول اکرم ﷺ کی تبلیغی سرگرمیوں میں جس چیز نے لوگوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ آپ ﷺ کا حسن معاشرت ہے۔ قرآن کریم نے بھی آپ ﷺ کی اس صفت کو آپ ﷺ کی کامیابی اور ہر دلعزیزی کا سبب قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

”اللہ کی مہربانی سے آپ ﷺ لوگوں کے لئے نرم ہو گئے ہیں اور اگر آپ ﷺ ترش رو اور سخت دل ہوتے تو سب لوگ آپ ﷺ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔“ (آل عمران)

آپ ﷺ کے حسن معاشرت کے خصائص میں سے غیر خواتین، دوسروں کے متعلق حسن ظن، خوش پوشی، علم و نیکو داری، عفو و درگزر، عہد کی پابندی، صدق، امانت و دیانت، حسن اخلاق، میں عازت و اطوار، عدل و انصاف، ایثار و ہمدردی، مہمان نوازی، شرم و حیاء اور شجاعت و بہادری نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

## اسلامی معاشرہ کے امتیازی خصائص:

دنیا کے مختلف علاقوں میں مختلف معاشرے وجود پذیر ہیں۔ بہت سے علاقوں میں جغرافیائی اعتبار سے مخصوص علاقے کے لوگ مخصوص معاشرے کے متقاضی ہوتے ہیں لیکن اسلام اپنی تہذیبی اقدار سے پوری دنیا میں منفرد اور یکساں حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام چونکہ ایک عالمی

مذہب ہے اور اس کے قوانین و ضوابط پوری دنیا کے لئے یکساں رائج اور محیط ہیں اس لئے مجموعی طور پر اسلامی معاشرہ تقویٰ و پرہیزگاری، عفو و درگزر، عدل و انصاف، احسان و ہمدردی، تحمل و مزاحمت، تدبیر و تفکر، خدمت خلق، طلب علم، شرم و حیا، عفت و عصمت، صدق و راست بازی، دوسروں کے لئے نیک خواہشات کا جذبہ، تبلیغ اسلام، جہاد مسادات، بے کسوں بے سہارا یتیموں سے حسن سلوک، اخوت و بھائی چارہ، خاندانی اقدار کا تحفظ، ناپ تول میں صحیح مقدار، تعمیر معاشرہ میں انفرادی کردار اور اسلامی ثقافت کا تحفظ جیسی بنیادی امتیازی خصوصیات کا حامل ہے۔

### معاشرتی ذمہ داریوں کا تصور:

انسان کے اندر اخلاقی حسن ایک فطری جذبہ ہے جس کی بناء پر انسان بعض صفات کو پسند اور بعض کو ناپسند کرتا ہے۔ یہ انفرادی طور پر انسانوں میں کم و بیش ہو سکتی ہے لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ مجموعی طور پر انسانیت کے شعور نے اخلاق کے بعض اوصاف پر خوبی کا اور بعض پر بُرائی کا یکساں علم لگایا ہے۔ سچائی، انصاف، ایقانے عہد اور امانت کو ہمیشہ سے انسانی اخلاقیات میں تعریف کا مستحق سمجھا گیا اور کبھی کوئی ایسا دور نہیں گزرا جب جھوٹ، ظلم، بدعہدی اور خیانت کو پسند کیا گیا ہو۔ ہمدردی، فیاضی اور فراخ دلی کی ہمیشہ قدر کی گئی اور خود غرضی، ستندی، بخل اور تنگ نظری کو بھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ صبر و استقلال، تحمل و بردباری، اولوالعزمی اور شجاعت ہمیشہ وہ اوصاف رہے ہیں جو تعریف کے لائق گردانے گئے جبکہ بے صبری، چھچھورا پن، تلون مزاجی، پست حوصلگی اور بزدلی کو کبھی اچھا نہیں کہا گیا۔

اخلاقی اوصاف کا تعلق اللہ اور بندے کے باہمی رشتے میں نہیں بلکہ ان عوامل سے ہے جو معاشرے میں رہتے ہوئے انسانوں کے مابین قائم ہوتے ہیں۔ معاشی لین دین ہو یا سیاسی معاملات، سماجی برتاؤ ہو یا افراد خاندان سے سلوک، جب ہم اس کو معاشرتی ذمہ داریوں کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اسلام سب کو اخلاقی اصولوں کے مطابق انجام دینے کی تعلیم دیتا ہے۔ تمام پسندیدہ اخلاقی اوصاف کا احاطہ کرنا تو مشکل ہے ذیل میں ہم دیا ندری، ایقانے عہد، صدق، عدل و انصاف، احرام قانون، کسب حلال اور ایثار کو زیر بحث لائیں گے۔

## معاشرہ کی نوعیت و اقسام

انسانی اجتماع مکمل اور نامکمل دونوں صورتوں میں پایا جاتا ہے۔ ایک کامل یا معیاری اجتماع چھوٹا، بڑا اور درمیانہ تینوں طرح کا ہو سکتا ہے۔ عظیم تر انسانی اجتماع ایک مکمل وحدت کی شکل میں متعدد اقوام پر مشتمل بھی ہو سکتا ہے درمیانے حجم کا اجتماع کسی خطہ میں ایک قوم کی صورت میں موجود ہو سکتا ہے جبکہ چھوٹے شہر کو چھوٹے اجتماع سے موسوم کیا جاتا ہے۔



اجتماع میں ہی انسان حقیقی خوشیوں سے ہمکنار ہو سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ عیلمانی مقاصد بھی حاصل کر سکتا ہے۔

دوسری طرف نامکمل اجتماع ایک گھرانہ مقامی گروہ یا گاؤں کی صورت میں پایا جاتا ہے اسی طرح اجتماع میں کچھ گردہ مکمل اور کچھ نامکمل ہوتے ہیں اور گاؤں اور شہروں کے اندر هجوم کی صورت میں بھی لوگ اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح قومیت اور ملت کسی خاص خطہ پر تشکیل پا سکتی ہے اور اس کی ساخت دونوں طرح کی ہو سکتی ہے یعنی منظم اور غیر منظم پوری دنیا کے اندر پھیلے ہوئے لوگ کوئی تنظیم قائم کئے بغیر بھی رہ سکتے ہیں۔

البتہ یہ کہ انسانی گروہ بندی کی اشکال وقتی پڑاؤ کی صورت میں لوگوں کا اکٹھا وارڈ، شہر، قوم اور قوم سے اوپر بنی نوع انسان ہو سکتی ہیں۔

اسلامی نظام معاشرت کے وہ کیا اصول اور طریقے ہیں جو اسلام نے معاشرے میں یکجہالت اور ہم رنگی پیدا کرنے اور انسانی اجتماع کی مختلف صورتوں کو ترقی دینے کے لئے مقرر کئے ہیں۔ اس سلسلے میں اسلام نے کچھ مستقل ادارے قائم کئے ہیں جن کا اجمالی خاکہ درج ذیل ہے:

## 1- خاندان:

یہ انسانی معاشرت کا اولین اور بنیادی ادارہ ہے۔ اس لئے اسلام کے معاشرتی نظام میں خاندان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ خاندان کی بنیاد ایک مرد اور ایک عورت کی باہمی رفاقت سے وجود میں آتی ہے اور ان ہی دو انسانوں سے مل کر بننے والا چھوٹا سا اجتماعی دائرہ انسان کی تمدنی زندگی کی سب سے پہلی کڑی ہے۔ اسلام کے نزدیک مرد اور عورت کی یہ مستقل رفاقت ایک کھلے ہوئے مستحکم معاہدے (نکاح) کے ذریعے سے وجود میں آتی ہے۔ یہ نکاح ایک ایسا باحرمت رشتہ ہے جو دونوں کی مرضی سے اور پورے اعلان کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ نکاح کے بغیر مرد و زن کا تعلق بدترین معصیت اور ایک ایسا جرم ہے جس کی سخت ترین سزا مقرر ہے۔

معاہدہ نکاح کے ذریعے سے دونوں (مرد و عورت) اپنے اپنے اوپر بھاری ذمہ داریاں عائد کر لیتے ہیں اور ہمیشہ کے لئے ان کے پابند ہو جاتے ہیں۔ اس رشتے کی وجہ سے جو ایک چھوٹی سی وحدت بنتی ہے مرد اس کا مہرمان اور ناظم اعلیٰ ہوتا ہے اور اس حیثیت سے وہ اپنے اہل و عیال کی دنیوی ضرورتوں اور اخروی فلاح دونوں کا خیال رکھتا ہے جس کے لئے وہ جواب دہ ہے اور بیوی اس کے زیر ہدایت گھر کا نظم و نسق چلاتی ہے اور اس حیثیت سے اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ نہ صرف گھر کے اندرونی نظم و نسق کو سنبھالے بلکہ شوہر کی حقیقی رفاقت کر کے اپنی عفت کو پوری طرح محفوظ رکھے۔

عورت اور مرد کے اس ملاپ سے ایک نئی نسل وجود میں آتی ہے۔ اس سے رشتے بنتے ہیں اور برادری کے دوسرے تعلقات پیدا ہوتے ہیں۔ بالآخر یہی رشتے پھیلتے پھیلتے ایک معاشرے تک جا پہنچتے ہیں نیز خاندان ہی وہ ادارہ ہے جس میں ایک نسل اپنے بعد آنے والی نسل کو انسانی تمدن کی وسیع خدمات سنبھالنے کے لئے نہایت محبت، ایثار و وسوزی اور خیر خواہی کے ساتھ تیار کرتی ہے۔ گویا یہ ادارہ وہ تربیت گاہ ہے جہاں سے اسلام اچھے انسان تیار کرنا چاہتا ہے اور اخلاقِ حسنہ کی ابتدائی تربیت اسی مقام پر دیتا ہے تاکہ شروع ہی سے بچے میں اسلام کا احترام پیدا ہو اور اس کی سیرت اسلامی سانچے میں ڈھل جائے۔

## 2- قرابت:

خاندان کے بعد رشتہ داری کی سرحد ہے اور باپ کے تعلق سے یا بھائی بہنوں کے تعلق سے یا سسرال کے تعلق سے ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوں۔ اسلام ان سب کو ایک دوسرے کا ہمدرد، مددگار اور غمخوار دیکھنا چاہتا ہے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ رشتہ داروں سے نیک سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور حدیث میں صلہ رحمی کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور اسے بڑی نیکی شمار کیا گیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہے کہ اسلام کے خلاف یا ناجائز کاموں میں تعاون کیا جائے اور رشتے یا قبیلے کی عصمت یا بے جا طرف داری سے کام لیا جائے۔ خون کے رشتوں کو اسلام نے قائم رکھا ہے اور قانون وراثت کے ذریعے انہیں ایک مستقل مقام دے کر رحمت مند اور فطری احساسات کو دوام عطا کیا ہے۔

## 3- محلہ داری یا ہمسائیگی:

رشتہ داری (قرابت) کے بعد ہمسائیگی ہے۔ قرآن کی رو سے ہمسایوں کی تین قسمیں

ہیں:

- 1- رشتہ دار ہمسایہ
- 2- اجنبی ہمسایہ
- 3- عارضی ہمسایہ یعنی جس کے پاس بیٹھے یا ساتھ چلنے کا آدمی کو اتفاق ہو

یہ سب اسلامی احکام کی رو سے رفاقت، ہمدردی اور نیک سلوک کے مستحق ہیں۔ اس باب میں نبی اکرم ﷺ کے بہت سے ارشادات ہیں۔ مثلاً:

”مجھے ہمسایہ کے حقوق کی اتنی تاکید کی گئی میں خیال کرنے لگا کہ شاید اب اسے (بھی) وراثت میں حصہ دار بنا دیا جائے گا۔“

”وہ شخص مومن نہیں ہے جس کا ہمسایہ اس کی شرارتوں سے امن میں نہ ہو۔“

”وہ شخص ایمان نہیں رکھتا جو خود پیٹ بھر کر کھالے جبکہ اس کے پہلو میں اس کا ہمسایہ بھوکا

رہ جائے۔“

غرض اسلام ان سب لوگوں کو جو ایک دوسرے کے پڑوسی ہوں آپس میں ہمدرد مددگار اور شریک رنج و راحت دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ان کے درمیان ایسے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے کہ وہ سب ایک دوسرے پر بھروسہ کر سکیں اور ایک دوسرے کے پہلو میں اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کو محفوظ سمجھیں اور ایسی معاشرت جس میں ایک دیوار کے درمیان رہنے والے باہم کوئی دلچسپی کوئی ہمدردی اور کوئی اعتماد نہ رکھتے ہوں اسلام کو مطلوب نہیں۔ وہ ہر محلے کو معاشرے کا ایک فعال اور مؤثر جزو مانتا ہے۔

#### 4- مسجد:

معاشرتی تعلقات کو استوار کرنے کے لئے مسجد کی حیثیت ایک مستقل ادارے کی سی ہے اور اسلام کا معاشرتی پروگرام مسجد ہی کے ذریعے زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مسجدوں کی صحیح تنظیم کو بڑی اہمیت حاصل ہے تاکہ مطلوبہ نتائج پوری طرح حاصل ہو سکیں۔

#### 5- احترام روایات:

مسلم معاشرے کی روایات مسجد (عرف) کا احترام اور ان کا استحکام بھی معاشرتی پالیسی کا ایک جزو ہے کیونکہ اس کے ذریعے مسلم معاشرہ کبھی بھی اپنے ماضی سے نہیں کٹتا اس کے معنی یہ نہیں کہ روایات میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ زندگی کے ہمہ گیر تقاضوں کی بناء پر ان میں تبدیلی ضرور ہوتی ہے لیکن یہ تبدیلی مستقل اور خاموش ارتقاء کے ذریعے سے ہوتی ہے اور کسی ہچکچاتی اور غیر معمولی بغاوت یا ماضی سے انتطاع کے ذریعے سے نہیں۔

#### 6- نظام تعلیم:

معاشرے کے سدھار اس میں اسلامی اقدار کے تحفظ اور اپنے نظام زندگی کو نئی نسلوں کی طرف منتقل کرنے میں نظام تعلیم بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور اسلامی معاشرت کا ایک بڑا ستون ہے۔

#### 7- حدود و تعزیرات:

معاشرے کی اصلاح کے تمام ذرائع اختیار کرنے کے بعد حدود و تعزیرات کا بھی ایک مکمل نظام رکھا گیا ہے جن کے ذریعے معاشرے کو ان افراد سے محفوظ کیا جاسکتا ہے جو تعلیمی ترغیبی اور اخلاق کے ذریعے سے اصلاح نہ قبول کریں اور معاشرتی قانون کی خلاف ورزی کریں ایسے لوگوں کو اسلام قرار دہائی سزا دیتا ہے تاکہ معاشرہ ان کی فتنہ انگیزیوں سے محفوظ رہے اور اس میں فساد رونما نہ ہونے پائے۔ نیز سماجی جرائم کا انسداد کیا جاسکے۔ گو کہ اسلامی معاشرے میں یہ

جرائم غیر معمولی طور پر بہت کم ہوں گے اس لئے ان سزاؤں کا نفاذ بھی شاذ و نادر ہی ہو گا۔ بہر حال قانون کی گرفت اسلامی نظام میں ناقابل شکست ہے۔ اسلام کی نظر میں قانون سے بالاتر کوئی نہیں ہوتا کیونکہ یہاں خواص و عوام میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔

## معاشرہ کی ضرورت و اہمیت

معاشرے کی ضرورت و اہمیت درج ذیل نکات سے واضح ہو جاتی ہے:

### 1- منظم زندگی:

معاشرے میں افراد کا کسی نہ کسی طور پر منظم ہونا ضروری ہے۔ ان کے عادات و اطوار ان کا چال چلن اور ان کی سرگرمیاں کسی نہ کسی سماجی قانون اور رسم و رواج کے تحت سرانجام پائی چاہئیں۔ ان کی اپنی مخصوص ثقافت اور تہذیب ہونی چاہئے۔ ان کے رہن سہن کا طریق بھی کسی خاص اصول کے تحت ہو۔ ان کے رسم و رواج اور قوانین مخصوص ہونے چاہئیں غرضیکہ وہ اپنے خاص رسم و رواج اور ضابطے کے تحت منظم اجتماعی زندگی بسر کریں۔

### 2- وسعت:

معاشرے کی حیثیت محدود بھی ہو سکتی ہے اور عالمگیر بھی کیونکہ اس اصطلاح میں بہت کچھ پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر خاندان بھی ایک معاشرتی اکائی ہے اور بہت سے خاندان اور ادارے مل کر ہی ایک معاشرے کو جنم دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا اطلاق عالمی حدود پر بھی کیا جاسکتا ہے۔ مذہبی رشتے بھی ایک خاص تہذیب، رسم و رواج اور ثقافت کو جنم دے کر ایک خاص معاشرے کو وجود میں لاتے ہیں مثلاً اسلامی معاشرہ۔ علاوہ ان بین الاقوامی ادارے فرد کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک عالمی معاشرے کی بنیاد جڑ پکڑتی ہے چنانچہ معاشرہ جغرافیائی حدود اور ریاست کی قیود کا پابند نہیں ہے اس کی حد ایک گاؤں تک محدود اور ساری دنیا تک وسیع ہو سکتی ہے۔

### 3- مستقل مقصد:

بایں مل جل کر رہنے میں افراد کی اپنی مرضی شامل ہے۔ وہ ارادی طور پر کسی خاص مقصد کے حصول کے لئے متحد ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے ایک مستقل اور پائیدار مقصد ہوتا ہے جو ان کے لئے مسلسل جدوجہد کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا وقت کبھی نہیں آتا جب اس مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد باقی نہ رہے کیونکہ مقصد مستقل ہوتا ہے مثلاً بنی نوع انسان کی بہبود ترقی، اگر چند افراد اتفاقہ طور پر کسی عارضی مقصد کے لئے ایک جگہ جمع ہو جائیں تو اسے معاشرہ

میں کہا جاسکتا۔ اسی طرح ایک ہیوم سے معاشرہ مراد لینا غلطی ہے کیونکہ یہ اجتماع بغیر مقصد کے عمل میں آتا ہے۔

#### 4- فکری ہم آہنگی:

معاشرے کے لئے یہ شرط ہے کہ اس کی ایک مشترک زندگی ہو اور یہ مجموعی طور پر ایک نظریہ رکھتا ہو۔ معاشرے میں افراد کے درمیان زندگی کے تمام مقاصد کے بارے میں ایک حد تک اشتراک کا پایا جانا ضروری ہے کیونکہ وہ عارضی طور پر ایک جگہ جمع نہیں ہوتے بلکہ مقصد اور فکر کی یکگت انہیں متحد کرتی ہے اور مقاصد کا اشتراک افراد کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے یعنی فکری ہم آہنگی اور ذہنی یکجہتی کے بغیر معاشرے کا وجود ممکن نہیں۔ اس طرح معاشرے میں افراد کا سوچنے کا انداز اور پسند اور ناپسند کا معیار قریب قریب یکساں ہوتا ہے۔

ان کی ثقافت مشترک ہو وہ ایک ہی طرح کے رسومات و اقدار و رسوم و رواج کے پیروکار ہوں جس کی وجہ سے وہ ایک لڑی میں پروئے رہیں گے ورنہ ہر وقت ایک کشمکش سی جاری رہے گی۔ وہ مذہبی طور پر ایک ہی جیسی سوچ رکھتے ہوں ورنہ ان کے حصے بخرے ہو جائیں گے اور نتیجتاً معاشرہ میں فکری ہم آہنگی ہونے کی بجائے معاشرہ انتشار کا شکار ہو جائے گا۔

#### 5- یکجہتی:

معاشرہ افراد کا ایسا اتحاد ہے جس سے ان کی زندگی کے ہر شعبہ میں وحدت عمل نظر آتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان کے طرز عمل میں ہم آہنگی اور یکگت پائی جائے اور وہ باہمی اتحاد کے فوائد سے بہرہ مند ہو سکیں۔ ہمیں معاشرے میں جو تقسیم کار نظر آتی ہے یہ درحقیقت ایک بہتر اتحاد کی صورت ہے۔ معاشرے میں یکسانیت اور اخراج دونوں پائے جاتے ہیں کیونکہ انسانوں میں یکسانیت ہی نہیں تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ پھر بھی وہ اپنی زندگی میں ایک دوسرے کی خواہشوں کا خیال کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ معاشی اور معاشرتی سوچ کے لحاظ سے مختلف ہوں لیکن اپنے معاشرے کی ترقی اور خوشحالی کے لئے ہمیشہ مل جل کر کام کرنے کو ہمہ دقت تیار رہتے ہیں اور ایسے موقع پر وہ اپنے ذاتی اختلافات کو بھی ختم کر دینے کو تیار ہوتے ہیں تاکہ ان کے کسی ذاتی اختلاف کی وجہ سے وہ باقی قوموں سے پیچھے نہ رہ جائے بلکہ وہ ایک دوسرے کی ضروریات کا خیال کرتے ہوئے باہمی تعاون اور یکجہتی سے بسر کرتے ہیں۔ افراد کے انداز فکر اور آراء میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کے افعال میں ایک قسم کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ کسی فرد کی ذاتی رائے دوسروں سے مختلف ہو سکتی ہے لیکن عملی طور پر اسے معاشرے کے طریق کار کی پیروی کرتا پڑتی ہے۔

## 6- باہمی رشتے

معاشرے کی بنیاد دراصل افراد کے باہمی رشتے پر استوار کی جاتی ہے۔ اس میں ہر قسم کے انسانی رشتے اور تعلقات شامل ہیں۔ خواہ یہ تعلقات سیاسی ہوں یا سماجی مذہبی ہوں یا تجارتی اقتصادی ہوں یا ثقافتی غرض کہ اس میں اختیاری رشتے بھی شامل ہوتے ہیں اور وہ تعلقات بھی جو انسان کو دوسروں کے ساتھ مجبوراً استوار کرنے پڑتے ہیں۔ اس طرح یہ ان تمام تعلقات کا احاطہ کر لیتا ہے جو افراد کے درمیان قائم ہو سکتے ہیں۔ ان رشتوں میں شعوری اور غیر شعوری بلا واسطہ اور بالواسطہ منظم اور غیر منظم ہر قسم کے تعلقات شامل ہوتے ہیں۔ انہیں ہم معاشرتی تعلقات سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان سے مراد انسان کے وہ باہمی تعلقات ہیں جن سے وہ کسی نہ کسی حد تک آگاہ ہوتے ہیں۔ یہ تعلقات بے جان اشیاء نہیں ہو سکتے کیونکہ ان میں ایک دوسرے سے آگاہ ہونے کا شعور نہیں ہوتا مثلاً میز اور اس پر رکھا ہوا نائپ رائٹر اگرچہ ان میں ایک قسم کا تعلق ہے لیکن یہ دونوں اشیاء اس سے آگاہ نہیں۔ اس کے برعکس انسانوں کے باہمی تعلقات کو لیجئے اگر وہ ایک دوسرے سے لا تعلق اور منفرد بھی ہوں تو پھر بھی ان میں اس کا شعور بہت شعور ضرور ہوتا ہے۔ معاشرہ بھی معرض وجود میں آتا ہے جب افراد میں کسی نہ کسی قسم کا تعلق پایا جائے۔ اس طرح جو رشتے بھی باہم قائم کئے جاتے ہیں وہ معاشرتی کہلاتے ہیں۔

## 7- یکجہ:

معاشرے کا یکجہ رہنا ضروری ہے تاکہ وہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال سکے۔ یہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر حادی ہے جس میں مختلف ادارے شامل ہوتے ہیں اور ان کے بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں کے مطابق وہ نسبتاً متعادل میں رد و بدل کرتا رہتا ہے۔ درحقیقت معاشرہ رسم و رواج اور انسانی سرگرمیوں کی مستقل تبدیلیوں کا نام ہے کیونکہ معاشرتی رشتے مختلف اثرات کی بناء پر ہمیشہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور معاشرے کو ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہنا چاہئے تاکہ افراد کے کردار اور سرگرمیوں میں نظم و ضبط برقرار رہ سکے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب معاشرہ میں یکجہ رہنے کی خواہش ہو۔

## 8- اختیاری رکنیت اور مساوات

معاشرے کی رکنیت اختیاری ہوتی ہے۔ کسی فرد کو معاشرے کا رکن بننے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ جب وہ اس میں شمولیت اختیار کر لیتا ہے تو اس پر معاشرے کے قواعد و ضوابط کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔

معاشرے کا قیام کسی خاص طبقے کی خوشحالی یا بہبودی کے لئے عمل میں نہیں آتا۔ اس

سے ہر فرد امیر ہو یا غریب یکساں طور پر بہرہ مند ہوتا ہے۔ اس میں ہر شخص اپنی رائے کا اظہار آزادانہ کر سکتا ہے اور اپنی بہتری اور اجتماعی بہبود کے لئے مختلف سرگرمیاں اختیار کر لیتا ہے۔ معاشرے کی بنیاد باہمی تعاون اور مساوات پر قائم کی جاتی ہے اس لئے اس میں کسی فرد کی حق تلفی نہیں ہونے پاتی۔

## معاشرے کے مقاصد

معاشرے کے اہم مقاصد درج ذیل نکات سے واضح ہو جاتے ہیں:

### انفرادی و اجتماعی ترقی:

معاشرے کے قیام کا سب سے ضروری مقصد یہ ہے کہ فرد کی زندگی انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے بہتر ہو۔ انفرادی حیثیت سے فرد کو ایسی سہولتیں میسر ہوں جن سے اس کی تمام صلاحیتیں پوری طرح نشوونما پا سکیں اور ان کو اُجاگر ہونے کا پورا موقع مل سکے۔ فرد کی شخصیت کی تکمیل کا اُتھار بھی معاشرے پر ہے۔ معاشرے ہی فرد کی ذہنی صلاحیتوں کو اُجاگر کرتا ہے اور اسے ترقی سے ہمکنار ہونے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اسی میں وہ کر انسان میں سوجھ بوجھ اور فہم و فراست کی خاصیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرے کو صحیح اصولوں پر منظم کیا جائے تاکہ فرد اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لا سکے۔

اجتماعی حیثیت سے معاشرے کا نصب العین یہ ہے کہ تمام افراد قومی ترقی کے حصول کی کوشش کریں۔ پھر قومی اور تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ دنیا کی دوسری اقوام سے اپنے رشتے استوار کریں جس سے تمام بنی نوع انسان ایک ہی برادری کے رکن معلوم ہوں۔ اس طرح وہ اجتماعی طور پر کامیاب زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں گے اور دنیا میں اپنا مخصوص مقام حاصل کر لیں گے۔

ہر ملک کے افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ باہمی تعاون اور اشتراک کے جذبے کو تقویت دینی چاہئے۔ پھر معاشرے کو قوموں کی علیحدہ علیحدہ اس طرح ترتیب کرنی چاہئے جس سے اقوام میں باہمی تعاون اور ایثار کی روح پیدا ہو سکے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے انسانیت کو عالمگیر جنگوں کی تباہی سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ اس طرح تمام اقوام اجتماعی طور پر ایک عالمگیر برادری میں منسلک ہو جائیں گی اور یہی معاشرے کا حقیقی مقصد ہے۔

### اخلاقی ترقی:

معاشرے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ افراد کی اخلاقی ترقی کا ضامن ہے۔ ان میں

جذبہ خدمت کو آجا کر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ معاشرے کے تمام افراد میں ہمدردی یا ہی تعاون اور اخوت کے جذبات پیدا کرے تاکہ خود غرضی اور طبقاتی منافرت کا خاتمہ کیا جاسکے اور یا ہی اتحاد و تعاون سے افراد کو ترقی سے روشناس کرایا جائے۔

اخلاق کا تعلق کسی بھی معاشرے سے ہوتا ہے۔ معاشرے سے اس کے افراد کے اخلاق کا علم ہوتا ہے لہذا معاشرہ اچھا اور بہتر اخلاق کا ذمہ دار بھی بن جاتا ہے۔

### ضروریات کی فراہمی:

معاشرے کا فرض ہے کہ وہ افراد کی معاشی ضروریات کی اشیاء بہم پہنچائے۔ ان کے بغیر فرد نہ تو انفرادی حیثیت سے معاشرے کو کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی اجتماعی حیثیت سے معاشرے کی کوئی خدمت کر سکتا ہے۔ اگر معاشرہ ایسی سہولتیں بہم پہنچائے جس سے فرد آسانی بنیادی ضروریات کی اشیاء فراہم کر سکے تو پھر وہ اپنی ذہنی ترقی کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔ مادی آسائشیں مہیا ہوتے ہی فرد کسی کا محتاج نہیں رہتا۔ وہ ذہنی تربیت کی طرف زیادہ توجہ دے سکتا ہے اور علوم و فنون اور ادب کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت نکال سکتا ہے۔ اس فرد کا ذہن ترقی پاتا ہے اور افراد کی ذہنی ترقی میں بھی معاشرے کی ترقی کا راز مضمر ہے۔

### یکساں مواقع:

معاشرے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ ہر فرد کو ترقی کے مواقع فراہم کرے۔ اس کی جسمانی اور ذہنی بہتری کے لئے سہولتیں پہنچائے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ سہولتیں عام افراد کو بلا تفریق میسر آئیں۔ یہ نہ ہو کہ چند افراد اس سے مستفید ہو جائیں اور دوسرے محروم رہ جائیں۔ ایک اچھے معاشرے میں تمام افراد کو اپنی شخصیت آجا کر کرنے اور صلاحیتوں کی نشوونما کے یکساں مواقع نصیب ہونے چاہئیں۔ اس سے افراد میں احساس خودی پیدا ہوتا ہے اور ان کی خود غرضی کے جذبے کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے کیونکہ ایک اچھے معاشرے میں ایک فرد کی شخصیت کی نشوونما کسی کے حقوق کو نقصان پہنچا کر نہیں کی جاتی بلکہ تمام افراد کو ترقی کے پورے اسباب یکساں مہیا کرنے ہوتے ہیں۔

مناصب اور کارہائے منصب کے تعین میں درج ذیل عناصر کا فرما ہوتے ہیں:

1- حیاتیاتی حقائق جیسے بہت سے مناصب اور کارہائے منصب جنس اور عمر پر منحصر ہوتے ہیں مثلاً ہم شیر خوار اور بالغ کے درمیان اور پھر بالغ میں نوجوان اور چھڑ عمر اور بوڑھوں کے درمیان فرق بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے معاشرے میں بیشتر کار منصب جنس یعنی مرد اور عورت کے لئے الگ الگ متعین ہیں۔

2- بہت سے مناصب اور کارہائے مناصب اجتماعی زندگی سے اپنا وجود حاصل کرتے ہیں



مثلاً ایک خاص معاشرے میں کس قسم کی معاشی تقسیم کار کا فرما ہے۔  
 اسی حساب سے بے شمار مناصب اور کارہائے مناصب مقرر ہوتے ہیں۔ جوں جوں  
 معاشرہ بڑا پیچیدہ ہوتا جاتا ہے نئے مناصب اور ان کے مطابق کار منصب آجھرتے ہیں۔  
 کسی منصب کی نمایاں اہمیت کی چیز اس سے وابستہ عزت اور مرتبہ ہے جو وہ دوسروں  
 کی نظر میں رکھتا ہے۔ ہر منصب اور کار منصب کو لوگ ایک خاص سکیل پر رکھ کر اس کی اہمیت  
 اور افادیت کو پرکھتے ہیں اور اس سکیل کی بنیادیں اس معاشرے کی ثقافت کے اندر ہوتی ہیں۔  
 حاصل:

معاشرتی گروہ ثقافت بردار ہوتا ہے۔ ثقافت کے بغیر کسی بھی معاشرتی تفاعل کے کچھ  
 معانی نہیں ہوتے۔ یہ معانی انسان اپنی شخصیت میں بسوئے ہوئے ہوتا ہے۔ انسان پیداؤشی طور  
 پر بہت چکدار ہے اور اس کی نشوونما کئی اطراف میں ممکن ہوتی ہے لیکن اس کا انحصار ثقافت پر  
 ہے۔ ہر معاشرہ اپنی ثقافت کو بطور بنیاد تسلیم کرتا ہے اور اس کے مطابق ہی اپنے افراد کی تربیت  
 کرتا ہے۔ یونٹ کے اس حصے میں ہم انسانی شخصیت کے بعض پہلوؤں کا جائزہ لیں گے۔  
 بچے کی تربیت کچھ یوں ہوتی ہے کہ اسے لمحہ بہ لمحہ کچھ کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے اور  
 کچھ کاموں سے منع کیا جاتا ہے۔ معاشرتی طور پر پسندیدہ کام کرنے سے وہ ایک اچھا فرد اور  
 قواعد کی خلاف ورزی کرنے پر وہ بُرا فرد کہلاتا ہے چونکہ اچھائی اور بُرائی کے نقوش اس کے  
 احساسات پر نقش ہوتے جاتے ہیں اور بالآخر وہ شعوری اور بعض اوقات لاشعوری طور پر قواعد کی  
 پابندی کرتا ہے اور اس طرح اس کی شخصیت کی نشوونما کا عمل مکمل ہوتا ہے۔

اس کے لئے آسانی اسی میں ہے کہ وہ ثقافتی اقدار کو اپنی شخصیت کا حصہ بنا لے۔  
 انسان کی انفرادیت بھی قائم رہتی ہے اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دراصل شخصیت جو بالآخر مرتب  
 ہوتی ہے وہ ثقافت اور اس کی انفرادیت کے مابین عمل ہے اور اس طرح معاشرتی ثقافت یکساں  
 ہونے کے باوجود ہر شخص ایک منفرد شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ معاشرہ بھی اس کی انفرادیت کو  
 تسلیم کرتا ہے۔ بہر صورت انسان کی اپنی شخصیت کی وضع قطع مزلہاس کھانے پینے کے طور طریقے  
 منسلک کے آداب صرف اسی معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں جن کا وہ فرد ہوتا ہے۔

## انسان کی معاشرتی فطرت

اللہ عزوجل نے کائنات اور اس کے اندر لاتعداد چیزیں پیدا کیں لیکن سب سے اعلیٰ  
 شان کو بنایا۔ انسان سب سے زیادہ قیمتی ہے۔ انسان کو قیمتی بنانے کا مطلب ہے کہ اس کے  
 لئے بننے کی استعداد پیدا کر دی۔ اگر یہ اپنی محنت کو اپنی ذات کے اوپر صحیح طرح خرچ کرے تو

انسان اتنا قیمتی بن جاتا ہے کہ فرشتوں سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے۔ اگر یہ اس پاکیزہ طریقے کو سیکھنے کے لئے نکلے جو اللہ عزوجل نے اپنے پیارے رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذریعے امت کو بتایا ہے لیکن ابھی اس طریقے کو اس نے پڑھا نہیں دیکھا نہیں اور اس پہ چلا نہیں صرف سیکھنے کے لئے نکلا ہے تو اس وقت یہ اتنا قیمتی انسان بن جاتا ہے کہ فرشتے اپنی پرواز روک دیجے ہیں اور اس کے آگے اپنے پر بچھا دیجے ہیں اور اگر یہ اس پاکیزہ فطرتی اصولوں کو سیکھ لے تو اہل علم کے لئے فرشتے دعا کرتے ہیں اور پھر یہ اگر سو جائے تو اس کا سونا بھی عبادت بن جاتا ہے۔

### انسان کب بے قیمت بنتا ہے:

اگر انسان نے اپنی محنت کو اپنے علاوہ دنیا کے اندر پھیلی ہوئی دیگر چیزوں کے اوپر خرچ کیا اور یہ اپنے آپ کو نظر انداز کر بیٹھا تو پھر دنیا کے اندر پھیلی ہوئی چیزیں انسان کی نظروں میں قیمتی بن جاتی ہیں اور یہ انسان سب سے زیادہ بے قیمت ہو جاتا ہے بلکہ اللہ عزوجل کی نظروں میں تو یہ جانوروں سے بھی زیادہ بدتر ہو جاتا ہے:

ان هم الا كالانعام بل هم اضل سبيلا. (الفرقان).

”یہ تو محض چوپایوں کی طرح ہیں (کہ وہ بات کو سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں) بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں۔“

اور خود انسان بھی دوسرے انسانوں کی نگاہوں میں گر جاتا ہے تو پھر دنیا میں سب سے زیادہ بے قیمت اگر کوئی مخلوق ہوتی ہے تو وہ انسان ہوتا ہے چنانچہ آج بھی ہے کہ زمین کے ٹکڑوں کے بدلے انسان کو مارا جائے عہدے کے لئے انسان کو مارا جائے پیسے کی خاطر انسان کو مار دیا جائے۔ انسان اتنا بے قیمت بنا کہ زمین کے ٹکڑے سے زیادہ عہدے سے زیادہ اور روپیہ پیسہ سے زیادہ بے قیمت بنا۔ یہ کب بنا؟ جب انسان نے معاشرتی اصولوں کو ترک کر دیا اپنی محنت کو اپنی ذات پر خرچ کرنے کی بجائے دینا کے اندر پھیلی ہوئی چیزوں پر صرف کیا تو انسان بے قیمت بنا۔

### انسان کو قیمتی بنانے کا پاکیزہ طریقہ:

رسول اکرم ﷺ انسان کو قیمتی بنانے کا ایسا پاکیزہ طریقہ لے کر اس دنیا میں تشریف لائے کہ اگر یہ طریقہ کتابوں سے نکل کر انسانوں کے اندر آ جائے اور نقوش میں سے نکل کر نفوس میں آ جائے تو قیامت تک کے زمانے میں جس علاقے میں یا جس زمانے میں یہ محنت ہو گی تو وہاں کے انسانوں کے اندر آپس میں جوڑ ہوگا محبت ہوگی اللہ کی رحمت برے گی انہیں کی رحمت سے برکت لکھی گی آسمانوں سے برکت اترے گی۔

ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اس پاکیزہ طریقے میں طاقت، رحمت اور برکت رکھی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ یہ پاکیزہ طریقہ فطرت زندگیوں کے اندر آ جائے کیونکہ اس میں سب سے کلی چیز جو سارے انبیاء نے بتائی اور رسول پاک ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سکھائی اور انہوں نے یہ بتایا کہ اس پاکیزہ طریقے کو زندہ کرنے کے لئے بنیادی چیز یہ ہے کہ پیغمبر کا پاکیزہ طریقہ زندہ ہو کر عملی زندگی میں آ جائے۔

### انسانی بدن کے صحیح استعمال کا طریقہ:

اگر انسان کا یہ بدن رسول اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے طریقے پر ہر جگہ استعمال ہوا تو اس کے اندر دنیا کا امن و امان چھا ہوا ہے اور پورے عالم کے لئے رحمتیں اور برکتیں پوشیدہ ہیں۔ اس کے اندر قبر کی راحیں چھپی ہوئی ہیں، حشر کے میدان کی سکھتیں اور جنت کی نعمتیں چھپی ہوئی ہیں مگر انسانی بدن کا استعمال صحیح تربیت کے مطابق ہو جائے۔

اور اگر اس انسانی بدن کا استعمال رسول اللہ ﷺ کے طریقے کے مطابق نہ ہوا بلکہ اس کے خلاف ہوا اور اس کے اندر خرابیاں آئیں تو پھر اس بدن کے اندر پوری دنیا کا فتنہ و فساد چھا ہوا ہے اور انتشار اور پریشانی چھپی ہوئی ہے اور قبر کے اندر کے سانپ اور بچھو چھپے ہوئے ہیں۔ پورے عالم کا انتشار اور بد حالی چھپی ہوئی ہے۔

### پاکیزہ انسانی فطرت کے اثرات:

رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے پاکیزہ طریقے اور پاکیزہ فطرت نے دنیا کے اندر امن و امان پیدا کیا اور قیامت تک جب رسول پاک ﷺ کی تربیت کو جس علاقے میں اور جس ملک کے اندر جاری کیا جائے گا وہیں امن و امان ہوگا اور اگر عالمی پیمانے پر اس پاکیزہ معاشرتی نظام اور پاکیزہ تعلیمات کو لاگو کیا گیا تو پورے عالمی پیمانے پر امن و امان ہوگا۔ رسول اکرم ﷺ پوری دنیا کے لئے رحمت بن کر آئے لیکن آپ ﷺ کی رحمت سے اس وقت مستفید ہوا جاسکتا ہے جب آپ ﷺ والا پاکیزہ طریقے پورے عالم کے اندر جاری ہو لیکن اس کے لئے محنت کرنا پڑے گی اور صحابہ کرامؓ کے نقش قدم پر چل کر اس طریقے کو جاری کرنا ہوگا۔

### انسانی معاشرتی فطرت، زندگی کی اکائی:

محمد موسیٰ خان جلال زئی ”اسلامی فلسفہ حیات“ میں لکھتے ہیں:

یہ صحیح ہے کہ عملی سہولت کی خاطر انقلاب انسان کو مختلف شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے لیکن ہر شعبے کو ایک آزاد اور جداگانہ جزیرے کی شکل دے دینا، نہایت مہلک ہے۔ انفرادی، اجتماعی، سیاسی، معاشی اور تمدنی یہ تمام شعبے ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوتے ہیں کہ انہیں

بالکل الگ الگ حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی انسانی زندگی خوشحالی اور کامرانی سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔ اگر یہ ممکن نہیں کہ آپ کا آدھا چہرہ مسکرائے اور باقی نصف پہ مسکراہٹ نہ آئے تو یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ صرف سیاست یا معیشت کی تنظیم سے پوری زندگی سنور جائے اور جس طرح یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص بیک وقت مختلف سمتوں میں چل سکے یا دو مخالف سمتوں میں جانے والی کشتیوں پر سوار ہو اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ انسان کی زندگی کے مختلف شعبوں کو بیک وقت مختلف منزلوں کی طرف سرگرم عمل کیا جاسکے۔

تجربات نے آج کے انسان کو اچھی طرح سکھا دیا ہے کہ اگر وہ اپنی شخصیت کا استحکام اور تمدن کی حقیقی اور صحیح معاشرتی انسان بن کر ترقی چاہتا ہے تو اسے جز و پندہ کی مقابلے میں تہذیبی اور معاشرتی وحدت کی راہ اختیار کرنی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی سب سے بڑی ضرورت ایک ایسا صحت مند نظریہ حیات ہے جو دنیا کو اس انتشار سے نکال دے جس میں وہ گھر گئی ہے۔

انفرادی زندگی کے نصب العین پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی لکھتے ہیں:

”حیات انسانی مقصد کے شعور اور اس کے حصول کی جدوجہد سے عبارت ہے۔ نصب العین وہ معنائے مقصود ہے جس کو حاصل کرنے کی جدوجہد سے ہر کمال واپست ہے۔ انفرادی زندگی کا اعلیٰ نصب العین ایسا انسان بنا ہے جسے اللہ عز و جل کی خوشنودی حاصل ہو۔ اللہ عز و جل کی ربوبیت کا اقرار انسان کے تحت الشعور میں موجود ہے۔“

### نصب العین کا عروج و زوال:

نصب العین کا واضح تصور نصب العین کے لئے تنظیم کی ضرورت کا شعور نظام فکر و عمل کی روح یعنی یقین حصول غایت کی جدوجہد کے دوران پیش آنے والی مزاحمت کے نتیجے میں زندگی کا مقصد اور حصول مقصد میں کامیابی کے یقین اور فضائل اخلاق سے مزین ہو کر مقصد کے قریب تر ہوتے جانا عروج ہے اور غایت کے تصور کے خیر ہو جانے، تنظیم کی احتیاج کے شعور سے ہٹ جانے نظام فکر و عمل کی روح کے فنا ہو جانے اور اختلال انگیز موثرات کے جواب میں قوی کردار کی حفاظت نہ کر سکنے کا نام نصب العین کا زوال ہے۔

### انسانی فطرت کے دو پہلو:

فطرت بالمثل جبلی و ارضیات، طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضوں پر مشتمل ہے۔ جو اپنی تکمیل کسی حدود و قیود کے بغیر چاہتے ہیں اور بالقوہ فطرت فجور و تقویٰ کے اختیار ربوبیت کے اقرار اپنے نفس کی بصیرت اور امانت کی ذمہ داری کے احساس پر مشتمل ہے۔ یہ ایک ایسا استعداد ہے جو نشو و نما نہ پاسکے۔ سو اس کا عدم اور وجود برابر ہو جاتا ہے۔ اس پہلو کو نشو و نما دے

کر اسے ایک زندہ طاقت بنا کر اس کے تحت ہاں فعل فطرت کو منضبط اور منقاد بنانے کے لئے انبیاء کی بعثت ہوتی رہی ہے تاکہ انسان کمال پر فائز ہو سکے۔

انفرادی زندگی کے کمال پر فائز ہونے کی یہ شرط ہے کہ وہ نصب العین بھی ”علم بالوحی“ سے متعین ہو جس کے حصول کی جدوجہد سے فرد کمال انسانی پر فائز ہوگا اور اس نصب العین کے حصول کی رہنمائی بھی ”علم بالوحی“ سے میسر آتی ہے۔ اس سلسلے میں اپنی نسبت قرآن کا دعویٰ ہے: ”یہ تو نصیحت ہے سو جو چاہے اپنے پروردگار تک پہنچنے کا راستہ اختیار کرے۔“

فرمان اللہ عزوجل ہے: ”اور اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو حکمت سے پیدا کیا ہے تاکہ ہر شخص اپنے اعمال کا بدلہ پائے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

انسانی مرہمی بننے کی جدوجہد سے انفرادی زندگی کے فکری ایمانی اور اخلاقی تینوں پہلو اصلاح پذیر ہوں گے۔

فکری پہلو کی اصلاح طلب خاصیت زندگی اور کائنات کو بے مقصد سمجھنا ہے اور اس کی اصلاح پذیری یہ ہے کہ زندگی اور کائنات دونوں کے بارے میں مقصدیت کا یقین راسخ ہو۔

ایمانی پہلو کی اصلاح طلب خاصیت یہ تذبذب ہے کہ حصول مقصد کی جدوجہد میں کامیابی ہوگی یا نہیں؟..... اور اس کی اصلاح پذیری حصول مقصد کی جدوجہد میں کامیابی کی نسبت ایمان بالغیب کا راسخ ہونا ہے کیونکہ جو نتائج ابھی غیب میں ہیں ان ہی کے حاصل ہو کر رہنے کا یقین ایمان بالغیب ہے جو جدوجہد سے پہلے نہ ہو تو جدوجہد نہیں ہو سکتی اس کی اساس کائناتی قوانین کے باہمی ربط میں مضمر ہے۔

اخلاقی پہلو کی اصلاح خاصیت خواہشات کا بے انضباط اور بے انقیاد ہونا ہے اور اس پہلو کی اصلاح پذیری یہ ہے کہ خواہشات ضبط و انقیاد کی پابند ہو جائیں۔

رضائے الہی کے مطابق زندگی کے ذمہ جانے کی شہادت یہ ہے:

1- ایمان باللہ انسان کے فطری داعیات پر غالب ہو جو اسے خواہش کے مقابلہ میں جادہ استقامت سے منحرف نہ ہونے دے۔

2- طبعی خواہشات پر یہ تاریخی تجربہ غالب ہو کہ کامیابی ضبط و انقیاد سے حاصل ہوتی ہے۔

3- نفسیاتی تقاضوں پر یہ شعور غالب ہو کہ ہر کامیابی کے لئے فضائل اخلاق ضروری ہے۔

اگر یہ تینوں شرطیں پوری ہوں تو انسان اللہ عزوجل کے بتائے راستے پر ثابت قدم رہ سکے گا اور اس کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئے گی۔



# اسلامی معاشرت کی خصوصیات

## اجتماعیت و تشکیل معاشرت اور اسوۂ حسنہ

### اجتماعیت کا مفہوم:

اسلام سے قبل الاغلاطونی فکر، نوافلاطونی فلسفہ اور عیسائی تصوف نے مل جل کر انسان پر مذہب، روحانیت اور اخلاق کا انفرادی تصور مسلط کر دیا تھا، یعنی کہ ہر انسان اپنی نجات و سعادت خود فرمائہ طور پر اور دوسرے انسانوں کی فلاح و صلاح سے بے تعلق ہو کر محض رسمی اور ظاہری عبادات، راہبات طرز زندگی اور صوفیانہ خانقاہات کے طریقے سے حاصل کر سکتا ہے جبکہ اسلام نے اس غلط مفروضہ کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا کہ انسانی فلاح و سعادت معاشرے اور اجتماع کی نوعیت پر منحصر ہے۔ اگر معاشرہ بحیثیت نسوی غلط اصولوں اور غیر متصفانہ بنیادوں پر قائم ہو تو کوئی فرد محض اپنی ذاتی کوشش سے فلاح یافتہ نہیں بن سکتا بلکہ ایک فرد کی فلاح و صلاح تمام افراد کی فلاح و صلاح کے ساتھ وابستہ ہے اور افراد کی سعادت کا دارومدار معاشرے کی حسن تنظیم پر منحصر ہے۔ تنہا فرد کوئی حقیقت نہیں رکھتا بلکہ اس کی اصل اہمیت اور معنویت کا سرچشمہ قوم اور ملت ہے۔ ملت ہی کی استواری، مضبوطی، تعمیر و تزئین اور اصلاح و درستگی کے ساتھ اس کی ذاتی ترقی وابستہ ہے۔ خواہ یہ ترقی مادی ہو یا روحانی ہو۔ اسلام کی اخلاقی تعلیم کا تعلق صرف فرد سے نہیں بلکہ جماعت سے ہے اسی کا نام اجتماعیت ہے۔

### معاشرت کا مفہوم:

معاشرے سے مراد وہ انسانی اجتماع ہے جو کسی خاص عقیدے اور مسلک پر قائم ہو اور اس کا فکری و عملی نظام ایک خاص اسلوب پر ہو یہی وجہ ہے کہ افراد کے ایسے گروہ کو جو بلا مقصد و ارادہ کسی جگہ جمع ہو جائے معاشرہ نہیں کہا جاسکتا۔

### اجتماعیت و معاشرت کی اہمیت:

انسان اپنی تمام ضروریات اکیلا مہیا نہیں کر سکتا وہ اس کے لئے دوسروں کے تعاون کا محتاج ہے۔ جتنا زیادہ انسانی ضروریات میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اسی تناسب سے علوم و فنون میں ترقی ہوتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ معاشرتی نظم میں بھی وسعت آ جاتی ہے۔ جس

اسلام اور جدید افکار  
قدر معاشرتی اکائی منظم اور وسیع۔۔۔ جس کی قدر سمجھتیں بھی وافر میسر ہوں گی۔ اس طرح کتبہ سے  
قبائل، گاؤں اور قوموں کی صورت میں زندگی منظم ہو جاتی ہے پھر قصابات اور شہروں کے باہمی  
اتحاد اور رابطہ سے ریاست تشکیل پاتی ہے جس میں رہنے والے لوگ قوم قرار پاتے ہیں جو اپنے  
خصوصی امتیازات کے باعث دوسری اقوام سے ممتاز ہو سکتے ہیں۔

### اجتماعیت و معاشرت کے ارتقائی مراحل:

معاشرہ کی تشکیل کے پس پشت دو اساسی مقاصد کارفرما ہوتے ہیں:

1- ضروریات زندگی کی فراہمی لوگوں کو ایک دوسرے کے اشتراک و تعاون پر مجبور کرتی ہے  
کیونکہ تنہا کوئی فرد بھی اپنی تمام ضروریات کی تکمیل نہیں کر سکتا اور نہ ہی اسے جان و مال  
کا تحفظ حاصل ہو سکتا ہے۔

2- دوسرا محرک جذبہ بقائے نسل انسانی ہے اور اس کے لئے کتبہ خاندان، نسل پرکشت اور  
قربت داری اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

معاشرہ کا ارتقاء بتدریج ترقی اور زیادہ منظم زندگی کی طرف ہوتا چلا جاتا ہے چونکہ فرد کی  
ضروریات ایک کتبہ کے اندر پوری نہیں ہو سکتیں اس لئے وہ دوسرے افراد کی طرف دست تعاون  
بڑھاتا ہے اس سے معاشرے میں مختلف فنون اور پیشوں کی نشوونما ہوتی ہے اور معاشرہ بڑے  
اجتماع کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح مختلف پیشوں اور دست کاریوں کو اہمیت حاصل ہو  
جاتی ہے اور جوں جوں صنعت و حرفت اور زراعت میں ترقی ہوتی جاتی ہے معاشرہ شہری زندگی  
میں منظم ہوتا جاتا ہے۔ اس سے شہر وجود میں آتے ہیں اور معاشرتی تنظیم وسیع بنیادوں پر استوار  
ہو جاتی ہے۔

### انسانی شخصیت کی نشوونما میں اجتماعیت کا کردار:

ہر انسانی معاشرہ ہزاروں لاکھوں کروڑوں افراد سے مل کر بنتا ہے۔ اس مرکب کا ہر فرد  
ذی روح، ذی عقل اور ذی شعور ہے۔ ہر فرد اپنی ایک مستقل شخصیت رکھتا ہے جسے بھلنے پھولنے  
اور نشوونما پانے کے لئے مواقع درکار ہیں تاہم ہر فرد کا اپنا ایک ذاتی ذوق ہے اس کے اپنے فہم  
کی کچھ رغبتیں اور خواہشات ہیں۔ اس کے اپنے جسم اور روح کی کچھ ضروریات ہیں۔ ان افراد  
کی حیثیت کہ عین کے بے روح ہڈیوں کی نہیں ہے کہ اصل چیز مشین ہو اور یہ ہڈیوں کے  
مشین ہونے کے لئے مطلوب ہوں اور ہڈیوں کی اپنی کوئی شخصیت نہ ہو بلکہ اس کے برعکس انسانی  
نرہ جیتے جاگتے انسانوں کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ افراد اس مجموعے کے لئے نہیں ہیں بلکہ مجموعہ  
ان افراد کے لئے ہے اور افراد جمع ہو کر یہ مجموعہ بناتے ہی اس مقصد کے لئے ہیں کہ ایک  
دوسرے کی مدد سے انہیں اپنی ضروریات حاصل کرنے اور اپنے فہم و جسم کے مطالبات اور

تقاضے پورے کرنے کے مواقع ملیں۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ تمام افراد فرداً فرداً اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہیں۔ ہر فرد کو اس دنیا میں ایک خاص امتحانی مدت گزار کر اپنے خدا تعالیٰ کے حضور جا کر حساب دینا ہے کہ جو قوتیں اور صلاحیتیں اسے دنیا میں دی گئی تھیں ان سے کام لے کر وہ اپنی کیا شخصیت بنا کر لایا ہے یہ ہر انسان کی انفرادی جوابدہی ہوگی اجتماعی نہیں۔

### اجتماعیت اور معاشرت کیلئے اداروں کی ضرورت و اہمیت:

معاشرہ جو کنبوں، قبیلوں، قوموں اور پوری انسانیت کی شکل میں علی الترتیب قائم ہوتا ہے اس کی ابتداء ایک مرد اور ایک عورت سے ہوئی ہے جس سے پھر خاندان بنتا ہے۔ ان خاندانوں سے قبیلے اور برادریاں بنتی ہیں۔ ان سے ایک قوم وجود میں آتی ہے اور قوم اپنے اجتماعی اداروں کی تحفید کے لئے ایک ریاست کا نظام بناتی ہے اور ریاست کو چلانے کے لئے مختلف ادارے تشکیل دیئے جاتے ہیں۔ ریاست میں قائم کردہ مختلف اجتماعی ادارے اصلاً جس غرض کے لئے مطلوب ہیں وہ یہ ہے کہ ان کی مدد سے فرد کو اپنی شخصیت کی تکمیل کے لئے وہ مواقع نصیب ہو سکیں جو وہ تنہا اپنے بل بوتے پر حاصل نہیں کر سکتا لیکن اس بنیادی مقصد کے حصول کے لئے ان میں سے ہر ایک ادارے کو افراد بر اور بڑے ادارے کو چھوٹے اداروں پر اقتدار حاصل ہو تاکہ وہ افراد کی ایسی آزادی کو روک سکیں جو دوسروں پر دست اندازی کی حد تک پہنچتی ہو اور افراد وہ خدمت لے سکیں جو مجموعی حیثیت سے معاشرہ کے تمام افراد کی فلاح و ترقی کے لئے مطلوب ہو۔

اجتماعیت کے لئے قائم کردہ اداروں کی تشکیل میں دو بنیادی باتوں کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے کہ ایک طرف ہر قوم اور ریاست کی آزادی و خود مختاری کا برقرار رہنا بھی ضروری ہے اور دوسری طرف کسی بالاتر قوت ضابطہ کا ہونا بھی ضروری ہے کہ یہ قومیں اور ریاستیں حد سے تجاوز نہ کر سکیں۔

www.kitabosunnat.com

## اسلامی معاشرتی اقدار

رسول اکرم ﷺ کی تبلیغ سرگرمیوں میں جس چیز پہنچے لوگوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ آپ ﷺ کا تشکیل حسن معاشرت ہے۔ قرآن حکیم نے بھی آپ ﷺ کی اس مفت کو آپ ﷺ کی کامیابی اور ہر راجہ یزی کا سبب قرار دیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فطاً غليظ القلب لا نفصوا من حولك

(آل عمران)



”اللہ کی مہربانی سے آپ ﷺ لوگوں کے لئے نرم ہو گئے ہیں اور اگر آپ ﷺ ترش روخت دل ہوتے تو سب لوگ آپ ﷺ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔“

یہاں آپ ﷺ کے حسن معاشرت کی تفصیل کے چند خاص ذکر کئے جاتے ہیں:

### 1- خیر خواہی:

آپ ﷺ کے دل میں ہمیشہ دوسروں کی خیر خواہی کے جذبات موجزن رہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

”میرے سامنے دوسروں کی ایسی باتیں نہ کیا کرو جنہیں سن کر میرے دل میں ان کے متعلق کوئی کدورت پیدا ہو کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ میں سب سے عاقل و لی سے ملوں۔“

آپ ﷺ فرماتے تھے:

”اخلاق کی بلندی یہ نہیں کہ تم اس کے ساتھ نیکی کرو جو تمہارے ساتھ نیکی کرے اور اس کے ساتھ بُرائی سے پیش آؤ جو تمہارے ساتھ بُرا سلوک کرے بلکہ صحیح اخلاق یہ ہے کہ ہر شخص کے ساتھ نیک سلوک کرو خواہ وہ تم سے بُرے طریقے سے ہی پیش آئے یا تم پر زیادتی ہی کرے۔“

آپ ﷺ یہ چاہتے تھے کہ اخوت، محبت، ہمدردی اور خیر خواہی کا یہ جذبہ پورے معاشرے میں رواں دواں ہو۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

”تم اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک دوسروں کے لئے بھی وہی پسند نہ کرنے لگو جو خود اپنے لئے کرتے ہو۔“

### 2- دوسروں کے متعلق حسن ظن:

آپ ﷺ ہمیشہ دوسروں کے متعلق حسن ظن رکھتے تھے۔

آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”حسن ظن اچھی عبادت ہے۔“

اس کے ساتھ ہی آپ ﷺ کا یہ فرمان تھا کہ ”ان مواقع سے بچو جن سے دوسروں کو بدگمانی کا موقع مل سکتا ہے۔“

اسی بناء پر عورت کو تنہا سفر کرنے یا کسی اجنبی مرد کے ساتھ تہائی میں بیٹھنے سے روکتے تھے۔ آپ ﷺ خود بھی ایسے مواقع سے بچتے تھے۔

ایک مرتبہ شام کے بعد آپ ﷺ حالت اعتکاف میں مسجد کے باہر اپنی زوجہ محترمہ سے معروف گفتگو تھے کہ وہاں سے دو صحابہ تیز قدم اٹھاتے گزرے۔ آپ ﷺ نے انہیں آواز

دے کر فرمایا: ٹھہر جاؤ! یہ میرے ساتھ میری بیوی سفید ہے۔ بھوں نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ ﷺ کے متعلق بھی کسی کو بدگمانی ہو سکتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: شیطان انسان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے، کیا خبر وہ تمہیں میرے متعلق بدگمانی میں مبتلا کر دے۔

### 3- چشم پوشی:

آپ ﷺ کسی کے خفیہ حالات کا متنبہ نہیں کرتے تھے اور دوسروں کو بھی یہی حکم دیتے تھے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

”جو کوئی کسی مسلمان کے عیب کو دیکھ کر چشم پوشی کرتا ہے وہ گویا کسی زندہ دفن کی جانے والی بچی کو زندگی بخشتا ہے۔“

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

”جو کسی مسلمان کے عیب سے چشم پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔“

### 4- حلم و بردباری:

آپ ﷺ کی حلم و بردباری کی کوئی حد نہیں ہوتی تھی حضرت عائشہ فرماتی ہیں:

”آپ ﷺ نے زندگی بھر اپنے اوپر کی گئی کسی زیادتی کا بدلہ نہیں لیا الا یہ کہ خدائی حرمت کو پامال کیا گیا ہو پھر اس صورت میں آپ ﷺ سختی سے مواخذہ کرتے تھے۔“

آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”طاقتور وہ نہیں جو کسی کو پچھاڑ دے بلکہ اصل طاقتور وہ ہے جو غصے کے وقت خود پر قابو رکھے۔“

ایک مرتبہ ایک بدو آیا اور بیچے سے آپ ﷺ کی چادر کو پکڑ لیا اور اس زور سے جھٹکا دیا کہ گردن مبارک پر نشان پڑ گیا۔ آپ ﷺ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے نہایت درشتی سے کہا: ”میرے اونٹوں پر مال لاؤ دے کیونکہ یہ مال تیرا ہے نہ میرے باپ کا۔“ آپ ﷺ نے نہ صرف یہ کہ اس کی بدتمیزی معاف کر دی بلکہ اس کے ایک اونٹ پر جو اور دوسرے پر چھوڑ لی لاؤنے کا حکم دیا۔

### 5- غصہ و درگزر:

آپ ﷺ کا غصہ و کرم بے مثال تھا۔ آپ ﷺ نے کئی بار اپنے قتل کے لئے آنے والوں کو معاف کر دیا۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے اپنے خون کے پیاسے دشمنوں کو معاف کر دیا۔ مدینہ منورہ میں منافقین نے آپ ﷺ کے خلاف ہر طرح سے سازشیں کیں لیکن آپ

ﷺ نے ان سے بھی انتقام نہیں لیا بلکہ انہیں عبداللہ بن ابی کو اس کے مرنے کے بعد اپنی نہیں پہنائی۔

## 6- عہد کی پابندی:

آنحضرت ﷺ کو وعدے کا اس قدر پاس ہونا کہ شفقت اور تکلیف برداشت کر کے بھی وعدہ پورا فرماتے۔

عبداللہ بن ابی الحناء فرماتے ہیں کہ میں نے بشت سے پہلے ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ سے ایک معاہدہ کیا میرے ذمہ کچھ دینا باقی تھا میں نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ آپ ﷺ یہیں ٹھہریں میں ابھی لے کر آتا ہوں۔ اتفاق سے گھر جانے کے بعد اپنا وعدہ بھول گیا۔ تین روز کے بعد یاد آیا اور فوراً وعدے کی جگہ پر پہنچا۔ آپ ﷺ کو اس مقام پر منتظر پایا۔ آپ ﷺ نے صرف اتنا فرمایا: عبداللہ تم نے مجھے تکلیف دی۔ تین روز سے اسی جگہ تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔

صلح حدیبیہ کا معاہدہ طے پا جانے کے بعد ابو جہل صحابی زنجیروں میں بکڑے ہوئے دروناک اور قائل رحم حالت میں اہل مکہ کی قید سے بھاگ کر حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے۔ معاہدے میں ایک شرط یہ تھی کہ جو شخص مکہ سے مدینہ جائے گا وہ اہل مکہ کے مقابلہ پر واپس کر دیا جائے گا۔ حضور ﷺ نے ابو جہل کو میر کی تلقین کی۔ انہیں واپس کر دیا اور فرمایا: ہم بدعہدی نہیں کریں گے۔

## 7- صدق:

صدق کا مطلب ہے قول اور فعل کا باہم مطابق ہونا۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے:

قُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ (الاحزاب)

”درست بات کہا کرو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی اصلاح فرمائے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمائے گا۔“

رسول اکرم ﷺ میں صدق کا وصف اس قدر نمایاں تھا کہ عدالت اور اختلاف کے باوجود آپ ﷺ کے دشمن بھی آپ ﷺ کو صادق اور امین کہہ کر بکارتے تھے۔ ابو جہل کہا کرتا تھا: ”اے محمد ﷺ! میں تمہیں جھوٹا نہیں کہتا مگر جو کچھ تم کہتے ہو اس کو تسلیم نہیں کرتا۔“

قیصر روم کے دربار میں ابوسفیان نے اعتراف کیا کہ محمد (ﷺ) نے عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

## 8- امانت و دیانت:

آج کے لیکن دین کے معاملات میں دیانت و امانت کی ضرورت ایک مسلمہ صحیفہ ہے جس معاشرے سے امانت اور دیانت ختم ہو جائے اسے بدترین معاشرہ تصور کیا جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے امانت کو ایمان کے برابر قرار دیتے ہوئے فرمایا:

لا ايمان لمن لا عهد له

”جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں۔“

ایک روایت میں حضور ﷺ نے امانت میں خیانت کو نفاق کی علامت قرار دیا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کو بعثت سے قبل ہی اہل مکہ کی جانب سے ”امین“ کا خطاب مل چکا تھا کیونکہ آپ ﷺ اپنے کاروبار اور معاملات میں انتہائی دیانت دار تھے۔ لوگ آپ ﷺ کے پاس امانتیں رکھتے تو آپ ﷺ جوں کی توں لوٹا دیتے۔ ہجرت مدینہ کے موقع پر آپ ﷺ نے ان لوگوں کی امانتیں لوٹانے کا اہتمام فرمایا جو آپ ﷺ کے قتل کے ورپے تھے۔

## 9- حسن اخلاق:

رسول اکرم ﷺ کے اخلاق کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

انك لعلى خلق عظيم

”بے شک آپ ﷺ اخلاق کی عظمتوں پر قائم ہیں۔“

خود آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”میں اس لئے مبعوث کیا گیا ہوں تاکہ اخلاق کی خوبیوں کو عمل کروں۔“

حضرت خدیجہ کی شہادت آپ ﷺ کے اخلاق کے متعلق یہ تھی کہ:

”خدا کی قسم! خدا آپ ﷺ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا کیونکہ آپ ﷺ صلہ رحمی کرتے

ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، غریبوں کی مدد کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، حق

کی حمایت کرتے ہیں اور مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔“

حضرت علیؓ نے خلق محمدی ﷺ کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

”آپ ﷺ خندہ جبین، نرم خو اور مہربان تھے۔ سخت عراج اور تنگ دلی نہ تھے۔ کسی کی

عیب جوئی نہیں کرتے تھے۔ نہایت راست گو اور خوش مجلس تھے۔“

## 10- عادات و اطوار:

آپ ﷺ کا چہرہ ہر وقت گفت اور کھلا رہتا تھا۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملنے

تھے۔ سلام میں سبقت فرماتے پہلے مصافحہ کرتے لوگوں کی ناگوار باتوں کو بھی برداشت فرماتے اور اظہار نہ کرتے۔ حضرت زینبؓ سے نکاح کے ولیمہ میں لوگ کھانا کھا کر بھی کتنی دیر تک پیٹھیں رپے حالانکہ آپ ﷺ چاہتے تھے کہ لوگ اٹھ جائیں لیکن اظہار نہ فرمایا۔ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

”خدا کے نزدیک سب سے زیادہ مفض ہے جس کی بدزبانی کی وجہ سے لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیں۔ کسی کی کوئی بات بُھرا معلوم ہوتی تو نام لے کر اس کا ذکر نہیں کرتے تھے بلکہ اس طرح ذکر کرتے کہ لوگ ایسا کہتے ہیں یا بعض لوگوں کی یہ عادت ہے تاکہ اس کی ذلت نہ ہو۔“

## 11۔ عدل و انصاف:

رسول اللہ ﷺ کو ستائشوں قبائل سے واسطہ پڑتا تھا۔ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے اس لئے ان کے درمیان عدل کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ اگر کسی ایک قبیلے کے حق میں فیصلہ کیا جاتا تو دوسرا دشمن بن جاتا۔ آپ ﷺ تالیفِ قلوب سے کام لیتے تھے لیکن اس صورت میں بھی عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ جاتا۔

خاندانِ محرم کی ایک عورت نے چوری کی خاندانی وقار کی بناء پر لوگ چاہتے تھے کہ سزا نہ ہو۔ انہوں نے اسامہ بن زیدؓ کو سفارش کے لئے آپ ﷺ کے پاس بھیجا۔ آپ ﷺ نے غضبناک ہو کر فرمایا کہ ”تم سے پہلی امتیں محض اسی لئے ہلاک ہوئیں کہ وہ غریبوں کو سزا دیا کرتی تھیں اور امیروں سے درگزر کرتی تھیں۔“

## 12۔ ایثار و ہمدردی:

آپ ﷺ کے حسن معاشرت میں ایثار کا وصف بہت نمایاں تھا۔ ایک دفعہ ایک عورت نے چادر لاکر پیش کی۔ آپ ﷺ کو ضرورت تھی۔ آپ ﷺ نے لے لی۔ ایک صحابی نے چادر کی تعریف کی تو آپ ﷺ نے چادر اتار کر انہیں دے دی۔

ایک صحابی نے شادی کی لیکن ولیمہ کے لئے کچھ نہ تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عائشہؓ کے پاس جاؤ اور آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ۔ وہ مانگ لائے حالانکہ آپ ﷺ کے گھر میں اس وقت اس کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

اسی طرح ایک مرتبہ ایک غفاری آپ ﷺ کے ہاں مہمانِ ٹھہرا۔ رات کو کھانے میں صرف بکری کا دودھ تھا وہ اسے دے دیا اور سب گھردالوں نے اس سے پہلی رات کی طرح یہ رات بھی قافہ میں گزاری۔

## 13- مہمان نوازی:

عرب میں مختلف اطراف سے لوگ جوق در جوق آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ زیادہ تر ان کی مہمانی آپ ﷺ خود ہی کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کے ہاں ضیافت میں مومن و کافر کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ ایک دفعہ آپ ﷺ کے ہاں ایک کافر مہمان ٹھہرا اس نے سات بکریوں کا دودھ پیا اور جب تک وہ سیر نہ ہو گیا آپ ﷺ پلاٹے رہے۔ آپ ﷺ اپنے مہمانوں کی خبر گیری راتوں کو اٹھ اٹھ کر کیا کرتے تھے۔ صحابہ میں سے سب سے مفلس گروہ اصحاب صفہ کا تھا۔ ان کو بھی زیادہ تر آپ ﷺ ہی کے مہمان ہونے کا شرف حاصل ہوتا۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں بھوک کی شدت کی بناء پر ایک مرتبہ عام گزرگاہ پر بیٹھ گیا۔ حضرت ابو بکرؓ کا گزر ہوا۔ میں نے حسن طلب کے طور پر قرآن کی ایک آیت پڑھی لیکن وہ بتا کر چلے گئے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ بھی گزر گئے۔ اس کے بعد آپ ﷺ کا گزر ہوا اور آپ ﷺ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا: میرے ساتھ گھر آؤ۔ گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ کوئی ہدیہ کے طور پر دودھ کا ایک پیالہ دے گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: سب اصحاب صفہ کو بلاؤ۔ میں بلا لایا تو آپ ﷺ نے مجھے دودھ کا پیالہ دیا اور کہا کہ سب کو پہلے پلاؤ پھر خود پوچھا نہ میں نے ایسا ہی کیا۔

## 14- شرم و حیاء:

رسول اکرم ﷺ دو چیزہ لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلے تھے۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی کے ساتھ بدزبانی نہیں کی اور عجم کے علاوہ کبھی فقہہ نہیں لگایا۔ عرب میں لوگ شرم و حیاء سے عاری تھے۔ ننگے نہانا عام بات تھی اور خانہ کعبہ کا طواف ننگے ہو کر کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے ان سب چیزوں سے منع فرما دیا۔ ایک دفعہ کچھ عورتیں حضرت ام سلمہؓ کے پاس آئیں اور حمام میں نہانے کا تذکرہ چل نکلا۔ ام سلمہؓ نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”جو عورت اپنے گھر کے سوا کسی اور گھر میں کپڑے نہیں اتارتی، خدا اس کی پردہ دری کرتا ہے۔“

لوگ جب رفع حاجت کے لئے جاتے تو پردہ نہیں کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

”اس سے خدا تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔“ آپ ﷺ رفع حاجت کے لئے اتنی دور نکل جاتے کہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔

## 15- شجاعت و بہادری:

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اکرم ﷺ سب سے زیادہ شجاع تھے۔ ایک دفعہ مدینہ

میں مشہور ہوا کہ دشمن آگئے۔ لوگ مقابلے کے لئے تیار ہو گئے لیکن جب باہر نکلے تو آپ ﷺ کو گھوڑے کی تنگی پشت پر سوار واپس آتے دیکھا۔ آپ ﷺ نے تمام خطرات والے مقامات کا گشت لگایا تھا اور واپس آ کر لوگوں کو تسلی دی کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔

”غزوہ حنین میں بنو ہوازن نے تیروں کی بوچھاڑ کر دی تھی جس سے مسلمانوں کی کثیر تعداد میدان چھوڑ گئی تھی لیکن آپ ﷺ اپنے چند جاٹاروں کے ساتھ میدان میں ڈٹے رہے۔ دشمنوں کی تمام فوج کا نشانہ صرف آپ ﷺ کی ذات تھی لیکن آپ ﷺ کے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی۔“

حضرت براہ بیان کرتے ہیں کہ سب سے بہادر وہ شمار ہوتا تھا جو میدان جنگ میں آپ ﷺ کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا۔

## 16- خدمت خلق:

بلا معاوضہ نیک نیتی سے مخلوق خدا کی خدمت کرنے کو ”خدمت خلق“ کہا جاتا ہے جیسے آپ بھوکے پیاسے اور محتاج لوگوں کو کھانا کھلا دیں، پانی پلا دیں، کپڑا پہنا دیں، ان کی تکلیفیں دور کر دیں۔ ضرورت مندوں کا بازار سے سودا لا دیں۔ کسی کے ساتھ چل پھر کر اس کا کام کرا دیں۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہو جائیں۔

## خدمت کی اہمیت و فضیلت:

خدمت خلق کرنے والوں سے اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوتا ہے دنیا میں ان کی بڑی قدر ہوتی ہے اور شریعت میں بھی ان کو بہت سراہا گیا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

المسلم اخو المسلم لا يظلمه ولا يسلّمه من كان في حاجة أخيه كان الله في حاجته ومن فرج عن مسلم كربة من كربة يوم القيامة ومن ستر مسلماً ستره الله يوم القيامة (بخاری)

”مسلمان“ مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرے نہ اسے ظالم کے حوالے کرے۔ جو اپنے (مسلمان) بھائی کے کام میں لگا رہے گا اللہ تعالیٰ اس کے کام میں لگا رہے گا۔ جو کسی مسلمان کی بے چینی دور کرنے کا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی بے چینی ختم کر دے گا اور جو مسلمان کسی مسلمان کی عیب پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی قیامت کے دن عیب پوشی فرمائے گا۔“

اسی مضمون کو رسول کریم ﷺ نے ایک اور روایت میں اس انداز سے واضح کیا:

من نفس عن مسلم كربة من كربة الدنيا نفس الله عنه كربة من كربة يوم

القیامۃ ومن یسر علی معسر فی الدنیا یسر اللہ علیہ فی الدنیا و الآخرۃ واللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیه (مسلم ابوداؤد)

”جو مسلمان کسی مسلمان سے دنیا کی پریشانی دور کرے گا اس کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ اس کی آخرت کی پریشانی ختم کر دے گا اور جو دنیا میں تنگ دست مسلمان پر آسانی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لئے دنیا و آخرت میں آسانیاں کر دے گا اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ دونوں جہانوں میں اس کی پردہ پوشی کرے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی اعانت میں رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد اور خدمت میں مصروف رہتا ہے۔“

ایک مقام پر آپ ﷺ نے فرمایا:

ان لله خلقا خلقهم لحوایج الناس یفزع الناس الیهم فی حوائجهم اولئک آمنون من عذاب الله (طبرانی)

”یقیناً اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کو ضروریات انسانی کے لئے پیدا کیا ہے کہ ضرورت کے وقت عام لوگ اپنی ضروریات ان کے سامنے پیش کریں ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بے خوف رہیں گے اور امن کی زندگی بسر کریں گے۔“

نیز فرمایا:

ان لله عند القوام نعماً اقرها عندهم كانوا فی حوائج المسلمین ما لم یملوا فاذا ملوهم نقلها الی غیرهم (طبرانی، ترمذی)

”بہت سی قوموں کو اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی نعمتیں اس لئے عطا فرمائی ہیں کہ وہ لوگوں کی خدمت کریں اور ان کی ضرورتیں پوری کریں یہ کام خوشی سے انجام دیتے رہیں اور اس سے مت آکٹائیں اور جب وہ لوگ خدمت خلق سے تنگ دل ہو کر آکٹ جائیں گے تو اللہ تعالیٰ بھی ان نعمتوں کو ان سے چھین کر دوسروں کے حوالے کر دے گا۔“

اور فرمایا:

”جو مسلمان اپنے بھائی کی حاجت روائی میں لگ جائے یہاں تک کہ اس کی ضرورت پوری کر دے اگر صبح کے وقت اس کے لئے جائے تو اللہ تعالیٰ پچھتر ہزار فرشتوں سے اس پر سایہ کراتا ہے۔ یہ فرشتے شام تک اس کے حق میں دعائیں کرتے رہتے ہیں اور اگر شام کے وقت جائے تو یہ فرشتے صبح تک اسی طرح دعائیں کرتے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر قدم پر ایک گناہ معاف کرتا ہے اور ایک درجہ بلند کرتا ہے۔“ (ابن حبان، ترمذی)

ایک روایت میں ہے کہ ”جو شخص اپنے بھائی کے کام میں مدد کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے قدموں کو اس دن ٹاہت رکھے گا جس دن سب کے قدم پھسل جائیں گے۔“ (ترمذی)



## خدمت خلق کا ثواب:

ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ کسی غزوہ سے واپس آئے تو ایک ساتھی کی بڑی تعریفیں کرنے لگے۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے، راستہ میں برابر قرآن مجید پڑھتا رہا، چاہا کہیں راستے میں لوگوں نے قیام کیا وہ وہیں کثرت سے نفل پڑھتا رہا۔ ایسا نیک شخص ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس کے سامان کی دیکھ بھال کون کرتا تھا اور اس کی سواری کو چارہ کون کھلاتا تھا؟ صحابہؓ نے عرض کیا: ہم نے اس کے سامان کی نگرانی کی اور ہم نے اس کی سواری کو چارہ دیا تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: تم اس سے بہت اچھے ہو کیونکہ تم نے خدمت خلق کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔“ (مراہیل ابوزاؤد ترغیب)

اگر کوئی انسان آج دوسرے کی مدد کرے گا تو کل جب اس کو دوسروں کی مدد کی ضرورت پڑے گی تو اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت پوری کرنے کا سامان کر دے گا اس لئے ہر انسان کا فرض ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کی خندہ پیشانی سے مدد کرے۔

## نصیحت

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (آل عمران)

”تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو لوگوں کو نیکیوں کا حکم دیتی رہے اور بھلائیوں کی طرف بلاتی رہے اور بُری باتوں سے منع کرتی رہے اور اچھے لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔“

یعنی کچھ لوگ ایسے کام کے لئے مستعد اور آمادہ رہیں کہ جو لوگوں کو وعظ و نصیحت سنا رہے ہیں اور نیکیوں کا حکم دیتے رہیں اور بُری باتوں سے روکے رہیں تاکہ دنیا میں امن و امان قائم رہے اور فتنہ و فساد پیدا نہ ہو۔ خدا کی نافرمانی سے عذاب آتا ہے اور فتنہ و فساد پیدا ہوتا ہے جبکہ نیکی اور اطاعت سے امن و امان رہتا ہے۔

## نصیحت کی اہمیت و فضیلت:

عقلی اور عقلی حیثیت سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات سے اور بہت سی احادیث سے اس کی فضیلت واضح ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وذكر فان الذكرى تنفع المؤمنين (الذاریات)

”اے نبی! آپ لوگوں کو دعا دے کہ کبھی نہ کہ کبھی نصیحت ایمان والوں کو نفع پہنچاتی ہے۔“

حضور لوگ اس سے فائدہ اٹھا کر عمل صالح کرتے ہیں اور برائی سے باز رہتے ہیں۔  
جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

كنتم خير امة اخرجت للناس تعلمون بالمعروف و تنهون عن المنكر و تؤمنون بالله (آل عمران)

”تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کئے گئے ہو تم نیک باتوں کا حکم کرتے ہو اور بُری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“

یعنی تم تمام امتوں میں سب سے افضل ہو اس لئے کہ تم میں یہ تین خوبیاں پائی جاتی ہیں: (1) تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ (2) لوگوں کو بُری باتوں سے روکتے ہو۔ (3) نیکوں کا حکم دیتے ہو۔

جن لوگوں میں یہ تین خوبیاں پائی جائیں گی وہ بھی نقصان نہیں اٹھا سکتے بلکہ ہمیشہ فائدے میں رہیں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

والصبر ان الانسان لفي خسر الا الذين آمنوا و عملوا الصالحات و اوصوا بالحق و تواصوا بالصبر۔ (سورۃ الصبر)

”صبر کی قسم! بے شک انسان سرِ اسرِ نقصان میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے اور جنہوں نے آپس میں حق کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔“

یعنی ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے کی نصیحت کرنے والے اور بُری باتوں سے روکنے والے بھی خسارے میں نہیں رہیں گے بلکہ ایسے لوگوں کے لئے دنیا و آخرت میں بڑے بڑے درجے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ومن احسن قولا ممن دعا الى الله و عمل صالحا و قال اننى من المسلمين (حم السجۃ)

”اور اس سے اچھی بات والا کون ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف بلائے اور نیک کام کرے اور کہے کہ یقیناً میں مسلمانوں میں سے ہوں۔“

رسول اکرم ﷺ نے اسرِ المعروف و نعی من الشکر کی اہمیت ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

من من فی الاسلام منۃ حسنة فله اجرها و اجر من عمل بها من بعده من غیر

ان ینقص من اجورهم شیئ ومن سن فی الاسلام سلة سینه کان علیہ وزرہا ووزر من عمل بها من غیر ان ینقص من اوزارہم شیئ (صحیح مسلم)

”جو اسلام میں کوئی اچھا کام کرے تو اس کو بھی ثواب ملتا ہے اور اس پر عمل کرنے والے کو بھی ثواب ملتا ہے اور ان کے ثوابوں میں کمی بھی نہیں ہوگی۔ اسی طرح گناہ کا کام ایجاد کرنے والے کو گناہ ملتا ہے اور اس پر عمل کرنے والوں کا گناہ بھی اسی کو ہوتا ہے اور عمل کرنے والے کے گناہ میں بھی کمی نہیں ہوگی۔“

اس حدیث سے ثابت ہے ہوا کہ بھلائی کی دعوت دینے والے اچھے اور کامیاب لوگ ہیں اور ان کی نیکیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ عذابوں اور آفتوں کو دور فرما دیتا ہے اور جب اسے چھوڑ دیا جاتا ہے تو انسان مسیتوں میں گھر جاتا ہے۔

حضرت نعمان بن بشیرؓ سے مروی ہے کہ سمجھانے کے لئے آپ ﷺ نے نہایت عمدہ مثال بیان فرمائی ہے جو کہ بخاری شریف میں اس طرح منقولی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

”جو شخص اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود پر قائم رہے آگے نہ بڑھے اور جو ان میں گھس گیا (وہ گناہوں میں پڑ گیا) دونوں کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جنہوں نے جہاز میں قرعہ ڈال کر جگہ بانٹ لی تھی اور ہر کدو درجہ لیا کسی نے نیچے کا۔ اب جو لوگ نیچے کے درجے میں رہے وہ پانی کے لئے اوپر کے درجے والوں پر سے گزرے پھر کہنے لگے چلو ہم نیچے ہی اپنے درجے میں ایک سوراخ کر لیں تو اس طرح بار بار آئے سے اوپر والوں کو تکلیف نہ ہوگی۔ اگر اوپر والے ان کو اس طرح چھوڑ دیں اور ایسا کرنے دیں تو سب ڈوب کر تباہ ہو جائیں گے۔ اگر ان کو اس حرکت سے روکیں گے تو اب بھی بچیں گے اور دوسرے بھی بچ جائیں گے۔“

حدیث کا مطلب : مناف اور واضح ہے کہ اگر نافرمانوں کو نافرمانی سے روکا جائے تو بھی آفت سے بچ جائیں گے ورنہ سب پر آفت آئے گی۔ پہلے زمانے میں بہت سے لوگوں کو صرف اسی بناء پر ملعون قرار دیا گیا کہ وہ نہ تو نافرمانوں کو برائیوں سے روکتے تھے اور نہ ہی بھلائی کا حکم دیتے تھے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علی لسیان داؤد و عیسیٰ ابن مریم ذالک بما عصوا و کانوا یعتدون کانوا لا یتناہون عن منکر فعلوہ لبس ما کانوا یفعلون (البقرہ)

”بنی اسرائیل کے کافروں پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان پر لعنت کی گئی اس بناء پر کہ وہ نافرمانیاں کرتے تھے اور حد سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ آپس میں ایک دوسرے کو بُرے کاموں سے روکتے نہ تھے جس کو بھی یہ کرتے تھے یقیناً بہت بُرا تھا۔“

مسند احمد کی ایک روایت میں اس کی وضاحت اس طرح مروی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”بنی اسرائیل میں پہلے پہل جب گناہ گاریاں شروع ہوئیں تو ان کے علماء نے ان کو روکا لیکن جب دیکھا کہ باز نہیں آتے تو انہوں نے انہیں الگ نہیں کیا بلکہ انہی کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کے دل پھیر دیئے اور حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ان پر لعنت نازل فرمائی گئی کیونکہ وہ نافرمان اور ظالم تھے۔ اس بیان کے وقت آنحضرت ﷺ تکیہ لگائے ہوئے تھے لیکن اب ٹھیک ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا: نہیں نہیں خدا کی قسم تم پر ضروری ہے کہ لوگوں کو خلاف شرع کاموں سے روکو اور ان کو شریعت کی پابندی پر لاؤ۔“

ایک روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا:

”سب سے پہلی برائی بنی اسرائیل میں یہ داخل ہوئی تھی کہ ایک شخص دوسرے کو خلاف شرع کام کرتے دیکھتا تو اسے روکتا۔ اس سے کہتا کہ اللہ سے ڈرو اور اس نہرے کام کو چھوڑ دے۔ یہ حرام ہے۔ لیکن جب وہ نہ چھوڑتا تو یہ اس سے کنارہ کشی نہ کرتا بلکہ اس کا ہم شرب رہتا اور میل جول باقی رکھتا اس وجہ سے سب ہی میں سنگ دلی آگئی۔ پھر آپ نے اس پوری آیت کی تلاوت کر کے فرمایا واللہ تم پر فرض ہے کہ ہر کسی کو بھلائی کا حکم کرو براہیوں سے روکو ظالم کو اس کے ظلم سے باز رکھو اور اسے تنگ کر دو کہ حق پر آ جائے۔“ (ابو داؤد)

مسند احمد اور ترمذی میں ہے کہ یا تو تم بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے منع کرتے رہو گے یا اللہ تعالیٰ تم پر بھی اپنی طرف سے عذاب بھیج دے گا۔ پھر تم اس سے دعائیں بھی کرو گے لیکن وہ قبول نہیں فرمائے گا۔

ابن ماجہ میں ہے اچھائی کا حکم دو اور برائی کی مخالفت کرو اس سے پہلے کہ تمہاری دعائیں قبول ہونے سے روک دی جائیں۔

ایک روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا:

فمن رآى منكُم المنكر فليغيره بيده ومن لم يستطع فبلسانه ومن لم يستطع فبقلبه و ذالك اضعف الايمان (مسلم)

”تم میں سے جو شخص خلاف شرع کام دیکھے اس پر فرض ہے کہ اسے اپنے ہاتھ سے مٹائے۔ اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے (برا جانے) اور یہ شخص بہت ہی ضعیف ایمان والا ہے۔“

ایک مقام پر آپ ﷺ نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ خاص لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے عام لوگوں کو عذاب نہیں کرتا لیکن اس

وقت کہ ان میں برائیاں پھیل جائیں اور قدرت کے باوجود انکار نہ کریں اس وقت اللہ تعالیٰ مام و خاص سب کو گھیر لیتا ہے۔“ (مسند احمد)

ایک روایت میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:  
 ”تم میں سے کسی شخص کو اپنی بے عزتی نہ کرنی چاہئے۔ لوگوں نے پوچھا حضور ﷺ یہ کیسے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: خلاف شرع کوئی کام دیکھنے اور سمجھ نہ کہے قیامت کے دن ان سے باز پرس ہوگی کہ فلاں موقع پر تو خاموش کیوں رہا؟ یہ جواب دے گا کہ لوگوں کے ڈر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں سب سے زیادہ حق دار تھا کہ تو مجھ سے خوف کھائے۔“ (ابن ماجہ)

### امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی فریضت:

نبی کا حکم دینا اور بری باتوں سے روکنا ضروری ہے خواہ گھر کا آدمی ہو یا پاس پڑوس کا ہو۔ اگر خود نمازی ہے لیکن گھر والوں یا پاس پڑوس کے لوگوں کو نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیتا اور انہیں دیگر برائیوں سے نہیں روکتا ہے تو قیامت کے دن یہ بے نمازی پڑوس کا دامن پکڑ کر خدا کے سامنے پیش ہو گا اور کہے گا کہ خدا یا نہ میں نے اس کی خیانت کی ہے اور نہ ہی حق تلفی کی ہے۔ وہ بے نمازی کہے گا کہ خدا یا یہ سچ تو کہتا ہے لیکن اس نے مجھے گناہوں سے نہیں روکا ہے۔ اس لئے یہ میری خیانت اور حق تلفی ہوئی ہے۔“ (مسند احمد)

مومن کی یہی شان ہے کہ وہ خود بھی نیکیوں کا بحسہ ہوتا ہے اور بھلائی کرتا ہے اور لوگوں کو بھی بھلائی کا حکم دیتا ہے۔

### کامل مومن کی پہچان:

اللہ تعالیٰ نے کامل مومن کی یہ نشانی بتائی ہے:

والمؤمنون والمؤمنات بعضهم اولیاء بعض یأمرون بالمعروف و ینہون عن المنکر و یمونون بالصلوٰۃ و یمونون بالزکوٰۃ و یمطیعون اللہ و رسولہ اولئک سیر حمہم اللہ ان اللہ عزیز حکیم (التوبہ)

”مومن مرد اور عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے مدد و معاون اور دوست ہیں بھلائیاں سکھاتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔ نمازوں کو پابندی سے بجالاتے ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے رہتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ بہت جلد رحم فرمائے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ غلبے والا بردبار ہے۔“

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ داری ہر چھوٹے بڑے پر ہے جو جس درجے اور مرتبے کے لائق ہے اسی لحاظ سے اسے یہ فریضہ ادا کرنا چاہئے۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

”تم خیردار رہو۔ تم میں سے ہر شخص محافظ ہے اور ذمہ دار ہے اور ہر شخص سے اس کی ذمہ داری اور نگرانی کی بابت دریافت کیا جائے گا۔ جو لوگوں کے ذمہ دار ہیں ان سے ان کی رعایا کے بارے پوچھا جائے گا۔ آدمی اپنے گھر کا ذمہ دار ہے اس سے اس کے گھر والوں کے متعلق دریافت کیا جائے گا۔ عورت اپنے خاندان کے گھر اور اولاد کی محافظ ہے اس سے ان چیزوں کے متعلق پوچھا جائے گا۔ غلام اپنے مالک کے مال کا چوکیدار ہے اس سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ القرض تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اس کی ذمہ داری کے متعلق سوال کیا جائے گا۔“

ایک مقام پر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

”جو چھوٹوں پر شفقت نہ کرے اور بڑوں کی عزت نہ کرے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر نہ کرے تو وہ ہم میں سے نہیں ہے۔“

ایک روایت میں آپ ﷺ نے معراج کے ایک واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

رأيت ليلة أسري بي رجلا تقرض شفاهم بمقارنض من النار فقلت من هؤلاء يا جبرئيل قال: الخطباء من امتك الذين يأمرون الناس بالبر و ينسون انفسهم وهم يتلون الكتاب افلا يعقلون. (بخاری)

”معراج والی رات میں نے دیکھا کہ کچھ لوگوں کے ہونٹ آگ کی ٹیغیوں سے کاٹے جا رہے ہیں تو میں نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ تو جبریل امینؑ نے بتایا کہ یہ آپ ﷺ کی امت کے خطیب اور واعظ ہیں جو لوگوں کو بھلائی سکھاتے تھے مگر خود نہیں کرتے تھے علم کے باوجود کچھ نہیں رکھتے تھے۔“

حضرت ابو دائلؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت اسامہؓ سے کہا گیا کہ آپ حضرت عثمانؓ سے کچھ نہیں کہتے۔ آپؐ نے فرمایا کیا میں تمہیں سنا کر کہوں تو پھر ہی کہتا ہوگا۔ میں تو انہیں پوشیدہ طور پر ہر وقت کہتا رہتا ہوں لیکن میں کسی کام کو پھیلانا نہیں چاہتا خدا کی قسم میں کسی شخص کو سب سے افضل نہیں کہوں گا کیونکہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ

”ایک شخص کو قیامت کے روز لایا جائے گا اور اسے جہنم میں ڈالا جائے گا۔ اس کی آنتیں نکل آئیں گی اور وہ اس کے ارد گرد چکر کھاتا رہے گا اور جبھی اس کے ارد گرد جمع ہو کر پوچھیں گے کہ حضرت! آپ تو ہمیں اچھی باتوں کا حکم کرنے والے اور برائیوں سے روکنے والے تھے۔ یہ آپ کی کیا حالت ہے؟ وہ کہے گا افسوس! میں تمہیں کہتا تھا لیکن خود نہیں کرتا تھا۔ میں تمہیں نہ دیکھتا تھا لیکن خود نہیں رکھتا تھا۔“ (مسند احمد)

# اخوت

## اخوت کا مفہوم:

اخوت کا لفظ ”اخ“ سے نکلا ہے۔ اس کے معنی بھائی چارے کے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں اخوت کا لفظ اہل اسلام کے باہمی تعلق اور رشتے کے لئے بولا جاتا ہے یعنی تمام مسلمان آپس میں رشتہ اسلام کی وجہ سے ایک دوسرے کے بھائی ہیں خواہ ان کا تعلق کسی بھی خاندان، برادری، قبیلے یا علاقے سے ہو اور ان کے درمیان کتنا ہی زیادہ فاصلہ کیوں نہ ہو صرف کلمہ گو ہونے کی وجہ سے ہی ایک انسان دوسرے انسان کا بھائی بن جاتا ہے۔ عام طور پر لوگ خاندانی اور نسلی تعلقات کو ہی بھائی چارہ سمجھتے ہیں حالانکہ اسلام کا رشتہ اخوت کہیں زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔

اسلام ہی وہ دین ہے جو اخوت و بھائی چارے کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام سے قبل تمام انسانیت ملک، قوم، رنگ اور نسل کے تعصبات و تفریقات میں بٹی ہوئی تھی۔ ہر قوم دوسری قوم کو اپنا دشمن سمجھتی تھی۔ ہر قبیلہ دوسرے سے دست و گریباں تھا۔ پوزی انسانیت باہم برسر پیکار تھی اور قبل از اسلام عرب جنگ و جدل میں مصروف تھے اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ آپ ﷺ نے تمام دنیا کو اخوت کا درس دیا اور یہ بات سمجھائی کہ روئے زمین کے تمام انسان ایک ہی اصل کی مختلف شاخیں ہیں۔

## اخوت کی اہمیت قرآن کی روشنی میں:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ (النساء: 1)

”اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تمہیں ایک ہی اصل سے پیدا کیا۔“  
دوسری جگہ فرمایا:

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا (یونس: 19)

حقیقت میں تم خوارِ محبت، اُس اور پیار ہی وہ بنیاد ہے جس پر دین اسلام نے مسلمانوں میں بھائی چارے کو قائم کیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

انما المؤمنون اخوة فاصلحوا بَيْنَ اخوتکم (الحجرات: 10)

”مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں لہذا اپنے بھائیوں کے درمیان صلح صفائی کرو دیا

کر دے“

اس رشتہ اخوت میں صرف مؤمن مرد ہی شامل نہیں ہیں بلکہ مؤمن عورتیں بھی مواخات میں اپنے مسلمان بھائیوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

والمؤمنون والمؤمنات بعضهم اولیاء بعض (التوبہ: 71)

”مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔“

**اخوت حدیث کی روشنی میں:**

رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

المؤمن للمؤمن كالبیان يشد بعضه بعضا و شك بين اصابعه (متفق علیہ)

”مؤمن مؤمن کے لئے عمارت کی مثل ہے جس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کو مضبوط کرتی ہے۔“

جس طرح ہر اینٹ عمارت کا حصہ ہے اسی طرح ہر مسلمان اسلامی معاشرے کا حصہ ہے اور اسلامی معاشرہ افراد کی اصلاح ہی سے صاف ستھرا، مضبوط اور توانا ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

مثل المؤمنین فی نواذهم و تراحمهم و تعاطفهم مثل الجسد اذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى (متفق علیہ)

”مومنوں کی مثال ان کے آپس کی محبت و شفقت، رحم دلی اور مروت، مہربانی اور حسن سلوک میں ایک جسم کی طرح ہے جب اس کا کوئی عضو بیمار ہوتا ہے تو سارا جسم جاگتا ہے اور اس کو بخار آ جاتا ہے۔“

غور کیجئے آنکھ میں چھوٹا سا ذرہ پڑ جائے تو کسی کروٹ چپٹن نہیں آتا۔ ذرہ ٹپکتے ہی سارا جسم راحت پا جاتا ہے اسی طرح جب مسلمان تکلیف میں ہوں خواہ ان کا تعلق دنیا کے کسی ملک اور زمین کے کسی خطہ سے کیوں نہ ہو، دنیا بھر کے مسلمانوں کو ان کے دکھ درد میں شریک ہونا چاہئے اور ان کی ہر ممکن مدد کرنی چاہئے اور جب تک ان کے مصائب اور مشکلات دور نہ ہو جائیں انہیں آرام سے نہیں بیٹھنا چاہئے۔ یہی اس حدیث مبارک کا مطلب اور مفہوم ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

المسلم اخو المسلم لا يظلمه ولا يسلطه من كان في حاجة اخيه كان الله في حاجته (متفق علیہ)

”مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں نہ کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی پر ظلم کرتا ہے اور نہ ہی اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے جو کوئی اپنے مسلمان بھائی کی ضرورت پوری کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ روز جزا (جب تقاضی کا عالم ہوگا) اس کی حاجت پوری فرمائے گا۔“



آپ کا ارشاد مبارک ہے:

”لا يؤمن احدكم حتى يحب لاخيه ما يحب لنفسه (تشفق علیہ)

”تم میں سے کوئی شخص (کامل) مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی بات پسند نہ کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔“

ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنے لئے خیر و برکت کا ہی طالب ہوتا ہے تو لازماً اسے اپنے بھائی کے لئے بھی خیر و برکت کا ہی طالب رہنا چاہئے صرف اسی حدیث مبارک پر عمل کرنے سے دھوکا فریب اور شر و فساد کی ساری راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

”مَوَاحَاةُ“ اللہ کا انعام ہے:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

واذكروا نعمة الله عليكم اذ كنتم اعداء فالف بين قلوبكم فاصبحتم بنعمته اخوانا (آل عمران: 103)

”(مسلمانو!) اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے (اسلام سے قبل) تم ایک دوسرے کے دشمن تھے (اسلام قبول کرنے کے بعد) اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل سے تم بھائی بھائی بن گئے۔“

یعنی جس وقت پورے عرب میں قبائلی نظام رائج تھا، لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم تھا، کوئی حکومت یا عدالت سرے سے موجود ہی نہ تھی کہ جس کی طرف رجوع کیا جاسکتا، اگر کسی قبیلہ کا کوئی آدمی قتل ہو جاتا تو مقتول کا قبیلہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتا جب تک اس کا انتقام نہ لے لیتا۔

قبائلی میث جسے قرآن نے ”حمیۃ جاہلیۃ“ کا نام دیا ہے اس انتہا کو پہنچی ہوئی تھی کہ کوئی فریق یہ سوچنے کی زحمت گوارا ہی نہ کرتا تھا کہ قصور کس کا ہے؟ صرف یہ دیکھا جاتا تھا کہ چونکہ ہمارے قبیلہ کے آدمی کو فلاں قبیلہ کے آدمی نے نقصان پہنچایا ہے اس لئے اس سے انتقام لینا ضروری ہے۔ پھر اس انتقام میں انصاف کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ جہاں کہیں کوئی جنگ چھڑی تو پھر وہ ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ مکہ میں بنو بکر اور بنو تغلب کی لڑائی شروع ہوئی جس میں نصف صدی لگ گئی۔ خاندان کے خاندان تباہ ہو گئے، کشتوں کے پستے لگ گئے مگر لڑائی ختم ہونے میں نہ آئی۔

نہایت حال صرف مکہ اور مدینہ تک ہی محدود نہ تھی بلکہ پورے عرب میں ایک جیسی آگ لگی ہوئی تھی اور قریب تھا کہ پوری عرب قوم نیست و نابود ہو جائے کہ اس حال میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو دولت اسلام سے سرفراز فرمایا جس سے پرانی رنجشیں اور کدورتیں دور ہو

میں۔ عداوت کی بجائے مسلمانوں نے دلوں میں زلفت و محبت پیدا کی اور وہ بالکل یوں  
کی طرح بن گئے اس طرح اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو آگ کے گڑھے میں گرے اور مرنے کے  
بعد جہنم کی آگ کے گڑھے میں گرے سے بچالیا۔ اسی نعمت کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے سورہ انفال  
میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا:

والف بين قلوبهم لو انفقت ما فى الارض جميعا ما الفت بين قلوبهم ولكن  
الله الف بينهم انه عزيز حكيم (الانفال: 63)

”اس رب کریم نے مومنوں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیئے آپ اگر روئے  
زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو ان لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے مگر وہ اللہ ہے جس  
نے ان لوگوں کے دل جوڑے یقیناً اللہ تعالیٰ غالب حکمتوں والا ہے۔“

### اخوت کا عملی نمونہ:

رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی زندگیاں اخوت کا عملی نمونہ تھیں۔ جب حضور مکہ سے  
مدینہ تشریف لائے تو انصار اور مہاجرین کے درمیان مواءنہ کو عملی شکل عطا فرمائی۔

جس طرح رسول اللہ ﷺ نے مسجد نبوی کی تعمیر کا اہتمام فرما کر یاہمی اجتماع اور میل  
محبت کے ایک مرکز کو وجود بخشا (کہ مسلمان یاہم مل کر نہ صرف رب کریم کے حضور اپنی  
پیشانیوں کو جھکا کر اس کی رضا اور ہدایت کے طلب گار بنیں بلکہ امیر و غریب شاہ و گدا ایک ہی  
صف میں کھڑے ہو جائیں اور ان میں اتحاد و اتفاق اور الفت و محبت کی قضاء برقرار رہے۔)  
اسی طرح آپ ﷺ نے تاریخ انسانی کا ایک اور تابناک کارنامہ انجام دیا جسے مہاجرین و انصار  
کے درمیان مواءنات اور بھائی چارے کے عمل کا نام دیا جاتا ہے۔

پھر رسول کریم ﷺ نے سیدنا انس بن مالکؓ کے مکان میں مہاجرین و انصار کے  
درمیان بھائی چارہ کرایا۔ کل نوے آدمی تھے آدھے مہاجرین اور آدھے انصار۔ بھائی چارے کی  
بنیاد یہ تھی کہ یہ ایک دوسرے کے غمخوار ہوں گے اور موت کے بعد بھی قربت و اوروں کی بجائے  
ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔ وراثت کا یہ تقسیم جنگ بدر تک باقی رہا۔

اس بھائی چارے کا مقصد یہ تھا کہ جب بھی ”مقتدین“ تھے تو ”مقتدین“ بن جائیں حقیقت و غیرت جو  
کچھ ہو کہ اسلام کے لئے ہو۔ نسل و وطن اور رنگ کے امتیازات مٹ جائیں۔ بلندی اور پستی کا  
معیار انسانیت و تقویٰ کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے اس بھائی چارے کو محض کھوکھلے الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا تھا بلکہ اسے  
ایک ایسا نافذ العمل عہد و پیمان قرار دیا تھا جو خون اور مال سے مربوط تھا۔ یہ خالی خولی سلامتی  
اور مبارک باد نہ تھی کہ زبان پر روانی کے ساتھ جاری رہے مگر نتیجہ کچھ نہ ہو بلکہ اس بھائی چارے

نے ساتھ ایثار و غم گساری اور اُلفت و محبت کے جذبات بھی مخلوط تھے اور اسی لئے اس نے اس نے مہاجرے کو بڑے نادر اور تاجانک کارناموں سے نڈھ کر دیا تھا۔

نبی اکرم ﷺ کی اس قائم کردہ مواخات کی مثال تاریخِ عالم میں نہیں ملتی۔ انصار نے فراخ دلی اور زندہ دلی کا ثبوت دیا۔ ہر انصاری اپنے مہاجر بھائی کو اپنے ساتھ لے کر گیا اپنے مالِ باغات اور جائیداد میں سے نصف اس کو دے دیا بلکہ بعض انصاری جن کی دو بیویاں تھیں انہوں نے اپنی ایک بیوی کو طلاق دے کر دوسرے بھائی سے عقد کی پیشکش کی لیکن انہوں نے انصار کی اس پیشکش کو شکرے کے ساتھ رد کر دیا اور بعض مہاجرین نے اپنے انصاری بھائیوں سے عملاً کسی قسم کا حصہ نہ لیا مگر انصاری بھائیوں نے خلوص و محبت کا مظاہرہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ یہودیوں اور منافقوں نے کئی ایک مواقع پر اوس اور خزرج کو باہم لڑانے کی کوشش کی اور انصار و مہاجرین کے درمیان دراڑیں پیدا کرنے کی سرکوشش کی۔ ایک مرتبہ تو قریب تھا کہ انصار اور مہاجرین کے درمیان تلوار چل جائے۔ یہودیوں نے کچھ اس طرح کی فضاء پیدا کر دی کہ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے اور یہ ٹھہر گیا کہ جرہ کے میدان میں جا کر دل کھولی کر لڑیں اور پیاسی زمین کو اپنے خون سے سیراب کریں۔ رسول کریم ﷺ کو بروقت پتہ چل گیا تو آپ ﷺ نے دونوں گروہوں کو ٹھنڈا کیا اور ان کے درمیان صلح صفائی کرائی اور دونوں گروہ اپنی اس حرکت پر تادم ہوئے۔

## اسلامی اخوت کے تقاضے

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لا تحاسدوا ولا تناجسوا ولا تباعضوا ولا تدابروا ولا یبع بعضکم علی بعض بعض و کونوا عباد اللہ اخوانا المسلم اخو المسلم لا یظلمہ ولا یحقرہ ولا یخذلہ التقویٰ ہننا و یشیر الی صلدہ ثلاث مرات بحسب امرئ من الشر ان یحقر اخاہ المسلم کل المسلم علی المسلم حرام دمہ و ماله و عرضہ۔ (صحیح مسلم)

”رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک دوسرے سے حسد نہ رکھو، ایک دوسرے کو دھوکہ نہ دو، ایک دوسرے سے نفرت نہ کرو، ایک دوسرے سے بیعت نہ پھیرو، کوئی شخص دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرے۔ تم سب اللہ کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ (یاد رکھو) مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرے نہ اسے حقیر جانے اور نہ اسے (کسی طرح بھی) ذلیل کرے۔ تقویٰ (کا مرکز) یہاں ہے آپ ﷺ نے اپنے سینہ مبارک کی طرف تین مرتبہ اشارہ کیا پھر فرمایا کہ انسان کے لئے اتنی برائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے، مسلمان پر ہر مسلمان کا خون اس کا مال اور اس کی عزت و آبرو حرام ہے۔“

یہ حقیقت ہے کہ کوئی جھگڑا اور فساد دو آدمیوں کے درمیان ہو یا دو قوموں کے مابین اس کا محرک آپس کا حسد و بغض، اپنی شوکت و سطوت کا لوہا منوانا، دوسروں کو نیچا دکھانا، ایک دوسرے کے حقوق تلف اور غصب کرنا ہوتا ہے۔ اس سے فریقین کے درمیان رنجش اور نفرت کے جذبات ابھرتے ہیں اور جب ان میں تیزی آتی ہے تو پہلے زبان درازی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ پھر ہاتھ پائی اور دنگا فساد کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ لڑائی کے ان شعلوں میں افراد اور قومیں عقل و فکر سے خالی اور دانش و بینش سے عاری ہو جاتی ہیں۔ انہیں نہ تو انجام کی فکر رہتی ہے نہ ہی اپنے نقصانات کی پرواہ ہوتی ہے۔

اسی بناء پر اسلام اپنے پیروکاروں کو نہ صرف زیور علم سے آراستہ کرتا ہے بلکہ ان کی تہذیب نفس بھی کرتا ہے۔ ذیل میں ہم اسی اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے اخوت کے تقاضے ذکر کرتے ہیں:

### 1- اتحاد و اتفاق:

اسلامی اخوت کا تقاضا ہے کہ مسلمان باہم مل جل کر رہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو ایک عمارت کی مانند قرار دیا ہے جس طرح عمارت کی دیوار کا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے۔

### 2- زیادتی سے اجتناب:

اپنے کسی مسلمان بھائی سے کسی قسم کی زیادتی کا ارتکاب نہیں کرنا چاہئے۔ اس میں اس کے ساتھ حقارت کا برتاؤ اس سے حسد رکھنا، دل میں اس کے لئے کدورت اور بغض رکھنا اس کی غیبت اور چغلی کھانا اور کسی بھی انداز میں اس کی حق تلفی کرنا وغیرہ سب کچھ شامل ہے۔

### 3- حقوق کی ادائیگی:

مسلمانوں کو ایک دوسرے کے تمام حقوق صدق دل سے اور خوشی سے ادا کرنے چاہئیں کیونکہ اسلام نے حقوق اللہ سے بھی زیادہ حقوق العباد پر زور دیا ہے۔

### 4- تحقیر اور دل آزاری کی ممانعت:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرُ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُمْ  
 ”اے ایمان والو! کوئی قوم کسی دوسری کو مذاق نہ کرے ممکن ہے دوسرے ان سے بہتر

ہوں۔“

## 5- غیبت اور چغل خوری کی ممانعت:

اسلامی اخوت کا تقاضا ہے کہ کوئی مسلمان اپنے بھائی کی عدم موجودگی میں اس کی برائی بیان نہ کرے کیونکہ ارشاد خداوندی ہے:

”کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے یقیناً تم اس سے نفرت کرو گے۔“ (الحجرات)

## 6- ایثار و قربانی:

قرآن مجید نے مسلمان کی اس خوبی کو نمایاں طور پر بیان کیا ہے:

وَيُؤْتُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

”اور وہ اپنے نفس پر دوسروں کو مقدم رکھتے ہیں اگرچہ ان پر تنگی ہی کیوں نہ ہو۔“

اس سے پتہ چلا کہ اپنے مسلمان بھائی کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دی جانی

چاہئے۔

## 7- خیر خواہی:

مسلمانوں کا فرض ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ احسان اور بھلائی کے ساتھ پیش آئیں اور ایک دوسرے کی خیر خواہی کریں۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

الدين النصيحة (بخاری)

”دین خیر خواہی کا نام ہے۔“

مسلمان کا کوئی اقدام ایسا نہیں ہونا چاہئے جس سے کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف ہو بلکہ انہیں دوسروں کی بھلائی کے کام کرنے چاہئیں۔

## 8- باہمی تعاون:

اسلامی اخوت کا یہ بھی تقاضا ہے کہ کسی مسلمان بھائی کی کوئی بھی جائز ضرورت ہو تو اس کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ

”نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو۔“

## 9- نرم دلی:

تمام اہل ایمان کو آپس میں پیار محبت سے رہنا چاہئے۔ ان کے دل آپس میں ایک دوسرے کے لئے نرم ہونے چاہئیں۔

## 11- فریب دہی کی ممانعت:

ایک مسلمان بھائی دوسرے بھائی کے ساتھ دھوکہ فریب نہ کرے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

”سب سے بڑی خیانت یہ ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی بات کہو اور وہ تمہیں سچا سمجھ رہا ہو حالانکہ تم اس سے جھوٹ بول رہے ہو۔“

## 11- لڑائی جھگڑے سے اجتناب:

اخوت اسلامی کا تقاضا ہے کہ مسلمان آپس میں لڑائی جھگڑا نہ کریں ورنہ وہ کمزور ہو جائیں گے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ولا تنازعوا فتفشلوا و تذهب ربکم

”اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تم کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔“

## 12- تفرقے سے اجتناب:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

واعصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا

”تم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقے میں نہ پڑو۔“

## 13- حقوق کی ادائیگی:

مسلمانوں کو ایک دوسرے کے تمام حقوق صدق دلی اور خوشی سے ادا کرنے چاہئیں۔ اسلام نے کئی لحاظ سے حقوق اللہ سے بھی بڑھ کر حقوق العباد پر زور دیا ہے۔

ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں جنہیں ادا کرنا چاہئے:

- i- جب ملے تو سلام کہے۔
- ii- دعوت دی جائے تو قبول کرے۔
- iii- چھینک آئے تو بربک اللہ کہے۔
- iv- بیمار ہو تو سیاحت کرے۔
- v- فوت ہو جائے تو جنازہ پڑھے۔
- vi- اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

## 14- خلوص:

ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ مخلص ہونا چاہئے جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”دین خیر خواہی کا نام ہے۔ پوچھا گیا: کس سے؟ فرمایا: اللہ سے اس کے رسول سے۔“

مہر ہوں سے اور تمام مسلمانوں سے۔“

### 15- پردہ پوشی:

ہر مسلمان دوسرے مسلمان کی پردہ پوشی کرے۔ اس کے عیوب کی اشاعت کر کے اسے رونا نہ کرے۔ اس سلسلے میں آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”من ستر مسلماً سترہ الله يوم القيمة“

”جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی پردہ پوشی کرے گا۔“

### 16- ہمدردی اور غم خواری:

مسلمانوں کا آپس میں ہمدردی کا برتاؤ ہونا چاہئے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

”من كان في عون العبد كان الله في عون“

”جو کسی مسلمان کے دکھ درد میں کام آئے گا اللہ تعالیٰ اس کے کام آئیں گے۔“

### 17- مدد اور تعاون:

ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”انصروا خاك ظالما او مظلوما“

”اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔“

## اخوت کے اثرات اور فوائد و ثمرات

صحابہ کرام کی پاکیزہ زندگیاں اطاعت الہی اور سنت رسول ﷺ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھیں۔ وہ آپس میں شیر و شکر تھے۔ ان میں خلوص اور وفاداری تھی۔ اس لئے انہیں ”رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ“ کی خوشخبری سنائی گئی۔ ان کی صفوں میں اتحاد تھا وہ دشمن کے مقابلہ میں سب سے پہلی دیوار تھے جبکہ آپس میں رحیم و کریم تھے۔

اب ہم ذیل میں اختصار سے اخوت کے اثرات اور فوائد و ثمرات کا ذکر کرتے ہیں:

### 1- اخلاقِ سیدہ سے بچاؤ:

جب مسلمانوں کے مابین بھائی چارے کی فضاء قائم ہوگی تو کوئی بھائی کسی بھائی کو تنگ نہیں کرنا چاہے گا چنانچہ دوسروں کی خلقِ طبعی اور ان کے ساتھ ظلم و زیادتی وغیرہ رذائل اخلاق اور اخلاقِ سیدہ سے اجتناب اور بچاؤ ہوگا۔

## 2- باہمی تعاون کی فضاء:

اسلامی اخوت اور بھائی چارے کی وجہ سے باہمی تعاون اور احساس کی فضاء قائم ہوتی ہے۔ معاشرے کا ہر فرد دوسرے کا احساس کرتا ہے۔

## 3- خوشگوار معاشرت:

جب معاشرے میں ایک دوسرے کے لئے ہمدردی، خلوص، وفاداری کے جذبات ہوں گے اور لوگ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے تو معاشرتی ماحول خوشگوار ہوگا۔

## 4- احساس ہمدردی:

اخوت و محبت کی وجہ سے دل میں ہمدردی کا احساس بھی بیدار ہوتا ہے۔ اگر کسی کو کسی قسم کی تکلیف ہو تو اس کے دوسرے مسلمان بھائی اس کی دلجوئی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ دکھ درد میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

[www.kitabosunnat.com](http://www.kitabosunnat.com)

## 5- اقتصادی خوش حالی:

جب اخوت و محبت اور باہمی تعاون کی فضاء ہو تو امراء اپنے غریب بھائیوں کے ساتھ مالی تعاون بھی کریں گے جس سے وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل ہوں گے اور معاشرے سے غربت و افلاس کا خاتمہ ہوگا اور معاشی خوشحالی کا دور دورہ ہوگا۔ جب معیشت ٹھیک ہو جائے گی تو معاشرتی پریشانیاں بھی کم ہو جائیں گی۔

## باہمی معاملات میں اصلاح بین الناس

ہمارے معاشرے کے افراد کی عام معاشرتی و اخلاقی حالت جیسی کچھ ہے آپ اس کا اندازہ خود اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کی بناء پر کریں ہم میں کتنے فیصد لوگ ایسے پائے جاتے ہیں جو کسی کا حق تلف کرنے میں کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے میں کوئی مفید ٹھوسٹ بولے اور کوئی نفع بخش بے ایمانی کرنے میں صرف اس بناء پر تامل کرتے ہوں کہ ایسا کرنا اخلاقی طور پر ہے؟

جہاں قانون کی گرفت نہ ہو اور اس گرفت سے بچ نکلنے کی امید ہو وہاں کتنے فیصد اشخاص محض اپنے اخلاقی احساس کی بناء پر کسی جرم اور کسی بُرائی کا ارتکاب کرنے سے باز رہ جاتے ہیں؟ جہاں اپنے کسی ذاتی فائدے کی توقع نہ ہو وہاں کتنے آدمی دوسروں کے ساتھ بھلائی ہمدردی، ایمان، حق رسانی اور حسن سلوک کا برتاؤ کرتے ہیں؟

ہمارے تاجروں میں ایسے تاجروں کی کتنی اوسط ہے جو دھوکے، فریب، جھوٹ اور ناجائز



نفع اندوزی سے پرہیز کرتے ہوں؟ ہمارے صنعت پیشہ لوگوں میں ایسے افراد کا کیا تناسب ہے جو اپنے فائدے کے ساتھ کچھ اپنے خریداروں کے مفاد اور اپنی قوم اور اپنے ملک کی مصلحت کا بھی خیال رکھتے ہوں؟

ہمارے زمینداروں میں کتنے ہیں جو غلہ روکتے ہوں اور بے حد گراں قیمتوں پر بیچتے ہوئے یہ سوچتے ہوں کہ وہ اپنی اس نفع اندوزی سے کتنے لاکھ بلکہ کتنے کروڑ انسانوں کو فائدہ کسی کا عذاب دے رہے ہیں؟ ہمارے مالداروں میں کتنے ہیں جن کی دولت مند میں کسی ظلم کسی حق تلفی اور کسی بددیانتی کا دخل نہیں ہے؟

ہمارے محنت پیشہ لوگوں میں کتنے ہیں جو فرض شای کے ساتھ اپنی اجرت اور اپنی تنخواہ کا حق ادا کرتے ہیں؟ ہمارے سرکاری ملازموں میں کتنے ہیں جو رشوت اور خیانت سے ظلم اور مردم آزادی سے کام چوری اور حرام خوردی سے اور اپنے اختیارات کے ناجائز استعمال سے بچے ہوئے ہیں؟

ہمارے دیکھوں میں ہمارے ڈاکٹروں اور حکیموں میں ہمارے اخبار نویسوں میں ہمارے ناشرین و مصنفین میں ہمارے قومی خدمت گزاروں میں کتنے ہیں جو اپنے فائدے کی خاطر ناپاک طریقے اختیار کرنے اور خلق خدا کو دہنی، اخلاقی، مالی اور جسمانی نقصان پہنچانے میں کچھ بھی شرم محسوس کرتے ہوں؟

شاید مبالغہ نہ ہو جائے اور اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے معاشرے میں بمشکل پانچ فیصد لوگ اس اخلاقی جذام سے بچے رہ گئے ہیں ورنہ 95 فیصد افراد کو یہ چھوٹ کی برائی لگ چکی ہے۔

باہمی معاملات میں اصلاح بین الناس کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ان کو نکات کی شکل میں ذیل میں بیان کیا جا رہا ہے:

### 1- خوف خداوندی:

خوف خدا ہی انسان کو برائیوں سے روکنے اور سیدھا چلانے کے لئے ایک قابل اعتماد ضمانت ہے۔ راست بازی، انصاف، امانت، حق شناسی، ضبط نفس اور وہ تمام دوسری خوبیاں جن پر ایک پُر امن اور ترقی پذیر تہذیب و تمدن کی پیدائش کا انحصار ہے اسی ایک حجم سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگرچہ بعض دوسرے عقیدوں سے بھی انہیں کسی نہ کسی حد تک پیدا کیا جاسکتا ہے جس طرح مغربی قوموں نے اپنے اندر کچھ نہ کچھ پیدا کیا ہے لیکن ان ذرائع سے پیدا کی ہوئی خوبیوں کی نشوونما بس ایک حد پر جا کر رک جاتی ہے اور اس حد میں بھی ان کی بنیاد حزنزل رہتی ہے صرف خدا ترسی ہی وہ پائیدار بنیاد ہے جس پر انسان کے اندر برائی سے روکنے اور بھلائی پر چلنے کی

صفت مضبوطی کے ساتھ قائم ہوتی ہے اور محدود پیمانے پر نہیں بلکہ نہایت وسیع پیمانے پر تمام انسانی معاملات میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔

## 2- خدائی ہدایت کی پیروی:

جو کہ انسان کے شخصی، اجتماعی، قومی اور بین الاقوامی رویہ کو اخلاق کے مستقل اصولوں کا پابند کرنے کی ایک ہی صورت ہے۔

جب تک انسان اپنے اخلاقی اصولوں کا خود غور نہ کرے اور منصف رہتا ہے وہ باتیں بنانے کے لئے کتابوں میں آب زر سے کچھ اور قسم کے اصولی نکالتا ہے اور معاملات میں اپنے مطلب کے مطابق بالکل دوسری قسم کے اصولی برتا ہے۔ وہ لوگوں سے مطالبہ کرتے وقت کچھ موقع مصلحت اور ضرورت کے دھاؤں کے تحت اس کے اصول ہر آن بدلتے رہتے ہیں وہ اخلاق کا اصل محور ”حق“ کو نہیں بلکہ اپنے ”مناہ“ کو بناتا ہے اور وہ اس بات کو مانتا ہی نہیں کہ اس کے عمل کو حق کے مطابق ڈھلانا چاہئے۔ اس کے بجائے وہ چاہتا ہے کہ حق اس کے مفاد کے مطابق ڈھلے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی بدولت افراد سے ملے کر قوموں تک سب کا رویہ غلط ہو جاتا ہے اور اسی سے دنیا میں ناساد پھیلتا ہے۔ اس کے برعکس جو چیز انسان کو خوشحالی اور فلاح و سعادت بخش سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اخلاق کے کچھ ایسے اصول ہوں جو کسی کے مفاد کے لحاظ سے نہیں بلکہ حق کے لحاظ سے بنے ہوئے ہوں اور انہیں اہل مان کر تمام معاملات میں ان کی پابندی کی جائے۔ خواہ وہ معاملات شخصی ہوں یا قومی خواہ وہ تجارت سے تعلق رکھتے ہوں یا سیاست اور صلح و جنگ سے۔

ظاہر ہے کہ ایسے اصول صرف خدائی ہدایت ہی میں ہمیں مل سکتے ہیں اور ان پر عمل درآمد کی بھی ایک صورت ہے کہ انسان ان کے اندر رد و بدل کے اختیار سے دستبردار ہو کر انہیں واجب الاتباع تسلیم کر لے۔

## 3- نظام انسانیت:

جو کہ شخصی، قومی، نسلی اور طبقاتی خود غرضیوں کے بجائے تمام انسانوں کے مساوی مرتبے اور مساوی حقوق پر مبنی ہو جس میں بے جا امتیازات نہ ہوں جس میں اونچ نیچ، چھوٹ چھات اور مصنوعی تعصبات نہ ہوں جس میں بعض کے لئے مخصوص حقوق اور بعض کے لئے بنیادی پابندیاں اور رکاوٹیں نہ ہوں جس میں سب کو یکساں پھلتے پھولنے کا موقع ملے اور جس میں اپنی وسعت ہو کہ روئے زمین کے سارے انسان اس میں برابری کے ساتھ شریک ہو سکتے ہوں۔

## 4۔ عمل صالح:

یعنی خدا کی دی ہوئی قوتوں اور اس کے نقشے ہوتے ذرائع کو پوری طرح اور صحیح صحیح استعمال کرنا۔

یہ چار چیزیں ہیں جن کے مجموعے کا نام ”باہمی معاملات میں اصلاح بین الناس“ ہے اور ہم سب کی بہتری اس میں ہے کہ ہمارے اندر ٹیک انسانوں کی ایک ایسی تنظیم موجود ہو جو ”بگاڑ“ کے اسباب کو روکنے اور ”باہمی اصلاح“ کی ان صورتوں کو عمل میں لانے کے لئے پیہم جدوجہد کرے۔ یہ جدوجہد اس ملک کے باشندوں کو راہ راست پر لانے میں کامیاب ہوگئی تو اللہ عزوجل کا فضل و کرم ہم پر نہ صرف نازل ہوگا بلکہ اس کا عملی نمونہ ہمیں اپنے معاشرے میں نظر بھی آئے گا۔

## برائی کے مقابلے میں حسن اخلاق

## اسلام کا نظریہ اخلاق:

انسان کے اندر اخلاقی حسن ایک فطری حسن ہے جس کی بناء پر انسان بعض صفات کو پسند اور بعض کو ناپسند کرتا ہے۔ یہ انفرادی طور پر انسانوں میں کم و بیش ہو سکتی ہے لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ مجموعی طور پر انسانیت کے شعور نے اخلاق کے بعض اوصاف پر خوبی کا اور بعض پر بُرائی کا ہمیشہ یکساں حکم دیا۔ سچائی، انصاف، عہد کا پاس اور امانت کو ہمیشہ سے انسانی اخلاقیات میں تعریف کا مستحق سمجھا گیا اور کبھی کوئی ایسا دور نہیں گزرنا جب جھوٹ، ظلم، بدعہدی اور خیانت کو پسند کیا گیا ہو۔ ہمدردی، فیاضی اور فراخ دلی کی ہمیشہ قدر کی گئی اور خود غرضی، سنگ دلی، بخل اور تنگ نظری کو کبھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ صبر و تحمل، استقلال و بُردباری، اولوالعزری و شجاعت ہمیشہ سے وہ اوصاف رہے ہیں جو تعریف کے مستحق سمجھے گئے اور بے صبری، ہتھیوراپن، تلون مزاجی، پست حوصلگی اور بُردلی کو کبھی اچھا نہیں سمجھا گیا۔

## اخلاقی صفات:

ویسے تو ہر عمل صالح اگر وہ خالص خدا کی رضا کے لئے کیا جائے اسلام کے نزدیک عبادت کا درجہ رکھتا ہے اور عبادات ہی کہلانے کا مستحق ہے لیکن مسلمان مفکرین نے عوام کے لئے بات کو آسان اور قابل فہم بنانے کے لئے عبادت کا لفظ صرف ان اعمال صالحہ کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔

## اعمال صالحہ کی اقسام

پہلی قسم:

جن کے ذریعے سے بندہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی معبودیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے سامنے اپنی بندگی اور اپنے عجز و نیاز کا اظہار کرتا ہے۔

دوسری قسم:

اعمال صالحہ کی دوسری قسم وہ ہے جس سے پیغمبرانہ دعوت و اصلاح کا اظہار ہوتا ہے یعنی ایسے اعمال جو دراصل انبیاء کے ہیں اور دوسرے لوگ ان کو انبیاء ہی کے مقصد کو پھیلانے کے لئے کرتے ہیں جیسے تبلیغ دین اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔

تیسری قسم:

اعمال صالحہ کی تیسری قسم وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی نیابت کا رنگ ہے۔ ایسے ہی اعمال دینی اصطلاح میں ”اخلاق“ کہلاتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جب انسان اپنے ہم جنسوں اور دوسری مخلوقات سے پیش آئے تو اس حیثیت سے کہ وہ کائنات کے مالک اور آقا کا نمائندہ ہے اور ایک نمائندہ کا چونکہ یہ فرض ہے کہ جہاں تک ممکن ہو وہ اپنے آپ کو اسی رنگ میں پیش کرے جو مقرر مالک کا رنگ ہے اس لئے انسان کو اپنے اندر وہ تمام صفات پیدا کرنی چاہئیں جو خدا کی صفات ہیں مثلاً رحم ایک صفت ہے جو اللہ تعالیٰ میں ہے اور وہ اس کی وجہ سے رحمان و رحیم ہے پھر بندوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ وہ اپنے اندر صفت رحمت پیدا کریں اور ہر قابل رحم مخلوق کے ساتھ رحم کا معاملہ کریں اسی طرح خطاء و قصور معاف کرنے اور دوسروں کے عیب چھپانا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور بندوں کو بھی حکم ہے کہ وہ بھی اپنے اندر یہ صفت پیدا کریں۔

اخلاق کی تعریف سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اخلاق کا تعلق خدا اور بندے کے باہمی رشتے میں نہیں بلکہ ان تعلقات سے ہے جو انسانوں کے مابین قائم ہوتے ہیں۔ معاشی لین دین جو یا سیاسی معاملات، سماجی برتاؤ جو یا افراد خاندان سے سلوک، اسلام سب کو اخلاقی اصولوں کے مطابق انجام دینے کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن و سنت میں معاملات و معاشرت سے متعلق بالتفصیل ان صفات کا ذکر ہے جو خدا تعالیٰ کو پسند یا ناپسند ہیں اس مختصر باب میں ان سب کا احاطہ کرنا تو مشکل ہے اس لئے چند اہم صفات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

## پسندیدہ اخلاقی صفات

### 1- صبر:

اسلام کو انسانوں میں جو اجتماعی اور انفرادی نیکیاں مطلوب ہیں ان میں سے ایک ”صبر“ ہے غموں صبر کا مطلب بس یہ لے لیا جاتا ہے کہ موت، بیماری اور فقر و تنگ دستی جیسی مصیبتوں کو اس طرح برداشت کر لیا جائے کہ شور و فغاں اور شکوہ و شکایت کا اظہار نہ ہو اور کوئی ظالم اگر ظلم کرے تو اس کا انتقام نہ لیا جائے اور نہ تالہ و فریاد کیا جائے۔

مگر قرآن کی زبان میں ”صبر“ کا معنی اس سے بہت زیادہ وسیع اور عمیق ہے۔ مختصر الفاظ میں اس حقیقت کو کچھ اس طرح ادا کیا جاسکتا ہے کہ کسی نیک کام کے لئے صدیوں تکلیفوں اور ناگواریوں کو برداشت کرنا اور ناموافق حالات میں بھی حق اور سچائی پر مضبوطی سے سچ رہنا اور نیکی کے راستے پر کاربند رہنا صبر ہے۔ قرآن پاک نے صبر کو ایک ذریعہ اور قوت قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

”اے ایمان والو! (مشکلوں اور تکلیفوں میں) صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔“

### 2- سچائی اور راست بازی:

قرآن مجید میں جن اخلاقی صفات کی بہت زیادہ اہمیت و فضیلت معلوم ہوتی ہے ان میں ایک سچائی اور راست بازی بھی ہے۔ سچائی کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں کہ زبان سے غلط اور خلاف واقعہ بات نہ کی جائے بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں دل کی سچائی اور عمل کی سچائی بھی شامل ہے۔ دل کی سچائی کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا نفاق، دغا اور فریب نہ ہو اور عمل کی سچائی کا مطلب یہ ہے کہ جو عقیدہ اور قول ہو وہی عمل بھی ہو اور ظاہر و باطن میں پوری یکسانیت ہو جن بندوں کا حال یہ ہو وہی قرآن کی اصطلاح میں ”صادق“ ہیں۔ قرآن و سنت میں صدق کو مومن اور منافق کے درمیان وجہ امتیاز قرار دیا گیا ہے۔

### 3- عدل و انصاف:

جن اخلاقی اور معاشرتی امور پر اسلام نے سب سے زیادہ زور دیا ہے ان میں سے ایک عدل و انصاف بھی ہے۔ یہ دراصل راست بازی اور سچائی ہی کی ایک شکل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کے ساتھ بلا تردد رعایت وہ معاملہ کیا جائے اور اس کے بارے میں وہ خدا لگتی بات کی جائے جس کا وہ مستحق ہے۔ اس عدل و انصاف پر دنیا کا نظام قائم ہے جس قوم اور جس سماج میں عدل و انصاف نہ ہو وہ خدا کی رحمت سے محروم رہے گا اور دنیا میں اس کا انجام

نیت ہی بُرا ہوگا۔ قرآن پاک اور کتاب و نبوت کا مقصد ہی بتاتا ہے کہ لوگوں کے درمیان میزان قائم ہو اور میزان سے مراد عدل و انصاف ہی کے قوانین ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہدایت کی گئی ہے کہ معاملات میں عدل و انصاف کو اور سچی خدا لگتی بات کہنے کو اپنا اصول اور نصب العین بنا لو اور پوری دیانت داری اور خدا ترسی کے ساتھ اس فرض کو ادا کرو خواہ اس سے تمہیں یا تمہارے اقرباء و اعزاء کو کتنا ہی نقصان پہنچے لیکن حق و انصاف کے معاملہ میں کسی کی جانبداری نہ کرو اور نہ کسی غریب کو غریب و ناداری پر ترس کھا کر اس کی بے جا حمایت کرو۔ انصاف اور سچائی سب سے مقدم ہے۔ غریبوں کی غریب بھی اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ جاننے والا ہے اور وہی سب کا حقیقی والی ہے حتیٰ کہ اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف سے معاملہ کرو محض ان کی دشمنی کی بناء پر ان سے بے انصافی کا معاملہ روا نہ رکھا جائے اور ان کے حقوق پامال نہ کئے جائیں کیونکہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اپنوں سے انصاف کی تلقین تو سب نے کی ہے لیکن اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ دشمنوں کے ساتھ بھی عدل و انصاف کی تاکید کرتا ہے۔

#### 4۔ امانت :

سچائی اور راست بازی ہی کی ایک شکل امانت بھی ہے۔ امانت سے مراد محض یہی نہیں کہ کسی نے جو چیز کسی کے پاس رکھوا دی وہ مطالبے پر جوں کی توں واپس کر دی جائے بلکہ تمام حقوق و فرائض کا دیانت داری کے ساتھ ادا کرنا اور ہر قابل لحاظ بات کا لحاظ رکھنا بھی امانت کے مفہوم میں شامل ہے یہاں تک کہ کوئی شخص کسی معاملے میں مشورہ لے تو پوری خیر خواہی سے مشورہ دینا اور اس کے متعلق تمام رازوں کو محفوظ رکھنا بھی امانت ہے اس لئے قرآن پاک میں امانت کے وصف کو اختیار کرنے کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔

#### 5۔ عفو و درگزر :

مسلمان کو عفو و درگزر کی بھی تعلیم دی گئی ہے۔ عفو سے مراد یہ ہے کہ دوسرے کی خطا اور قصور کو معاف کر دیا جائے اور انتقام کی طاقت رکھتے ہوئے بھی بخش دیا جائے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ایک طرف پھنسر کھانے کے بعد منہ کی دوسری طرف بھی پیش کر دی جائے اس سے تو شریک و عناصر کی اور بھی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ عفو صرف اس صورت میں مناسب ہے جبکہ غلطی کرنے والا کسی حد تک اپنی غلطی پر ناام ہو۔ بعض لوگ عفو و درگزر کو اپنے رعب و عزت کی کمی کا باعث تصور کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انتقام سے فوری دھاک تو بیٹھ سکتی ہے مگر پائیدار عزت عفو و درگزر سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

## 6۔ رواداری

خفو و درازداری سے لائق جلتی ایک صفت رواداری ہے۔ رواداری سے مراد یہ ہے کہ باہمی تعلقات میں خیر خواہی سے کام لیا جائے اور دوسرے کی معمولی غلطیوں اور خطاؤں پر کڑت نہ کی جائے۔ رواداری کی بناء پر معاشرے میں اخوت اور بھائی چارہ کے جذبات پرورش پاتے ہیں۔

## 7۔ احسان:

اپنی نوعیت کے اعتبار سے عفو اور رواداری واصل احسان کی مختلف شکلیں ہیں۔ احسان کے معنی یہ ہیں کہ کسی کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جائے جو اس کے لئے فائدہ مند ہو اور یہ برتاؤ عقلاً اور شرعاً صحیح ہو۔ احسان کی مختلف بے شمار صورتیں ہیں مثلاً ضرورتمندوں اور رشتہ داروں کی مالی مدد کرنا، کسی کو مصیبت سے نجات دلانا، کسی کے حق کو خوبی اور سخاوت سے ادا کرنا احسان کی یہ شکل ”فضل“ کہلاتی ہے یعنی کسی کے حق کو نہ صرف پورا کرنا بلکہ اس سے کچھ زیادہ ادا کرنا یا کسی سے اپنا حق وصول کرتے وقت رعایت کر دینا یا اس کو بالکل چھوڑ دینا۔

پھر احسان صرف حقوق العباد کے ادا کرنے میں ہی محدود نہیں ہے بلکہ حقوق اللہ کی ادائیگی میں بھی یہ مطلوب ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ احسان اسے کہتے ہیں کہ سارے حقوق و فرائض اس طرح ادا کئے جائیں جیسا کہ ان کے ادا کرنے کا حق ہے۔

## 8۔ مساوات:

معاشرتی محاسن میں مساوات کا بھی بڑا اعلیٰ مقام ہے۔ اسلام میں مساوات سے مراد دو باتیں ہیں ایک قانونی مساوات اور دوسری معاشرتی مساوات۔ قانونی مساوات کے تحت تمام افراد ملت کے لئے ایک ہی قانون ہے غلام ہو یا آزاد، امیر ہو یا غریب، عالم ہو یا جاہل سب کے لئے قانون کی پابندی یکساں ضروری ہے۔ کسی کو کسی بناء پر کوئی برتری اور فوقیت حاصل نہیں پھر اسی قانونی مساوات سے یہ بھی مراد ہے کہ ہر ایک کو ترقی کے فوائد جو کہ علمی ہوں یا معاشی یا معاشرتی یکساں حاصل ہیں۔

معاشرتی مساوات سے مراد یہ ہے کہ نشست و برخاست میں، عبادت میں، سماجی تقریبات میں یا عام اجتماعی زندگی میں کسی کو اولیت و فضیلت حاصل نہیں۔ امیر و غریب مسجد میں شانہ بٹانہ کھڑے ہوں گے۔ تقریبات میں ایک دوسرے کے قریب بیٹھیں گے، دعوتوں میں ایک ہی دوش سے کھائیں گے کیونکہ اسلام میں نہ اونچ نیچ ہے اور نہ برتری و کستری ہے۔

## 9۔ اخوت:

پھر اسلام صرف اسی پر بس نہیں کرتا کہ اونچ نیچ کو صرف منفی انداز سے ختم کرے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایجابی طور پر اس بات کی تعلیم بھی دیتا ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اس لحاظ سے ان کے تعلقات ایسے ہونے چاہئیں جیسے بھائیوں کے ہوتے ہیں یعنی ان میں باہمی شفقت اور ترحم ہو اور آپس میں ان کا معاملہ نرمی اور فروتنی کا ہو۔ ہر ایک دوسرے کا خیر خواہ، خدمت گزار اور نیازمند ہو اور جو چیزیں تعلقات کو خراب کرنے والی دلوں میں کدورت پیدا کرنے والی ہو سکتی ہیں مسلمان ان سب سے اجتناب کریں۔

اخوت کے یہ تعلقات ایک جانب تو ملت اسلامیہ کو ایک قوم کی حیثیت سے مستحکم کرتے ہیں اور دوسری جانب ایک پُر امن اور صالح معاشرہ کے ضامن ہیں۔

## 10۔ تقویٰ:

اخلاقی محاسن جن میں سے چند کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اسلام کے نزدیک صرف اس صورت میں قابل تعریف ہیں جب ان سے خدا تعالیٰ کی رضامندی مقصود ہو۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور مقصود ہے تو ان محاسن کے بہتر معاشرتی اور سماجی نتائج یقیناً قوانین نفسیات و عمرانیات کے تحت نکلیں گے لیکن اخوت میں سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔

”اسلامی اخلاقیات کی بنیاد خوف خدا ہے یہی خوف خدا جب انسان اپنی پوری زندگی پر محیط کر لیتا ہے اور جب وہ ہر قدم اٹھانے سے پہلے یہ سوچتا ہے کہ کہیں یہ خدا کو ناپسند تو نہیں تو اس کا یہ وصف تقویٰ کہلاتا ہے۔“

تقویٰ کے دو لوازم ہیں ایک تو زندگی کے ہر شعبہ میں خدا کی عمل اطاعت اور دوسرے اپنے اعمال کا مجاہدہ کرتے ہوئے مزید نیکی کرنے کی مسلسل کوشش۔ قرآن کریم میں جہاں تقویٰ و نیکی کی تعلیم دی گئی ہے وہیں متقی لوگوں کے لئے آخرت کی زندگی میں فوز و فلاح کی بشارت بھی سنائی گئی ہے اس کے برخلاف وہ لوگ جو خدا کی نافرمانی کرتے ہیں ان کے لئے جہنم کی وعید ہے۔

قرآن کریم میں جہاں پسندیدہ اخلاق کا ذکر ہے وہاں ناپسندیدہ اوصاف بھی گنا دیئے گئے ہیں تاکہ انسان ان سے بچ کر اپنی آخرت کی زندگی بہتر بنا سکے۔



## عفو و درگزر

عفو کا مفہوم:

عفو کا لغوی معنی ”مٹانے“ کے ہیں۔ شرعی اصطلاح میں ”عفو“ مغفرت اور معافی کو کہتے ہیں۔ اس زیادتی کی معافی جس کا بدلہ لے سکتے کے باوجود نہ لیا جائے اور معاف کر دیا جائے عفو کہلاتا ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ کا مشہور فرمان ہے:

”عفو قادر ہونے کی صورت میں ہوتا ہے بے بسی میں کوئی عفو نہیں ہے۔“

اگرچہ عفو بہت اچھی خصلت ہے مگر ایک چیز کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ اگر معاف کر دینے سے تکلیف دینے اور تنگ کرنے والے کا حوصلہ بڑھتا ہو اور معافی کی صورت میں اس کی طرف سے مزید زیادتی کا خطرہ ہو تو پھر معافی کی بجائے مناسب سزا دینا زیادہ بہتر ہے۔

عفو و درگزر کی اہمیت قرآن کی روشنی میں:

1- والکاظمین العقیظ والعافین عن الناس واللہ یحب المحسنین (آل عمران)  
”اور وہ غصے کو پی جاتے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکاروں کو پسند کرتا ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ عفو و درگزر کا اخلاق میں بڑا بلند مقام ہے۔  
2- ظلم و زیادتی کا مناسب بدلہ لینے کا قانونی جواز ہے لیکن برداشت کرنا اور معاف کر دینا بڑی بلند ہمتی کا کام ہے۔ ارشاد فرمایا:

ولمن صبر و غفر ان ذالک من عزم الامور  
”اور جو بندے برداشت کر لیں اور معاف کر دیں تو یہ بڑی عزیمت اور بلند ہمتی کی بات ہے۔“

3- جو لوگ آخرت میں خصوصی انعامات کے حق دار ہوں گے ان کے اوصاف میں سے ایک وصف بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:  
واذا ما غضبوا ہم یغفرون

اور جب (کسی شرارت اور بدتمیزی پر) ان کو غصہ آ جاتا ہے تو وہ (انتقام نہیں بلکہ) معاف کر دیتے ہیں۔“

4- قصور والوں کی کوتاہیوں کو معاف کرنے کی بہت دلنشین اور مؤثر انداز میں ترغیب دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ولیعفوا ویصفحوا الا ترحمون ان یغفر اللہ لکم واللہ غفور رحیم  
 ”اور انہیں (ایمان والوں کو) چاہئے کہ معاف کر دیں اور درگزر دے کام لیں۔ کیا تم یہ  
 نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کر دے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“  
 پتہ چلا کہ جو بندہ اللہ کی بخشش اور فضل و کرم کا مستحق ہے تو اس کا آسان نسخہ یہ ہے کہ  
 دوسروں کے ساتھ مہربانی اور درگزر کا معاملہ کرے۔

5- قریب قریب یہی مضمون سورہ تغابن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے فرمایا:

وان تعفوا و تصفحوا و تغفروا فان اللہ غفور رحیم  
 ”اگر تم درگزر کیا کرو اور نظر انداز کر دیا کرو اور معافی دے دیا کرو تو اللہ بھی بہت بخشنے  
 والا مہربان ہے۔“

6- اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو خصوصی طور پر اس کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

خذ العفو وأمر بالعرف وأعرض عن الجاهلین  
 ”(لوگوں کی بے ہودہ باتوں اور جاہلانہ حرکتوں سے) آپ درگزر کرنے اور معاف کر  
 دینے کا شیوہ اختیار کیجئے اور نیک کاموں کے لئے کہتے رہئے اور ان جاہلوں بے سمجھوں (کی  
 جاہلانہ باتوں) کا کچھ خیال نہ کیجئے اور کوئی اثر نہ لیجئے۔“  
 7- عفو و درگزر کی تلقین کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا:

فاعفوا و اصفحوا حتی یأتی اللہ بامرہ (البقرہ: 109)

”تو تم معاف کر دو اور درگزر کر دو حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اپنا (دوسرا) حکم بھیجے۔“

8- اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو اس کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

فاعف عنہم واستغفر لہم و شاوہم فی الامر (آل عمران: 159)

”تم انہیں معاف کر دو اور ان کے لئے مغفرت مانگو اور اپنے کاموں میں ان سے مشورہ  
 لیا کرو۔“

9- اسی طرح کا مضمون اللہ تعالیٰ نے سورہ المائدہ میں بھی بیان کیا ہے فرمایا:

فاعف عنہم و اصفح ان اللہ یحب المحسنین (المائدہ: 13)

”تو ان کی خطائیں معاف کر دو اور ان سے درگزر کرو کہ اللہ احسان کرنے والوں کو  
 دوست رکھتا ہے۔“

10- و جزاء سنیۃ سنیۃ مفلحاً فمن عفا و اصلح فاجره علی اللہ (الشوریٰ: 40)

”اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے مگر جو معاف کرے اور (معاظی کو) درست  
 کر دے تو اس کا بدلہ اللہ کے ذمہ ہے۔“

عذوبہ و درگزر حدیث رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں:

1- حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! میرے کچھ رشتہ دار ہیں، میں ان سے صلہ رحمی کرتا ہوں (تعلقات جوڑتا ہوں) اور وہ مجھ سے قطع تعلقی کرتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہوں وہ مجھ سے بدسلوکی کرتے ہیں۔ میں ان سے حلم و درگزر سے پیش آتا ہوں اور وہ مجھ سے جہالت سے پیش آتے ہیں۔ (یہ ساری باتیں سن کر) آپ ﷺ نے فرمایا:

لئن كنت كما قلت لكانما تسفهم المل ولا يزال معك من الله ظهير عليهم ما دمت ذالک (مسلم)

”اگر تو ایسا ہی ہے جیسا کہ تم نے کہا ہے تو تم ان کے منہ میں گرم راکھ ڈال رہے ہو اور جب تک ایسا کرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے خلاف تمہارے ساتھ ایک بددگار رہے گا۔“

2- اللہ تعالیٰ غصہ کرنے والوں کی عزت میں اضافہ کرتا ہے فرمایا:

وما زاد الله رجلا بقولا ولا عزا (صحیح بخاری)

”اللہ تعالیٰ غصہ و درگزر کرنے والوں کی عزت میں اضافہ کر دیتا ہے۔“

3- بعض دفعہ کسی کی بدزبانی اور بدسلوکی پر انسان کو غصہ آ جاتا ہے جس سے فساد پھیل جاتا ہے کیونکہ غصہ شیطان کے درغلانے سے آتا ہے اور شیطان معاشرے میں امن و سکون کو پسند نہیں کرتا چنانچہ غصہ پر قابو کرنے کی تلقین کرتے ہوئے رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ان الغضب من الشيطان وان الشيطان خلق من النار وانما طغيا النار بالماء فاذا غضب احدكم فليمتوضا (ابو داؤد)

”غصہ شیطان سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ کو پانی بجھا دیتا ہے تو جس کو غصہ آئے اسے وضو کر لینا چاہئے۔“

4- ایک مرتبہ آپ ﷺ نے فرمایا:

ليس الشديد بالصرعة انما الشديد الذي يملك نفسه عند الغضب

(صحیح بخاری)

”پہلوان وہ نہیں ہے جو دوسرے کو پچھاڑ دے بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصے کی حالت میں اپنے اوپر کنٹرول کر سکے۔“

5- ایک روایت میں آپ ﷺ نے غصہ کی حوصلہ شکنی اور غصہ کی تلقین اس انداز میں فرمائی:

فلات من كن فيه آواه الله في كفه وستر عليه برحمته وادخله في محبته من

اذا أعطی شکر و اذا قدر غفر و اذا غضب فتر (مستدرک حاکم)

”جن میں تین باتیں ہوں گی اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے گا:

(i) اللہ کی دی ہوئی نعمتوں پر شکر گزاری کرے۔ (ii) جب (بدلہ لینے کی) قدرت ہو تو

معاف کر دے۔ (iii) جب غصہ آئے تو خاموش ہو جائے۔“

6- ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من دفع غضبه دفع الله عنه عذابه ومن حفظ لسانه ستر الله عورته (معجم طبرانی)

”جس نے غصے کو روک لیا اللہ تعالیٰ اس سے اپنا عذاب ہٹا لے گا اور جس نے اپنی

زبان کی حفاظت کر لی تو اللہ تعالیٰ اس کے عیوب پر پردہ ڈال دے گا۔“

7- ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

من كظم غيظا وهو قادر على ان ينقله دعاه الله سبحانه وتعالى على رؤس

الخلائق حتى يخبره من المحور ماشاء الله (ابوداؤد ترمذی)

”جس نے غصے کو دبا لیا حالانکہ وہ بدلہ لینے پر قادر تھا تو اللہ تعالیٰ اسے (قیامت کے

روز) سب مخلوق کے سامنے بلائے گا اور اختیار دے گا جس حور کو چاہے پسند کر لے۔“

8- غنود درگزر کرنے والا اللہ تعالیٰ کو بہت عزیز ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

قال موسى ابن عمران يا رب من اغر عبادك قال من اذا قدر غفر (تبیخی)

”موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے درخواست کی کہ پروردگار تیرے بندوں میں سے کون سا

بندہ تیرے نزدیک زیادہ پیارا ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو قادر ہو کر معاف کر دے۔“

9- بے جا غصہ کرنے سے ایمان خراب ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان الغضب ليقسد الايمان كما يفسد المصبر العسل (تبیخی)

”غصہ ایمان کو اس طرح خراب کر دیتا ہے جس طرح ایلا شہد کو خراب کر دیتا ہے۔“

10- غصے کے دبانے اور دور کرنے کی حدیث میں یہ تین صورتیں بتائی گئی ہیں:

(i) غصے کے وقت اعوذ بالله من الشيطان الرجيم پڑھنا۔ (ii) وضو کر لینا یا پانی پی

لینا۔ (iii) زمین پر لیٹ جانا۔

غنود درگزر کی اسوۂ حسنہ سے چند مثالیں:

رسول رحمت ﷺ کی سیرت طیبہ میں غنود درگزر کی بے شمار اور نہایت اعلیٰ مثالیں ہیں

چند مثالیں درج ذیل ہیں:

\* رسول اکرم ﷺ کو جب طائف والوں نے پتھر مارے تو آپ ﷺ لبوہان ہو گئے اس

اثناء میں جبریل امین علیہ السلام نے آ کر سلام کہا اور بتایا کہ یہ پہاڑوں کا فرشتہ

میرے ساتھ ہے پھر اس فرشتے نے سلام کیا اور عرض کیا: مجھے طائف والوں کی بدسلوکی کا پتہ ہے مجھے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کا حکم ماننے کے لئے بھیجا ہے۔ اگر آپ ﷺ چاہیں تو میں انہیں (طائف کے) ان دو پہاڑوں کے درمیان پیس دوں تو رسول رحمت ﷺ نے فرمایا:

بَلْ ارْجُوْا اَنْ يَخْرُجَ اللّٰهُ مِنْ اَصْلَابِهِمْ مِنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ وَحْدَهُ لَا شَرَكَ لَهُ (متفق علیہ)

”نہیں (میں یہ بھی نہیں چاہوں گا) بلکہ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشتوں سے ایسے لوگ پیدا فرمائے گا جو صرف ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔“

☆ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی چیز کو عورت کو نہ خادم کو اپنے ہاتھ سے بھی نہیں مارا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتے تھے (جس میں دشمن سے قتال کرتے) اور ایسا بھی بھی نہیں ہوا کہ آپ ﷺ کو کسی کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچی ہو اور آپ ﷺ نے اس تکلیف پہنچانے والے سے بدلہ لیا ہو مگر جب اللہ تعالیٰ کے محرم میں سے کسی حرمت کی پامالی ہوئی ہو تو پھر آپ ﷺ اللہ (تعالیٰ کی خوشنودی) کیلئے انتقام لیتے تھے۔“ (متفق علیہ)

☆ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں رسول اکرم ﷺ کے ساتھ جا رہا تھا اور آپ ﷺ کے اوپر موئے کنارے والی چادر تھی۔ ایک دیہاتی آپ ﷺ سے ملا اور اس نے بڑے زور سے آپ ﷺ کی چادر کو پکڑ کر کھینچا میں نے نبی اکرم ﷺ کے کندھے کی جانب دیکھا تو چادر کے شدت سے کھینچنے کی وجہ سے نشان پڑ چکے تھے پھر اس نے کہا: ”اے محمد! اللہ تعالیٰ کا جو مال تیرے پاس ہے اس میں سے میرے لئے بھی (عطا کرنے کا) حکم دو۔“ آپ ﷺ نے اس کی طرف دیکھا تو مسکرا دیئے پھر آپ ﷺ نے اسے عطا کرنے کا حکم صادر فرمایا۔“ (متفق علیہ)

☆ حضرت ابن مسعودؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک نبی کا واقعہ بیان کیا کہ ان کی قوم نے انہیں بار بار کر ابو لہبان کو دیا تھا اور وہ اپنے چہرے سے خون صاف کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے:

اللّٰهُمَّ اَعِدْ قَوْمِيْ فَاتَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (متفق علیہ)

”اے اللہ! میری قوم کو معاف کر دے کیونکہ وہ (میرے مقام و مرتبے کو) جانتے نہیں ہیں۔“

عالمِ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھ پیش آنے والے طائف کے واقعے کی طرف اشارہ

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

کیا تھا۔

\* صنم حدیبیہ کے موقع پر اپنی طرف صنم کی بات چیت جاری تھی اور دوسری طرف قریش نے رسول اکرم ﷺ کے ان کی منصوبہ بنا کر اتنی آدمیوں کو بھیجا لیکن وہ سب پکڑے گئے مگر رسول رحمت ﷺ نے سب کو معاف کر دیا۔

\* آپ ﷺ کی آستین کا سانپ عبداللہ بن ابی جس نے آپ ﷺ کے گھر پر بھی حملہ کیا کہ بڑے خود رسول اللہ ﷺ کے گھر آنے کو حضرت عائشہؓ پر تہمت کے ذریعے دیا جس رسوا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ کئی مرتبہ انصار و مہاجرین کو باہم لڑانے کی کوششیں کیں مگر رسول اللہ ﷺ نے پھر بھی معاف کر دیا حتیٰ کہ نماز جنازہ کے لئے بھی تیار ہو گئے۔

## عفو کے فوائد نتائج و ثمرات اور انسانی زندگی پر اثرات

### 1- عفو باعث تقویٰ:

عفو و درگزر سے انسان کے اندر تقویٰ کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ فرمان خداوندی ہے:

وَانْ تَعْلَمُوا الْقُرْبَ لِلتَّقْوَىٰ (البقرہ: 237)

”اور یہ کہ تم معاف کر دو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔“

### 2- خوشگوار تعلقات کا نسخہ:

انسانی معاشرے میں امن و سکون اور خوش گواری پر مبنی تعلقات اسی وقت قائم رہ سکتے ہیں جب باہم ایک دوسرے کی غلطیاں اور خطائیں معاف کرنے کا جذبہ پیدا ہو بصورت دیگر تعلقات کشیدہ ہو جائیں گے اور آخر کار منقطع ہو کر دشمنی پیدا ہو جائے گی۔

### 3- محبت الہی کا حصول:

دوسروں کی غلطیوں کو معاف کر دینے سے اللہ رب العزت کی محبت حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالْكَافِرِينَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (آل عمران: 134)

### 4- نسلی فسادات کا خاتمہ:

اگر باہمی معاف کرنے اور درگزر کا جذبہ نہ ہو بلکہ انتقام کا سلسلہ ہو تو یہ معاملہ نسل در نسل چلتا ہے۔ اس میں پھر کتنی جائیں ضائع ہو جاتی ہیں اس کے پچھلے اگر عفو و درگزر سے کام

ایلا جائے تو یہ نسلی فسادات ختم ہو سکتے ہیں۔

### 5- اخلاقی اقدار کا فروغ:

جس معاشرہ کے افراد ایک دوسرے کو معاف کر دینے والے ہوں گے وہاں ایک دوسرے کے لئے محبت اور ایک دوسرے کا احساس پیدا ہوگا اس طرح اس معاشرے میں اخلاقی قدروں کو فروغ حاصل ہوگا۔

### 6- دشمنیوں کا خاتمہ:

معاف کر دینے کی وجہ سے دشمن کے دل میں بھی بندے کی قدر و منزلت پیدا ہوتی ہے اور وہ دشمنی سے باز آ جاتا ہے اس طرح آپس کی دشمنیوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔

### 7- ایثار و قربانی کا جذبہ:

دوسروں کی خطا میں اور کوتاہیاں معاف کر دینے والے بندے میں ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے کیونکہ وہ ایثار کرتے ہوئے ہی اپنا نقصان ہونے کے باوجود دوسروں کو معاف کرتا ہے۔

### 8- تقویٰ کا ذریعہ:

عفو و درگزر تقویٰ کا ذریعہ ہے۔ ارشاد الہی ہے:

وَان تَعْفُوا اقْرَبُ لِلتَّقْوٰی

”عفو و درگزر تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔“

### 9- دشمنی دوستی میں بدل جاتی ہے:

عفو سے محبت کی دنیا میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ دشمن دوست ہو جاتے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

ادْفَعْ بِاللّٰہِ ہِیْ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهُ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهُ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ

”برائی کو اچھائی سے دور کر پھر تو تیرا دشمن بھی جگری دوست بن جائے گا۔“

### 10- امن و سکون کی قضاء:

اس سے معاشرہ کی سالمیت اور استحکام برقرار رہتا ہے۔ انسانی معاشرے میں امن و سکون کی قضاء قائم رہتی ہے۔ باقی حسد، عناد اور بغض و عداوت کی قضاء ختم ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”آپس میں ایک دوسرے کو معاف کر دیا کرو تمہارے باہمی کہنے دور ہو جائیں گے۔“

# اعتدال پسندی / میانہ روی

## (Modération)

اعتدال اور میانہ روی افراد یا اقوام کی معاش اور معیشت کو بحال اور برقرار رکھتی ہے جبکہ اسراف و تبذیر اسے تنگدست اور کنگال بنا ڈالتی ہے۔ ”اسراف“ ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اور ”تبذیر“ ناجائز باتوں پر خرچ کرنا۔ قرآن کریم میں ان دونوں سے منع کیا گیا ہے۔

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ (الاعراف: 31)

”اور کھاؤ اور پیو لیکن اسراف نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

ان المبذرين كانوا اخوان الشياطين وكان الشيطان لربه كفورا (بنی اسرائیل: 27)

”فصول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان تو اپنے رب کا ناشکرا

ہے۔“

”عدل“ کا ایک معنی ”اعتدال“ (میانہ روی) بھی ہے یعنی کسی معاملے میں بھی افراط و تفریط کا ارتکاب نہ کیا جائے حتیٰ کہ دین کے معاملے میں بھی کیونکہ دین میں افراط (زیادتی) اضافہ کا نتیجہ غلو ہے اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ (المائدہ: 77)

دین میں ”غلو“ سخت مذموم ہے اور تفریط دین میں کوتاہی ہے اور یہ بھی ناپسندیدہ ہے۔ اسی لئے تو نبی اکرم ﷺ نے ساری رات عبادت کرنے والے کے ہارے میں فرمایا:

ان في جسدك حق، ان في زوجك حق (صحیح بخاری)

اس شخص کو آپ ﷺ نے ساری زندگی روزے رکھنے سے منع فرما دیا جس نے ساری زندگی روزے رکھنے کا ارادہ کیا تھا اور فرمایا:

لا صام من صام الدهر (مسند احمد)

”اس شخص کا کوئی روزہ نہیں ہے جس نے زندگی بھر روزے رکھے۔“

اسلام نے اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔ دولت کو تمام افراد ملت میں تقسیم کرنے اور مالداروں کے مال میں ناداروں کو حصہ دار بنانے کا اچھا انتظام کیا ہے۔ ہر شخص کو کفایت شعار کا درس دیا ہے تاکہ لوگ افراط و تفریط کی روش اختیار کر کے معاشی توازن کو نہ بگاڑ دیں۔ قرآن مجید کی جامع تعلیم ملاحظہ ہو۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا

محسورا۔ (بنی اسرائیل)



”نہ اپنے ہاتھوں کو گردن سے باندھے رکھ اور نہ ہی اس کو بالکل ہی کھول دے کہ بعد میں حسرت زدہ بن کر بیٹھا رہے۔“

والذین اذا انفقوا لم يسرفوا ولم يقتلوا وكان بين ذلك قواما.

”اللہ کے نیک بندے وہ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل کرتے ہیں بلکہ ان دونوں کے مابین معتدل رہتے ہیں۔“

اس تعلیم کا فٹا یہ ہے کہ اپنے اقتصادی وسائل کی حدود میں رہ کر خرچ کیا جائے۔ یعنی اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کسی صورت میں نہیں ہونا چاہئے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب عیاشی اور فضول خرچی سے اجتناب کیا جائے اور بے دریغ دولت کو پانی کی مانند نہ بہایا جائے۔ سورۃ النبی اسرا اہل میں ہے:

”اور اپنے رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین اور مسافر کو فضول خرچی نہ کرو۔ فضول خرچ شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکر ہے۔“

کہا جاتا ہے کہ اقتصادِ غریب کا خزانہ ہے۔ اسلام میں صرف جائز ضروریات زندگی پر خرچ کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اسلام نے فضول خرچی کو اخلاقی تعلیم کے علاوہ قوانین بھی مقرر کر رکھے ہیں۔ شراب، زنا اور جوئے وغیرہ سے نہ صرف منع کرتا ہے۔ بلکہ ارتکاب کرنے والوں کو کڑی سزائیں بھی دیتا ہے۔ لہو و لعب اور دیگر مسرفانہ مشاغل پر پابندی لگاتا ہے۔ قیمتی ملبوسات، زرد و جواہر سونے چاندی کے ظروف اور جاندار چیزوں کے مجموعے سے منع کرتا ہے۔ مگر جائز حد تک تزئین و آرائش کی اجازت ہے۔ حدیث مبارکہ میں ہے:

”وہ محتاج نہ ہوا جس نے میانہ روی اختیار کی۔“ (مسند احمد)

”مسلمان مردوں اور عورتوں کو جائز نہیں کہ سونے چاندی کے برتن استعمال کریں۔“

(بخاری)

”چاندی کے برتن میں جو کھانا پیتا ہے جہنم کی آگ میں وہ اس کے پیٹ میں کھولیں

گا۔“ (بخاری)

اسلام میں سادہ زندگی گزارنے کی تلقین کی گئی ہے۔ زیادہ نمود و نمائش اور ظاہری غمٹا ہاتھ سے پرہیز بہتر ہے۔

ولا تسرفوا انه لا يحب المسرفين. (الانعام 141)

”اور بے جا خرچ نہ کرو! اسے بے جا خرچ کرنے والے پسند نہیں آتے۔“

”اے اولادِ آدم نماز کے وقت آرائش لے لو کھاؤ پیو فضول خرچ نہ کرو۔ اس کو بے جا خرچ کرنے والے خوش نہیں آتے۔“ (الاعراف 31)

اسلام کا مزاج یہ ہے کہ مادی سازد سامان سے بے نیازی کے ساتھ اس کو برتنے میں

سیارہ روی اختیار کی جائے۔ قلب مسلم کا ذوق و احساس راہ اعتدال کو خوب جانتا ہے۔

## قطع رحمی کے مقابلے میں صلح رحمی

اسلام قطع رحمی کی سخت حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

لا يدخل الجنة قاطع رحم (صحیح بخاری)

”رشتہ داری کو قطع کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔“

رشتہ داری توڑنے سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور معاشرے میں خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فهل عسىٰم ان توليتم ان تفسدوا في الارض و تقطعوا ارحامكم اولئك الذين لعنهم الله فاصمهم واعصم ابعصارهم (محمد: 22-23)

”پس اگر تم حاکم بن جاؤ تو قریب ہے کہ زمین میں فساد پھیلاؤ اور قطع رحمی کرو یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی“ سو انہیں بہرا کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔“ اور ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

ويقطعون ما امر الله به ان يوصل و يفسدون في الارض اولئك هم الخاسرون (البقرہ: 27)

”اور جو ان رشتوں کو قطع کرتے ہیں جنہیں اللہ نے ملانے کا حکم دیا ہے اور زمین میں فساد مچاتے ہیں یہی لوگ نقصان اٹھاتے ہیں۔“ بدخلق رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرنا:

قرآن و حدیث میں صلہ رحمی کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ نفس تعلقی اور قطع رحمی سے حتی الامکان گریز کرنا چاہئے یہاں تک کہ اگر کوئی بدخلق کا مظاہرہ کرے اور تعلقات کو منقطع کر رہا ہو تو اس سے بھی تعلقات جوڑنے کی ہی کوشش کرنی چاہئے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

ليس الواصل بالمكافئ ولكن الواصل الذي اذا قطعت رحمه وصلها (صحیح بخاری)

”رشتہ جوڑنے والا وہ نہیں جو احسان کے بدلے احسان کرے بلکہ وہ ہے جس کا رشتہ کاٹا جائے مگر وہ جوڑ دے۔“

اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

صل من قطعك

”اس سے تعلق جوڑ جو تجھ سے تعلق توڑتا ہے۔“

حضرت ابوذر غفاریؓ بیان کرتے ہیں کہ

”مجھے میرے حبیب (حضرت محمد ﷺ) نے وصیت کی کہ تم رشتہ داروں سے نیک سلوک ہی کرنا اگرچہ وہ تم سے بدسلوکی سے پیش آئیں۔“ (مسند احمد)

**صلح صفائی کروانا:**

خاندانی معاملات میں اختلاف رائے ہو جانا فطری بات ہے لیکن بعض اوقات اختلاف کی نوبت لڑائی بھگڑنے تک پہنچا دیتی ہے اور تنازعہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو ایسی صورت میں رشتہ داروں کے مابین صلح صفائی کروانا اور معاملے کا تصفیہ کروانا بھی حقوق کی ادائیگی میں آتا ہے اور یہ نیک بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَاصْلَحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ (الانفال: 1)

”پس اللہ تعالیٰ سے ڈرئے رہو اور باہمی معاملات کو درست کرو۔“

**خوشی اور غمی میں شرکت:**

مسلمان دوسرے مسلمان کی خوشی و غمی میں امیر و غریب کی تفریق کئے بغیر شرکت کرے لیکن اس کا مقصد رضائے الہی کا حصول ہو جبکہ کسی رشتہ دار کی خوشی میں شرکت کرنے سے اس کی خوشی میں اضافہ اور غمی میں شرکت ہونے سے غم میں کمی آ جاتی ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

”جو کسی مسلمان کا غم اور تکلیف دور کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا غم دور کرے گا۔“ (ابوداؤد)

اگر بیمار ہو تو اس کی عیادت کی جائے اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں ان کی حوصلہ افزائی کی جائے اس سے باہمی تعلقات خوشگوار ہوتے ہیں۔



# عظمت انسانی اور فرد کا مقام

## اسلام اور عظمت انسان:

ہمارے پیارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری سے پہلے انسان ذلت و کمیت کی پستی میں گر چکا تھا اور روئے زمین پر اس سے زیادہ ذلیل و حقیر چیز نہیں رہ گئی تھی۔ بعض مقدس حیوان اور اشجار جن سے اساطیری (Legendary) روایات اور معتقدات وابستہ تھے وہ اپنے پرستاروں کے نزدیک زیادہ مکرم و محترم تھے اور انسان کے مقابلے میں انہیں حفاظت کا زیادہ مستحق سمجھا جاتا تھا۔ خواہ اس کے لئے معصوموں کا خون ہی کیوں نہ بہانا پڑے۔ ایسے شجر و حجر کے آگے انسان کا گوشت اور خون بھی بے تکلف اور ضمیر کی خلش کے بغیر پیش کر دیا جاتا تھا۔ اس کی مکروہ تصویریں اس بیسویں صدی میں ہندوستان جیسے بعض ترقی یافتہ ممالک میں بھی دیکھی گئی ہیں۔

رسول کریم ﷺ نے انسانیت کو اس کی شرافت و عظمت واپس کی۔ اس کا کھویا ہوا وقار و اعتبار بحال کیا اور یہ اعلان کیا کہ انسان اس کائنات کا سب سے قیمتی وجود اور گر انقدر جوہر ہے اور یہاں اس سے زیادہ باعظمت اور محبت و حفاظت کی مستحق کوئی اور شے نہیں۔ آپ ﷺ نے انسان کا درجہ اتنا بلند کیا کہ وہ اللہ کا نائب و خلیفہ قرار پایا جس کے لئے اس نے دنیا پیدا کی اور اسے اپنے لئے پیدا کیا:

هو الذي خلق لكم ما في الارض جميعا. (البقرہ)

”وہی خدا ہے جس نے زمین کی تمام اشیاء کو تمہارے لئے پیدا کیا۔“

## انسان اشرف المخلوقات:

قرآن نے انسان کو اشرف المخلوقات اور صدر کائنات بتایا:

ولقد کبرنا بنی آدم و حملنهم فی البر والبحر و رزقنهم من الطیبت و فضلنا ہم علی کلیم ممن خلقنا تفضیلا. (الاسراء)

”ہم نے ہنی آدم کو عزت دی اور ہم نے انہیں خشکی اور دریا و دونوں میں سوار کیا اور ہم نے ان کو نفیس چیزیں عطا کیں اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر بڑی فضیلت دی۔“

اس ارشاد نبوی ﷺ سے زیادہ انسان کی عزت و عظمت کے بارے میں اور کیا کہا جا

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

سکتا ہے۔

الخلق عیال الله فاحب الخلق الى الله من احسن الى عیاله. (سنن بیہقی)  
 ”اللہ کی مخلوق خدا کا کلبہ ہے۔ اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کلبے کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے۔“

**انسانی خدمت ذریعہ تقرب الہی:**

انسانی رفعت اور اس کی خدمت کے ذریعے تقرب الہی حاصل کرنے کے سلسلہ میں یہ حدیث بہت بلیغ اور معنی خیز ہے جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے روایت کیا ہے:

”اللہ عزوجل قیامت کے دن پوچھیں گے اے ابن آدم! میں پیار پڑا مگر تو نے میری عیادت نہیں کی؟ آدمی کہے گا یا رب آپ رب العالمین ہیں میں آپ کی عیادت کیسے کرتا؟ اس پر اللہ عزوجل فرمائیں گے کیا تمہیں علم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا مگر تو نے اس کی عیادت نہیں کی؟ کیا تجھے نہیں معلوم کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔“

اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا؟ آدمی کہے گا خدایا! آپ تو دنیا کے مربی تھے میں آپ کو کیسے کھلاتا؟ اللہ عزوجل فرمائیں گے کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا مگر تو نے اسے کھانا نہیں دیا اگر تو اسے کھلاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔“

اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا لیکن تو نے مجھے پانی نہیں دیا؟ آدمی کہے گا الہی! آپ تو رب العالمین ہیں میں آپ کو کیسے پانی پلاتا؟ اللہ عزوجل فرمائیں گے کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا مگر تو نے اسے پانی نہیں دیا اگر تو اسے پانی پلاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔“ (صحیح مسلم)

کیا انسانی رفعت و عظمت کا اس سے زیادہ واضح اور صریح کسی اعلان کا تصور کیا جاسکتا ہے جسے دین توحید نے پیش کیا ہے؟ اور دنیا کے قدیم و جدید کے کسی دین و فلسفہ کے تحت انسان نے کبھی ایسی عظمت و منزلت حاصل کی ہے؟

**انسانوں پر رحم:**

رسول رحمت ﷺ نے انسانوں پر رحم کرنے کو اللہ عزوجل کی رحمت کے نزول کی شرط لازم بتاتے ہوئے فرمایا:

الراحمون یرحمهم الرحمن ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء.  
 (سنن ابی داؤد)

”ذم کرنے والے پر رشتہ بھی رحم کرتا ہے تم زمین والوں پر رحم کرو تم پر آسمان والا رحم کرے گا۔“

### غزوات نبوی اور انسانی جانوں کی حفاظت:

رسول اکرم ﷺ کے عہد کے غزوات کی کل تعداد 27 یا 28 ہے اور سرایا کی تعداد 60 تک پہنچی ہے۔ ان میں جنگی تارنخوں کو دیکھتے ہوئے سب سے کم خون بہایا گیا۔ ان غزوات کا مقصد انسانی جانوں کی حفاظت اور انسانی مفادات کا دفاع تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ اخلاقی آداب اور شریفانہ تعلیمات کی اس طرح پابند تھیں کہ نوع انسانی کے حق میں تعذیب کے بجائے تادیب کا حکم رکھتی تھیں۔

اسلام ایمان اور اپنی اخلاقی تعلیمات کے ذریعے انسان کی عظمت، شرافت کا ایسا شعور پیدا کرتا ہے جس سے ایک مسلمان اس معاملہ میں بہت زود حس ہو جاتا ہے۔ وہ انسان کو کسی حال میں جانوروں کے درجہ میں نہیں آتا رہتا اور نہ وہ ان سے حیوانوں جیسا سلوک پسند کرتا ہے اور نہ انہیں اپنے ذاتی تفوق کے لئے غلام بناتا ہے۔ وہ اپنے اور دوسرے انسانوں کے درمیان کوئی فرق نہیں سمجھتا کہ ان سے توہین آمیز سلوک کرے۔ یہاں انسانی مساوات اور احترام آدمیت کے سلسلہ میں بطور نمونہ ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے:

”حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ہم لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس تھے کہ ان کے پاس مصر کے ایک قبیلے نے فریاد کی آپ نے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ عمرو بن العاصؓ نے مصر میں گھوڑ دوڑ کرائی جس میں میرا گھوڑا آگے نکل گیا اور لوگوں نے اسے دیکھا بھی مگر محمد بن عمرو بن العاص کہنے لگا: خدا کی قسم یہ میرا گھوڑا ہے۔ وہ جب قریب آئے تو میں نے انہیں پہچان کر کہا کہ نہیں خدا کی قسم وہ میرا گھوڑا ہے۔ اس پر وہ مجھے کوڑے مارنے لگے اور کہنے لگے کہ جانتے نہیں کہ میں ابن الاکرمن (شریف زادہ) ہوں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے اسے کہا کہ اچھا بیٹھو پھر عمرو بن العاصؓ کو لکھا کہ میرا خط دیکھتے ہی تم اور تمہارا بیٹا محمد حاضر ہو جائیں۔“

راوی کہتا ہے کہ عمرو بن العاصؓ نے اپنے بیٹے کو بلا کر پوچھا کہ کیا تم نے کوئی جرم کیا ہے؟ اس نے نفی میں جواب دیا تو وہ کہنے لگے تب کیوں عمرؓ نے تمہارے بارے میں لکھا ہے؟ اس کو لے کر وہ حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہو گئے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ہم حضرت عمرؓ کے پاس ہی تھے کہ عمرو بن العاصؓ کو ایک لنگی اور چادر میں آتے دیکھا تو حضرت عمرؓ دیکھنے لگے کہ ان کا بیٹا بھی ساتھ ہے یا نہیں جو ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: مصری کہاں ہے؟ اس نے کہا ہاں میں یہاں ہوں (جب اس نے زیادتی کا اقرار کر لیا تو) حضرت عمرؓ نے

تعمیر کیا کہ وہ لے کر دین الکریمین (شریف زادہ) کی خبر لو۔ راوی کہتا ہے کہ اس نے اسے اچھی طرح مارا۔ پھر حضرت عمرؓ نے کہا کہ عمرو کے سر پر بھی گھماؤ کھیں انہی کے بل بوتے پر اس نے تمہیں مارا تھا۔ مصری کہنے لگا کہ میں مارنے والے کو مار چکا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر تم انہیں مارتے تو میں بیچ میں نہ پڑتا جب تک کہ تم ہی نہ انہیں چھوڑتے۔ پھر فرمایا: عمرو! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنایا حالانکہ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا؟ پھر مصری کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ اطمینان سے جاؤ اگر کوئی بات پیش آئے تو مجھے لکھنا۔“

## فرد اور معاشرے کا تعلق

(جدید افکار کے تناظر میں)

فرد اور معاشرے کا تعلق ایسے ہی ہے جیسے انسان کا ہوا سے اور مچھلی کا پانی سے!..... فرد معاشرے کی ایک اکائی ہے اگر فرد نہ ہو تو معاشرہ تشکیل نہیں پاسکتا۔ انسان اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے تمام حیوانات سے بلند تر ہے۔ انسان کے اندر دو قوتیں ایسی ہیں جو اسے معاشرتی طور پر حیوانات سے ممتاز کرتی ہیں:

1- قوت ناطقہ

2- قوت نزوع

پہلی قوت کے ذریعے وہ علم کی دولت سے ہمکنار ہوتا ہے اسے نیک و بد اور خیر و شر کی تمیز کا پتہ چلتا ہے۔ دوسری قوت اس کے اندر ایک طرف محبت یا کسی سے نفرت کا جذبہ پیدا کرتی ہے تو دوسری طرف وہ راحت و غم کا ادراک حاصل کرتا ہے۔ علاوہ ازیں انسانی عقل اسے دوسرے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے اور اسی کے ذریعے وہ اپنی مہارتوں، استطاعت اور قوت متفکر سے کام لیتا ہے۔ اگرچہ کئی حیات تو حیوان میں بھی موجود ہوتی ہیں لیکن عقل صرف انسان کو حاصل ہے۔

معاشرہ کی ضرورت:

انسان اپنی تمام ضروریات اکیلا مہیا نہیں کر سکتا وہ اس کے لئے دوسروں کے تعاون کا محتاج ہے۔ جتنا زیادہ انسانی ضروریات میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اسی تناسب سے علوم و فنون میں ترقی ہوتی رہتی ہے جبکہ اس کے ساتھ ہی معاشرتی نظم میں وسعت آ جاتی ہے۔ جس قدر معاشرتی اکائی منظم اور وسیع ہوگی اسی قدر سہولتیں بھی وافر میسر ہوں گی۔ اس طرح کتبہ سے قائل گاؤں اور قصبات کی صورت میں زندگی منظم ہو جاتی ہے۔ قصبات اور شہروں کے باہمی اتحاد اور

ارتباط سے ریاست تشکیل پاتی ہے جس میں رہنے والے لوگ قوم قرار پاتے ہیں جو اپنی مخصوص خصوصیات کے باعث دوسری اقوام سے ممتاز ہو سکتے ہیں۔

### معاشرہ کا آغاز اور ارتقائی مراحل:

انسانی معاشرہ کے آغاز اور اس کے ارتقائی مراحل کے سلسلہ میں امام غزالی کے نظریات دو اہم تصورات سے ہم آہنگ ہیں یعنی معاشرہ کی تشکیل کے پس پشت دو اساسی مقاصد کارفرما ہوتے ہیں:

ایک تو ضروریات زندگی کی فراہمی لوگوں کو ایک دوسرے کے اشتراک و تعاون پر مجبور کرتا ہے تبہ کوئی فرد بھی اپنی تمام ضروریات کی تکمیل نہیں کر سکتا اور نہ ہی اسے جان و مال کا تحفظ حاصل ہو سکتا ہے جبکہ دوسرا محرک جذبہ بقائے نسل انسانی ہے اور اس کے لئے کنبہ نسلی پکاگلٹ و قرابت داری اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اسی سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انسان ذاتی الطبع یعنی اجتماعیت پسند ہے۔

معاشرہ کا ارتقاء بتدریج ترقی اور زیادہ منظم زندگی کی طرف ہوتا چلا جاتا ہے چونکہ فرد کی تمام ضروریات ایک کنبہ کے اندر پوری نہیں ہو سکتیں اس لئے وہ دوسرے لوگوں کی طرف دست تعاون بڑھاتا ہے۔ اس سے معاشرے میں مختلف فنون اور پیشوں کی نشوونما ہوتی ہے اور معاشرہ بڑے اجتماع کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح مختلف پیشوں اور دست کاریوں کو اہمیت حاصل ہو جاتی ہے اور جوں جوں صنعت و حرفت اور زراعت میں ترقی ہوتی جاتی ہے معاشرہ شہری زندگی میں منظم ہوتا جاتا ہے۔ اس سے شہر وجود میں آتے ہیں اور معاشرتی تنظیم وسیع بنیادوں پر استوار ہو جاتی ہے۔

### ابن خلدون کا نظریہ:

ابن خلدون کا خیال ہے کہ ابتداء میں لوگ خاندان کی شکل میں زندگی بسر کرتے تھے۔ پھر مختلف خاندان کے اجتماع سے ایک معاشرہ وجود میں آیا۔ اس معاشرہ کو ابن خلدون نے ”اجتماعی معاشرہ“ کا نام دیا ہے۔

ابن خلدون کے نزدیک انسانی معاشرہ اتھنائے فطرت کا نتیجہ ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان فطرتاً ذاتی الطبع ہے وہ تنہا اور الگ تھلک رہ کر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ روزمرہ ضروریات کی تکمیل کے لئے اسے دوسروں کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ انسان غذا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور غذا کے حصول کے لئے متعدد افراد کی مشترکہ محنت و کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً کسان غلہ بوتا ہے تو اس عمل میں اسے آلات زراعت کی فراہمی کے لئے ترکھان اور لوہار کی خدمات حاصل کرنا پڑتی ہیں۔ پھر غلہ پیسنے اور پکانے کی نوبت آتی ہے تو اس کے لئے بھی اسے دوسروں کا



محتاج ہونا پڑتا ہے چنانچہ بہت سے افراد مل کر کام کرتے ہیں تو تب نہیں جا کر روٹی تیار ہوتی ہے جو زندگی کی مکین کو متحرک رکھنے کے لئے اذہ لازم ہے۔ اس سے ابن خلدون یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ انسانی ضروریات کا تقاضا ہے کہ وہ مل جل کر رہے۔

ابن خلدون کے نزدیک اجتماع انسانی کا ایک محرک دفاع بھی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ حیوانات اپنا دفاع خود کر سکتے ہیں کیونکہ قدرت نے ان کی جسمانی ساخت کچھ اس قسم کی رکھی ہے کہ وہ اپنی حفاظت خود کر سکیں۔ حیوانات اپنی موٹی موٹی کھالوں، سینگوں، پنجوں اور ناخنوں سے آلات حرب کا کام لیتے ہیں لیکن انسان ان تمام چیزوں سے محروم ہے اس کے بدلے میں قدرت نے اسے ہاتھ اور عقل دو چیزیں عطا کی ہیں جن کی مدد سے وہ نت نئے آلات بناتا رہتا ہے جن کے لئے وہ خود کو دشمنوں کے حملے سے محفوظ رکھتا ہے لیکن صرف آلات اسے حملوں سے محفوظ نہیں رکھتے اس لئے وہ ایک گروہ کا محتاج ہے جس کے ساتھ مل کر وہ اپنی مدافعت کر سکے۔ ابن خلدون معاشرہ کے وجود کو مشیت الہی کا تقاضا قرار دیتا ہے اس کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روئے زمین کو آباد کرنے کے لئے انسان کو پیدا کیا ہے۔

### حضرت شاہ ولی اللہ کا نظریہ:

حضرت شاہ ولی اللہ کے نزدیک معاشرہ اپنی چار تدبیریں منزلیں طے کر لے تو وہ اپنی اگلی منزل کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک منزل در منزل معاشرہ اپنے تکمیلی عروج کو پہنچتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ معاشرہ جلد نہیں رہتا بلکہ اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہے۔ مختلف منازل سے گزرتا ہوا وہ اپنی تکمیل کرتا ہے۔ معاشرہ کے ارتقاء کے چار مراحل ہیں جن کی تفصیل کچھ یوں ہے:

پہلا مرحلہ..... معاشرہ انتہائی سادہ ہوتا ہے صرف بنیادی ضروریات تک محدود ہوتا ہے۔ انسانی معاشرہ حیوانی اجتماع کی طرح ہوتا ہے۔ بنیادی ضروریات کو محدود نہیں کیا جاسکتا۔ بنیادی ضروریات میں ذراعت، زبان، کھانا پینا، برتن بنانا، مویشی پالنا، ان کی حفاظت کرنا، دوکان، لباس اور شریک حیات کو حضرت شاہ ولی اللہ شامل کرتے ہیں۔ پہلے مرحلے میں چار طبقے نظر آتے ہیں:

- 1- دانشمندی، ضرورت مندوں اور اہل شعور کا طبقہ یعنی عقل والوں کا طبقہ۔
- 2- دولت کے پجاریوں کا طبقہ یعنی تن آسان اور آرام طلب لوگوں کا طبقہ۔
- 3- شہامت، جرأت اور بہادری، دلیری سے سرشار افراد کا طبقہ جو سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں، اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے سرحدوں کی رکھوالی کرتے ہیں۔
- 4- جو نام و شہرت کے دلدادہ ہوتے ہیں اور غریبوں کی خدمت صرف شہرت کے حصول کے

لے کر رہتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ انسان کے آفریش کے ساتھ طبقات انسانی جنم لیتے ہیں تو بے جا نہ لگے گا۔

دوسرا مرحلہ... انسان کی جب ضروریات زندگی کی تکمیل ہو جائے تو انصاف کی کوشش ہوتی ہے کہ انسانیت اور عمرگی آئے۔ انسان کے ہر عمل میں نکھار و خوبی پیدا ہو یعنی خواہشات آرزوؤں، آفتوں اور حسرتوں کی تکمیل عمدہ طریقے سے ہو۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے نزدیک علم حاصل کرنا بھی فطرت انسانی میں شامل و داخل ہے۔ جب انسان کی ضروریات کا کمر اوّل تعلیم حاصل کرنے کے شوق سے ہوتا ہے تو نئے نئے علوم اور فنون وجود میں آتے ہیں۔ تجربات سے علوم اور فنون کے شعبہ جات میں وسعت ہوتی ہے۔ غرض حضرت شاہ ولی اللہ کے نزدیک انسان کی مخصوص نفسیات نصب العین کا تعین نفاست پسندی اور تحقیق و تجسس اسے دوسرے مرحلے میں داخل کر دیتا ہے۔ وہ زندگی میں نئے نئے تجربات کا خواہاں ہوتا ہے جو انسانی فطرت میں ودیعت کی گئی ہوتی ہے۔

تیسرا مرحلہ... اس منزل میں معاشرہ نئے نئے مشاہدات و تجربات اور نئے نئے علوم سے آشنائی و راہنمائی حاصل کرتا ہے۔ پرانے علوم سے استفادہ کرتے ہوئے ان میں مزید نکھار پیدا کرنے کے لئے ان کی اصلاح بھی کرتا ہے۔ اس مرحلہ میں تمدن پیدا ہوتا ہے جس سے ایک منظم سیاسی نظام وجود میں آتا ہے۔ یہ سیاسی نظام افراد کی آزادی کے تحفظ کا ضامن ہوتا ہے۔ چوتھا مرحلہ... حضرت شاہ ولی اللہ کے نزدیک اس مرحلے میں پہنچ کر معاشرہ عالمگیری حیثیت حاصل کر لیتا ہے یعنی بین الاقوامی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اپنی خواہشات کی زیادتی کی وجہ سے تمام چھوٹے چھوٹے گاؤں، قصبے اور شہر متحد ہو کر باہمی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں تاکہ وہ باہمی جنگ و جدل سے بچ جائیں مبادا وہ تباہ و برباد ہو جائیں۔ ایسے عالمگیر معاشرہ کو وہ خلافت کا نام دیتے ہیں۔

## اسلامی معاشرہ کو مستحکم اور غیر مستحکم کرنے

### والے عوامل کا مطالعہ

آج دنیا جن سنگین مسائل سے دوچار ہے ان میں اخوت کا فقدان، جاہلیت کے رسم و رواج، غربت و افلاس، ناخواندگی، ظاہری نمود و نمائش، اسلحہ کی دوڑ اور ہوس ملک گیری زیادہ مشہور ہیں۔ موجودہ دنیاوی قوانین میں ان تمام خرابیوں کا خاطر خواہ حل موجود نہیں ہے جبکہ اسلام ایسا

دین ہے جو انسان کی بنیادی عزت کا قائل ہے۔ کسی کو بھی کسی پر حملہ کرنے کا حق نہیں دیتا۔ مساوات کا درس دینے کے ساتھ ساتھ بھائی چارہ کا سبق سکھاتا ہے۔ اس کی ایک سادہ اور عام فہم مثال یوں ہے کہ ایک بڑی تفصیل جو اینٹوں سے بنی ہوئی ہے اس کی مضبوطی اور استحکام کا تمام دار و مدار اینٹوں کی مضبوطی اور چٹکی پر ہی موقوف نہیں ہوتا بلکہ اس میں اس کا رے یا مسالے کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ ملت اسلامیہ کے استحکام کے لئے جس قدر مسلمانوں میں ہر فرد کا سیرت و کردار کے اعتبار سے پختہ ہونا ضروری ہے اسی قدر اس کے مابین رشتہ اُلفت و محبت کا استوار ہونا بھی لازم ہے۔ اُمت مسلمہ کا استحکام تمام قومی تصورات کے تحت صرف دنیوی غلبہ اور اقتدار کے لئے نہیں بلکہ یہ استحکام اس لئے مطلوب ہے کہ خدا کی زمین پر خدا کی مرضی پوری کرنے کا ذریعہ و آلہ کار ہے۔

آج معاشرتی بگاڑ کی مشہور وجوہات از روئے قرآن پاک چار ہیں جن کی تفصیل پیش ہے۔ قرآن مجید میں ان چاروں کو اصطلاحات کے ذریعے بیان کیا گیا ہے جو یہ ہیں:

1- حمیۃ الجاہلیۃ

2- ظن الجاہلیۃ

3- تبرج الجاہلیۃ

4- حکم الجاہلیۃ

1- حمیۃ الجاہلیۃ: زمانہ جاہلیت میں محدود حسیت و عصیت جیسے وطنی علاقائی، نسلی، طبقاتی اور گروہی جتنے ہندی رائج تھے۔ اس کے لئے انسان اپنی وفاداریوں کو محدود بنانے پر از خود متعین کر لیتا تھا اور خود کو ہمہ گیر وحدت میں شملک کرنے کی بجائے مختلف طبقوں میں تقسیم کر لیتا تھا۔ پھر انہی محدود وفاداریوں کو اپنی معاشرت کی بنیاد بنا کر خود کو پابند کر لیتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ انہی کو وجہ شرف اور بنائے تفاخر قرار دیتا تھا۔ اسلام اسی بات اور عمل کو حمیۃ الجاہلیۃ قرار دیتا ہے اور اس کی کسی صورت بھی اجازت نہیں دیتا اور ان کو نیست و نابود کر دینا چاہتا ہے۔

2- ظن الجاہلیۃ: قرآن مجید فرقان حمید میں معاشرتی بگاڑ کی دوسری اصطلاح ظن الجاہلیۃ کا استعمال کیا ہے جس کے معنی ہیں: ”دور جاہلیت کی طرح غیر اسلامی افکار و نظریات اور توہمات و تصورات“ یعنی وہ تمام مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی تصورات جو غیر اسلامی افکار سے جنم لیتے ہیں ظن الجاہلیۃ کہلاتے ہیں۔ ان کی وجہ سے پوری معاشرتی زندگی براہ راست متاثر ہوتی ہے کیونکہ ہر شعبہ زندگی کسی نہ کسی ہا قاعدہ تصور اور نظریہ سے تشکیل پاتا ہے اور اسی تصور اور نظریہ کے باعث زندگی کے ہر عمل کی صحت و عدم صحت اور نوعیت متعین ہوتی ہے۔

3- تبرج الجاہلیۃ: اس کا مطلب ہے: دور جہالت کی طرح نمود و نمائش، حسن، عریانی، آبرو باختل اور اظہار جمال اور اس کی مختلف صورتوں کا اچھانا اور رواج دینا۔

نمود و نمائش اور زندگی کے مصنوعی وقار اور حسن و جمال کی خاطر طرح طرح کے فیشن اور بے جا مصارف جو زیادہ تر خواتین کی زیب و زینت کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں سب کے سب تبرج الجاہلیہ کے ضمن میں آتے ہیں۔ معاشرتی اور عائلی زندگی نہ صرف ناروا بوجھ کے تلے دب جاتی ہے بلکہ ان کی وجہ سے نقص اور بناوٹ کی آئینہ وار ہو جاتی ہے۔ سادگی حقیقت اور اصلیت ناپید ہو جاتی ہے۔ انجام کار انسان ان کی خاطر کوڑی کوڑی کا محتاج ہو جاتا ہے۔ اس کے اخلاقی فضائل اور مذہبی اقدار کا بھی دیوالیہ ہو جاتا ہے۔ اس نمود و نمائش سے معاشرے میں گناہ اور محصیت کی زندگی بھی رواج پا جاتی ہے۔

4- حکم الجاہلیہ: زمانہ جاہلیت کے غیر اسلامی طاعونی قوانین یعنی کسی معاشرے کا وہ قانونی ڈھانچہ جو اپنی اصلی مابیت کے لحاظ سے غیر اسلامی ہو اور اخلاقی زندگی کا صحیح تحفظ کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو حکم الجاہلیہ کہلاتا ہے۔ معاشرے کے وہ تمام قوانین جو قرآن اور سنت سے انحراف کرتے ہوں ان کی ناروا پیچیدگیاں اور مخصوص ضابطے انسانی زندگی میں بجائے سہولت و آسائش مہیا کرنے کے دشواریاں پیدا کرتے ہیں اور ان کی ساخت انسانی ذہن کی تراشیدہ ہونے کی وجہ سے جو خامیاں ہوتی ہیں غیر اخلاقی زندگی کو جنم دیتی ہیں۔

قرآن پاک کی سورہ الحجرات کی آیت 11 میں ارشاد فرمایا گیا:

”اے ایمان والو! نہ مردوں کو مردوں پر ہنسنا چاہئے۔ کیا عجیب ہے (کہ جن پر ہنستے ہیں) وہ ان (ہنسے والوں) سے (خدا کے نزدیک) بہتر ہوں اور نہ عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہئے کیا عجیب ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔ نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے لقب سے پکارو۔ ایمان لانے کے بعد گناہ کا لگنا ہی بُرا ہے اور جو ان حرکتوں سے باز نہیں آئیں گے تو وہ ظلم کرنے والے ہیں۔“

مندرجہ بالا خرابیاں اخلاقی اور معاشرتی برائیاں کہلاتی ہیں اور اہل ایمان کو ان سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے تاکہ معاشرے میں فساد پیدا نہ ہو اور معاشرہ محفوظ رہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ تمسخر وہ ہنسی ہے جس سے دوسروں کی تحقیر اور دل آزاری ہو جبکہ وہ ہنسی جس سے دوسروں کے دل خوش ہوں وہ مزاح کہلاتی ہے اور وہ جائز ہے۔

اسی سورۃ الحجرات کی آیت 12 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچا کرو کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور سراغِ ست لگایا کرو اور کسی کی غیبت بھی نہ کیا کرو۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔ اس کو تو تم ناگوار سمجھتے ہو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ بڑا قبول کرنے والا مہربان ہے۔“

یہاں غیبت سے مراد کسی کی پیٹھ پیچھے بُرائی کرنا کہ اگر اس کے سامنے کی جائے تو اسے

رج ہو گو وہ بات سچی ہی کیوں نہ ہو۔ اگر وہ بات جھوٹی ہو تو وہ بہتان کہلاتی ہے۔  
مندرجہ بالا بیان کردہ برائیاں ایسی معاشرتی خرابیاں پیدا کرتی ہیں کہ بھائیوں میں آپس  
کی محبت و الفت ختم ہو جاتی ہے اور باہمی عداوت کا باعث بھی بن جاتی ہیں۔

## معاشرے میں اصلاح احوال کے طریقے

آئیے اب ان کے علاج کی طرف دھیان دیں کہ ان خرابیوں اور بُرائیوں کو معاشرے  
سے کس طرح ختم کیا جاسکتا ہے:

### جمعیت و عصبيت:

آج کے دور کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ تمام محدود گردنی و فاداریوں اور  
عصبتوں کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا جائے بلکہ ایسی عصبتوں کو ہوا دینے کی کوشش قوی وحدت  
اور سالمیت کے خلاف سازش تصور کرتے ہوئے طاقت سے دبا دیا جانا چاہئے اور اس کی بجائے  
پوری معاشرتی زندگی کو وحدت میں بدلنے کے لئے مؤثر اقدامات کئے جائیں۔ مولانا ظفر علی  
خان نے اس بات کو اپنے ایک شعر میں یوں کہا تھا:

ایک جھنڈے کے تلے جس روز ملت آئے گی

ساری دنیا اس کے آگے خود بخود جھک جائے گی

علامہ محمد اقبالؒ نے اسی سلسلہ میں کہا تھا:

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

### سادہ نظام زندگی:

اسلام سادگی اور سادہ زندگی اپنانے کا درس دیتا ہے۔ ایسی تمام نمود و نمائش اور سفلہ  
نوازی کی تمام صورتیں جو سادہ اور باعصمت زندگی کے معافی ہوں ان سب کو ختم کر دیا جائے  
بلکہ سادہ نظام زندگی اس طرح قانوناً جاری کیا جائے کہ بے جا زیب و زینت کی معمولی سی  
صورت کی اجازت نہ ہو۔

### غیر اسلامی افکار و نظریات کا خاتمہ:

تمام غیر اسلامی کوششیں اور تحریکیں افکار و نظریات کا قلع قمع کیا جائے تاکہ معاشرے کی  
اجتماعی زندگی نظریاتی خالصیت سے بہرہ ور ہو اور ہر عمل کو صحیح فکر کی رہنمائی حاصل ہو۔

## قرآن و سنت کا قانون:

معاشرتی یکجہ کی اصلاح کے لئے قرآن و سنت پر مبنی نظام قانون نافذ کیا جائے۔ اگر قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں اور طاقتوں کے پیش نظر مذکورہ بالا مقاصد ہی نہ ہوں تو قانونی ڈھانچہ بدلتا ہے سود ہوگا کیونکہ انقلابی مقاصد اور منصوبہ بندی کے بغیر شریعت کے جزوی احکام کا نفاذ بے معنی ثابت ہوگا۔

اوپر بیان کیا جانے والا لائحہ عمل ایسا ہے کہ جس کے ذریعے قوموں کے لئے نصب العین حاصل کرنا نہ صرف ممکن واقع ہو سکتا ہے بلکہ ایک سیاسی انقلاب کا آغاز ہوگا۔ اس کے نتائج کو معاشرتی انقلاب کے ذریعے سے محفوظ کیا جائے۔ اسی طریق کار کو اپنا کر ہی مطلوب اخلاقی انقلاب لایا جاسکتا ہے۔ اسلام کا ہر حکم ایسا ہے جس سے معاشرے کی اصلاح مقصود و مطلوب ہے نہ کہ بگاڑ۔ اسلام کے ایک حکم کو ہی لے لیجئے اور دیکھئے کہ اس کے مکمل نفاذ سے کتنی برائیاں اور خرابیوں کا قلع قمع ہوتا ہے۔

اسلام نے قرآن مجید میں جہاں نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے وہاں زکوٰۃ ادا کرنے کی بھی تاکید فرمائی ہے۔ زکوٰۃ سے کیا فائدے حاصل ہوتے ہیں ان کی تفصیل عرض ہے:

### جذبہ ایثار:

مالدار لوگوں میں یہ جذبہ ایثار پیدا ہوتا ہے۔ جب وہ زکوٰۃ و عشر ادا کرتے ہیں تو دولت کی علیحدگی کی وجہ سے ان میں دوسرے لوگوں کا احترام قائم ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”اور وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اور اگرچہ وہ خود ضرورت مند کیوں نہ ہوں۔“

### امداد باہمی کا جذبہ:

زکوٰۃ و عشر اور اتفاق فی سبیل اللہ کی دولت سے معاشرے میں جذبہ امداد باہمی کو تقویت ملتی ہے اور فرد غنا حاصل ہوتا ہے۔

### رضائے الہی:

زکوٰۃ و عشر ادا کرنے والوں کا اپنے رب کریم پر اعتماد بڑھتا ہے اور مضبوطی کے ساتھ قائم رہتا ہے کیونکہ مالدار شخص یہ فرض صرف اور صرف اپنے رب تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے سرانجام دیتا ہے۔

## اطاعت الہی:

جن لوگوں کو زکوٰۃ و عشر دیا جاتا ہے وہ اسے اپنے رب ذوالجلال کا انعام اور نعمت سمجھتے ہیں اور اس کے حضور سر بسجود ہو جاتے ہیں۔ ان میں اللہ کریم کے احکام کا احترام اور زیادہ پیدا ہو جاتا ہے۔

## بخل سے پاکیزگی:

زکوٰۃ صرف اللہ پاک کے حکم کی تعمیل میں دی جاتی ہے اور انسان اس کی رضا کا طالب ہوتا ہے۔ یہ ایسے گناہوں اور بخل کی گندگی سے پاک کر دیتی ہے۔ بخل ایسی لعنت ہے جو فرد اور معاشرہ دونوں کے لئے خطرناک ہے۔ اسی لئے تو قرآن پاک کی سورۃ الحشر کی آیت 9 میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ يُّوقْ شِحْنًا ثَلَاثًا فَقَدْ أُؤْتِيَ الْفَيْلَ حَقًّا

زکوٰۃ بخل کی خباثت سے انسان کو پاک کرتی ہے۔ انسان کو مال کی غلامی اس کا بچاری بننے سے بچاتی ہے کیونکہ اسلام انسان کو اشیاء کا بندہ بننے کی بجائے صرف خدا کا بندہ بنانا چاہتا ہے۔

## شکران نعمت:

زکوٰۃ عشر اور انفاق فی سبیل اللہ کی بدولت معاشرہ شکران نعمت کا مظہر ہوتا ہے کیونکہ خطرات اور عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ انسان حصول نعمت پر اللہ پاک کا شکر ادا کرے۔ ارشاد خداوندی ہے:

لَنْ يَشْكُرَ لَكُمْ وَلَنْ يَكْفُرَ لَكُمْ أَنْ عَذَابِيْ لَشَدِيدٌ

”اگر تم میرا شکر کرو گے تو میں تمہیں مزید دوں گا اور اگر ناشکری کی تو بیشک میرا عذاب بہت سخت ہے۔“

زکوٰۃ اور عشر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نفس میں شکر خداوندی کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ رب تعالیٰ کے احسانات اپنے بندوں پر اس کے نفس اور مال کے تعلق سے ہیں اس لئے بدنی عبادات، بدنی نعمتوں کے شکریہ کے طور پر ہیں اور مالی عبادات مالی نعمتوں کے شکریہ کے طور پر دی جاتی ہیں۔

## خب دنیا کا علاج:

ادائیگی زکوٰۃ و عشر سے معاشرے میں اللہ اور آخرت کے تعلق کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جبکہ مال کی طلب میں رہنے سے سعادت کا حصول نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں مال خرچ

کرنا ہی اپنی سعادت تصور کرتا ہے۔ جب دنیا ایک مرض ہے اور اس کے ازالہ کا بہتر علاج ادائیگی زکوٰۃ عشر اور انفاق فی سبیل اللہ ہی ہیں۔

### باعث محبت:

زکوٰۃ عشر اور انفاق فی سبیل اللہ کی بدولت دولت مندوں اور معاشرہ میں محبت اخوت اور تعاون کا گہرا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جب حاجت مندوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مال دار شخص اپنے مال کا ایک حصہ ان پر خرچ کرتا ہے تو ان کے دلوں اور زبانوں سے اس کے حق میں دعائے خیر نکلتی ہے اور ایسی دعا رب تعالیٰ کے ہاں جلدی مقبول ہوتی ہے کیونکہ:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے  
پہ نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

### افزائش مال:

زکوٰۃ عشر کی ادائیگی سے نہ صرف مال دولت میں پاکیزگی آتی ہے بلکہ وہ بڑھتا بھی ہے کیونکہ قرآن کریم فرماتا ہے:

بمحق اللہ الربا ویربی الصدقات (البقرہ: 276)

”اللہ تعالیٰ سو کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔“

سورہ سہا کی آیت 39 میں آیا ہے:

وما انفقم من شیء فهو لیخلفه وهو غیر الزا قین

”اور جو چیز تم خرچ کرتے ہو تو اس کی جگہ اور دے دیتا ہے۔“

### گردش دولت:

اسلام چاہتا ہے کہ دولت ایک گھر میں اکٹھی نہ ہو بلکہ گردش میں رہے اسی لئے زکوٰۃ و عشر اور انفاق فی سبیل اللہ کے احکام دیئے ہیں۔ سورۃ العنکبر کی آیت 7 میں فرمایا گیا ہے:

کی لا یكون دولته بین الاغنیاء منکم

”تاکہ مال گردش نہ کرتا رہے تمہارے دولت مندوں کے درمیان۔“

### جماعتی تصادم کا خاتمہ:

زکوٰۃ کی ادائیگی معاشرے سے امیر و غریب کا فرق دور کرتی ہے اور پورا معاشرہ راہ اعتدال پر آ جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو امیر و غریب کا فرق پیدا ہو جائے اور امیر غریبوں کی زندگی اجیرن کئے رکھیں۔ اگر دیکھا جائے تو اسلام کا ایک حیرت انگیز کرشمہ ہے کہ اس نے صرف ایک حکم کے ذریعے جماعتی تصادم کا خطرہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے۔



## جرائم کا خاتمہ:

غربت سے کئی برائیاں جنم لیتی ہیں۔ جب زکوٰۃ و عشر پور انفاق فی سبیل اللہ معاشرے کے غریب لوگوں میں ادا کر دیا جاتا ہے تو ان کی معاشی بد حالی ختم ہو جاتی ہے اور بیکاری چھوڑ کر کوئی نہ کوئی کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ اس طرح جرائم ان سے دور ہو جاتے ہیں۔

## قومی ترقی:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو قوم کی ترقی کا ذریعہ بیان کیا ہے اور تاریخ میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ دنیا کے نقشہ پر وہی اقوام ترقی کے ساتھ ابھرتی ہیں جو قوی اور ملتی مفاد کی خاطر خرچ کرتی ہیں۔ خصوصاً امت مسلمہ کی ترقی کی وجہ یہ تھی کہ وہ راہ خدا میں بے دریغ خرچ کرتی رہتی تھیں۔

## معاشرے کی اصلاح:

دولت کو معاشرے میں وہی حیثیت حاصل ہے جو خون کو انسانی جسم میں۔ اگر انسان کا خون دل میں اکٹھا ہو جائے تو باقی سارا جسم مفلوج ہو جاتا ہے اور اعضاء اپنا اپنا کام بند کر دیتے ہیں۔ لیکن دولت بھی اگر چند ہاتھوں یا گھروں میں جمع ہو جائے تو تمام کاروبار زندگی شطب ہو کر رہ جائے اور اس طرح معاشرے میں کئی معاشرتی برائیاں پیدا ہو جائیں اور ان کا اثر صرف غریبوں پر ہی نہ ہو گا بلکہ دولت مندوں میں بھی اخلاقی بیماریاں پیدا ہو جائیں گی۔ اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ و عشر ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔

ایسے ہی اسلام کے دیگر احکامات ہیں کہ اگر ان پر عمل کرنا بند کر دیا جائے تو معاشرے میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو جائیں جن کا علاج اس دنیاوی قانون کے قابو میں نہیں۔ اسلام کا ایک حکم تقسیم وراثت ہے یعنی قوت ہو جائے۔ واسطے شخص کی تمام جائیداد اس کے ورثاء میں برطبق احکام شرعیہ تقسیم کرنا۔ اگر اس حکم پر عمل نہ کیا جائے تو تمام زرعی زمین کسی فرد واحد کی ملکیت میں چلی جائے گی اور پھر اس کے رحم و کرم پر عوام ہوگی۔ اگر وہ نہ چاہے گا تو اپنی زمین میں اناج کی کاشت بند بھی کر سکتا ہے۔ جب اناج پیدا نہ ہوگا تو قحط پیدا ہو جائے گا یا بصورت دیگر وہ من مانی قیمت وصول کرے گا جس کی ادائیگی ہر امیر غریب نہ کر سکے گا۔ اس سے معاشرے میں کئی برائیاں پیدا ہو جائیں گی جن کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

## رذائل اخلاق کے اسباب و محرکات

رذائل اخلاق سے مراد وہ تمام عادات و اطوار ہیں جن کو مالکِ حقیقی ناپسند فرماتا ہے۔ اسے بندوں کو ان سے باز رہنے کا حکم فرماتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان مالکِ حقیقی کا درجہ رکھتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو اس کی طرف مالک کی طرف سے کیا حکم فرماتا ہے؟ جب ہر نعمت عطا کرنے والی ایک ہی پیاری ذات ہے تو آخر بندہ کیوں راہِ حق کو چھوڑ کر باطل کی راہوں کو اپناتا ہے۔ آخر وہ کون سے محرکات و اسباب ہیں جن کی وجہ سے انسان درمیانِ مصلحت و مفاد میں کھو جاتا ہے؟ آخر عصرِ حاضر کے مسلم معاشرے بگاڑ کا کیوں شکار ہوئے؟ اخلاقی گمراہی کی منزلیں کیوں روز بروز طے کر رہے ہیں اور اس کے اسباب و محرکات کیا ہیں؟

ہمارا ہر وہ فعل جو اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم ﷺ کے فرمودات کے مطابق ہے وہ فضائل اخلاق کی تعریف کے تحت آئے گا مگر ہر وہ عمل جو اللہ عزوجل اور اس کے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے احکامات کے متافی ہے وہ رذائل اخلاق کے زمرے میں آئے گا۔

### خود غرضی:

رذائل اخلاق میں خود غرضی ایک ایسا عنصر ہے جس کی وجہ سے انسان دنیا کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے جیسے اس دنیا کی نعمتوں کے علاوہ کوئی اور نعمتوں کا وجود ہی نہیں ہے۔ بس جو کچھ ہے یہ دنیا ہے۔ جتنا اس میں کمایا جاسکتا ہے، کمال اس کے بغیر بھی زندگی کا کوئی فائدہ ہے۔

بھلا زندگی گزارنے کا انداز بغیر دنیا کمانے کے بھی بہتر ہو سکتا ہے؟

جب سوچ اس سوچ پر آ جائے تو سمجھ لینا چاہئے کہ انسان گمراہی کی راہ پر گامزن ہو چکا ہے۔ یہ فلاح کا راستہ قطعاً نہیں ہے بلکہ اس طرح تو کافر زندگی گزارتا ہے اور کسی بھی مسلمان کے لئے کافر کی زندگی مثالی نہیں ہو سکتی جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

”اللہ جس کے لئے چاہے رزق کشادہ اور تنگ کرتا ہے اور کافر دنیا کی زندگی پر اتر اگھے اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابل نہیں مگر کچھ دن برت لینا۔“

گویا قرآن حکیم نے چنی لگاؤ کی وجہ صاف صاف الفاظ میں یہ بیان کی ہے کہ دنیا کی زیب و زینت کو ہی سب کچھ سمجھ لینا تو کافروں کا طریقہ ہے۔ جب بندہ اُن کی سوچ کے مطابق اپنی سوچ بنائے گا تو یقیناً رذائل اخلاق کی طرف مائل ہو گا لہذا یہ موقفِ باہمی قائم کیا جاسکتا ہے کہ انسان اخلاقِ رذیلہ کی طرف جو مائل ہوتا ہے اُس کا سب سے بڑا محرک و سبب دنیا کا مال و اسباب ہے۔ دنیا کی محبت اُسے راہِ حق سے ہٹا کر باطل والے راستے پر گامزن کرتی ہے۔ بندہ کے اندر جو بھی رذائل اخلاق یعنی اخلاق کو برباد کرنے والی صفات رائج

ہوتی ہیں وہ دنیا کی محبت کی وجہ سے ہی ہیں کیونکہ یہ محبت ایسی محبت ہے جو ہر بُرائی کی جڑ ہے۔  
ان الفاظ کی تائید میں یہ حدیث نبوی ﷺ پیش کی جاسکتی ہے:  
حب الدنيا راس كل خطيئة (مشکوٰۃ المصابیح)  
”دنیا کی محبت ہر بُرائی کی جڑ ہے۔“

### تقدیر پسندی / غصہ:

تقدیر پسندی / غصہ انسان کے اندر اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ انسان اپنی قوت غضب کی پیاس بجھانا چاہتا ہے۔ دوسروں پر اپنا رعب و دبدبہ قائم کرنے کو اتنا اوجھا سمجھتا ہے کہ اس کی تکمیل کے لئے بھی غصے والا وصف اختیار کرتا ہے۔ اس کے علاوہ نفس پرستی کی لذتیں بھی اس فعل کی وجہ سے ہی پورا ہوتی ہیں لہذا یہی اسباب اس اخلاقِ رذیلہ کو جنم دیتے ہیں حالانکہ تقدیر پسندی / غصہ عمل کو بری طرح متاثر کرتا ہے انسان کے وقار میں کمی آتی ہے۔ غصہ دوسروں کی دل آزاری کا بھی سبب بنتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ اس بدترین خرابی کی مذمت اس انداز میں کرتے ہیں:

”غصہ ایمان کو ایسا بگاڑ دیتا ہے جیسے الیہ را شہد کو۔“ (مشکوٰۃ المصابیح)

غیبت کا مرض بھی ہمارے اندر اس طرح سراپت کر چکا ہے کہ ہم اکثر یہ کام کر رہے ہوتے ہیں۔

غیبت کس قدر بڑی خرابی ہے اس کا اندازہ قرآن کریم کے درج ذیل حکم سے ہو جاتا ہے:

”اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی پسند کرے گا کہ اپنے مرے بھائی کا گوشت کھائے تو یہ تمہیں گوارا نہ ہو گا۔“ (المجادلہ: 12)

صدر الا قاضی مولانا سید محمد رفیع الدین مراد آبادی لکھتے ہیں:

”مسلمانوں کی عیب جوئی نہ کرو اور ان کے پیچھے حال کی جستجو میں نہ رہو جسے اللہ تعالیٰ نے شان ستاری سے چھاپا۔“

یہاں ایک چیز کی وضاحت ضروری ہے کہ تہمت اور غیبت میں کیا فرق ہے؟ غیبت سے مراد وہ عیب جو کسی شخص میں موجود ہو مگر اس کی غیر موجودگی میں لوگوں نے اس انداز میں تذکرہ کیا کہ اگر وہ وہاں موجود ہوتا تو اس کا دل رنجیدہ ہوتا یعنی اُسے اپنے بارے میں وہ کلمات سن کر تکلیف ہوتی۔ جبکہ تہمت وہ عیب جو کسی میں موجود بھی نہیں یا کوئی ناپسندیدہ فعل اس نے سرانجام بھی نہیں دیا مگر پھر بھی اس کی طرف منسوب کر دینا تہمت کہلاتا ہے۔

## تخصیصات / طبقاتی تقسیم کا رواج:

عصر حاضر کے مسلم معاشرے غریب اور امیر کا لے اور گورے عربی اور عجمی کی تقسیم پر مبنی معاشرے ہیں۔ یہ ایک ایسا اخلاقی اعتبار سے بُرا پہلو ہے کہ ہماری معاشرتی اقدار کو دیکھ کر کی جانتا جا رہا ہے۔ مسلم معاشرے اپنے قدموں پر اُس وقت تک با اعتماد طریقے سے دوبارہ کھڑے نہیں ہو سکتے جب تک اپنے اندر سے طبقاتی تقسیم کو ختم نہیں کر لیتے۔ معاشرہ کا سارا حسن اس منفی امر کی وجہ سے پامال ہو چکا ہے۔ باہمی محبت جو مسلم معاشروں کا ایک لازمی عنصر ہے آج ہر جگہ مفقود ہو چکی ہے۔ فقط اُس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ آج ہم انسان کو انسانیت کے اعتبار سے نہیں جانچتے بلکہ رنگ و نسل کی بنیاد پر اہمیت دیتے ہیں حالانکہ تمام انسان اللہ عزوجل کی نگاہ میں برابر ہیں۔ ہاں قرب خدا اُسی کو نصیب ہوتا ہے جو اللہ کے بتائے ہوئے راستوں پر چلتا ہے۔

کمزور طبقہ تو اللہ تعالیٰ کا اتنا پسندیدہ ہے کہ امیروں کو جو رزق ملتا ہے وہ فقراء کے صدقے میں ہی ملتا ہے جیسا کہ رسول اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

”تم لوگ اپنے کمزوروں کی برکت سے ہی مدد کئے جاتے ہو اور روزی دیئے جاتے ہو۔“ (صحیح بخاری)

## تفاخر / ریا کاری:

ہمارے مسلم معاشرہ میں ریا کاری کا مرض بھی روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ تفاخر / نمود نمائش آج ہر جگہ رائج ہوتی جا رہی ہے۔ جموٹے نام کمانے سے ہمیں ایسی تسکین آتی ہے کہ سب کچھ بھول جاتے ہیں کہ میرے اس عمل سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ تحت نارض ہوں گے میری عاقبت خراب ہو جائے گی۔ آج جو میں زمانے بھر میں معزز بنا پھرنا ہوں کل کو حشر کے دن کیا منہ لے کر اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہ میں جاؤں گا۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ پاس نہ ہوگا۔ صدقات و خیرات نماز و روزہ وغیرہ کسی عبادت کو بھی شرف قبولیت کی دولت نہ ملے تو سب کچھ برباد ہو جائے گا۔

ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کس طرح ہمارے معاشرہ سے تفاخر / ریا کاری کا مرض ختم ہوتا ہے۔ ہر کام اپنے مقررہ اسلوب کے مطابق جب ہوگا تو معاشرہ اپنے آپ امن و سکون کا گہوارا بن جائے گا۔

ریا کاری ہے بچنے کے لئے قرآن میں حکم ہوتا ہے:

”جو لوگ دنیاوی زندگی اور اس کی آرائش و زیبائش کے طلب گار ہوں تو ہم اپنے لوگوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دنیا میں ہی دے دیے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کیا

جائی۔“

### تنگ نظری اور فرقہ بندی:

تنگ نظری اور فرقہ بندی کے ذہر نے اسلامی معاشرے کے اتحاد کو پاش پاش کر دیا ہے۔ اس رذیلہ سے بھی ہم وابستہ اس لئے ہوئے ہیں کہ ہم جماعت کی اتحادیت بالکل بھول بیٹھے ہیں! بس اپنا اجارہ داری قائم کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارا رویہ یہ ہوتا جا رہا ہے کہ جس طرح میں سوچتا ہوں اس طرح باقی لوگ بھی سوچیں! اگر انہوں نے یہ روش اختیار نہ کی تو پھر ایسے لوگ فرقہ بندی کا ذہر معاشرے میں گھول دیتے ہیں حالانکہ ایک مسلمان تو دوسرے مسلمان کی قوت ہے! یہ ایک دوسرے کی پہچان ہیں۔ جماعت سے علیحدگی میں سوائے ہلاکت کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

رذائل اخلاق میں یہ فعل بھی اپنی اہمیت کے اعتبار سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ جتنا نقصان مسلمانوں کو اس نے پہنچایا ہے! شاید کوئی ایسا ہو جو اس سے زیادہ مہلک ہو۔ ”جسد واحد“ والی سوچ آج ہم بکسر کھو بیٹھے ہیں۔ اسی لئے تو ارشاد ہوتا ہے:

”جو جماعت سے ایک ہاشت دور ہو گیا اس نے اپنی گردن سے اسلام کا پتہ اتار دیا۔“

### استحصال:

رذائل اخلاق میں سے ایک اہم برائی دوسروں کے استحصال کے ذریعے کمائی ہوئی دولت ہے۔ شریعت مطہرہ نے بڑے اہتمام کے ساتھ اس فعل کا سد باب کیا ہے اور تمام معاملات کو اس فعل پر موقوف کیا ہے۔ مختلف اسلوب کے ساتھ اور بہت سی وعیدیں سن کر اس فعل سے باز رکھنے کا حکم دیا۔ یاد رہے کہ یہ وابستگی خصوصیت کے ساتھ ہمارے مسلم معاشروں میں رائج ہو چکی ہے حالانکہ یہ کتنا مذموم فعل ہے اس کا اندازہ درج ذیل احادیث کی روشنی میں لگائیں:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں۔“

ایک اور حدیث مبارک ہے:

”رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنم میں جائیں گے۔“

استحصال کے ذریعے حاصل ہونے والی دولت چونکہ رزق حرام ہے اور اسے ہمیشہ غلط ذرائع سے حاصل کیا جاتا ہے اس لیے کمانے والے کا ضمیر اندر سے طمطم نہیں ہوتا اور اس کے گھر والے بھی جن کی اس مال سے پرورش کی جا رہی ہے بہت ہی خرافات اور برائیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

## اولاد و مال:

قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”مال اور بیٹے یہ جتنی دنیا کا سنگھار ہے اور باقی رہنے والی ابھی باتیں ان کا ثواب جہارے رب کے یہاں بھتر اور اُمیدیں سب سے بھلی۔“

مذکورہ آیت مقدمہ سے یہ بھی حقیقت ظاہر ہو رہی ہے کہ مال و دولت اور بیٹوں کو انسان سب کچھ نہ سمجھ لے۔ اگر یہ نعمتیں فائدہ مند ہیں تو اللہ جبارک و تعالیٰ کے حکم سے ہیں۔ اگر یہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں تو پھر یہی رذائل اخلاق کا سبب بھی بن جاتی ہیں۔ ناجائز طریقے سے کماتا، حلال و حرام کی تقسیم کو پس پشت رکھتا یہ سب انسان زیادہ سے زیادہ مال کمانے کے لئے کرتا ہے۔ راتوں رات امیر ہونے کے لئے یہ سب معاملات سرانجام دیتا ہے اور مزید یہ کہ اپنی اولاد کے لئے اپنی عاقبت خراب کرتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا کہ ان نعمتوں کو حرف آخر نہ سمجھ لینا یہ بھی اسی وقت ہی کام آئیں گی جب انسان مخصوص حدود و قیود کے اندر رہے گا ورنہ مال اور بیٹے جو کہ اس جتنی دنیا کا سنگھار ہیں رذائل اخلاق کے اہم محرک ثابت ہو سکتے ہیں لہذا اپنے آپ کو رذائل اخلاق سے بچانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تمام غیر ضروری چیزوں کو دل سے نکال دیا جائے۔

مال و دولت اکٹھا کرنے میں انسان اتنا منہمک ہو جاتا ہے کہ اُسے اپنا مقصد تخلیق ہی بھول جاتا ہے۔ وہ اس دنیا میں کس مقصد کے لئے آیا ہے یہ ہمیشہ اُس کا ٹھکانہ نہیں بلکہ دنیا تو مسافر خانہ ہے لہذا اس کے متعلق ہی ہمیشہ سوچنا انسان کے کردار کو جاہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ نہ صرف اس کی یہ دنیا برباد ہوتی ہے بلکہ آخرت کی زندگی بھی جاہ و برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔

### قیموں سے ظلم و نا انصافی:

آج ہمارے معاشرے میں پھر وہی دور جہالت کے رنگ غالب آتے جا رہے ہیں۔ دور جہالت میں قیموں سے انتہائی بُرا سلوک ہوتا تھا کوئی اُن کے سر پر شفقت والا ہاتھ نہیں رکھتا تھا۔ آج یہ بُری خصلت ہم میں رائج ہو چکی ہے جس کا واحد حل یہ ہے کہ ہم رسول اکرم ﷺ کی سیرت کو اپنائیں کیونکہ یہ صرف آپ ﷺ کی برکت ہی ہے جس سے ایک ایسا مثالی معاشرہ قائم ہو سکتا ہے جس میں قیموں، ناداروں اور غلاموں کو حقوق ملیں گے۔

اس سلسلہ میں رسول اکرم ﷺ کا فرمانِ ذی شان ہے:

”میں اور جہنم کی کفالت کرنے والا جنت میں اپنے ہوں گے جیسے یہ قریب ہیں۔“  
(آپ ﷺ نے اگلی شہادت اور درمیانی اگلی کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔)

## انتشار فکری / بدگمانی:

مومن کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ کبھی بھی انتشار فکری / بدگمانی کے قریب نہیں جاتا مگر بدقسمتی سے آج یہ مرض بھی ہمارے معاشرہ کا ایک لازمی عنصر بننا جا رہا ہے۔ ہمارے سوچنے کا آج انداز یہ ہے کہ کوئی شخص چاہے صحیح عمل بھی کر رہا ہو اس کی نیت بھی خوب خالص ہو مگر شیطان ہمارے ذہنوں میں بدگمانی کا بیج ضرور بوتا ہے کہ یہ کام تو یہ شخص فلاں نیت سے کر رہا ہے اس میں اس کا یہ فائدہ ہے وغیرہ۔ حالانکہ ہم نے اس کا دل کھول کر تو نہیں دیکھا۔ لہذا ہمیں اس مرض سے بھی کوسوں دور ہونا چاہئے۔

انتشار فکری / بدگمانی کا مرض انسان کیوں اختیار کرتا ہے؟ فقط اسی وجہ سے ہے کہ میری عزت لوگوں کی نظر میں بڑھے جبکہ میرے مقابل لوگوں کی عظمت کم ہو۔ جب ایسی سوچ ہمارے ذہنوں میں بسیرا کرے گی ہم اس بیج پر سوچنے والے بن جائیں گے تو اس کا نتیجہ یہی نکلا ہے کہ بدگمانی کے مرض میں ہم جھٹلا ہو جائیں گے جس کے ہم مریض بن بھی چکے ہوتے ہیں۔ اللہ عزوجل نے قرآن کریم میں اس برائی سے بچنے کا اس طرح حکم دیا ہے:

”اے ایمان والو! بہت گمان سے بچو بیشک کوئی گمان گناہ ہوتا ہے۔“ (الحجرات: 12)

## کفار کی دوستی اور تقلید:

کفار خود غلیظ ہیں بھلا ان سے کسی قسم کی فلاح کی توقع کی جا سکتی ہے۔ دین اسلام کو جھٹلانے سے بڑھ کر کبھی کوئی کیا عیب اس دنیا میں ہے؟ جب اس مذموم ترین صورت حال سے کفار وابستہ ہیں تو پھر بھلا ہٹاؤ ان سے کسی قسم کے فضائل اخلاق کے متعلق امید کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے بڑی شدت کے ساتھ کفار کو رد کیا ہے۔ جابجا مختلف اسلوب میں ان کی دوستی سے منع فرمایا ہے:

”اے ایمان والو! نہ بنناؤ یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جس نے دوست بنایا انہیں تم میں سے سودہ انہی میں سے ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم قوم کو۔“

”اے ایمان والو! نہ بنناؤ یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جس نے دوست بنایا انہیں تم میں سے سودہ انہی میں سے ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم قوم کو۔“

”تم ضرور اپنے سے پہلے لوگوں کی اندھی پیروی کرو گے۔ بائست کے برابر بائست میٹر کے برابر میٹر۔ یہاں تک کہ وہ اگر گروہ کے سوارخ میں داخل ہوں گے تو تم بھی اس میں جا گھس گے۔ لوگوں نے عرض کی کہ آقا ﷺ اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: (یہ نہیں تو) اور کون۔“

یہود و نصاریٰ کی تقلید کی وجہ سے ہی مسلم معاشرہ آج بگاڑ کا شکار ہو چکا ہے۔ طرح طرح کے رذائل اخلاقی ان کے ہاں رائج ہو چکے ہیں، زنا جیسا غلیظ گناہ بھی کفار کے معاشروں ہی سے درآمد کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سودی نظام بھی حادثے ہاں اس لئے رائج ہے کہ یہ نظام مغربی دنیا میں رائج ہے کفار کے معاشروں میں رائج ہے۔ یہی سودی نظام کو قائم کرنے کی ہماری پاس یہی دلیل ہے۔ کیا اس کے بعد بھی کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ کی تقلید بھی کرے گا اور خود کو رذائل اخلاق سے محفوظ بھی رکھے گا؟ ہرگز نہیں۔ یہ بالکل دو مختلف حقیقتیں جو کبھی بھی یکجا نہیں ہو سکتیں۔

ایسے بہت سے مسلمان ہیں جو کہتے ہیں کہ سودی نظام کو اختیار کئے بغیر گزارہ نہیں۔ یا کسی اور اخلاق رذیلہ کی دلیل گزرتا ہوا وقت بتاتے ہیں اور موقف یہی اختیار کرتے ہیں کہ یہ ہماری مجبوری ہے اس کے سوا اور کوئی حل نہیں ہے جیسے رشوت کا لین دین اسی نام نہاد اصول کی بنیاد پر ہی بڑے زور و شور سے قائم و دائم ہے۔

**نیک کام کے لئے علم سیکھنا:**

علم دین کا حصول اگر اللہ عزوجل کی رضا کے لئے ہو اور دین اسلام کی خدمت کے لئے ہو تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”اگر ایسے طالب علم کو اس حالت میں موت آجائے تو اس کے اور نبیوں کے درمیان جنت میں صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا۔“ (الترغیب والترہیب ج 1 ص 53)

مگر یہی کام بدعتی کے ساتھ کیا جائے تو اس کے جو نقصانات اور اثرات ظاہر ہوتے ہیں وہ بھی ملاحظہ فرمائیں:

ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا فرمانِ ذی شان ہے:

”جس نے طلب دنیا کے لئے علم دین سیکھا تو اسے جنت کی خوشبو نصیب نہ ہوگی۔“

(الترغیب والترہیب ج 1 ص 65)

مزید آپ ﷺ فرماتے ہیں:

”جس نے اللہ عزوجل کے لئے نہیں بلکہ غیر اللہ کے لئے علم سیکھا تو اس نے اپنا ٹھکانہ

دوزخ کو بنالیا۔“ (الترغیب والترہیب ج 1 ص 67)

یہی وجہ ہے کہ دین اسلام نے اس حدیث کو احکامات کے سلسلہ میں بہت اہمیت دی

ہے۔ ”اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔“ (صحیح بخاری)





# اہم معاشرتی ادارے

## خاندان

کسی بھی معاشرے کی تشکیل کے لئے ایک خاندان کی تکمیل ضروری ہوتی ہے کیونکہ ایک مضبوط خاندان ایک مضبوط معاشرہ کے قیام کی مہینہ دلیل ہے۔ معاشرے کی ابتداء ہی ایک خاندان کے اتحاد سے ہوئی اور معاشرہ نام ہے مختلف افراد کا ہم خیال و ہم ارادہ ہو کر اکٹھے رہنے کا اور ایک دوسرے کی فلاح و بہتری کے لئے کام کر کے ترقی کی منازل طے کرنا۔

دوسرے معنی میں معاشرت یا ہی ضروریات کی تکمیل کے لئے افراد خانہ کی مسلسل کوششوں کا نام ہے۔ خاندان اور اُس کے افراد ایک دوسرے کی روح ہوتے ہیں چنانچہ معاشرے کو زندہ اور صحت مند رکھنے کے لئے لازمی ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض کی بجا آوری صدق دل سے کرتا رہے اور خلوص نیت کے ساتھ دوسروں کے کام کرتا رہے اور اس کے ساتھ ہی ہر فرد معاشرہ کے لئے از بس لازم ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حقوق کا احترام کرے۔

ایک خاندان میں سربراہ کنبہ ایک ایسا بزرگ ہوتا ہے جسے سب سے پہلے باپ کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ بعد ازاں افراد خاندان میں بالترتیب عفت و احترام کے قابل والدہ بیٹے بیٹیاں بہنیں لائق عزت ہوتے ہیں۔ ان تمام افراد کا اپنی اپنی جگہ ایک اہم مقام ہے۔

ماں اور باپ شفقت کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنی اولاد کو پالتے ہیں اور تربیت دیتے ہیں جبکہ بہن بھائی مل کر ایک دوسرے کے مدد و معاون بن کر زندگی گزارنے کا عہدہ کئے ہوتے ہیں۔ ان سب کا فرض ہے کہ ایک دوسرے کی ضروریات کا نہ صرف احساس کریں بلکہ جہاں تک ممکن ہو سکے ایک دوسرے کی مدد کریں چنانچہ ایک مستحق خاندان کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہونی چاہئیں اور ان کا ہونا ضروری ہے۔

### 1- خاندان کے سربراہ کا نیک کردار ہونا:

اچھا نیک مضبوط اور قابل ستائش خاندان کا مرد سربراہ نیک سرشت کا مالک ہوتا ہے اور خاتون خانہ جو مادر خانوادہ کہلاتی ہے وہ نیک سیرت اور وفا شعار خاتون ہوتی ہے۔ اس مرد اور عورت کے اتحاد کا مقصد یعنی میاں بیوی کے ملاپ کا اعلیٰ مقصد بہترین اولاد پیدا کرنا ہوتا ہے نہ

کہ تیشاب زندگی کی لذتوں میں غرق رہنے کا نام چنانچہ صرف اولاد پیدا کرنا ہی کوئی کارنامہ نہیں ہے بلکہ اولاد کی بہترین تعلیم و تربیت کرنا بھی اُن کا اولین فرض ہے کیونکہ بہترین تعلیم و تربیت ہی ایک اعلیٰ ترین معاشرے کی تشکیل کی ضامن بن سکتی ہے۔ اولاد پر بھی لازم ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی نگہداشت کی طرف عمل توجہ دے۔ بڑھاپے میں اُن کے آرام و آسائش کے لئے ممکن حد تک اہتمام کریں۔ اُن کے ذمہ جو معاشرتی فرائض ہوں اُن کو وہ حتی المقدور اپنی کمال صلاحیتوں سے ادا کریں جس کی بناء پر پیشہ ورانہ کارکردگی میں حوصلہ افزائی حاصل ہو سکتی ہے۔

## 2- عزیزوں، رشتہ داروں سے ہمدردی:

والدین کی توجہ اور اولاد کی فرض شناسی کے بعد جو اہم کام معاشرے کی مضبوطی کا ہو سکتا ہے وہ رشتہ داروں، عزیزوں میں یکجہت اور اعتماد پیدا کرنا ہے اور یہ اعتماد ایک ہی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص دوسرے شخص کو مشکوک نظر سے نہ دیکھے۔ اپنے اندر خلوص کا مادہ رکھے اور اپنے فعل میں صداقت و سچائی رکھے۔ چنانچہ دلوں کو مشکوک و شبہات سے دور رکھنے کے لئے خواہ مخواہ ایک دوسرے پر بے جا پابندیاں نہ لگائے۔ ان میں برداشت، شفقت، انسانی ہمدردی، صلہ رحمی کے عناصر کارفرما ہوں۔ ذاتی اقاویت کی خاطر دوسروں کے مفادات تباہ کرنے کی نیت نہ رکھے بلکہ دوسروں کے لئے ایثار و قربانی کے جذبات رکھے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ”اس کی نشانیں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تم ہی میں سے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم اُن سے سکون حاصل کرو اور اس سے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کی۔“

ایک اچھے خاندان میں ایک عورت جو سربراہ خانہ بھی ہو سکتی ہے کے لئے حکم خداوندی ہے کہ اُن سے بہترین سلوک روا رکھا جائے تاکہ نہ صرف وہ عورت خود مطمئن رہے بلکہ پورے سکون و اطمینان کے ساتھ خاندان کی تربیت کر سکے۔

حکم خداوندی ہے:

ترجمہ: ”اور تم اپنی بیویوں کے ساتھ اچھی طرح رہو۔“

اور پھر مرد کو خاص طور پر وہ ہدایت کی کہ وہ عورت کو حقیر نہ جانے بلکہ وہ اتنی ہی اہم ہے جس قدر وہ خود کو اہم خیال کرتا ہے۔

ارشاد الہی ہے:

ترجمہ: ”عورتیں تمہارے لئے لباس ہیں اور تم عورتوں کے لئے لباس ہو۔“

### 3۔ خاندان میں تنظیم کا ہونا:

خاندان میں تنظیم کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ بغیر نظم و تنظیم کے فرد گھونٹے سے گرے ہوئے پرندے کی طرح ہے جس کو مقاب کسی بھی وقت ایک سکتا ہے۔ یہی حال بغیر تنظیم کے خاندان کا ہے البتہ خاندان کی مرکزیت کو مضبوطی دینا نظم و ضبط اور دوچہ بندی کو مد نظر رکھتے ہوئے عورت اور اولاد پر واضح کیا ہے کہ مرد عورت کی نسبت کسی نہ کسی طرح افضل ہے اور مرد عورت سے زیادہ طاقتور ہے۔

ارشاد الہی ہے:

”مردوں کے نزدیک ان عورتوں کا ایک مقام ہے یعنی مرد عورتوں پر ایک مقام رکھتے ہیں یعنی مرد عورتوں کی نسبت زیادہ طاقتور ہیں۔“

ان ہدایات کے مطابق خاندان کے ہر فرد خواہ مرد ہو یا عورت سربراہ خاندان کے ماتحت زندگی بسر کرنی چاہئے۔ ایک نظم و ضبط کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں  
سوج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

### 4۔ خاندان کے لئے اچھی بیوی کا ہونا:

یہ سب کچھ ہونے کے باوجود ایک کامیاب خاندان کے لئے ایک اچھی و فاضل بیوی کا ہونا از بس ضروری ہے جس بیوی میں مندرجہ ذیل صفات پائی جاتی ہوں وہ جس گھر میں ہوگی وہ گھر امن و سکون کا گہوارہ اور آئندہ نسل کے لئے بہترین تربیت گاہ اور ایک مضبوط خاندان کی دلیل ہوگا۔

اطاعت شوہر اور خاندان سے محبت اس بیوی کا شیوا ہو۔ ہر ایک سے حسن سلوک سے پیش آئے۔ اپنے قول و فعل کے اعتبار سے اس قدر کشش رکھے کہ اس سے معاملات رکھنے والے نہ صرف اس کے تقدس کے مداح ہوں بلکہ اس کی شیریں بیانی و حسن کردار کے قائل ہوں۔ گھر میں سے کسی سے کسی قسم کا ظلم و تعدی ادا نہ ہو۔ وہ خود بھی امن پسند ہو اور دوسروں کے ساتھ بھی حسن سلوک کا مظاہرہ کرے۔ ایک دوسرے پر مکمل اعتماد اور رازداری کا شیوا رہے۔ ہو اور جہاں تک ممکن ہو سکے باہمی مصالحت روا رکھنے والی ہو البتہ ایسے کام میں مصالحت کن طرح درست نہیں جن میں بد اخلاقی بے راہ روی یا گناہ و جرم کا شائبہ تک بھی پایا جاتا ہو۔

خاندان کے ہر فرد کا حق ہے کہ اس کے ساتھ عدل و انصاف برتا جائے۔ اسی طرح بیوی کے لئے بھی لازم ہے کہ وہ دوسروں سے انصاف کرے اور اپنے بارے میں انصاف درست اور رشتہ داروں سے احسن سلوک روا رکھے۔ بالخصوص ایسے رشتہ دار جن کے ساتھ خاندان کو بہت

زیادہ پیار ہو اور جن کو خاوند بجا طور پر فوقیت دیتا ہو۔ ہر عورت پر لازم ہے کہ وہ اپنے گھر کی اور اپنے عیوب کی پردہ پوشی کرے۔ علاوہ ازیں جسمانی اعتبار سے بھی اسلام کسی بھی عورت کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا ہے کہ وہ اپنا بدن کسی غیر مرد کے سامنے عریاں کرے چنانچہ اچھی بیوی پر لازم ہے کہ وہ اپنے جسم کو مکمل طور پر پوشیدہ رکھے۔ پاؤں کی ایڑی سے سر کی چوٹی تک عورت کا پردہ ہے۔ حیاء عورت کا زیور ہے اور حیاء ہی عورت میں سب سے بڑی کشش اور جاذبیت کا موجب ہوتی ہے۔ حیاء دار عورتیں پورے معاشرے میں سکون و ماحول میں پاکیزگی کا باعث بنتی ہیں۔ بے حیاء عورتیں پورے معاشرہ میں خاندان میں جھنسی بے راہ روی سکون کی بربادی و مہلک کاری کا سبب بنتی ہیں۔

اختصار! جس خاندان میں عورت کے لئے اس کی جان مال کے تحفظ کی ضمانت و فاداری عفت و عصمت کا تحفظ و رواداری پائی جاتی ہو اور اسی قسم کے معاشرتی حقوق میسر ہوں اس خاندان کو نہ تو کوئی شتم کر سکتا ہے اور نہ ہی اس میں کوئی زوال و انتشار پیدا ہو سکتا ہے۔

### 5- اچھے خاندان کے لئے اسلامی نظام حیات کا ہونا:

ایک کامیاب خاندان کے لئے اسلامی نظام حیات بھی اللہ کی رحمت و برکت ہے۔ ایک روشن و کامیاب خاندان کے لئے اسلامی نظام حیات نے ایک زبردست منضبط طریقہ کار دیا ہے جس کو اپنانے سے نہ صرف ایک فرد واحد بلکہ پورا خاندان پورے معاشرے کے لئے باعث استحکام بن جاتا ہے چنانچہ اسلامی نظریہ حیات کے تحت والدین کو لازماً افراد معاشرہ کے علیحدہ علیحدہ واضح حقوق متعین کر دیے گئے ہیں۔ اسی طرح تمام حضرات کے فرائض بھی بتا دیے گئے ہیں چنانچہ جس وقت تک فرائض اور حقوق کی ادائیگی میں اعتدال قائم رہتا ہے خاندان مضبوط رہتا ہے جس کا نتیجہ معاشرہ کی مضبوطی کی شکل میں نکلتا ہے۔ اس کے برعکس اگر خاندان اور معاشرہ دونوں میں سے کسی ایک کی طرف سے اسلامی حقوق و اسلامی قوانین کی خلاف ورزی ہوئی تو رخنہ اندازی استحکام کی شکست و ریخت ان کا مقدر بن جائے گی اور خاندان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا۔

## خاندان میں انتشار کی وجوہات

دنیا کا سب سے قدیم اور فرد کی زندگی میں اہم ترین ادارہ خاندان ہے جس کا وجود ہر دور اور ہر معاشرے میں رہا ہے۔ خاندان کو بین الاقوامی ادارہ بھی کہا جاتا ہے۔ دنیا کے تقریباً ہر مذہب و غیر مذہب ترقی یافتہ یا غیر ترقی یافتہ معاشرے میں خاندان کی اہمیت مسلم ہے۔ دیگر اداروں کے مقابلے میں خاندان کی ایک فرد کی زندگی میں زیادہ اہمیت ہے اس لئے کہ فرد

خاندان میں بنی پیدا ہوتا ہے۔ اسی میں سے بنیادی ضروریات کی تسکین حاصل کرتا ہے اور معاشرتی زندگی کے غور طریقوں اور ثقافتی نمونوں سے آشنا ہوتا ہے جو اس کی سماجی تربیت کا اہم حصہ ہیں۔ نیز خاندان ہی سے وابستہ رہ کر ایک فرد اپنے جذبات اور نفسیاتی کیفیت کی تسکین بھی حاصل کرتا ہے۔ خاندان معاشرے کی اکائی ہوتا ہے اور پورے معاشرے کی نمائندگی کرتا ہے۔ قدیم زمانے سے آج تک خاندان معاشرتی زندگی کے انتہائی اہم وظائف انجام دیتا آ رہا ہے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ خاندان کی ساخت اور فرائض میں تبدیلیاں بھی آ رہی ہیں جن میں بعض اہم فرائض بجائے خاندان کے دیگر سماجی اداروں کے سپرد ہو گئے ہیں جبکہ چند نئی ذمہ داریاں آج کے خاندان کے سرانجام دہنی پڑ رہی ہیں۔ خاندان کی ساخت اور ڈھانچے میں نمایاں تبدیلیوں کی وجہ سے آج کے خاندان میں ٹوٹ پھوٹ و انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ خاندان کا ساز بھی کم ہوتا جا رہا ہے۔ خود غرضی، نفسانسی، دولت کی انفرادی حرص، ہر فرد کا اپنے آپ کو خود کفیل خیال کرنا، خاندان کی اقدار سے آزادی، بزرگوں کی کفالت سے آزادی، آپس کے پیار محبت میں کمی وغیرہ کے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ آخر اس انتشار کی کیا وجوہات ہیں آئیے ذیل میں جائزہ لیتے ہیں۔

### 1- خاندان کی ساخت میں تبدیلی کا رونما ہونا:

آج کا خاندان ساخت کے اعتبار سے قدیم خاندان سے کافی چھوٹا اور کافی حد تک مختلف ہو گیا ہے۔ قدیم خاندان بڑے ہوتے تھے جن میں شوہر بیوی اور بچوں کے علاوہ بہت سے خونی رشتے بھی شامل ہوتے تھے۔ اس قسم کے خاندان کو مشترکہ خاندانی نظام (Joint Family System) کہلایا جاتا تھا۔ اسی خاندان میں ایک فرد کو جو عموماً باپ ہوتا تھا (بعض دفعہ ماں بھی ہوتی تھی) تمام اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ تمام افراد خانہ اس کے فرمانبردار ہوتے تھے۔ مشترکہ معیشت ہوتی تھی اور سب مل جل کر کام کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے رنج و غم، خوشی مسرت میں شریک ہوتے تھے۔ اس قسم کے خاندان میں پیار، محبت، خلوص، ایثار و یگانگت کے جذبات موجزن ہوتے تھے جس کے سبب خاندان میں مضبوطی و استحکام زیادہ تھا۔ جب بھی خاندان پر کوئی آفت و مصیبت آتی تو ہا ہی مشورہ سے نجات حاصل کرنے کی کوششیں کرتے تھے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ہی مشترکہ خاندانی نظام کا رجحان اس کی چند کوتاہیوں، رنجشوں کی بناء پر ختم ہو گیا اور اس کی جگہ شوہر، بیوی اور چند ماتحت بچوں پر مشتمل خاندان کو فروغ حاصل ہوا۔ اس قسم کے مختصر خاندان کو اکائی خاندان یا Nucleus Family System کہتے ہیں۔ یہ نظام خاندان مشترکہ نظام خاندان کے مقابلے میں غیر مستحکم ہے۔ اس میں خلوص، پیار و محبت کے جذبات کم پائے جاتے ہیں۔ یگانگت کا تو تصور ہی نہیں ہے۔ اس خاندان میں عموماً ہر

فرد کی مصروفیات زیادہ ہوتی ہیں۔ ہر کام اکیلے کو ہی کرنا پڑتا ہے۔ اس وجہ سے خاندان کے افراد کے درمیان رابطہ نہیں رہتا۔ آپس میں رابطے کا فقدان ہوتا ہے۔ اسی پر سب گھٹکھٹکے رہتے رہتے ہیں۔ معاشی اعتبار سے بھی یہ خاندان کمزور ہوتا ہے۔ اس خاندان میں شخصی آزادی پر زور دیا جاتا ہے اور کسی ایک کے اختیارات تسلیم نہیں کئے جاتے۔ ہر ایک خودکفیل و خودمصر ہوتا ہے۔ نفساً نفسی خود غرضی ان کے سنہرے اصول ہوتے ہیں۔ یہ خاندان صنعتی ترقی پور شہروں کے فروغ سے انحراف ہے جس کا اس خاندان کی مصروفیات پر نمایاں اثر پڑا ہے مثلاً اکائی خاندان (Nuclear Family) میں عموماً عورتوں کی مصروفیات زیادہ ہوتی ہیں جس سے عورتیں خوش ہیں۔ اکثر گھر سے باہر کی زندگی پسند کرتی ہیں۔ ان میں تعلیم کی شرح بھی بلند ہوتی ہے۔ ان کی عام ذمہ داریاں اور کردار مردوں کے مساوی ہوتا ہے اور معاوضہ بھی مردوں کے مساوی۔ یہاں تک کہ دنیا کے ہر میدان میں مساوات کی طلب گار ہیں۔

اس قسم کا مختصر خاندان مغربی معاشروں میں کلی طور پر اپنایا گیا ہے جبکہ پاکستان میں بھی اکائی نظام خاندان کا رجحان صرف شہری علاقوں میں بڑھتا جا رہا ہے۔ اکائی نظام خاندان کے فروغ سے بوڑھوں اور بچوں کی دیکھ بھال اور خدمت کا مسئلہ بن گیا ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر مغربی معاشروں میں حکومت کی طرف سے اور این جی اوز (NGOs) کے تعاون سے بوڑھوں کی کفالت کا معقول انتظام کیا ہے مثلاً ”اولڈ ہاؤس“ تعمیر کر دیئے ہیں جس کے تحت ان کی تمام ضروریات کی تکمیل حکومت کے ذمہ ہے۔ بوڑھوں کی رہائش تجارتی علاقے میں ان کی تفریح اور اخبارات و رسائل کا مطالعہ کے لئے لائبریری وغیرہ کا معقول بندوبست کر دیا گیا ہے جبکہ اب تک ہمارے معاشرے میں ایسی اکائی انتظام نہیں ہے جس کا سبب ایک بوجھار روایتی کردار ہے جس کے تحت ہم پر بوڑھے والدین یا مستحق رشتہ داروں کی کفالت کی ذمہ داری عائد ہے۔ یہی روایت اسلام سکھاتا ہے۔ دوسرے ہمارا ملک معاشی لحاظ سے غریب ملک ہے لیکن آبادی بڑھانے میں امیر ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی وسائل کی راہ میں حائل ہے اور حکومت بوڑھے افراد معاشرے کے دیگر ضعیف لوگوں کو وہ سہولتیں دینے سے قاصر ہے جو مغربی ممالک اپنے بوڑھے لوگوں کو فراہم کر رہے ہیں۔ مغربی معاشرہ تو بوڑھوں کو بے روزگاری، انانٹس و بڑھاپا، الالونٹس بھی ادا کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکائی نظام خاندان میں ہمارے پاکستانی توام کے لئے کشش ہے جس نے رائج الوقت پاکستانی معاشرہ میں کئی مسائل پیدا کر دیئے ہیں اور موجودہ خاندان کا نظام اعتبار کا شکار ہے۔

## 2- خاندان کے فرائض میں تبدیلی کا ہوتا:

خاندان کی ساخت میں تبدیلی کے ساتھ ہی ساتھ خاندان کے اہم فرائض میں بھی

تہذیبیاں رونما ہو رہی ہیں۔ اب بہت سے ایسے قرائض (وظائف) جو خاندان سرانجام دیتا تھا وہ اب دوسرے اداروں کے سپرد ہیں یا پھر خاندان کے ذریعے ان کی ادائیگی میں کوتاہیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ یہ تہذیبیاں ہم اپنے خاندان میں بھی محسوس کر رہے ہیں۔

درج ذیل میں ان تہذیبوں کا جو خاندان کے قرائض پر اثر انداز ہوتی ہیں، کا مختصر جائزہ پیش کریں گے:

1- خاندان کا سب سے اہم فرض فرد کی بنیادی ضروریات پوری کرنا، ان کی تحسین کرنا تھا جس میں غذا کی فراہمی، مکان یا ٹھکانے کی تعمیر، لباس اور علاج معالجہ شامل ہیں۔ آج کا خاندان اپنی اس ذمہ داری کو براہ راست پورا نہیں کرتا مثلاً غذا کے لئے آج کے خاندان کو براہ راست اناج اگانا نہیں پڑتا۔ نہ جانوروں کا شکار کرنا پڑتا ہے بلکہ منڈیوں، مارکیٹوں اور دیگر معاشی اداروں کے تعاون سے حصول غذا کا فرض ادا کیا جاتا ہے۔

2- خاندان کا ایک اہم فرض بچوں کو تعلیم و تربیت دینا رہا ہے۔ باپ اپنے بچوں کو اپنے چمچے کا فن سکھاتا تھا۔ بچی اس کی معلومات کا ذریعہ تھیں اس کے علاوہ مذہبی تعلیم کی فراہمی بھی اس کا فرض تھا۔ مذہبی رسوم اور روایات کی تعلیم، مذہبی معلومات کی تعلیم کی فراہمی بھی خاندان ہی پر عائد تھی۔ آج کل تعلیم و تربیت تعلیمی اداروں کی معرفت منظم طور پر ہم پہنچائی جاتی ہے۔ جبکہ سکول، کالج، اکیڈمیاں تعلیم کے ذریعہ سے معاشرہ کو روشن کر رہی ہیں۔ خاندان کی انفرادی ذمہ داری ختم ہو گئی ہے۔ جہاں تک مذہبی تعلیم کی فراہمی کا تعلق ہے وہ دینی درسگاہوں، عربی مدارس اور مذہبی اداروں کی معرفت دی جا رہی ہیں۔ جو ایک رسم کے طور پر دی جا رہی ہے اس میں خاندان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ خاندان کے افراد تو بس اپنی روزی کمانے کی فکر میں دن رات ایک کئے ہوئے ہیں۔

3- قدیم خاندان اپنے افراد کے لئے تفریح کا باعث بھی ہوا کرتا تھا۔ اجتماعی طور پر کھڑی پہلوانی، گھڑسواری کے مقابلے منعقد کیے جاتے تھے۔ خاندان کی تفریح کو پورا کرنے کے لئے بچے کے حاشے، کھک، ڈاس اور لڈی ڈالی جاتی تھی مگر آج خاندان کے اس عہد میں تبدیلی آ گئی ہے۔ تفریح کا فرض تفریحی اداروں کے سپرد ہے۔ ریجنٹی وی، گانے، ڈرامے، ٹیلی ویژن، کمپیوٹر، سینما ہاؤس وغیرہ تعلیمی ادارے اور ایجنسی۔ جی۔ او۔ منعقد کر رہے ہیں۔ یہ خاندانی روایات میں بڑی تبدیلی کا آغاز ہے مگر آج کل خاندان کا یہ اہم فریضہ تفریحی اداروں کے سپرد ہے جس کی بڑی حد تک افراد خاندان کی مصروفیات ہیں۔ لہذا ان دنوں خاندان کی مصروفیات سے انہیں مل جیتنے اور ایک دوسرے کے ساتھ



تفریح میں حصہ لینے کا وقت نہیں ملتا۔ آج کل فرد کی بجائے خاندان کے کلب، سینما ہال، تھیٹر، کھیل کے سٹیڈیم، ریس کورس کے میدان اور دیگر تفریح گاہیں تفریح کا ذریعہ بن کر رونق لگا رہی ہیں۔ یہ سب کچھ خاندان کے فرائض میں تبدیلی کا ثمر ہے۔

### 3- بوڑھوں، بچوں کی خدمت میں تبدیلی کا رجحان:

خاندانی نظام میں انتشار کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ بوڑھوں، بچوں کی خدمت سے غفلت اور کوتاہی کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے حالانکہ قدیم خاندانی نظام میں بوڑھوں، بچوں کی خدمت و دیکھ بھال و نگہداشت خاندان کے ہر فرد کا مذہبی فریضہ تھا۔ اکائی خاندان کے فروغ نے خاندان سے متعلقہ ذمہ داریوں کو ختم کر دیا ہے۔ عموماً بچوں کو ڈے کیئر (Day Care) سینٹروں یا نرسری سکولوں کے ذریعے پروان چڑھایا جاتا ہے جبکہ بوڑھے لوگ اپنی زندگی کے آخری ایام مایوسی، ناامیدی و شرمندگی کے احساس سے پورے کرتے ہیں۔ اس ضمن میں خواتین کی ملازمت اور اضافی مصروفیات کا بڑا عمل دخل ہے۔

خاندان سے متعلق ان ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کوتاہیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ دفتری مصروفیات کے سبب نہ اپنے بزرگوں، رشتہ داروں کی اس طرح خدمت کر سکتی ہیں جیسا کہ پہلی خواتین کرتی تھیں اور نہ وہ اپنے بچوں کو پیار و شفقت دے سکتی ہیں جو دینے کا حق ہے۔ اس طرح وہ اپنے بچوں کی تعلیم و پرورش کا حق ادا کرنے سے قاصر ہوتی ہیں۔ عورتوں کی کوتاہیوں بیرونی مصروفیات نے خاندان میں پیچیدہ مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔

افراد کی مصروفیات میں اضافے سے ان کے خاندان سے متعلقہ فرائض کی انجام دہی میں کوتاہیاں ہو رہی ہیں مثلاً بچوں کی تعلیم و تربیت اور پرورش میں خواتین پورا حصہ نہیں لیتی ہیں اور سرپرست خاندان جو عموماً باپ ہوتا ہے، کی توجہ بھی خاندان پر کم ہی رہتی ہے۔ بچوں کی تربیت میں پہلے خاندان جس قدر حصہ لیتا ہے اب نہیں لیتا۔ اب یہ تربیت دیگر تعلیمی ادارے، تفریحی اور مذہبی اداروں سے حاصل کی جا رہی ہے۔

### 4- ثقافتی ورثہ کا عدم تحفظ:

خاندانی نظام میں انتشار کی یہ بھی وجہ ہے کہ ثقافتی ورثہ عدم تحفظ کا شکار ہے۔ ثقافتی ورثہ خاندان کی تاریخ ہوتا ہے۔ شناخت کا سبب ہوتا ہے۔ اس کی آنے والی نسلوں میں منتقلی میں خاندان اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وقت کے ساتھ خاندان میں تبدیلی نے خاندانی ورثہ کو بھی تباہ و برباد کر دیا ہے جس نے انتشار کی حالت پیدا کر دی ہے۔ ثقافتی ورثہ اب کمزور پڑ گیا ہے۔ پرانے رسم و رواج ختم ہونے کی وجہ سے ثقافتی ورثہ بھی آنکھوں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ ذرائع آمد و رفت میں سہولت اور ذرائع مواصلات میں ترقی کے سبب دنیا کے تمام معاشرے میں



ثقافتی ارتباط کا عمل بڑھ گیا ہے لہذا کسی بھی ثقافت سے متعلق خاندان کو ثقافتی ورثہ منتقل کرنا دشوار ہو گیا ہے اور ایک معاشرے کی ثقافت دوسرے معاشروں کی ثقافت میں شامل ہو رہی ہے۔ خاندانی ورثہ کی لاپرواہی اور مخصوص شان جو ایک خاندان کا نشان ہوتی تھی اب ختم ہوتی جا رہی ہے لہذا آنے والی نسلوں کو ورثہ میں کیا منتقل کیا جائے گا؟ یہ سوال غور طلب ہے۔

### 5- صنعتی ترقی اور خاندان پر اثرات:

صنعتی ترقی ہر ملک اور معاشرے کی خوشحالی کی ضامن ہوتی ہے۔ معاشی حالات پر صنعتی ترقی کا بہتر اثر ہوتا ہے جس سے بیشتر مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ صنعتی ترقی سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کی مرہون منت رہی ہے جو ہر دور میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نہ صرف بہتری اور ترقی کی ذمہ دار رہی ہے بلکہ ان شعبوں میں تغیر لانے کا بھی بہت بڑا ذریعہ بنی رہی ہے۔ لہذا وہ معاشرے جہاں پر سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے صنعتوں کو ترقی دی جاتی ہے نہ صرف معیشت کے اعتبار سے ایک نئے دور میں داخل ہوتے ہیں بلکہ معاشرتی زندگی میں بھی تبدیلیوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ صنعتی ترقی کا دیگر اداروں کی نسبت خاندان پر نمایاں اثر مرتب ہوا ہے۔ یورپ میں ہم دیکھتے ہیں کہ صنعتی انقلاب کے ساتھ جہاں زندگی کے بیشتر شعبے تبدیل ہوئے وہاں نظام زندگی بھی بدلا۔ روس، جرمنی اور امریکہ جیسے صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ معاشروں میں خاندان کی ساخت، فرائض اور اہمیت بدل گئی ہے۔ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جو صنعتی ترقی کے دور میں داخل ہو رہا ہے جس کے سبب نہ صرف معیشت میں بلکہ روزمرہ زندگی اور مصروفیات میں نمایاں تبدیلی آ رہی ہے۔ ہمارا ملک اب تک زرعی معیشت رکھنے والے ممالک میں شامل ہے مگر آج کل یہ کوششیں کی جا رہی ہیں کہ زرعی معیشت کو صنعتی معیشت میں بدل دیں اور اس کوشش کے نتیجے میں ایک طرف ملیں، کارخانے، فیکٹریاں قائم ہو رہی ہیں تو دوسری طرف آبادی دیہاتوں سے شہروں کی طرف ہجرت کر کے آ رہی ہے۔ یہ سلسلہ دن بدن بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ شہر وسیع تر ہوتے جا رہے ہیں جبکہ دیہاتوں کو سڑکوں اور ریلوے لائن سے ملایا جا رہا ہے۔ صنعتی ترقی سے تجارت میں فروغ ہوا ہے جس سے غیر ملکی تجارتوں کی آمدورفت بھی بڑھ گئی ہے۔ ان حالات کا خاندان پر جو نمایاں اثر مرتب ہوا ہے ان میں خاندان کا چھوٹا ہو جانا ہے۔ اہم فرائض و وظائف میں تبدیلی قائل ذکر ہے جس سے افراد کی مصروفیات میں اضافہ ہو گیا ہے اور افراد خاندان میں طبعی روابط اور جتنی ہم آہنگی کی کمی بڑھ رہی ہے۔ خاندانی نظام میں کمی آتی جا رہی ہے جو خاندانی انتشار کا بڑا موجب ہے۔

## مغربی ثقافت اور ہمارا خاندان

یہ حقیقت ہے کہ آج کل مغربی معاشروں میں خاندان کی اہمیت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ایک فرد کی زندگی میں خاندان کے مقابلے میں دیگر اداروں کا زیادہ دخل ہے۔ مغربی ماہرین عمرانیات کا خیال ہے کہ مستقبل میں رقتہ رقتہ شادی اور خاندان جیسے ادارے بالکل ناپید ہو جائیں گے۔ مغربی معاشرے میں ہر فرد خود کفیل ہے اور افراد اپنے آپ کو اس قسم کے حالات سے پوری طرح ہم آہنگ کر چکے ہیں۔ ان کے ہاں نرسریاں قائم ہیں جہاں بچوں کی اطمینان بخش نگہداشت ہوتی ہے اور بڑھوں کے لئے ”اولڈ ہاؤس“ قائم ہیں جہاں اُن کی کفالت اور تنہا زندگی کا اہتمام کیا گیا ہے۔ شریک حیات کے انتخاب میں فرد پر کوئی پابندی نہیں یہ معاملہ بین فرد کی غلط فہمی سے طے ہوتا ہے۔ شادی کے بعد ازدواجی رشتے مضبوط رکھنا بھی ضروری نہیں اس ضمن میں بھی خاندان سے کوئی پابندی شوہر اور بیوی پر عائد نہیں ہوتی۔ وہ اپنی سہولت اور خواہش سے یہ رشتہ منقطع کر لینے میں ہلکے ہیں۔ بات ان کے ہاں اس قدر عام ہے کہ ہر عورت اور مرد باسانی اپنی زندگی میں طلاق کے بعد چار پانچ شادیاں رچا سکتا ہے۔ اس طرح منسختی ترقی کے خاندان پر بہت بُرے اثرات رونما ہوئے ہیں۔ جنسی بے راہ روی کے دروازے کھل گئے ہیں۔ بچوں کی ولدیت منکوحہ ہو گئی ہے۔ خاندانی عزت و وقار ختم ہو گیا ہے۔ انسانیت کا دیوالیہ نکل چکا ہے۔

ہمارا معاشرہ اسلامی اقدار پر قائم ہے جو مغربی معاشروں سے بے حد مختلف ہے۔ ہماری روایات و اقدار مذہبی اصولوں پر قائم ہیں جن کی وجہ سے ہر فرد پر خاندان سے متعلقہ چند ذمہ داریاں عائد ہیں۔ ہماری اقدار خواتین کی آزادی اور شادی سے پہلے میل جول کو بُرا خیال کرتی ہے اور اس بات کی بالکل اجازت نہیں دیتی کہ لڑکا لڑکی کھل کر تفریح کی خاطر شادیاں رچائیں اور چند دنوں بعد طلاق دے کر آزاد ہو جائیں۔ شادی تو عمر بھر کا ساتھ ہوتی ہے۔ عمر بھر اس کو بھانا ہوتا ہے۔

بزرگوں کا احترام اور خدمت ہمارا روایتی کردار رہا ہے۔ جہاں تک شریک حیات کے احباب کا تعلق ہے اس کا گہرا تعلق بہ نسبت لڑکے یا لڑکی کے خاندان سے ہوتا ہے۔ والدین اور بزرگ ہی رشتے طے طے کرتے ہیں۔

آج کل ہم اپنے شہری معاشروں میں جہاں بیشتر شعبہ جات زندگی میں تہذیبیں محسوس کرتے ہیں وہاں پر تنقید کا ہلال ماحلات میں بھی عیوی سے تہذیبی نظر آتی ہے۔ ذرائع آمد و رفت میں امتداد اور مواصلاتی نظام میں ترقی نے ایک طرف ہمارے معاشرے کو مغربی دنیا سے قریب تر کر دیا ہے جس کے سبب ثقافتی ہرج مہرج کا قتل بھی ہو گیا ہے۔ دوسری طرف

خاندان مذہبی اداروں، لوگ ریت اور رسوم و رواج جیسے سماجی اداروں کی گرفت کمزور پڑ گئی ہے جس کے نتیجے میں آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو بوڑھوں اور نوجوانوں کے درمیان تنازعہ بڑھ گیا ہے اور نوجوان (اولاد) اپنے بوڑھے والدین کو اپنے ساتھ رکھنا پسند نہیں کرتی۔ دوسری طرف خواتین کی آزادی اور مصروفیات نے بچوں کی پرورش اور تربیت پر منفی اثر ڈالا ہے۔ محبت کی شادیوں کا رواج بڑھ رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی طلاق کی شرح بھی بلند ہو رہی ہے۔ نوجوانوں میں لاپرواہی اور لالچالی پن بڑھ گیا ہے جس سے ان کی خاندان اور اس کی ذمہ داریوں سے چشم پوشی بڑھتی جا رہی ہے۔ لیڈی ازم، فیسٹ لیڈی ازم جیسے نفسیاتی امراض بھی بڑھ رہے ہیں جن کا خاندان پر بہت بُرا اثر پڑ رہا ہے جہاں تک اقدار و روایات اور رسوم و رواج کا تعلق ہے جن کی پابندی خاندان کی طرف سے عائد ہوتی ہے وہ بھی ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ نوجوان پرانی اقدار کو نئی اقدار سے بدلنا چاہتا ہے۔ مجموعی طور پر ہم خاندان کا جائزہ لیں تو آج کا خاندان مغربی ثقافت کے زیر اثر آ کر کافی حد تک متاثر نظر آتا ہے۔ اسی متاثر ہونے کو بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ خاندان ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کا شکار ہے۔ یہ تبدیلیاں ہمارے معاشرے میں مسائل پیدا کر کے ہر کسی کو پریشان کر رہی ہیں۔ آج کل ہم اپنے معاشرے میں خاندان سے متعلق جن مسائل و انتشار کو محسوس کر رہے ہیں ان کا مختصر جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

## خاندانی بحران یا انتشار

اگر خاندانی عدم تنظیم کو خاندان کی ہیئت بگڑنا اور ٹوٹنا کہا جائے تو اس میں وہ تمام صورت حالات شامل ہیں جن میں ایک خاندان ایک یا زائد افراد کو کھو بیٹھا ہے۔ خاندان کے شخصیتوں کے تعاملی وحدت کے نظرے کی وجہ سے خاندانی عدم تنظیم میں خاندانی ہیئت کی نازک ترین ٹوٹ پھوٹ بھی شامل ہے یعنی وہ جو خاندان کے افراد کی آپس میں بیگانگی میں نظر آتی ہے جس میں خاندانی کشاکش بڑھتی ہے۔ خاندانی تعامل محدود ہوتا ہے۔ رابطے اور تعلقی کی راہیں مسدود و محدود ہو جاتی ہیں۔ خاندانی تعلقات کوئی بھی شکستگی جو خاندانی وضع کی تنظیم نو پر مجبور کرے نہ صرف خاندانی بحران کھڑا کر دیتی ہے بلکہ خاندانی عادات و خاندانی وحدت کے لئے ایک بڑا خطرہ ہے۔

برگس اور لاک (Burgess & Locke) نے بحران کو وہ ”فیصلہ کن تبدیلی“ کہا ہے جس کی وجہ سے ایسی صورت حال ہوتی ہے جس کے لئے فرد یا گروہ کے عادات میں شامل طرز عمل کے طور پر طریقہ ناکافی اور ناموزوں ہیں۔ بعض صورتوں میں بحران میں خاندانی تفرقہ لازمی جواز ہے اور اس میں بچوں کا گھر سے بھاگ جانا، علیحدگی، طلاق اور موت شامل ہیں جس حد تک یہ حادثات تفرقہ انگیز ہوں اس کا بنیادی طور پر جذباتی وابستگی اور سرگرمیوں کے انحصار

یا ہی پر انحصار ہے۔ جہاں جذباتی الجھاؤ اور باہم انحصار شدید ہو وہاں بچوں کا گھر سے چلے جانا طلاق اور موت..... خاندان کے افراد کے لئے بہت بڑا بحران ہے۔

ہر خاندان کسی نہ کسی مرحلے پر بحران سے دوچار ہوتا ہے یا تو جذب پذیر احتجاج کی صورت میں یا ایسے اہم واقعات کی صورت جو ان مٹ داغ دے جاتے ہیں۔ یہ پورا مسئلہ ہی بڑا پیچیدہ ہے کیونکہ مختلف لوگوں کی نظر میں بحران کے مختلف معنی ہوتے ہیں مثلاً نچلے طبقے کے لوگوں کے لئے معاشی و مالی بحران بڑا تکلیف دہ ہے جبکہ متوسط طبقے کے لئے بدنامی کا خطرہ شدید پریشانی کا باعث ہوتا ہے۔ وہ عزت و احترام پر زور دیتے ہیں۔ اسی طرح کسی خاندان میں بڑی مستحکم و شوخ تنظیم ہوئی ہے اور تمام خاندانی حالات میں بڑی سختی سے افراد اصولوں پر کاربند رہتے ہیں اور بعض خاندانوں میں تقابلی پذیر خاندانی ساخت کی تلاش ہوگی۔ ہر خاندان بحران کی زد میں مختلف طرح سے ہوگا اور اس بحران سے توافق کا طریقہ بھی ہر ایک کا جداگانہ ہو گا۔

بہر صورت بحران ایسا حادثہ ہے جو خاندانی ذرائع پر بہت دباؤ ڈالتا ہے جس کا حل روایات رسومات یا خاندان کی پریشانیوں کے گزشتہ تجربوں سے نہیں ملتا اور جس کے لئے خاندان کو نئے اور بالعموم قرین مصلحت و ذرواثر طریقے اپنانے پڑتے ہیں تاکہ خاندان کی گازی چلتی رہے۔

بحران کے ذرائع مختلف ہیں کسی کی ابتداء خاندان کے اندر ہی ہوتی ہے۔ کسی پر بیرونی حالات اثر کرتے ہیں۔ جو بحران معاشی سردبازاری یا جنگ کا نتیجہ ہوں جو کہ خاندان کے اختیار سے باہر ہوں ان کے مسائل اس بحران سے مختلف ہوتے ہیں جس کے مسئلے خاندان میں تین شخصی تعلقات پر مبنی ہوں۔ بحران کی دوسری تقسیم میں خاندان کے افراد کو دینا یا ایسے فرد کی شمولیت جس کے لئے آمادہ نہ ہوں اور اخلاقی و خاندانی وحدت کو دینا یا ان تینوں کا احتجاج شامل ہے۔

چاہے کوئی بھی صورت ہو جلد یا بدیر بحران میں پست حوصلگی شامل ہے کیونکہ خاندانی نظام کردار پر ہمیشہ شدید اثر پڑتا ہے۔

جیسے معاشی بحران یا معاشرتی ذلت بحران کا باعث ہیں اسی طرح غربت سے ایک دم امیر ہو جانا اور گمنامی سے ایک دم شہرت پانا بھی بحران کا سبب ہے۔ اس کے علاوہ اپنے کرداروں سے متعلق تصورات بھی اکثر بحران کا سبب بن جاتے ہیں مثلاً والدین اور بچوں کے کردار مہیاں اور بیوی کے کردار۔

انحصار! اگر خاندان کے ذرائع ناکافی ہوں اور مشکلات کو باعث بحران سمجھا جائے تو اس خاندانی فکسٹ و ریجٹ کے عوامل متضاد ہوں گے مثلاً جین شخصی تعلقات متضاد خاندانی کردار محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

شہر اور بیوی کے درمیان تہذیبی اختلافات آرزوؤں میں تضاد معاشی دباؤ اور طبقاتی دباؤ ہیں جو بحران کا سبب بنتے ہیں۔

## بحران کی قسمیں

### 1۔ بے روزگاری کا بحران:

بے روزگاری کی بے شمار صورتیں ہیں اور انتہائی وقت کے لحاظ سے یہ کیفیت بدلتی رہتی ہے مثلاً پاکستان میں بے روزگاری عام ہے۔ نیز ہمارے کسان صرف فصلوں کے زمانے میں برسر روزگار ہوتے ہیں اور باقی تمام سال بے کار ہی رہتے ہیں۔ ہڑتالیں، صنعتی بے چینی، صنعتی تہذیبیاں، تجارت میں نقصان اور خرید و فروخت کے مسائل کی وجہ سے ملازم بے روزگار ہو جاتے ہیں۔ بے شمار خاندان روزگاری کی صورت حال میں زبردست تبدیلیوں کی وجہ سے شدید غربت کے خاندانی بحران کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہ سمجھنا کہ مشینری اور کارخانے بے روزگاری کے مسئلے کو پورے طور پر حل کر سکتے ہیں بڑا رجائی نظریہ ہے۔ کام پیشہ مرد اور عورتیں مشین کا ایک حصہ نہیں ہیں بلکہ کام اور زندگی کی طرف ان کے خاص رویے اور عاداتی مہارتیں ہیں۔ ان کے واسطیات و وابستگیاں گھر سے ہی وابستہ ہوتی ہیں اور اگر ان کا روزگار چھوٹ جائے تو یہ وابستگی بے معنی ہو جاتی ہے۔ ان میں احساس تحفظ بہت کم ہوتا ہے اور بدلے ہوئے حالات سے نئے سرے سے مطابقت کے لئے وہ کسی کی مدد اور رہنمائی حاصل نہیں کر سکتے۔ الغرض جس حد تک بے روزگاری خاندان کے افراد پر برا اثر ڈالے اسی پر اس کو بحران کا باعث سمجھنے کا انحصار ہے۔

### 2۔ بیماری کا بحران:

صحت کے بھی بے شمار مسائل ہیں جن میں عوامی امراض مثلاً جراثیمی (برص)، غذائی بیماریاں، اخطاطی امراض جن کا بڑھاپے سے تعلق ہے۔ دہی بیماریاں جن کا تعلق فشارخون و فسادخون اور تشویش سے ہوتا ہے شامل ہیں۔ کچھ لوگ بیماری کی وجہ سے کسی حد تک بے کار ہو جاتے ہیں۔ زیادہ شدید اور غذائی بیماریاں اعلیٰ طبقے کے مقابلے میں پچھلے طبقے کو متاثر کرتی ہیں جبکہ اخطاطی بیماریوں کا معاشرتی، معاشی، طبقاتی حیثیت سے کوئی تعلق نہیں۔ بالعموم آدمی ایسی بیماریوں اور تکلیفوں کا شکار ہوتے ہیں جو مہلک ثابت ہوں۔ عورتوں کے مقابلے میں اندرونی دباؤ بھی مردوں پر زیادہ پڑتا ہے۔

بیماریوں کے علاوہ ایسے لوگ بھی ہیں جو جسمانی معذوریوں کا شکار ہیں۔ ان میں اپاہج، تاجنا، گونگے، لنگڑے، بھرے، فالج زدہ وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ان لوگوں کو بہت حد تک امداد و

توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے معذوروں کی بحالی کے لئے خاص ادارے ہیں جن کی سرگرمیاں تیز تر ہونی چاہئیں تاکہ ان کو ایسے کاموں پر لگایا جاسکے جس کی وجہ سے یہ دوسروں کے محتاج و دست نگر نہ ہوں اور کسی حد تک اپنی کفالت خود کر سکیں۔ معذوروں اور ایتھوں کے معاشرتی مسئلے حل کرنے کے لئے دو طرح کے پروگرام مرتب کئے جاتے ہیں:

1- انفرادی نوعیت کے پروگرام

2- اجتماعی نوعیت کے پروگرام

اول الذکر میں ان کے لئے خاص درسگاہیں خاص کلاسوں کا ایسا انتظام جہاں یکساں معذوروں والے افراد ایک جگہ کام کریں اور ایسے مرد اور عورتوں کو معاشرتی بنانے کی کوششیں و ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ نیز بعض صورتوں میں آپس میں شادی کرنے کے لئے ہمت افزائی بھی کی جاتی ہے۔

آخر الذکر کھگرہی میں معذوروں کی غیر معذوروں سے اکثر اوقات ملاقاتیں کرائی جاتی ہیں اور طبی تعلقات استہوار کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں تاکہ ان معذوروں کا معاشرتی دائرہ بہت محدود نہ رہے اور اس کی وجہ سے کہیں مسئلے بڑھ نہ جائیں لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ ان دونوں حدود میں بچ کی راہ سب سے بہتر ہے۔ پاکستان میں اس وقت کافی تعداد میں ذہنی طور پر بیمار یا معذور لوگ ہیں جو جذباتی یا کسی اور نفسیاتی اختلال یا معذوری کا شکار ہیں۔ ان میں کچھ ذہنی طور پر بیمار اور کچھ ذہنی نقص میں مبتلا ہیں۔ اکثر کو ہپتالوں یا کلینک میں باقاعدہ علاج کی ضرورت ہے جس سے معاشرتی زندگی زیادہ پیچیدہ ہوتی جاتی ہے اور معیار زندگی کو بہتر کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ زیادہ لوگ اپنی ذہنی نااہلیت سے آگاہ ہوتے جاتے ہیں جو جذباتی اشار کا باعث ہو سکتا ہے۔

غرض بیماریاں اور معذوریوں خواہ جسمانی ہوں یا ذہنی ایک حد تک خاندانی بحران کی ایک قسم ہے۔ اگر ان کی وجہ سے طبی تعلقات و تعامل پر برا اثر پڑے تو خاندانی وحدت و سالمیت کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں اسے بحران کہہ سکتے ہیں۔

### 3- تباہی کا بحران:

سیلاب طوفان و آرمیاں آگ زلزلے وبائیں اور جنگیں لڑائیاں وغیرہ چند ایسی تباہیاں ہیں جو خاندان کی زندگی میں ایک دم خلل ڈالتی ہیں اور اکثر اپنی شدت کی بناء پر زندگیاں ہی ختم کر دیتی ہیں اور واسطیات تباہ ہو سکتے ہیں۔ نیز ان کی وجہ سے خاندان کی معاشی حیثیت برباد ہو جاتی ہے جیسے پاکستان میں 8 اکتوبر 2005ء کا زلزلہ جس نے خاندانوں میں باہمی مالی و معاشی تباہی مچا دی تھی۔ ان تباہ کاریوں نے بحالیات و آبادکاری بے روزگاری کے

مسائل کھڑے کر دیئے ہیں۔ اکثر ان خاندانوں میں روڑی کمانے والا ہی نہ رہا۔ یہ تباہ کاریوں والے بحران خاندان کے لئے سب سے بڑا شدید بحران تصور کئے جاتے ہیں۔

#### 4۔ موت اور غم مفارقت والا بحران:

والیٹر (Waller) نے خاندان کے کسی فرد کی موت کے صدمے کو اکثر پیش آنے والا بحران کہا ہے جبکہ برگس (Burgess) کے الفاظ میں:

”جبکہ خاندان کے کسی فرد کی موت بذات خود خاندانی زندگی میں خلل ڈالتی ہے، بعض حالات میں اس کی وجہ سے خاندان کا شیرازہ کامل طور پر بکھر سکتا ہے۔“

کسی قریبی عزیز کی موت پیچھے رہ جانے والوں کے لئے بے شمار معنی لئے ہوتی ہے اور اس کے اثر کو صحیح طور پر بیان کرنا مشکل ہے۔

منظم مذہبوں میں لوگوں کی توجہ دنیا کی بے ثباتی کی طرف بطور عقیدہ کرائی جاتی ہے اور ان کو اپنی یا اپنے کسی قریبی عزیز کی موت کا صدمہ برداشت کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ قرآن شریف میں جگہ جگہ مومنین و مومنات کو اس امر کی یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ دنیا میں ہر شے کو فنا ہونا ہے۔ کوئی موت سے نہیں بچ سکتا۔ ہر کسی کو موت کا حزمہ چکھنا ہے۔ سب اللہ کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جانا ہے۔ چنانچہ ہر ایک کو موت کے لئے تیاری کرنی چاہئے۔ بقا تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہے۔ وہی ہمیشہ قائم دائم رہنے والی ذات ہے۔

صدمہ رشتی حیات کا والدین، بچوں، بہن بھائیوں یا دیگر قریبی رشتہ داروں سب کو ہوتا ہے لیکن اس کا شدید اثر عمر کے ساتھ انسان کی مرنے والے کے ساتھ جذباتی وابستگی، موت کے طریقے (حادثاتی موت، بیماری کی وجہ سے موت یا اچانک موت) کی وجہ سے مختلف ہوتا ہے۔

موت کا صدمہ ایسا بحران ہے جو ناگزیر ہے۔ تہذیب و معاشرے میں ہر کسی کو اس سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس لئے اس سے متعلق ہر معاشرہ میں مختلف رسومات و مختلف طریقے و طرز عمل ہیں۔ مثلاً اسلام میں تین دن تک سوگ کی اجازت ہے۔ سوگم قل یا پھول کے بعد زندگی پھر اسی ڈھب پر آ جاتی ہے۔ رشتہ داروں، عزیزوں یا ملنے جلتے والوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ تعزیت کے لئے آئیں۔ اس عمل کو غم ہانپنے یا اس میں شریک ہونے کی نشانی تصور کیا جاتا ہے۔ دوران سوگ اکثر گمرانوں میں آگ نہیں جلتی اس لئے ان تین دنوں میں یعنی جب تک فاتحہ ہو قریبی عزیزوں یا ملنے والوں کے گھر سے کھانا آتا ہے جس کو حاضری کہتے ہیں۔

سوگم کے علاوہ دسویں، بیسویں، مینے چالیسویں اور برسی کی بھی فاتحہ ہونے لگی ہے۔ اس کی وجہ یہ تصور ہے کہ مرنے والے کو ثواب پہنچانے کا اب بھی ایک طریقہ ہے۔ اس طرح ہم مرنے والے کے کام آ سکتے ہیں اور اس کی روح کو زیادہ سے زیادہ ثواب پہنچا سکتے ہیں۔ نیز



سوگ کا ایک اور کام یہ بھی ہے کہ خاندان کے باقی افراد سے اظہار ہمدردی کیا جائے جو معاشرتی ضرورت ہے اور قابل قبول طرز عمل ہے تاکہ سوگوار خاندان مرنے والے کی جدائی کو بھول جائے اور مرنے والے کی جدائی سے جو غلام پیدا ہو گیا ہے وہ پُر کرنے کے لئے دوبارہ بھر پور زندگی کا آغاز کر سکیں۔

بہر حال موت کا بحران ایک حمد اور جذباتی طور پر باہم منحصر خاندان کے افراد کے لئے بہت شدید ہوتا ہے اور شدید غم اندوہ کا باعث ہوتا ہے۔ اس حادثے کا سب سے پہلا اثر سکتا کا عالم ہے جس میں انسان نہیں سمجھتا کہ اس پر کیا گزری۔ اس کے باوجود ایک لمحہ ایسا آتا ہے کہ جب وہ موت کا مطلب پوری طرح سمجھ لیتا ہے۔ اس وقت کے ذہن میں غم و اندوہ کا سیلاب موجزن ہو جاتا ہے۔ کافی عرصے تک یقین اور بے یقینی میں جنگ جاری رہتی ہے۔

حافظ جس کے ذریعے انسان ٹھہر جانے والے کو یاد کرتا ہے زبردست تحریک غم و رنج کا باعث بنتا ہے مگر بہت احتمالی طریقے سے۔ ایک حد تک تو وہ حقیقت (موت) سے جنگ کر رہا ہوتا ہے۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ موت واقع ہو چکی ہے۔ اس مرے ہوئے فرد کی یاد دفعتاً بھڑک اٹھتی ہے اور پھر کچھ دیر کے لئے دب جاتی ہے۔ کسی حد تک اس کی یاد معاشرتی اصول پر مبنی ہوتی ہے جس کا تقاضا ہے کہ مرنے والے کی خوبیاں یاد کی جائیں اور خامیاں نظر انداز کر دی جائیں۔ اس طرح اس کی کوتاہیوں و خامیوں کو بھی اچھائی کا رنگ دے دیا جاتا ہے۔ یہ چیز مرنے والے کی جدائی کو اور ابھارتی ہے۔

موت ایک ایسا خاندانی بحران ہے جس سے توافقی کے لئے معاشرتی جواز موجود ہیں۔ اس صدمے میں جانے والے کی خوبیوں پر نظر کا رجحان ہوتا ہے۔ برائیوں کو تاہیوں کو نظر انداز کر دینے کا رویہ ہوتا ہے۔ باقی کتبے کے افراد کی مالی و زبانی اعانت پر دھیان دیا جاتا ہے۔

اس دور میں خاندان کے افراد کو دوستوں اور رشتہ داروں کے قرب سے سکون ڈھارس اور سہارا ملتا ہے۔ زبانی و طبی ہمدردی کا اظہار ہر فرد سے طلب کرنے کی خواہش ہوتی ہے اور توقع کی جاتی ہے۔ مذہبی رسومات میں حصہ لینے سے غم زدہ خاندان کو ڈھارس و تسلی مہیا ہوتی ہے۔ مذہبی رسومات جو مرنے والے کی یاد میں ادا کی جاتی ہیں ان سے روحانی سکون ملتا ہے اور تزکیہ نفس ہو جاتا ہے نور غم زدہ دل کو قدرے تسلی و تسکین مل جاتی ہے۔ یہ رسومات غم و رنج کو کا ذریعہ ثابت ہوتی ہیں۔ رنج و صدمے کو غلط کرنے کا ہتھیار ہیں۔ بہر حال شدید خاندانی بحران یا موت کی وجہ سے ہوتا ہے اس بات کی نشانی ہے کہ خاندان کے افراد میں موت کی حقیقت کا عقیدہ کمزور ہے نیز سہولیت و اتناہد کو قائم رکھنے کی صلاحیت موجود نہیں۔



## 5۔ ازدواجی زندگی میں علیحدگی کا بحران:

میاں بیوی میں علیحدگی بھی ایک خاندانی بحران ہے جو فرد اور معاشرے پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ اقوام متحدہ Bureau of Census کے مطابق اس میں وہ لوگ شامل ہیں جو قانونی طور پر علیحدگی کر چکے ہیں یا وہ لوگ شامل ہیں جو طلاق لینے کے خیال سے ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں اور وہ جو اپنے رشتی حیات سے ازدواجی ناموافقیت کی بناء پر مستغاک یا عارضی طور پر کشیدگی اور بے مہری کا شکار ہیں۔ ترک ازدواج اُس وقت ہوتی ہے جب کوئی ساریقی بغیر کسی وجہ کے کبھی نہ واپس آنے کے ارادے سے خاندان کو چھوڑ دے۔ بالعموم بیویاں جو خاندان کو اُس وقت چھوڑیں جب بچے چھوٹے ہوں۔ ان کی تعداد ایسے شوہروں کے مقابلے میں کم ہے۔ علاوہ ازیں یہ غریبوں، افلاس زدہ شوہروں میں زیادہ عام ہے کہ وہ طلاق لینے یا دینے کے متحمل نہیں ہو سکتے اور اسی لئے غائب ہو جاتے کو زیادہ سہل اور بہتر خیال کرتے ہیں۔

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ ترک ازدواج کم تعلیم یافتہ اور نچلے معاشرتی طبقوں میں زیادہ عام ہے۔ اگرچہ آج کل کے بدلتے دور میں یہ زیادہ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ معاشی طبقوں میں پایا جا رہا ہے۔ ان صورتوں میں جہاں ترک ازدواج ہو یا خاندان کو بالکل بے سہارا چھوڑ دیا گیا ہو تو یہ بہت ہی تکلیف دہ اور پریشان کن مسئلہ ہوتا ہے اور بیوی بچوں کی زندگی دشوار ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ بے وفا شوہر عموماً نچلے معاشرتی طبقہ میں پائے جاتے ہیں یعنی وہ ایسی معاشی حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں جہاں بے روزگاری اور غربت عام ہے۔ عمرانیات میں ترک ازدواج روایتی طور پر ”غریب آدمی کی طلاق“ کے نام سے مشہور ہے۔

اگرچہ طلاق بچوں پر بہت برا اثر ڈالتی ہے تاہم بے وفائی کو بچوں کے لئے طلاق سے زیادہ مضر گردانا جاتا ہے۔ اس میں بے شمار عوامل شامل ہیں۔ بے وفائی کے اثرات بڑی حد تک خاندانی بحران کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ خاندان میں سراسیمہ کر جاتے ہیں جس میں فرد اور معاشرہ دونوں شامل ہیں۔

ترک ازدواج کے بیشتر واقعات ایسے ہیں جن میں باپ اپنے خاندان کی کفالت نہیں کرتا اور اس غلاء کو نہ کرنے کے لئے بیت المال، قسم کا ادارہ قائم کرتے کی ضرورت ہے جو مطالعہ خاندان کی معاشی ضروریات کا تقبل ہو۔ مالی لحاظ سے بے وفائی کے اثرات معاشرہ پر بہت برے اور نقصان دہ ہوتے ہیں۔ مطلقہ بیوی بچوں کی روزی کا مسئلہ رہائش کا مسئلہ بچوں کی تعلیم و تربیت متاثر ہو جاتی ہے۔ باپ کا سایہ نہ ہونے کے سبب بچے آوارہ گرد ہو جاتے ہیں تعلیم ترک کر دیتے ہیں جرائم پیشہ افراد کا ترغیب بن جاتے ہیں۔ مطلقہ بیوی پر معاشرہ انگلی اٹھاتے

لگ جاتا ہے کیونکہ مطلقہ دوسروں کی دست نگر بن جاتی ہے جو اس کی معاشی مجبوری ہے۔  
 ترک ازدواج شکستہ خاندان کی علامت ہے۔ ایسے خاندانوں کو معاشرتی عدم تنظیم کی  
 علامت کہا جاتا ہے۔ درحقیقت بے وفا کی کا مطلب ہے ناکامی! شوہر کا اپنی خاندانی زندگی کی  
 ذمہ داریاں نبھانے میں ناکامی معاشرے کی اقدار بنانے میں ناکامی بچوں کا باپ کے ہوتے  
 ہوئے یتیم ہو جانا۔ یہ سب خاندانی بحران کی وجوہات میں سے ایک ہے۔ غرض یہ کہ بے وفا کی  
 بھی خاصا سنگین قسم کا بحران پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔

الغرض! مندرجہ بالا بحران ہمارے خاندانی نظام کو بہت متاثر کرتے ہیں جن سے محفوظ  
 رہنے کے لئے معاشرہ کو قابل عمل تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جو انفرادی بھی ہوں اور اجتماعی بھی  
 تاکہ خاندان بحرانوں سے کی حد تک محفوظ رہے اور افراد خاندان پر سکون اور یقین و آرام کی  
 زندگی بسر کر سکیں۔ محبت، پیارا، اخوت اور اتحاد و اتفاق سے مل جل کر معاشرہ کو چار چاند لگا سکیں۔  
 یہی عمرانیات کا اعلیٰ ترین مقصد حیات ہے۔

## خاندان کو مستحکم، منظم اور پرسکون بنانے والے عوامل

مندرجہ ذیل چند تجاویز پیش کی ہیں جن پر عمل اقدامات اٹھا کر خاندان کو مستحکم، منظم اور  
 پرسکون ماحول مہیا کیا جاسکتا ہے:

1- پاکستان جیسے زرعی معاشرے میں اکائی خاندان کا نظام موزوں نہیں اس سے کئی مسائل  
 پیدا ہو رہے ہیں۔ مشترکہ نظام خاندان کو مقبول بنایا جائے۔ شروع سے ہی افراد خاندان  
 کو مشترکہ خاندان کے فوائد روشناس کرانا چاہئیں تاکہ بالغ ہونے پر مشترکہ خاندانی  
 روایات کے علمبردار بن کر زندگی بسر کریں۔

2- زراعت سے صنعت میں بدلتی ہوئی معیشت میں خاندان کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑ  
 رہا ہے ان میں سب سے بڑا مسئلہ ماحول سے ہم آہنگی کا ہے۔ دیہاتوں سے شہروں  
 میں بدل ہوا ماحول خاندان کے لئے مسائل پیدا کر رہا ہے۔ دیہی ماحول سے شہری  
 ماحول میں بدترج اور آہستہ آہستہ نظام خاندان میں تبدیلیاں لانی چاہئیں اور وہی  
 تبدیلیاں قبول کی جائیں جو خاندان کے تمام افراد کے لئے مفید ہوں۔ اگر یہ تبدیلیاں  
 خاندان کے کسی فرد پر بھی بُرا اثر کرتی ہوں تو اُن کو نہ اپنایا جائے۔

3- خاندان کی ازسرنو تنظیم کی جائے جس میں خاندان اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کو اسی  
 طرح انجام دے جیسے پہلے دیا کرتے تھے۔ خاص طور پر مذہبی تعلیمات، ثقافت کی منتقلی،  
 تفریحی اور ذہنی تسکین کے اسباب خاندان میں ہی انجام دیئے جائیں۔ یہاں تک کہ  
 رشتے نامطے و شادیاں خاندان کے اندر ہی انجام دی جائیں۔ خاندان سے باہر شادیاں

کرنے کے رجحان کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ ایسا کرنے سے خاندان میں اتفاق و اتحاد آپس میں پیار و محبت کو تقویت میسر آئے گی۔

4- خواتین کی اضافی مصروفیات پر نظر ثانی کی جائے۔ اگر ان کی ملازمت سے گھر کے انتظام میں کوتاہیاں پیدا ہو رہی ہوں تو بہتر ہے خواتین ملازمت ترک کر دیں اور اپنے گھر، بال بچوں کی پرورش پر دھیان دیں۔ شوہروں کو سکون مہیا کریں، گھر کو پُر سکون، منظم اور رشک جنت بنائیں۔ چند روپوں ڈالروں کی خاطر گھر کا سکون برباد نہ کریں۔ گھر کا سکون، چین و آرام بازار سے نہیں خریدا جاسکتا۔ یہ قدرت کا بہت بڑا عطیہ ہے جس کی کوئی قیمت نہیں ادا کی جاسکتی۔

5- شادی کے بعد میاں بیوی کے درمیان جتنی ہم آہنگی ضروری ہے۔ میاں بیوی خاندان کے اہم رکن ہوتے ہیں جن پر پورے خاندان کی تنظیم و فلاح و کامیابی کا دار و مدار ہوتا ہے۔ ان کے درمیان تنازعہ، جھگڑا بد بختی و بد قسمتی کی نشانی ہے۔ جب یہ طول پکڑ جائے تو طلاق و علیحدگی تک نہایت جلد پہنچتی ہے۔ یہی خاندانی انتشار کا بڑا سبب ہے۔ خاندانی انتشار کو روکنے کے لئے میاں بیوی کو ایک دوسرے کے ساتھ مہار کرنے کی کوششیں کرنی چاہئیں تاکہ دونوں یکجان و یک قالب ہو کر پورے خاندان کی فلاح و بہبود کے لئے کام کریں۔

6- خاندان میں انتشار اور بحران کا ایک بڑا سبب معاشی بد حالی ہے۔ مالی دشواریاں گھر کا سکون ختم کر کے بے شمار مسائل اور الجھنیں پیدا کرتی ہیں۔ حکومت کو چاہئے کہ وہ پیداوار بڑھانے کے لئے جدید طریقہ زراعت کو رواج دے، صنعتوں کو فروغ دے، ملک سے بے روزگاری ختم کرنے کے اقدامات کرے۔ غریب و مفلس خاندانوں کی بیت المال سے مالی امداد ماہانہ بنیادوں پر کرے تاکہ انسانی ضروریات زندگی ہر فرد کو میسر آسکیں۔

7- دیہاتوں سے شہروں کی طرف ہجرت کے رجحان کو قابو میں رکھنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔ کوشش کی جائے کہ روزگار کے وسائل زیادہ سے زیادہ دیہاتوں میں مل جائیں تاکہ دیہاتی آبادی روزگار کی تلاش میں شہروں کی طرف رخ نہ کر سکے۔ دیہاتوں میں زیادہ سے زیادہ تعلیمی ادارے چھوٹی چھوٹی صنعتیں قائم کی جائیں۔ کڑی کے کام کے چھوٹے کارخانوں اور ورکشاپوں کو وسعت دی جائے تاکہ فرنیچر کی صنعت دیہات میں خوب پروان چڑھے۔ بنکوں کے ذریعے حکومت دیہاتی آبادی کو آسان قسطوں پر قرضے دلائے تاکہ وہ اپنا روزگار دیہات میں شروع کر سکیں۔ اس طرح شہروں پر دیہاتی آبادی کا بوجھ کم ہو جائے گا۔ شہروں کے صفائی، آب رسانی، بجلی و سڑکوں کے

مسائل بھی حل ہو جائیں گے اور شہروں کو سکون میسر آ جائے گا۔

- 8- شادیاں خاندان کے اندر ہونے کو ترجیح دی جائے کیونکہ غیر گھرانوں سے آئی ہوئی بہو یا داماد خاندان کے افراد سے مطابقت پیدا کرنے میں اکثر ناکام رہتے ہیں جس کے سبب گھر لڑائی جھگڑے کا مرکز بن جاتا ہے اور خاندانی سکون میں کمی کا باعث ہوتا ہے۔

- 9- خاندان میں استحکام سلطنت اور مضبوطی قائم رکھنے کی خاطر ”پدر سری نظام خاندان“ رائج کیا جائے جس میں باپ یا بڑا بھائی حکومت کرتا ہے اور تمام گھر والے اس کا احترام کرتے ہیں اس کا حکم مانتے ہیں اس کے مشوروں پر عمل کرتے ہیں۔ اس طرح خاندان میں علیحدگی اور اپنی مرضی چلانے کے مواقع کم ہو جاتے ہیں۔ ہر کوئی اپنے سربراہ کی نگرانی میں خاندانی مفادات کا خیال کرتا ہے جس خاندان میں مرد کی علمبرائی ہو وہاں تمام انتظامات خیر و خوبی سے سرانجام پاتے ہیں۔ نا اتفاقی و جھگڑوں کے چالس کم ہوتے ہیں اور طرز زندگی خوش اسلوبی سے بسر ہوتی ہے۔

- 10- حکومت کو بھی چاہئے کہ ایسے عالمی قوانین تشکیل دے کہ جن سے خاندان کی سلطنت استحکام و وظائف کا تحفظ ہو سکے۔ چھوٹے موٹے مالیاتی نوعیت کے جھگڑے اور عالمی اختلافات محلہ و دیہات کی ثالثی عدالتوں کے ذریعے نپٹائے جائیں یا چنچائیت سسٹم کو بحال کیا جائے جو معاشرہ و خاندان میں کفایت شعاری والی رسم و رواج کو جاری کرے اور فضول خرچی والی رسوم کا قلع قمع کرے تاکہ خاندان کی مالی حالت مضبوط ہو جائے اور ہر خاندان اپنے مالی وسائل بچوں کی تعلیم و تربیت پر ان کے لباس و خوراک پر اور اچھی صاف ستھری رہائش گاہوں پر خرچ کرے اور خوشحال خاندان معرض وجود میں لا سکے۔ یہی ہر معاشرے کا نصب العین اور اولین مقصد ہے۔

خاندان خوشحال معاشرہ خوشحال!

## مسجد

مسجد کی تاریخ

مسلمانوں کی اجتماعی عبادت گاہ کو عام الفاظ میں مسجد (Masque) کہا جاتا ہے۔ اگرچہ اسے زمین پر کسی بھی جگہ جو پاک ہو سجدہ کیا جاسکتا ہے۔ ہر جگہ ہر مقام پر جو پاک صاف ہو بطور مسجد استعمال کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ فضیلت رسول اکرم ﷺ کو عطا ہوئی ہے۔

”زمین میرے لئے مسجد اور پاکیزہ بنائی گئی ہے۔“ (الحجہ ۱۳)

ہام مسلمانوں نے اسی مرز میں کے کچھ مخصوص حصے کو عبادت کے لئے مخصوص کر کے اسے مسجد کا نام دے دیا۔ قرآن پاک میں مسجد کی اصطلاح کو مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسلمانوں کی مطلق عبادت گاہ کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

اسلامی معاشرہ میں مسجد کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ وہ جگہ ہے جہاں مسلمان دن میں پانچ مرتبہ اکٹھے ہوتے ہیں۔ اللہ کی رضا و خوشنود کے لئے احکام خداوندی کی بجا آوری کرتے ہیں (یعنی نماز ادا کرتے ہیں) اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے کے دکھ سکھ سے مطلع ہوتے ہیں حتیٰ المقدور ایک دوسرے کے کام آنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ جناب رسول اکرم ﷺ نے مسجد کو بہت اہمیت دی ہے کیونکہ نماز کو دین اسلام میں بنیادی و کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ ایک کافر اور مومن میں نماز ہی کا فرق ہے۔ قیامت میں سب سے پہلے نماز کی ادائیگی کے بارے میں سوال ہوگا۔ اس لئے مسجد کا ہونا بہت ضروری قرار پایا۔

جناب رسول اکرم ﷺ کے ابتدائی دور میں تمام تر اہم فیصلے مسجد نبوی ہی میں طے پاتے تھے۔ آپ ﷺ اپنے صحابہؓ کو وہیں اکٹھا کرتے تھے۔ معاشرتی مسائل سنتے تھے اور ان کا حل بتاتے تھے۔ مسجد نبوی کی تعمیر سے قبل آپ ﷺ نے اپنا مرکز اسلامی مسجد قبا کو بنایا ہوا تھا کیونکہ مسجد قبا سب سے پہلی مسجد تھی جہاں حضور پاک ﷺ نے نماز پڑھی اور پڑھائی۔ بعد میں مسجد نبوی میں منتقل ہوئے۔ مسجد نبوی کی زمین دو خیم بچوں کا پلاٹ تھا جس کو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنی جیب خاص سے خرید کر ایک وسیع و عریض مسجد نبوی کی تعمیر کے لئے وقف کیا۔ اس طرح مسجد نبوی معرض اجد میں آئی جو سب سے پہلی اسلامی مرکزی مسجد تھی اور اسلامی ہیڈ کوارٹر تھی۔ جب خلفاء راشدین کے دور میں اسلام افریقہ، ایران و روم تک پھیلا تھا تو مسلمانوں نے جہاں جہاں بھی گئے مساجد تعمیر کرائیں۔ یہ مساجد ہی ان کی شان و شوکت اور عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہیں مثلاً کوفہ، بصرہ، دمشق، بغداد، مصر، فلسطین، افریقہ، ہندوستان، پاکستان، ایران، انڈونیشیا، چین کی مساجد قابل دید و قابل ذکر ہیں۔ غرضیکہ دنیا کے تمام ممالک جہاں جہاں ایک دفعہ مسلمان آباد ہوئے مساجد تعمیر کرائیں۔ جہاں کی حکمرانی نصیب ہوئی وہاں بین الاقوامی شہرت، کی مسجدیں تعمیر ہوئیں مثلاً، قرطبہ کی جامع مسجد، دہلی کی جامع مسجد، لاہور کی بادشاہی مسجد وغیرہ۔ مسلمان خلیفہ ان جانتے تھے کہ مسجد ہی اسلامی معاشرے میں تمدنی مرکز کی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا بھر میں سب سے بڑا تمدنی مرکز بیت اللہ فی المکہ ہے جس کی بارے میں ارشاد الہی ہے:

ترجمہ: ”بے شک وہ گھر جو سب سے پہلے لوگوں کے لئے بنادہ گھر مکہ میں ہے اور برکت والا ہے جہاں لوگوں کو ہدایت ملتی ہے۔“

## مسجد کا معاشرتی مقصد و معاشرتی اہمیت

مسجد کے لغوی معنوں سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ مسجد صرف عبادت گاہ ہی ہے جو صرف عبادت (نماز) کے لئے ہی بنائی گئی ہے۔ اس میں اور کوئی کام نہیں ہوتا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ مسجد مسلمانوں کا سب سے فعال ادارہ ہے۔ تاہم مسلمانوں کے ہاں مسجد میں عبادت تو ہوتی ہی ہے لیکن بعض دیگر اقوام کی طرح مسجد صرف عبادت کے لئے ہی مخصوص نہیں ہوتی کہ اس میں کوئی اور کام نہ ہو سکے۔ عہد رسالت ﷺ میں مسجد میں مسلمانوں کے جھگڑوں کے فیصلے ہوتے تھے۔ بیرونی وفود اور سفراء کا استقبال و قیام ہوتا تھا اور مذاکرات مسجد میں ہی ہوتے تھے۔ نیز فوجی دستے مسجد ہی سے روانہ کئے جاتے تھے، تکفیل دیے جاتے تھے (مثلاً اسامہ بن زید کا لشکر) چنانچہ مسجد ایک ادارہ ہے جہاں ہر وہ کام ہوتا ہے جو انسانیت کی بھلائی کا ہو۔ امت مسلمہ کی فلاح و بہبود اور دین کی ترویج و اشاعت کے لئے ضروری اور مفید ہو۔

مختصر یہ کہ مسجد ایک مذہبی تنظیم ہے جس میں مسلمان دینی سرگرمیاں سرانجام دیتے ہیں۔ اسلامی معاشرے میں اسے مرکزیت کا درجہ حاصل ہے۔ یہ عبادت کی تکمیل، درس و تدریس، انتظامی امور، عالمی امور و رسومات کی تکمیل، تبلیغ اور اشاعت علوم و دینی مسائل وغیرہ کے انجام دینے کی جگہ ہے۔ مسجد نبوی میں دیگر شافعی سرگرمیاں بھی انجام دی جاتی رہیں۔ جہاد کی تعلیم و تربیت کے لئے بھی اصحاب صفہ کا چوتری استعمال ہوتا تھا۔ فن سپاہ گری و تیر اندازی و کموار زنی کی مہارت وغیرہ کے فنون صنف پر ہی سکھے جاتے تھے۔

ان حقائق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسجد زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے اہم معاشرتی امور پر بحث کرنے، تبصرہ کرنے، تبادلہ خیالات کرنے اور اسلامی اقدار کی تبلیغ و اشاعت، اسلامی علوم سکھانے کے لئے اہم ترین مراکز رہی ہے۔ اب ہم ذیل میں مسجد کی اہمیت اسلامی معاشرہ میں کیا ہے، پر نظر ڈالیں گے اور مختلف عنوانات کے تحت مسجد کی اہمیت و حیثیت واضح کرنے کے لئے بحث کریں گے۔

### 1- مسجد مذہبی مرکز کی حیثیت سے (بطور عبادت گاہ):

مسجد جیسا کہ لفظ سے ہی ظاہر ہے وہ جگہ ہے جہاں انسان اپنی پیشانی اللہ تعالیٰ کے حضور میں جھکا تا ہے چنانچہ ایک سجدہ گاہ ہے یا مرکز عبادت ہے جہاں مسلمان نماز پنج گانہ پڑھتے ہیں۔ نماز تراویح، نماز جمعہ، نماز عیدین و عطا و تبلیغ کی مجلسیں ہوتی ہیں۔ جہاں قرآن پاک اور درس قرآن کا انتظام ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرہ میں مسجد اشاعت تعلیم کا ایک مرکز ہوتی ہے۔ یہاں طلباء کو دینی و دنیاوی تعلیم دی جاتی ہے۔ شروع شروع میں مسجد میں قرآن کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن آگے چل کر اس میں علم حدیث، علم فقہ، علم ریاضی و ہندسہ کے علوم بھی شامل کر

لئے گئے۔ حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ (خلفائے راشدہ) کے دور میں بچوں کو قرآن پڑھانے کا بندوبست مسجدوں میں ہی تھا۔ اس کے علاوہ قرآن کے عالم حافظ، محقق و مفسر و شیخ الحدیث مساجد ہی میں علم دین کی خدمت کرتے تھے اور عوام کو مذہبی مسائل سے روشناس کراتے تھے چنانچہ انہی مساجد کے قابل و مابر عالم دین امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام حنبلیؒ کی شکل میں اسلامی دنیا میں نمودار ہوئے۔ یہ انہی مساجد کے ہونہار طلباء باسعادت تھے۔ انہی کے مسائل کے مطابق دنیا میں کوئی مسجد حنفیہ ہے، کوئی مسجد اہل حدیث ہے، کہیں مسجد شافعیہ اور کہیں مسجد حنبلیہ رونق افروز ہے۔ اسی طرح مسجد مالکیہ، مسجد اہل سنت، مسجد جعفریہ اسلامی دنیا میں اشاعت دین و اپنے اپنے عقائد کے مطابق عبادت کا فریضہ ادا کر رہی ہیں۔ مذہبی نقطہ نظر سے یہ مساجد درج ذیل اسلامی اقدار کی اشاعت و تبلیغ کا رول ادا کر رہی ہیں:

1- مرکز عبادت، مرکز دینی علوم کی تبلیغ و اشاعت

2- مرکز سیاسی

3- مرکز تعلیم و تربیت و ادب و آداب

4- مرکز انتظامی امور

5- مرکز عدل و انصاف و مساوات

2- مسجد سیاسی مرکز کی حیثیت سے:

مسجد نبوی ﷺ میں جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ مسجد نبوی میں تمام تر امور معاشرت طے ہوتے تھے۔ سیاسی انتظام چونکہ دین کا لازمی جزو ہے۔ اس لئے سیاسی امور بھی مسجد نبوی ﷺ میں ہی طے کئے جاتے تھے۔ سیاست دین سے جدا نہیں ہے۔ اسلام میں مذہبی امور اور سیاسی امور ساتھ ساتھ انجام دیتے جاتے ہیں۔ اسلام میں یہ دونوں پہلو جسم کے اعضاء کی طرح ہیں۔ جسم اعضاء کے بغیر ناممکن ہوتا ہے۔ اس طرح مذہب و سیاست ایک دوسرے کے لئے اٹوٹ انگ ہیں، جزو لاینفک ہیں۔

بقول علامہ اقبالؒ:

جہاں پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو

جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

چنانچہ جناب رسول اکرم ﷺ کی اپنی حیات مبارکہ سیاسی و فو کی آمد مسجد نبوی ہی ہوتی تھی کیونکہ یہی مسجد اسلام کا دار الخلافہ بھی تھا اور سیاسی معاہدے مسجد ہی میں طے پاتے تھے۔ جناب رسول اکرم ﷺ بہت سے قانونی مسائل کا فیصلہ بھی مسجد میں ہی بیٹھ کر فرماتے تھے نہ صرف سرزمین عرب کی مساجد میں یہ روایت تھی کہ مختلف معاملات وہاں طے کئے جائیں بلکہ مساجد میں معاشرتی امور حل کرنے کی مثالیں ہمیں ایران میں بھی ملتی ہیں۔ ابن بطوطہ اپنے



سفر نامے میں لکھتا ہے کہ ”شیراز شہر میں اسے جس عدالت میں پیش کیا گیا وہ مسجد میں ہی منعقد ہوئی تھی اور قاضی ایک نامور فقیہ تھا۔“

### 3- مسجد تعلیمی مرکز کی حیثیت ہے:

مسلمانوں میں مسجد ایک واحد ایسا ادارہ تھا جس میں سیاسی مذہبی معاشی و حربی مسائل کو حل کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیم و تدریس کا شعبہ بھی پورے زور شور سے جاری تھا کیونکہ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق تعلیم سے بے بہرہ آدمی سوائے حیوان ناطق کے موا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کے جتنے بھی اعلیٰ ادارے تعلیم کو فروغ دینے والے تھے وہ سب مساجد سے ملحقہ ہوتے تھے اور مسجد سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ مسجد کو ایک تعلیمی ادارے کی حیثیت سے مرکزی و بنیادی کردار حاصل رہا ہے۔ ان کے ساتھ واسطہ مدارس و دانش گاہیں مسلمانوں کے لئے درس و تدریس و حفظ قرآن کی فیض رسانی کرتی ہوئی رواں دواں نہریں تھیں جو تعلیم و تربیت سے سیراب کرتی رہیں۔ اگر کوئی درس گاہ بنائی گئی تو اس کا مسجد جزو بنایا گیا۔ اگر کوئی خانقاہ یا بڑا حوزہ تعمیر ہوا تو اس سے ملحقہ مسجد بھی تعمیر کی جاتی تھی۔ چنانچہ مسجد کی تعمیر اور مدرسہ و درس گاہ تعلیمی مرکز کی شکل میں مسلمانوں کی روایت بن گیا۔ اسلامی معاشرہ مسجد و مدرسہ کے وجود سے ہمیشہ خالی نہیں ہے۔ یہ اسلامی معاشرے کی جان ہیں۔

اسلامی حکومتیں جو خلافت راشدہ کے بعد قائم ہوئیں مثلاً بنو امیہ و بنو عباسیہ کی حکومتیں اسی طرح ترکوں کی خلافت عثمانیہ وغیرہ کے دور میں تعلیم کا بندوبست حکومت کا فریضہ تھا چنانچہ مساجد مکاتب کا کردار ادا کرتی تھیں جن میں علوم الہیات کے علاوہ منطق فلسفہ ریاضی ہندسہ علم نجوم ادب شعر و شاعری اور لسانیات کی تعلیم سے فیض یاب کیا جاتا تھا۔ اسلامی معاشرہ تعلیم و تربیت کے میدان میں یورپین اقوام مغربی تہذیب سے چار قدم آگے تھا ترقی یافتہ تھا۔ اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اسی دور میں مسلمان سائنس دانوں ریاضی دانوں اور ماہرین فلکیات نے اپنا لوہا منوایا اور ان کی تعلیمی کاوشوں سے فائدہ اٹھا کر موجودہ دور کے سائنس دانوں نے اپنا مقام بلند کیا۔

### مسجد کے مقاصد ایک نظر میں:

بنیادی طور پر مسجد سے جو حقیقی مقاصد حاصل ہوتے ہیں ان میں مندرجہ ذیل بالخصوص قابل ذکر ہیں:

- 1- مسجد امت مسلمہ کے لئے ایک مرکز کی حیثیت رکھتی ہے جس میں دینی مذہبی معاشرتی سیاسی اور ہمیں نوع دیگر مسائل کو بھی حل کرنے کی تدابیر کی جاسکتی ہیں۔
- 2- مسجد میں مسلمانوں کا اجتماع اس امر کی دلیل ہے کہ خداوند عالم نے جو دین ان کو عطا



کیا ہے وہ کس قدر باہمی یکاگت و تعاون کا منبع ہے اخوت و مساوات کا خزانہ ہے۔ سب ایمان والوں کے لئے ایک ہی سبق ہے کہ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم "سب اللہ کی اطاعت کرو رسول کی اطاعت کرو اور اطاعت کرو اس کی جو تم میں سے ہو۔" یہ حکم سب کے لئے ہے۔ امیر غریب چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہیں۔ یہی مساوات ہے۔ سب کے لئے حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سر بسجود ہو کر اللہ کی خوشنودی و رضا حاصل کرو۔ زکوٰۃ دینے والے بن جاؤ۔ رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ چنانچہ ڈسپلین (Discipline) کا سبق اسی مستحکم ادارے سے ملتا ہے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز  
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز  
بندہ و صاحب و محتاج و غنی سبھی ایک ہوئے  
پہنچے جو تیرے حضور تو سبھی ایک ہوئے  
اُ گیا جب عین جنگ میں وقت نماز  
صف در صف کھڑی ہو گئی قوم حجاز

اس سے معلوم ہوا کہ مسجد کا بڑا مقصد اور اعلیٰ فریضہ مساوات اور بھائی چارے کا سبق دینا ہے۔ اخوت و ایثار و ہمدردی کا احساس بیدار کرنا ہے۔ عیسوی فتنہ کی پادشاہی کا درس ملتا ہے۔

3- اس خدائی ادارے سے پابندی وقت کا ایک لائحہ عمل ملتا ہے۔ پانچ وقت کی نماز جو مختلف اوقات میں ادا کی جاتی ہے ہر روز وقت مقررہ پر ادا کی جاتی ہے جو پابندی وقت کا احساس بیدار رکھتی ہے۔ نمازوں کا پابندی سے وقت مقررہ پر ادا کرنا انسان میں مکمل طور پر پابندی وقت کی عادت ڈال دیتا ہے اور وہ زندگی کے دیگر امور مخصوص لائحہ عمل کے تحت ادا کرتا ہے۔ نظم و ضبط قائم رکھنے کے لئے مسجد بہت اچھا تربیتی ادارہ ہے۔

4- مسجد میں ہمیں پاکیزگی طہارت فرض شہاسی کا سبق ملتا ہے۔ یہ ایسی معاشرتی خوبیاں ہیں جن کو غیر مسلم بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ نماز کے لئے طہارت کا ہونا ضروری ہے اور ہر وقت نماز ادا کرنا فرض شہاسی اور پابندی وقت کی بہترین دلیل ہے۔

5- مسجد اسلامی ثقافت کا سب سے بڑا مظہر ہے تو یہاں پر ہر مفرد کو اپنا مقام دیکھائی دیتا ہے۔ اس کی ملاقات حقائق حقیقی سے ہوتی ہے۔ مساوات، سادگی و یک رنگی کا درس ملتا ہے۔ یہاں ایک درس سب کے لئے مشترک ہے کہ وہ اللہ کی مخلوق ہیں اور انہیں ایک مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور وہ مقصد عبادت اور اپنے فرائض منصبی نہایت صداقت سے ادا کرنا ہے۔ کبر و غرور کو طاق نسیاں میں رکھیں، عملِ عظیم میں مصروف رہیں اور اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی مسلسل تعمیل کریں کہ نماز قائم کرو زکوٰۃ ادا کرو رکوع

کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

6- مسجد پورے عالم اسلام میں ایک بہترین تعلیمی مرکز ہوتی ہے۔ اسلام کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ مسجد سے ملحقہ تعلیمی اداروں نے اس قدر ترقی کی کہ بعض ادارے دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں میں شمار ہونے لگے مثلاً مصر و بغداد طرابلس کے تعلیمی ادارے قرطبہ کی لائبریریاں و صمدگاہیں قابل ذکر ہیں۔ مسلم مفکرین ابی مسجد کی دسالت سے اس قابل ہوئے کہ وہ دنیا کے دیگر ادیان کے مبلغین کے سامنے نبرد آزما ہو سکیں۔ اسلام کے خلاف دنیاوی پراپیگنڈہ کا توڑ ثابت ہوئے۔

7- مسجد مرکز تبلیغ بھی ہے۔ نمازی یہاں جب روس سنتے ہیں یا خطبات امام سے بہرہ ور ہوتے ہیں تو ان کی دینی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ مسلمان اس قابل ہو جاتا ہے کہ دیگر مذاہب کے اکابرین کے سامنے ان اعتراضات کا جواب دے سکے جو بالعموم ان کو پریشان کرنے کے لئے اٹھائے جاتے ہیں۔

8- مسجد مسلمانوں کے لئے باہمی مشاورت کی ایک بہترین جگہ ہے۔ معاشرتی مسائل پر بھی تبادلہ خیالات کا موقع مہیا کرتی ہے۔ باہمی جذبہ تعاون و اخوت کے ذریعے ایک دوسرے کی مدد کی جا سکتی ہے چنانچہ مسجد مشورہ کرنے کا ایک بہترین مرکز ہے۔ یہ آپس میں اتفاق پیار و محبت و ایثار سے زندگی بسر کرنے کا درس دیتی ہے لہذا مسجد اسلامی معاشرہ میں ایک بڑی اہمیت اور بلند مقام رکھتی ہے۔ آنے والی نئی نوجوان نسل کی تعلیم و تربیت کی ضامن ہے۔

## مدرسہ

تعلیم دنیا کے ہر دور میں وقت کی اہم ضرورت رہی ہے مگر اس کی اہمیت آج کے تعلیم یافتہ دور میں اور بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ تعلیم ہی ایک واسطہ ہے جس کے ذریعے سے نئی نوع انسان اپنے خالق کو پہچانتا ہے۔ اپنے مقصد حیات کو جاننے کے قابل ہوتا ہے۔ اپنے ثقافتی ورثہ کو نسل در نسل منتقل کر رہا ہے۔ تعلیم کے ذریعے ہی اپنے اسلاف کی روایات، تجربات اور علم و فنون کو محفوظ کر سکا ہے۔ اگر ہی ذریعہ (یعنی مدارس کا قیام) ہمارے پاس نہ ہوتا تو ہر نسل کو اپنی زندگی کا آغاز شروع سے کرنا پڑتا لیکن یہ تعلیم ہی ہے جس کے ذریعے اپنی پرانی نسلوں کے تجربات کو محفوظ کر سکے اور ان کی تعلیمات سے اپنے آپ کو آگے بڑھا سکے۔ دنیا کا کوئی معاشرہ ایسا نہیں جس میں تعلیمی ادارے نہ ہوں۔ تعلیم کے ذریعے ہی ثقافتی ترسیل ممکن ہے اور پرانی

ثقافت کی نسل تک پہنچتی ہے۔ اس طرح تعلیم دونوں کے درمیان گہرا تعلق پیدا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ تعلیمی ادارے ہمیں معاشرے میں مختلف روزگار حاصل کرنے کے لئے بھی مناسب تربیت و ٹریننگ دیتے ہیں اور ہنر سکھاتے ہیں مثلاً ٹیکنیکل سکول، کالج و یونیورسٹیاں۔ انہی فی اداروں کی بدولت کوئی ڈاکٹر بن جاتا ہے تو کوئی انجینئر اور معلم، پرنسپل کوئی ہیڈ مدرس وغیرہ وغیرہ۔

### تعلیم کی اہمیت:

اسلام ایک اہل انوارین ہے جس کا آغاز نسل انسانی کی ابتداء سے ہی ہو گیا تھا اور انسانوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس کی ہدایات بھی بڑھتی گئیں اور اللہ نے نبوت کا سلسلہ ہدایت و تعلیم کا ذریعہ بنا کر انسانوں کی رہنمائی فرمائی چونکہ احکام الہی کی ہدایات و تعلیم کی تبلیغ کی اشد ضرورت تھی لہذا اسلام نے ”تعلیم“ کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ اس کی ترویج و اشاعت کی حوصلہ افزائی کی۔

### بلغ ما علیک

”اے نبی جو کچھ آپ کے پاس ہے (وحی) وہ آگے لوگوں تک پہنچاؤ۔“  
اور پہلی وحی کا آغاز ہی لفظ اقراء ”تو پڑھ“ سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تعلیم کی اہمیت اور تعلیم کو آگے بڑھانے (بلغ) اور تعلیم کی افادیت کو عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔  
آگے چل کر قرآن پاک میں ارشاد ہے:

”اپنے پروردگار کے نام سے پڑھ جس نے تجھے پیدا کیا ہے جس نے انسان کو خون کے بوجھ سے پیدا کیا۔ ارپے بزرگ پروردگار کے نام سے پڑھ جس نے انسان کو کلمہ کے ذریعے سے سکھایا۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جو اسے معلوم نہ تھا۔“ (سورۃ العلق: 1-5)

ان آیات میں واضح طور پر پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنے کی تلقین بھی ہے۔ نیز یہ حقیقت بھی ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ علم و دانش کا اصل اور حقیقی سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور انسان کو جو کچھ بھی علم حاصل ہے وہ اللہ کا دیا ہوا عطیہ ہے۔

حدیث مبارک ہے:

انما بعث معلما۔

”میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔“

تعلیم دینا ایک مقدس فریضہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفت اور رسول اکرم ﷺ کا معلم کا منصب ہے۔ جو انسان اس فریضے کو اہناتا ہے وہ یقینی طور پر نبوت کے پیغام کو آئندہ نسلوں تک پہنچاتا ہے۔ انسانیت کی خدمت کرتا ہے اور علم و دانش کی شمع کو روشن رکھتا ہے۔ ایسا شخص اللہ

تعالیٰ کے ہاں بہت بلند مقام پاتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

”جاہل اور عالم ہرگز برابر نہیں ہوتے۔“

ارشاد ربانی ہے:

”آپ بتا دیجئے کہ علم والے اور بغیر علم والے لوگ کہیں ایک جیسے نہیں ہوتے۔ بے

شک اہل عقل و دانش ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔“

اسلام میں تعلیم کی اہمیت، افادیت اور مقام کے پیش نظر مسلمانوں نے اس میدان میں بے پناہ خدمات سر انجام دی ہیں۔ پہلا باقاعدہ تعلیمی ادارہ عہد رسالت ﷺ میں ہی قائم ہو گیا تھا۔ یہ مدرسہ چونکہ مسجد نبوی میں قائم ہوا تھا (مدرسہ اصحاب صفہ) اس لئے اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں درس گاہیں مسجد کا حصہ ہوا کرتی تھیں۔ مسلمان ماہرین تعلیم نے نہ صرف تعلیم و تدریس کا باقاعدہ کام جاری رکھا بلکہ انہوں نے مقصد تعلیم، اصول تعلیم، طریقہ تدریس اور انساب تعلیم پر بھی بھرپور توجہ دی اور ان تمام امور میں مسلمان ماہرین تعلیم نے قرآن و سنت سے اصول اخذ کئے۔ ان اصولوں کی روشنی میں اسلامی نظام تعلیم و تربیت کی تفصیل مرتب ہوئیں۔

**تعلیم کا مقصد:**

تعلیم کا مقصد متعین کرنے کی لاتعداد کوششیں ہوئیں اور ہر ایک مفکر نے اپنے گرد پیش اور اپنی ضرورت اور سمجھ کے مطابق تعلیم کا مقصد یا نصب العین پیش کیا۔ تعلیم کا مقصد متعین کرنے میں ایسے مفکر اصحاب کو زیادہ مشکلات پیش آئیں جن کی زندگی مذہبی روح اور مذہبی نصب العین سے خالی تھیں۔ بہر حال تعلیم کے بہت سے مقاصد بیان ہوئے، ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

- 1- تعلیم کا مقصد سیرت کو تعمیر کرنا ہے۔
- 2- انسان کو ایک مکمل زندگی بسر کرنے کے لئے تیار کرنا ہے۔
- 3- تندرست جسم میں تندرست روح پیدا کرنا۔
- 4- انسان کی فطری صلاحیتوں کو ظہور میں لانا۔
- 5- انسان کی انفرادیت کی آزادانہ نشوونما کرنا۔
- 6- تعلیم کا مقصد اقتدار حاصل کرنا ہے حکومت کرنا ہے۔
- 7- انسان کو اس قابل بنانا کہ وہ روزی کما سکے۔
- 8- ماحول کو سمجھنا اور اس میں انسان کا فٹ ہونا۔
- 9- انسانی اور سماجی قدروں سے آگاہی حاصل کرنا اور ان کا احترام کرنا۔
- 10- کائنات کی حقیقتوں کو جاننا اور انہیں اپنا تابع بنانا۔

مذکورہ بالا مقاصد بظاہر بہت پرکشش اور وسیع معلوم ہوتے ہیں لیکن ان میں ایسا پہلو نظر نہیں آتا جس سے اندازہ ہو سکے کہ تعلیم کا مقصد انسان کو اس دنیا اور آخرت کے لئے تیار کرنا ہے تاکہ وہ یہاں پر سکون زندگی گزارے اور آخرت میں جب اپنے رب و خالق کے حضور پیش ہو تو وہ وہاں بھی کامیاب و کامران گردانا جائے۔ حقیقت میں تعلیم بذات خود ایک بڑے نظام کا حصہ ہے جس کے بغیر تعلیم کا قیام ممکن نہیں۔

تعلیم ہمیشہ کسی ریاست میں دی جاتی ہے۔ اس لئے تعلیم بھی ریاست کے مقصد قیام کے تحت ہوتی ہے۔ اس لئے تعلیم کا مقصد اُس وقت معلوم ہو سکتا ہے جب ریاست کا نصب العین واضح ہو۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ تعلیم زندگی کا ایک لازمی جزو ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے زندگی کا نصب العین متعین کئے بغیر تعلیم کا مقصد واضح نہیں ہو سکتا۔

اسلام میں زندگی موت کے ساتھ ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ انسان نے جو اچھے بُرے اعمال اس دنیا میں انجام دیئے ہیں وہ مرنے کے بعد ان کے بارے میں جواب دہ ہے۔ اسی طرح انسان صرف جسم کا نام نہیں ہے کہ اس کی مادی ضرورتوں کے علاوہ اس کی کوئی اور ضرورتیں نہ ہوں بلکہ انسان جسم اور روح دونوں کے مجموعے کا نام ہے اس لئے زندگی کا نصب العین اور تعلیم کا مقصد ایسا ہونا چاہئے جو انسان کی مادی ضرورتیں اور روح کی ضرورتیں پوری کر سکے۔ ان افکار کی روشنی میں اسلامی نظام تعلیم کا مقصد ”اللہ تعالیٰ کی پہچان“ اللہ اور اس کے بندے کے مضبوط تعلقات کا استوار ہونا اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنا ہے۔ اسی مقصد سے انسان کی سیرت تعمیر ہوتی ہے۔ اُس کی بہترین صلاحیتوں کو جلا ملتی ہے۔ اُس کی انفرادیت پروان چڑھتی ہے اس لئے تعلیم یافتہ انسان وہ ہے جس کے دل میں اللہ کی یاد ہوں اللہ سے اُس کا گہرا رشتہ قائم ہو اور اُس کی زندگی اللہ تعالیٰ کے دینے ہوئے احکام کے مطابق گزرے۔ یہی انسان کی فطرت اور مقصد حیات ہے اسی میں انسان کو امن و سکون حاصل ہوتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”یاد رکھو اللہ کی یاد سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔“

یہی وجہ ہے کہ جب تک استاد اور شاگرد کے دل و دماغ پر کسی اعلیٰ ہستی یعنی اللہ تعالیٰ کا تصور غالب نہ ہو اُس وقت تک وہ تعلیم کا مقصد حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی تصور کو مستحکم اور مضبوط کرنے سے اخوت، مساوات، علی غلظتی، وسعت فکر اور بردباری جیسی بلند صفات انسان میں پروان چڑھتی ہیں۔ انسان خدا کا نیک بندہ اور معاشرے کا مفید و کارآمد رکن بن جاتا ہے۔

## مدرسے کی خدمات یا فرائض

ہر معاشرے میں مدرسے چند بنیادی خدمات انجام دیتے ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

- 1- ثقافتی ترسیل
- 2- ایجادات
- 3- سماجی اتفاق و یکجہتی
- 4- پیشوں کے انتخاب میں مدد دینا و تعلیم فراہم کرنا
- 5- ذاتی ترقی و کردار سازی میں مدد دینا
- 6- معاشرتی تبدیلی لانے میں مدد دینا

### 1- ثقافتی ترسیل:

ہر معاشرے میں اپنی ثقافت ہوتی ہے اور اس کا تحفظ اس معاشرے کے ہر رکن کا فرض ہوتا ہے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ثقافت کی تعریف کے مطابق ثقافت ایک سماجی ورثہ کا نام ہے جس میں تمام مادی اور غیر مادی اشیاء شامل ہیں جو ہم نے اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں حاصل کی ہیں۔ اس میں علم، پیشہ ورانہ مہارت و تربیت، علم تعمیرات اور علم مصوری سے لے کر معاشرے کی رسوم و رواج تک تمام چیزیں شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ چیزیں تو ایسی ہیں جو ہم نسل در نسل بالمشافہ منتقل کرتے ہیں یعنی باپ سے بیٹا زندگی کے آداب اور گھریلو معاملات سیکھتا ہے مگر فن و مہارت معاشیات کے اصول، علم حیوانات، علم اراضی (جغرافیہ)، علم کیمسٹری، علم جراحی اور طب وغیرہ ایسے معاشرتی ورثے ہیں جن کو کتابوں کی شکل میں محفوظ کر لیا جاتا ہے اور تعلیمی اداروں کے ذریعے ان کو اگلی نسلوں تک منتقل کیا جاتا ہے۔ اس طرح علوم و فنون ارتقائی منازل بھی طے کرتے رہتے ہیں اور ان میں آنے والی تبدیلیں مزید اضافہ بھی کرتی رہتی ہیں چنانچہ علوم و فنون کو آئندہ آنے والی نسلوں کو منتقل کرنے کی خدمت ان تعلیمی اداروں کی گرانقدر خدمات میں سے ایک ہے۔

### 2- ایجادات:

دوسری خدمت جو تعلیمی ادارے معاشرے کو فراہم کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ تعلیمی ادارے علم کو اگلی نسلوں کو منتقل کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف موضوعات پر تحقیق (ریسرچ) بھی جاری رکھتے ہیں جس کے نتیجے میں نئی باتوں کا علم میں اضافہ ہوتا ہے اور ایجادات بھی ہوتی ہیں۔ یہ ایجادات عملی زندگی میں معاشرے کے لئے مفید ثابت ہوتی ہیں۔ یہ ایجادات صرف اس لئے ممکن ہیں کیونکہ ہمارے پاس ماضی کا سرمایہ علم اور تجربات محفوظ ہیں جس سے آنی والی

تعلیمی ادارے میں کامیاب رہتی ہیں۔

### 3- سماجی اتفاق و یکجہتی:

تعلیمی ادارے کسی ملک یا معاشرے کی یکجہتی میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں کیونکہ ان اداروں کے ذریعے ہی آپ اپنے معاشرے کی روایات اور تجربات یکساں طور پر آنے والی نسلوں میں منتقل کرتے ہیں اور اس وجہ سے ان کے خیالات اور سوچ میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ انہی اداروں کی بدولت آپ اپنی قوم کے نظریات اور مقاصد اُجاگر کر سکتے ہیں۔ قوم کے بچوں کو اتفاق سے رہنے سہنے کا درس دیا جاسکتا ہے۔ قوم کے بچوں میں کردار بنانے کی تعلیم دینا ان اداروں کی بڑی خدمت ہے کیونکہ مستقبل میں انہی بچوں نے بڑے ہو کر قوم یا ملک کی ذمہ داریاں سنبھالنی ہیں۔ اس طرح سے قومی نظریات و روایات یکساں طور پر معاشرے میں پھیلانے کی خدمت انجام دیتے ہیں جن سے لوگوں کے سوچنے اور چیزوں کو پرکھنے کا انداز تقریباً ایک جیسا ہو جاتا ہے۔

### 4- پیشوں کے انتخاب میں مدد:

کسی بھی معاشرے میں ایک خاص درجے تک بنیادی تعلیم لوگوں کو دی جاتی ہے جس کو ہر شخص حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان تعلیم حاصل کرنے والوں میں کچھ یہ مقصد حاصل کر پاتے ہیں اور کچھ ان مقاصد کو حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں اور دیگر مشاغل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ کامیاب طلباء اس تعلیم کے بعد مزید تعلیم حاصل کر کے مختلف کالجوں، یونیورسٹیوں اور پیشہ ور اداروں میں داخلے کی کوششیں کرتے ہیں مگر ان میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس طرح تعلیمی ادارے معاشرے میں لائق اور احسن لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں اور ان کو تربیت دینے کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ مختلف درجہ گروہوں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہ لوگ مختلف پیشے اختیار کر لیتے ہیں۔ کوئی وکیل بن جاتا ہے تو کوئی ڈاکٹر یا انجینئر۔ اس طرح یہ تعلیمی ادارے گورنمنٹ اور دیگر صنعتی اداروں کے لئے امدادی قوتی اور ہنرمند افرادی قوت مہیا کرنے کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

اس سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ کسی ملک میں ان تینوں اداروں یعنی تعلیمی اداروں، گورنمنٹ صنعتی اداروں کے درمیان خیرجی تعاون ہو تاکہ تعلیمی ادارے ان کی ضرورت کے مطابق افرادی قوت مہیا کر سکیں اور دوسرے ان تعلیمی اداروں میں تحقیق سے ایجادات ملک کی ضروریات کے مطابق ہو سکیں اور ملک صحیح معنوں میں ترقی کر سکے۔

مثلاً اگر گورنمنٹ اور صنعتی اداروں کو معاشی ماہرین اور انجینئرز درکار ہوں تو تعلیمی ادارے ان میں بھی افرادی قوت مہیا کریں نہ کہ وکیل اور ڈاکٹر جن کی معاشرے کو زیادہ ضرورت نہیں۔

## 5- ذاتی ترقی و ذاتی کردار سازی میں مدد:

تعلیمی ادارے جہاں ملک و قوم کی ترقی کے لئے خدمات سرانجام دیتے ہیں وہاں یہ انفرادی سطح پر لوگوں کی ترقی اور بہبود کے لئے بھی کام کرتے ہیں۔ ایک طالب علم سکول میں نئی اور اچھی عادات سیکھتا ہے جیسا کہ وقت کی قدر کرنا، پابندی سے سکول جانا، ڈسپلن، تنظیم اور دوسری کردار سازی والی عادات آجا کر کرتا۔ یہ سب خدمات ایک تعلیمی ادارے کے ذریعے فراہم کی جاتی ہیں۔ بچوں میں ”اپنی مدد آپ کرنا“ والی عادت آجا کر کرتا، دوسروں پر انحصار نہ کرنا کی عادت کو آجا کر کرتا بھی تعلیمی ادارے کی خدمت ہے۔

## 6- تعلیم اور معاشرتی تبدیلی:

کسی معاشرے میں تغیر کے تین بڑے عوامل ہوتے ہیں:

1- محفوظ

2- ایجادات

3- دریافت

ان تینوں عوامل میں تعلیمی ادارے اہم کردار ادا کرتے ہیں کیونکہ کسی بھی دریافت اور ایجاد کی بنیاد تعلیمی اداروں پر منحصر ہوتی ہے۔ تعلیمی ادارے ماضی کے تجربات اور علم کو محفوظ رکھتے ہیں اور انہی درسگاہوں میں عالم اور فاضل لوگ معاشرے کو نئی راہیں دکھاتے ہیں۔ تعلیم کے ذریعے ہی نئی چیزوں کو پھیلاتے ہیں۔ ان کو مقبول عام کرانے کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ پڑھے لکھے لوگ معاشرے میں تبدیلی لانے کا سبب بنتے ہیں چنانچہ معاشرہ میں فلاح و بہبود لانے والی تبدیلیاں انہی تعلیمی اداروں کی مرہون منت ہیں۔ ایجادات اور دریافت جو تبدیلیاں معاشرے میں لاتی ہیں وہ تعلیمی اداروں کے سبب سے ہی ہیں۔ انقلابی تبدیلیوں میں تعلیمی ادارے اہم رول ادا کرتے ہیں۔ یہی ہمارے معاشرے کے لئے تعلیمی اداروں کی گراں قدر خدمت ہے۔

## تاریخ اسلام کی روشنی میں مدرسوں کا کردار

مندرجہ بالا پیرا گراف میں ہم نے مدارس (عام سکول، کالج، یونیورسٹی) جو دنیاوی تعلیم کی خدمت انجام دے رہے ہیں ان کا جائزہ لیا ہے۔ ان اداروں کے علاوہ ایک اور تعلیمی ادارہ بھی ہے جو اسلام کے ابتدائی دور سے ہی تعلیمی خدمات سرانجام دے رہا ہے وہ ہے ”اسلامی مدارس“ (عربی مدارس)۔ اسلامی مدارس بڑی بڑی وقف جائیدادوں کی آمدنی سے قائم کئے گئے تھے۔ یہ اوقات مختلف اوقات میں مختلف امراء، قائدین، علماء، تجار اور بادشاہوں کی جانب سے قائم کئے گئے تھے۔ یہ مدارس اتنی کثرت سے تھے کہ مملکت اسلامی کی حدود میں کوئی ایسا قابل ذکر قصبہ



گاؤں نہ تھا جہاں مدرسہ نہ ہو اور ان میں بیسیوں مدرسین عربی فارسی و دیگر علوم کی تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ ہماری تہذیب میں مسجد وہ ابتدائی حلقہ تھا جس سے مدرسہ کی نشوونما شروع ہوئی (مثلاً اصحاب صفہ کا مدرسہ)۔ اُس وقت مسجد صرف عبادت گاہ ہی نہ تھی بلکہ محکمہ میں مسلم بچے قرآن پاک کی قرأت، کتابت، علوم قرآن، فقہ شریعت سے متعلق مسائل و عقائد نیز لغت، ادب، ہندسہ و ریاضی اور دوسرے علوم بھی حاصل کرتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ مسجدوں سے ملحق مکاتب بھی قائم ہو گئے جہاں قرأت، کتابت اور قرآن مجید کے علاوہ علوم عربیہ اور علم ریاضی کی تعلیم دی جانے لگی۔ یہ مکاتب ہمارے موجودہ زمانے کے پرائمری سکولوں کے مشابہ ہوتے تھے اور یہ اس قدر کثرت سے ہوتے تھے کہ ابن جوق کی گفتی کے مطابق صرف صقلیہ کے قصبے میں قریباً چھ سو (600) مکتب تھے اور وسیع اس قدر تھے کہ بعض اوقات ایک ایک مدرسہ میں سینکڑوں اور ہزاروں طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ابوالقاسم بلخی اپنی تاریخ میں خود اپنے مکتب کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں تین ہزار طلبہ زیر تعلیم تھے اور اُس کا یہ مکتب اس قدر وسیع تھا کہ اس کے طویل و عریض احاطہ میں طلبہ کی نگرانی کیلئے اور اُن کے حالات و ضروریات سے واقفیت کیلئے سواری کا استعمال کرنا پڑتا تھا۔

پھر مکتب سے آگے بڑھ کر مساجد کے ساتھ ”مدرسہ“ قائم ہوا۔ یہ مدرسہ دور حاضر کے ثانوی اور اعلیٰ درسا گاہوں کے مشابہ تھا۔ (یعنی سکول اور کالج کے مشابہ) ان مدارس میں تعلیم بالکل مفت دی جاتی تھی اور ہر طبقہ کے لوگ داخل ہوتے تھے۔ غریب کا بچہ بھی وہاں زیر تعلیم ہوتا تھا اور امیر کا اور خلیفہ وقت کا شہزادہ بھی اور آج کل کے ہمارے ثانوی سکولوں اور کالجوں کی طرح وہاں کسی قسم کی فیس وغیرہ ادائیگی کرتی پڑتی تھی۔ تعلیم کے مواقع سب کے لئے یکساں تھے جو آتا تھا داخلہ لے سکتا تھا۔ وہاں فقراء و اغنیاء کے درمیان امتیاز نہ تھا۔ ان مدارس میں تعلیم دو طرح کی ہوتی تھی: داخلی اور خارجی۔

داخلی تعلیم حاصل کرنے والے طلباء اکثر غریب ہوتے تھے جن کے والدین اور سرپرستوں کی معاشی حالت ان کو ضروریات زندگی فراہم کرنے کی تحمل نہیں ہوتی تھی اور دوسری قسم خارجی طلباء کی تھی جو مدرسہ میں رہائش نہ رکھتے تھے۔ وہ دن میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور رات کو اپنے گھروں یا رشتہ داروں کے ہاں چلے جاتے تھے۔ تعلیم تو سب کے لئے مفت تھی مگر داخلی طلباء کو تمام سہولتیں مفت فراہم کی جاتی تھیں۔ ان کے کھانے پینے، سونے و رہائش کے انتظامات مدرسے ہی میں کئے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پرانی مساجد میں مدرسہ و رسگاہ مطبخ کھانے (بادرستی خانے) رہائش کے کمرے کتب خانے مطبخ و حمام ضرور ہوا کرتے تھے۔ بعض مدارس میں کھلی فضاء کے لئے کھیل کے میدان بھی ہوتے تھے جہاں طلبہ جسمانی ریاضت کرتے تھے۔ آج تک عالم اسلامی میں بعض جگہوں پر ایسے مدارس کے نمونے موجود ہیں جن

سے اس وقت کی تمام اسلامی دنیا بھری پڑی تھی۔

مدارس اور خصوصاً اعلیٰ تعلیمی اداروں کی اس قدر بہتاب تھی کہ پورا عالم اسلام اعلیٰ تعلیمی اداروں سے بھرا پڑا تھا۔ تاریخ اسلامی بڑے تعجب و شکر سے بعض ایسے فرزندان اسلام کے نام پیش کرتی ہے جنہوں نے عالم اسلام کے ہر شہر میں بڑے بڑے مدارس تعمیر کرائے ہیں اہم کردار ادا کیا۔ ان لوگوں میں سرفہرست نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی کے نام ہیں جنہوں نے مصر دمشق، موصل اور بیت المقدس کے چھ چھ بڑے مدارس کا جال بچھلایا تھا۔

نور الدین الشہید نے صرف شام میں چودہ مدارس قائم کئے تھے جن میں چھ دمشق میں چار حلب میں دو حماہ میں اور ایک ایک حمص اور بعلبک میں تھا۔ علاوہ ازیں نظام الدین طوسی (جو آل سلجوق کے وزیر اعظم تھے بغداد ان کا دار الخلافہ تھا) بھی ایسے لوگوں میں سے تھے جنہوں نے عراق خراسان کو مدارس سے بھر دیا تھا۔ مؤرخین کے بقول اس نے عراق و خراسان میں مدارس کا جال بچھا دیا تھا۔ بڑا ہی علم دوست وزیر اعظم تھا۔ دور دراز علاقوں میں بھی مدارس قائم کیا کرتا تھا مثلاً اس نے جزیرہ ابن عمر میں ایک عالی شان مدرسہ قائم کیا تھا جو نہایت خوبصورت تھا۔ جہاں بھی اسے کسی ماہر تعلیم کا پتہ چلتا تھا وہیں اس کے لئے ایک مدرسہ قائم کر دیتا تھا تاکہ اپنے گھر کے قریب ہی تعلیمی خدمات انجام دیتا رہے۔ تمام اخراجات اوقاف سے ادا کرنے کے احکام صادر کرتا تھا۔ طلبہ کی سہولت کے لئے اور عوام کی فلاح کے لئے مدرسے کے ساتھ کتب خانہ بھی تعمیر کراتا تھا (یعنی لائبریری کا قیام)۔

وزیر اعظم نظام الدین طوسی کی سب سے بڑی یادگار ”مدرسہ نظامیہ اسلامیہ بغداد“ ہے۔ یہ بہت اہم اور منظم مدرسہ (یونیورسٹی) تھی۔ پانچویں اور نویں صدی کے درمیان بڑے بڑے فضلاء و علماء اس مدرسہ سے فارغ التحصیل ہوئے جن طلبہ نے یہاں سے تعلیم مکمل کی ان کی تعداد چھ ہزار (6000) تک جا پہنچی تھی۔ یہ ایک ایسی درسگاہ تھی جہاں ممالک اسلامیہ کے بڑے بڑے رؤساء کے بچے فقیر سے فقیر تر لوگوں کے بچے ایک جگہ بیٹھ کر بغیر کسی فیس کے تعلیم حاصل کرتے تھے بلکہ فقراء کے لئے تو مفت تعلیم کے علاوہ وظائف بھی مقرر تھے جو اس مقصد کے لئے وقف کردہ زمین کی آمدنی سے دیئے جاتے تھے۔

ان صاحبان جاہ و منصب کے دوش بدوش دوسرے دولت مند حضرات تاجرانہ اور انھما حضرات بھی قیام مدارس اور ان کے لئے اوقاف قائم کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھتے تھے تاکہ ان اوقاف کی وجہ سے مدارس کو مالی استحکام حاصل رہے اور طلبہ بڑے اطمینان و سکون سے ان مدارس کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ بہت سے ایسے محترم حضرات بھی گزرے ہیں جنہوں نے اپنے گھروں کو ہی مدارس میں تبدیل کر دیا تھا۔ ان گھروں میں جو کتابیں تھیں یا ان کے ساتھ جو جائیدادیں تھیں وہ سب انہی طلبہ کے لئے وقف ہوتی تھیں۔

درج ذیل میں ہم چند مشہور اسلامی کلاسوں کی فہرست درج کرتے ہیں تاکہ معلومات میں اضافہ ہو سکے۔

### چند مشہور اسلامی درس گاہیں / مدارس:

- 1- مسجد نبوی ..... مدینہ منورہ۔
- 2- جامع عمرو ..... 21ھ میں تعمیر ہوئی۔
- 3- جامع دمشق ..... 90ھ میں خلیفہ عبدالملک اموی نے تعمیر کرائی۔
- 4- جامع المصنوع ..... 145ھ میں تعمیر ہوئی۔
- 5- جامع کوفہ ..... دوسری صدی ہجری میں تعمیر ہوئی۔
- 6- جامع الازہر ..... مصر کی سب سے عظیم الشان اور قدیم یونیورسٹی۔
- 7- مدرسہ الحاکم ..... 290ھ میں تعمیر ہوا۔
- 8- جامع سعیدہ ..... نصر بن کھنکین نے 289ھ میں تعمیر کرائی۔
- 9- جامع بھقیہ ..... امام بیہقی نے 384ھ میں غیثاپور میں تعمیر کرائی تھی۔
- 10- جامع نظامیہ اسلامیہ بغداد ..... یہ ادارہ اسلامیہ وزیراعظم نظام الدین طوسی نے امام الحرمین شریف کے لئے بغداد میں چوتھی صدی ہجری میں تعمیر کرایا تھا۔
- 11- دارالحدیث نور یہ ..... نور الدین زنگی نے 563ھ میں تعمیر کرایا۔
- 12- دارالسعد السعداء ..... صلاح الدین ایوبی نے 569ھ میں تعمیر کرایا۔
- 13- جامع نجف ..... پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں جناب ابو جعفر طوسی نے تعمیر کرایا تھا۔
- 14- جامع اصفہانیہ ..... ابواسحاق اصفہانی نے چوتھی صدی ہجری میں تعمیر کرائی تھی۔
- 15- مرکز علوم اسلامیہ ..... مغربی سوڈان میں فیکسو کے مقام پر چھٹی صدی ہجری میں تعمیر ہوئی۔
- 16- دارالعلوم مستطریہ ..... خلیفہ مستنصر نے 631ھ میں تعمیر کرایا اور خود اپنے ہاتھوں سنگ بنیاد رکھا تھا۔
- 17- دارالعلوم غزنویہ ..... سلطان محمود غزنوی نے 410ھ میں غزنی کے مقام پر اس مدرسے کی بنیاد رکھی تھی۔
- 18- دارالعلوم قسطنطنیہ ..... سلطان محمد فاتح نے 865ھ میں ترکی میں قائم کیا۔
- 19- جامع قرطبہ ..... سلطان عبدالرحمن الداخل نے ہسپانیہ کے شہر قرطبہ میں یہ مدرسہ قائم کیا۔
- 20- جامعات غرناطہ ..... اندلسی دور کی مشہور درس گاہیں۔

21- مدرسہ ازیق..... ترکوں نے ازیق کے مقام پر آٹھویں صدی ہجری میں اس کی بنیاد رکھی۔

22- مدرسہ النوریہ الکبریٰ..... چھٹی صدی ہجری میں دمشق میں قائم ہوا۔

23- مدرسہ الناصرہ..... ملک منصور قلاؤن نے 689ھ میں تعمیر کرایا۔

ملت اسلامیہ حصول علم اور تشہیر علم میں شروع ہی سے زبردست فعال رہی ہے۔ چنانچہ وہ علوم جن پر رومیوں اور یونانیوں کو ناز تھا جب مسلمانوں کے قبضے میں آئے تو اس طرح ان میں بہار آئی کہ نئی قسم کی نئی شاخیں نمودار ہوئیں۔ نئے غنچے کھلے اور متنوع علم ظہور میں آئے۔ ادب، تحقیق، تنقید اور دیگر سائنسی علوم میں جو بلند ترین مقام مسلمانوں نے حاصل کیا اُس نے پوری دنیا کے ادیبوں، محققوں اور ناقدوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا لیکن سب سے بڑے فخر کی بات تو یہ ہے کہ سائنسی علوم میں بھی مسلمانوں نے وہ مقام حاصل کیا کہ وہ آنے والی مہذب اور ترقی یافتہ اقوام کی تہیاب بن کر ابھرے۔ علوم ہندسہ، طب، جغرافیہ، نجوم و ریاضی وغیرہ میں مسلمانوں سے زیادہ ماہر کسی اور قوم کا کوئی فرد نہیں۔ آج کی دنیا نے سائنسی دور میں جو ترقیاں کی ہیں وہ سب کی سب مسلمانوں کے ابتدائی اسباق کی مرہون منت ہیں۔

## مارکیٹ / بازار

خرید و فروخت اور کاروبار کے مرکز کو عموماً بازار یا مارکیٹ کہتے ہیں۔ عام زبان میں اس کو منڈی کا نام دیا جاتا ہے۔ معاشیات میں منڈی یا مارکیٹ کے معانی قدرے وسیع تر نوعیت رکھتے ہیں۔ مارکیٹ سے مراد کوئی خاص علاقہ نہیں جہاں اشیاء کی خرید و فروخت ہو بلکہ اس سے مراد وہ تمام علاقہ ہے جہاں چیزوں کی خرید و فروخت کرنے والے آپس میں بالواسطہ یا بالواسطہ رابطہ قائم کر کے قیمت کے تعین کے لئے مقابلہ کر سکیں۔ معاشی بازار کسی جغرافیائی قیود کا پابند نہیں ہوتا۔ بائع اور مشتری کا دائرہ عمل ایک شہر سے دوسرے شہر تک بھی ہو سکتا ہے اور ایک ہی شہر میں محدود بھی اور اگر وہ اس کو مزید وسعت دینا چاہیں تو پوری دنیا تک وسیع ہو سکتا ہے۔

### بازار کا انتظام:

چودھویں صدی عیسوی کے ایک عظیم ایشیائی مؤرخ ضیاء الدین برنی کے مطابق بازاروں کا نظم ہزاروں سالوں کی حکومت کے لئے ہمیشہ درد سزا رہا ہے کیونکہ تاجر سوداگر اور بازار کے دوسرے لوگ انتہائی شاطر اور عیار و مکار رہے ہیں اور ان پر قابو پانا ایک محال امر رہا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اسلام جو سماج کے تمام طبقات کے عمل و کردار کی پاکیزگی

کا علمبردار ہے، تاجروں اور بازار کے لوگوں کے عمل و کردار کی بھی صحیح تعمیر و تشکیل کرنا چاہتا تھا چنانچہ قرآن کریم اور احادیث نبوی ﷺ میں اس قسم کی بہت سی ہدایات اور احکام ملتے ہیں۔ انتظامی طور سے یہ اسلامی ریاست کے سربراہ کی ذمہ داری تھی کہ وہ شرعی حدود کے اندر بازاروں کے نظم و نسق کے لئے اقدامات کرے کیونکہ محض اخلاقی و روحانی تعلیمات کسی نظام کی بقاء اور اثر کے لئے کافی نہیں ہوا کرتیں۔ احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ بنفس نفیس بازاروں کا چکر لگاتے اور دورہ کرتے تھے اور تاجروں اور خریداروں دونوں کے اعمال و اخلاق کی درستگی کے لئے برابر احکام و ہدایات جاری کیا کرتے تھے۔

جامع ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ کا گزر ایک بازار سے ہوا اور آپ ﷺ نے وہاں ایک شخص کے پاس گندم کا ڈھیر دیکھا جو وہ فروخت کے لئے لایا تھا۔ آپ ﷺ نے اس ڈھیر میں اپنا ہاتھ ڈال دیا تو دیکھا کہ وہ اندر سے نم ہے۔ آپ ﷺ نے تاجر کو سرزنش کی اور دھوکا بازی سے منع کیا۔

امانج کی خرید و فروخت صرف مارکیٹوں میں ان مقامات میں جائز قرار دی گئی تھی جہاں وہ عام طور سے ہوا کرتی تھی۔ اس قسم کی ہدایات کا مقصد یہ تھا کہ امانج کے تاجروں کی باقاعدہ نگرانی کی جاسکے اور ان کے پُر فریب طریقوں کا انسداد کیا جاسکے۔

**مارکیٹ یا بازار سے متعلقہ ضروری امور:**

مارکیٹ کے لئے درج ذیل چیزوں کا ہونا ضروری ہے:

- 1- مال بغرض فروخت
- 2- مال خریدنے اور بیچنے والے
- 3- بائع اور مشتری میں بلا روک ٹوک باہمی مقابلہ
- 4- ایک مقام جہاں مال لوگوں کو دکھانے کے لئے رکھا جاسکے
- 5- تمام خطہ یا علاقہ میں قیمت کا یکساں ہونا

**مال کی خرید و فروخت میں مارکیٹ کا کردار:**

مال کی خرید و فروخت بالعموم منڈیوں میں ہی ہوتی ہے۔ منڈی نہ ہونے پر مال بیچنے اور خریدنے والوں کو ایک دوسرے سے راہ و رسم پیدا کرنے کا بہت کم موقع ملتا ہے کیونکہ نہ تو انہیں مال سے واقفیت ہوتی ہے جس کے باعث خرید و فروخت میں سخت رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور مال حیار اور بناتے والوں کو بازار کے ذریعہ ہی علم ہوتا ہے کہ لوگوں کو کون سی چیز درکار ہے؟ ان کی پسند کیا ہے؟ اور کس چیز کا رواج زیادہ ہو رہا ہے؟ چنانچہ وہ اسی کے مطابق مال تیار کرتے ہیں۔ اسی طرح خریداروں کو پتہ چلتا ہے کہ کون کون سی شے مہیا ہو سکتی ہے۔ بازار کے

لیجے مال کی قیمت مقرر ہوتی ہے اور مال کی بھم رسانی اور مانگ کو مد نظر رکھ کر بدلتی رہتی ہے۔ چنانچہ بازار یا منڈی کی قیمت پر لوگوں کا اطمینان ہوتا ہے اور خرید و فروخت میں آسانی رہتی ہے۔ مارکیٹ یا بازار کے بغیر مال کی خرید و فروخت میں بڑی مشکلات سامنے آتی ہیں۔

## کیونٹی سنٹرز

کیونٹی سنٹر کا کام سیر و تقریر، سماجی بہبود اور طبی خدمات کا مہیا کرنا اور ان میں رابطہ قائم کرنا ہے۔ اس میں جامعیت کے ہر طبقے کے نمائندے موجود ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی شہر کے معزز اور مخیر حضرات کو بھی اس کا ممبر بنالیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سماجی بہبود کے سرکاری و غیر سرکاری اداروں (مثلاً اسپتال، بچوں کی عدالت اور محکمہ تعلیم) کے نمائندے بھی شامل ہوتے ہیں لیکن ان لوگوں کو کسی قسم کا معاوضہ نہیں دیا جاتا۔

کیونٹی سنٹرز کے درج ذیل اہم فرائض ہوتے ہیں:

### 1- رابطہ قائم کرنا:

اس کونسل کے اجلاس کے موقع پر کونسل کے کارکنان جماعت کے لوگوں کے سامنے اپنی کارکردگی اور پروگرام پیش کرتے ہیں۔ عام طور سے کونسل اپنی شائع کردہ رپورٹ ممبروں میں تقسیم کرتی ہے۔ اس طرح تمام ممبر کونسل کے پروگراموں سے واقف ہو جاتے ہیں اور دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اجلاس اور کانفرنس کے ذریعے موجود مسائل اور ضروریات کو پورا کرنے کی تدابیر اور تجاویز پر غور کیا جاتا ہے۔ فضول خرچی اور بدانتظامی کو روکا جاتا ہے۔

### 2- معلومات فراہم کرنا:

جماعت کے سماجی و معاشی حالات کی تحقیق کر کے ان کی وجہ معلوم کی جاتی ہے اور جماعت کے وسائل کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اسی لئے سماجی سرورے اور تحقیق جماعت کے سماجی حالات معلوم کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ ماہرین باہر سے بلائے جاتے ہیں تاکہ وہ بالکل صحیح اور غیر متعصبانہ جائزہ موجودہ انتظامیہ کو فراہم کر سکیں۔ وہ کمیشیاں جن کے سپرد جائزہ کا کام ہوتا ہے ان کے کارکن تربیت یافتہ اور غیر تربیت یافتہ دونوں ہو سکتے ہیں اور یہ اپنی تحقیقات کے نتائج کونسل کے ممبروں کے علاوہ معاشرہ کے عام لوگوں کو بھی مہیا کرتے ہیں۔

### 3- وسائل کا یکجا کرنا:

چونکہ اس کے ممبر مختلف اداروں سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے وہ جماعت کے تمام وسائل

بآسانی کیجا کر کے ساری جماعت کے لئے ایک متحدہ منصوبہ تیار کرتے ہیں جو تحقیقی معومات پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے بعد تمام اداروں اور تنظیموں کی مدد حاصل کر کے منصوبہ بندی یعنی کی سفارشات پر عمل درآمد کرتے ہیں۔

#### 4- خدمات کا معیار بلند کرنا:

جماعت کے تمام اداروں کے پروگرام کا جائزہ لینا اس کا اہم کام ہے۔ کونسل کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ تمام ادارے باقاعدگی سے کام کریں۔ اس طرح یہ ادارہ ان کی رجحانی کار کے ان کا معیار بلند کرتا ہے۔

#### 5- مشترکہ خدمات کا مہیا کرنا:

کچھ خدمات جو ساری جماعت کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں ویلیفیر کونسل اور سوشل سروس ایجنسی کے رضا کاروں کی مدد سے ضرورت پڑنے پر فراہم کرتی ہے۔

#### 6- عوام کا تعاون حاصل کرنا:

کونسل کا ایک اہم کام پروگراموں کی طرف عوام کی توجہ مرکوز کرنا اور ان کا تعاون حاصل کرنا ہے تاکہ وہ پروگرام میں دلچسپی لیں۔ تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ آبادی کا ایک بڑا حصہ ایجنسی کے کاموں کے متعلق بہت کم جانتا ہے۔ یہ کونسلیں کمیونٹی لیڈر بنانے میں بہت اہم رول انجام دیتی ہیں۔ جب لوگوں کو ان کی خدمات کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے تو وہ اپنے خیالات و تجربات کو جماعت کے دوسرے لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔

## عصری ذرائع ابلاغ

موجودہ زمانے میں عصری ذرائع ابلاغ / میڈیا کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے وہ دراصل اس اقتدار کا نتیجہ ہے جو میڈیا نے رائے عامہ پر حاصل کیا ہے۔ جمہوری اداروں میں جہاں اصول منادات پر زور دیا جاتا ہے میڈیا کا ملک میں بیداری اور عوام انسان میں اپنے حقوق اور فرائض کا احساس پیدا کرانے میں بڑا حصہ رہا ہے لیکن اس فرض کی انجام دہی کے لئے اسی امر کی ضرورت ہے کہ آزادی تحریر و تقریر پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ کی جائے اور عوام کو صحیح حالات معلوم کرنے کا موقع دیا جائے۔

آج کل جمہوری مملکتوں کی کامیابی بڑی حد تک میڈیا اور رائے عامہ کی رہن منت ہے جن ممالک میں بادشاہت یا محدودیت قائم ہے وہاں بھی میڈیا نے ملک کے عام رجحانات کو

منظم کرنے میں نمایاں خدمت انجام دی ہے۔ حکومت کے مظالم انتظام کی خرابیاں عالیشان سلطنت کی غیر ذمہ دارانہ روش اور ان کی خود غرضیوں اور غلطیوں کو آشکار کر کے رائے عامہ کو ان کے خلاف ہموار کرنا صرف میڈیا ہی سے ممکن ہے۔

### رائے عامہ کی تشکیل کے طریقے:

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رائے عامہ کی تشکیل کے کیا طریقے ہیں اور اس خصوص میں میڈیا کو کن اصولوں پر عمل پیرا ہو کر رائے عامہ کو منظم کرنا چاہئے۔

مذہب سوسائٹی میں رائے عامہ کو متاثر کرنے کے دو طریقے ہیں: ایک تو یہ کہ بحث و تحقیق کے ذریعے اخبار کی پالیسی، تحریک یا شخص کی تائید کرتا ہے یا مخالفت اور اب یہ چیزیں خلوص کا نتیجہ ہوں تو اس قسم کی رائے زنی سے جماعتی زندگی کو بڑی مدد ملتی ہے۔ دوسرا طریقہ بہت موثر اور ساتھ ہی مشکل بھی ہے چونکہ رائے عامہ کی تشکیل میں صرف واقعات سے بحث ہوتی ہے اس لئے میڈیا اپنے خیالات کی تشہیر یا حصول مقاصد کے لئے اپنی رائے کو واقعات کا جامہ پہناتا ہے۔ بسا اوقات من گھڑت واقعات سے کام لیا جاتا ہے لیکن اس طریقہ پر بہت ہوشیاری سے عمل کرنے کی ضرورت ہے ورنہ اگر اصلیت کا پتا چل گیا تو میڈیا کی نیک نامی پہ پانی پھر جاتا ہے۔ اس سے بچنے کے لئے ایک اور کارگر طریقہ ہے اور وہ واقعات کا انتخاب ہے یعنی صرف ایسی خبریں یا واقعات مشہور کئے جاتے ہیں جن سے کسی خاص خیال کی تائید یا حمایت مقصود ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی ایسے واقعات کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو اس خیال کے مغاثر ہوں لیکن یہ طریقہ صرف بیرونی اور خارجی خبروں کی اشاعت کی حد تک ہی مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

انیسویں صدی میں رائے عامہ کی تشکیل اخباروں کے اداروں یا مضامین کے ذمہ ہوتی تھی۔ براعظم یورپ میں اخبارات بعض مشہور اخبار نویسوں کی پارٹی کے ہوتے تھے جو اپنے نام سے مضامین شائع کرتے تھے۔ انگلستان میں لکھنے والے کے نام راز میں رکھے جاتے ہیں جس سے ان کے متعلق عوام میں ایک تجسس پیدا ہوتا تھا اور اخبار کی اہمیت بڑھ جاتی تھی۔

رائے عامہ کی تشکیل بڑا مشکل کام ہے۔ جب تک عوام کے دلوں میں میڈیا کی عزت و عظمت قائم نہ ہو وہ لوگوں کی رائے کو متاثر نہیں کر سکتا اور عزت و عظمت میڈیا کے اس کردار سے پیدا ہوتی ہے جو وہ معاشرہ میں ادا کرتا ہے اور غیر محسوس طور پر لوگوں کو اپنا ہموار بنایا جاتا ہے۔ یہ بات میڈیا کو اس وقت نصیب ہو سکتی ہے جب کہ اس کو اپنے صحافتی فرائض کا احساس ہو اور اہل ملک کے خیالات اور احساسات کی وہ ترجمانی کرتا ہو۔



## عصری ذرائع ابلاغ کے مقاصد

ہر کام کسی مقصد کے تحت ہوتا ہے۔ ماہرین صحافت کے مطابق عصری ذرائع ابلاغ کے مقاصد درج ذیل ہیں:

i- مطلع کرنا:

اطلاعات و معلومات کی فراہمی، خبریں، ادارے اور اشتہارات۔

ii- رہنمائی کرنا:

حالات حاضرہ کے متعلق عوام کی رہنمائی کی جاتی ہے۔ اخبارات کے کالم اور ادارے یہ فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔

iii- تعلیم دینا:

فیچر اور ایسے آرٹیکل جو کسی مخصوص علم سے متعلق ہوں۔

iv- تفریح:

بلکہ پچھلے آرٹیکل اور فکاہیہ کالم کے علاوہ اخبارات کے خصوصی ایڈیشن یا سنڈے میگزین میں شائع ہونے والی کہانیاں صحافت کا تفریحی مقصد پورا کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

قومی و انفرادی زندگی میں سدھار:

میڈیا کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ آزادی اور حریت کا علمبردار ہے اور قومی کے مقابلے میں ضعیف کا سینہ پر ہے اور دنیا میں اس کی وجہ سے حق و انصاف کی شمع روشن ہے۔ اخبار کے حقیقی فرائض خبروں کی توسیع و اشاعت ہی نہیں ہیں بلکہ قومی زندگی اور حالات کا انہیں آئینہ ہونا چاہئے۔ عوام الناس اور خصوصاً مفلوک الحال اور افلاس زدہ لوگوں کی مصیبتوں کو دور کرنے اور ان کی زندگیوں کو سدھارنے کا فرض بھی میڈیا کے کندھوں پر عائد ہوتا ہے۔ اس لئے قومی زندگی کو ایک خاص معیار پر لانے کی کوشش بھی میڈیا ہی کو کرنی چاہئے تاکہ غریب و امیر و افلاس و امارت میں جو وسیع فاصلے حائل ہیں وہ باقی نہ رہے۔ ملک کی وہ ساری برائیاں جن سے بحیثیت جمہوری اخلاق عامہ پر اثر پڑتا ہے دور ہو جائیں اور لوگ پاک اور سادہ زندگی بسر کر سکیں جہاں نہ آپس میں بغض و عناد ہو نہ کینہ و حسد اور جہاں نہ اسراف ہو نہ بد اعمالیاں قوم کی اصلاح اور ملک کی خدمت میڈیا کے فرائض میں داخل ہے اور اس فرض کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا اخبار کی زندگی کا اصل اصول ہے۔

### اخلاقی تربیت:

میڈیا کے تعلق ایک خیال یہ ہے کہ وہ صرف ایک کاروبار بلکہ ایک ادارہ بھی ہے۔ جہاں تک کاروبار کا تعلق ہے اس پر دنیا کے معاشی حالات کے مطابق عروج و زوال کی وہی کیفیتیں طاری ہوتی ہیں جن کا ہر کاروبار میں امکان رہتا ہے۔ اسی طرح بحیثیت ایک ادارہ کے دنیا کے معاشرتی اور سیاسی حالات اور اثرات کا اس پر مرتب ہونا لازماً ہے۔ اگر اس کی کاروباری کامیابی کا اندازہ اس کے منافع سے کیا جاتا ہے تو بحیثیت ادارہ اس کی کامیابی ان خبروں، آراء اور عام معلومات سے ہوتی ہے جو یہ بنیاد کرتے ہیں۔ صحافت چونکہ راستہ عوام کے خیالات، اخلاق، ذوق و معیار زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے اس لئے حکومت اور سوسائٹی کے لئے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ کسی جمہوری حکومت کی کامیابی کا انحصار رائے عامہ پر ہوتا ہے اور اخبارات سے رائے عامہ متشکل اور اثر پذیر ہوتی ہے۔ اس طرح کسی سوسائٹی کی فلاح و بہبود کا مدار اخلاق عامہ پر ہوتا ہے۔ اور اخلاق عامہ کی تربیت اخبارات ہی کرتے ہیں۔

### احتساب:

متحدہ ممالک میں صحافت عوام کا ایک زبردست حربہ ہے جس کی قوت قوموں کے نزدیک مسلم ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی قوت کا جس کا حکومتیں احترام کرتی ہیں لوگوں کی خانگی زندگی ان کے خیالات، ان کے اعتقادات، احساسات اور اخلاق پر کتنا اثر نہ پڑتا ہوگا۔ میڈیا کی اس قوت کا اندازہ حکومتی احتساب قوانین خلاف اذالہ حیثیت عربی و اخلاق عامہ اور اس پراپیگنڈے سے ہو سکتا ہے جو زمانہ جنگ میں میڈیا کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومتوں کے نزدیک خاص کر جمہوری ممالک میں میڈیا کو سرکاری طور پر بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسی قوت اور اثر کی بنیاد پر سوسائٹی میں صحافت نے ایک ادارہ کی حیثیت حاصل کر لی ہے اور اس کا شمار خاندان مذہب اور مدرسہ کی صف میں ہونے لگا ہے۔

ونڈل ٹمپلس کہتا ہے:

”والدین سکول، کالج، میگزین، ٹیلی ویژن اور مشیر کی ساری خصوصیتیں اخبار میں

جسم ہیں۔“

### سچائی اور حقائق کی تلاش:

میڈیا کے لئے غریب اور امیر، حاکم و محکوم، آقا اور غلام سب کی زندگیاں برابر ہیں۔ مظلوموں کی مدد کرنا، مظلوموں اور بے نواؤں کی دیکھ بھری کرنا اور ان کی مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کرنا میڈیا کے فرائض میں داخل ہے۔ کسی خبر کے شائع کرنے میں رنگ آمیزی، مبالغہ یا

توڑ مروڑ سے کام نہیں لینا چاہئے۔ یہ خبر کا معیار صداقت، کامل صداقت اور محض صداقت ہے۔ اخبار نویس ایک مؤرخ کی طرح روزانہ کے واقعات سے نتائج اخذ کرتا ہے اور ان پر بے لاگ تبصرہ کرتا ہے۔ اس لئے وہ زیادہ سے زیادہ سچائی کی تلاش میں رہتا ہے اور اپنے ناظرین کے لئے ایسی ہی خبریں بہم پہنچاتا ہے جو صداقت پر مبنی ہوں۔ ہر اخبار نویس خبروں کی اشاعت میں مصلحت کو شامل کرنے میں امانت عامہ کے تحفظ کی اہمیت نہیں ہوتی۔

**رائے عامہ کی تیاری:**

متمدن ممالک میں صحافت کو عوام کی قوت سے موسوم کیا گیا ہے اور اس قوت کا احترام ہر حکومت کا فرض ہے۔ یہ قوت دراصل رائے عامہ کی قوت ہے جس کے اظہار کے مظہر ملک کے ذرائع اطلاع ہیں۔ یہ قوت اس اقتدار سے مختلف ہے جو حکومت یا بادشاہ کو اپنی رعایا پر حاصل ہوتا ہے جس میں جبر کا عنصر شریک ہے اور جس کا احترام قانون اور عدالت کے ذریعہ ہوتا ہے۔ پریس کی قوت کی نوعیت اس آمدنی کی طرح ہے جو سمندر کی لہروں کو (جنہیں عوام کہا جاسکتا ہے) طوفان میں تبدیل کر دیتی ہے۔ حکومت ایک کشتی ہے جو ان لہروں کی آغوش میں پروش پائی ہے۔ لہریں اسے منجھدار سے نکالتی ہیں اور ساطل مراد تک پہنچاتی ہیں اور جب ان میں موج پیدا ہوتا ہے اور یہ تلاطم خیز طوفان کی صورت اختیار کر لیتی ہیں تو کشتی تباہ و تاراج ہو جاتی ہے۔ دنیا میں اس طرح انقلاب آئے اور قوموں کی قسمتوں نے اس طرح پلٹا کھایا۔

**خیر و شر کی تمیز:**

صحافت ایک جادو ہے جس کے بول میں خیر و شر کی بجلیاں روپوش ہیں۔ ایک معمولی سی خبر ایک انوار یا ایک غلط بیان کے وہ دور رس نتائج مرتب ہوتے ہیں جن پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ کسی شخص کو بام شہرت پر پہنچانا یا قعر مذلت میں دھکیلنا ہو کسی جماعت یا تحریک کو قبولیت کی سند عطا کرنی ہو یا لوگوں کو اس سے متنفر کرنا ہو حکومت کی کسی پالیسی کو کامیاب یا ناکام کرنا ہو یا مختلف اقوام میں جذبات نفرت یا دوستی پیدا کرنا ہو تو یہ صحافت کا ادنیٰ کرشمہ ہے بعض وقت یہ بھی کہا جاتا ہے کہ میڈیا جنگ کا باعث ہوتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے البتہ جن واقعات یا حالات کا نتیجہ جنگ ہوتی ہے میڈیا ان میں ضرور شدت پیدا کرتا ہے اور ملک اور قوم کو جنگ کے لئے تیار کرتا اور دوران جنگ میں لوگوں میں ایثار اور قربانی کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ شکست خوردہ ذہنیت سے باز رکھتا ہے اور جذبات انتقام کو اتنا مشتعل کرتا ہے کہ قوم کا ہر شخص قوم کی عزت و ناموس کا محافظ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد سے آزاد حکومتوں میں جنگ کے زمانے میں میڈیا پر سخت نگرانی اور خبروں پر احتساب قائم کیا جاتا ہے، مبادا قوم افراط و تفریط میں مبتلا ہو جائے۔

## قومی مفادات کا تحفظ:

ملک و قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے ضروری ہے کہ عوام میں یہ شعور پیدا کیا جائے کہ قومی مفادات کو ذاتی مفادات پر ترجیح دینا چاہئے۔ ذاتی مفاد سے کسی فرد واحد کو تو فائدہ ہو سکتا ہے لیکن ملک و قوم نقصان اٹھاتے ہیں۔

## صحافت بطور مشن:

اگر ہم برصغیر کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ ابتداء میں صحافت کا آغاز مشتری جذبے کے تحت ہوا۔ عوام کو ان کے حقوق کا احساس دلانا اور آزادی کے جذبے سے موجزن کرنا صحافت کی اولین ذمہ داری بن گیا تھا۔ اخبارات کی تحریروں میں شدید لب و لہجہ اختیار کیا جاتا تھا جذباتی انداز عام تھا۔

## صحافت ایک اہم صنعت:

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صحافت کے مشتری جذبے پر کاروباری انداز غالب آ گیا۔ آج کے اخبارات باقاعدہ ایک ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نئے نئے الفاظ اور میان روی دور جدید کے اخبارات کا اہم عنصر ہیں۔ اس کے ساتھ بہت سے لوگوں کا روزگار وابستہ ہے۔ آج ہم صحافت کو ایک اہم صنعت کی حیثیت دیتے ہیں۔

## رابطہ:

ہر علاقے اور ملک کی خبریں بہم پہنچا کر صحافت مختلف معاشروں کے افراد اور ایک ہی علاقے میں رہنے والے افراد کے مابین رابطے کا اہم ذریعہ بن جاتی ہے۔ اخبارات کے کلاسیفائیڈ اشتہارات کی بدولت ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ کس علاقے میں کس قسم کی خدمات اور مصنوعات درکار ہیں یا موجود ہیں۔ اس طرح ہم ان اطلاعات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

## احساب:

سماجی برائیوں اور حکومت کے انتظام و انصرام پر تنقید کر کے صحافت حکومتی احساب کا وسیلہ بھی بن جاتی ہے۔ اگر یہ تنقید مثبت مقاصد کے حصول اور مثبت انداز سے کی جائے تو اس کا فائدہ عوام اور حکومت دونوں کو ہوتا ہے۔

## آئینی حق:

عوام کو ان کے آئینی حقوق سے روشناس کرانا اور اس کے مطابق اپنے حقوق کے لئے آواز بلند کرنا صحافتی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

## غیر اسلامی معاشرہ اور اسلامی معاشرہ کا تقابل

دنیا کے مختلف علاقوں میں مختلف معاشرے وجود پذیر ہیں۔ بہت سے علاقوں میں جغرافیائی اعتبار سے مخصوص علاقے کے علاوہ لوگ مخصوص معاشرے کے متقاضی ہوتے ہیں لیکن اسلام اپنی تہذیبی اقدار سے پوری دنیا میں منفرد و یکساں حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام چونکہ ایک عالمی مذہب ہے اور اس کے قوانین و ضوابط پوری دنیا کے لئے یکساں رائج و محیط ہیں اس لئے مجموعی طور پر اسلامی معاشرہ بنیادی امتیازی خصوصیات کا حامل ہے۔

ذیل میں غیر اسلامی معاشرہ اور اسلامی معاشرہ کا تقابل نکات کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے:

### 1- تقویٰ و پرہیزگاری:

سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

”اسلامی شریعت میں ’تقویٰ‘ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ عزوجل کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تمیز کی غلط اور خیر (نیکی) کی طرف رغبت اور شر (بدی) سے نفرت پیدا کر دیتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بناء پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے۔“

تقویٰ کی حقیقت کا ذکر کرتے ہوئے شیخ عبدالقادر فرماتے ہیں:

”جب تک انسان اس چیز میں اپنے نفس پر فرض نہ کر لے اس کا

تقویٰ کامل نہیں ہوتا:

i- اپنی زبان کو غیبت سے محفوظ رکھے۔

ii- ہدگمانی سے پرہیز کرے۔

iii- ٹھٹھا کرنے سے پرہیز کرے۔

iv- حرام سے آنکھوں کو بند کر لے۔

v- زبان سے ہجی بات کہے۔

- vi- اپنے اور اللہ عزوجل کا احسان ماننے اور اپنے نفس پر بھروسہ نہ کرے اور اس کو اچھا نہ سمجھے۔
- vii- اپنا مال مستحق لوگوں پر خرچ کرے، غیر مستحق اور باطل لوگوں پر خرچ کرنے سے احتراز کرے۔
- viii- اپنے لئے بلند مرتبہ اور بزرگی کی خواہش نہ کرے۔
- ix- ٹھیک وقت پر پانچ وقت کی نماز ادا کرے اور رکوع و سجود کو اچھی طرح بخالائے۔
- x- سنت نبوی ﷺ کی پیروی کرے اور معاشرے سے ملتا رہے۔

## 2- عفو و درگزر:

عفو سے مراد یہ ہے کہ دوسرے کی خطا اور قصور کو معاف کر دیا جائے اور انتقام کی طاقت رکھتے ہوئے بھی بخش دیا جائے لیکن اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ ایک گال پر تھپڑ کھانے کے بعد دوسرا بھی پیش کر دیا جائے۔ اس سے تو شر پسند عناصر کی اور بھی ہمت افزائی ہوگی۔ عفو صرف اسی صورت میں مناسب ہے کہ جب غلطی کرنے والا کسی حد تک اپنی غلطی پر نادم ہو۔ بعض لوگ عفو و درگزر کو اپنے رعب و عزت کی کمی کا باعث سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انتقام سے فوری دھاک تو بیٹھ جاتی ہے یا بیٹھ سکتی ہے مگر پائیدار عزت و عفو و درگزر ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ عفو و درگزر کو اسلامی معاشرے میں بنیادی اہمیت حاصل ہے اور اسلامی معاشرت کا طرہ امتیاز ہے اور اس کا اخلاق میں بڑا بلند مقام ہے۔

## 3- عدل و انصاف:

جن اخلاقی معاشرتی امور پر اسلام نے سب سے زیادہ زور دیا ہے ان میں سے ایک عدل و انصاف بھی ہے۔ یہ دراصل سچائی اور راست بازی ہی کی ایک شکل ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کے ساتھ بلا رُ و رعایت وہ معاملہ کیا جائے اور اس کے بارے میں وہ خدا لگتی بات لگایا جائے جس کا وہ مستحق ہے۔ اس عدل و انصاف پر ہی دنیا کا نظام قائم ہے۔ جس قوم اور جس سماج میں عدل و انصاف نہ ہو وہ خدا کی رحمت سے محروم رہے گا اور آخرت میں بھی اسے سخت عداوت اٹھانا پڑے گی۔

قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ کا مقصد ہی یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان میزان قائم ہو اور ”میزان“ سے مراد عدل و انصاف ہی کے قوانین ہیں جن پر عمل پیرا ہونے کی قرآن و حدیث میں بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

## 4- احسان و بندہ روی۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

”تم دوسروں کی دیکھا دیکھی کام کرنے والے نہ بنو کہ کہنے لگو کہ اگر لوگ احسان کریں گے تو ہم بھی احسان کریں گے اور اگر دوسرے لوگ ظلم کا رویہ اختیار کریں گے تو ہم بھی ویسا ہی کریں گے بلکہ اپنے دلوں کو اس پر پکا کرو کہ اگر اور لوگ احسان کریں تب بھی تم احسان کرو اور اگر لوگ برا سلوک کریں تب بھی تم ظلم اور برائی کا رویہ اختیار نہ کرو (بلکہ احسان ہی کرو)۔“

مطلب یہ ہے کہ دنیا میں خواہ احسان اور حسن سلوک کا چلن ہو یا ظلم اور بد سلوکی کا دورہ ہو اہل ایمان کو چاہئے کہ ان کا رویہ دوسروں کے ساتھ احسان و حسن سلوک ہی کا رہے نیز یہ احسان صرف ان ہی لوگوں کے ساتھ نہ کیا جائے جو ہمارے ساتھ احسان ہی کا رویہ رکھیں۔ یہی مومنانہ شان کا تقاضا ہے اور اسی بات کی تعلیم اہل ایمان کو قرآن و سنت میں دی گئی ہے۔

## 5- تحمل مزاجی:

انسان اشرف المخلوقات ہے اس زمین پر اللہ عزوجل کا نائب ہے اور اس لئے اس کی ذمہ داریاں بھی بہت ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو تحمل کے بغیر ادا نہیں کیا جاسکتا، تحمل نہ ہو تو انسان ذمہ داریوں سے پہلو ہٹ کر گتتا ہے۔ زندگی ایک حال پر نہیں رہتی بلکہ کروٹ بدلتی رہتی ہے۔ آج اگر عروج ہے تو کل زوال اور اگر آج خوشی ہے تو کل رنج و الم۔ تحمل انسان کو اس قابل بنائے رکھتا ہے کہ اگر خدا خواستہ اس پر زوال کے دن آجائیں تو مایوس نہ ہو اور نہ اس کے دل کی حرکت بند ہو بلکہ حوادث کو مردانہ وار سہے اور برداشت کرے۔

تحمل ہی کی وجہ سے انسان زندگی کے فرائض خوشی سے سنبھال سکتا ہے مشکلات کو عزم و ہمت کے ساتھ برداشت کر سکتا ہے۔ تحمل والا انسان جلد بازی سے کام نہیں لیتا اور پھر اس تکلیف سے جو اسے معاشرہ کی طرف سے پہنچتی ہے اسے پوری قوت کے ساتھ سہارتا اور برداشت کرتا ہے۔ قوت برداشت کے بغیر جینا بہت مشکل ہے اور نازک مزاجی انسان کو اس قابل نہیں رہنے دیتی کہ وہ ادروں کی کوتاہیوں یا لغزشوں پر صبر کر سکے۔ جس میں تحمل نہ ہو وہ بات بات پر الجھتا اور بگڑتا ہے اور دنگ فساد پر آمادہ ہو جاتا ہے ایسے شخص کے لئے معاشرہ میں کوئی جگہ نہیں ہوتی اور وہ قوم و ملت کی خدمت نہیں کر سکتا لہذا تحمل کو اسلامی معاشرہ میں اساسی اہمیت حاصل ہے۔

## 6- تدبیر و تفکر:

تدبیر انسان کی امتیازی صفت ہے اور یہی تدبیر اسے دوسرے حیوانات سے ممتاز کرتا ہے۔ صرف انسان میں اللہ تعالیٰ نے غور و فکر اور عقل و تدبیر کی صلاحیتیں رکھی ہیں اور انہی کو صحیح کام میں لاکر انسان اشرف المخلوقات بنتا ہے۔ حیوانات پر ان کے جذبات حکمران رہتے ہیں لیکن انسان اپنے جذبات کو عقل کے تابع رکھتا ہے۔ حیوانات کی عقل محدود ہوتی ہے اور وہ دو دربین اور دوراندیش نہیں ہوتے جبکہ انسان برسوں تک غور و فکر کر کے فکر و تدبیر کا ایک عالم گیر نظام قائم کرتا ہے۔ غور و فکر اور تدبیر سے کام نہ لینا حیوانیت کی طرف پلٹنے کے برابر ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ تدبیر سے کام نہیں لیتے وہ چوپایوں سے بھی بدتر ہیں کیونکہ وہ اللہ پاک کی عطا کردہ نعمت کو ٹھکرا کر ناشکری کا ثبوت دیتے ہیں۔

اسلامی فلاحی معاشرے اور انسانی سیرت کی تعمیر کے لئے ضروری ہے کہ انسان دنیا میں غافلوں کی سی زندگی نہ گزارے بلکہ کائنات کی نشانیوں پر غور و فکر کرتا رہے اور حقیقت کو پانے کی برابر کوشش کرتا رہے اور اس خدا کی یاد سے غافل نہ ہو جس نے اس کائنات کو انتہائی حکمت کے ساتھ پیدا فرمایا ہے۔ خدا کی یاد کے بغیر غور و فکر بے نتیجہ ہے اور غور و فکر کے بغیر خدا کی یاد میں گہرائی پیدا نہیں ہو سکتی۔ آج مغربی اقوام نے زندگی کا مقصد کھانے پینے اور عیش و عشرت کو قرار دے کر انسانیت اور معاشرے کی کتنی تذلیل کی ہے تدبیر کے فقدان نے کہاں تک پہنچا دیا خدا سے ہٹ کر انہوں نے کتنی خطرناک ٹھوک کھائی کہ انسانیت کو حیوانیت کی سطح پر لے آئے۔ تدبیر انسان کو بلند یوں پر لے جاتا ہے اسے صحیح معنوں میں انسان بناتا ہے اور بالآخر اسے دنیا و آخرت کی کامیابیوں سے ہمکنار کرتا ہے۔

## 7- خدمت خلق:

اسلام نے اپنے ماننے والوں پر دو قسم کے حقوق عائد کر رکھے ہیں: ایک وہ حقوق ہیں جن کا تعلق اللہ کے ساتھ ہوتا ہے اور ایک وہ جن کا تعلق مخلوق کے ساتھ ہو۔ اللہ کا حق یہ ہے کہ اس کی بندگی کی جائے اور اس بندگی میں کسی اور کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ مخلوق کے حقوق یہ ہیں کہ ان کی خدمت کی جائے مدد کی جائے اور مقدر پھر جو کچھ اس کی بہبود کے لئے کیا جاسکتا ہے اس میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے۔ بس انہی دو قسم کے حقوق کی ادائیگی کا نام اسلام ہے۔ ان میں کسی طرح کی کمی نہ کی جائے تاکہ خالق راضی رہے اور مخلوق بھی ناراض نہ ہو۔ اسلام نے صرف مسلمان ہی کے ساتھ اچھا سلوک کرنے اور اس کی ہر ممکن مدد کرنے کی تاکید نہیں فرمائی بلکہ اللہ کی تمام مخلوق کے ساتھ اچھے برے کاؤ کی تعلیم دی ہے اس نے اپنے اور پرانے مسلمان اور غیر مسلم انسان اور حیوان کی کوئی قید نہیں رکھی بلکہ حدیث



کے مطابق پوری مخلوق اللہ کا کتبہ ہے اور اللہ کے ہاں مخلوق میں سے وہی پسندیدہ ہے جس کا اس کے کتبہ (مخلوق) کے ساتھ سلوک اچھا ہو۔

خدمت خلق کی مختلف صورتیں ہیں مثلاً اپنے گھر والوں کی خدمت کرنا اگرچہ بظاہر ایک دنیوی فریضہ ہے لیکن آدمی یہ فرض اللہ کی خوشنودی کے لئے ادا کرے تو یہ بھی اللہ کے ہاں خدمت خلق شمار ہوگی۔ ایک تاجر کا کسی کو دھوکا نہ دینا ناجائز منافع سے اپنے آپ کو بچانا اور چور بازاری نہ کرنا بھی خدمت خلق ہی کی ایک شکل ہے۔ بلازم کا اپنی ملازمت کے دوران اپنی ذیولنی کو صحیح طور پر ادا کرنا اور جن لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا بھی خدمت خلق ہے۔ اگرچہ ظاہری اعتبار سے بلا معاوضہ خدمت کو ”خدمت خلق“ کہا جاتا ہے لیکن اگر انسان چاہے تو زندگی کے ہر شعبے میں خلق خلق کی روح کو قائم رکھ سکتا ہے جو جہاں ہے وہیں اللہ کی مخلوق کی خدمت کرے۔ خدمت کے قابل نہیں تو اچھے الفاظ سے معذرت کر دے اور یہ بھی ایک طرح کی خدمت خلق ہے۔ جس آدمی کو اللہ عزوجل نے صحیح و سلامت جسمانی اعضاء دیئے ہوں وہ بے اعضاء لوگوں کی خدمت کر کے اپنے صحیح اعضاء کا شکر یہ اس صورت میں ادا کر سکتا ہے۔

خدمت کا جذبہ ایثار سے پیدا ہوتا ہے اور اگر یہ جذبہ پیدا نہ ہو تو انسان دل سے خدمت خلق پر مائل نہیں ہو سکتا۔ ایثار سے مراد یہ ہے کہ دوسرے کو اپنے آپ پر ترجیح دی جائے۔ رسول کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ایثار اور خدمت خلق کی بہترین اور اعلیٰ مثال ہیں۔

## 8- طلب علم:

اگر ہم قرآن و حدیث پر نظر ڈالیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایک علمی تحریک ہے جہاں تک اسلامی معاشرے میں علم کی اہمیت کا تعلق ہے تو آج کی (بزم خود) مہذب دنیا اسلام سے بہت پیچھے ہے اگرچہ عصر حاضر میں اقوام متحدہ نے تعلیم کو انسان کے بنیادی حقوق میں تو شمار کیا ہے مگر اسے انسان کے لئے فرض قرار نہیں دیا جبکہ اس کے برعکس اسلام نے طلب علم کو فرض قرار دیا ہے۔ انسان اپنے حق سے تو دستبردار ہو سکتا ہے مگر فرض سے پہلو تہی نہیں کر سکتا۔

قرآن مجید میں اسلامی معاشرہ کے قیام کے سلسلہ میں نبوت کی جو ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں اور آپ ﷺ کے جو فرائض مقرر کئے گئے ہیں ان میں تلاوت آیات، تعلیم کتاب و حکمت، احکام کی تفسیر، تزکیہ نفوس اور تبلیغ کو ایک مرکزی مقام حاصل ہے۔ بلاشبہ اسلام ایک علمی تحریک ہے اور مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں علم پر جو توجہ کی ہے اس کی نظیر تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ مغرب میں علم کی شمع مسلمان ہی جلانے والے تھے۔ آج یورپ

اور امریکہ کو جس علم پر ناز ہے اور جس کے ذریعے وہ دنیا کے چمپئن بنے ہوئے ہیں اس کا ہرچشمہ اصلاً اسلام ہی ہے۔

### 9۔ شرم و حیاء اور عفت و عصمت:

قرآن و حدیث کے استعمالات پر غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ”حیاء“ انسانی طبیعت کی اس کیفیت کا نام ہے جو انسان کو ہر نامناسب بات اور ناپسندیدہ کام سے باز رکھتی ہے۔ شرم و حیاء اور عفت و عصمت ان اسلامی معاشرتی اخلاق میں سے ہے جس پر شریعت نے خاص طور پر زور دیا ہے اور اس کی ضد یعنی بے حیائی اور اخلاقی آلودگی سے بچنے کی سخت تاکید فرمائی ہے۔

ہر دین اور شریعت میں انسانی اخلاق کے کسی خاص پہلو پر نسبتاً زیادہ زور دیا جاتا ہے جیسا کہ شریعت عیسوی میں رحمہالی اور عفو و درگزر پر زیادہ زور دیا گیا ہے گویا یہ مسیحی تعلیمات کا مرکزی نکتہ اور اس کی روح ہے۔ اسی طرح رسول کریم ﷺ کی لائی ہوئی شریعت اور تعلیم میں حیاء کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔

امام نوویؒ نے حیاء کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

”حیاء ایسی عادت کا نام ہے جو نڈی چیزوں کے بھونڈنے پر آمادہ کرتی اور ابھارتی ہے اور اہل حق کے حقوق کی کوتاہی کرنے سے باز رکھتی ہے۔“

### 10۔ صدق و راست بازی:

انسان کے ہر قول و فعل کی درستی کی بنیاد یہ ہے کہ اس کے لئے اس کا دل اور زبان باہم ایک دوسرے کے مطابق ہوں درحقیقت اس کا نام سچائی اور صدق ہے۔ امام غزالیؒ نے سچائی کی چھ اقسام بیان کی ہیں:

- i- قول میں سچائی
  - ii- ارادہ و نیت میں سچائی
  - iii- عزم میں سچائی
  - iv- تکمیل عزم میں سچائی
  - v- عمل میں سچائی
  - vi- ویاستداری کے مقامات اور مراتب میں سچائی
- اگر مندرجہ بالا باتوں پر پورا عمل ہے تو وہ شخص راست باز اور صادق ہے۔

## 11- دوسروں کیلئے نیک خواہشات کا جذبہ:

اسلام میں معاشرے کے ہر فرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کے بارے میں اپنے دل میں نیک تمنائوں کے لئے جگہ دے۔ خیرگالی کے جذبات کو دلوں میں رکھنا ہی کافی نہیں بلکہ ہر شخص کو اپنے کردار سے خیرگالی کے جذبات کی ترجمانی کرنی چاہئے اور اپنے سینے سے کینہ، حسد اور بغض کو نکال کر دوسروں کے لئے بہبود خوشحالی اور اچھائی کے خیالات کا اظہار کرے ایک دوسرے سے حقے تحائف کا تبادلہ کرے اس سے حسن معاشرت میں مزید نکھار پیدا ہوگا۔

## 12- تبلیغ اسلام:

اسلامی معاشرے میں ہر فرد کے لئے لازم ہے کہ وہ اسلامی نظریات کے پرچار کے لئے دوسرے مذاہب والوں کی دل آزاری کئے بغیر وہ تمام پسندیدہ اقدامات کرے جن سے لوگوں کے دلوں میں از خود اسلام سے محبت پیدا ہو جائے۔ تبلیغ کا انداز نہایت خوش اخلاقی اور شیریں بیانی پر مبنی ہونا چاہئے۔

## 13- جہاد:

اسلام نہ صرف امن کا علمبردار ہے بلکہ امن کا محافظ بھی ہے۔ اسلام کسی دوسرے کے مذہب میں مداخلت نہیں کرتا لیکن اپنے مذہبی مفادات کا تحفظ کرنا اولین مقصد سمجھتا ہے۔ مسلمان کی تمام تر معاشرتی زندگی احکام خداوندی کی اطاعت اور رسول اکرم ﷺ کی فرمانبرداری میں گزرتی ہے۔ ذاتی سطح پر مسلمان کے جو مفادات ہوں ان کی دیکھ بھال کے لئے جدوجہد کرنا انفرادی فریضہ ہے لیکن جب قومی اور اسلامی سطح پر کسی مفاد کو نقصان پہنچتا ہو اور اسلامی اقتدار خطرے میں دکھائی دیں تو اس وقت ہر مسلمان کا مذہبی فریضہ ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں کفن بدوش اور سر بکف ہو کر اس حملے یا خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان عمل میں نکل آئے اور جہاں تک ممکن ہو سکے اپنی پوری قوت کے ساتھ دشمن پر ٹوٹ پڑے اور اس وقت تک جنگ کرتا رہے جب تک اس کو آخری فتح نصیب نہ ہو جائے یا پھر وہ شہید ہو جائے۔ شہادت کی موت موت نہیں ہوتی بلکہ وہ نہایت ہی شاندار پُر عظمت اور پائیدار فلاحی زندگی کی ضمانت ہوتی ہے۔

## 14- مساوات:

اسلام کی اعلیٰ ترین قدر ”مساوات“ ہے۔ اسلامی معاشرے میں مساوات کو اس اسی حیثیت حاصل ہے۔ ہر پیدا ہونے والا بچہ آزاد اور مسلمان ہوتا ہے اور بعد میں اس کا نام و نسب ماحول اور اس کی تعلیم و تربیت اس کو کچھ اور بنا دیتی ہے۔ اسلام میں غلامی اور طبقاتی درجہ بندی

کا تصور نہیں ہے۔ تمام لوگ ایک ماں اور ایک باپ سے پیدا ہوتے ہیں اور جنس کے اعتبار سے کوئی مرد اور کوئی عورت پیدا ہوتے ہیں پھر خاندانوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تاکہ سب لوگ پہچانے جاسکیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوگوں کو گھٹیا اور برہمیا بنا دیا بلکہ ہر ایک فرد برابری کا حق رکھتا ہے۔ شریعت اور اسلامی معاشرے میں سب لوگ عزت و احترام کے نقطہ نظر سے ایک جیسے مرتبے کے مالک ہیں ہر ایک شخص کو عزت نفس سے نوازا گیا ہے۔ اسلام میں اگر کوئی درجہ بندی ہے تو تقویٰ کی کمی بیشی کی بناء پر ہے۔ اسلام میں نیک اعمال والا شخص زیادہ عزت اور زیادہ مرتبے کا حامل ہے۔

### 15- بے کسوں، بے سہارا، یتیموں اور یتیموں سے حسن سلوک:

غیر مسلم معاشرے کی نسبت اسلامی معاشرے میں یتیموں، یتیموں، بے کسوں اور مفلسوں کو خصوصی بھروسہ کا مستحق گردانا گیا ہے کیونکہ وہ بھی معاشرہ کا حصہ ہیں۔ معاشرہ کی تقویت اور انسانی بھروسہ کا تقاضا ہے کہ ان ایک خصوصی نگہداشت کی جائے اور ان کی خوشی غمی کے مواقع پر حوصلہ افزائی کی جائے اور ان کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے حتی الامکان تعاون کیا جائے۔

### 16- اخوت و بھائی چارہ:

اسلامی معاشرہ میں تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں اور سب کے لئے لازم ہے کہ وہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھیں۔ یہ درس تعاون ہے اور باہمی تعاون سے لائق مسائل حل ہوتے ہیں۔ آپس میں اخوت اور محبت سے ہی معاشرے میں استحکام پیدا ہوتا ہے بلکہ تعاون معاشرے کا اہم ترین تقاضا ہے اور تعاون کے بغیر معاشرے کی بقاء ناممکن ہے۔

### 17- خاندانی اقدار کا تحفظ:

غیر اسلامی معاشرے میں سربراہ خاندان کو وہ مقام و مرتبہ حاصل نہیں ہوتا جو ایک اسلامی معاشرہ میں سربراہ خاندان کو حاصل ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں سربراہ خاندان خصوصی عزت و احترام کا حامل ہوتا ہے۔ اس کا حکم اس کے تمام بچوں پر اس کی مرضی کے مطابق چلنا ہے۔ خواتین اور بچوں کو معاشرتی اعتبار سے ان کا حصہ ملتا ہے۔ خاندان کے تمام افراد اپنی اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کی ضروریات میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ پورے گھر میں امن و امان اور خوشحالی کا دور دورہ ہوتا ہے اور ان کا طریقہ پرورش ایک دوسرے کے لئے باعث کشش ہوتا ہے۔

### 18- ناپ تول میں صحیح مقدار:

رسول اکرم ﷺ خود بھی تجارت کیا کرتے تھے اور فن معاش میں پورا عبور رکھتے تھے۔

انہوں نے اس سلسلے میں بہترین اصولوں کی تلقین کی۔ رسول کریم ﷺ نے واضح طور پر ارشاد فرمایا:

”دین اور خرید و فروخت کے معاملات میں عدل و انصاف کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھو، ناپ تول میں کمی بیشی نہ کرو، اشیاء میں ملاوٹ مت کرو، اسی چیز کی قیمت خریدار سے وصول کرو جو اسے بیچنے کے لئے دکھائی گئی ہو۔ اچھا مال ڈھیر کے اوپر رکھ کر اس کے نیچے دبے ہوئے نکتے مال کو بھی اچھے مال کے ساتھ فروخت کرنا سبے ایمانی ہے۔ اس سے بچو اور صحیح ترازو کے ساتھ وزن کرو۔“

## 19۔ تعمیر معاشرہ میں انفرادی کردار:

ہر فرد ملت کا ایک جزو ہے اور اسے ملت کی تعمیر کے لئے کچھ نہ کچھ حصہ ڈالنا پڑتا ہے۔ ملت اسلامیہ کے ہر فرد کے لئے لازم ہے کہ اس کے تمام افراد اجتماعی مفادات کے حصول کے لئے ہمدوش ہو کر کام کریں۔ تاریخ ایسی قربانیوں سے بھری پڑی ہے جن سے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں نے ملتی تعمیر میں کس قدر ولولہ انگیزی سے شمولیت اختیار کی اور کس جرأت اور دہدے سے اپنے مقاصد حاصل کئے۔

## 20۔ اسلامی ثقافت کا تحفظ:

اسلامی ثقافت کے تقاضے تمام قدیم تقاضوں کے مقابلہ میں مختلف تھے۔ اسلام ایک انقلابی معاشرتی ثقافت کا علمبردار ہے۔ اسلام جہاں کہیں گیا، بتوں کو گرا کر مساجد تعمیر کیں، بت خانوں کو کتب خانوں میں تبدیل کیا، انسانی قربان گاہوں کو دینی مراکز میں بدلا۔ درختوں، بھیاں، جانوروں، ٹھانٹھیں مارتے ہوئے پانیوں اور پلکتے شعلوں کو سجدہ کرنے کے بجائے ان کو تسخیر کرنے کا سبق دیا۔ فن تعمیر، فن حرب اور دین کہن کے نئے طریقوں کو متعارف کروایا اور اپنے مخصوص نقوش چھوڑے تاکہ مسلمانوں کو اپنی عظمت اور قدیم عظمت کا احساس ہوتا رہے۔



## عورت کا مقام (اسلامی اور مغربی تصورات کا جائزہ)

اسلام مرد اور عورت کو مساوی مقام دیتا ہے لیکن یہ مقام مساوی ہے یکساں نہیں ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دیکھا جائے تو مرد اور عورت ایک دوسرے کے لئے تکمیلی ذریعہ ہیں۔ ان کے درمیان شراکت کار ہوئی چاہئے گویا اگر دونوں اپنا کردار اسلامی احکام کے مطابق ادا کریں تو نہ ان کے درمیان رقابت ہوگی اور نہ مخالفت! روحانی اور مذہبی حوالے سے اسلام مرد اور عورت کی فطرت میں کوئی تفریق نہیں کرتا۔ قرآن پاک اس کی وضاحت کچھ یوں کرتا ہے:

1- ”لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔ اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کہ تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔“

(سورت 4، آیت 1)

2- ”اور وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے تمہاری ہم جنس بیویاں بنائیں اور اس نے ان بیویوں سے تمہیں بیٹے اور پوتے عطا کئے اور تمہیں کھانے کو اچھی اچھی چیزیں عطا کیں۔“ (النحل: 72)

### اسلام میں عورت کا وقار اور مرتبہ:

عورت کے وقار اور مرتبے کا قرآن اس طرح ذکر فرماتا ہے:

”اور ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنا اور اس کے حمل اور دودھ پھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے۔“

(سورت 46، آیت 15)

## عورت کے معاشی حقوق:

اسلام نے آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے عورت کو جو معاشی حقوق دیئے ان حقوق میں بہت سی چیزیں شامل ہیں مثلاً ایک بالغہ عاقلہ مسلمان عورت جائیداد خرید سکتی ہے رکھ سکتی ہے بیچ سکتی ہے خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ ہو۔ وہ بغیر کسی پابندی کے اپنی مرضی سے اپنے مال کے بارے میں وہ تمام فیصلے کر سکتی ہے جو ایک مرد کر سکتا ہے۔

ایک حقیقی اسلامی معاشرے میں بہت سے ایسے پیشے ہیں جنہیں خواتین اختیار کر سکتی ہیں مثلاً میڈیکل کا شعبہ دیکھنے خواتین کے علاج کے لئے ہمیں ماہر خواتین ڈاکٹروں اور نرسیوں کی ضرورت ہے۔ اسی طرح تعلیم کے شعبہ میں خواتین اساتذہ کا ہونا ضروری ہے۔

## عورت کا وراثت میں حق:

اسلام نے آج سے صدیوں پہلے ہی عورت کو وراثت کا حق دیا۔ اگر آپ قرآن کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ سورۃ بقرہ سورۃ نساء اور سورۃ مائدہ میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ عورت بیوی کی حیثیت سے ماں کی حیثیت سے بہن اور بیٹی کی حیثیت سے وراثت میں حصہ دار ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کا حصہ خود مقرر کر دیا ہے۔ اسلام بیٹی کی تعلیم و تربیت اچھے طریقے سے کرنے کا بھی حکم دیتا ہے۔ رسول اکرم نے ارشاد فرمایا:

”جس شخص نے اپنی دو بیٹیوں کی اچھی طرح پرورش کی اور ان کا خیال رکھا اور محبت کے ساتھ انہیں پالا وہ شخص جنت میں داخل ہوگا۔“

## عورت بطور ”محضہ“:

قدیم زمانے میں عورت کو شیطان کا آلہ کار سمجھا جاتا تھا جبکہ اسلام میں عورت کا تصور اس کے بالکل الٹ ہے کیونکہ اسلام عورت کو ”محضہ“ یعنی شیطان سے بچنے کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ جب ایک مرد کی شادی ایک اچھی اور نیک عورت سے ہوتی ہے تو وہ عورت اس کے لئے شیطانی ترغیبات سے بچنے کا ذریعہ بن جاتی ہے اور اسے اس راہ پر چلانے کا باعث بنتی ہے جسے اسلام نے صراطِ مستقیم قرار دیا ہے۔

## نکاح کیلئے عورت کی رضامندی:

نکاح کے لئے مرد اور عورت دونوں کی رضامندی ایک لازمی شرط ہے کوئی بھی..... خولہ وہ لڑکی کا والد ہی کیوں نہ ہو اپنی بیٹی کی شادی زبردستی نہیں کر سکتا۔

### عورت بحیثیت ماں / بہن :

اسلام میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد اہمیت والدین کے احترام کی ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے عورت بحیثیت ماں کے احترام کا یوں ذکر فرمایا:

”جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔“ (مسند احمد، ابن ماجہ)

اسلام نے عورت کو بہن کی حیثیت سے بھی نہایت محترم ٹھہرایا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے:

”مومن مرد اور مومن عورتیں یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔“

(سورت 9، آیت 71)

### تعلیم نسواں:

اسلام نے اس وقت خواتین کی تعلیم پر زور دیا جس وقت دنیا میں تعلیم نسواں کا کوئی تصور ہی موجود نہ تھا۔ اس وقت دور صحابہ میں ہمیں متعدد عالمہ خواتین کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ سب سے پہلے اہم مثال تو حضرت عائشہؓ کی ہے۔ ان سے صحابہ کرام اور خلفاء راشدین تک ہدایت اور رہنمائی حاصل کرتے رہے۔

مرد اور عورت محض سماجی سطح پر ہی نہیں بلکہ سیاسی سطح پر بھی ایک دوسرے کے لئے مدد و معاون ہیں۔ اسلام سیاسی معاملات میں بھی عورت کو اپنی رائے کا اظہار کرنے کا حق بھی دیتا ہے۔

اسی طرح اسلام نے خواتین کو قانون سازی میں حصہ لینے کی بھی اجازت دی ہے۔ الغرض! اسلام میں عورت کو جو عزت و وقار عطا کیا ہے وہ اسے دنیا کے کسی اور مذہب حاصل نہیں۔ اسلام عورت کو بحیثیت ماں، بہن، بیٹی اور بیوی جو مقام عطا کرتا ہے اس کا اسلام سے پہلے تو تصور بھی موجود نہیں تھا۔





## حقوق نسواں کے حوالے سے جدید افکار کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ

اسلام مرد اور عورت کو مساوی حقوق دیتا ہے لیکن یہ حقوق مساوی ہیں، یکساں نہیں ہیں۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دیکھا جائے تو مرد اور عورت ایک دوسرے کے لئے تعمیلی ذریعہ ہیں۔ ان کے درمیان شراکت کا رہنما ہوئی چاہئے گویا اگر دونوں اپنا کردار اسلامی احکام کے مطابق ادا کریں تو نہ ان کے درمیان رقابت ہوگی اور نہ مخالفت!

### اسلام میں حقوق نسواں کی بنیادی اقسام:

جہاں تک اسلام میں حقوق نسواں کا تعلق ہے ہم انہیں چھ بنیادی اقسام میں تقسیم کرتے ہیں اور وہ اقسام یہ ہیں:

1- مذہبی اور روحانی حقوق

2- معاشی حقوق

3- معاشرتی حقوق

4- تعلیمی حقوق

5- قانونی حقوق

6- سیاسی حقوق

اب ہم ذیل میں ان کی کچھ تفصیل بیان کرتے ہیں:

### اسلام میں عورت کے مذہبی اور روحانی حقوق:

روحانی اور مذہبی حوالے سے اسلام مرد اور عورت کی فطرت میں کوئی تفریق نہیں کرتا۔ قرآن پاک اس کی وضاحت کچھ یوں کرتا ہے:

يا ايها الناس اتقوا ربكم الذي خلقكم ..... ان الله كان عليكم رقيباً

(سورت 4، آیت 1)

”لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔ اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ وے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانتے ہو اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے

سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔“

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ بَنِينَ وَحَفَدَةً وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ (النحل: 72)

”اور وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے تمہاری ہم جنس بیویاں بنائیں اور اس نے ان بیویوں سے تمہیں بیٹے اور پوتے عطا کئے اور تمہیں کھانے کو اچھی اچھی چیزیں عطا کیں۔“

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد خداوندی ہے:

فَاطْرِبُوا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَمِنَ الْإِنْعَامِ أَزْوَاجًا يَلْبِذُوَكُمْ فِيهِ لَبْسٌ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّطِيعُ الْبَصِيرُ (الشوری: 11)

”آسمانوں اور زمین کا بنائے والا جس نے تمہاری اپنی جنس سے تمہارے لئے جوڑے پیدا کئے اور اسی طرح جانوروں میں بھی جوڑے بنائے اور اس طریقہ سے وہ تمہاری تسلیں پھیلاتا ہے۔ کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔“

اسلام میں جنت کا تصور صرف مردوں کے لئے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ اس میں جنس کی کوئی تفریق نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يُلْقٰكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يَظْلَمُونَ نَقِيرًا (النساء: 124)

”اور جو نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ کی جائے گی۔“

اسی سے ملتی جلتی ایک اور آیت کچھ اس طرح ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (النحل: 97)

”جو شخص بھی نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اسے دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہتر اعمال کے مطابق بخشیں گے۔“

ان آیات سے یہ بات بخوبی سمجھ آ جاتی ہے کہ اسلام میں جنت کے حصول کے لئے جنس کی کوئی شرط موجود نہیں ہے۔

ایک مقام پر تو اللہ تعالیٰ نے اس تفریق کی ایسے انداز میں نفی کی ہے کہ اسلام میں عورت کے مذہبی اور روحانی حقوق کا مقام مکمل کر سامنے آ جاتا ہے اور عورت کے حوالے سے

مغربی پراپیٹنڈہ کی عمل قلعی کھل جاتی ہے۔

ان المسلمین والمسلمات والمؤمنين والمؤمنات ..... اعد الله لهم مغفرة  
واجرا عظيما (الاحزاب: 35)

”یا اللہ! جو مرد اور جو عورتیں مسلم ہیں، مومن ہیں، مطیع فرمان ہیں، راست باز ہیں، صابر ہیں، اللہ کے آگے ہنٹکنے والے ہیں، صدقہ دینے والے ہیں، روزے رکھنے والے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں۔ اللہ نے ان کے لئے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔“

عورت کے وقار اور مرتبے کا قرآن اس طرح ذکر فرماتا ہے:

ووصينا الانسان بوالديه احسانا حملته امة كرها ووضعته كرها وحمله و  
فصاله ثلاثون شهرا (سورت 46، آیت 15)

”اور ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے اس کی ماں نے مشقت، الجھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنا اور اس کے حمل اور دودھ پھرانے میں تیس مہینے لگ گئے۔“

اننا آیات قرآنی سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام ماں بننے کے عمل کی عظمت اور اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے عورت کو اس حوالے سے انتہائی اعلیٰ اور ارفع مقام عطا کرتا ہے اور پھر یہ ہے کہ اسلام میں عزت و وقار کا معیار جنس، رنگ، نسل اور مال و دولت نہیں بلکہ اللہ کے ہاں اہل کا معیار صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے ”تقویٰ“ محض جنس کی بنیاد پر نہ اللہ کے ہاں سزا ملے گی اور نہ ہی جزا ملے گی۔

مذکورہ بالا سورۃ احزاب کی آیت مہار کہ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اسلام مرد اور عورت کے درمیان نہ تو اخلاقی اور روحانی ذمہ داریوں کے حوالے سے کوئی تفریق روا رکھتا ہے اور نہ ہی فرائض و واجبات کے اعتبار سے۔ نماز پڑھنا، روزہ رکھنا اور زکوٰۃ دینا وغیرہ جس طرح مرد پر فرض ہے اسی طرح عورت پر بھی لازم ہے۔ ثابت ہوا کہ اسلام عورت اور مرد پر یکساں اخلاقی ذمہ داریاں عائد کرتا ہے اور ایک ہی جیسی حدود و قیود نافذ کرتا ہے۔ یہی اسلام کا طرۂ امتیاز ہے کہ جو مذہبی اور روحانی حقوق اسلام نے عورت کو دیئے کوئی دوسرا مذہب اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

**اسلام میں عورت کے معاشی حقوق:**

اب ہم معاشی حوالے سے جائزہ لیتے ہیں کہ اسلام عورت کو کیا حقوق عطا کرتا ہے اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ اسلام نے آج سے ڈیڑھ ہزار

سال پہلے عورت کو جو معاشی حقوق دیئے ان حقوق میں بہت سی چیزیں شامل ہیں مثلاً ایک بالغ عاقلہ مسلمان عورت جائیداد خرید سکتی ہے، رکھ سکتی ہے بیچ سکتی ہے خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ ہو۔ وہ بغیر کسی پابندی کے اپنی مرضی سے اپنے مال کے بارے میں وہ تمام فیصلے کر سکتی ہے جو ایک مرد کر سکتا ہے۔

جہاں تک عورت کے کام کرنے اور روزی کمانے کا تعلق ہے اسلام اس کی بھی پوری اجازت دیتا ہے۔ قرآن و حدیث میں کہیں بھی عورت کے کام کرنے پر پابندی عائد نہیں کی گئی البتہ شرط یہ ہے کہ یہ کام جائز ہو اور شرعی حدود کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کیا جائے اور خصوصاً پردے کا خیال رکھا جائے۔ لیکن قدرتی بات ہے کہ اسلام عورت کو کوئی ایسا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا جس میں عورت کے حسن و جمال کو نمایاں کیا جائے مثلاً اداکاری اور ماڈلنگ وغیرہ۔

اسی طرح بہت سے ایسے کام ہیں جو اسلام نے مردوں کے لئے بھی حرام قرار دیئے ہیں ظاہر ہے ایسے کاموں کی اجازت عورت کو بھی نہیں دی جا سکتی مثلاً شراب کے کاروبار سے متعلق پیٹھے یا قمار بازی سے متعلق پیٹھے، ایسے پیٹھے مردوں کے لئے بھی اسی طرح ممنوع ہیں جیسے عورتوں کے لئے۔

ایک حقیقی اسلامی معاشرے میں بہت سے ایسے پیٹھے ہیں جنہیں خواتین اختیار کر سکتی ہیں مثلاً میڈیکل کالج کا شعبہ دیکھئے خواتین کے علاج کے لئے ہمیں ماہر خواتین ڈاکٹروں اور نرسوں کی ضرورت ہے۔ اسی طرح تعلیم کے شعبہ میں خواتین اساتذہ کا ہونا ضروری ہے۔

دوسری طرف اسلام تمام تر معاشی ذمہ داریاں مرد کو سونپتا ہے اور عورت پر کمانے کی ذمہ داری بالکل عائد نہیں کرتا۔ گویا اسے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے کام کرنے کی ضرورت نہیں البتہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ عورت کو اپنی روزی خود کمانی پڑے تو اسلام اس سے روکتا بھی نہیں ہے۔

جہاں تک فیکٹریوں اور دیگر اداروں میں کام کرنے کا تعلق ہے اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ ان اداروں کا انتظام اسلامی اصولوں کے مطابق چل رہا ہو۔ یعنی مردوں اور عورتوں کے شعبے بالکل الگ الگ ہوں۔ کیونکہ اسلام مردوں اور عورتوں کے اختلاط کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔

اسی طرح اسلام عورت کو کاروبار کی اجازت دیتا ہے لیکن جہاں نامحرموں سے اختلاط کا موقع ہو وہاں اسے کسی محرم مرد مثال کے طور پر باپ، بھائی یا شوہر کی مدد حاصل کرنا ہوگی۔ اس سلسلے میں اُم المؤمنین حضرت خدیجہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ دو اپنے دور میں مکہ کی مالدار خواتین میں شمار ہوتی تھیں اور نبی اکرم ﷺ ان کی جانب سے کاروباری ذمہ

داریاں سرانجام دیتے رہے۔

اسلام بنیادی طور پر فکر معاش کی ذمہ داری خاندان کے مرد پر عائد کرتا ہے۔ شادی سے پہلے یہ اس کے باپ یا بھائیوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی تمام ضروریات اپنی استطاعت کی حد تک پوری کریں۔ شادی کے بعد یہ ذمہ داری اس کے شوہر کی طرف منتقل ہو جاتی ہے کہ وہ اس کے کھانے، پہننے اور رہنے سہنے کا بندوبست کرے۔ اگر شوہر فوت ہو جائے تو یہ ذمہ داری اس کے بیٹے پر عائد ہو جاتی ہے۔ گویا جب تک کوئی مرد موجود ہے کمانے کی ذمہ داری اس کی ہے۔

شادی کے موقع پر بھی دیکھا جائے تو اسلامی اصولوں کی روشنی میں عورت ہی فائدے میں رہتی ہے کیونکہ نکاح کے موقع پر اسے حق مہر کی صورت میں ایک تحفہ ملتا ہے۔

قرآن مجید کی سورہ نساء میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاتُوا النِّسَاءَ صَدَقَتِهِنَّ نَحْلَةً فَإِنَّ طَبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِينًا مَرِيئًا

(النساء: 4)

”اور عورتوں کے مہر خوش دلی کے ساتھ (فرض جانتے ہوئے) ادا کر دالہ اگر وہ اپنی خوشی سے مہر کا کوئی حصہ تمہیں معاف کر دیں تو اسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔“

مہر اسلامی شریعت کی زو سے نکاح کی ایک لازمی شرط ہے اگرچہ ہمارے معاشرے میں اب مہر کی روح کو نظر انداز کیا جا رہا ہے جس شادی کی تقریب پر لاکھوں روپے خرچ کئے جا رہے ہوتے ہیں وہاں حق مہر چند سو روپے مقرر کر لیا جاتا ہے۔ حق مہر کا فریقین کی مالی حیثیت کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ ایک سو اکیس ایک سو اکیاون یا سات سو چھیاسی روپے حق مہر کا کوئی تک نہیں بنتا۔

ایک المیہ یہ ہوا ہے کہ بعض مسلمان معاشروں پر دیگر ثقافتوں کے اثرات کچھ زیادہ ہی مرتب ہوئے ہیں جس کی ایک مثال برصغیر پاک و ہند کا معاشرہ ہے یہاں ”مہر“ تو بہت کم مقرر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ لڑکی اپنے ساتھ بہت سا جہیز لے کر آئے گی۔ نئی وی فریج سے لے کر کار اور فلیٹ تک کی توقع کی جاتی ہے۔ ان باتوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام میں جہیز کا مطالبہ بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی بھی طرح جائز نہیں ہے۔

اگر لڑکی کے والدین اپنی خوشی سے اپنی بیٹی کو کوئی تحفہ دینا چاہیں تو اس پر کوئی پابندی نہیں ہے لیکن اس مقصد کے لئے دباؤ ڈالنا کسی صورت جائز نہیں ہے۔ اسلام ایسی حرکتوں سے سختی سے منع کرتا ہے۔

عورت کے لئے کمانا ضروری نہیں ہے لیکن اگر وہ کچھ کماتی ہے تو یہ عمل طور پر اس کی ذاتی ملکیت ہوگی۔ اسے اپنے گھر والوں پر ایک پائی بھی خرچ کرنے کا پابند نہیں کیا گیا۔ وہ اپنی

ماں اپنی مرضی سے جیسے چاہے خرچ کر سکتی ہے۔

اسلامی اصول یہ ہے کہ بیوی کتنی ہی مالدار کیوں نہ ہو کماتا اور روٹی کپڑے مکان کا بندوبست کرنا شوہر کی ذمہ داری ہے اور شوہر کو اپنی یہ ذمہ داری بہر صورت ادا کرنی ہوتی ہے۔

طلاق یا علیحدگی کی صورت میں بھی ”عدت“ کے دوران بیوی کے نفقے کا ذمہ دار مرد ہے۔ اگر بچے موجود ہوں تو ان کے اخراجات پورے کرنا بھی اسی کا فرض ہے۔

اسلام نے آج سے صدیوں پہلے ہی عورت کو وراثت کا حق دیا۔ اگر آپ قرآن کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ سورۃ بقرہ سورۃ نساء اور سورۃ مائدہ میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ عورت بیوی کی حیثیت سے ماں کی حیثیت سے بہن اور بیٹی کی حیثیت سے وراثت میں حصہ دار ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کا حصہ خود مقرر کر دیا ہے۔

### اسلام میں عورت کے معاشرتی حقوق:

اب ہم اسلام میں عورت کو سماجی اور معاشرتی حوالے سے دیے گئے حقوق کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم حقوق کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

الف: اسلام میں عورت کے حقوق بحیثیت بیٹی

ب: اسلام میں عورت کے حقوق بحیثیت بیوی

ج: اسلام میں عورت کے حقوق بحیثیت ماں

د: اسلام میں عورت کے حقوق بحیثیت بہن

سب سے پہلے ہم اسلام میں بیٹی کو دیے گئے حقوق کا ذکر کرتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسلام نے بیٹی کو جان کی حفاظت فراہم کی اور بیٹیوں کو قتل کرنے کی قبیح روایت کا حاتمہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِذَا نَمَوُا وَذَرْنُوا بَأْيَ ذَنْبِ قَتَلْتِ (التکویر: 48)

”اور جب زندہ گاڑھی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی۔“

ہندہ اسلام یہ حفاظت بیٹی اور بیٹیوں کے لئے فراہم کرتا ہے اور قتل اولاد کو حرام قرار دیتا ہے۔ فرمان الہی ہے:

قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبِّيَ مِنْ أَفْوَاحِكُمْ عَلَيْكُمْ الْإِفْشَارَ كَوَافًا بِهٖ شَيْنًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ أَمْلَاقٍ نَحْنُ نَنْزِلُكُمْ وَابْتِهَامٍ

(سورۃ 16 آیت 15)

”اے نبی! ان سے کہو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں یہ کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کر دے اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو اور اپنی اولاد

کو کسی کے ذر سے قتل نہ کرو ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے۔“  
اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ سَحَنَ نَرْزُقْهُمْ وَآيَاكُمْ إِنَّ فِتْنَةَ كَانَ خَطَا  
کبیرا (سورہ ۱۷ آیت ۳۱)

”اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی  
درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔“

اسلام صرف بچی کے قتل پر ہی پابندی نہیں لگاتا بلکہ اسلام تو اس طرز عمل کی بھی سختی سے  
مذمت کرتا ہے کہ بچے کی پیدائش پر خوشیاں منائی جائیں اور بچی کی پیدائش کی خبر سن کر افسوس کیا  
جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”جب ان میں سے کسی کو بچی کی پیدائش کی خوشخبری سنائی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر  
سایہ چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے اور وہ لوگوں سے پھٹتا پھرتا ہے  
کہ اس نئی خبر کے بعد کسی کو کیا منہ دکھائے سوچتا ہے کہ دولت کے ساتھ بیٹی کو لئے رہے یا مٹی  
میں دیا دے؟ دیکھو کیسے بڑے حکم ہیں جو یہ اللہ کے ہارے میں لگاتے ہیں۔“ (سورہ ۱۶  
آیت ۵۸-۵۹)

مزید یہ کہ اسلام نبی کی تعلیم و تربیت اچھے طریقے سے کرنے کا بھی حکم دیتا ہے۔ رسول  
اکرم نے ارشاد فرمایا:

”جس شخص نے اپنی دو بیٹیوں کی اچھی طرح پرورش کی اور ان کا خیال رکھا اور محبت  
کے ساتھ انہیں پالا وہ شخص جنت میں داخل ہوگا۔“

نبی اکرم ﷺ صرف ربانی احکامات نہیں دیتے تھے بلکہ آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے بھی  
ایسے ہی طرز عمل کا ثبوت ملتا ہے۔

### عورت کے بحیثیت بیوی معاشرتی حقوق:

اگر اسلام سے قبل مذاہب اور تہذیبوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم  
زمانے میں عورت کو شیطان کا آلہ کار سمجھا جاتا تھا جبکہ اسلام میں عورت کا تصور اس کے بالکل  
الٹ ہے کیونکہ اسلام عورت کو ”محسنہ“ یعنی شیطان سے بچنے کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ جب ایک  
مرد کی شادی ایک اچھی اور نیک عورت سے ہوتی ہے تو وہ عورت اس کے لئے شیطانی ترفیبات  
سے بچنے کا ذریعہ بن جاتی ہے اور اسے اس راہ پر چلانے کا باعث بنتی ہے جسے اسلام نے صراط  
مستقیم قرار دیا ہے۔

صحیح بخاری کی ایک روایت کا مفہوم یہ ہے:

”نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ: ہر مسلمان جو نکاح کی استطاعت رکھتا ہو ضرور نکاح کرے اس طرح ان کے لئے اپنی نگاہ کی حفاظت اور پاکدامنی برقرار رکھنا آسان ہو جائے گا۔“

حضرت انسؓ سے مروی ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے:

”جس نے نکاح کر لیا اس نے اپنا آدھا دین محفوظ کر لیا۔“

اس سے آپ ﷺ کی مراد یہ ہے کہ نکاح کر لینے سے ایک مسلمان کے لئے بدکرداری، بد اخلاقی، بے راہ روی، زنا کاری اور ہم جنس پرستی جیسے جرائم سے بچنا آسان ہو جاتا ہے اور دنیا کے نصف جرائم انہی اسباب کے باعث ہوتے ہیں۔

اسلام نے نکاح کو ایک پختہ عہد (میثاق غلیظ) قرار دیا ہے۔ (النساء: 21)

تیز ارشاد الہی ہے:

وعاشروهن بالمعروف فان كرهتموهن فعسى ان تكرهوا شيئا ويجعل الله

فيه خيرا كثيرا (النساء: 19)

”ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے

کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ تعالیٰ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔“

نکاح کے لئے مرد اور عورت دونوں کی رضامندی ایک لازمی شرط ہے کوئی بھی خواہ

وہ لڑکی کا والد ہی کیوں نہ ہو اپنی بیٹی کی شادی زبردستی نہیں کر سکتا۔

ایک حدیث میں ہے کہ ”ایک عورت بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئی اور شکایت کی کہ اس

کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف اس کا نکاح کر دیا ہے۔ آپ ﷺ نے اسے فرمایا کہ اگر

وہ چاہے تو اس نکاح کو برقرار رکھے اور چاہے تو فسخ کر دے۔“

(مسند احمد بن حنبل)

اسلام میں بیوی کی حیثیت باندی کی نہیں ہوتی بلکہ اسے شوہر کے ساتھ بالکل سادی

حیثیت ملتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

”تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جس کا اپنے گھر والوں سے سلوک اچھا ہے۔“

(مسند احمد)

### اسلام میں والدہ کے حقوق:

اسلام میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد اہمیت والدین کے احترام کی ہے۔ قرآن مجید

میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”تمہارے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو۔

والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو



کر رہیں تو انہیں اُف تک نہ کہو۔ نہ انہیں جھڑک کر جواب دو بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو۔ نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ اے اللہ! ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔“ (سورت 17 آیات 23-24)

ایک اور مقام پر یوں فرمایا:

”اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کے دودھ چھوٹنے میں لگے (اسی لئے ہم نے اسے فصاحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا۔ تجھے میری ہی طرف پلٹنا ہے۔“ (سورت 31 آیت 14)

رسول اکرم ﷺ نے عورت بحیثیت ماں کے احترام کا یوں ذکر فرمایا:

الجنة تحت اقدام الامهات (مسند احمد ابن ماجہ)

”جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔“

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک روایت کا مفہوم یہ ہے کہ:

”ایک شخص نے رسول اکرم ﷺ سے پوچھا کہ مجھ پر سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تیری والدہ کا۔ اس نے پوچھا اس کے بعد؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تیری والدہ کا۔ اس شخص نے تیری بار پوچھا اس کے بعد؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تیری والدہ کا۔ جب اس نے چوتھی مرتبہ دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تیرے باپ کا۔“

گویا اس حدیث کی روشنی میں پچھتر فیصد عزت و احترام کی مستحق ماں ٹھہرتی ہے اور پچیس فیصد کا باپ۔

یوں کہا جاسکتا ہے کہ سونے کا تمغہ ماں کے حصے میں آتا ہے چاندی کا تمغہ بھی ماں کے حصے میں کالسی کا تمغہ بھی ماں کے حصے میں آتا ہے باپ کو صرف حوصلہ افزائی کا انعام ملتا ہے۔

اسلام میں بہن کے حقوق:

اسلام نے عورت کو بہن کی حیثیت سے بھی نہایت محترم ٹھہرایا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے:

والمؤمنون والمؤمنات بعضهم اولياء بعض (سورت 4 آیت 71)

”مومن مرد اور مومن عورتیں یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔“

لفظ ”اولیاء“ کے معنی یہاں رفیق اور مددگار ہیں بالفاظ دیگر مومن مرد اور مومن عورتیں

آپس میں بہن بھائی ہیں۔ اگر ان کے درمیان کوئی اور رشتہ نہ ہو تو ان کا تقدس اور رشتہ بہن اور بھائی کا ہو گا۔

### اسلام میں عورت کے تعلیمی حقوق:

آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے جب خواتین کو کسی بھی قسم کے حقوق حاصل نہ تھے ان کی حیثیت ذاتی املاک سے بڑھ کر نہ تھی۔ اسلام نے اس وقت خواتین کی تعلیم پر زور دیا جس وقت دنیا میں تعلیم نسواں کا کوئی تصور ہی موجود نہ تھا۔ اس وقت دور صحابہ میں ہمیں متعدد عالمہ خواتین کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ سب سے پہلے اہم مثال تو حضرت عائشہؓ کی ہے۔ ان سے صحابہ کرام اور خلفاء راشدین تک ہدایت اور رہنمائی حاصل کرتے رہے۔

آپ کے ممتاز ترین شاگرد عروہ بن زبیرؓ تھے وہ کہتے ہیں کہ:

”میں نے تفسیر قرآن، فرائض، حلال و حرام، ادب و شعر اور تاریخ عرب کا حضرت عائشہؓ سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں دیکھا۔“

ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دیگر صحابہ کرام کے علاوہ آپ کو چاروں خلفاء راشدینؓ کی رہنمائی کا بھی موقع ملا۔ متعدد مرتبہ آپؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی رہنمائی فرمائی۔ حضرت عائشہؓ سے تقریباً 2210 احادیث مروی ہیں 88 علماء نے آپ سے تعلیم حاصل کی۔

حضرت عائشہؓ کے علاوہ بھی متعدد صحابیات کے علم و فضل کی شہادت ملتی ہے۔ ام المومنین حضرت صفیہؓ کو بھی علم فقہ میں مہارت حاصل تھی۔ امام نوویؒ کے بقول وہ اپنے وقت کی سب سے عالم خاتون تھیں۔

اسی طرح ایک اور مثال ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کی ہے۔ ان کے بارے میں ابن حجرؒ کا بیان ہے کہ 32 علماء نے آپؓ سے تعلیم حاصل کی۔

امام نوویؒ کا بیان ہے کہ فاطمہ بنت قیس ابتدائی مہاجرین میں شامل تھیں اور وسیع علم رکھتی تھیں۔

حضرت انسؓ کی والدہ ام سلیمؓ بھی انتہائی عالم خاتون تھیں اور دعوت و تبلیغ میں خصوصی مہارت رکھتی تھیں۔

حضرت انسؓ کی پوتی سیدہ نفیسہؓ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ سے امام شافعیؒ نے بھی تعلیم حاصل کی۔

حضرت ام الدرداءؓ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں علوم عقلیہ میں مال حاصل تھا۔ ان کے علم و فضل کی گواہی امام بخاریؒ جیسے عالم نے بھی دی ہے۔

مزید مثالیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں اور یہ ذکر اس دور کا ہو رہا ہے باب عورت کے

ساتھ بہت بُرا سلوک کیا جاتا تھا۔ جب لوگ بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیتے تھے اور اسی دور میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں نہ صرف علم دین بلکہ طب اور سائنس جیسے علوم کی ماہر خواتین بھی موجود تھیں۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اسلام ہر عورت کو تعلیم حاصل کرنے کا حق دیتا ہے۔

### اسلام میں عورت کے قانونی حقوق:

اسلامی قانون کے اعتبار سے مرد اور عورت بالکل برابر ہیں۔ اسلامی شریعت مرد اور عورت کی جان اور مال کو یکساں تحفظ فراہم کرتی ہے۔ اگر کوئی مرد کسی عورت کو قتل کر دے تو اسے بھی سزائے موت ہی دی جائے گی جیسے قصاص میں کسی مرد کے قاتل کو سزائے موت ملتی ہے اور اگر کوئی عورت قتل کی مرتکب ہوتی ہے تو اس کے لئے بھی وہی سزا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ الْحَرُّ بِالْحَرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ  
وَالْأُنثَىٰ بِالْأُنثَىٰ..... وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَوةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (البقرة: 179-178)

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تمہارے لئے قتل کے مقدموں میں قصاص کا حکم لکھ دیا گیا ہے۔ آزاد آدمی نے قتل کیا ہو تو اس آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے غلام قاتل ہو تو وہ غلام ہی قتل کیا جائے اور عورت اس جرم کی مرتکب ہو تو اس عورت سے ہی قصاص لیا جائے۔ ہاں اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا بھائی کچھ نرمی کرنے کے لئے تیار ہو تو معروف طریقہ کے مطابق خون بہا کا تحفیہ ہونا چاہئے اور قاتل کے لئے لازم ہے کہ راستی کے ساتھ خون بہا ادا کرے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے تحفیہ اور رحمت ہے۔ اس پر بھی جو زیادتی کرے اس کے لئے دردناک سزا ہے۔ عقل و خرد رکھنے والو! تمہارے لئے قصاص میں نرمی ہے۔ امید ہے تم اس قانون کی خلاف ورزی کرنے سے پرہیز کرو گے۔“

اسلامی قانون میں جسمانی نقصان پہنچانے کی سزا بلا تفریق جنس ایک ہی ہے اور اس سلسلے میں مرد اور عورت میں کوئی تفریق نہیں کی جاتی۔

قتل کے علاوہ جرمِ زانیہ میں بھی عورت اور مرد میں کوئی تفریق روا نہیں ہے۔ ”یٰٰلَہٰی اللہ تعالیٰ نہ ارشاد کرتی ہے۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جِزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَزِيزٌ  
حَكِيمٌ (المائدہ: 38)

”اور چور خواہ مرد ہو یا عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ

کی طرف سے عبرت ناک سزا۔ اللہ کی قدرت سب پر غالب ہے اور وہ وانا دینا ہے۔“  
اسی طرح سورہ نور میں ارشاد ہوتا ہے:

الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة ولا تأخذکم بهما رافة فی دین اللہ ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الآخر ولیشهد عذابہما طائفة من المؤمنین (النور: 2)

”زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور اللہ کے دین کے معاملے میں تمہیں ان پر ترس کھانے کا جذبہ دامن نہ ہو۔ اگر تم اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو اور ان کو سزا دیتے وقت اہل ایمان کا ایک گروہ موجود ہو۔“  
یہاں بھی جنس کے حوالے سے کوئی تفریق نہیں کی گئی اسی طرح اسلام نے عورت کو گواہی کا حق دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

والذین یرمون المحصنات ثم لم یاتوا بأربعة شہداء فاجلدوہم ثمانین جلدة ولا تقبلوا لہم شہادة ابدا (النور: 4)

”اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور پھر چار گواہ پیش نہ کر سکیں انہیں اسی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو اور وہ خود ہی فاسق ہیں۔“

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام عورت کی عزت و وقار کو کس قدر اہمیت دیتا ہے بالعموم یہ ہوتا ہے کہ شادی کے بعد عورت اپنے نام کے ساتھ شوہر کا نام لکھتی ہے لیکن اسلام نے اس معاملے میں بھی آزادی دی ہے وہ چاہے تو شوہر کا نام اختیار کر سکتی ہے اور چاہے تو باپ کا نام ہی استعمال کر سکتی ہے۔ اس کا سبب اسلام میں عورت اور مرد کی مساوات اور برابری ہے۔

### اسلام میں عورت کے سیاسی حقوق:

مرد اور عورت محض سماجی سطح پر ہی نہیں بلکہ سیاسی سطح پر بھی ایک دوسرے کے لئے مدد معاون ہیں۔ اسلام سیاسی معاملات میں بھی عورت کو اپنی رائے کا اظہار کرنے کا حق بھی دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یاایہا النبی اذا جاءک المؤمنات یرایعنک علی ان لا یشرنک باللہ شیئا ان اللہ غفور رحیم (الممتحنة: 12)

”اے نبی! جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لئے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی چوری نہ کریں گی بدکاری نہ کریں گی اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی اور کسی معروف امر میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں اللہ سے

دعائے مغفرت کرد۔ یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔“  
یہاں بیعت کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بیعت کے لفظ میں آج کل کے الیکشن کا مفہوم بھی شامل ہے کیونکہ حضور اکرم ﷺ کے رسول بھی تھے اور سربراہ مملکت بھی تھے اور بیعت سے مراد انہیں سربراہ مملکت تسلیم کرنا تھا۔ اس طرح اسلام نے اسی دور میں عورت کو ودت دینے کا حق بھی تقویض کر دیا تھا۔

اسی طرح اسلام نے خواتین کو قانون سازی میں حصہ لینے کی بھی اجازت دی ہے۔ ایک مشہور روایت ہے کہ

”حضرت عمرؓ ایک دفعہ صحابہ کرامؓ کے ساتھ حق مہر کے مسئلے پر (یا جعہ کے خطبہ میں) گفتگو کر رہے تھے اور حضرت عمرؓ کی خواہش تھی کہ حق مہر کی بالائی حد مقرر کر دی جائے کیونکہ نوجوانوں کے لئے نکاح کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ پیچھے سے ایک بوڑھی عورت اٹھی اور اس نے قرآن مجید کی یہ سورۃ نساء کی بیسویں آیت پڑھی:

وان اردتم استبدال زوج مکان زوج و آتیتم احدھن قنطاراً فلا تأخذوا منه شیئاً (النساء: 20)

”اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانے کا ارادہ کریں تو تو خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔“

اس کے بعد اس عورت نے کہا کہ جب قرآن یہ اجازت دیتا ہے کہ مہر میں مال کا ذخیرہ بھی دیا جاسکتا ہے تو عمر کون ہوتا ہے حد مقرر کرنے والا۔

یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فوراً اپنی رائے سے رجوع کر لیا اور کہنے لگے کہ غلط تھا اور یہ عورت درست کہہ رہی تھی۔“

اندازہ کریں کہ ایک عام عورت کو بھی اتنا حق حاصل تھا۔

وہ یقیناً ایک عام عورت تھی اگر وہ کوئی مشہور خاتون ہوتی تو لازماً اس کا نام لیا جاتا نام نہ لئے جانے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کوئی عام خاتون تھی اور پھر بھی اسے یہ حق حاصل تھا کہ وہ خلیفہ وقت سے اختلاف کی جرأت کر سکے اور اس پر اعتراض کر سکے۔ اگر آج کل کی تکنیکی اصطلاحات میں بات کی جائے تو ہم کہیں گے کہ اس خاتون نے ”آئین کی خلاف ورزی“ پر اعتراض کیا تھا کیونکہ مسلمانوں کا آئین تو قرآن ہے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام عورت کو قانون سازی میں شرکت کا بھی حق دیتا ہے۔



# جنسی تفریق کا جدید نظریہ اور اسلام

پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں:

”اسلامی معاشرے کی بنیاد مسلمان فرد اور مسلمان خاندان ہے۔ اسلام نے انسانی اجتماعیت کے دونوں بڑے مسائل... مرد اور عورت کا رشتہ اور فرد اور اجتماع کا تعلق... کو بڑی خوش اسلوبی سے حل کیا ہے۔ دور جدید کے ہی نہیں انسانی تاریخ کے بڑے بڑے تہذیبی فتنے انہی دونوں رشتوں میں بگاڑ، افراط و تفریط اور کمزوری و انتشار کے پیدا کردہ ہیں۔“

## اسلام کی دعوت اولین کا مخاطب:

اسلام نے اپنی دعوت اولین کا مخاطب فرد کو بنایا ہے اور اس کے قلب و نظر کو ایمان کا گہوارہ قرار دیا ہے۔ ہر فرد کی سیرت سازی اس کا پہلا ہدف ہے اور ہر مردہ اور عورت کو ایک اسلامی شخصیت سے آراستہ کر کے ہی اسلام معاشرتی اور تہذیبی انقلاب برپا کرتا ہے۔ فرد و سنوارنے کے ساتھ ساتھ اسلام اس کا رشتہ معاشرے سے جوڑتا ہے اور اس کے لئے ایسے ادارے قائم کرتا ہے جو زندگی میں احکام پیدا کر سکیں اور تمام انسانوں کی قوت و صلاحیت کو تعمیر و ترقی کے لئے استعمال کر سکیں۔

اسلامی اجتماعیت میں فرد معاشرہ اور ریاست کے درمیان تعلق کشاف اور محض حقوق کی جنگ سے عبارت نہیں بلکہ اس کی اصل تعاون اور یکاقل کا رشتہ ہے۔ شریعت کی روشنی میں دونوں کے کردار متعین ہیں اور دونوں ایک ہی مقصد یعنی اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے مصروف کار ہیں۔

## مرد اور عورت کا رشتہ:

اسی طرح مرد اور عورت کا رشتہ بھی الہامی ہدایت کے تحت استوار کیا گیا ہے۔ خاندان کا نظام محض انسانی تجربے کا حاصل اور ٹھوکر بن کھانے کے بعد کسی موبوم معاشی مفاد کے حصول کا ذریعہ نہیں (جیسا کہ مارکس، انجلز وغیرہ نے اپنے اپنے انداز میں کہا ہے) بلکہ یہ پہلا انسانی ادارہ ہے جسے وحی کے تحت قائم کیا گیا اور جس سے انسانی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ شریعت الہیہ نے اس ادارے کے مقاصد اور خطوط کار متعین کر دیے ہیں اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا

پودا تناور اور پھل دار درخت اس بیج کی پیداوار ہے۔ قرآن و سنت میں اس کے متعلق متعدد ارشادات مذکور ہیں۔

### اسلام اور خاندانی نظام:

اسلام نے خاندانی نظام کو جو تقدس عطا کیا ہے وہ منفرد ہے۔ یہ محض انسان کی تلاش و جستجو اور تجربے سے حاصل ہونے والا ادارہ نہیں بلکہ اللہ عزوجل کا قائم کردہ نظام ہے جو انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور معاشرے اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس الہامی طور پر قائم ہونے والے ادارے کے بارے میں ساری ضروری ہدایات خود اللہ عزوجل کی کتاب اور اس کے پیارے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سنت میں فراہم کر دی گئی ہیں۔

### قرآنی احکام اور خاندان:

قرآن پاک میں جو قانونی احکامات ہیں ان کا دو تہائی حصہ صرف خاندان کے مسائل کے بارے میں ہے اور مسلم معاشرے کو آج تک اسلام کی بنیاد پر قائم رکھنے اور ہر انحراف کے بعد اصل کی طرف رجوع کی تحریک پیدا کرنے والے عوامل میں سب سے اہم قرآن و سنت کی موجودگی کے بعد خاندان ہی کا ادارہ ہے جو ہمارا اصل قلعہ اور جائے امن ہے جس کے حصار میں اس امت نے بڑے سے بڑے فتنے کے مقابلہ میں پناہ لی ہے اور جس سے وہ انسان رونما ہوتے رہے ہیں جن کے ہاتھوں تجدید و احیاء کی نئی تاریخ رقم ہوئی ہے۔

### مسلمان ماں:

مسلمان خاندان اور خصوصیت سے مسلمان ماں وہ اہم ترین جائے پناہ رہی ہے جس نے اس امت کو راہ ثواب پر قائم رکھا ہے اور ہر پستی کے بعد نئی بلندی کی راہیں ہموار ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج دشمن انہی چیزوں کو خاص نشانہ بنا رہا ہے یعنی وحی الہی ہدایت (قرآن و سنت) اور خاندانی نظام!..... اس کا ہدف مسلمان عورت کو اس کے دین سے برگشتہ کرنا ہے۔ یو۔ این۔ او کے عالمی پروگراموں سے لے کر غیر ملکی اور ملکی این جی او اے اس "معدنہ جہاد" میں مصروف ہیں۔

### اسلام میں خاندان کا مخصوص مزاج:

اسلام میں خاندانی نظام کا اپنا مخصوص مزاج اور متعین نظام ہے۔ اسے انسانی تہذیبوں کے دوسرے نمونوں (Models) سے کنفیوڈ نہیں کیا جانا چاہئے خواہ ہندو مذہب اور سماج میں پروان چڑھنے والا تصور خاندان ہو یا یونان، روم اور کلیسا کے دور کا خاندانی نظام یا صنعتی انقلاب اور مغربی انداز کے زیر اثر رونما ہونے والا مختصر بلکہ منتشر خاندان کا یورپی اور امریکی نمونہ ہو ان

سب کے مقابلہ میں اسلام نے خاندانی نظام کو جو تصور دیا ہے وہ بالکل مختلف اور منفرد ہے اور اسے تاریخ کے پدری (Patriarchal) نظام یا مغربی ممالک کی نشاۃ ثانیہ کے زیر اثر آزاد محبت رانی (Romantic Love) دونوں سے کوئی نسبت نہیں۔ اس لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ اسلام کے خاندانی نظام کی حقیقت اور اس کی روح کو اچھی طرح سمجھا جائے اور نئی نسلوں میں اس کی صحیح تفہیم پیدا کی جائے۔

### اسلام میں نکاح کی اہمیت:

اسلام میں نکاح محض شہوت کی تسکین کا ایک راستہ نہیں بلکہ جنسی عمل اور فطرت کے حقیقی تقاضوں کی جائز تسکین اس کا ایک حصہ ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ایک نئے خاندان کے قیام کا ذریعہ دو خاندانوں میں نئے روابط کی ایک صورت اور معاشرے کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے اور استوار رکھنے کا ایک تخلیقی عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نکاح سے بچنے اور جائز ذریعے سے شہوت کی تسکین کو بھی لائق اجر عمل قرار دیا گیا ہے۔ نکاح کی حیثیت ایک سنت اور کچھ حالات میں سنت مؤکدہ کی ہے اور اس نئے خاندان کے قیام کے عمل کو محض وقتی جذبات پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ اس کے لئے بڑے واضح اصول اور قواعد و ضوابط مقرر کئے گئے ہیں اور ایسے تحفظات کا اہتمام کیا گیا ہے جو اس عمل کو محض ایک کھیل اور تجربہ نہ بننے دیں۔

## اسلامی عائلی نظام کے بنیادی اصول

اسلام نے اپنے پورے عائلی نظام کی بنیاد جن اصولوں پر رکھی ہے وہ یہ ہیں:

### 1- اطاعت شریعت:

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت انسان کی خدائی کی جگہ رب العالمین کی حاکمیت کو تسلیم کرنا اور بندگی اور اطاعت کے راستے کو خوش دلی سے اور والہانہ انداز میں اختیار کرنا۔

### 2- حاکمیت الہیہ کا عقیدہ:

اللہ کی حاکمیت کے عقیدے کا لازمی نتیجہ انسانوں کی مساوات اور برابری حقوق و فرائض کی پاسداری اور ایک ہی مقصد اور منزل کی جستجو میں رفاقت اور ہم سفری کا احساس اور تجربہ ہے۔ یہ تمام انسانوں مرد اور عورت، شوہر اور بیوی، والدین اور اولاد بزرگوں اور بچوں..... غرض معاشرے کے ہر فرد کو ایک دوسرے سے ایک نئے رشتہ میں جوڑ دیتا ہے اور زندگی گزارنے کے لئے ایک نئے اسلوب اور آہنگ سے روشناس کرتا ہے جسے شریعت نے بڑے حسین انداز میں کامیابی کے معیار کی صورت میں پیش کیا ہے:



”دنیا اور آخرت میں برتری اور کامیابی کا معیار نہ جنس ہے نہ نسب نہ دولت اور نہ اقتدار ہے بلکہ مرد اور عورت سب کے لئے تقویٰ ہی واحد معیار ہے۔“ (الحجرات)

اور پھر سورہ توبہ میں مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا رفیق اور مددگار بتایا اور دونوں کے لئے کارگہ حیات میں ذمہ داریاں متعین کیں اور دنیا اور آخرت میں کامیابی کا ایک ہی راستہ اور ایک ہی معیار اس دو ٹوک انداز میں مقرر فرمایا:

والمؤمنون والمؤمنات بعضهم اولیاء بعض..... ان الله عزیز حکیم۔

مسلم خاندان اور مسلم معاشرہ زندگی اور کامیابی کے اسی انقلابی اصول پر قائم ہوتا ہے اور یہ مسلم امت کو ان تمام گمراہ کن بحثوں سے نجات دے دیتا ہے جن میں دور قلامی سے لے کر ماوراء پر آزادی تک کے انسانی سماج میں وہ الجھا رہا ہے۔ اسلام نے زندگی گزارنے کے لئے جو میدان کار (Matrix) تیار کئے بنایا ہے وہ سب سے جدا اور سب سے خالص ہے۔

### 3- مہر و محبت اور صلہ رحمی:

اسلام کے خاندانی نظام کی تیسری بنیاد مہر و محبت اور صلہ رحمی ہے۔ نکاح دراصل اخلاق و عصمت کے تحفظ کے لئے قلعے کی مانند ہے اور اس قلعے کے کئیں ایک دوسرے کے لئے تسکین و محبت اور رحمت کا سرچشمہ ہیں:

لنسکونوا الیہا وجعل بینکم مودة ورحمة۔ (الروم)

اور اس رشتے کو ایک دوسرے کے لباس کے قرمبی رشتے سے تعبیر کیا ہے:

هن لباس لکم وانتم لها سلہن۔ (البقرہ)

اور پھر اس رحمت اور محبت کو ازواج یا اولاد تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ صلہ رحمی کے علم کے ذریعے وسیع تر خاندان اور تمام دوسرے رشتہ داروں کو بھی اس کی غنڈک اور مٹھاس میں شریک کر لیا گیا ہے۔

### 4- عدل و انصاف:

اللہ کی حاکمیت اس کے تحت رونما ہونے والی مساوات اور شرکت مقاصد عصمت کی حفاظت اور محبت و رحمت کے بعد چوتھی بنیاد عدل و انصاف ہے۔ اسلام میں کوئی کسی کی ملک نہیں اور کوئی کسی کا تابع مہمل نہیں۔ سب حقوق و فرائض کے ایک جہاز اور عینیت کے پابند ہیں اور اگر ایک طرف اختیارات اور فرائض کی تقسیم ہو جائے تو سب کا جواب نظم کی خاطر مرد کو بجا طور پر ”ایک درجہ“ فوقیت دی گئی ہے جو کہ قرآن مجید کی صریح دعوت ہے۔ تابع اور جواہدہ کے نظام سے مشروط ہے۔ جبر اور کمین بانی کا اختیار شریعت الہی کے نظام میں کسی کو حاصل نہیں، مرد کو اور نہ ہی عورت کو۔

ولهن مثل الذی علیہن بالمعروف و للرجال لیہن درجۃ۔ (البقرہ)  
 اختیاراتِ ذمہ داریوں اور جواب دہی کے اس نظام کو حضور اکرم ﷺ نے بڑے دل  
 نشیں انداز میں بیان کیا ہے۔ فرمایا:

”تم میں سے ہر شخص نگران ہے اور ہر شخص سے اس کی رعیت کے  
 بارے میں پانڈس ہوگی۔ امام نگران ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق  
 پانڈس ہوگی۔ آدمی اپنے اہل و عیال پر نگران ہے اس سے اس کی رعیت کے  
 متعلق پانڈس ہوگی اور عورت اپنے گھر کی نگرانی ہے اس سے اس کی رعیت  
 کے متعلق پانڈس ہوگی۔“ (بخاری شریف)

### 5- فرد کی معاشی آزادی اور اجتماعی تکافل:

عدل و انصاف اور مشاورت کے اس نظام کو مستحکم کرنے کے لئے مسلمان خاندان کی  
 پانچویں بنیاد فرد کی معاشی آزادی اور اجتماعی تکافل کا ایک ایسا نظام ہے جو مرد اور عورت کی  
 عزت نفس اور آزادی کی مکمل ضمانت کے ساتھ ان کے درمیان تعاون اور شراکت کا رشتہ استوار  
 کرتا ہے۔ دونوں کو اپنی اپنی ملک پر پورا اختیار دیتا ہے مرد کو نان و نفقہ کا ذمہ دار قرار دیتا ہے  
 اور عورت کو محض دودھ پلانے والی اور جبری طور پر گھر کا کام کاج کرنے والی نہیں بناتا بلکہ ان  
 تمام معاملات کو ان کی اہمیت اور خاندانی نظام کی ضرورت کے مطابق حقوق کی باہم پاسداری  
 کے ساتھ انجام دلانا چاہتا ہے اور اس کے ساتھ گھر کے اندر بھی اور خاندان اور معاشرے کے  
 وسیع تر میدان میں بھی ایک ایسا نظام قائم کرتا ہے کہ جو بھی مالی اعتبار سے مضبوط ہو وہ مالی  
 اعتبار سے کمزوروں کی مدد ان کے ایک حق کی اداگی کے جذبے سے کرے۔

یہ عمل زندگی اور موت دونوں صورتوں میں جاری رہے یعنی نفقہ صدقات، نسل رنجی  
 وراثت و ولایت اور قریبی رشتہ داروں کے اخراجات برداشت کرنے کے قوانین اور ہدایات کی  
 روشنی میں عمل کرے۔

[www.kitabosunnat.com](http://www.kitabosunnat.com)

الْمَكْتَبَةُ الْإِسْلَامِيَّةُ

بجے ماؤں ٹاؤن - لاہور

# ایم۔ اے اسلامیات میں کامیابی کیلئے معیاری کتب کا انتخاب

## پنجاب یونیورسٹی کا نیا نصاب

(تمام پرچے لازمی ہیں)

### 1- سال اوّل

احمد رضا	فہم القرآن	پہلا پرچہ
ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی	فہم الحدیث	دوسرا پرچہ
ملک کریم بخش	اسلام اور مذاہب عالم	تیسرا پرچہ
ملک کریم بخش	تاریخ اسلام	چوتھا پرچہ
حافظ محمد صدیقی	عربی زبان و ادب	پانچواں پرچہ

### 2- سال دوم

حافظ محمد صدیقی	تیسیر الفقہ (لازمی)	پہلا پرچہ
محمد حبیب عباسی	اسلام اور جدید افکار (لازمی)	دوسرا پرچہ
ڈاکٹر حمید اللہ شاہ ہاشمی	اسلام اور سائنس	تیسرا پرچہ
ڈاکٹر حمید اللہ شاہ ہاشمی	اسلام اور فلسفہ	آپشنل
محمد حبیب عباسی	عالم اسلام کے وسائل و مسائل	آپشنل
ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی	اسلام اور جدید فکر مغرب	چوتھا پرچہ
ڈاکٹر حمید اللہ شاہ ہاشمی	اسلامی اخلاق و تصوف	آپشنل
خدیجہ نعیم	دعوت و ارشاد	پانچواں پرچہ

سال اول اور دوم کیلئے گائیڈ معروضی سوالات اور حل شدہ پرچے بھی دستیاب ہیں

دانیال گائیڈ (سال اول دوم) دانیال حل شدہ پرچے (سال اول دوم)

Ph: 042-37660736 / جلال دین ہسپتال بلڈنگ  
 Mob: 0333-4276640 / چوک اردو بازار لاہور  
 maktabahdanyal@hotmail.com www.maktabahdanyal.com